سہ ماہی

# نخلستان


اپریل تا جون سنہ ۱۹۸۳ء

جلد :- ۴ —————— شمارہ :- ۱


## مجلس ادارت




ناشر :

راجستھان اردو اکیڈیمی
جے ۲۷- سبھاش مارگ سی اسکیم
جے پور ۳۰۲۰۰۱

... احمد پرنٹر و پبلشر نے ... پرنٹنگ پریس ... میں چھپا کر دفتر راجستھان ... سے شائع ...

سہ ماہی

# نخلستان

قیمت ——— فی پرچہ ——— تین روپے
زرِ سالانہ ——————— دس روپے

ترسیلِ زر و مراسلت کا پتہ

دفتر راجستھان اردو اکیڈمی
جے ۳، سبھاش مارگ، سی اسکیم
جے پور ۳۰۲۰۰۱

کاتب: سلیم واصف فرقانی ٹونکی

# ترتیب

# ترتیب

## قطعات و منظومات

# اداریہ

راجستھان میں اردو زبان و ادب کے تحفظ و بقا اور ترویج و اشاعت کی غرض سے ۲۸ مارچ ۱۹۷۹ء کو راجستھان اردو اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس کے دستور العمل کی ترتیب، حکومت راجستھان سے اس کی توثیق اور رجسٹریشن کا مرحلہ طے کرنے کے بعد، ۱ فروری ۱۹۸۰ء کو باقاعدہ اس کا ایک جلسہ افتتاح منعقد کیا گیا۔ اور اکیڈمی نے اپنے دستور العمل کے مطابق کام شروع کیا۔

اسی کے تحت سہ ماہی رسالہ نخلستان جاری کیا گیا جس کی پہلی جلد کا شمارہ نمبر اول و دوم (یکجائی) اپریل تا ستمبر ۱۹۸۰ء شائع ہوا تھا۔ اور اسی وقت سے پابندی کے ساتھ اس کی اشاعت کا سلسلہ قائم ہے۔ زیر نظر جریدہ چوتھی جلد کا پہلا شمارہ ہے۔

اس عرصہ میں نخلستان کی ادارت میں تبدیلیاں بھی آتی رہی ہیں لیکن متعلقہ حضرات کی محنت اور کوشش نیز اہلِ قلم کے تعاون سے اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا رہا ہے اور ملک کے معتدد ادباء و شعراء کی اعلیٰ تخلیقات کی شمولیت کے باعث اس کو نظرِ تحسین سے دیکھا جانے لگا ہے ہمیں یقین ہے کہ ملک کے اہل قلم حضرات کا تعاون ہمیں اسی طرح حاصل رہے گا۔ اور اس کی نظم و نثر کی بلند مرتبہ تخلیقات کے باعث نخلستان کا معیارِ ادب بلند سے بلند تر ہوتا رہے گا۔

"نخلستان" راجستھان کا واحد ادبی جریدہ ہے جس کے ذریعہ اس خطّے کی ادبی تاریخ کے روشن پہلو اور یہاں کے اہلِ قلم حضرات کی تخلیقاتِ نظم و نثر کو خصوصیت کے ساتھ منظرِ عام پر لانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ پچھلی تین جلدوں کے دس شماروں میں اب تک راجستھان کے ستائیس (۲۷) ضلعوں میں سے حسب ذیل سترہ (۱۷) ضلعوں کے مختلف شعراء و ادباء کی تخلیقات، سہ ماہی "نخلستان" میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

اجمیر اودے پور بانسواڑہ بھرت پور بیکانیر پالی ٹونک جودھپور جھالاواڑ
جھنجھنوں جے پور چورو ڈونگر پور سوائی مادھو پور سیکر کوٹہ اور ناگور

ان میں زیادہ تر شعری تخلیقات ہیں۔ نثر کی جانب توجہ کم نظر آتی ہے چنانچہ مختلف موضوعات

پر اب تک کل پچاس نثری تخلیقات شائع ہوئی ہیں جن میں تحقیقی و تنقیدی مضامین کے علاوہ افسانہ ڈرامہ، سوانح، فیچر اور رپورتاژ وغیرہ شامل ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر تخلیقات جے پور اور ٹونک کے ادیبوں کی ہیں۔ ایسی صورت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ راجستھان کے مختلف علاقوں کے ادیب، نثر کی مختلف اصناف کی جانب بھی توجہ فرمائیں اور خصوصی طور پر اپنے علاقہ کی تاریخ ساز شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں کو منظر عام پر لاکر راجستھان میں ادبی تحقیق کے لئے راہیں فراہم کریں۔ تاکہ اس خطے کی ادبی تاریخ واضح طور پر سامنے آسکے۔

یہ کام نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ اب تک مؤرخین و محققین کی نارسائی اور بے اعتنائی کے باعث اردو ادب کی تاریخ میں راجستھان کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ راجستھان میں بھی اردو زبان و ادب کی ایسی خدمات انجام دی جاتی رہی ہیں جن کے باعث ادبی اعتبار سے یہاں کا ماضی نہایت روشن رہا ہے۔ اور یہاں بھی ایسے ایسے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے کاروانِ علم و ادب کو آگے بڑھایا ہے۔

پروفیسر محمود شیرانی جیسے مؤرخ، محقق، نقاد، ماہر لسانیات، اور رومانی تحریک کے علمبردار محمد داؤد اختر شیرانی جیسے شاعر راجستھان ہی کی سرزمین پر پیدا ہوئے تھے۔ اور آج بھی اس سرزمین پر ان اثرات کی جھلک تلاش کی جا سکتی ہے لیکن ضرورت توجہ کی ہے اس لئے راجستھان کے شعراء و ادباء کی توجہ خصوصی طور پر اس جانب مبذول کراتے ہوئے ان سے گزارش ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ تخلیقات نخلستان میں اشاعت کے لئے ارسال فرما کر اکیڈمی کے مقاصد کی تکمیل میں ہمارا تعاون فرمائیں۔

اسی کے ساتھ راجستھان کے بقیہ اضلاع اور باڑمیر بوندی بھیلواڑہ جالور جیسلمیر چتوڑ دھولپور، سروہی اور گنگانگر کے شعراء و ادباء تک بھی ہم اپنی گزارش پہنچانا چاہتے ہیں جن کی تخلیقات کی عدم شمولیت کی ایک کمی نخلستان میں محسوس ہوتی ہے۔ ان اضلاع کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شائع کرنے کے بعد ہی ہم بجا طور پر یہ کہہ سکیں گے کہ "نخلستان" تمام راجستھان کے ادیبوں اور شاعروں کا نمائندہ جریدہ ہے۔

آج راجستھان یونیورسٹی اور اودے پور یونیورسٹی میں اردو میں پی، ایچ، ڈی کے لئے تحقیق کا کام تیزی سے بڑھ رہا ہے تحقیق کرنے والے چند حضرات کے مضامین نخلستان کے پچھلے شماروں میں

شائع بھی ہوئے ہیں جن سے راجستھان میں اردو تحقیق پر روشنی پڑتی ہے۔ ایسے تمام ریسرچ اسکالرس سے بھی ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنے موضوعات سے متعلق تحقیقی مضامین اور مقالات کی "نخلستان" میں اشاعت کے لئے قدم بڑھا کر راجستھان میں اردو تحقیق کے کام کو منظرِ عام پر لائیں۔

ہمیں اپنی اس کمزوری کا اعتراف ہے کہ محدود وسائل کے باعث ابھی تک ہم "نخلستان" میں شائع ہونے والی تخلیقات پر کوئی نذرانہ پیش نہیں کر پا رہے ہیں اگر نخلستان کی خریداری اتنی بڑھ جائے کہ اس کی طباعت کے مصارف اسی سے پورے ہو سکیں تو یقیناً ہم اس صورت میں اپنے معاون اہلِ قلم کی خدمت میں ان کی تخلیقات کے لئے نذرانہ بھی پیش کر سکیں گے۔ لہٰذا ناظرینِ کرام سے گزارش ہے کہ نخلستان کی خریداری کے اضافے میں ادارہ کی اعانت فرما کر ممنون فرمائیں۔

"نخلستان" کے پچھلے شمارے میں مالی سال ۸۲-۸۳ء۱۹ میں راجستھان اردو اکیڈمی کی خدمات پر روشنی ڈالی جا چکی ہے جس میں خطاطی کے تربیتی مرکز کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

اس مرکز کا باقاعدہ افتتاح ۳۰ مارچ ۱۹۸۳ء کو عالی جناب احمد بخش صاحب سندھی، وزیر قانون حکومت راجستھان نے فرمایا۔ اکیڈمی کے سالانہ ایوارڈ کے لئے جنرل کونسل نے مینیجنگ بورڈ کے مجوزہ حسب ذیل حضرات کے ناموں کی توثیق کی۔ جناب محمود سعیدی صاحب جناب شمیم جے پوری

اکیڈمی کی جانب سے دو ہزار روپے کے مالی تعاون سے انجمن ترقی اردو بیکانیر نے، مئی ۸۳ء کو آل راجستھان مشاعرہ منعقد کیا اور اسی موقع پر ۸ مئی ۸۳ء کو "اردو تعلیم کے مسائل" پر ایک کل راجستھان اردو سمپوزیم کا انعقاد بھی کیا گیا۔

انجمن ترقی اردو جھنجھنوں کو تعلیمی کانفرنس اور مشاعرہ منعقد کرنے کے لئے اکیڈمی نے فی ہزار روپے کی مالی امداد فراہم کی۔ نیز شعبۂ اردو راجستھان یونیورسٹی جے پور کو ایک ادبی مباحثہ کے انعقاد کے لئے ایک ہزار روپے کی مالی امداد دی گئی۔

سالِ رواں میں اردو اکیڈمی اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے میدانِ عمل میں گامزن ہے۔

ایڈیٹر

# اقبال اور مناظرِ فطرت

محمد بدیع الزماں
کنکر باغ کالونی پٹنہ ۲۰

اقبال کے علاوہ اردو شاعری میں کوئی دوسری ایسی مثال نہیں ملتی جہاں کسی شاعر نے فطرت کا معنی خیز نظروں سے عمیق مشاہدہ کر کے اپنے ہر شعر کو مناظرِ فطرت کے گل بوٹوں سے سجایا ہو اور اپنے خیالات کے اظہار کے لئے ہر آن بزم قدرت کا سہارا لے کر دقیق اور پیچیدہ نکتوں کو قاری کے ذہن نشین کرایا ہو بس منظر ہی کے لئے سہی ۔ مناظرِ فطرت سے نتیجہ اخذ کر کے کلیہ بنانے اور داخلی جذبات کی تشریح کے لئے استعمال کرنے کا کمال اقبال ہی کو حاصل ہے ۔ ان کا ہر شعر مناظرِ فطرت کے پروں کا سہارا لے کر فضا میں پرواز کرتا ہے ۔

ان کے بہت کم ایسے اشعار ہیں جن میں کوکب ، انجم ، ستارے ، تارہ ، چاند ، سورج ، قمر ، ماہ موج ، بحر ، دریا ، ندی ، بہار ، ابر ، کہسار ، سمندر ، گہر ، صدف ، گل ، کوہ ، چاندنی ، سحر ، شجر ، دشت شبنم ، شفق ، پربت ، صبح ، شام ، گردوں ، افق ، نرگس ، نرگس شہلا ، ببول ، شمشاد ، سوسن نسترن ، لالہ ، صنوبر ، سنگ ، طیور ، بجلی ، ساحل ، آب جو ، موتی ، ہوا ، ریت ، ٹیلے ، آہو ، صحرا چشمہ ، اختر ، مطلع خورشید ، غروب آفتاب ، تلاطم ، بیاباں ، فلک ، لیلیٰ شب ، ویرانہ ، گلستاں چمن ، شمس ، قمر ، گھٹا ، سبزہ ، جھاڑی ، بادل ، غنچہ ، مالی ، جو ، برق ، باغ ، بو ، گرداب ، قطرہ ، خزاں بہار ، کلی ، شعاع آفتاب ، دن ، رات ، بن ، گلزار ، نشیمن ، نہر ، موجۂ صرصر ، پانی ، کوئل ، قمری ، طوطی عندلیب ، عنادل ، کبوتر ، بلبل ، نیل ، گنگا ، راوی ، دجلہ ، فرات ، درخت ، بدلی ، وادی ، پتی ، سبزہ زار ماہ مبیں ، گہن ، سیماب ، زہرہ ، صبا اور خار وغیرہ جیسے الفاظ نہ آئے ہوں ۔

نخلستان

"بانگِ درا" کی ایک سو ستالیس نظموں میں اقبال نے خصوصی طور پر اکتیس نظموں کا عنوان مناظرِ فطرت کے ان اجزاء سے ہی دیا ہے جو خالص منظری نظمیں تو نہیں کہی جا سکتیں مگر ان کو منظری نظموں کی فہرست میں ضرور لایا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہاں بھی منظر نگاری کو اپنے فلسفہ کے اظہار کے لئے پس منظر کے طور پر ہی استعمال کیا گیا ہے۔ مگر یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ اقبال کو مناظرِ فطرت کے گل بوٹوں سے کتنا لگاؤ تھا۔ جن کے ستونوں پر وہ ہمیشہ اپنے فلسفہ کی عمارت کھڑی کرتے رہے یہی کمال کیا کم ہے۔؟

اقبال اپنے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے ان مناظرِ فطرت کے اجزاء کو تشبیہات و استعارات اور علامات و تمثیل کے طور پر استعمال کر کے شعر میں معنی آفرینی، رنگینی اور شعریت ہی پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ زندگی کے سامنے حقائق کی ترجمانی کا کام بھی لیتے ہیں جس میں ہم عصر زندگی کے سیاسی اور اخلاقی حالات اور فلسفیانہ مسائل بھی شامل ہیں۔

کبھی وہ ان کے ذریعہ نا امیدی اور یاس پر تازیانے لگا کر ولولہ اور ہمت پیدا کرتے ہیں تو کبھی باعمل زندگی کی ترجمانی کا کام لیتے ہیں۔ ان اجزاء سے جب جیسا چاہا اس طرح کام لینا، ان کا زبان پر عبور، فطرت کا غیر معمولی قوتِ مشاہدہ اور بے پناہ تجربہ اور بلند تخئیل کی بلند پروازی کو خاص دخل ہے اگر موجِ دریا کی فنا اقبال کو سفر میں قائم رہنے سے نظر آتی ہے تو آبرو کا سامان ان کو گہر کی صدف نشینی میں نظر آتا ہے غرض وہ اپنی فکری اساس کا سارا تانا بانا ان ہی چاند تاروں اور موج و دریا کے دھاگوں سے بنتے ہیں۔

اقبال وہبی شاعر تھے۔ ان میں جذبات کو ادا کرنے کا فطری ملکہ تھا۔ ان کی ذہنی قوت کی نشو و نما مناظرِ فطرت سے بڑی حد تک متاثر ہوئی اور وہ اپنے خیالات کو درمیانی منازل طے کراتے ہوئے فطرت کے ساتھ ساتھ لے چلتے رہے۔ ان ہی چاند تاروں، آفتاب و ماہتاب اور موج و دریا کا استعمال دوسرے اردو شعراء نے پہلے بھی کیا تھا۔ مگر اقبال نے ان کو وسعت بخشی، ان میں معنویت پیدا کی۔ اور ان کا خلاقانہ استعمال کیا۔

وہ مناظرِ فطرت کے ذریعہ ایک منفرد آہنگ پیدا کرتے اور فکر و نظر کو نئی بلندیوں سے آشنا کرتے ہیں وہ روایت کے نہ تو اسیر ہیں۔ اور نہ اس سے باغی۔ مگر ان چاند تاروں سے حسن و عشق، بلندیٔ خیال، جدتِ ادا، معنی آفرینی، فلسفۂ حیات اور مسائلِ حکمت و تصوف کی نئی نئی راہیں کھولتے ہیں۔

ان مناظر فطرت کے ذریعہ وہ انسانی جذبات کو حرکت میں لانے اور ان کی مثال دے کر وہ تصوف فلسفہ اور شاعری کو یکجا کر کے ایسی رچی ہوئی دلنشین معنویت اور والہانہ اندازِ سخن پیدا کرتے ہیں کہ ان کی شاعری کا بطون ان کے ظاہر شاعری سے وابستہ ہو جاتا ہے اور وہ تمام گرہیں کھل جاتی ہیں جن پر، پردہ، پڑا ہوا تھا۔ وہ مناظر قدرت کے الفاظ کے استعمال میں الفاظ کے آہنگ اور صوتی کیفیات پر خاص خیال رکھتے ہیں۔ جس سے نغمگی برس پڑتی ہے۔

اقبالؔ مناظر قدرت کے ان پیکروں سے محاکاتی فضا پیدا کر کے کہیں حرکت کی مدح خوانی کرتے کہیں سکون کی مخالفت، کہیں جدّوجہد زندگی میں انسان کے اندر آفاق گیری کے نئے ولولے پیدا کرتے تو کہیں حیات کو بے ثبات تصوّر کر کے موت کے پردے میں زندگی کے راستے دکھاتے تو کہیں ان سے وہ انسان کی قوت تسخیر فطرت کی پرزور نمائش کرتے، کہیں وہ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے سے تسخیر کے لئے آئین مرتّب کرتے ہیں۔ اور کہیں قطروں کو وصل کے آئین پر عمل کر کے دریا بننے کے نکتے نکالتے ہیں۔

اقبالؔ نے اپنی شاعری ہی منظر نگاری سے شروع کی۔ یہ بات انیسویں صدی کے آخری سالوں کی ہے۔ ہمالہ پربت میں ان کو چشم بینا کے لئے سراپا تجلی نظر آئی۔ نظم "ہمالہ" جو ان کی سب سے پہلی نظم ہے اس کے چند بندوں میں اقبالؔ کا مناظر قدرت سے دلی لگاؤ ملاحظہ ہو جس میں پیکر تراشی تمثیل نگاری اور محاکات کا کتنا لطیف امتزاج ہے :—

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے — تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے — دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لئے
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ فطرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو،،

لیلیٰ شب کھولتی ہے آکے جب زلفِ رسا — دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا — وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

بیسویں صدی ابھی شروع ہوئی ہے۔ اقبال کی اوائلِ شاعری کا دور ہے۔ مگر ان کے سوزِ دروں میں ایک ہیجانی کیفیت ہے۔ دل بجھا ہوا ہے محفل سے طبیعت اکتا سی گئی ہے نظم "ایک آرزو" میں اپنی حرماں نصیبی کا تذکرہ مناظرِ فطرت کے سہارے کس فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں۔

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں — چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا — ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا سبزے کا ہو بچھونا — شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں — ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ — پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ — پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو — سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو

اس ماحول اور پس منظر میں اقبال اپنی مقصدیت پر آتے ہیں:-

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے — تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

نظم "نمودِ صبح" میں طلوعِ آفتاب کا منظر اور اس منظر سے خوابِ گراں سے بیداری کا فلسفہ ملاحظہ ہو :-

ہو رہی ہے زیرِ داماںِ اُفق سے آشکار
صبح، یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار

پا چکا فرصت دُرودِ فصلِ انجم سے سپہر
کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار

آسماں نے آمدِ خورشید کی پا کر خبر
محملِ پروازِ شب باندھا سرِ دوشِ غبار

شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار

ہے رواں نجمِ سحر جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار

مطلعِ خورشید میں مُضمر ہے یوں مضمونِ صبح
جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار

جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

"گورستانِ شاہی" کا تذکرہ ہو یا خدا سے شکایت کا دفتر، اقبال منظر کشی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ نظم "شکوہ" میں خدا کو کھری کھوٹی سنا چکنے کے بعد اقبال پر عاجزی غالب آتی ہے اور وہ عجز و انکسار سے آرزومند ہیں کہ :-

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن

عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن
اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قُمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں

وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

---

جب اقبال کا نالۂ بے باک یعنی خدا سے شکوہ آسمان چیر گیا تو عرش پر کھلبلی مچی کہ یہ آواز کہاں سے آئی - ذرا چاند تاروں کی زبان میں عرش والوں کا حال، "نظم" "جوابِ شکوہ" میں سنیئے! جہاں اقبال نے جذبات و تخیل کو فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچا دیا ہے -

پیر گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی　　بولے سیارے سرِ عرشِ بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا، نہیں اہلِ زمیں ہے کوئی　　کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو، تو رضواں سمجھا
مجھ کو جنت سے نکالا ہوا، انساں سمجھا

اور جب خدا نے سارا قصور مسلمانوں ہی کا ٹھہرا - اور :-

ع　　میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

والی بات ہو گئی - تو اقبال کو احساس ہوا - کہ مسلمان کہیں ناامیدی اور حرماں نصیبی کے شکار نہ ہو جائیں تو پھر گل بوٹوں کی زبان میں انھیں ڈھارس بندھائی - چند بند ملاحظہ ہوں

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی　　کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی　　گل بر انداز ہے خونِ شہداء کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

شل بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا　　رخت بر دوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا　　نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کر دے

اب اسی نظم میں ذرا گل و بلبل کی زبان میں اقبال کا نذرانۂ عقیدت بحضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ملاحظہ ہو - :-

ہو نہ یہ پھول، تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو     چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
نہ یہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو     بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا اِستادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

---

دشت میں دامنِ کہسار میں میدان میں ہے     بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں ہے     اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے

---

اقبال خدا کے حضور میں جب بھی حاضر ہوتے ہیں تو وہی چاند تارے، موج و دریا، اور صدف و گوہر کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں اگر ایک طرف انتہائی عجز و انکسار اور سپردگی ہے تو دوسری طرف حجابِ ناز بھی۔:-

---

تو ہے محیطِ بے کراں، میں ہوں ذرا سی آبجو     یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بے کنار کر
میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو     میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر

---

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو     یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے
زوالِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں     کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

---

تو میری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

---

تجھ سے گریباں مرا، مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ھو

---

دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دل ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

نظم "فلسفۂ غم" میں اقبال شروع میں موت کے تابناک اور روشن پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کی فطرت کو کمال، حادثاتِ غم ہی کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ غم کا داغ سینہ کو روشن کرتا اور روح کو سامانِ زینت بخشتا ہے۔ جوانی کو لطفِ خواب سے جگاتا اور دل کے رازوں کا انکشاف کرتا ہے۔

پھر مندرجۂ ذیل بند میں اقبال موت و حیات کے اسرار و معارف کو دلنشیں کرانے کے لئے مناظرِ فطرت کا سہارا لیتے ہیں جس میں ان کے عمیق مشاہدے اور بلندیٔ تخیل کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیمابِ رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی
پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

اور موت کے فلسفہ کا لبِ لباب بھی مناظرِ فطرت ہی کی مثال دے کر اس نظم کو یوں ختم کرتے ہیں

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

قربان جائیے ان اشعار کے استعارات و تشبیہات پر، موت کے نفسیاتی پہلو کے علاوہ زندگی کو ندی سے تعبیر کرنا جو آسمان کی بلندی سے نغمۂ سرود پیدا کرتی ہوئی نیچے اترتی ہے اور گر کر صاف آئینہ کی شکل بن جاتی ہے جس کے سائے سے رخسارِ حور بھی شرمندہ ہے اور پھر اس آئینہ کا چٹان پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا اور قطرے بن کر تابدار موتیوں کی شکل میں تبدیل ہو جانا اور پھر موت و حیات میں صرف دو قدم کا فاصلہ رہ جانا۔ کیا اردو شاعری میں کوئی ایسی مثال دی جا سکتی ہے؟ جہاں منظر نگاری کے پردے میں کسی شاعر نے علم النفس اور فلسفۂ حیات کا اتنا لاجواب انکشاف کیا ہو۔

دوسری نظم "کنارِ راوی" ہے جس میں اقبال نے زندگی جاوداں کے مضمرات اور اس کی کشاکش کو بحیثیت مقصود بیان کیا ہے۔ دریائے راوی کا شام کا منظر پیش نظر ہے۔ شام کا مکمل سکوت ہے ایک سفینۂ تیز سینۂ دریا پر رواں ہے۔ ملاح موج سے سرگرم ستیز ہے کشتی بہت سبک رو ہے۔ اور جلد ہی حلقۂ نظر سے دور ہو جاتی ہے۔

"کنارِ راوی" سکوت شام کا منظر ملاحظہ ہو :۔

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام　　لئے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام

عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا

کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی　　منارِ خواب گہِ شہسوارِ چغتائی

مقام کیا ہے سرودِ خموش ہے گویا
شجر! یہ انجمن بے خروش ہے گویا

دوسرے بند میں زندگی کی کشمکش اور موت و حیات کو پھر مناظرِ فطرت کے سہارے اس طرح رقم کرتے ہیں :۔

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موج سے ملاح جس کا گرم ستیز

گلستان

سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دُور گئی

اس پس منظر میں ایک سبک رو کشتی کا رواں ہونا، اور دریا میں ملّاح کا موج سے گرم ستیز رہنا زندگی کی مشکلات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کی سبک روی زندگی کی مشکلات پر قابو پانے اور رواں دواں رہنے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور پھر حلقۂ حدِ نظر سے اس کا دور ہو جانا انسان کو موت کا شکار ہو جانا بتاتا ہے۔

ایسے مناظر سے اقبال یہ نکتہ نکالتے ہیں :-

جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہی — ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" موت کے ہاتھوں مجبوری اور بے چارگی کا اظہار بھی ہے اور پھر حیاتِ ابدی کا سرود بھی ــــ! ہوا کا سطحِ آب پر بے شمار حباب تعمیر کرنا اور اپنے ہی جھونکوں سے انھیں مٹا دینا۔ اور دوبارہ پھر سطحِ آب پر بے شمار حباب تعمیر کرنا انسان کی زندگی کے تسلسل اور ہوا کے قوت کی ارزانی، اور اس کا اس آزادی سے متعرف ہونے کا نقشہ اقبال نے مناظرِ فطرت کے سہارے یوں کھینچا ہے :-

آہ! غافل موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے — نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے
جنتِ نظارہ ہے نقشِ ہوا بالائے آب — موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب
موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ — کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ
پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا — توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا
اس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر — یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر
فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

نظم "گورستان شاہی" میں بھی وہی حیات و موت کے اسرار و رموز کی ایک طویل بحث ہے۔ نظم کے شروع میں گورستان کی خاموشی ملاحظہ ہو جس پس منظر میں وہ آگے کے بندوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:۔

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے
کچھ مکدّر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے

چاندنی پھیکی ہے اس نظّارۂ خاموش میں
صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی
بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

باطنِ ہر ذرّۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے

پھر موت و حیات کے پیچیدہ نکتوں پر منظر نگاری اور پیکر تراشی کا ملا جلا امتزاج اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا، اڑ گیا
آہ! کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم؟ کیا گئے
زندگی کی شاخ سے پھوٹے کھلے، مرجھا گئے

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

شاہوں کی یہ خواب گاہ ناکامی کی ایک مکمل تصویر ہے یہی حشر قوموں کا بھی ہوا کرتا ہے اور مسلم قوم بھی اس زیاں خانے میں بربادی سے نہ بچ سکی۔ مگر چونکہ اقبال کو نومیدئی زوال علم و عرفاں تھی اس لئے اس ناکامی سے وہ ملّت مسلمہ کے لئے تابندہ پہلو نکالتے ہیں۔ موت کے پردے میں انھیں زندگانی کی تڑپ نہاں دکھائی دیتی ہے۔ اس تابندہ پہلو کا اظہار مناظرِ فطرت سے وہ اس طرح کرتے ہیں

ہے رگِ گُل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی
کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے الجھی ہوئی

نخلستان

سینۂ دریا شعاعوں کے لئے گہوارہ ہے — کس قدر پیارا لبِ جُو مہر کا نظارہ ہے
محوِ زینت ہے صنوبر، جوئبار آئینہ ہے — غنچۂ گل کے لئے بادِ بہار آئینہ ہے
نعرہ زن رہتی ہے کوئل باغ کے کاشانہ میں — چشمِ انساں سے نہاں پتوں کے عزلت خانہ میں
اور بلبل مطربِ رنگیں نوائے گلستاں — جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں
باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں — وادیٔ کہسار میں نعرے شباں زادوں کے ہیں
پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح — دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

اقبال کے یہاں زندگی، کوششِ پیہم کا نام ہے جس کو نہ کہیں ثبات ہے نہ قرار، رازِ حیات کے فلسفہ کو نظم "کوششِ ناتمام" میں ان ہی مناظرِ قدرت کے پیکروں سے اس طرح رقم کرتے ہیں :—

فرقتِ آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تاب صبح — چشمِ شفق ہے خوں فشاں اخترِ شام کے لئے
رہتی ہے قیس روز کو لیلیٔ شام کی ہوس — اخترِ صبح مضطرب تابِ دوام کے لئے
کہتا تھا قطبِ آسماں قافلۂ نجوم سے — ہمرہو! میں ترس گیا لطفِ خرام کے لئے
سوتوں کو ندیوں کا شوق، بحر کا ندیوں کو عشق — موجۂ بحر کو تپش ماہِ تمام کے لئے
حسنِ ازل تو پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں — کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لئے

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

نظم "شاعر" میں اقبال کا کہنا یہ ہے - کہ :—

شاعرِ دلنواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری

مگر اس کا پس منظر ملاحظہ ہو جس میں جوشِ عمل اور تعلیقِ جستجو کے نکتوں کے لئے بزمِ قدرت کے

گل بوٹوں کو استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے :—

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے ۔ پی کے شراب لالہ گوں میکدۂ بہار سے

پھرتی ہے وادیوں میں کیا دخترِ خوش خرام ابر
کرتی ہے عشق بازیاں سبزۂ مرغزار سے

اور اس نظم کا آخری شعر، قربان جائیے مناظرِ فطرت کے ذریعہ طرزِ اظہار پر :—

گلشنِ دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

اقبال کے اندازِ بیان کی ایک خوبی اس کی ڈرامائی پیشکش ہے وہ زیادہ تر پیچیدہ نکتوں کے اظہارِ خیال کے لئے ہی یہ طرز اپناتے ہیں۔ مگر ہر ایسے مکالمہ کا پس منظر وہ مناظرِ فطرت سے قائم کرتے ہیں۔ اور یہ مناظر ان کے ایسی نظموں کے فلسفہ کا prologe ہوتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک، عشق بقا کا، اور موت فنا کا مظہر ہے۔ نظم عشق اور موت میں منظر نگاری محاکات، تخیل، اور حسنِ بیان کا لطیف و حسین امتزاج ملاحظہ ہو :—

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی ۔ تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاجِ زر مل رہا تھا ۔ عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے ۔ ستاروں کو تعلیمِ تابندگی تھی
کہیں شاخِ ہستی کو لگتے تھے پتے ۔ کہیں زندگی کی کلی پھوٹتی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا ۔ ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی
عطا درد ہوتا تھا شاعر کے دل کو ۔ خودی تشنہ کامِ مئے بیخودی تھی
اٹھی اول اول گھٹا کالی کالی ۔ کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی

زمیں کو تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں
مکاں کہہ رہا تھا کہ میں لامکاں ہوں

نخلستان ۔

اس پس منظر میں عشق کا فرشتہ موت کے فرشتے سے ہم کلام ہے جہاں عشق کا فرشتہ موت کے فرشتہ پر غالب آجاتا ہے۔

ایک مختصر سی نظم "ایک شام" میں، دریائے نیکر (ہائیڈل برگ۔ جرمنی) کے کنارے کا منظر ہے۔ منظر نگاری کے ساتھ ساتھ مرقع کشی اور ڈرامائی انداز ملاحظہ ہو:۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی — شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش — کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے — آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے — نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے — یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا

اقبال کو تو اپنے دل کا فسانہ سنائے بغیر چین نہیں تھا۔ خواہ وہ ہمالیہ پہاڑ سے مخاطب ہوں۔ یا نیکر کے شام کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ چنانچہ وہ اسی نظم کے آخر میں اپنے دل کا فسانہ اس طرح سنا گئے:۔

اے دل تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

نظم "بزم انجم" میں اقبال، تاروں کی زندگی سے ربطِ ملت کا نکتہ پیش کرنا چاہتے ہیں تو پہلے غروبِ آفتاب کا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو — طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور — قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی — چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے

وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے
کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں تارے

اتنے میں عرش بریں سے ایک فلک تاروں سے یوں مخاطب ہوتا ہے :-

چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے
رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمھاری

اس کے بعد ایک نوا آسمان کی وسعت کو اس طرح معمور کرتی ہے :-

وہ حسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں | جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم | داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے | جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں "

اسی ربطِ ملت کے نکتہ کو موج و دریا کے استعارے سے اقبال نے دوسری جگہ اس طرح واضح کیا ہے :-

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبال زیادہ تر اپنی قوم، اپنے ملک، بلکہ ساری انسانیت کے زوال کا راز مناظرِ فطرت ہی سے ہمیشہ پوچھتے ہیں۔ کہیں وہ چاند سے مخاطب ہیں تو کہیں سورج سے، کہیں تاروں سے ہمکلام ہیں تو کہیں سکونِ شام سے سرگوشی کر رہے ہیں، کہیں ہمالہ کو آواز دے رہے ہیں۔ تو کہیں دریا اور موجوں سے سرگرمِ گفتگو ہیں۔ اس لئے کہ قدرت نے ان سارے پیکروں میں ان کو جاودانی پیہم رواں، ہر دم جواں ہے۔ زندگی کا راز مضمر نظر آتا ہے۔ بقا و فنا کے رازہائے سربستہ کے نکتے وہ انھیں کے مشاہدے سے نکالتے ہیں۔

نظم "انسان اور بزمِ قدرت" میں خورشیدِ درخشاں سے اقبال یوں مخاطب ہیں:۔

پرتوِ مہر کے دم سے ہے اجالا تیرا | سیمِ سیّال ہے پانی ترے دریاؤں کا
مہر نے نور کا زیور تجھے پہنایا ہے، | تیری محفل کو اسی شمع نے چمکایا ہے،
گل و گلزار ترے، خلد کی تصویریں ہیں | یہ سبھی سورۂ والشمس کی تفسیریں ہیں
سرخ پوشاک ہے پھولوں کی درختوں کی ہری | تیری محفل میں کوئی سبز کوئی لال پری
ہے ترے خیمۂ گردوں کی طلائی جھالر | بدلیاں لال سی آتی ہیں افق پر جو نظر
کیا بھلی لگتی ہے آنکھوں کو شفق کی لالی | مئے گل رنگ خمِ شام میں تو نے ڈالی

رتبہ تیرا ہے بڑا، شان بڑی ہے تیری
پردۂ نور میں مستور ہے ہر شے تیری

اس پس منظر میں اقبال اپنی زبوں حالی کی وجہ پوچھتے ہیں:۔

میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں مگر
جل گیا پھر مری تقدیر کا اختر کیوں کر

اس کا جواب انھیں کہیں سے ملا :۔

انجمن حسن کی تو ہے، تری تصویر ہوں میں | عشق کا تو ہے صحیفہ تری تفسیر ہوں میں
تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے

اقبال، مثنوی "ساقی نامہ" میں خدا سے مئے پردہ سوز پلائے جانے کے آرزومند ہیں۔ ایسی مے جس سے ضمیرِ حیات روشن ہوتا ہے اور جس سے کائنات پر مستی چھا جاتی ہے۔
اقبال اپنے دل کی امنگوں اور ولولوں کے اظہار کے لئے میخانہ کا پس منظر مناظرِ فطرت سے تیار کرتے ہیں۔ اس منظر نگاری کی پیش کش کا ڈرامائی انداز ملاحظہ ہو جس منظر کشی میں گویا حروف میں کو لعل و جواہر نظر آنے لگتے ہیں:۔

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار ، ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن ، شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور ، ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی ، اٹکتی ، لچکتی ، سرکتی ہوئی
اچھلتی ، پھسلتی ، سنبھلتی ہوئی ، بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ ، پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز ، کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز
وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات ، وہ مے جس سے ہے مستیِ کائنات

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اس پس منظر میں اقبال نے خودی اور حیات و موت جیسے پیچیدہ نکتوں پر گہر افشانی کی ہے

دما دم رواں ہے یمِ زندگی ، ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے ، یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول ، اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور ، کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور
کہیں جرۂ شاہینِ سیماب رنگ ، لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

اقبال نے مسلسل غزلوں میں بھی پس منظر کے طور پر منظر نگاری کی ہے ۔ ایک مشہور غزل —— "من کی دنیا تن کی دنیا" میں حسنِ بے پردہ کا پس منظر ملاحظہ ہو :۔

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے دشت و دمن      مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حُسنِ بے پروہ کو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

اقبال نے تمثیل نگاری میں بھی مناظرِ قدرت کی مثال دے کر اپنے تخیّل کی بلند پروازی اور ان کے عمیق مشاہدہ کا ثبوت دیا ہے۔ عشق کی تمثیل نگاری ملاحظہ ہو۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیٔ سیمینِ قمر — نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا آنچل لے کر — چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم — موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا

("حسن و عشق")

حسنِ ازل کی تمثیل نگاری مناظرِ قدرت کے پیکروں کو چن چن کر اس طرح کرتے ہیں :۔

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن — آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
حسن، کوہستاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے — مہر کی ضوگستری شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ — شام کی ظلمت شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
چشمۂ کہسار میں دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں آبادی میں حسن

("بچہ اور شمع")

حسن ازل پر چند اور اشعار جو چاند تاروں کی زبان میں پیش کئے گئے ہیں :۔

تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہِ سحر میں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں
بلندی آسمانوں میں زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں افتادگی تیری کنارے میں

نظم "جگنو" میں قدرت کی دلبری، پروانہ کی تپش اور جگنو کی روشنی پیش کر چکنے کے بعد آخری بند میں پھر حسنِ ازل کا نکتہ تخیل اور فکر کے حسین امتزاج سے چاند تاروں اور گل و بلبل سے نکالا ہے:۔

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا، شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

نظم "ماہِ نو" کے ایک بند میں خالص منظر نگاری، خوبصورت اور نادر تشبیہات و استعارات کا شاعرانہ اندازِ بیان ملاحظہ ہو:۔

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

اقبال کی مشہور نظم "خضرِ راہ" ہے اقبال شہیدِ جستجو ہیں۔ دل کے سب سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ کہیں سے امید کی کوئی کرن نہیں پھوٹتی۔ ساحلِ دریا پہ اک رات محو نظر ہیں ساحلِ دریا کا منظر اور اس کی مصوری و پیکر تراشی ملاحظہ ہو:۔

سرِ ساحل دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب

رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجمِ کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب

اس پس منظر میں :-

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل
چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

خضر سے انھوں نے اسرارِ ازل پر بہت سے سوالات کئے ان کا جواب مناظرِ قدرت ہی کی زبان میں ان کو ملا :-

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل

وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیریِ کشت و نخیل

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

اقبال کسی کو خراجِ عقیدت بھی پیش کرتے ہیں تو اس کی عظمت کا بیان مناظرِ قدرت ہی کے ذریعہ کرتے ہیں :-

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار — جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیّل سے ہے قدرت کی بہار — تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ زار

("مرزا غالب")

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے آب تو — پہلے گوہر تھا بنا اب گوہرِ نایاب تو
نغمۂ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا — لَا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلّا اللہ کا

("سوامی رام تیرتھ")

شفقِ صبح کو دریا کا خرام، آئینہ — نغمۂ شام کو خاموشیٔ شام، آئینہ
برگِ گل آئینۂ عارضِ زیبائے بہار — شاہدِ مے کے لئے حجلۂ جام، آئینہ
حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن — دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام، آئینہ

("شیکسپیر")

الغرض اقبال نے مناظرِ فطرت کے ان اجزاء کے ذریعہ روح میں بالیدگی، طبیعت میں جودت و تازگی، مزاج میں گرمی، احساس میں صداقت، نظر میں تنویر اور باہمی تعلقات میں محبت و اخوت پیدا کرنے کا کام لے کر فکر اور جذبہ کی آمیزش سے ایک ابدی کیفیت پیدا کی۔ وہ شعاعِ آفتاب سے حرارت لیتے چاند سے ٹھنڈک اور تنویر کے عناصر فراہم کرتے، برق اور موجوں سے دائمی تڑپ، اضطراب اور بے قراری و اضطراب کے استعارے وضع کرتے، ستاروں سے دلبری اور تبسم، آبشاروں سے زندگی اور موسیقی، چمن سے پھولوں کی نکہت، غنچہ سے چٹک اور پھولوں کی مہک اخذ کرتے شفق سے لالی، لالہ سے داغِ جگر اور شبنم سے رفعتِ پرواز کا اشارہ پاتے، خرامِ دریا سے ارتعاش اور حیرت کے تاثرات پیدا کرتے ہیں۔

ان تمام چیزوں کے اجزائے ترکیبی سے انھوں نے جو اشعار وضع کئے ہیں انھیں حیاتِ انسانی کا واقعی ترجمان بنا دیا ہے۔

ان مناظرِ فطرت کے پیکروں کے ذریعہ اقبال نے خدا اور خدا کے بندوں کی تلاش کا کام لیا ہے۔ ملاحظہ ہو:—

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی

---

بقول ڈاکٹر اختر اورینوی

"آقبال کی منظری نظموں کی زبان گنگا جلی ہے ایسی پیاری گنگا جمنی زبان استعمال کی ہے۔ کہ اس کی مٹھاس لبِ ذوق پر ہمیشہ رہتی ہے۔"

(از کتاب "مطالعہ و محاسبہ")

● ●

---

## جناب فراق گورکھپوری کی جے پور آمد پر

جناب مولانا قمر واحدی
جے پور

بہت دنوں سے قمر ان ہماری آنکھوں کو
یہ آرزو تھی کہ دیکھیں کبھی جمالِ فراق
خدا کا شکر کہ اب آرزو ہوئی پوری
زہے نصیب کہ حاصل ہے اب وصالِ فراق

# فراق مجموعۂ اضداد

سید عبدالباری

یادش بخیر —! آج سے پچیس سال قبل جب پاکستان کے مشہور نقاد محمد حسن عسکری کی کتاب "انسان اور آدمی" منظر عام پر آئی تو اس کی بہت سی چونکا دینے والی باتوں نے بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے بھی کشاں کشاں اپنے کرم فرما حیرت شملوی مرحوم کے یہاں اس نادر کتاب کی جستجو میں حاضری دی۔

رام پور کے اس خوش مزاج اور خوش فکر شاعر کے یہ الفاظ اب تک کانوں میں گونج رہے ہیں —— کہ :—

> "لیجئے! کتاب حاضر ہے —! مگر یہ خیال رکھئے گا۔ کہ عسکری صاحب فراق کے بہت مدّاح ہیں۔ بلکہ فراق زدہ، اگر شاعر ہوتے تو شاید فراقی تخلص ہوتا —— "

اس وقت میں حیرت صاحب کے اس تبصرے سے کچھ بدمزہ ہوا تھا۔ مگر "انسان اور آدمی" کے مطالعہ سے اس میں زیادہ مبالغہ محسوس نہیں ہوا۔

عسکری صاحب کے خیال میں اس وقت تک یعنی (اشاعتِ انسان اور آدمی تک) اردو غزل کا جو ارتقا ہوا تھا وہ بیشتر فی ... فراق کا مرہونِ منت تھا۔ انھوں نے فراق کے پہلو دار اشعار ان کی فکر کی رفعت اور ان کی زبان کی گھلاوٹ اور رسیلے پن کو خوب خوب سراہا تھا۔ ان کے خیال میں ہجر و وصال کی نفسیات پر جتنے پہلوؤں سے فراق نے نظر ڈالی ہے اور اس کی نفسیات

کو جس طرح شعریت میں تبدیل کیا ہے وہ اردو کی بڑی سے بڑی شاعری میں نہیں بلکہ انھوں نے "مغرب کے ادب سے پہلو ماری ہے۔"

آخر میں فراق کو عسکری صاحب نے یہ سند بھی عطا کی تھی۔ کہ:۔

"فراق نے نئی نسل کے شعور میں ایک زبردست تبدیلی پیدا کی ہے۔ ہمیں عشقیہ زندگی کی نئی اقدار دی ہیں۔ اور ہمیں واقعی عشق کرنا سکھایا ہے۔ یہ فراق کا سب سے بڑا احسان ہے کہ انھوں نے جنسی کشش کو زندگی اور شعور کے پورے نظام میں وہ جگہ دی ہے جہاں یہ جذبہ دوسرے عناصر سے علیحدہ نہیں بلکہ سب کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر عمل کر سکے۔"

مجھے عسکری صاحب کی رائے سے اختلاف تھا۔ مگر وہ کوئی معمولی انسان نہ تھے کہ ان کی رائے کو میں نظر انداز کر دیتا۔ میں نے فراق کے دورِ اوّل کا کلام جو ۱۹۲۶ء تک محیط ہے غور سے دیکھا تو اس میں کئی گوہر شب چراغ ملے۔ پھر دوسرے دور کی طرف مڑا تو لعل ہائے گراں مایہ کا ڈھیر لگ گیا۔ اور بیسویں صدی کے غزل کے چار ارکین میں ایک اور کا اضافہ کرنے پر طبیعت خود بخود آمادہ ہو گئی۔

فراق کے فکر و فن کی مختلف تہیں جوں جوں کھلتی گئیں ان کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کا راستہ میرے لئے کچھ آسان ہوتا گیا۔ لیکن اس منزل تک میں اب بھی نہیں پہنچ سکا جہاں تک فراق شناسی میں عسکری صاحب کی رسائی ہے۔

فراق دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ دنیا جو ان کے لئے بیحد کربناک بھی تھی۔ اور بے حد دلکش بھی اب شاید ان کے مرتبے کی صحیح تعیین کا وقت آگیا ہے جب کہ ہر طرح کی مروّت، مصلحت، اندیشہ اور لحاظ سے بے نیاز ہو کر کوئی بھی شخص ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔

فراق کی زندگی میں ان کے کلام کے معروضی مطالعہ کی گنجائش خاطر خواہ نہ تھی)۔ اس میں سب سے بڑا روڑہ خود فراق صاحب ہی تھے انھوں نے اردو شعر و ادب کی اس قدر جی جان سے خدمات انجام دی تھیں۔ کہ ان کے بارے میں تحلیل و تنقید کا ہر نشتر ناکارہ ہو جاتا تھا۔ کچھ تو لوگوں کو ان کے دل کے نازک

آبگینے کا بہت پاس و لحاظ تھا۔ کچھ ان کی پہاڑ جیسی انا سے ٹکرانے کی زحمت کوئی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ بقول ظ۔ انصاری، ان کو اپنے آپ سے بے پناہ محبت تھی وہ کسی معاملے میں اپنے آپ کو کسی سے کمتر ماننے پر تیار نہ تھے۔ ان کے اسی ادّعا کی وجہ سے کچھ لوگوں کو ان کے فنکارانہ خلوص پر شک ہوتا تھا۔ لیکن برصغیر میں ان کے کلام کی جو پذیرائی ہوئی پھر عسکری صاحب جیسے جہاندیدہ نقادوں نے جب ان کو میر کا کنٹینر container بنا کر پیش کیا۔ بلکہ یہ بھی کہہ گئے۔ کہ فراق کے بعض مطالبات میر سے بھی پورے نہیں ہونے تو پھر فراق کی انا کو دیو قامت بننے میں کیا رکاوٹ ہوسکتی تھی۔

بہر حال میرے اندر فراق کی عظمت کے اس رازِ سربستہ کے جاننے کی خواہش تھی۔ جو "انسان اور آدمی" کے مطالعے سے سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہوا تھا۔ کہ دو سال قبل عسکری صاحب کے ایک سلیم الطبع نیازمند سلیم احمد کی ایک تحریر نظر سے گزری انھوں نے یہ تشریح فرمائی۔

"عسکری صاحب کے خیال میں شخصیت کے لئے ایک مرکز ضروری ہے جس کے ذریعے شخصیت میں ہم آہنگ ترقی کا امکان پیدا ہوتا ہے چنانچہ وہ ایسے شاعروں کو پسند کرتے ہیں جو زندگی کے متنوع تجربات کو ایک مرکز پر لانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جو غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو ملا کر اپنا غم بنالیں اور اس اپنے غم سے مراد وہ تخلیقی درد ہے جو انسانی ہستی اور انسانی تفتیش کا ذریعہ بنتا ہے اور جس میں کائنات کا غم و نشاط بن جانے کی قوت اور گہرائی موجود ہوتی ہے۔

دنیا کے عظیم شعراء ڈانٹے، جیاسر، شیکسپیر اور جیمز جوائس کے یہاں وہ (عسکری صاحب) اس تخلیقی درد کو کارفرما دیکھتے ہیں۔ اردو شعراء میں یہ تخلیقی درد ان کے نزدیک میر و فراق کے یہاں موجود ہے۔ فراق کسی ماورائی طاقت کے بغیر خود اپنے خارجی اور داخلی عمل سے اپنے وجود کے الم کو خوشی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اور اس معاملے میں ان کو میر پر برتری حاصل ہے۔

مزید برآں فراق عسکری صاحب کے خیال میں اپنی ہستی کو کائنات میں سمونے اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ ان کے محبوب کی طرح ان کی کائنات بھی اردو شاعری میں نئی چیز ہے۔"

سلیم احمد کی ان تشریحات سے عسکری صاحب کے فراق پر خیالات کی وضاحت ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ فراق صاحب کی شاعری میں کچھ اور پہلو آپ کو تلاش کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو وہ بھی واضح ہو سکتی ہے۔ مگر اسی پیمانہ پر جب ناپنے کی کوشش کی تو فراق و جگر کی تخصیص باقی نہیں رہتی بلکہ اردو کے بہت سے شعراء، اپنے وجود کے الم کو نشاط سے تبدیل کرتے اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے یہاں وہ تخلیقی درد بھی محسوس ہوا جس میں کائنات کا غم نشاط بن جانے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور غم جاناں و غم دوراں کو اپنا غم بنا لینے کی روایت اردو شاعری میں بہت پرانی نظر آئی۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے شعراء کو چھوڑتا ہوا میں ولی دکنی تک جا پہنچا۔ جب اردو غزل ابھی اپنے عہد طفلی میں تھی۔ وہاں بھی مجھے ایک وسیع الاطراف غم، ایک رنگ نشاط اور مسکرانے کا حوصلہ نظر آیا۔ وہاں بھی ایک دل نواز محبوب کی تصویر دکھائی دی۔ اور جمالِ کائنات کے مشاہدے کا شوق کارفرما نظر آیا۔ ؎

اے نورِ جان و دیدہ کہ ہے انتظار میں
مدت ہوئی پلک سوں پلک آشنا نہیں

گل و بلبل کا گرم ہے بازار     اس چمن میں جدھر نگاہ کرو
سفرِ عشق کا اگر ہے خیال     ہمت دل کو زادِ راہ کرو

ہرگز ولی کے پاس تم باتاں وطن کی مت کرو
جو نیہہ کے کوچے میں ہے اس کو وطن سوں کیا غرض

آشنائی نہیں تو جاتا ہوں     کیا کروں دل اداس ہوتا ہے
زندگی جام عیش ہے لیکن     فائدہ کیا اگر مدام نہیں

فراق کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوا کہ وہ ایک اچھے فن کار ہیں۔ اور "ستارہ می شکنند آفتاب می سازند" کا آرٹ انھیں بخوبی آتا ہے لیکن وہ ضربِ کاری اور نگاہِ بیدار دونوں سے محروم ہیں۔ تاہم آنچ اور نرمی و گھلاوٹ کا ذوق انھیں ضربِ کاری سے محروم کر دیتا ہے اور نگاہ بیدار وہ اس وجہ سے حاصل نہ کر سکے۔ کہ مشرق و مغرب کے افکار و نظریات کو پوری طرح ہضم کرنے کے بعد کسی منفرد نظامِ فکر کی تشکیل اور حیات

وکائنات کے بارے میں کسی قطعی نقطۂ نظر تک پہنچنے کے لئے جس بھاری بھرکم ذہن، جس مستعد دماغ اور جس بے کراں خلوص کی ضرورت تھی۔ بدقسمتی سے فراقؔ اس سے محروم تھے۔ کبھی کبھی تو وہ ایسے ذہنی امراض اور فکری تعصبات کا شکار ہو جاتے تھے۔ کہ جو ان کے دائرۂ فکر ونظر کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا موجب ہو سکتا تھا۔

فراقؔ صاحب نے اسلام کے تہذیبی کارناموں کے اعتراف، مسلم مفکرین اور صوفیاء سے استفادہ کے باوجود آج سے ربع صدی قبل، لاہور کے "نقوش" میں اسلام اور ادب پر ایک ایسی بحث چھیڑ دی تھی جو اہلِ علم کو حیرت میں ڈالنے والی تھی۔ وہ ایک تاریخ ساز نظریۂ حیات کو ایک قوم کا داخلی اور ذاتی معاملہ قرار دے کر ادب اور آرٹ کو اس سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ جب کہ ان کو مارکسی نظریہ، اس ملک کے قدیم تہذیبی تصورات اور مغرب کے جدید فلسفیانہ افکار سے شعروادب کی اثر پذیری کو تسلیم کر لینے میں کوئی تامل نہیں تھا۔

ہمارے خیال میں فراقؔ کا ذہنی ارتقاء، ان کی تخلیقی زندگی کے دورِ اوّل کے بعد رک گیا۔ اس دور میں وہ حسرتؔ، اصغرؔ اور اقبالؔ سے نمایاں طور پر متاثر تھے اور اس ملک کو صحت مند تہذیبی روایات، تعمیری اقدار اور انسان وکائنات کے بارے میں ایک واضح نقطۂ نظر کے حامل تھے۔

اس صدی کی پانچویں دہائی میں ملک کی تقسیم کے بعد جب زبانیں اور نظریات بھی تقسیم ہو گئے اور نئی فکری کشمکش کا آغاز ہوا۔ نئے سیاسی حالات نئے نئے تعصبات کو برگ وبار لانے کے مواقع فراہم کئے۔ اور ایک طرف قرونِ مظلمہ سے رشتہ استوار کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ تو دوسری طرف مادہ پرستانہ افکار اندھا دھند در آمد کئے گئے۔ بہت سی مانوس قدریں اجنبی، ہمہ گیر اور بہت سے نامانوس خیالات کے خاطر چراغاں کیا گیا۔ اس فتنہ وآشوب کے دوران فراقؔ صاحب بھی اپنی فکر کی سلامت روی کو برقرار نہ رکھ سکے۔

ان کے دورِ اول کے مجموعۂ کلام "شبنمستان" کو دیکھئے کہ ایک طرف تصوف کے دل نواز خیالات ان کے ذہن ودماغ کے دریچوں سے روشنی کی کرن بن کر پھوٹ رہے ہوں گے دوسری طرف حسن کا ایک ارضی تصور ان کی شریانوں میں لہو بن کر دوڑ رہا ہوگا۔ ان کے اس دور کے کلام کے پردے سے اصغرؔ و حسرتؔ جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ؎

نخلستان

کچھ مضطرب سی عشق کی دنیا ہے آج تک — جیسے کہ حسن کو نہیں دیکھا ہے آج تک
مدت ہوئی کسی کو مٹے کوئے یار میں — اک ناتواں غبار سا اٹھتا ہے آج تک

دوسرا شعر ہمیں بے ساختہ اصغر کے اس دلکش شعر کی یاد دلاتا ہے :-

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے — غبار قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

آگے ملاحظہ فرمائیں :-

غم دوراں کا بس نام آگیا تھا باتوں باتوں میں — فراق اہل وفا سے وہ نظر ہے بدگماں اب تک

حریف خضر تھا ہر مست بادۂ عرفان
دلیل راہ مگر اک چراغ بھی نہ ملا

غرض اس عہد کے معروف غزل گو شعراء سے وہ ذہنی طور پر بھی قریب ہیں اور ان کے اسلوب بیان پر بھی اس دور کے مقبول لب و لہجہ کی چھاپ نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اپنا ایک منفرد وجود بھی رکھتے ہیں اور اپنے فکر و فن کی ایک الگ دنیا بھی بناتے ہیں۔ وہ ایک طرف لذت تخشش بادۂ کہن بھی ہیں اور دوسری طرف دلوں میں کروٹیں لینے والے جذبۂ انقلاب کے بھی ترجمان ہیں۔ اس دور میں وہ تنہا سے حسن و جمال میں زیادہ دیر ٹھہرنا نہیں چاہتے اور وصال کو منتہائے نظر بھی نہیں بنانا چاہتے۔

اردو شاعری میں اس صحتمند رجحان کی پرورش اس دور کے بہت سے روشن خیال شعرا نے کی تھی اور اس کے ڈانڈے سرسید کی علی گڑھ تحریک سے جا کر ملتے تھے۔ جو اردو ادب میں زندگی کی گتھیوں کو ناخن عقل سے کھولنے اور حریم دل کی پاسبانی کے لئے ایک بیدار شعور کو مقرر کرنے کی قائل تھی۔ چنانچہ فراق کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں — وہی انداز جہان گزراں ہے کہ جو تھا
آنکھ جھپکی کہ ادھر ختم ہوا روز وصال — پھر بھی اس دن پہ قیامت کا گماں ہے کہ جو تھا

آج بھی آگ وہی ہے دل انساں میں فراق،
آج بھی سینوں میں اٹھتا وہ دھواں ہے کہ جو تھا

خیال کو بے اثر نہ سمجھو، عمل کی چنگاریاں ہیں اس میں
کہ آج ظلمت سرائے دل میں جو نور ہے، کل وہ نار ہوگا

ترا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست ، وصال کو مری دنیائے آرزو نہ بنا ،
یہ زندگی کے کڑے کوس یاد آتا ہے۔ تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایہ

نگہ ناز دئے جاتی ہے پیغامِ حیات
موت سے کھیل رہے ہیں ترے جانباز جدا

میں نے اس آواز کو پالا ہے مر مر کر فراقؔ آج جس کی نرم لو ہے شمعِ محرابِ حیات

اس عہد میں فراقؔ، اردو شاعری کے رموز و علائم کو استعمال کرتے ہیں جو ایک مخصوص تہذیبی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں اور مقبولِ عام ہیں۔ وہ تلمیحات و استعارے بھی اسی تہذیبی جواہر خانے سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں۔ جو اردو غزل کی زیبائش کا سب سے بڑا وسیلہ رہا ہے :—

سادگی میں جلوۂ صبحِ ازل شوخیوں میں گرمیٔ روزِ شمار
فتنے اٹھتے ہیں ازل سے تا ابد
زندگی کس شوخ کی ہے رہ گزار

کبھی تنگ آ کے اس کے حسن سے انکار بھی کر لے کوئی بے کفر کے شائستۂ ایماں نہیں ہوتا ،

اسی عہدِ اولیں میں ان کے کلام میں اس اقبال کی بھی جھلک نظر آتی ہے جس کو فراقؔ عظیم شاعر ماننے کے لئے تیار نہ تھے وہ بھی ان کی ہی طرح جبرئیل، غزنوی، اور ایاز کا ذکر چھیڑتے ہیں —

ازل سے سینۂ جبرئیل جس سے ہے محروم قفس میں پال رہا ہوں وہ حسرتِ پرواز
مآلِ عشق سے اونچا بہت تھا عشق ان کا
مآلِ عشق سے خائف نہ غزنوی نہ ایاز

اور کبھی وہ جوش کی گھن گرج کے ساتھ زمانہ کو ایک نئے انقلاب کی خبر دیتے ہیں۔

رخصت اے ملتِ کہن کہ ترا ہو گیا جامِ زندگی لبریز!

دورِ انسانیت کی شان تو دیکھ گرد ہے آج سطوتِ چنگیز

دیکھ رفتارِ انقلاب فراقؔ
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

لیکن اسی عہد میں فراقؔ کی انفرادیت بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ ان کا لہجہ و آہنگ دوسروں سے ممتاز ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے الفاظ، ان کے استعارات اور ان کی تلمیحات الگ اپنا تشخص قائم کر رہی تھیں وہ اپنے موضوعات کے لئے فکر و خیال کے ہر خرمن سے خوشہ چینی کر رہے تھے۔ اور حیات و کائنات کے مرکزی حقائق کو موضوعِ گفتگو بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی غزل انھیں کے الفاظ میں انتہاؤں کا سلسلہ بنتی جا رہی تھی۔ وہ بھاری بھر موضوعات چنتے اور ان کی ادائیگی لطیف و مترنم پیرائے میں کرنے کی کوشش کرتے۔

وہ الفاظ کے صوتی اثرات سے پوری طرح واقف تھے اور ان کے ذریعہ اپنے مفاہیم کی تاثیر میں شدت پیدا کرنے کی پوری کوشش کرتے۔ چنانچہ ان کے کلام میں الفاظ کی تکرار سے پیدا ہونے والا صوتی حسن، عام بول چال کے الفاظ سے اور محاورے کے بلیغ استعمال سے پیدا ہونے والی معنوی دلکشی موجود ہے ؎

اگن کنڈ ہے سینۂ فراقؔ دھڑ دھڑ جلتی ہے آگ

عشق میں اور نشاط کی امید
آستیں میں فراقؔ سانپ نہ پال

دیکھ محبت کا یہ عالم ساز بھی کم کم سوز بھی کم کم
ڈس لے گا یہ کالا ناگ ہو آگ بلائے عشق سے بھاگ

آج بھی صید گہِ عشق میں حُسنِ سفاک
لئے ابرو کی لچکتی سی کماں ہے کہ جو تھا

زیادہ ظرف سے دنیا بھی کوئی دیتا ہے
دلوں نے تیری محبت کا جام چھلکایا

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

اس انفرادیت کے باوصف فراق اس صدی کے نصف اوّل کے ممتاز غزل گو شعراء کے سلسلے کی ایک اہم کڑی محسوس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر کے الفاظ ہیں:-

"اردو شاعری کا وہ عہد جس نے آرزو، عزیز، ثاقب، صفی، جلیل، ریاض اور پھر حسرت، اصغر، فانی، یگانہ اور جگر کو پیدا کیا۔ نئی زندگی اور اس کے بدلتے ہوئے مزاج کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر اب تک فراق میں زندہ ہے۔"
(فلسفہ اور ادبی تنقید)

فراق نے اپنی شاعری کے دوسرے اور آخری دور میں غزلوں کے ساتھ ساتھ بہت سی نظمیں اور رباعیاں بھی لکھیں ۱۹۴۷ء میں ان کی رباعیات کا مجموعہ "روپ" شائع ہوا۔ اب وہ کلاسکیت کے ساتھ جدیدیت کی طرف کچھ اور مائل ہوئے۔ ان کا ذہن اک ذہن روحِ عصر سے پوری طرح روشناس تھا۔ اور اب وہ جدید افکار و نظریات کے مزاج داں تھے۔ جو یورپ اور ایشیا میں انسانی مقدرات کی تعمیر و تخریب میں مصروف تھے۔
ان کے کلام میں اس احساس و ادراک کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے الفاظ ہیں:-

"انھوں نے ایک ذہین و طباع غزل گو کی طرح استعاروں اور کنایوں میں زندگی کی بدلتی ہوئی حقیقتوں اور تبدیل ہوتے ہوئے تصورات کو بھی نظم کر دیا ہے ـــــ"
(جدید اردو شاعری مجموعہ مقالات۔ شائع کردہ مسلم یونیورسٹی یونین ص ۱۲)

اس منزل پر آکر فراق کے اندر دو رجحانات نے شدت اختیار کی اول تو وہ جنسی معاملات میں

زیادہ بے حجابی پر مائل ہوئے۔ اور عسکری صاحب کے مطابق اس زمین اور اس کے حقیقی دودو کا رشتہ حسیت سے جوڑ دیا۔ دوسرے اس ملک کی دیو مالا اور اساطیر میں ان کی دلچسپی مزید بڑھ گئی۔

جنس کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر میں یورپ کے جدید خیالات سے ہم آہنگی پیدا ہوئی اور وہ انسان کی جنسی بھوک کی اہمیت کے اعتراف میں فرائڈ کی منزل تک پہنچ گئے۔ انھوں نے اب غزل کا یہ مذہب قرار دیا۔ کہ :-

"گوشت، پوست کے تقاضے، نفسیاتی خواہشوں کی تکمیل، یا یہ بھی چاہتا ہے۔ کیا کیا کچھ والے تقاضوں کی تکمیل، جنسی بھوک کی تشفی کے ساتھ ساتھ تصورِ جمال اور جذبۂ عشق سے ہماری شخصیت کو غزل مالا مال کرے۔"

(اندازے۔ صفحہ ۲۹۳)

اس معاملے میں فراق نے صرف اتنی رعایت برتی کہ غزل کے اشعار کے ذریعہ ہماری شہوانی زندگی اور اس کی ترغیبوں اور تحریکوں میں بہیمیت باقی نہ رہے۔ خود انھیں کے الفاظ میں :-

"انسانی جمال کا احساس شہوانیت یا حسیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ترقی یافتہ عشقیہ شاعری نہ شہوت پرستی ہے۔ نہ تخیلی طور پر جنسی بھوک پیاس کی شاعری ہے۔"

فراق کی اس شہوت نوازی پر اگر اکبر الٰہ آبادی زندہ ہوتے۔ تو یہ تبصرہ کرتے۔ کہ ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

سوال یہ ہے کہ انسان کا ذوقِ جمال کیا شہوانیت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر اپنا توازن برقرار رکھ سکتا ہے۔ فراق کے لئے مشکل یہ تھی کہ اس دور میں جب انھوں نے "روپ" کی رباعیاں لکھیں ہندوستان میں ترقی پسندی کی ایک علامت یہ بھی تصور کر لی گئی تھی۔ کہ صنفِ نازک بالکل عریاں، ہو کر ان لوگوں کے الفاظ میں سچے روپ میں سامنے آجائے۔ اور اس کے جسم کا ایک ایک عضو اپنے دبازت اور ضخامت کے ساتھ شعر و ادب میں پرتو فگن ہو۔ اسے حقیقت نگاری کا اولین تقاضا

قرار دے دیا گیا تھا۔

اس کے برعکس ہمارے ملک کی مذہبی روایات، عورت کے پیکر کو باحجاب رکھنے پر زور دیتی ہیں اور ایسے انسان کے اندر غیرت وحیا کا جو فطری داعیہ موجود ہے اس کا لازمی تقاضا قرار دیتی ہیں فرائڈ نے انسان کی جنسی خواہشات کی بے محابا آسودگی کو اس کے ارتقاء ذات کے لئے لازمی قرار دیا تھا اس کے خیال میں بہت سے نفسیاتی امراض جذباتی پیچیدگیاں انسان کے اندر جنسی بندشوں کے سبب پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن سے جنسی آسودگی کے بغیر نجات ممکن نہیں۔

اس نقطۂ نظر نے جنس کے بارے میں آزادروی کو ترغیب دی اور فن کاروں کے ایک گروہ نے اسے ارتقاء اور جدیدیت کا لازمی تقاضا سمجھ کر اپنی ادبی کاوشوں میں مشعل راہ بنایا۔

ماضی کے شعراء نے بھی جنس کو بے تحاشا تختۂ مشق بنایا ہے مگر اپنی عریاں نگاری اور معاملہ بندی کے لئے ان کے پاس کوئی فلسفیانہ یا نفسیاتی وجہ جواز نہ تھی۔ ان کی سراپا نگاری پر اگر وہ تہذیب کے دائرے سے باہر تھی ہمیشہ معاشرے نے ناپسندیدگی کی نگاہ ڈالی۔ لیکن بیسویں صدی میں اس طرح کے فواحش کے لئے سائنٹفک بنیادیں تلاش کر لی گئیں۔

فراق کے ساتھ دقت یہ تھی کہ ان کے دامن میں ماضی کا جو سرمایۂ تہذیب واخلاق تھا اس سے یکلخت جدائی بھی ان کو گوارا نہ تھی۔ مگر ان کے جسم وجان کے تقاضے ان کو صنف نازک کے گداز جسم کی طرف مائل کرتے تھے چنانچہ وہ درمیان کی ایک راہ تلاش کر رہے تھے۔ اور اس کوشش میں وہ کبھی کامیاب ہوتے اور کبھی پھسل جاتے۔

وہ اپنی عشقیہ شاعری کے معیار کو ہمارے بعض مثنوی نگاروں، واسوخت نگاروں اور ریختی گو شعرا کی جنس آلودگیوں سے بلند رکھتے ہیں۔ لیکن جنسیت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کی خواہش انھیں اعتدال کی حدود میں رہنے نہیں دیتی۔

یہ سچ ہے کہ زندگی کی اعلیٰ قدریں ان کو بہت عزیز ہیں لیکن جب وہ ان قدروں کے دائرے سے جنس کو باہر لاتے ہیں۔ تو اس کی کشش ان کو بے قابو کر دیتی ہے اور ہمیں ان کے اس دعوے کا ان کے کلام سے کوئی مثبت جواب نہیں ملتا۔ کہ:۔

• "جنسی جذبات وتجربات کو کتنا لطیف ورنگین بنا سکا ہوں اگر ان باتوں کا پتہ چلانا ہے تو

نخلستان

میری غزلوں، رباعیوں اور عشقیہ نظموں میں ان سوالات کا جواب ڈھونڈھنا چاہیئے۔"

یہ سچ ہے۔ کہ فراق، میر، اثر، مرزا شوق اور مومن کی مثنویوں کے بعض حصوں کی طرح صنف لطیف سے ہاتھا پائی کا منظر پیش نہیں کرتے۔ اور نہ انشاء، رنگین اور جرأت کی طرح غزلوں میں لچر مضامین باندھتے ہیں۔ ان کے مزاج میں تہذیب و شرافت ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے شامل ہے وہ اس کا بار بار اعتراف کرتے ہیں۔ ایک مقام پر رقم طراز ہیں۔

"عشقیہ جذبات میں شرافت اور تربیت یافتہ انسانیت کے عناصر گھل مل جائیں تبھی جنسیت نری جنسیت نہیں رہتی بلکہ عشق کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔"

مگر فراق اس شرافت و انسانیت کو اس پر آشوب دور میں صحیح و سلامت رکھنے کے لئے زیادہ فکرمند نظر نہیں آتے اس کے لئے بہرحال ایک فرد کو اخلاقیات کے ایک نظام کا تابع ہونا ہوتا ہے مگر اس طرح کی قیود کو تسلیم کرنے کے وہ قائل نہیں۔ اور کسی ترنگ میں آکر یہ کہنے لگتے ہیں:۔

خشک اعمال کے اوسر میں اُگا کب اخلاق
یہ تو نخل لبِ دریائے معاصی ہے فراق

اقدار کے کسی نظام کے بغیر انسانیت کا تصور کھوکھلا ہو کر رہ جاتا ہے اور ہماری ہیئت اجتماعی یا فرد کی ذاتی زندگی میں نمو پذیر ہونا لائق نہیں رہ جاتا۔ آدرشوں کو خراج عقیدت پیش کرنے سے آدرشوں کی آبیاری نہیں ہوتی۔ ان کو زندگی میں قابل عمل بنانے کے لئے عقائد کی گرمی اور یقین کا استحکام درکار ہوتا ہے اس کے بغیر حسن و خیر کا عرفان بھی مشکل ہے اور حسن و خیر کو شر و فساد سے ممیز کرنا بھی دشوار ہے اس پر اسرار کائنات میں خیر و شر اس طرح خلط ملط ہیں۔ کہ ان کے درمیان امتیاز بڑی تیز ایجرت کا طالب ہے ہمیں یہ ایجرت فراق کے یہاں کم نظر آتی ہے۔

فراق نے اپنی رباعیوں میں عورت کی سراپا نگاری میں کن جذبات اور کن مقاصد کو مشعلِ راہ بنایا اس سے مجھے بحث نہیں۔ میں صرف اتنا عرض کروں گا۔ کہ ان میں عورت کی ایک تصویر تو وہ ہے جو ہماری شریفانہ جذبات کو مہمیز دیتی ہے۔ عورت کے معاشرتی منصب، اس کے سماجی وقار اور اس کی،

تہذیبی فضیلت کے سماجی مختلف پہلو ہماری نگاہوں کے سامنے ابھرتے ہیں۔ وہ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ ؎

کس درجہ سکوں نما ہیں ابرو کے ہلال
خیر و برکت کا دھن لٹاتی ہوئی چال
جیون ساتھی کے آگے دیوی بن کر
آتی ہے سہاگن سجائے ہوئے تھال

رکھشا بندھن کی صبح، رس کی پتلی، چھائی ہے گھٹا گگن پہ ہلکی ہلکی ، ، ، ،
بجلی کی طرح لچک رہے ہیں لچھے بھائی کے ہے باندھتی چمکتی راکھی

کس پیار سے دے رہی ہے میٹھی لوری
ہلتی ہے سڈول بانہہ گوری گوری
ماتھے پہ سہاگ آنکھوں میں رس ہاتھوں میں
بچے کے ہنڈولے کی چمکتی ڈوری ؎

"گل رعنا" میں یہ رباعیاں آٹے میں نمک کی مانند ہیں لیکن فراق جب محبوب کے جسم کے مختلف اعضا، اور اس کی مختلف اداؤں کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار، امانت کی طول طویل راسوخت مات ہو جاتی ہے۔ اور واسوخت گو شعرا کی طرح اپنے محبوبِ ہزار شیوہ پر، وہ یہ احسان بھی لاد دیتے ہیں:—

کرائے گی تازہ کچھ توت عرکا کی پاس سراج ہے آب و گل کی روحِ حساس
کیا سے کیا کر دیا ہے پیکر کو ترے پہلے تھا کہاں یہ رنگ یہ رس یہ باس

اپنے محبوب ادا فروش کے ذکر اذکار میں انھوں نے پوری اردو و ہندی کی سراپا نگاری کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ وہ ان رباعیوں میں الفاظ و تراکیب، تشبیہات و استعارات، تمثیل نگاری و پیکر تراشی کا جادو جگاتے، سرخوشی و سرمستی کے ترانے الاپتے، صنفِ نازک کے پیکر سے لطف اندوز

ہوتے یوں سامنے آتے ہیں جیسے کوئی شہزادۂ نیمروز کسی اندر سبھا میں پہنچ گیا ہو۔

ہیں قوسِ قزح کے تھرتھراتے بازو
رنگِ فردوس لہلہاتے پہلو،
رقصاں شعلہ ہے لچکی لچکی سی کمر
کندل یہ کہ ہے یا دسکتا پیڑو

وہ چہرہ کہ برقِ طور آنکھیں جھپکائے وہ ماتھا چندرلوک جس سے شرمائے
وہ ناف کہ کوثر میں بھنور پڑ جائے وہ ران کہ خورشید کو آئینہ دکھلائے

ان رباعیوں میں فراق، یونان و روما کے صنم تراشوں کی طرح مجسمے تراشتے ہیں اور ان اصنام میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ ان کو اپنی اقدار و روایات تو درکنار خود اپنا پاس و لحاظ نہیں رہ جاتا — وہ خاص الخاص رومانی شاعر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جس کو روح سے زیادہ جسم سے، اعلیٰ وجدانی انبساط اور روحانی سرور سے زیادہ جسمانی لمس ولذت سے دلچسپی نظر آتی ہے۔ محرم سے چھلکتی ہوئی جوانی کی دھوپ، ہنگام وصال سرکتے ہوئے ملبوس ابھرے سینے پر لہرائی لٹیں، کولھوں کی لچک، جوبن کا رس، کلائی کی ڈلک، نتھنوں کا ابھار اور نہ جانے کن کن چیزوں کا وہ مزا لے کر ذکر کرتے ہیں۔

ان رباعیات میں فراق اپنے مداح عسکری صاحب کی توقعات سے بہت دور چلے گئے ہیں اور نئی نسل کے شعور میں اضافہ کے بجائے۔ اس کے تشنج میں اضافہ کا وسیلہ بن گئے ہیں حالانکہ اس اندر سبھا کی مشاقگی کے بعد وہ آخر یہ دعویٰ کر کے اپنے قاری کو مرعوب بھی کرنا چاہتے ہیں —

لے میں مری گونجتا ہے سورج منڈل
مرے سوز دروں میں پڑ کر ہوئی حل
دنیا بھی جب آدمی نے آنکھیں کھولیں
اس وقت سے آج تک کی تاریخِ مسلسل

---

"روپ" کی رباعیاں سراپا نگاری کا اچھا نمونہ تو ہیں لیکن ان میں نہ تو کوئی تخلیقی درد ہے اور نہ کائنات کا غم و نشاط بن جانے کی قوت و گہرائی ہے یہ رباعیاں ہمیں فراق کے فنکارانہ مقام کا قائل ضرور بناتی ہیں مگر ان کی شخصیت اور ان کے فکر و شعور کی سطحیت ہمیں مایوس کرتی ہیں اور ہمیں دوبارہ اپنی رائے کو متوازن بنانے کے لئے "شبنمستان" کی طرف مڑنا پڑتا ہے تاکہ فراق کا تخلیقی درد ہم محسوس کر سکیں

ذروں میں کائنات کے پہلے یہ تھرتھری نہ تھی
کس نے دلِ وجود کو رازِ عدم بتا دیا

اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات

خیالِ ربطِ باہمی مجھے بھی ہے انھیں بھی ہے
یہ آرزو الگ الگ یہ مدعا جدا جدا

گلوں کی جلوہ گاہِ ناز میں نہ ڈھونڈھ اب مجھے میں نقش تھا مٹا دیا۔ چراغ تھا بجھا دیا

صدائے بازگشت بھی دیارِ عشق میں نہیں
جواب کا تو ذکر کیا مگر پکارے جا

کہاں نگاہ ناز اور کہاں یہ نقشِ آرزو بڑھا دیا گھٹا دیا بنا دیا مٹا دیا

تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراق
شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

شرطِ الفت کیا بس اک شرطِ سکوت جان جاتی ہے تو جائے دم نہ جائے

تھی نگہ اس کی پیام اندر پیام
یاد کر کچھ اے دلِ غفلت شعار

غرض فراق کے کلام میں ہم فرازِ ناز، نشیب نیاز اور سطح گداز تینوں کے جلوے دیکھتے ہیں لیکن

نخلستان

یہ تیسرا جلوہ اتنا ہوش ربا ہے کہ ہمیں ڈی۔ ایچ لارنس کے بارے میں مڈلٹن مری کے اس مشہور جملے کی یاد آجاتی ہے۔ کہ :۔

"وہ نہ صرف عورت کی آغوش میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے بلکہ پوری زندگی انھوں نے اس کے آغوش میں ہمکتے ہوئے گزار دی۔"

مری کی کتاب فرزندِ وزن (The Son of woman) سے ڈاکٹر عبدالمغنی، جوش ملیح آبادی کے سلسلہ میں یہ حوالہ دیتے ہوئے رقمطراز ہیں :۔

"جوش کے یہاں لارنس کی طرح جنس کا کوئی فلسفہ نہیں بلکہ وہ صرف ایک عاشقانہ طبیعت رکھتے ہیں۔ جس کو ان کے شاعرانہ مزاج نے بہت ہی تند، رنگین، اور دبیز بنا دیا ہے۔" (تشکیل جدید عبدالمغنی۔ کتاب منزل سبینہ)

جوش کے برعکس فراق جنسیت کا ایک فلسفہ رکھتے ہیں خواہ اس کی صغریٰ و کبریٰ ندارد ہو انھوں نے بھی لارنس کی طرح جسمانیات کو روحانیات میں مدغم کرنے کی کوشش کی ہے جنس کے ڈانڈے تصوف و تلذذ دونوں سے ملائے ہیں۔ وہ نہ وصال کے شاعر ہیں نہ فراق کے، لیکن حسن کی ہر ادا کو للچائی ہوئی نظر سے دیکھنے کے ضرور عادی ہیں۔ اور اپنی ناآسودگی کا راز وہ دوسروں پر افشا کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ اختر کے نزدیک فراق اپنی ناآسودہ ازدواجی زندگی کی محرومیوں کے سبب بار بار عشق کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس عشق کا محرک اپنی شخصیت کی تکمیل کی خواہش ہے۔ جو شاعری کی سطح پر سماج اور انسانیت کی تکمیل کی خواہش بن جاتی ہے اس وجہ سے ان کے کلام میں شدید قسم کا احساس تنہائی موجود ہے۔

ان کی مشہور نظمیں "ہنڈولہ" اور "جگنو" اس احساس کی آئینہ دار ہیں ان میں وہ بچپن کی یادوں کو آواز دیتے ہیں۔ اور ماں کی محبت کے لئے تڑپ تڑپ جاتے ہیں۔ کبھی اپنی اس تنہائی کے مداوا کے لئے جنسیت کے دامن میں اور کبھی فطرت کی آغوش میں پناہ لیتے ہیں۔

فراق کے دامن میں ہمارے روشن تہذیبی تصورات حیات افروز علامات، پہا سواہ اساطیر

اور مشرق و مغرب کے روپ کی تابناک روایات کا خزینہ موجود ہے ان کا کلام ان کے مطالعہ و مشاہدہ کی وسعت پر روشنی ڈالتا ہے یہ مطالعہ ادبیات، فلسفہ، تاریخ اور دیگر معاشرتی علوم پر حاوی ہے لیکن اس مطالعہ کا کوئی ٹھوس نتیجہ سامنے نہیں آتا اور وہ اقبال اور ٹیگور کی طرح اس عہد کے پیامبر شاعر نہیں بن سکے اور نہ عہد جدید کے مسائل سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ موجودہ نسلوں کو عطا کر سکے۔ وہ اس کائنات کے سربستہ رازوں اور موت و حیات کے کرشموں پر غور کرتے ہوئے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

صحرا میں ہی زماں و مکاں کے کھو جاتی ہیں      صدیاں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراق
تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں

اردو کے کلاسیکل شعراء کی طرح فراق بھی اس عالم رنگ و بو کے مشاہدے سے یہ نتائج اخذ کرنا چاہتے ہیں۔

سازو وہ قطرے قطرے میں سوز وہ ذرے ذرے میں
یا دَہر کیسے نہ تھی، درد ترا کہاں نہ تھا

وہ نشاط کو زندگی میں توازن پیدا کرنے کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔:۔

ہر ساز سے ہوتی ہے یہی دھن پیدا      ہوتا ہے بڑے جتن سے یہ گن پیدا
میزانِ نشاط میں صدیوں تُل کر
ہوتا ہے حیات میں توازن، پیدا

فراق کی قوت مشاہدہ غیر معمولی ہے مگر صحیح نتائج تک پہنچنے میں وہ کامیاب نہیں ہوتے دقت یہ ہے کہ ان کے مزاج پر خود رائی (obstinacy) اور ادعائیت کا غلبہ ہے ان کا خیال یہ ہے کہ انھوں نے پہلی بار ہندوستانیت سے اردو شاعری کو روشناس کرایا۔
یہ سچ ہے کہ قدیم ہندو فلسفہ و دیو مالا، ہندوستانی مناظر اور علامات کو انھوں نے بڑے سلیقے سے اردو شاعری کی زینت بنایا۔ لیکن بقول ڈاکٹر وحید اختر:۔

نخلستان

"ان کے اس دعوے کو آنکھ بند کرکے وہی مان سکتا ہے جس کی نظر میں ہندوستان کے فارسی گو شعراء، اردوئے قدیم اور اساتذۂ متقدمین کا سرمایہ نہ ہو۔"

جو شخص ہندوستان کی قدیم صوفیانہ روایات کے اسلامی عہد میں احیاء اور بھگتی تحریک کے اردو ادب میں اثرات سے واقف ہے وہ کبھی فراق کو اس میدان میں یکہ و تنہا شہسوار تسلیم نہیں کر سکتا فطرت سے انسان کے قرب کا جو تصور فراق نے پیش کیا ہے۔ وہ اردو کے لئے نیا نہیں ہے۔ فطرت کی دوشیزگی کا اوروں نے بھی مشاہدہ کیا ہے۔ انسانی جذبات و احساسات کی جھلک فطرت میں دیکھنے کا رواج تو اردو میں بہت پہلے تھا۔ رہ گیا ہندوستان کے مخصوص کلچر یا تہذیبی علامات کا معاملہ تو اس امر میں فراق نسل انسانی کو اکائیوں میں تقسیم کرنے اور ان کے عالمگیر تہذیبی ارتقاء کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹ کر ان پر غور کرنے کی طرف کبھی کبھی مائل ہو جاتے ہیں۔ یا شاید قومی تحریکات کے پیدا کردہ جوش و خروش کی وجہ سے وہ کبھی کبھی ہندوستان کی تہذیبی برتری کے معاملہ میں جارحانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔

تہذیب کا تعلق اساطیر اور دیو مالا سے نہیں۔ بلکہ فلسفۂ زندگی، اخلاقی تصورات اور روحانی نقطۂ نظر سے ہے۔ انسانی تہذیبوں کا ارتقا جغرافیائی حدود کا کبھی تابع نہیں رہا۔ مسیحی تہذیب، بدھ تہذیب اور اسلامی تہذیب نے تمام جغرافیائی حدود کو توڑ کر زمین کے مختلف حصوں میں اپنے جھنڈے گاڑ دئے۔ ان تہذیبوں کے کارنامے پوری نسل انسانی کا مشترک ورثہ ہیں اس لئے ہر خطۂ ارض میں یہ انسانی زندگی کی تزئین و آرائش کرتی رہی ہیں۔

وہ تہذیب جو جغرافیائی حدود کی پابند ہو بہت جلد سمٹ اور سکڑ کر ختم ہو جاتی ہے اس کے پاس اقدار کا کوئی نظام اور کوئی فکری سرمایہ نہیں ہوتا۔ انسانوں کے انداز خورد و نوش، ان کا تمدنی رنگ روغن ان کی تزئین و آرائش اور لباس و مکان جدا جدا ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود فکر و خیال کی ہم آہنگی کے نتیجے میں تہذیبی اعتبار سے مربوط رہ سکتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ ہم زمانۂ حال اور زمانۂ ماضی دونوں میں کر سکتے ہیں۔

اقبال نے ایک تہذیب سے روحانی و مادی فیوض حاصل کرنے والوں کو ایک ملت قرار دیا ہے۔

اور مغرب کے خطرناک قوم پرستانہ تعصبات سے مشرق کو آگاہ کیا ہے جن کی وجہ سے ایشیا و افریقہ کے ہم فکر و ہم خیال افراد مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئے تھے ؎

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی ،

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

ایشیا و یورپ میں اس صدی میں روحانیت و مادیت کی جو کشمکش برپا ہوئی اس نے واضح طور طور پر انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ۔ اس کے نتیجے میں انداز فکر ، آرزوئیں ، تمنائیں ، خواب طرز معاشرت ، آداب زندگی سب دو خانوں میں بٹ گئے ۔ اس کشمکش میں بہت سے اہل قلم نے مشرق کی روحانیت اور اقدار حیات کے لئے صدائے حمایت بلند کی اور بہتوں نے مغرب کے دفاع میں آواز بلند کی ۔

فراق صاحب کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ وہ روحانیت و مادیت دونوں کو ایک ہی تصویر کے دو رخ سمجھتے تھے ۔ اور ان دونوں انتہاؤں کو مدغم کرنا چاہتے تھے ۔ ایک طرف کومل رسمساتے گات اور دلکش نسوانی پیکر سے لطف اندوز ہونے کی تیز و تند خواہش تھی دوسری جانب ان ماورائی بلندیوں میں پرواز کرنا چاہتے تھے جہاں انسان جسمانی لذتوں سے بے نیاز ہو کر غم کائنات کا لذت کش ہو جاتا ہے

فراق کوئی مفکر یا فلسفی نہ تھے کہ روحانیت و مادیت میں امتزاج کی راہ کرتے انھوں نے انسان کے اندر یہ دونوں انتہائیں حقیقت بن کر رونما ہوتی دیکھیں اور یہ فیصلہ کیا ۔ کہ یہ ازلی صداقتیں جب تک شانہ بشانہ موجود نہ ہوں انسانی زندگی کی گاڑی صحیح طور پر نہیں چل سکتی مگر مشکل یہ پیش آئی کہ اس معاملہ میں مذاہب کی خدمات کو فراق نظر انداز کر بیٹھے ۔

انھوں نے عہد حاضر میں مذہب کو تنگ نظر اور درندہ صفت انسانوں کا آلۂ کار بنا ہوا دیکھا اور اس مغالطہ میں پڑ گئے کہ غالباً مذہب انسانوں کو مہذب بنانے کے بجائے جنگجو اور کھردرا بنا دیتا ۔ وہ اس معاملہ میں صوفیوں اور عظیم شخصیتوں و ریشیوں کو فراموش کر بیٹھے ورنہ ایلیٹ کے اس قول کو تسلیم کرتے کہ ہر تہذیب اور ہر کلچر کا خمیر کسی نہ کسی مذہب سے اٹھتا ہے ۔

مذہب کے عطا کردہ علم نے انسان کو نرمی اور انکساری کی آخری بلندیوں تک پہنچایا ہے اور خود کشی

و انکسار کی سطح کے نیچے خود اعتمادی اور سکونِ قلب کی اتھاہ گہرائیاں عطا کی ہیں۔

فراق کی فکر و نظر کا جائزہ لیجیے تو وہ اپنے ہم عصر اور مزاج شناس جوش ملیح آبادی سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں دونوں کے مزاج کی ساخت اور ذہنی کائنات کافی مشابہت رکھتی ہے۔

فراق خود روحِ عصر کے دیباچے میں اعتراف کرتے ہیں کہ:۔

" جوش کی وجہ سے ان کو اپنی شاعری میں نئی وسعتیں اور نئے امکانات پیدا کرنے کی ترغیب ہوئی۔ "

فراق اردو شعر و ادب کی دنیا میں بہت کم شعراء کی عظمت کے معترف ہوئے لیکن جوش کی عظمت کا لوہا مانتے رہے ان کی تشبیہوں اور استعاروں کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے رہے —— ڈاکٹر وحید اختر کے الفاظ میں :۔

" دونوں کا اندازِ نظر یکساں نظر آتا ہے۔ دونوں جدید خیالات کے پرستار تھے اور دونوں قدیم ادب سے اپنا رشتہ استوار رکھنا چاہتے ہیں۔ "

قدیم ادب کے بارے میں فراق خود لکھتے ہیں :۔

" محض نئی بات کہہ دینے یا نئے انداز بیان یا چونکا دینے والی بات کہہ دینے سے شاعری زندہ نہیں رہ سکتی۔ نئی شاعری جب ہی زندہ رہے گی جب وہ ہماری تہذیب اور ہمارے قدیم ادب کی دین ہو۔ ہمیں اپنی شاعری کو اپنے اور دنیا کے قدیم اور مستند ادب کا سہارا لے کر چلنا چاہیئے۔ "

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جوش و فراق، دونوں اس عہد کے قدیم و جدید پر نگاہ رکھنے اور قدیم و جدید دونوں کو برتنے والے قد آور شاعر سے خوش نہیں حالانکہ یہ دونوں بھی اس عشق و محبت کا گن گاتے ہیں جس کے نغمہ گر از اقبال بھی تھے — یہ ضرور ہے کہ ان کے برعکس اقبال کا عشق جنسیت و لذتیت کے دلدل میں کبھی نہیں پھنستا۔ بلکہ انسان کی ذہنی و روحانی قوتوں کو فروغ دینے اور عالمگیر توانائی کا ایک سرچشمہ بن کر تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف تاریخ ساز کرداروں کو ابھارنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

جوشؔ و فراقؔ دونوں کے خیالات میں زبردست پراگندگی ہے ۔ ایک طرف مذہبی خدمات کا دوسری طرف اس کو تہ و بالا کر کے ایک نئی دنیا آباد کرنے کا دلولہ ہے ۔ دونوں اکھنڈ انسانیت اور عالمگیرانہ اتحاد کی بات کرتے ہیں ۔ مگر دونوں کے پاس اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کیلئے کوئی متعین راستہ نہیں ۔ مارکس کے خیالات اور ترقی پسند رجحانات سے دونوں متاثر نظر آتے ہیں لیکن دونوں سچے اشتراکی نہ بن سکے ۔ اور ٹھیٹھ قسم کے مارکسسٹ اہل قلم ہمیشہ ان دونوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے رہے ۔ اس لئے کہ دونوں رومانیت اور قدامت کے طلسم میں ہمیشہ ہی گرفتار رہے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

آج سے ربع صدی قبل جب فراقؔ نے نقوش کے صفحات پر مذہبی ادب کی بحث چھیڑ دی تھی اور اکھنڈ انسانیت کا نعرہ بلند کیا تھا ۔ تو حامد حسن صاحب قادری نے تبصرہ فرمایا تھا ۔ :-

" اکھنڈ انسانیت یہ نہیں ہے کہ سب ٹریکٹر سے کھیتی کرنے لگیں ۔ سب مشینیں استعمال کرنے لگیں یا سب اشتراکی بن جائیں ۔ بلکہ یہ ہے کہ ہر انسان سب انسانوں کو انسان سمجھے اور یہ منزل ابھی خواب و خیال سے بھی دور ہے ۔ ابھی انگریزوں کی آمریت اور روس کی قاہریت انسانیت کو کہیں آس پاس پھٹکنے نہیں دے رہی ہے ۔ "

قادری صاحب کی یہ بات آج بھی سچ ہے ۔ امریکہ و اسرائیل کے فلسطینیوں پر مظالم اور روس کی ، افغانی عوام کی آزادی و وقار کو سلب کرنے کی کوشش ہمارے سامنے ہے ۔ اپنے گرد و پیش ہونے والے انسانوں پر مظالم سے ایک شاعر کا دل نہ پگھل اٹھے اور اس کی آنکھ اشکبار نہ ہو جائے ۔ اور وہ مظلوموں کی حمایت میں کوئی فریاد ، کوئی صدائے احتجاج اور کوئی آہ دلخراش نہ بلند کرے تو ہمیں اس کے خلوص پر یقیناً شک ہونے لگے گا ۔

آزاد ہندوستان میں انسانی قدروں کے زوال اور چھوت و ساتویں دہائی میں تعصب اور تنگ نظری کے خوفناک عفریت کے ننگے ناچ ، اور خونریز فسادات کے ہولناک مناظر مسلسل سامنے

آئے۔ حیرت ہے۔ کہ انسانی قدروں اور الکنڈا انسانیت کی بات کرنے والے اس شاعر پر اس کی پرچھائیں تک نہ پڑی اور حیرت ہے کہ اس کے ارباب اقتدار کی نوازشوں اور عنایتوں کے لئے دامن پھیلائے ہوئے حالات سے بے نیاز اپنی دنیائے تصورات کی سیر کرتے ہوئے۔ اپنی زندگی کی شام گزار دی۔

فراق کے کلام میں غور و فکر کا عنصر اور حقائق کی جستجو کا پہلو کمزور ہے۔ اس میں وہ تڑپ نہیں جو ایک بڑے فنکار میں ہونی چاہیئے۔ میر کے کلام میں اس کی نادر مثالیں ملتی ہیں۔ اگرچہ میر بھی حکیم اور فلسفی نہیں۔ اور جذباتی انداز سے اپنے مسائل حیات پر غور کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے مرکزی نقطہ پر اپنے جملہ مشاہدات کو مرتکز کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس چمن کا ہر گل ان کو ایک بھرا ساغر نظر آتا ہے۔ اس کائنات میں بکھرا ہوا حسن ان کو حسن مطلق کی یاد دلاتا ہے۔ وہ اس کی نیرنگیوں پر غرقِ حیرت ہو جاتے ہیں۔

اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں
حیرت ہے بڑی آن کے صاحب نظروں کو

اس نالہ و شیون سے بھری کائنات میں میر کے نزدیک خوشی کم اور غم بے حد بسیط ہے اس لئے وہ اس کو سیاہ خانہ قرار دیتے ہیں۔ اور کتنا شریفانہ احتجاج کرتے ہیں ؎

عالم یہ سیاہ خانہ ہے کسی کا
وہ شور ہے کہ دنیا نہیں کچھ سنائی بات

ادراکِ حقیقت کے لئے میر صفائے قلب پر زور دیتے ہیں لیکن عقل کی لذتوں کا بھی مطلق انکار نہیں۔ قدم قدم پر تامل و تفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ اور خود نگری و خود شکنی اور دل نوازی خلق کا پیغام دیا گیا ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

لیکن اس کے لئے وہ سلیم الطّبعی کو لازمی قرار دیتے ہیں اور کجیٔ ذہن سے انسان کو خبردار کرتے ہیں:—

کجیٔ ذہن اس وادی میں گمراہی کا باعث ہے
سلیم الطبع کو تو پاؤں کا ہر نقش ہادی ہے

میرؔ نہایت مہذّب اور شریفانہ لہجہ میں زندگی کا ایک واضح نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور اقدار و روایات کا ایک سرمایہ آنے والی نسلوں تک منتقل کر جاتے ہیں:—

فقیرانہ آئے صدا کر چلے ۔۔۔ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات ۔۔۔ کلی نے یہ سن کر تبسّم کیا

اب بھی دماغ رفتہ ہمارا ہے عرش پر
گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملا دیا

فراقؔ میرؔ سے اپنے ذہنی قرب کا بار بار ذکر کرتے ہیں لیکن میرؔ کے برعکس ان کے کلام میں ایک ناآسودہ انسان، اپنی جنسی، روحانی اور ذہنی شکستوں اور ناکامیوں کا وسیلۂ اظہار شعر کو بناتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کی تلخی سے بچ نکلنے کے لئے ایسے جمالیاتی پیکر تراشتا ہے جو خدمات کو متحرک بنا سکیں اور ان سے وہ اپنی محرومیوں اور المناکیوں کا مداوا کرنا چاہتا ہے۔ شاعری اس کے لئے انتقالِ ذہنی کا ایک وسیلہ بنتی ہے۔

دوسری طرف فراقؔ اپنے لہجہ کی کھنک اور خود اعتمادی سے یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ کسی ذہنی انتشار کی زد میں ہیں یا ان کے فکر کی کشکول خالی ہے۔ وہ غزل کی رچی ہوئی زبان، بلیغ استعارے اور خوشنما علائم کے بادشاہ ہیں اور اپنے حسنِ بیان سے ہمیں مسحور کر لیتے ہیں۔

"گلِ نغمہ" کی بیسویں غزل کو لیجئے۔ بڑا پرشکوہ انداز ہے۔ شاعر جستہ جستہ اپنی شخصیت کو بے نقاب کرتا ہے وہ شخصیت جو تضادات کا مجموعہ ہے وہ شخصیت جو کائنات کے حقائق کو کسی ایک نقطہ پر مرکوز کرنے سے محروم ہے لیکن لہجہ کی نا شخیت اس خلا کو ظاہر نہیں ہونے دیتی —

مرے عالم غم و یاس کی یہ سیاہیاں یہ اداسیاں
وہ دیار ہوں کہ جہاں ہوئی سحر آشنا نہ شبِ وطن
یہ لبوں کی شوخ بیانیاں کہ چھلک گئی ہیں گلابیاں
یہ بہارِ انجمنِ طرب کہ بس اک کلی ہے حسینِ چمن
مرے سینے میں ہے وہ روشنی، کہ نہ عمر حسن کی بتا سکیں
یہیں جلوے عہدِ جدید کے، یہیں پر تو عہدِ کہن

لیکن اس تیور کو فراق زیادہ دیر برقرار نہیں رکھ پاتے ہیں اور مضامینِ بوس و کنار سے دل بہلانے لگتے ہیں۔ ع

وہ تمام روئے نگار ہے وہ تمام بوس و کنار ہے

پھر اپنی ناقدری کا شکوہ کرتے ہیں۔ ع

وہ جہاں نہ سمجھیں مری زباں وہیں قسمتوں سے ملا وطن

پھر معشوق کے پیکر میں کھو جاتے ہیں تاکہ ناقدری کے احساس سے چھٹکارا ملے۔ ع

تری آنکھ جادوئے سامری ترے لب فسانۂ نل دمن

پھر وہ اپنے مجموعۂ اضداد مزاج سے مجبور ہو کر خود کو خزاں اور بہار دونوں کا نقیب اور ایک ایسے پھول کی پنکھڑی قرار دیتے ہیں جو کفن پر بکھیری جاتی ہے اور زیب پیراہن بھی بنتی ہے۔ پھر محبوب کی پیکر تراشی جو ان کا محبوب ترین موضوع ہے ان کو متوجہ کر لیتی ہے ؎

وہ تبسمِ لبِ نازنیں وہ بہار پیکرِ دلنشیں
وہی ادھ کھلی سی کلی کلی وہی تازگی سی چمن چمن

ایک شعر میں ایمجری کا طلسم اور تمثیل کا جادو، ہمیں ہومر اور ورجل جیسے عظیم فنکاروں کی یاد دلاتا ہے ؎

کف پا سے تا سر نازنیں کئی آنکھیں کھلتی جھپکتی ہیں
کہ تمام سکن آ ہو اں ہے وہ مرغزار ترا بدن

فراقؔ کا موڈ حسبِ روایت پانی کی لہروں کی طرح بل کھاتا اور پیچ و خم دکھاتا محبوب کی بزمِ ناز اور لبِ لعلیں کے ذکر کے بعد پھر ان کی بےکسی اور محرومی کے احساس تک آ جاتا ہے۔

ع مری بےکسی نے اڑھا دیا مرے آنسوؤں کا مجھے کفن

خود ترحمی Self pity فراقؔ کے مزاج کا نمایاں پہلو ہے وہ تقریباً ہر غزل میں اپنی مظلومیت، اور ماحول و زمانہ کی بے انصافیوں اور ناقدریوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ شکست خوردگی ان کے بڑا فن کار بننے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ اپنے فکر و خیال کو کسی ایک نقطہ پر مرکوز نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ نفسِ مطمئنہ سے محروم ہیں جو ٹھوس علم اور معرفتِ حق کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ فراقؔ جب اپنی تلخیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے بہت سے پرانے زخم تازہ ہو جاتے ہیں لیکن جب ان کا غم آفاقی نہ بن کر فقط ترحم سیدی، شکوۂ بے رحمیٔ حالات، شکایتِ ستمہائے زمانہ تک محدود ہو جاتا ہے تو ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کیا یہ انداز کسی بڑے شاعر کے لئے زیبا ہے — اقبالؔ تو در کنار، اصغرؔ و حسرتؔ بھی اپنی کج کلاہی کی شان برقرار رکھتے ہیں اور کبھی ستمہائے روزگار کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتے :—

فراقؔ اپنی ذات کی مرثیہ خوانی کر کے اپنے فن کی عظمت مجروح کر دیتے ہیں۔

جسے ڈس لیا ہے زمانے نے کوئی زندگی ہے یہ زندگی
یہ سوادِ شامِ اجل نما — یہ ضیائے صبح، کفن کفن

اس اذیت سے فرار کی خاطر وہ سراپائے محبوب کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ مگر اس محبوب میں حسنِ مطلق کی جھلک نظر نہیں آتی ؎

مری ہر غزل کو یہ آرزو تجھے سج سجا کے نکالئے
مری فکر ہو ترا آئینہ مرے نغمے ہوں ترا پیرہن

فراقؔ کبھی کبھی اپنے غم کو آفاقیت بھی عطا کرتے ہیں اور اپنی اداسی و افسردگی کی بھٹی میں جلنے کے

کے باوجود، دینیات انیت کو اپنے نغموں سے چمن زار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے اشعار، خال خال سامنے آتے ہیں۔ مگر وہ اتنے دل کش ہیں۔ کہ ہم ان کی ساری کوتاہیاں فراموش کرکے ان کے خلوص کے قائل ہو جاتے ہیں:۔

یہ اداس اداس کبھی کبھی کوئی زندگی ہے فراقؔ کی
مگر آج کشت سخنوری ہے اسی کے دم سے چمن چمن

اسی طرح فراقؔ کی دیگر غزلوں میں ان کا موڈ مسلسل تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اور تقریباً ایک ہی طرح کے نشیب و فراز کا سامنا کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ البتہ ان کی زود گوئی اور طول کلامی ان کی اچھی اچھی غزلوں کے تاثر کو مجروح کر دیتی ہے۔ اور جس غزل کا مطلع یہ ہو۔

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

اس میں ایسے ایسے اشعار سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔

تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبار الفت میں
ہم اپنے سر ترا اے دوست یہ احسان لیتے ہیں
فراقؔ اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

موسیقیت و غنائیت، شعر فراقؔ کی امتیازی خصوصیت ہے اس کے لئے وہ شعوری کوشش کرتے نظر آتے ہیں، سریلی، نرم، میٹھی، اور گھلاوٹ دار آوازان کو بہت عزیز ہے اس معاملہ میں وہ فرانس کے فن کار ورلین کے ہم خیال محسوس ہوتے ہیں۔ جو کہتا ہے:۔

"شعر میں پہلے موسیقی ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے۔ وہ ادب ہے۔"

مگر فرانس کے ہیئت پرستوں سے وہ متفق نہیں اور گیسوئے شعر کی شانۂ فکر سے آرائش ضروری

سمجھتے ہیں۔ میلارمے کے "خالص شعر کے نظریے"، یا فلوبیر کے اسلوب کی فوقیت کے تصور سے وہ ان معنوں پر ضرور قریب ہیں۔ کہ شعر کے لئے لوچ، نکھار، گھلاوٹ اور نرمی کے زبردست حامی ہیں مگر وہ اپنے قاری کو بودلیر کے الفاظ میں ریاکار نہیں سمجھتے ہیں اور اس کے دل کے دروازوں پر دستک ضرور دیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ ایسی جرأت سے محروم ہیں۔ کہ خود کو اپنے قاری کے سامنے پوری طرح بے حجاب کر دیں۔ جیسا کہ میر کا طرۂ امتیاز ہے۔

حسن عسکری کا خیال ہے کہ اگر فنکار صحیح معنیٰ میں فنکار ہے تو وہ خرید و فروخت سے بالاتر ہے کیوں کہ اس کے لئے سب سے بڑی حقیقت اس کے اعصاب ہیں اور اعصاب جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ جوش کو اپنے اعصاب پر قابو نہیں رہتا۔ لیکن فراق کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے اعصاب کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی اسے ڈھیلا ضرور کر دیتے ہیں۔ جب وہ اپنے دلیش کی سبھیتا اور تابناک آدرشوں کے ذکر کے ساتھ مارکس کی مادہ پرستانہ فکر کا ترجمان بننے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے قاری کو فریب دے رہے ہیں۔

مجھے ڈاکٹر وحید اختر کی اس رائے سے اتفاق نہیں کہ اگر فراق ترقی پسند تحریک کے ساتھ نہ چلتے۔ تو وہ بھی اپنے کئی ہمعصر شعراء کی طرح طاقِ نسیاں بن جاتے۔ محدود قوم پرستی سے آفاقیت کی طرف زندگی کی اعلیٰ اقدار کے عرفان کی وجہ سے وہ گرم سفر ہوئے۔ ان کی وسعتِ نظر مارکس ازم کی مرہونِ منت نہیں۔ انسانوں اور انسانوں کے درمیان دردمندانہ رشتوں کا عرفان ان کو اپنے تہذیبی ورثہ سے ملا ہے جسے وہ بے حد عزیز رکھتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے اندر اخلاقی انقلاب، مادی انقلاب سے زیادہ دور رس تبدیلیوں کا حامل ہوتا ہے۔ فراق اس طرح کے انقلاب کے واضح خدوخال سے روشناس نہ تھے۔ وہ کوئی فلسفۂ انقلاب نہ دے سکے ہوں۔ مگر ہم کو ایک نئی صبح کی بشارت ضرور دیتے ہیں جو امنڈتی ہوئی تاریکیوں کے بعد ضرور طلوع ہو کر رہے گی۔ ؎

رکی رکی سی شب تار ختم پر آئے وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئے

زمیں جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کہ کوئی ذرّہ محو خواب نہیں

فراقؔ اپنی دنیا داریوں کے باوجود اپنے مزاج میں کچھ درویشی کے اوصاف بھی رکھتے ہیں اسی لئے وہ اس بھری محفل کائنات میں خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ یہ احساس تنہائی اس قدر شدید ہے کہ اگر وہ منزلِ جاناں پر پہنچ بھی جاتے تو ان کی آنکھ بھر آتی۔

انھوں نے اس داخلی گداز کی بدولت اردو غزل کو اس لائق بنا دیا۔ کہ وہ اپنے وجود کو اس سفاک اور اذیت ناک مشینی دور میں برقرار رکھ سکے۔ چنانچہ عسکری صاحب کی اس رائے سے ہر شخص اتفاق کرے گا۔ کہ فراقؔ کی شاعری، اردو شاعری کی روایت میں ایک زبردست اضافہ ہے۔ لیکن یہ تسلیم کرنے میں تامل ہوگا۔ کہ نئی نسل کی ذہنی و جذباتی زندگی میں ان کی شاعری اپنا ایک گہرا اثر چھوڑ جائے گی۔

فراقؔ اپنے آخری دور میں ذہنی اعتبار سے کُند ہو گئے تھے۔ اور ہماری نئی نسل چھٹی اور ساتویں دھائی میں جن پُر آشوب حالات سے دوچار تھی۔ اس سے نبرد آزمائی کرنا، فراقؔ کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے لئے اس صدی کے نصف آخر کو ایک اور اقبالؔ کی ضرورت در پیش ہے جو بے پناہ اعتماد کے ساتھ نئی نسل کو مخاطب کرے۔ اور اسے اپنی پنہاں قوتوں کی بازیافت کے لئے آمادہ کر سکے۔

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں — آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں — جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

(اقبالؔ)

لیکن ایسا بھی نہیں کہ فراقؔ نے نئی نسل کے الم اور کرب کو کسی سے کم محسوس کیا ہو۔ ان کے احساسات بہت بیدار تھے۔ آج کی زندگی پر انھوں نے جس جس انداز سے تبصرے کئے ہیں۔ وہ زبان زدِ خاص و عام بن گئے ہیں ؎

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

زندگی کیا ہے اس کو آج اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

فراقؔ اپنی جمال پرستی، سراپا نگاری، رومانیت، نشاط سبز اور جنسیت نوازی کے باوجود انسان کے بیکراں غم کی جس جس انداز سے تعبیر بیان کرتے ہیں وہ بلا شبہ ان کو میرؔ کا ہمرتبہ بنا دیتا ہے اور یہ حقیقت ان کے کلام کے ذریعہ خود کو منوا لیتی ہے کہ ہمارے شیریں ترین نغمے وہی ہیں جو ہمارے شدید ترین غم کے ترجمان ہیں۔

فراقؔ کے یہ اشعار پتھر سے پتھر دل کو موم بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔

ہم غمزدوں کی گفتگوئے تلخ پر نہ جا
قسمت بری سہی، یہ طبیعت بری نہیں

جانے بھی دو نام کسی کا، آگیا باتوں باتوں میں
ایسی بھی کیا چپ لگ جانا کچھ تو کہو کیا سوچو ہو

جن کو اتنا یاد کرو ہو، چلتے پھرتے سائے ہیں
ان کو مٹے تو مدت گزری نام و نشاں کیا پوچھو ہو

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ اپنی سارے تضاد بیانیوں کے باوجود، نیز فکری کوتاہیوں کے باوصف فراقؔ اس عہد کے ایک بڑے شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ اردو ادب کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ بلکہ موجودہ دور پر یہ احسان بھی کر گئے۔ کہ فکری خلاء، ذہنی انتشار، اور جذباتی تشنج میں گرفتار اس دور کو ان اقدار سے روشناس کرایا۔ جو ان کی زندگی کو پُر کیف بنا سکتی ہیں انھوں نے موجودہ دور کے انسان کو اپنے غم کو انگیز کرنے کا ایک نیا انداز عطا کیا۔ ان کی بدولت نئی نسل شائستہ کلامی کا ہنر حاصل کر سکی۔

اس دور کی زندگی کے اتھاہ کرب و الم کا جب ہم اندازہ لگاتے ہیں تو ہمیں فراقؔ کا احسان مند

ہونا پڑتا ہے جنھوں نے درد و کرب کے اس سیلِ بے پناہ میں مسکراتے ہوئے کشتیٔ حیات کو کھینے کی ترغیب دی۔

آخر میں انھیں کے ایک شعر پہ بات ختم کروں گا۔ جو فراق نے گورکی کے مشہور افسانے "۲۶ - آدمی اور ایک لڑکی" سے متاثر ہو کر کہا تھا ؎

اس کائناتِ غم کی فسردہ فضاؤں میں
بکھرا گئے ہیں آکے وہ کچھ مسکراہٹیں

---

# قطعات

## جشنِ فراق

لکشمی نرائن فارغ

(۱)

فدائے بزمِ سخن تو نہ تھا مگر پھر بھی
اداشناسِ سخن تھا ترا مذاقِ سلیم
پیامِ فکرِ درخشاں دیا زمانے کو
بدل سکا نہ اگرچہ تو رسم و راہِ قدیم

(۲)

پسند تجھ کو تھی تہذیب بھی سلیقے کی
توقع تھی تجھے انسان سے قرینے کی
ادائے خاص سے دیکھا جمالِ فردا کو
ادائیں تو نے سکھائیں بشر کو جینے کی

(۳)

اگرچہ زندۂ جاوید میر و غالب ہیں
رہے گا تو بھی زمانے میں ضوفشاں برسوں
زمینِ شعر پکارے گی تجھ کو رہ رہ کر
ترے فراق میں روئے گا آسماں برسوں

# یادوں کی برات
# ایک مطالعہ

ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی
لکچرر شعبۂ اردو
شبلی کالج - اعظم گڑھ

جوشؔ ملیح آبادی اپنی شاعری کے لئے زیادہ مشہور ہیں۔ لیکن وہ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں اس کا پوری طرح اندازہ "یادوں کی برات" کی اشاعت سے پہلے کم عام سطح پر نہیں کیا جا سکا تھا۔ بقول صابر کمال :-

"نثر کی جانب جوشؔ کو ٹیگور نے متوجہ کیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ کے لئے شانتی نکیتن میں بھی مقیم رہے —"[1]

جوشؔ نے اپنی نثر کی ابتدا ادب لطیف سے کی جس کی طرف بلاشبہ ٹیگور نے ان کی رہنمائی کی ہوگی۔ جوشؔ انگریزی ادب سے بھی اچھی طرح واقف تھے جس میں آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر وغیرہ کے ہاتھوں ادب لطیف کا گراں قدر سرمایہ جمع ہو چکا تھا۔

اس کے علاوہ اردو میں محمد حسین آزادؔ، اور شبلیؔ کے ذریعہ نہ صرف اس کی ابتدا ہو چکی تھی۔ بلکہ میر ناصر علی دہلوی، عبدالحلیم شررؔ، ریاض خیرآبادی، ابوالکلام آزادؔ، مہدی افادی، نیاز فتحپوری اور سجاد حیدر یلدرم وغیرہ اسے ترقی کی اعلیٰ منزل پر پہنچا چکے تھے۔ جوشؔ کے اس قسم کی نثر کے نمونے سب سے پہلے ان کی شعری تخلیقات کے ہمراہ "روحِ ادب" میں شائع ہو چکے تھے۔

---

[1] یادوں کی برات - از صابر کمال - ص ۵۶

اس کے علاوہ جوش کی نثر کا ایک دوسری طرح کا نمونہ ان کی نثری تصنیف "اشارات" میں منظر عام پر آیا تھا۔ جو رسالہ کلیم میں لکھے گئے ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔ جنھیں انھوں نے اس رسالہ کی ادارت کے زمانے میں لکھا تھا۔

"اشارات" میں ایک مضمون "ہمارے شاعر" کے عنوان سے بھی ہے جس میں جوش نے شاعر کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ شاعر کے متعلق وہ یوں بھی کہا کرتے تھے۔ کہ:۔

"ایک اچھے شاعر کے لئے اچھا انسان ہونا بھی ضروری ہے جو اچھا انسان نہیں۔ وہ موزوں طبع تو ضرور ہو سکتا ہے لیکن اچھا شاعر نہیں۔"[1]

لیکن اپنے مضمون میں اچھے شاعر کی جو خصوصیات انھوں نے پیش کی ہیں۔ وہ اس طرح ہیں:——

"شاعر جس ملک اور قوم کا ہو۔ شائستہ ترین انسان ہوا کرتا ہے شاعر اپنی فطرت کی رو سے بہترین انسان ہونے کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ گلاب کی طرح شعر حقیر شے نہیں۔ جو گھوڑے پر بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ شعر کی بنیاد تو عالمگیر اور لامحدود محبت ہے جب دل میں محبت اپنے نقطۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ تو شعر اس وقت ہوتا ہے اور جب اپنے قاتل دشمن کی اداؤں پر پیار آنے لگتا ہے اس وقت قلب انسانی میں شعر کی تخلیق ہونے لگتی ہے۔ . . . . . . "[2]

ان تصانیف کے علاوہ جوش کی نثر کے نمونے اخباروں اور رسالوں میں بکھرے ہوئے مضامین کی شکل میں بھی ملتے ہیں۔ عرصہ ہوا ان کا ایک مضمون "ہماری زبان" میں پاکستان جانے کے بعد شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے اقبال کی شاعری اور شخصیت اور پاکستان کو خاص طور پر موضوع بنایا تھا۔ اقبال کی شاعری کے متعلق جوش نے اپنی زیر بحث تصنیف "یادوں کی برات" میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

---

[1] یادوں کی برات۔ ص ۷۹۔ از صابر کمال

[2] 〃 〃 〃 〃 〃

حضرت اقبال کی شاعری، اقوال، روایات، اور عقائد کی طرف چل پڑی اور یہ
دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جس تصوف اور مابعد الطبیعات سے انھوں نے مجھے روکا تھا
اس پر کا لیبل لگا کر وہ خود اسی طرف چلے گئے۔ اور عقل کو بولہب اور عشق
کو مصطفےٰ کا خطاب دے دیا۔ اور۔ ع

السلام اے عشق خوشی سودائے ما۔

کے نعرے لگانے لگے چونکہ وہ اعلیٰ درجے کے پڑھے لکھے اور بلا کے ذہین تھے اس لئے
شروع شروع میں انھوں نے مغرب کے الحاد اور مشرق کے مابین مصالحت کی
بڑے خلوص کے ساتھ کوشش کی لیکن جب ان کی سعی مشکور نہ ہوئی تو انھوں نے
نیٹشے کے مافوق البشر کو مشرف بہ اسلام کر کے "شاہین بچہ" بنا دیا۔ قرآن
کے مردود لفظ عشق کو آسمان پر چڑھا کر اسے تمام انسانی شرف و مجد کا مرکز تسلیم
کیا۔ اور قرآن کے محبوب لفظ "عقل" کو خاک میں ملا کر اس کو تمام مفاسد کا
سرچشمہ بنا دیا۔ اور میں چیخ اٹھا۔ ع

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما۔" [1]

لیکن جو مضمون "ہماری زبان" میں چھپا ہے اس میں جوش نے اقبال کے مختلف نظریات اور تصورات کا زیادہ تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اور ان کی اسلامی شاعری کو خاص طور پر اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ جوش کا کمال یہ ہے کہ درج بالا سطور میں انھوں نے اقبال کی شاعری کی پوری روح اتار دی ہے اس سے ان کا تنقیدی شعور ظاہر ہوتا ہے۔

جوش کی تصنیف "یادوں کی برات" ان کی ہر قسم کی نثر کی آئینہ دار ہے۔ اس میں انھوں نے نثر نگاری میں کھپائی ہوئی اپنی پوری زندگی نچوڑ دی ہے۔

یہ ان کی خود نوشت سوانح عمری ہے جو ۱۹۷۰ء میں تصنیف ہوئی۔ انھوں نے اسے چھ سال کے طویل عرصے میں لکھا۔ اس مدت میں انھیں اس کے چار مسودے تیار کرنے پڑے۔ یہ ان کا

---

[1] یادوں کی برات ص ۱۵۳ و ۱۵۴۔ از جوش ملیح آبادی۔ نظامی پریس لکھنؤ۔

جو تھا مسودہ ہے جسے زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ جوش تو اس سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے انھیں مجبوراً اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔ تاکہ جیسے تیسے ان کے حالاتِ زندگی، افکار و نظریات، ان کا اندازِ فکر اور ان کی زندگی کے مختلف رخ محفوظ ہو جائیں۔ لیکن جوش کے لئے یہ غیر اطمینان بخش مسودہ بھی ایک ایسی تصنیف کی صورت میں سامنے آیا ہے جس کو بجا طور پر اردو نثر کا شاہکار اور ان کی ساری عمر کا حاصل بلا تامّل قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۹۷۰ء میں جوش اکیڈمی نے اس کو شائع کیا۔ اس وقت سے آج تک اردو کا یہ کارنامہ جوش کی بدنامی اور رسوائی کا سبب بنا ہوا ہے۔ اس پر طرح طرح کے اعتراضات کئے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے بھی اس پر سخت تنقید کی ہے۔ جو کسی زمانے میں جوش کی ادبی صلاحیت کے اس قدر معترف تھے۔ کہ انھیں غالب اور ٹیگور کی صف میں جگہ دیتے تھے[۱] انھوں نے اس پر تبصرہ ہی "ایک گندی کتاب" کے عنوان سے کیا ہے۔ اور "یادوں کی برات" کے بجائے۔ اس کو "یادوں کی گواگھاٹ" کا نام دیا ہے۔ لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے اس نے ان سے بھی اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ انھوں نے اس حیثیت سے اس کی بڑی تعریف کی ہے مگر اس میں جو جو خامیاں ہیں ان کی بھی نشان دہی کر دی ہے۔

مثلاً وہ لکھتے ہیں :—

"زبان بحیثیت مجموعی اچھی اور بہت اچھی ہے اور ان کے سے ادیب کے شایانِ شان اور بعض بعض ٹکڑے تو بے ساختگی کے لحاظ سے بے مثل و بے مثال ہیں لیکن ایسا ہر جگہ نہیں ہے۔ اور جو ٹکڑے توشِ وقتی کے وقت میں لکھے ہیں وہ اختلالِ حواس کی نذر ہو گئے ہیں۔ جیسے کہ ہر شرابی اور نشے باز کے ہونے بھی چاہئیں۔ ان پر بے تکلف حکومت آمد (کذا)، تصنع و تکلف قائم ہو گئی ہے اور کہیں کہیں قافیہ کے جوش اور غلو میں دب کر عبارت مہمل بن گئی ہے کہیں کہیں لفظ قلم سے غلط، نکل گئے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۲۹۵ پر بجائے نفس آمارہ کے نفس لوّامہ اور دعوے میں

---

[۱] یادوں کی برات۔ ص ۱۵۳ و ۱۵۴۔ از جوش ملیح آبادی۔ نظامی پریس لکھنؤ

کا قافیہ گھومیں۔" [1]

مولانا نے اپنے مختصر سے اس اقتباس میں "یادوں کی برات" کے اسلوب اور زبان کی بیشتر خوبیوں اور خامیوں کو سمیٹ لیا ہے۔ جوش نے اپنی اس تصنیف کو طرح طرح کے ادبی حسن سے آراستہ کیا ہے۔ اس میں ان کے نثری اسلوب کے ہر طرح کے نمونے ملتے ہیں۔ ان کی تنقیدی نثر کی مثال اقبال کے تعلق سے، پہلے ہی پیش کی جا چکی ہے۔

اس کے علاوہ اس میں ادب لطیف کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں اس مقصد کے لئے جوش اپنی نثر کو شعری محاسنات سے سجایا ہے اور جملوں کو مقفٰی بنا کر پیش کیا ہے جس کی وجہ سے اس میں شعریت پیدا ہو گئی ہے لیکن ادب لطیف کے نمونے بہت سے غیر مقفٰی جملوں میں بھی مل سکتے ہیں۔ مثلاً

"تمھیں کیا خبر۔ کہ ہم شعرائے کرام الفاظ کے معنٰی یوں بدل دیتے ہیں۔ کہ لغت کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔"

"میں نے بھی اپنے دل کو عیاشی کا وطن نہیں بننے دیا۔ بلکہ اسے ایک رات کا مسافر خانہ بنائے رکھا اور ایسا مسافر خانہ جس پر صبح کی پہلی کرن کبھی نہیں پھوٹتی ـــــــ"

مگر اس تصنیف میں عام طور پر مقفٰی جملے میں ادب لطیف کی مثال پیش کی گئی ہے جو بیشتر مختلف خاکوں کے شروع میں ملتے ہیں۔ مثلاً جوش، مسز سروجنی نائیڈو کے خاکے کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:ـــ

بادۂ شاعری سے سرشار، گروہ شعراء کی غمگسار، آزادی کی شیدائی، محبت کی شہنائی لہجے میں ارغنوں، باتوں میں افسوں، میدان جنگ میں جھانسی کی رانی، ایوان امن میں قرۃ العین ثانی، تقریر میں نغمۂ آب حیواں، آواز میں جمال ماہِ کنعاں۔۔۔۔" [2]

اسی عبارت میں مقفٰی جملے کے متعدد جوڑے بنائے گئے ہیں۔

---

[1] ایک گزری کتاب (تبصرہ صدق جدید۔ ۲۰ جولائی ۱۹۷۲ء ص۔ ۴
[2] یادوں کی برات ـ ص ۵۹۴

مگر پرنس مرزا عالمگیر گورگانی کی خاکہ نگاری اس طرح شروع کرتے ہیں کہ اس میں مقفیٰ جملے کی ایک زنجیر بن جاتی ہے ۔ ملاحظہ ہو :۔

" خاندان تیموری کی یادگار، لکھنؤ کے باشندۂ پُروقار، کچھ اوپر چالیس برس سے ضیق النفس میں گرفتار، پھر بھی آواز پاٹ دار ... ۔ میرے لڑکپن کے یار "[1]

جواہرلال نہرو کے خاکہ کی ابتدا بھی وہ اسی انداز کے مقفیٰ جملے سے کرتے ہیں :۔

" وہ اپنی موہنی صورت کی جاذبیت ، اپنے رنگ کی طلاقت ، اپنی آنکھوں کی مروت اپنے لہجے کی عذوبت ، اپنے تکلم کی موسیقیت ، اپنے تبسم کی حلاوت ، اپنے خاندان کی وجاہت ، اپنے دل کی آفاق در آغوش وسعت ، اپنے مزاج کی بے نظیر شرافت ، اور اپنے کردار کی بے مثال نجابت ۔ "[2]

اس میں دس ہم قافیہ جملے تواتر کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں لیکن قافیہ بندی کا انداز ، مرزا عالمگیر قدر کے خاکے سے قدرے مختلف ہے ۔

اس کے علاوہ اس قسم کی نثر دوسرے موقعوں اور جگہوں پر بھی مل سکتی ہے جہاں ان کی شاعرانہ روکچھ بہک گئی ہے ۔ کوئی خاص قاعدہ یا کلیہ مقرر نہیں ہے ۔ اپنے محبوبوں کے بیان میں بھی جوش نے اسی قسم کے نثری نمونے پیش کئے ہیں ۔ جس ساقی کے ہاتھوں انھوں نے شراب کا پہلا جام نوش کیا تھا اس کا سراپا وہ اس طرح کھینچتے ہیں :۔

" سولہ برس کا سن ، مرادوں کی راتیں ، مرادوں کے دن ، وہ چھلاسی کمر ، وہ صراحی دار گردن ، کسمساتا بدن ، وہ گدرایا ہوا جوبن ۔ "

جوش واقعہ نگاری میں عموماً عاری نثر لکھتے ہیں ۔ لیکن کہیں کہیں مقفیٰ طرز کا ایک ہلکا سا انداز بھی ملتا ہے اردو تصنیف میں مقفیٰ طرز کی ابتدا سے ملتا ہے یہ فارسی کے اثر سے اردو میں شروع ہوا تھا ۔

---

[1] یادوں کی برات ۔ ص ۴۳۹

[2] " " ص ۴۵۰

سب سے پہلے جس اردو تصنیف میں اس طرز کو بھرپور طور سے برتا گیا۔ وہ ملّا وجہی کی سب رس ہے ملّا وجہی بھی بلا امکان مقفیٰ جملے لکھتا چلا جاتا تھا۔ اس کے یہاں چھ چھ اور آٹھ آٹھ جملوں کی مقفیٰ مثال بھی مل سکتی ہے۔ اس انہماک کے ساتھ لکھے گئے مقفیٰ جملوں کی مثال اگر اور کہیں مل سکتی ہے تو وہ جوش کی اس لطیف زیر بحث میں مل سکتی ہے۔

ادب لطیف میں شعریت پیدا کرنے کے لئے مبالغہ اور غلو کی صنعت کا استعمال بھی ضروری ہے جوش نے بھی اس صنعت کا خوب استعمال کیا ہے جس کا اندازہ درج بالا عبارتوں سے بھی لگ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر شعری محاسنات کو بھی انھوں نے اپنی نثر میں تواتر کے ساتھ برتا ہے۔

بہر حال اپنی نثر میں شعریت پیدا کرنے کے لئے انھوں نے ان تمام وسائل سے کام لیا ہے۔ جو شاعری میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔ لیکن ان کی اس قسم کی نثر ایسی جگہوں پر کھٹکتی ہے جہاں سنجیدہ علمی موضوعات سے بحث کی گئی ہو۔ "یادوں کی برات" میں اس طرح کی بے محل شہنائی کی مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ جیسے جوش، دین سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار، ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "...... میرا دین، خیابانِ ذہنِ انسانی کی نمائے رنگ و بو، حصولِ علم و فقدانِ جہل کی آرزو اور محرک اولین کی مسلسل جستجو ...... نوائے کائنات سے گرم پیکار جنسِ آگاہی کے خریدار اور ذرات و انجم شکار ......" ؎

یہاں مقفیٰ جملوں کے علاوہ عبارت کی شعریت بھی کھٹکتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ آخر جوش کیا کہنا چاہتے ہیں؟

جوش نے واقعہ نگاری کرتے وقت اپنی نثر میں افسانوی دل کشی پیدا کی ہے۔ ایسے موقع پر وہ عموماً سلیس اور آسان الفاظ نہایت روانی اور برجستگی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جہاں انھوں نے اپنی شراب نوشی کا واقعہ بیان کیا ہے یا اپنے معاشقے قلمبند کئے ہیں۔ افسانے اور ناول کا سا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ چونکہ یہ ان کی زندگی کے شروع کے واقعات ہیں جب وہ نوجوان تھے اس لئے اس میں جذباتی اور رومانی انداز شدت سے محسوس ہوتا ہے۔

---

؎ یادوں کی برات ص ۲۸۱

افسانوی نثر کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے جس میں جوشؔ اپنی شراب نوشی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ماضی کے دھندلکے میں ڈوب گئے ہیں۔ بس لہجہ سنجیدہ اور درد انگیز ہے۔

"..... مجھ کو آخر یہ زبردستی جلایا کیوں جا رہا ہے کیا میں ہی ایک رہ گیا ہوں مشقِ ستم کے واسطے۔؟ ..... سلونی فضا سنیما کے پردے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہر آن پردے اٹھنے اور گرنے لگتے ہیں اور ہر پردے کے اٹھتے وقت گھنٹیاں سی بجتیں اور منادی کی آواز گونجنے لگتی ہے۔ کہ اے جوشؔ دیکھو! تیرا ملیح آباد وہ کنول ہے جہاں تو شہزادوں کی طرح رہتا تھا.... یہ وہ انگنائی ہے۔ جہاں تو کھیلا کرتا تھا ... جس نے برکھا رُت میں کلکتہ والا ساون گایا اور گھر بھر کو رُلا دیا ...."[1]

یہ تو جوشؔ کا جذباتی انداز ہے۔ خوشگوار اور ہلکے پھلکے موڈ میں لکھتے ہیں۔ تو اس میں ایک نشاط انگیزی اور لطیفہ گوئی کی حیثیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً:-

"رفیع نے ایک دن مجھ سے پوچھا۔ کہ بیٹا خراب نکل جاتا ہے تو اس کو ناخلف کہتے شبیر یہ تو بتاؤ کہ باپ خراب نکل جائے تو اسے کیا کہیں گے۔ اور میں نے کہا تھا — "ناسلف" - جب میری پہلی تصنیف "روحِ ادب" نکلی تھی۔ اس پر رفیع نے مقدمہ لکھا تھا۔ تو "گلِ رعنا" کے مصنف حکیم عبدالحی صاحب کے پاس اس کو لے کر گئے تھے۔ اور کہا تھا۔ یہ دیکھئے! ایک بدمعاش کی کتاب پر دوسرے بدمعاش نے مقدمہ لکھا ہے۔ چور کا بھائی۔ گرہ کٹ۔ "[2]

ناول اور افسانے میں عوامی لب و لہجہ اور بول چال کی زبان سے فطری انداز پیدا ہوتا ہے جوشؔ نے اپنی اس مایہ ناز تصنیف میں بڑی تعداد میں بول چال کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مثلاً کچکچیا کر، دغدغا کر، دن، ڈھل ڈھل، کھدبداتی، پلوا، جانگلوس، اوندھا، اوندھا، دھم دھم ہونکتے، دھمال، چرسے، منک، تھپڑی، گوڑ وغیرہ —

---

۱؎ یادوں کی برات - ص ۲۷۷

۲؎ ″ ″ ص ۳۹۰

اس کے علاوہ جوشؔ نے بہت سے نئے الفاظ اور ان کے گر ایجاد بھی کئے ہیں ان میں سے اکثر لطف دیتے ہیں جس سے ان کی نثر میں دلکشی پیدا ہو گئی ہے لیکن بعض برے بھی لگتے ہیں:۔
مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے جوشؔ کی اختراعی صلاحیت کو اپنا موضوع اس طرح بنایا ہے :۔

"...... ترکیبوں اور محاوروں میں کہیں کہیں تو بے شک جدت، ندرت، تازگی اور حلاوت ہے لیکن کہیں کہیں غرابت اور بھدا پن بھی ہے مثلاً بارش کے بجائے رم جھم کے روم جھوم یا پانی کا جھوم جھام کے برسنا، یا بیٹا پانی کے بجائے میٹھے کا پانی یا اندھیرے کی جگہ اندھیارا، یا گوڑیت (دیہاتی چوکیدار) کے بجائے۔ گوڑ۔ ص ۱۷۱" [1]

اس کے علاوہ انھوں نے جو تشبیہات اور استعارات یا دیگر شعری محاسنات استعمال کئے ہیں ان کا انداز بھی تمثیلی، وضاحتی اور افسانوی ہے۔ مثلاً شروع ہی میں "چند ابتدائی باتوں" کے عنوان سے لکھتے ہیں :۔

"اس مسودے کو میں نے ایک ایسے گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح لکھا ہے جو صبح کو بیدار ہو کر رات کے خواب کو اسی خوف سے الٹا سیدھا لکھ مارتا ہے۔ کہ کہیں وہ ذہن کی گرفت سے نکل نہ جائے۔" [2]

"میرے کان مطربہ کی ٹھمریوں کے جھولے میں جھول رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ گویا عرب کی ہزار راتیں اس ایک رات میں سمٹ آئی ہیں۔"

جوشؔ کی خود نوشت کو پڑھنے پر ایک ناول کا لطف آتا ہے خواہ اخلاقی نقطۂ نظر سے اس کے اندر کتنی بھی قابل اعتراض باتیں کیوں نہ ہوں لیکن اس کی دلچسپی اور دلکشی کی وجہ سے کوئی شخص پڑھنے سے باز نہیں آتا۔

---

[1] صدق جدید۔ ص ۴۔ ۲۸ جولائی ۱۹۷۲ء

[2] یادوں کی برات۔ ص ۷۔

سوانح عمری خاص کر خود نوشت شخصی اور داخلی رنگ سے کبھی خالی نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے "اطراف غالب" میں شامل" غالب کی سوانح عمریوں کے عنوان سے تحریر کیا ہے کہ

"سوانح عمری اپنے معیار پر اس وقت پوری اترتی ہے جب اس کو پڑھتے وقت ناول کا لطف آئے۔ ورنہ سوانح حیات، حالات اور واقعات کا ایک روزنامچہ بن کر رہ جائے گی۔"

"یادگارِ غالب" کے بعد غالب کی کئی سوانح عمریاں لکھی گئیں ان کے اندر ان کی حیات پر بہت سے نئے مواد سامنے آئے ہیں بہت سے واقعات تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں لیکن ڈاکٹر موصوف نے اسی افسانوی دل کشی اور دلچسپی کی بنا پر "یادگار غالب" ہی کو اب بھی غالب کی سب سے عمدہ سوانح عمری و سوانح نگاری قرار دیا ہے۔

"یادوں کی برات" اپنے داخلی اور شخصی رنگ، عمدہ اسلوب نگارش، واقعہ نگاری اور اپنی افسانوی نثر کی بنا پر حالات اور واقعات کا ایک روزنامچہ بننے سے بچ گئی ہے اور ایک اعلیٰ درجہ کی خود نوشت سوانح حیات کے معیار تک پہنچ سکی ہے۔

"یادوں کی برات" ڈاکٹر محمد حسن کے اس کلیہ سے بھی بلند ہو کر سامنے آتی ہے کہ:-

"خود نوشت سوانح نویس جب اپنے بارے میں کچھ لکھتا ہے تو عموماً ارادۃً ہی۔ بلکہ غیر شعوری طور پر بھی وہ صرف ان ہی واقعات کو اہمیت نہیں دیتا جن سے اس کی شخصیت کے پسندیدہ اوصاف سامنے آجاتے ہیں۔ بلکہ اکثر و بیشتر اپنی ان خصوصیات پر نقاب ڈال دیتا ہے جن کے بیان سے اس کی عظمت پر دھبہ پڑنے کا امکان ہو۔" [1]

یہ کلیہ ڈاکٹر اقبال کی سوانح حیات پر تو چسپاں ہو سکتا ہے لیکن جوش کی خود نوشت "یادوں کی برات" پر نہیں۔ جوش تو اپنی اس تصنیف میں منہ پھٹ ہونے کی حد تک اپنی بے باکی، صاف

---

[1] اپنی تلاش میں پروفیسر کلیم الدین احمد کی خود نوشت سوانح حیات۔ ہماری زبان ۸ر و ۱۵ر ستمبر ۱۹۷۶ء۔ ص ۱

گوئی، جرأت اور بے باکی ہی کے سبب بدنام اور رسوا ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی شراب نوشی، معاشقے اور زندگی۔ نیز دین سے متعلق تمام حالات اور خیالات کو صاف صاف بیان کر دیا ہے اس کے ذریعہ جوش کے اندازِ فکر، جذبات، ذہنی سفر کی روداد، اور ان کے ادبی و علمی اکتسابات، غرض تمام چیزوں کے چہرے سے نقاب اٹھ جاتا ہے اور جوش اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگتے ہیں۔

جوش نے ان تمام امور کو اس مرکب انداز میں پیش کیا ہے کہ ان کی خود نوشت ادبی حسن سے مالامال ہو گئی ہے۔ اور اس میں ایک سوانحی ناول کی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی تصنیف "کارِ جہاں دراز" کو صرف ناول بلکہ ایک عمدہ ناول قرار دیا جاتا ہے۔ جو اپنی خشکی اور بے کیفی کے لئے مشہور ہے خصوصاً اس کی پہلی جلد جس کو بہت کم لوگ آخر تک پڑھ سکے ہوں گے۔ تو "یادوں کی برات" کو اپنی تمام افسانویت، دلکشی اور دلچسپی کے باوجود ناول کیوں نہیں کہا جا سکتا جس کا مرکزی کردار خود جوش ہیں۔ اور جس کے گرد اس کے تمام کردار اور واقعات گھومتے ہیں۔ جیسے "امراؤ جان ادا" میں امراؤ کے گرد کردار و واقعات ہی کیا پورا معاشرہ و سماج گھومتا ہے۔

"یادوں کی برات" میں جوش کے گرد بھی ہر چیز اور وہ پورا عہد گھومتا ہے خواہ ان کے احباب کی شکل میں ہو۔ یا ان کے محبوبوں کی شکل میں۔ اس زمانے کی عجیب ہستیاں ہوں یا کچھ اور، ہر ایک شے جوش کے تعلق سے اس تصنیف کے پردے پر ابھرتی ہے۔

مزید برآں یہ کہ جوش نے جس ذہنی حالت میں اس کو لکھا ہے اس میں تاریخ یا سوانح حیات نہیں بلکہ ناول ہی لکھا جا سکتا تھا۔ ..

# قطعات

ادھر تو نظم کا بے تاج بادشاہ گیا
ادھر غزل کے محافظ نے جان کو ہارا
یہ جا کے جوش کی تربت پہ کہہ دیا جائے
ترے فراق کے غم نے فراق کو مارا

اظہار مرزا اعجازی

فراقِ جوش سے دل کو ابھی قرار نہ تھا
کیا ہے موت نے ہم سے یہ ایک اور مذاق
ہر ایک خادمِ اردو زباں کے سینے میں
ہے آج زوروں پہ طوفانِ جذبِ جوش فراق

# احسان دانش اور تصورِ انقلاب

عزیز اندوری
صدر شعبۂ اردو
اسلامیہ کریمیہ ڈگری کالج اندور

زندگی اور فن کے باہمی رشتہ کی ضرورتوں کو جن حالات کے تحت ناگزیر سمجھا جاتا ہے یا ان رشتوں کی تیزی اور شدت کو جس طرح محسوس کیا جاتا ہے اس کے بہت سے بنیادی اسباب ہوتے ہیں مثلاً سماجی، سیاسی، مذہبی، اخلاقی، معاشی، اور معاشرتی انداز فکر میں جب نئی تبدیلیوں کے احساس کی شمولیت ہوتی ہے زندگی میں پھیلاؤ پیدا ہوتا جاتا ہے اور فن اس پھیلاؤ کا ایک مؤثر ذریعہ بن جاتا ہے۔

جہاں تک فنِ شعر و ادب کا تعلق ہے اسے زندگی کا مکمل عکاس بنانے کی جانب ہر عہد میں توجہ دی گئی ہے کبھی یہ توجہ زود اثر ہوتی ہے تو کبھی اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں دشواریوں کے ساتھ ہی تاخیر بھی ہو جاتی ہے۔ اردو شعر و ادب میں یہ سلسلہ کچھ تاخیر سے شروع ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے کو دراز کرنے والوں کے ذہنوں پر ہندوستانی سماج اور سیاست کی کشمکش ہمیشہ مسلط رہی۔ اندرونِ ملک ابھرنے والی اس کشمکش کے علاوہ بیرونی کشاکش اور حکمتِ عملی نے بھی اردو شعر و ادب میں مذکورہ سلسلے کو دراز ہونے اور اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں پھر بھی ہندوستانی سماج اور سیاست کے نشیب و فراز کی تقادیر کے ساتھ ہی عالمی پیمانہ پر مقبول تحرکات کے اثرات کو اردو کے ان فنکاروں نے پوری سنجیدگی اور شدت کے ساتھ قبول کیا جو زندگی اور فن کے رشتوں کو استوار و مستحکم بنانے کے خواہاں تھے۔

جو لوگ ادب کو انسان کے سماجی شعور کا مظہر سمجھتے ہیں وہ معاشرے کی ترقی پسند تبدیلیوں کے امکانات پر غور کر کے انسانی جدوجہد کو تیز تر کرنے پر ہمیشہ مائل رہتے ہیں۔ وہ تاریخی عمل کو مادّی تبدیلیوں کا ہم کاب کر کے انسانی رشتوں، سماجی ارتباط اور معاشی عوامل کو ادب کا ایک حصہ بنانے پر زور دیتے ہیں۔ ان مادّی تبدیلیوں کی بنیاد، اکثر سیاسی کشمکش اور مذہبی و اخلاقی اقدار و نظریات کے مابین تصادم پر رکھی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ تاریخی یا کلی طور پر چند معاشی تبدیلیوں کے پیش نظر بھی ان بنیادوں کو ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔

تبدیلیوں کا یہ احساس یوں تو ہر عہد میں کسی نہ کسی حد تک ہر معاشرہ میں نظر آتا ہے لیکن بیسویں صدی میں صنعتی سرمایہ داری کے سر ابھارتے ہی اس احساس میں نہ صرف شدت ہی پیدا ہو گئی۔ بلکہ اسے واضح اور باشعور انداز سے اختیار کئے جانے پر زور دیا جانے لگا اور جیسے جیسے انسان کا سماجی و سیاسی شعور بڑھتا گیا۔ علم و حکمت اور تاریخی تجربات فزوں ہونے گئے ویسے ویسے سماجی سیاسی اور تہذیبی تغیرات کی تشریحات و توضیحات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

سرمایہ داری نظام میں انسانی شعور کی پختگی اور انضباط کے نتیجے میں علوم و فنون میں سائنٹفک طرزِ فکر کو بھی عروج حاصل ہوا۔ لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ایسے عالم میں نئی اور پرانی قوتوں اور قدروں کے درمیان زبردست تصادم ہوتا رہا کبھی یہ بھی ہوا کہ جہد و پیکار کے عالم میں نئی اور پرانی اقدار کی آویزش بھی ناگزیر ہو گئی لیکن مجموعی طور پر معاشرہ کے تہذیبی یا اخلاقی ڈھانچے کو تبدیل کرنے کا اصل سبب وہ نتائج رہے جو چند بنیادی معاشی تبدیلیوں کے تقاضوں کی شکل میں ظاہر ہوتے رہے ہیں

بیسویں صدی کی صنعتی سرمایہ داری کے نتیجے کے طور پر معاشرتی، سیاسی اور معاشی تبدیلی کے امکانات پر اس وقت زیادہ شدت کے ساتھ غور کیا جانے لگا جب یہ صنعتی سرمایہ داری، صنعتی اجارہ داری کا روپ دھارن کرنے لگی ایسے میں تخلیق کیا گیا ادب سماجی حقیقت اور سارے عوامل و روابط کے ساتھ وجود میں آیا اور اس کے خالق کو اپنے عہد کے مخصوص تاریخی حالات کا تجزیہ کرتے وقت سماج کے بنیادی معاشی و معاشرتی مسائل کو بھی زیرِ غور لانے لگا اور بہبود انسانیت سے متعلق مسائل کا اسے گہرا مطالعہ کرنا پڑا۔

اگر انسانی معاشرے میں کسی قسم کی نابرابری یا غیر مساوی جذبات کے سرنگوں ہونے کا شائبہ بھی ہوتا ہے تو ادراک حقیقت کے تحت ایک سچے فن کار یا خالق کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان ناانصافیوں اور تفرقہ پروری کے خلاف آواز اٹھائے تاکہ معاشرہ شر اور تخریب سے محفوظ رہ سکے۔ خالق کے اسی احساس کا نام ادب میں انقلاب بھی ہے۔

اس طرح انقلاب کے تصور سے شاعری اسی وقت مالا مال ہو سکتی ہے جب اس کا خالق زندگی کے سارے خارجی حقائق کو احاطۂ تحریر میں لائے اگر کوئی فن کار اپنے دور یا اپنے معاشرے کے سیاسی، معاشی، اخلاقی اور معاشرتی حالات اور ان حالات سے پیدا ہونے والی تحریکوں سے خود کو الگ رکھتا ہے تو وہ طبقاتی کشمکش، سماجی حقائق اور ادراک حیات سے اپنی شاعری کو مؤثر نہیں بنا سکتا۔

جہاں تک اردو میں انقلابی شاعری کا سوال ہے اس کی داغ بیل تو اسی وقت سے پڑ گئی تھی۔ جب سر سید احمد خاں اور حالی جیسے مصلحِ قوم شعر و ادب کی جانب مائل ہوئے تھے۔ خاص طور سے حالی کی مسدس والی شاعری نے ہر محفل میں دھوم مچا دی تھی۔ حالی نے مسدس نما شاعری سر سید کی تحریک پر کی تھی۔ سر سید نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کے لئے مغرب سے ذہنی مطابقت فائدہ مند ہے۔ ان کے اسی تصور پر ایک نئی ادبی تحریک عالم وجود میں آئی جس نے زندگی کے تمام ہی اہم شعبوں میں تحرک، روانی اور گرمی پیدا کر دی۔ اور جب حالی نے اس نئی ادبی تحریک کو شعری قالب میں پیش کیا۔ تو ان کا یہ اقدام نہ صرف شاعری میں۔ بلکہ سماجی، سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے بھی نیز تہذیبی نقطۂ نظر سے انقلاب کی بازگشت بن گیا۔ جس کی گونج ان کے بعد کے شعراء کے کلام میں برابر سنائی دیتی رہی۔

غرض غدر سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک جس شاعری کی تخلیق کی گئی اس پر مقصدیت کی چھاپ بھی رہی۔ اسی چھاپ نے ایک نئے انقلاب کی آمد کے لئے راہیں ہموار کیں اس نئے انقلاب کی آواز اقبال کی شاعری میں فلسفیانہ روپ اختیار کر کے زیادہ سنجیدگی اور پختگی کے ساتھ سنائی دی جانے لگی۔ گویا اس عہد تک آتے آتے انقلاب کے تصور میں فکر و شعور کی گہرائی بھی شامل ہو گئی۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ اقتصادی پیچیدگیوں، روس میں پہلے پنج سالہ منصوبے کی کامیابی، ہندوستان

میں سول نافرمانی کی تحریک نے ہندوستانیوں کی زندگی کو گویا زیادہ رواں، دواں، متحرک اور انقلابی بنا دیا تھا۔ سرمایہ داروں کے جابرانہ رویے، جاگیرداروں کے سفاکانہ سلوک مہاجنوں کی لوٹ کھسوٹ، اور کسانوں کی زبوں حالی نے مجموعی طور پر اردو شاعری میں انقلاب کے ایسے تصور کو داخل کر دیا تھا جو زیادہ تلخ اور کرخت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عالم میں تخلیق کی گئی شاعری میں موجودہ انقلاب کے تصور میں زیادہ کرختگی اور چیخ پکار نظر آتی ہے۔ اس کی مثال ہمیں جوش ملیح آبادی کی اکثر نظموں میں مل جاتی ہے۔

تصورِ انقلاب میں برق و رعد جیسی کیفیت کا پیدا ہو جانا فطری ہوتا ہے لیکن یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ سماج کے جس طبقے کے لئے انقلاب کی ضرورت کو محسوس کیا جاتا ہے تصورِ انقلاب کو اس طبقہ کے ذہن میں پوری طرح اتارا جائے۔

سماج کے غیر مساوی جذبے کا سب سے زیادہ اثر کسان اور مزدور طبقے پر ہوتا رہا ہے اتفاق سے جوش سے لے کر ترقی پسند شعراء کی شاعری میں انقلاب کے جس تصور کو جس انداز سے پیش کیا گیا اس میں ولولہ خیزی، جوش اور گھن گرج سب کچھ موجود تو تھا۔ لیکن ان کی شاعری کا بڑا حصہ کسانوں اور مزدوروں کے لئے ناقابلِ فہم رہا۔ اس لئے اس میں برق و رعد کی "! بناکی اور گھن گرج ہونے کے باوجود وہ شاعری کسانوں اور مزدوروں کے دلوں پر براہِ راست اثر نہیں کر سکی اور نہ ان طبقوں میں سماجی تبدیلیوں کی حرارت ہی پیدا کر سکی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے ان شعراء کے کلام میں انقلاب کی شدت تو مل جاتی ہے لیکن گہرائی اور آستی کام نہیں ملتا۔

اس سلسلہ میں ایک ایسے شاعر ہمیں ضرور نظر آتے ہیں جن کے تصورِ انقلاب میں ادراک حقیقت کی پرچھائیاں بھی مل جاتی ہیں وہ احسان دانش ہیں جن کی شاعری میں تصورِ انقلاب ادراکِ حقیقت کی شکل اس لئے اختیار کر لیتا ہے کہ انھوں نے عملی اور ذاتی طور پر مزدوروں کے مسائل کو پرکھا ہے۔ اور ان مسائل کو اپنی روح میں اتار کر شعری صورتوں میں پیش کیا ہے اس سلسلے میں ان کی نظم "ضیاء و ظلمت" کا ذکر بے محل نہیں ہوگا جس میں انھوں نے بہرحل شرقی کی مزدوری، لاہور کے باغ کی چوکیداری، باغبانی اور خشت برداری کی جانب لطیف اشارے کئے ہیں — ملاحظہ کیجیے۔

لب پہ دریائے جمن کے ہے فسانہ میرا
اس کی اولاد کو پروان چڑھایا میں نے
چشم حیراں میں بسائی ہیں بھیانک راتیں
لوریاں دے کے گلستاں کو سلایا میں نے
میری فریاد نے چیرا ہے خموشی کا جگر،
صبح کو رات کی سیجوں سے اٹھایا میں نے
میرا دل بند ہے ہر ایک جگر بند چمن
خارِ صحرا کو کبھی منہ نہ لگایا میں نے
اپنے افلاس کو مغرور بنا کر رکھا،
سر نہ اب تک کسی چوکھٹ پہ جھکایا میں نے،

احسان دانش کے اس ذاتی عمل نے ان کی شاعری میں ایک منفرد تصورِ انقلاب کو پیدا کرنے میں بڑی حد تک مدد کی ہے۔ چاہے ان کی شاعری کو کسی ایسے سماجی یا سیاسی پس منظر کا نتیجہ نہ کہا جائے جس کا تعلق کسی فلسفہ یا ازم سے رہا ہو لیکن ان کی شاعری ان کے ذاتی حالات کی عکاسی ضرور کرتی ہے جن کا براہِ راست اظہار کر کے احسان دانش نے چاہے سماجی تغیر یا سیاسی انقلاب کی پیش گوئی نہ کی ہو، لیکن ان کی شاعری میں ایسے تمام تر تحرکات اور رجحانات مل جاتے ہیں جن کا تعلق اور رشتہ سماج اور سیاست کے ساتھ ہی جمہوریت، واقعیت اور عملی مشقت سے پوری طرح جڑا رہتا ہے۔

احسان دانش جب بھی اس رشتہ کو نبھانے کی غرض سے اپنی شاعری کو تصورِ انقلاب، یا نظریۂ طبقات سے مربوط و مستحکم کرتے ہیں تو ان کی نظموں کے ایک ایک مصرعہ سے ان کے ذاتی تجربات جھلکنے لگتے ہیں وہ اپنے ان تجربات و جذبات کے ذریعہ محنت کش عوام اور جمہور نواز افراد کی جتنی صاف ستھری عکاسی کرتے ہیں اس میں تمام انسانوں کے دلوں کی دھڑکن ہمیشہ شامل رہتی ہے۔ ان کی نظموں کا وہ رخ ہے جسے ہم شاعری میں انقلاب کے نئے امکان سے تعبیر کرتے ہیں۔
احسان دانش نے اپنے فن کو طبقاتی بنیادوں کا آئینہ بنا کر پیش کیا ہے جس نے انھیں

ایسے عوامی فن کاروں کی صف میں شامل کر دیا۔ جو محنت کش طبقے کی زندگی کی جیتی جاگتی اور حقیقت افروز عکاسی میں مہارت رکھتے ہیں۔

احسان دانش کے ساتھ ہی چند نام محنت کش طبقہ اور بطور خاص مزدور طبقہ کے شاعر کی حیثیت سے مقبول رہے ہیں لیکن احسان ان سب سے اس لئے ممتاز نظر آتے ہیں۔ کہ انھوں نے اپنی نظموں میں دوسرے شعراء کی طرح محض متوسط طبقے کی زندگی سے متعلق اپنے مشاہدات پیش نہیں کئے۔ بلکہ مزدور طبقہ کی زندگی کو بیان کرتے ہوئے مزدور کے اصل خط و خال کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احسان کی نظموں کو پڑھنے کے بعد محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کے تجربات و جذبات حقیقت سے معمور ہیں۔

مزدور طبقے کی روزمرہ کی زندگی سے متعلق موضوعات پر مشتمل ان کی نظمیں اردو ادب میں بیش بہا اضافے کی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں۔

احسان دانش نے انقلاب کے تصور کو محض حس کر یا محسوس کر کے اپنی نظموں میں پیش نہیں کیا ہے۔ بلکہ جن حالات سے وہ گزرتے رہے جو سختیاں ایک مزدور کی حیثیت سے انھوں نے جھیلیں اور ان سے جس طرح کے نتائج ان کے مقابل آکر حاصل حیات بنتے رہے ہیں ان سب کو احسان نے الفاظ کا قالب دے کر ان نظموں میں سمو لیا ہے اسی لئے ان کی اکثر نظمیں کسی اصل واقعہ یا ایسے حادثے کی عکاسی کرتی ہیں جن سے وہ خود دوچار ہو چکے ہیں۔

احسان نے ان واقعات یا حادثات کو اپنی داخلی کیفیات سے ہمیشہ مربوط رکھا ہے اسی لئے ان کے احاطۂ فکر میں آکر یہ واقعات و حادثات نہ صرف اہم ہی بن جاتے ہیں۔ بلکہ اردو نظم نگاری کو نئے امکانات سے قریب بھی کر دیتے ہیں۔ اور جن میں وہ ادراکِ حقیقت کو اوّلیت دینے کی جانب متوجہ رہتے ہیں۔ گویا احسان دانش مزدور طبقے کی زبان سے آپ بیتی بیان کرنے کی جس طرح کوشش کرتے ہیں اسے دیکھ کر بعض حضرات ان کی نظموں کو "مزدور نامہ" کہتے رہے ہیں۔ کسی نے انھیں مزدور کا خاندانی شاعر کہا ہے۔ [1]

---

[1] سید صفدر حسین ۔ ہماری شاعری کے جدید رجحانات ۔ مطبوعہ ماہنامہ نگار لکھنؤ ۔ جنوری [illegible]

ان کی نظموں میں دردمندی اور خلوص کی جیتی جاگتی تصاویر ملتی ہیں انھیں دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ احسان کا سماجی شعور محض دکھاوے کی چیز نہیں ہے اور نہ ان کا تصورِ انقلاب محض نعروں کی گونج پر مبنی ہے اسی لئے احسان کی نظموں میں موجود انسانی رشتوں، سماجی روابط اور معاشی عوامل کی بنیادیں کھوکھلے انقلاب کی رنگین تصاویر پیش نہیں کرتیں۔

سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ احسان نے سماجی تبدیلیوں اور سیاسی انقلاب کے لئے کسی بہت مقبول فلسفہ کا نہ تو مطالعہ ہی کیا ہے اور نہ کسی مفکر کے نظریات کی کورانہ تقلید ہی کی ہے وہ اس سلسلے میں ایسی تحریکات سے بھی گریز کرتے نظر آتے ہیں جہاں کے ذاتی تجربات کے مقابلہ میں کسی مخصوص نظریہ کو قبول کرنے پڑ جائے۔ چونکہ انسانی رشتے اور معاشی عوامل ان کے جسم و روح میں پیوست ہو چکے تھے۔ اس لئے انھوں نے ایسی نظموں کی تخلیق کی جنھیں سرمایہ دارانہ استعماریت اور صنعتی اجارہ داری کے خلاف ایک تیز ردِّعمل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے بعض جگہ ان کا یہ ردِّعمل بغاوت کی شکل میں بھی ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

بات یہ ہے کہ احسان دانش نے اپنے ذاتی تجربات کے ذریعے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کے سینوں سے بغاوت کا جو لاوا پھوٹا تھا اس کا اصل سبب حصول آزادی کے ساتھ ساتھ سامنتی نظامِ فکر، معاشی انتشار اور جاگیردارانہ بربریت کے خلاف ہندوستانیوں کا صف آرا ہونا بھی تھا۔

اسی کے ساتھ ۱۹۳۶ء کے بعد بار کسی فلسفے کو میکانکی طور پر اختیار کرنے کا رجحان روز بروز بڑھ رہا تھا۔ اور سماجی یا سیاسی مسائل، انسانی رشتے اور معاشی عوامل، ایک مخصوص سیاسی منشور کے تحت شعر و ادب میں داخل ہونے لگے تھے۔ یہاں تک کہ بعض ناقدین نے تو اس سلسلے کی خلاف ورزی کرنے والے نظم گو شعراء کو معتوب قرار دیدیا تھا۔

احسان دانش نے خود کو اس سیاسی منشور کا تابع نہیں ہونے دیا۔ اور نہ انھوں نے اس سیاسی منشور کے زیرِ اثر ابھرنے والے نظریۂ حیات کو اپنی نظموں کا مقصد ہی بنایا۔ بلکہ وہ محنت کش طبقہ کی ترجمانی اور انسانیت دوستی کے جذبات کی جمہوری بنیادوں اور صحت مند طرزِ فکر کو اپنی نظموں کا جزو سمجھتے رہے۔ یہی سبب ہے۔ کہ ان کی نظموں میں اندازِ بیان کی ندرت چاہے

پیدا نہ ہوئی ہو لیکن ان کی نظمیں موضوعات کے تاثر سے یکسر مبّرا بھی نظر نہیں آتیں۔

وہ اپنی نظموں کے لئے ایک ایسا سیدھا سادہ اور ہموار انداز اختیار کرتے ہیں جو ان کے موضوعات کو حقائق کی شدّت سے دور نہیں ہونے دیتا ہے اور جن میں ادراکِ حقیقت کی، شکل میں زندگی تر و تازہ نظر آتی ہے۔

چونکہ احسان دانش، کھردرے اور زندگی کے ناہموار راستوں کے راہی رہے ہیں اسی لئے ان کی نظموں میں بھی فکر، نظریہ اور فن کے اعتبار سے ممکن ہے کچھ خامیاں رہ گئی ہوں لیکن ان خامیوں میں ان کا خلوص، انسانیت دوستی اور انسانی رشتوں سے لگاؤ پردے ڈال دیتا ہے اور ان کی جمہوریت پسندی کے شدید جذبے اور اس کے اظہار کے لئے ان کے بے پناہ خلوص قوت مشاہدہ اور شعری قدرت کے باعث وہ جن خوشگوار سماجی تبدیلیوں کے خواہش مند نظر آتے ہیں اس نے انھیں اپنی فکر و نظر کی کمند کو چاہے ستاروں سے آگے نہ جانے دیا ہو۔ یا انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ زمان و مکاں کو زیر و زبر کرنے کی جرأت نہ کی ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ احسان دانش نے اپنے جمہوری کردار اور فکری ارتقا سے حدِّ امکاں تک مجبوری بے بسی سے نجات حاصل کرنے اور معاشرے کو اس لعنت سے چھٹکارا دلانے کا ایک موثر ذریعہ اپنی نظموں کو بنانے کی کوشش کی ہے۔

اسی لئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے بھی ارتقائے فکر اور حرکت پذیری کی شدت کو اختیار کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ رموزِ ہستی کو سمجھنے کے لئے منزل بہ منزل فطری ارتقا کے دامن کو تھامے آگے بڑھتے ہیں۔ ہر چند ان کے اس نظریۂ حیات کو ہم کسی سائنٹی فک نظرئے کا تابع نہیں کہہ سکتے۔ اور نہ اسے اشتراکیت کی اس صورت سے تعبیر کر سکتے ہیں جو تصنع پسندی کو جنم دیتی ہے اور نہ ان کا طبقاتی شعور کسی تاریخ داں کے شعور کی عکاسی ہی کرتا ہے۔ بلکہ ایک سچے انسان دوست فن کار کی حیثیت سے انھوں نے حس تیز، مشاہدے، جمہوریت پسندی اور انصاف پرستی پر مبنی شعور کا اظہار اپنی نظموں میں کیا ہے۔ اس نے ان کے انقلابی شعور میں تلخ نوائی کو بھی شامل کر دیا ہے۔

خاص طور سے وہ جب مکروہ طبقاتی نظامِ حیات کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے

ہیں تو ان کی آواز میں تلخی وگرختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:-

"اس کے یہاں دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی شدت نہیں اس کے خیالات سطحی اور جذبات ہنگامی نہیں۔ اس کی شاعری اس کے شدید احساس کی پیداوار ہے۔ اس کے یہاں عریانی نہیں، زندگی سے فرار نہیں۔ وہ تکنیک کے نئے اور پرانے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ نہ اپنے کلام کو مبہم اشاروں اور دور از کار کنایوں سے چیستان بنانے کی کوشش کرتا ہے اس کی شاعری اس کی شدید قوت حاسہ کا آزادانہ برجستہ اظہار ہے۔"

طبقاتی نظام زندگی کے خلاف تلخ نوائی کی شدت احسان دانش کی شاعری میں بغاوت کی سطحوں کو چھو لیتی ہے۔ کہیں کہیں بغاوت کا یہ جذبہ ان کی نظموں میں للکار اور آتش نوائی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اس سلسلے میں ان کی نظم "باغی کا خواب" بڑی اہم نظم ہے خود احسان نے اس نظم کے بارے میں لکھا ہے۔ کہ ناسازگار راحول، ذرّات کو شعلے اور تنکھوں کو بگولے بنا دیتا ہے۔ اور ہر بزدل ایک قاتلانہ حملے کے بعد جری اور دلاور ہو جاتا ہے۔

اس سے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ مندروں کے پجاری، مسجد کے ملّا، ناز و نعم سے پالے ہوئے شہر میں بیٹھے نوجوان، رومانی ادیب و شاعر بغاوت کر سکتے ہیں۔ بلکہ میرا اشارہ ان جاہل اور پامال کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کی طرف ہے۔ جن کے لاغر اجسام فاقوں اور خوف کردہ عزائم افلاس کی حدود سے باہر سانس نہیں لے سکتے۔ مجبوریاں جب گوشہ گیری کی حدود سے گزر کر عریانی تک پہنچ جاتی ہیں۔ تو انتقام کی نیلی اور سرخ جذباتی آندھیوں کی سفاکی کی تعلیم کے سوا اور کوئی درس نہیں ہوتا۔

دراصل احسان دانش کے یہ جذبات اس گرم جوشی کی جانب واضح طور پر اشارہ کرتے ہیں جو دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستانی قومی تحریک کے روپ میں ظاہر ہو چکی تھی

اور جو رفتہ رفتہ مزدور تحریک کی شکل اختیار کر چکی تھی ۔

مزدور تحریک میں انقلاب و بغاوت کا تصور پیدا ہونا ایک فطری امر ہے خاص طور سے دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس تحریک کو جس طرح عالمی پیمانے پر تقویت ملی اس کے باعث ملکوں ملکوں سماجی انقلاب کا جذبہ تیز تر ہو گیا تھا ۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا ۔ کہ معاشی اور سیاسی ہنگامہ خیزیوں کے باعث سماجی گردشوں میں جو طبقہ سب سے زیادہ پس رہا تھا ۔ وہ مزدور طبقہ ہی تھا ۔ صنعتی ارتقاء کے باوجود مزدور طبقے کی معاشی اور اقتصادی زبوں حالی ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ سرمایہ پرستوں نے اس کی زبوں حالی کو مزید بدتر بنا دیا تھا ۔

ان صورتوں کے ردِ عمل کے طور پر مزدور کے ذہن میں انقلاب بغاوت کا جو جذبہ ابھرا تھا اس میں تلخ نوائی اور آتش نفسی کی شمولیت لازمی تھی جو بڑی حد تک جوش ، ولولے اور غصے کی صورت میں ظاہر ہوتی رہی ۔ جس کے نتیجے میں پہلی بار معاشی استحصال کے خلاف مزدور طبقے میں ہلچل پیدا ہوئی ۔ اس پر طرہ یہ کہ سرمایہ داروں کے غنڈوں اور پولس کی سنگینوں نے جب اس ہلچل کو دبانا چاہا ۔ تو مزدور بھرپور اعتماد اور عزم کی پختگی کے ساتھ میدانِ بغاوت میں اتر آیا ۔ ہر چند اس کے ذہن میں کسی تخریبی عمل کا کوئی منصوبہ نہیں تھا ۔ اور نہ اس میں ان جابرانہ قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی سکت ہی تھی اسی لئے وہ سرمایہ داروں کو ان کے جبر و استبداد سے گریز کرنے کی تلقین بھی کرتا رہا ۔ لیکن جب اس کی تمام استدعا اور درخواست بے اثر ہو گئی تو اس کے دل میں غم ، غصہ ، جوش اور بغاوت کا سرفروشانہ جذبہ پیدا ہو گیا ۔

احسان دانش کی نظم " باغی کا خواب " میں یہ تمام کے تمام پہلو موجود ہیں ۔ ذرا غور سے ملاحظہ کیجئے ۔ ۔

دیکھ اے منعم جماعت ! مال و دولت کے غلام
لینے والی ہے جفاکیشوں سے فطرت انتقام

رات کو فاقے سے سوتے ہیں وہ مردانِ خدا
پرورش پاتی ہے جن کی گود میں مہر و وفا

کیا تمھیں حق نے دیا ہے زر خزانوں کے لئے
کیا نہیں اس کی ضرورت نیم جانوں کے لئے
تا بہ کے کھینچے رہو گے رخشِ دولت کی لگام
کیا اخوت مشربِ اہلِ دُوَل میں ہے حرام

اور جب سماج کے دولت مندوں پر احسان کی ان ضربوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو وہ جھنجلا اٹھتے ہیں اور ان کے جذبات میں غم و غصہ کے تیور شامل ہونے لگتے ہیں :۔

موت کے تیور ہیں ان کی گود کے پالے ہوئے
آسماں ہے ان کے قدموں پر سپر ڈالے ہوئے
ان کی جرأت توڑ دیتی ہے طلسمِ انتظام
ہے بغاوت ان کی باندی انقلاب ان کا غلام

رفتہ رفتہ ان کا غم و غصہ خونی بغاوت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ کہنے لگتا ہے :۔

مرد آمادہ نہیں ہوتے گدائی کے لئے
ہوتے ہیں پیدا وہ خنجر آزمائی کے لئے

یہاں سے ہمیں احسان دانش ذرات کو شعلوں میں اور نکہتوں کو گولوں میں تبدیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ اور جس کے نتیجہ میں مزدور طبقہ سرمایہ داروں کے خلاف بغاوت کی آگ دہکاتا ہوا ، خون کی ہولی کھیلتا ہوا اور سرمایہ داروں کے جابرانہ و ظالمانہ ہاتھوں کو قلم کرتا ہوا اپنے حق کے حصول کی خاطر آگے بڑھتا نظر آتا ہے ۔ ملاحظہ کیجئے :۔

اٹھ رہا ہے جیل خانوں کے احاطوں سے دھواں
طوق ٹکڑے ہو رہے ہیں کٹ رہی ہیں بیڑیاں

(اوسر)

کرتا ہے بجلی سے بانیِ اہلِ زنداں کا جلال
فاقہ مستوں کے لئے ہے خونِ سلطانی حلال

اٹھے ہیں نادار قسمت آزمانے کے لئے
پے بہ پے حملے ہیں بنکوں کو جلانے کے لئے

## اور

لوٹتے ہیں خاک و خوں میں منعمانِ بدقماش
لاٹھیوں سے اہلِ نخوت کے ہیں بھیجے پاش پاش

خون سے سرمایہ داروں کے شکنجے سرخ ہیں
لاشہ خوری سے گِدوں کے نوک پنجے سرخ ہیں

زندہ گاڑے جا رہے ہیں مفتیانِ خرقہ پوش
دار کے تختے پہ ہیں لٹکے ہوئے ملّت فروش

برہمن مندر میں ٹکڑے، شیخ مسجد میں حلال
خون کی ہولی ہے زرداروں پر، برستا ہے گلال

فاقہ مستوں کے گنڈاسے ہیں امیروں کے گلے
گر رہی ہیں بے سری لاشیں مکانوں سے تلے

ہر چند احسان دانش نے اپنی اس نظم میں بغاوت کے سہارے تخریبی عمل کو تیز کرنے پر زور دیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر مزدور طبقہ کے سماجی حل کے لئے حسین بغاوت کا سہارا لیتے ہیں۔ اس کے پس پردہ کوئی آئیڈیالوجی نہیں ہے اور ان کی یہ نظم جذباتیت سے لبریز ہے لیکن احسان دانش نے اس نظم میں اس مزدور طبقہ کے احساسات و جذبات کو نظم کیا ہے جو سرمایہ داروں کے استبدادِ مسلسل سے تنگ آکر جب بغاوت پر آمادہ ہوتا ہے۔ تو اس

کے دل و دماغ انتقام کی آگ سے جھلس جاتے ہیں اور ظاہر ہے انتقام کا جذبہ انسان کو تخریب کاری پر اکساتا ہے۔ اس لئے احسان کی نظم میں ابھرا ہوا مزدور بھی انتقام کی آگ میں جلتا ہوا ظالموں اور سرمایہ داروں کے سر قلم کرتا جاتا ہے۔ شاید اسی خیال سے کہ اس طرح زمانے سے ظلم و بربریت کا وجود ختم ہو جائے۔

احسان کی مذکورہ نظم ان کے جذبات کی شدت کی عکاسی کرتی ہے اسی کے پیشِ نظر غالباً احسان دانش کے تصورِ انقلاب کے بارے میں ایسی غلط فہمی پیدا ہو گئی جس کے تحت احسان دانش کے تصورِ انقلاب کو تخریب کاری کا عکاس قرار دے دیا گیا۔ لیکن حقیقتاً یہ خیال اس وقت غلط ثابت ہو جاتا ہے جب ہم ان کی دوسری نظموں "مزدور کی موت" اور "مزدور کا چالان" کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ان کا وہی تصورِ انقلاب جو ان کی نظم "باغی کا خواب" میں بغاوت کے سہارے تخریب کاری کو چھوتا نظر آتا ہے۔ انسانی ہمدردی اور خلوص دلی کی دل نشین تصاویر پیش کرتا ہے۔ جس میں ہنگامہ خیزی کے مقابلے میں واقعیت اور ادراکِ حقیقت کے وہ تمام پہلو مل جاتے ہیں جو سماجی نابرابری کو دور کرنے کے لئے ناگزیر ہیں۔

احسان دانش کے تصورِ انقلاب میں ایک اور چیز جو ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ وہ اعلیٰ فنی محاسن کی پاسداری ہے انھوں نے انقلاب کے تلخ سے تلخ تصور کو شعری حسن کے قالب میں ڈھال کر جس طرح مؤثر بنا دیا ہے۔ اس نے ان کی تخلیقات میں حسن، جاذبیت اور دلکشی پیدا کر دی ہے اسی لئے ان کی فکر نے جو جلا پائی ہے وہ ان کے فنی شعور کا بھی نتیجہ ہے۔

ظاہر ہے۔ انقلاب کے سلسلے میں فکر کی جن منزلوں کو وہ چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ ان کی فنی استعداد کے باعث ہی ہے۔ پھر انداز بیان کو جس مؤثر صورت میں انھوں نے پیش کیا ہے۔ اس نے ان کے تصورِ انقلاب کو کام کی چیز بنا دیا ہے۔

احسان دانش کے تصورِ انقلاب میں رجائیت کا جذبہ پوری طرح کارفرما ہے۔ جس کے باعث ان کے فکر و احساس میں تازگی و دلکشی پیدا ہو جاتی ہے اور واقعیت کے گہرے عرفان کو اپنی نظموں میں پیش کرنے پر قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے جہاں احسان۔ جوش ولولہ اور غصہ کا اظہار کرتے ہیں وہیں وہ محنت کش طبقے کو حوصلہ مند رہنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔

انھیں یہ بات گوارا نہیں ہوتی۔ کہ سماج سے متعلق واقعات کو بیان کرنے والے مؤرخ ناانصافی کا شکار ہوں اور حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے معمار ملک و قوم یعنی محنت کشوں کی عظمت کو نظر انداز کردیں۔ وہ بار بار محنت کش طبقے کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں اور محسوس کراتے ہیں۔ کہ اگر اس طبقہ کی جانب سے غفلت برتی گئی تو سماج کی ساری دلکشی، زمانے کی ساری ترقی اور انسان کی ساری عظمت ختم ہو جائے گی ۔

اس سلسلے میں ان کا لہجہ رجائی ہوتا ہے ایسے میں وہ بڑے دلکش انداز میں محنت کش طبقہ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں جس کی مثالیں ہمیں ان کی طویل نظم "گورستان" میں مل جاتی ہیں۔ اس نظم کے عنوان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے احسان نے غم زندگی سے بھرپور تاثرات اس نظم میں پیش کئے ہوں گے لیکن پوری نظم میں کہیں بھی ہمیں ایسی فضا نہیں ملتی جو ہمارے دل کو مغموم کردے۔

احسان دانش اس نظم میں بھی محنت کش طبقے کی اہمیت و عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اہل زمین کو محسوس کراتے ہیں۔ کہ زیر زمیں وہ افراد دفن ہیں جن کا وجود انسانی تمدن کے ارتقا کا باعث رہا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ۔ ١

سو رہے ہیں اس جگہ وہ برق فطرت شعلہ خو ۔
ہے تمدن کی رگوں میں آج تک جن کا لہو
یہ سنہری کھیتیاں خاک خستہ و خاموش پر
زر دفینہ سہاگن کیاریوں کے دوش پر
ہیں مہذب جھاڑیاں سرو سمن کے بھیس میں
یہ ترقی یافتہ جنگل، چمن کے بھیس میں
یہ گرجتے گونجتے پل قابل تحسین و داد
گھورتے پتھر، کٹا کتنے کنکروں کا اتحاد
یہ مشینیں، تربیت پائے ہوئے لوہے کا شور
بے تحاشا آگ کھا کر باؤلے پانی کا شور

یہ سرنگیں یہ پہاڑوں کی جگہ افگاریاں
یہ کھلے میدان یہ مفتوح ناہمواریاں
ان کے موجد دب چکے ہیں سینکڑوں من خاک میں
غلغلے برپا ہیں لیکن گنبدِ افلاک میں

اس نظم میں احسان دانش کا شعورِ غم و غصہ کی انتہا کو نہیں پہنچا نہ ان کے تصورِ انقلاب میں تخریب کاری کے اثرات ہی شامل ہوتے ہیں وہ بغاوت پر اکسا کر توڑ پھوڑ کرنے کی تلقین بھی نہیں کرتے اور نہ کرخت لہجے میں محنت کش طبقہ کو خون خرابہ پر ہی آمادہ کرتے ہیں بلکہ ان کا شعور سطحیت سے بلند ہو کر انسانی تاریخ اور انسانی تمدن سے قریب تر نظر آتا ہے۔ اسی لئے ان کی اس نظم میں کسی قسم کی قنوطیت یا اضمحلال سے پُر جذبہ دکھائی نہیں دیتا بلکہ وہ اپنے پُر اثر لہجہ کے ذریعہ سامراجیت اور سرمایہ داری کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔

اس نظم میں ان کا تصورِ انقلاب ان کی ان تمام نظموں سے مختلف ہے۔ جن میں انھوں نے محنت کش طبقہ کو بغاوت پر اکسا کر کہیں کہیں تخریب کاری کی جانب نکل جانے کی تلقین کی ہے۔

احسان دانش کے تصورِ انقلاب میں غم و غصہ یا جھلاہٹ جہاں بھی شامل ہوئے ہیں ان کی نظم انقلاب کی گھن گرج اور شور و غل کا نمونہ بن گئی ہے لیکن جب بھی انھوں نے اپنے ذاتی تجربات کا صحیح مصرف کر کے نظم کہی ہے۔ ان کے انقلابی تصور میں بڑی حد تک طبقاتی اور تاریخی شعور شامل ہو گیا ہے۔ جس نے ان کی فکر و نظر کو جذباتیت کی سطحوں سے بلند کر کے حقائق و واقعیت کی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے

# اردو نظم کا ایک نرالا انداز

ڈاکٹر روشن اختر کاظمی
شعبۂ اردو
راجستھان یونیورسٹی جے پور

بیسویں صدی میں اردو نظم نے اپنے بال و پر اتنی مختلف سمتوں میں پھیلائے ہیں۔ کہ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا احاطہ کرنے کی ہر ممکن کوشش ناکام رہی ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اردو کے بے شمار شاعر مختلف وجوہ سے اب تک منظر عام پر نہیں آسکے ہیں۔ اور اردو دنیا ان کی تخلیقات سے محروم ہے۔

اس محرومی کا سبب صرف زمانے کی ناقدر شناسی ہی نہیں ہے۔ بلکہ اکثر و بیشتر شعراء کا خواہش نام و نمود سے بلند تر ہونا بھی ہے۔ ایسے ہی شعراء میں ایک نہایت بلند پایہ بزرگ شاعر سید ابوالمظفر خنداں فتحپوری بھی ہیں

خنداں فتحپوری کا تعلق سر زمین اودھ کے ایک ممتاز خاندان سے ہے طریقۂ آبا و اجداد کی پاسداری نے انھیں بھی ہمیشہ شہرت اور نام و نمود کی خواہش سے بے نیاز رکھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کافی دلچسپ ہے۔ موصوف کے ایام جوانی میں آپ کے کسی قریبی رشتہ دار نے آپ کی ایک غزل بیسویں صدی میں شائع کروادی تو آپ عرصہ تک ان سے ناراض رہے۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد غزل کہنا ہی چھوڑ دیا اور اپنی شاعری کو ائمۂ طاہرین کی منقبت کے لئے وقف کردیا۔ ازحد بیش بہا قصائد تخلیق کئے لیکن وہ تمام قصائد بھی غیر مطبوعہ ہی ہیں۔ میں بغیر کسی اعتذار کے کہہ سکتی ہوں کہ ان کے قصائد فنی نقطۂ نظر سے بہت بلند ہیں اور لکھنؤ کے دورِ آخر کی قصیدہ نگاری کا بہترین نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔

یہ کوئی ایسی متحیر کرنے والی بات نہیں ہے کیونکہ ان کا مولد و مسکن تحصیل فتح پور ضلع بارہ بنکی

لکھنؤ سے صرف چالیس میل کی دوری پر واقع ہے۔ مزید برآں خنداں صاحب کو عزیز لکھنوی کی شاگردی کا شرف بھی حاصل ہے۔ راقم الحروف نے ان کی زبانی اکثر ان محفلوں کا ذکر سنا ہے جن میں عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، جبیر لکھنوی، مولانا سید الملت اور مولانا نصیر الملت جیسی ہستیاں شریک بزم ہوتی تھیں لیکن ان محفلوں کو اجڑے زمانہ ہو گیا دورِ حاضر کی ادبی دنیا سے ان کا رابطہ کم و بیش ختم ہو چکا ہے صرف خمار بارہ بنکوی سے تعلقات برقرار ہیں۔

خنداں فتحپوری کی شاعری کا محور و مرکز قصیدہ ہے اور موضوع نعت و منقبت۔ چنانچہ ان کی جو نظم میرے پیش نظر ہے اس میں بھی موضوعِ سخن منقبت ہی ہے لیکن فنی نقطۂ نظر سے بلاشبہ یہ ایک نظم ہے۔ کیونکہ نظم کی جملہ خصوصیات اس میں موجود ہیں۔

نظم کا لفظ جب ایک مخصوص صنفِ سخن کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس سے وہ مجموعۂ اشعار مراد ہوتا ہے جو ایک مرکزی خیال کے تابع ہو۔ اور ارتقائے خیال کے سبب احساسِ تسلسل برقرار رہے۔ صنفِ نظم میں نہ تو موضوعات کی تخصیص روا ہے۔ اور نہ کسی مخصوص ہیئت ہی میں اسے اسیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کی جولاں گاہ بہت وسیع ہے اس کے ڈانڈے عرش و فرش سے ملے ہوئے ہیں جب کہ صنفِ قصیدہ کم از کم اپنی ہیئت سے متجاوز نہیں ہو سکتی اور اس کے فنی تقاضے نظم کے فنی تقاضوں سے مختلف ہیں۔

اس نظم کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے سے قبل "اردو قصیدہ" اور "نظم" سے متعلق دو مخصوص کوششوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ اردو قصیدہ نگاری میں محسن کاکوروی نے ہندوستانی رنگ و آہنگ پیدا کرنے کی ایک بڑی مستحسن کوشش کی تھی۔ ان کے نعتیہ قصیدے

؎ سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

کی تشبیب میں ہندو مذہب کی تلمیحات و رسومات وغیرہ کا ذکر بڑا ہی دلنشیں ہے لیکن بعض مذہبی حضرات نے ان کی اس جدت طرازی کو گستاخی پر محمول کیا ہے۔ حالانکہ قصیدے کی تشبیب میں کسی دور میں بھی اس قسم کی کوئی پابندی روا نہیں رکھی گئی تھی۔ پھر بھی اردو قصیدے میں یہ طرز رائج نہیں ہو سکی۔

اردو نظم میں ہندی شاعری کی سادگی اور سوز و گداز پیدا کرنے کی کوشش عظمت اللہ خاں، آرزو لکھنوی، وحید الدین سلیم وغیرہ نے کی تھی لیکن اس کا کتنا اثر اردو نظم نے قبول کیا اس کا اندازہ دورِ حاضر کی نظمِ اردو سے لگانا دشوار نہیں ہے جس نے فطرت انسانی کی طرح ہر زنجیر کو توڑ کر رکھ دیا ہے پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ اردو نظم کی طویل تاریخ میں چند شاعر ایسے ضرور گزرے ہیں جن کی منظومات میں خالص ہندوستانی فضا اور اندازِ بیان میں ہندی شاعری کا سوز و گداز، اور سادگی بھی موجود ہے۔

خندان فتحپوری کی زیر بحث نظم میں ہمیں اردو قصیدے اور اردو نظم کے ان دونوں رجحانات کا ایک خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے اور وہ اس لحاظ سے لائق تحسین و آفریں ہیں کہ انھوں نے مذہبی موضوع کی نزاکت کے باوجود اس نظم میں فکر و نظر کی وسعت کا بڑی فن کاری سے مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے نظم کا پس منظر مختصر طور پر پیشِ ناظرین ہے۔

## پس منظر:۔

اس نظم کا پس منظر دکھوں کے ساگر میں گھری ہوئی حیاتِ انسانی ہے جسے پرشور اس سمندری طوفان میں گھری ہوئی ایک کشتی کی تمثیل میں پیش کیا گیا ہے۔ دکھوں کے اس ساگر کو شانت کرنے والے (مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق) امام آخر الزماں مہدیٔ دوراں ہی ہیں جو مصلحتِ خداوندی کے سبب "پردۂ غیب" میں ہیں۔ شاعر کو صرف انھیں کے ظہورِ پُرنور کی تمنا ہے۔ اس کی ساری تمناؤں کا مرکز و محور بھی ذات ہے جس کے دیدار کی تمنا میں وہ زندگی کے بے کیف ایام گزار رہا ہے۔ دردِ ہجر کی شدت الفاظ کی گرفت سے باہر ہے۔ پھر بھی وہ مطلق مایوس نہیں ہے۔

اہل تشیع کے عقیدے کے مطابق رسول اکرم محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام ان کے خلیفہ بلا فصل ہوئے اور پھر ان کی نسل سے گیارہ امام یکے بعد دیگرے اس منصب خلافت و امامت پر بحکم خدا فائز ہوئے۔ کیونکہ منصب امامت و خلافت منجانب اللہ ہے۔

بارھویں امام، مہدیٔ آخر الزماں علیہ السلام کے امام دوراں ہونے کے عقیدے کا اظہار اور ان کے ظہور کی تمنا کے موضوع کو اس فرقے سے تعلق رکھنے والے تمام شعراء نے بڑی خوبصورتی

سے اپنے قصائد و منظومات میں پیش کیا ہے۔ لیکن خنداں فتحپوری نے اس موضوع کو اپنے منفرد انداز میں نظم کیا ہے ہندی شاعری کی سادگی، سوز و گداز اور ہندو مذہب کی تلمیحات و استعارات نہایت خوبصورتی سے اس نظم کے آئینہ میں جلوہ افروز ہیں۔

پیش نظر نظم میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب بڑے خوبصورت انداز میں اپنی جھلک پیش کرتی ہے چونکہ امام آخرالزماں اور سری کرشن جی کے بارے میں مذہبی اعتقادات میں ہر دو مذاہب میں کچھ نہ کچھ شباہت پائی جاتی ہے اس لئے اس نظم میں بھی کرشن بھکتی کا رنگ غیر محسوس طریقے پر نمایاں ہو گیا ہے جو شاعر کے ایک طویل ذہنی سفر کی غمازی کرتا ہے اور ساتھ ہی ان کی مذہبی وسیع النظری کا محکم ثبوت بھی ہے۔ حالانکہ وہ عام رسمی معنوں میں بھی بڑے دین دار اور پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان ہیں

خنداں صاحب نے ہندو مذہب کی تلمیحات اور کرشن جی سے متعلق القابات کو جس وسعت نظر اور فراخ دلی سے استعمال کیا ہے اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ وہ اس منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ جہاں دیر و حرم کے تفرقے ختم ہو جاتے ہیں :۔

اختلافِ رنگ و بو، طرحِ بہارِ بے خودی
صلحِ کل، گردِ ادب گاہِ نزاعِ جلوہ ہے

نظم کی زبان بڑی خوبصورت ہے اور بلاشبہ یہ وہی زبان ہے جو آرزو لکھنوی کی "سریلی بانسری" اور عظمت اللہ خاں کی بعض نظموں کی یاد دلاتی ہے۔ اسی ضمن میں اس وضاحت کی بھی ضرورت ہے کہ نظم کے خالق کا میدانِ سخن وہ دشوار صنفِ سخن ہے۔ جو زبان اور ساتھ ہی اندازِ بیان کی بہت سی پابندیوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور اس مطالبہ کو انھوں نے اپنے قصائد میں بڑی چابکدستی سے پورا کر دکھایا ہے۔ دو مختلف قسم کی اصنافِ سخن کے لئے مختلف زبان کو اپنانا ان کی طلاقتِ لسانیات اور لسانیات سے واقفیت کا ایک قابل ذکر نکتہ ہے۔

اس نظم میں صرف لفظ "غَیبت" عربی لفظ ہے۔ امام آخرالزماں علیہ السلام کا عام انسانوں پر ظاہر نہ ہونا مذہبی اصطلاح میں غیبت کبریٰ کہلاتا ہے جسے صرف غَیبت بفتح غین یا

بھی کہتے ہیں۔

ہیں اسمار اور بھی عربی ہیں۔ (۱) نرجس (۲) نوح (۳) خضرا۔ نرجس حضرت امام آخر الزماں علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی ہے۔ نوح، حضرت نوح علیہ السلام مشہور پیغمبر کا نام نامی ہے اور خضرا ایک مقام کا نام ہے۔ مذکرہ بالا الفاظ اور اسمار کے علاوہ عربی اور فارسی کا کوئی لفظ اس نظم میں موجود نہیں ہے۔

نظم کی ہیئت مسدس کی ہے۔ بحر بھی وہ اختیار کی گئی ہے۔ جس میں مخصوص قسم کا زیر و بم ہے جو طوفانی رات میں منجدھار میں گھری ہوئی کشتی، ہواؤں کے تھپیڑوں، بیم و رجا کے موضوع سے ہم آہنگ ہے۔ چونکہ یہ نظم بھی شاعر کے دوسرے تمام کلام کی طرح غیر مطبوعہ ہے اسے ادب نواز حلقوں میں پیش کرتے ہوئے مجھے اسی لئے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔

مجھے خنداں صاحب نے اسے شائع کروانے کی اجازت بمشکل دی ہے شاید صرف اپنی شفقت اور میرے اصرار سے مجبور ہو کر۔

# چڑھتی ندی بڑھتا دھارا

از سید ابو المظفر خنداں فتحپوری

چڑھتی ندی، بڑھتا دھارا     چھایا چاروں اور اندھیارا
ناؤ بھنور میں دور کنارا     نیند کا ماتا کھیون ہارا
دھرم کے مانجھی تیری دہائی
تو نے نوح کی ناؤ بچائی

کالے کالے بادل چھائے،     جھونکے پُروائی کے آئے
پانی کچھ ایسے لہرائے     جیسے کوئی اجگر بل کھائے
توڑی لہروں نے پتوار
کیسے لگے یہ بیڑا پار

کھا کر لہروں کے ہچکولے — میری نیّا ڈگمگ ڈولے
جس کو پکاروں وہ نہیں بولے — کون ہے جو یہ گتھی کھولے
جگ کے داتا، درشن دکھائے
میری نیّا پار لگا دے

ڈوب رہی ہے میری نیّا — کوئی نہیں نیّا کا کھویّا!
تو ہے سبھوں کا دکھ سیویّا — آجا او خضرا کے بسیّا
جی جینے سے نراس ہے آجا
تیری ہی اب آس ہے آجا

جینے کے مجھ کو پڑ گئے لالے — کون بھنور سے آ کے نکالے
تو جو بچانا چاہے بچا لے — اور جس کی گود کے پالے
جیون تجھ بن ڈول رہا ہے
تیری دہائی بول رہا ہے

میرے داتا تجھ کو جو پاؤں — چرنوں پہ تیرے سیس نواؤں
دکھیا من کی بات سناؤں — تجھ بن جو بیتی وہ بتاؤں
چنتا میرے من کی مٹا دے
اپنا سندر روپ دکھا دے

کب سے کھڑا ہوں تیرے دوارے — سیس نوائے ہاتھ پسارے
میری آشاؤں کے سہارے — اور جس کے راج دلارے
شانتی مجھ کو من کی دے دے
بھیک اپنے درشن کی دے دے

جگ بیری، کوئی نہیں اپنا — کس کو سناؤں اپنی بپتا
کیسے تجھ تک پہنچوں بتلا! — بیچ میں ہے پربت غیبت کا
ڈھا دے یہ پربت گردھاری
تو ہے دیالو، میں ہوں بھکاری

اپریل تا جون ۸۳ء

میں ہی نہیں ہوں ایک اکیلا — اس دھرتی کے سارے بسیّا
بوڑھے بالے راجا پرجا — دیکھ رہے ہیں تیرا رستا
سب ہی تجھ سے آس لگائے
تو آئے تو دکھ ہر جائے

جگ میں دکھائی کچھ نہیں دیتا — چھایا ہے ایسا اندھیارا
تو سورج کے روپ میں آجا — بھٹکے ہوؤں کو رستا دکھلا
سیدھی ڈگر جب وہ پا جائیں
سب مل کر تیرے گُن گائیں

دھرتی ڈول رہی ہے ساری — کیسی مچی ہے ہاہاکاری
یہ جنتا ہے دکھوں کی ماری — تیرے ہی چرنوں کی پجاری
سن لے سن لے اس کا دکھڑا
دکھلا اپنا چاند سا مکھڑا

چاند سا مکھڑا پیارا پیارا — باپ کا جیون، ماں کا دلارا
سارے جگ کی آنکھ کا تارا — تو ہے دکھیاروں کا سہارا
تجھ سے لگائے آس ہے داتا
خنداں تیرا داس ہے داتا

---

## قطعہ

انعام الحق شرر رجے پوری

وہ ہر اک دور میں زندہ رہا تابندہ رہا
مر کے بھی ہو نہ سکی ایک قلمکار کی موت
گر گیا آج مرے گاؤں میں برگد کا درخت
آج پھر ہو گئی اک سایۂ دیوار کی موت

# میر اور اجتماعی شعور

انجم عثمانی
آل انڈیا ریڈیو
جے پور

کوئی بھی عظیم اور بڑا فن کار اپنے دور کے حالات، مظاہر، تحرک، جمود، سیاسی، سماجی لسانی اور ثقافتی انقلابات اور تبدیلیوں سے الگ نہیں رہ سکتا اور ہر بڑا فن اپنے موجودہ دور کے مختلف گوشوں کا عکاس اور اپنے دور کی روح تاریخ کو خود میں اس طرح سموئے ہوا اور اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتا ہے کہ آنے والے کل میں اس دور کو سمجھا اور اس دور کے اجتماعی شعور کا ادراک صحیح معنی میں کیا جا سکے۔

اجتماعی تبدیلیاں فرد پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتی ہیں فن کار ان تبدیلیوں کو ایک منفرد انداز میں، عوام کے مقابلے میں زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے اور باریک بینی سے ان عوامل پر غور کرتا ہے جن کی بنیاد پر یہ تبدیلیاں ظہور میں آتی ہیں اور وہ صرف عمل ہی پر نہیں رک جاتا بلکہ ردِ عمل تک جاتا ہے اور کسی حد تک یہ بات حقیقت ہے کہ فن، عمل سے زیادہ ردِ عمل کی ایک داستان ہوتا ہے۔

عمل اور ردِ عمل کا یہ اجتماعی شعور فن کار کے فن میں ڈھل کر مختلف رنگوں اور مختلف صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کے الفاظ میں :-

"..... اگر غور کیا جائے تو ہر دور میں شعوری یا غیر شعوری طور پر براہِ راست یا بالواسطہ اعلیٰ قسم کی شاعری کی روحِ رواں اور وہ تصادم و پیکار رہا ہے جو شاعر خارجی اسباب و حالات میں محسوس کرتا ہے اور خارجی اسباب کو بدلنے اور ان کو بہتر اور

نیا روپ دینے کی چھپی یا کھلی ہوئی مگر شدید آرزو ہی کا نام شاعری ہے۔"

(ادب اور زندگی ص ۲۵۲)

میر بھی اپنی تمام تر داخلیت، دروں بینی، بے دماغی (بلکہ کبھی کبھی تو بد دماغی) کے باوجود اپنے دور کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر کہاں رہ سکتے تھے۔

جب ہم میر کے دور کا تاریخی جائزہ لیتے ہیں تو تقریباً وہ سارا دور سیاسی اعتبار سے اتھل پتھل اور سماجی و تہذیبی اعتبار سے زوال آمادہ بلکہ زوال زدہ اور زراج کا نظر آتا ہے۔ نادر شاہ اور احمد شاہ کے تباہ کن حملے، قلعہ کی سیاسی اور سیاسی سازشوں کے توسط سے تہذیبی اقدار کا خاتمہ جس نے ایک اجتماعی نظام کو جنم دیا۔ جس میں پورے کا پورا معاشرہ خود سے فرار حاصل کرنے کے درپے تھا۔ محمد شاہ رنگیلے اس فرار کی تاریخی علامت ہے اور عوام میں شاعری اور تصوف سے لے کر مختلف بازیوں تک کا رواج اس دور کی تہذیبی و تاریخی حقیقت۔

اس اجتماعی مزاج کے زیر اثر عوام کے ساتھ خواص بھی تھے چنانچہ خواجہ میر درد نے تصوف میں پناہ لی۔ اور میر نے قلندری میں۔

[میر صوفی ہرگز نہیں تھے اس کے باوجود کہ ان کی ابتدائی تربیت صوفیانہ ماحول میں ہوئی تھی ان کی شاعری میں جہاں بھی تصوف کی جھلک ملتی ہے وہ فارسی شاعری کے توسط سے اردو شاعری پر اثر کا نتیجہ ہے۔ میر کے مزاج کو تصوف سے زیادہ قلندری سے نسبت ہے:-

خوش رہا جب تلک رہا جیتا

میر معلوم ہے قلندر، تھا]

ان اجتماعی حالات کے ساتھ میر کے ذاتی اور انفرادی حالات بھی کم غم انگیز اور پریشان کن نہ رہے۔ بچپن میں یتیمی پھر باپ سے زیادہ مشفق منہ بولے چچا، سید امان اللہ کا وصال، بھائیوں کی بدسلوکی، اور آگرہ سے دہلی کی طرف ہجرت وغیرہ نے بھی میر کے احساسات پر تازیانے لگائے اور میر کو خارج کے مقابلے میں داخل کی طرف زیادہ جھکا دیا۔ لیکن ان پر یہ الزام سراسر غلط ہے کہ میر نے اپنی ذات کے حصار سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اور انھوں نے اس وقت کے اجتماعی احساسات کی ترجمانی نہیں کی۔

یہ ضرور ہے کہ۔ انھوں نے خارجی حالات اور اس وقت کے زوال آمادہ بلکہ زوال شدہ معاشرہ (جس کا ذکر اوپر گزرا) کے حالات کو فن کے توسط سے بیان کیا ہے اور خارج کو بھی داخل کے پردے میں چھپا کر اس طرح استعمال کیا ہے۔ کہ وہ صرف وقتی احساسات کی ترجمانی نہ ہو کر اس دور کے احساسات کی بھی ترجمانی بن گیا۔

میر کو اپنے دور کے اجتماعی حالات کا بھی پورا پورا شعور ہوا اور یہ اس دور کے حالات ہی کا اثر تھا۔ جس نے ان سے کہلوایا۔ کہ :۔

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

اور

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا۔

اس طرح کے براہِ راست بیانات کے علاوہ میر کے ان استعمال ہونے والے بہت سے الفاظ اور ان کا طریقہ استعمال بھی اس بات کا ثبوت مہیا کرتا ہے کہ میر اپنے دور کی ساری اتھل پتھل کا پورا شعور رکھتے تھے۔ اس طرح کے الفاظ ہیں نگر، بستی، شہر، وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ؎ شہرِ دل ایک مدت اجڑا، بسا غموں میں
آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا

اب ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو اجڑی ہوئی بستی ویرانے کا مترادف نہیں ہے۔ اور کہا:۔

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کر

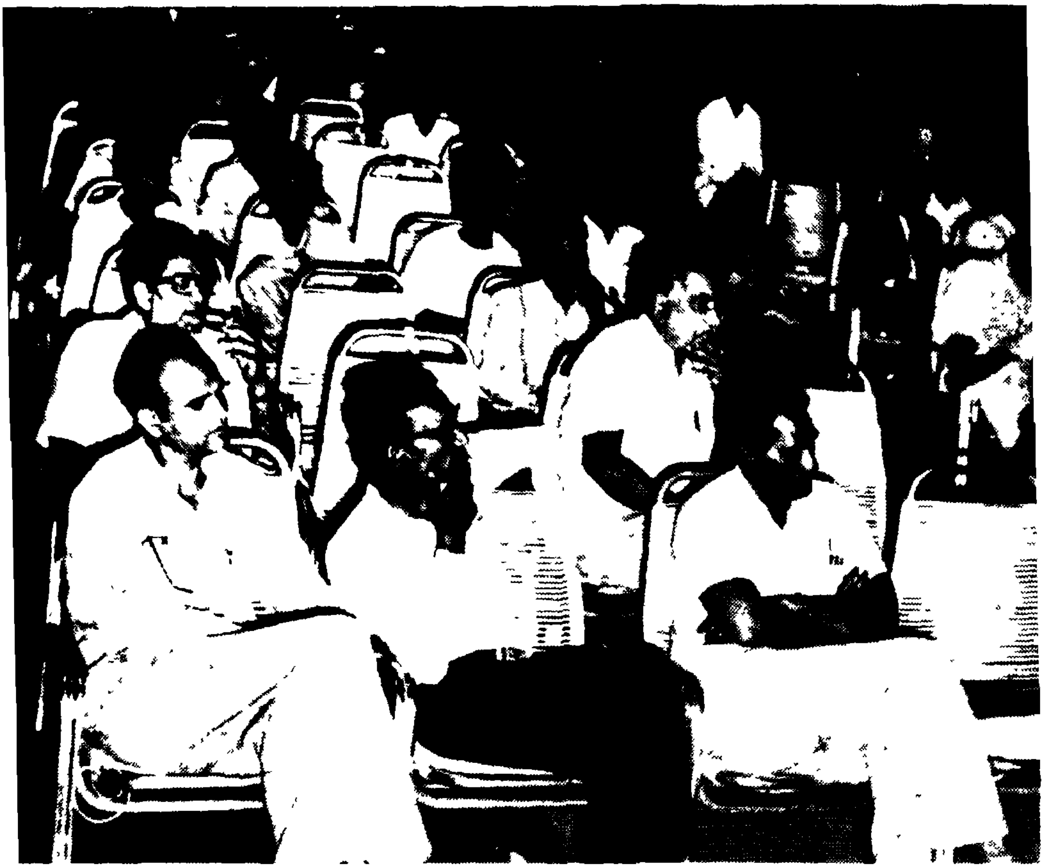
ظاہر ہے کہ نگر، شہر، بستی وغیرہ کی ویرانی اور تباہی کسی ایک شہر کسی ایک بستی کسی ایک نگر یا کسی ایک دل کی ویرانی نہیں ہے بلکہ اس اجڑی ہوئی تہذیبی بستی اور اس برباد شدہ معاشرتی نگری کا اشارہ ہے جس کی گواہی میر کے دور کی تاریخ سے ملتی ہے۔

جس شخص کے ہاں اس دور کی معاشرہ کی روحِ تاریخ موجود ہے اُسے "اپنے آپ میں گم" "داخلیت کا قیدی" "حصارِ ذات کا اسیر" اور "اجتماعی شعور سے بیگانہ نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ صحیح صورت حال یہ ہے کہ میر نہ صرف اپنے دور کے حالات آشنا تھے۔ بلکہ معاشرہ کے نبض شناس بھی تھے — البتہ یہ اتفاقی صورت حال ان کے ساتھ ضرور پیش آئی (جس کا فائدہ انھیں ان کی شاعری میں پہنچا) کہ ان کے ذاتی حالات اس دور کے اجتماعی حالات کی طرح کے تھے یعنی جو اتھل پتھل سارے معاشرے میں موجود تھی۔ اس سے کہیں زیادہ میر کے سینے میں غم اور افسردگی کا لاوا پک رہا تھا۔

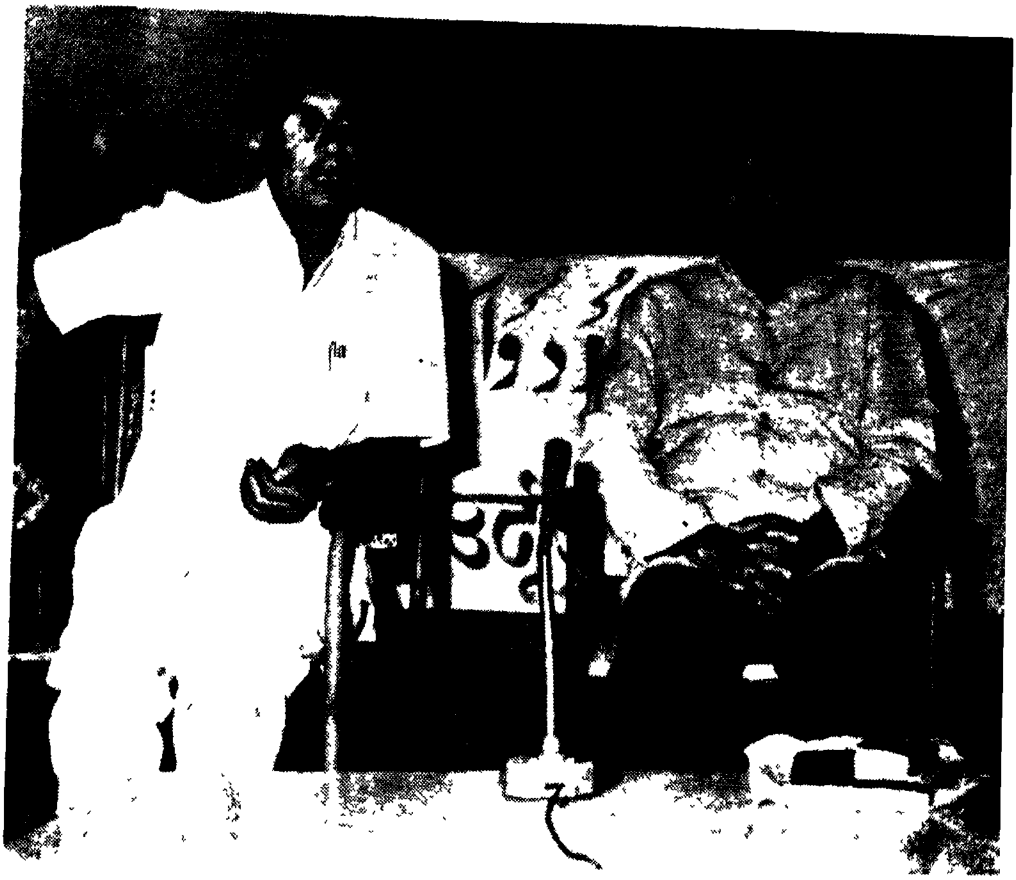
نتیجہ یہ ہے کہ اگر وہ اجتماعی حالات کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہ ان کے ذاتی غم میں اس طرح گھلا ملا ہوتا ہے۔ کہ اگر ان کا قاری اس دور کی تاریخ سے واقف نہ ہو تو اس پر نہ تو میر کی ذات کھل پاتی ہے اور نہ میر کے فن میں موجود اس دور کے اجتماعی حالات اس پر منکشف ہو پاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ میر اپنی تمام تر داخلیت، غم پسندی، ذات کی گہرائی، دروں بینی اور قلندری و جنون کے باوصف اپنے دور کے اجتماعی شعور کے عکاس بھی تھے۔ اور وجدان و عقل کی نزاکتوں سے آگاہ بھی۔ اور یہ سچ ہے۔ کہ :—

خوش ہیں دیوانگیٔ میر سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ



شب افسانہ میں سامعین
جناب انتظار حسین صاحب کا افسانہ سُنتے ہوئے



شبِ افسانہ کی تصاویر

شب افسانہ کی تقریب میں اکیڈمی کے چیئرمین
جناب ڈاکٹر محمد علی زیدی اور جناب انتظار حسین صاحب

# شب افسانہ۔ مختصر روداد

۱۹ر اپریل ۸۳ء کو مرکز اطلاعات (سوچنا کیندر) جے پور میں "شب افسانہ" منعقد کی گئی جس کی صدارت ڈاکٹر محمد علی زیدی چیرمین راجستھان اردو اکیڈمی نے کی۔ صدر بزم نے مہمان خصوصی جناب انتظار حسین صاحب، عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگار کا حاضرین سے تعارف فرمایا۔ انھوں نے فرمایا کہ آج اردو افسانہ جن بلندیوں کو چھو رہا ہے اور اس میں جو فنی پختگی پیدا ہو گئی ہے اس کا اندازہ جناب انتظار حسین کے افسانوں کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ انھوں نے انتظار حسین صاحب کے افسانے "کشتی" کا تفصیلی تجزیہ کر کے اس کی فنی و علامتی خوبیاں واضح کیں۔ انھوں نے معزز مہمان کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ کہ انھوں نے راجستھان اردو اکیڈمی کی دعوت قبول کر کے یہاں تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی۔

اس کے بعد جناب انتظار حسین نے اکیڈمی کے عہدیداران خصوصاً ڈاکٹر زیدی کا شکریہ ادا کیا انھوں نے نہ صرف اس حسین و دلربا گلابی شہر کو دیکھنے کی ان کی دیرینہ خواہش کو پورا کیا۔ بلکہ اس بزم کا انعقاد کر کے یہاں کے اہل ادب اور اہل ذوق حضرات سے ملنے کا موقع بھی فراہم کیا۔

اس کے بعد جناب انتظار حسین نے اپنا طویل افسانہ "کشتی" پڑھ کے سنایا۔ بعد میں حاضرین کے اصرار پر افسانے کے فن سے متعلق ایک مقالہ جو خط کی شکل میں تھا۔ پڑھا۔ اس کے بعد سامعین کرام کو ان کے افسانہ نگاری کے فن اور افسانوی ادب سے متعلق سوالات کرنے کی دعوت دی گئی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد یہ پرلطف نشست اختتام پذیر ہوئی۔

آخر میں سید امین الدین احمد سکریٹری راجستھان اردو اکیڈمی نے مؤثر الفاظ میں مہمان خصوصی کا اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اور انتظار حسین صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کو اکیڈمی کی جانب سے تحائف پیش کئے۔

---

# غزلیات و منظومات

# زبان

## (اقتباس)

سالک عزیزی
جھنجھنوں

کوئی بھی ملک زمانے میں بے زباں نہیں — کسی بھی قوم کی اس کے بغیر شان نہیں
وہ جسم خاک برابر ہے جس میں جان نہیں — یہ لازوال حقیقت کوئی گمان نہیں
یقین کیجیے وہ جسموں سے جان چھینتے ہیں
جو لوگ ہم سے ہماری زبان چھینتے ہیں

ہزار آفتیں سہتا ہے غم اٹھاتا ہے — ہزار کلفتیں ہنس ہنس کے جھیل جاتا ہے
ہزار نعمتیں خود ہاتھ سے گنواتا ہے — ہزار دولتیں کھو کر بھی مسکراتا ہے
زباں کو مگر انساں کھو نہیں سکتا
یہ ظلم وہ ہے جو برداشت ہو نہیں سکتا

یہ حسن ہے کسی غنچہ دہن نہ گلرو میں — بھرا ہوا ہے عجب کیف اس کی خوشبو میں
ادائیں ناز میں لہجے میں وضع میں خو میں — وہ کون خوبی ہے ملتی نہیں جو اردو میں
اسی کا نام ہے امرت اسی کا زمزم ہے
یہی تو کوثر و گنگا کا پاک سنگم ہے

زباں کی آن، فصاحت کی شان اردو ہے — بیاں کی روح بلاغت کی جان اردو ہے
ہمارے پیار کا سالک نشان اردو ہے — ہمیں تو جان سے پیاری زبان اردو ہے
ہم اپنی زیست کا گنج گراں نہیں دیں گے
جہاں دے دیں گے اپنی زباں نہیں دیں گے

# آفت جاں ہو گئی اردو

۲

## (اقتباس)

سالک عزیزی
جھنجھنوی

اسے ہم چاہتے ہیں یوں ہمارا غم سے رشتہ ہے — شکارِ ظلم ہے اردو کہ اس کا ہم سے رشتہ ہے
غرض دونوں کا کچھ ایسا غم بہم سے رشتہ ہے — دل سوزاں کا جیسے دیدۂ پرنم سے رشتہ ہے
ہم اس سے اور یہ ہم سے پریشاں ہو گئی اردو
ہمارے واسطے اک آفت جاں ہو گئی اردو

جسے دیکھو وہی بھرپور ضرب اس پر لگاتا ہے — جسے دیکھو وہی نام و نشاں اس کا مٹاتا ہے
جسے دیکھو اسی مجبور کو آنکھیں دکھاتا ہے — جسے دیکھو اسی معذور کے ٹکڑے اڑاتا ہے
سرِ فرہاد، مجنوں کا گریباں ہو گئی اردو
ہمارے واسطے اک آفت جاں ہو گئی اردو

اسی سے آج برگشتہ ہر اک اس کا نگہباں ہے — جو اس کو جاں سمجھتا تھا وہی اب دشمنِ جاں ہے
کبھی جو اس کا گلشن تھا وہ آج اس کا بیاباں ہے — نہ کوئی اس کا حامی ہے نہ کوئی اس کا پرساں ہے
چراغِ کشتۂ گورِ غریباں ہو گئی اردو
ہمارے واسطے اک آفت جاں ہو گئی اردو

اسی کی جان پر ہے ہر عذابِ وقت اے سالک — عدو اس کا ہے ہر خانہ خرابِ وقت اے سالک
کہاں ڈوبا اسے لے کر سرابِ وقت اے سالک — بڑا دل دوز ہے یہ انقلابِ وقت اے سالک
جو رحمت تھی وہی زحمت بداماں ہو گئی اردو
ہمارے واسطے اک آفت جاں ہو گئی اردو

# دو غزلیں

**ڈی۔ آر۔ مدان۔ ہوشؔ سرحدی جے پور**

گرا پڑا سا کوئی راہ گیر میں بھی نہ تھا
لکیر ہی کا رہے جو فقیر، میں بھی نہ تھا

گراں تھی ترکِ تعلق کی بات اُس کو بھی
نکل چکا ہو کماں سے جو تیر میں بھی نہ تھا

کسے پسند تھا پرواز کا مری انداز
رتوں کے ساتھ چلوں وہ اسیر میں بھی نہ تھا

بڑے مزے سے سنا میں نے اس کی باتوں کو
وہ بے خیال نہ ہو حرف گیر میں بھی نہ تھا

کسی کا درد کہاں ہے کسی کے دل میں آج
اکیلا میں ہی تڑپتا آمیر میں بھی نہ تھا

سمجھ کے حرف غلط کب مٹا سکی دنیا
کہ سطحِ آب پہ اُبھری لکیر میں بھی نہ تھا

کسے دماغ کہ حق بات سن سکے کوئی
سناتا دوہے کسی کو؟ کبیر میں بھی نہ تھا

ملا جو ہنس کے کوئی۔ بندگی بجا لایا
وہ کوہکن جو نہ تھا۔ جوئے شیر میں بھی نہ تھا

سنی نہ بات کبھی ہوشؔ نے زمانے کی
کہ مشورہ اُسے دیتا مشیر میں بھی نہ تھا

**تبسم فاروقی۔ لکھنؤ**

جب تک بکھر نہ جاؤں اپنوں کا آئینا ہوں
میں سب کے دکھ سمیٹے چہروں میں جی رہا ہوں

ہر زخم سر کا خوں، میں ہاتھوں پہ لے رہا ہوں
ہر سنگ کہہ رہا ہے مجھ سے کہ میں خدا ہوں

گھیرے میں آ گیا ہوں تیروں کو ختم کر لو
کل تم بھی بے گھرو گے میں جس جگہ کھڑا ہوں

چہرے پہ رینگتے ہیں کچھ بے قرار لمحے
اپنی تباہیوں کے اخبار پڑھ رہا ہوں

باتوں میں اُس کی نغمہ، ہونٹوں میں اُس کے صہبا
آنکھوں سے سن رہا ہوں کانوں سے پی رہا ہوں

مقتل میں آ چکا ہوں لیکن غنودگی ہے
کوئی جگا رہا ہے آواز سن رہا ہوں

یہ روشنی نہ مجھ کو تبسمؔ چھو سکے گی
خوشبو کا مقبرہ ہوں تہذیب کی دعا ہوں

# غزل

ابن احسن بزمی ٹونکی

جو آتشِ گل نے پھونک ڈالے وہ آشیاں جب شمار ہوں گے
چمن کی اک ایک شاخِ گل پر نہ جانے کتنے مزار ہوں گے

نہ جانے بیتا ہوں پر ان کی یہ خار و خس کیوں لرز رہے ہیں
یہ بجلیاں تو وہاں گریں گی جہاں کہیں شاہکار ہوں گے

یہ اعتبارِ وفا کا رشتہ ، یہی ہے بہتر کہ توڑ ڈالو
نہ آپ ہی کو ملال ہوگا نہ لوگ شکوہ گذار ہوں گے

ہم اپنی ہر اک شکستگی پر یہ سوچ کر مسکرا رہے ہیں
جو ہم نے ایسا نہیں کیا تو وہ کس قدر شرمسار ہوں گے

---

اس درجہ تغافل کو ہوا دی تو نے امید کی قندیل بجھا دی تو نے
اب زحمتِ الطاف سے کیا ہوتا ہے اے دوست بہت دیر لگا دی تو نے

---

اے اہلِ گلستاں کچھ حسنِ تاریخ گلستاں اور سہی
دو چار شبنم باقی ہیں اک جشنِ چراغاں اور سہی

اے جوشِ جنوں اب اہلِ چمن کل اپنی وفا پہ ننگ کریں
اک تارِ رگِ جاں باقی ہے یہ تارِ رگِ جاں اور سہی

یہ یاد رہے ہر آج کی ، کل تاریخ مرتب ہوتی ہے
اس وقت مری بربادی کے افسانے کا عنواں اور سہی

# غزل

## عارف سیوانی

جو میرے درد میں شامل نہیں ہے
وہ انساں کیسے پتھر دل نہیں ہے

کوئی رونق سرِ محفل نہیں ہے
وہ روحِ بزم جو شامل نہیں ہے

نئی تہذیب کا روشن ستارا ،
ہماری زیست کا حاصل نہیں ہے

جسے تم کو سنانا چاہتا ہوں
وہ کوئی داستانِ دل نہیں ہے

جسے پالا ہے خونِ دل پلا کر
وہ غم تو آپ کے قابل نہیں ہے

کسے زخمی کیا تم نے نظر سے
یہاں تو کوئی بھی بسمل نہیں ہے

خدا کا نور ہے اس دل میں پنہاں
یہ گھر تو مسکنِ باطل نہیں ہے

وطن والو! یہ کیوں تم سوچتے ہو
وطن کا کوئی مستقبل نہیں ہے

یہ کس نے کہہ دیا ہے تم سے عارف
چمن میں مجھ کو حق حاصل نہیں ہے

نخلستان

# غزل

## چاند نرائن رینکو مہر جے پوری

بازیگری کا کھیل یہ دنیا ہے آج بھی
جو ہو رہا تھا کل وہ تماشا ہے آج بھی

کیسے کہوں کہ اب کوئی ارماں نہیں رہا
دل میں مرے کسی کی تمنا ہے آج بھی ،

اے برق! جا ابھی دیکھ لئے تیرے حوصلے ،
شاخِ چمن پہ میرا بسیرا ہے آج بھی ،

دامن کو چھو لیا تھا ترے میں نے ایک دن ،
یہ دیکھ میرے ہاتھ میں چھالا ہے آج بھی ،

اے چارہ ساز دیکھ نظر تو نہیں مجھے ،
کانٹا سا ایک دل میں کھٹکتا ہے آج بھی ،

مرجائیے! نہ ہاتھ یہ پھیلائیے! کبھی ،
غیرت کا میری مجھ سے تقاضا ہے آج بھی ،

ان آندھیوں نے تو کوئی چھوڑی نہ تھی کسر
قائم ہمارا نقشِ کفِ پا ہے آج بھی ، .

عادت پڑی ہوئی ہے یہ عہدِ شباب کی ،
دامن سے میرا ہاتھ الجھتا ہے آج بھی ،

ہر وقت گو ہیں یاروں کے جھرمٹ لگے ہوئے
مہرؔ اس بھرے جہاں میں تنہا ہے آج بھی ،

# دو غزلیں

احمد رئیس کراچی

زخم کھا کر مسکرانے کی خبر دیتا رہا
اپنے ہونے کے زمانے کی خبر دیتا رہا

ملنے والوں سے کہا نہ، میں نے اپنا ماجرا
گھر ملا کر آشیانے کی خبر دیتا رہا

روشنی جب کھو گئی، تاریکیوں میں کہیں
میں دیا بن کر زمانے کی خبر دیتا رہا

چھین کر وہ لے گیا سارے درختوں کی پھبن
میں نئی رت لوٹ آنے کی خبر دیتا رہا

میں بھی اجلے موسموں کی دھوپ آنکھوں میں لئے
ذرہ ذرہ جگمگانے کی خبر دیتا رہا

اڑتے پتوں کی طرح جب گم ہوگئیں سچائیاں
بھیڑ میں خود کو نہ پانے کی خبر دیتا رہا

کون ظالم تھا۔ کہ ایسے جگنوؤں کے شہر میں
تتلیوں کے پر جلانے کی خبر دیتا رہا

ہوگیا جب راکھ سارا گلستاں اپنا رئیس
بے نشاں اک آشیانے کی خبر دیتا رہا۔

یوسف ثانی سلیمانی ۔ دہلی

شہر یاروں نے بنایا ہے جناب
کس کو کیا کیا راس آیا ہے جناب

تپتے سورج نے دیئے پیاسوں کو پھل
ریت کو جل تھل دکھایا ہے جناب

کیسی کیسی جانے کھائیں ٹھوکریں
تب کہیں جا ہوش آیا ہے جناب

راستے میں دل کہیں ٹھہرا نہیں
اچھے اچھوں نے رجھایا ہے جناب

سوچتا ہوں دیکھ کر اکثر بیاض
خونِ دل کتنا پلایا ہے جناب

کیا دلوں میں ہے مقام اس کا بھی
شہ نشیں پر جو بٹھایا ہے جناب

خود کو سمجھے تھا بڑا بالغ نظر
یوں بھی کب شیشہ تھمایا ہے جناب

وقت ہے ثانی بڑا ہی طوطا چشم
کیا ہے اپنا، کیا پرایا ہے جناب

# غزل

## خواجہ صلاح الدین عشقیؔ جے پور

آرہا ہے خیال پھولوں کا
دلربا خوش جمال پھولوں کا
کیسے بھولوں ، بھلا سکوں کیسے
سامنے ہے سوال پھولوں کا
دل کو حاصل ہے لطفِ نظارہ
خوش نما بے مثال پھولوں کا
دل نے دیکھا ہے جاں نے پایا ہے
سوزِ نورِ جمال پھولوں کا
دل جھکا جا رہا ہے پھولوں پر
دیدنی ہے کمال ، پھولوں کا
دل بتائے گا لطفِ نظارہ ، ،
پوچھئے جاں سے حال پھولوں کا

زندگی دل نے پائی ہے عشقیؔ
جانفزا ہے جمال پھولوں کا

## "دراڑ" — لطیف فہمی

( نئے سال پر ایک تاثراتی نظم )

آج احساس پہ چھایا نئی فطرت کا فسوں
میرے پیچیدہ مسائل میں اضافہ تو نہیں
ایک مفلس کے شب انگیز مقدر میں سحر
اس کی ناکام تمناؤں کا مژدہ تو نہیں

---

آج سے پہلے طبیعت میں یہ ہیجان نہ تھا
کیا ہوا وہ مری سنجیدہ مزاجی کا بھرم
میں کہ ہر لمحہ اذیت سے ہم آغوش رہا
یک بیک ذہنی تعیش نے پکارا ہے مجھے

---

شعبدہ یہ مری تخئیل کا حاصل کب ہے
میرے خوابوں کا محل ٹوٹ رہا ہے شاید

# دو غزلیں

**راشد جمال فاروقی**

ان درختوں میں آندھیاں رکھ جا
آندھیوں میں تباہیاں رکھ جا

ہر پرندہ ہوا ہے تن آساں
ہر نشیمن میں بجلیاں رکھ جا

کوئی منظر تو دیکھ پاؤں میں،
کوئی لمحہ تو جاوداں رکھ جا

چلچلاتی ہے دھوپ دور تلک
اپنی پلکوں کا سائبان رکھ جا

جو ملے بے دلی سے لے راشد
جو بھی پائے جہاں نہاں رکھ جا

**ظفر ہاشمی - جمشید پور**

واقعہ میرے تن اور سر کا ہے
سامنا ہر روح کو خنجر کا ہے

ٹوٹ جانا صرف شیشہ ! بات تھی
مسئلہ تو آج ہر پتھر کا ہے

ساز، پایل، گیت اور ٹھنڈی ہوا
خواب آنکھوں میں یہ ہر پیکر کا ہے

دور تک اڑتے ہوئے بے بال و پر
راستہ شاید کسی شہپر کا ہے

آگے آگے ہے اگر تنہا ظفر
پیچھے پیچھے شور بھی لشکر کا ہے

# نظم

## "سلمیٰ"

عابد اختر کوٹہ

تو میرے واسطے کیوں بے قرار ہے سلمیٰ
مرے فراق میں کیوں اشکبار ہے سلمیٰ
تو میری ہستیٔ دل کی بہار ہے سلمیٰ
تری وفا کا مجھے اعتبار ہے سلمیٰ
یہ جانتا ہوں تجھے مجھ سے پیار ہے سلمیٰ
مرے جہاں میں مگر انتشار ہے سلمیٰ

بہت سے لوگ زمانے میں پیار کرتے ہیں
سجا کے اپنے غموں کو بہار کرتے ہیں
وفا کی راہ میں سب کچھ نثار کرتے ہیں
رہیں گے ساتھ یہ قول و قرار کرتے ہیں

مجھے بھی تجھ پہ بہت اعتبار ہے سلمیٰ
مرے جہاں میں مگر انتشار ہے سلمیٰ

قریب آ تجھے دنیا کا حال بتلاؤں
نشانِ نامِ محبت نہیں ہے سمجھاؤں
جہاں کے فاقہ کش انسان تجھ کو دکھلاؤں
یہی ہے آرزو میری کہ ان کے کام آؤں
مجھی سے کیا مجھے اُن سے بھی پیار ہے سلمیٰ
مرے جہاں میں مگر انتشار ہے سلمیٰ

مری وجہ سے دل اپنا جلا رہی ہے کیوں
مرے فراق میں آنسو بہا رہی ہے کیوں
جہاں کو حال پہ اپنے ہنسا رہی ہے کیوں
بتا تو خاک میں ارماں ملا رہی ہے کیوں
سکونِ دل ہے تو میری بہار ہے سلمیٰ
مرے جہاں میں مگر انتشار ہے سلمیٰ

# قطعات

## سلیم واصف فرقانی ٹونکی

راہِ امید و رجا پر گامزن رہنے بھی دے
صرف قیدِ یاس و حسرت ہی مری منزل نہیں
ناخدا موجِ حوادث ہی سے ٹکراتا رہے
کشتیٔ امید کی قسمت میں کیا ساحل نہیں

کشتیٔ دل غم کے طوفانوں سے ٹکرانے تو دو
موجِ غم کو اپنا دامن اور پھیلانے تو دو
زندگی کی اس کشاکش کا بھی ہوگا فیصلہ
کھول کر دل دستِ دوراں کو ستم ڈھانے تو دو

اپریل تا جون سنہ [illegible]ء

# غزل

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی

رہِ حیات میں تجھ کو تلاش کرتا تھا
وہ آئینوں کا مقدر تلاش کرتا تھا

ہجومِ گردشِ شام و سحر میں دیوانہ
سکونِ دل کے لئے گھر تلاش کرتا تھا

اندھیریوں کے تلاطم سے لوگ لرزاں تھے
میں روشنی کا سمندر تلاش کرتا تھا

کبھی حسین پرندے تھے مائلِ پرواز
وہاں وہ ٹوٹے ہوئے پر تلاش کرتا تھا

جفا و جور کی دنیا اداس لگتی تھی۔
نہ جانے کس کو ستمگر تلاش کرتا تھا۔

الجھ گئی ہے قبا لہلہاتے کانٹوں میں
غریب شاخِ گلِ تر تلاش کرتا تھا

وہ دیکھنے میں بہت بے قرار تھا لیکن
سکون، روح کے اندر تلاش کرتا تھا

عجیب قدر مجھے بخشتا تھا۔ اس کی رحمت بھی
ہر ایک شخص سراسر تلاش کرتا تھا

ہمارے عہد کا پورس بھی خوب تھا اے راز
ہر آئینہ میں سکندر تلاش کرتا تھا۔

نفستن

# قطعہ

ڈاکٹر اظہار مسرت اعجازی

کتنا اوچھا ہے زیست کا دامن
چھوڑ دیتی ہے راہ لیتی ہے
موت کے بازوؤں میں وسعت ہے
ساری دنیا پناہ لیتی ہے۔

# ذو قافیتین

اندازِ خودسری پہ فقط ہم اٹل رہے
جتنے تھے دوست وقت کے سانچے میں ڈھل گئے

گم کردہ ہو کے رہ گئے وہ لوگ بالیقین
جو صرف رہبروں کے سہارے نکل پڑے

کچھ تو نکھر گئے ہیں مصائب کی آنچ میں
کچھ کاغذی وجود تھے بے چارے جل اٹھے

اس دورِ مصلحت میں وہی کامیاب ہے
جو برف کا مزاج رکھے اور پگھل سکے

ہم کو بھی اب سکون کے لمحات چاہئیں
حالات کی چٹانوں پہ برسوں پھسل چکے

تجھ پہ منافقت کا نہ لگ جائے اتہام
جو کہ ہے تیرے دل میں خدارا اگل بھی دے

آپ غموں کو رشکِ مسرت کریں تو بات
ہم نے زمانے بھر کے مسائل تو حل کئے

## ایک بند
محمد عباس حاتم نواء

سب سے حسین اردو زباں، اردو زباں سب کی زباں

---

رادھا کی چنری چمپئی مریم کا پیراہن بھی ہے
موسیٰ کا کوہِ طور بھی موہن کا بندرابن بھی ہے
اکسیر بھی چندن بھی ہے سونا بھی ہے کندن بھی ہے
ہے مشترک تہذیب کا شفاف اک دریا رواں
اردو زباں میری زباں میری زباں سب کی زباں

## غزل
شاہد میر

ہوئی جو شام بدن میں حرارتیں جاگیں
جلے دماغ تو سوئی عمارتیں جاگیں
سمجھ رکھا تھا جسے داستانوں کا مرکز
اس ایک جسم کو چھو کر طہارتیں جاگیں
کہیں سے پھول سمیٹے کہیں سے خوشبوئیں
چمن میں تیز ہوا کی شرارتیں جاگیں
لگائی اس نے دکاں سبز رنگ خوابوں کی
ہر ایک شخص کے دل میں تجارتیں جاگیں
رواروی میں پڑھیں ہر نگاہ نے شاہد
ہمارے چہرے پہ لکھی عبارتیں جاگیں،

## غزل
ڈاکٹر فضل امام
جے پور

یہ آدمی جسے کہتے ہیں جانشینِ خدا،
زمیں کو جس نے دلِ انقلاب بخشا ہے،
وہ جس کے آج بھی ناخن لہو میں ڈوبے ہیں
یہ آدمی جو سرِ ماہتاب پہنچا ہے۔
ابھی تو صرف زمیں پر ہی خون بہتا تھا
اب اس کے بعد لہو چاند سے بھی ٹپکے گا

---

یہ کیا کہ تارِ گریباں کی کہکشاں نکلے
اندھیرا ختم ہو تو مہر ضو فشاں نکلے
تمہاری بزم نہیں یہ ہماری دنیا ہے
تم آستین چڑھائے ہوئے کہاں نکلے
کئی افق، کئی راہیں، کئی دریچے ہیں
تمہارے شہر میں سورج کہاں کہاں نکلے
قلندری پہ جنہیں ناز تھا ابھی کل تک
رئیسِ شہر کے وہ بھی قصیدہ خواں نکلے
تمہارے ساتھ قیامت چلی بدل کے لباس
ہمارے ساتھ بہاروں کے کارواں نکلے
یہ فنِ شعر ہے یہ جاہلوں کے بس کا نہیں
جو دل میں آگ تو الفاظ سے دھواں نکلے

# غزل

عالم قریشی ۔ مراد آباد

زمانے کو جو بیش و کم جانتے ہیں
وہی فرقِ دیر و حرم جانتے ہیں

ستم بھی بہ رنگِ کرم جانتے ہیں
غمِ دل کو ہم مغتنم جانتے ہیں

محبت کی راہوں کے اِن پیچ و خم کو
نہ تم جانتے ہو نہ ہم جانتے ہیں

جو حاصل ہے پی کر سکوں اہلِ دل کو
کہاں واعظِ محترم جانتے ہیں'

زمانے نے اردو کو سمجھا فسانہ
حقیقت تو اہلِ قلم جانتے ہیں

سلجھنا، سلجھ کر اُلجھنے کا منشاء
تری زلف کے پیچ و خم جانتے ہیں

کوئی میرے سجدوں کو جانے نہ جانے
مگر ان کے نقشِ قدم جانتے ہیں

انھیں راس آئے نہ کیوں زندگی جو
خوشی کو خوشی، غم کو غم جانتے ہیں

تراشا ہے عالم نے کیوں زندگی بھر
یہ سب پتھروں کے صنم جانتے ہیں۔

# غزل

قاضی ندیم القادری ۔ مظفر نگر

قائم مثالِ دعوتِ شیراز کر گئے
تھے خوب جو خلوص کا دَر باز کر گئے

میرے سپردِ غم کا ہر انداز کر گئے
ناکامیوں کا وہ مری آغاز کر گئے

نالے پکارتے ہیں انھیں حادثات کو
پیدا جو دل کے درد میں آواز کر گئے

میں تو جھلس رہا تھا شکستوں کی آگ سے
شعلے انا کو پھونک کے پرواز کر گئے

تنہا گزر رہا تھا میں سانسوں کی راہ سے
تم مل کے زندگی سے کوئی ساز کر گئے

تنہائیوں میں جن کا تصور تھا میرے ساتھ
محفل میں وہ مجھے نظر انداز کر گئے،

یورشِ تباہیوں کی یہ بربادیاں مری
خود میرے سامنے مرے دمساز کر گئے

اس چشمِ بے نیاز کے تیور کو کیا کہوں
جو آشنائے جلوہ گہہِ ناز کر گئے

میں جس کو اے ندیم زباں پر نہ لا سکا
افشا وہ راز بھی مرے ہمراز کر گئے

# غزل

رئیس الدین رئیس علی گڑھ

جوہر ایسا کب کسی تلوار میں دیکھا گیا
زور جیسا پانیوں کی دھار میں دیکھا گیا

پھر ہوا شاید کسی بیمار لمحے کا گزر
پھر شگافِ قہقہہ دیوار میں دیکھا گیا

بولیاں لگتی ہوئی دیکھی گئیں دستار کی
اور فن بکتا ہوا بازار میں دیکھا گیا

سبز رت آتی ہے لے کر اشتہارِ زندگی
زلزلہ سا کیوں مگر اشجار میں دیکھا گیا

جب گماں انکار کا آنکھوں میں روشن ہو گیا
تب شکستوں کا یقیں اقرار میں دیکھا گیا

سربلے اپنی نیک نامی کو بہت کوسا رئیس
جب نیا طرّہ کسی دستار میں دیکھا گیا

# غزل

جمیل قریشی

منصف کے سامنے بھی زباں کھولتا نہ تھا
کیا جانے کس خیال سے وہ بولتا نہ تھا

شاہین ہے وہی کم پرندہ ہے کوئی اور
نیچی اڑان کو تو وہ پر تولتا نہ تھا

آسائشِ حیات قناعت کی دین تھی
موتی وہ زندگی میں کبھی رولتا نہ تھا

اک حلقۂ سکوت میں جکڑا ہوا تھا وہ
عریاں سماعتوں میں بھی رس گھولتا نہ تھا

بستی میں دستکوں کی صدا پا بہ تار تھی
کیا خوف تھا۔ کہ در بھی کوئی کھولتا نہ تھا

احباب ہو چکے تھے سبھی اس سے بدگماں
کہنے سے پہلے بات کو وہ تولتا نہ تھا۔

# غزل

سوز باندوی

یوں ہی پیمانہ نگاہوں میں چھپائے رکھئے
ہوش والوں کو بھی دیوانہ بنائے رکھئے

بس یہی باعثِ تسکینِ دلِ مضطر ہے
ان کی یادوں کو کلیجے سے لگائے رکھئے

خار تو خار ہیں پھولوں سے بھی محتاط رہیں
اپنے دامن کو ہر حال بچائے رکھئے!

بیت ہی جائیں گی تنہائی کی گھڑیاں آخر
ذکرِ غم سے دلِ نازک کو بچائے رکھئے

دل کا ہر رنگ نگاہوں سے عیاں ہوتا ہے
لاکھ سینے میں محبت کو چھپائے رکھئے

گم نہ ہو جائے اندھیروں میں محبت اپنی
ہاں وہی شمعِ وفا دل میں جلائے رکھئے

لیکے آجائیں نہ پتھر کہیں دنیا والے
سوز آہوں کو بدستور چھپائے رکھئے!

# غزل

واحد پریمی

حیات پاتے ہیں ہم حادثات میں کھو کر
مثالِ صبح ابھرتے ہیں رات میں کھو کر

وہ آشنائے چمن زارِ دہر ہی کب ہیں
جو رہ گئے ہیں بیابانِ ذات میں کھو کر

ہم اپنے آپ کو اکثر تلاش کرتے ہیں
وفورِ شوق، ہجومِ حیات میں کھو کر

حصارِ یاس و الم میں گھرے ہیں ہم اکثر
غبارِ آرزو و خواہشات میں کھو کر

غموں کا دشت ملا ہے ہمیں بھٹکنے کو
رہِ خلوص، رہِ التفات میں کھو کر

انھیں کو کیفِ نشاطِ حیات حاصل ہے
جو جی رہے ہیں غمِ کائنات میں کھو کر

ہم اپنی طرزِ سخن ڈھونڈھ لائے ہیں واحد
اساتذہ کے کئی کلیات میں کھو کر

# حسنِ نظر

اس عنوان کے تحت ہر ماہ قارئین کرام کے بعض خطوط کے اقتباسات ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔ لیکن قارئین کی رائے سے ایڈیٹر کا اتفاق ضروری امر نہیں۔ ادارہ

## سدرشن بالی - جے پور

مکرمی سکریٹری صاحب - آداب

نخلستان کا تازہ شمارہ دا کتوبر تا دسمبر، نظر نواز ہوا۔ مسز شانتا بالی کو اپنے افسانے "رستے ناسور" میں کتابت کی غلطیوں پر شکایت ہے خصوصاً بورٹ کی جگہ جگہ پر طباعت سے - اور ڈاکٹر رفعت اختر خاں کے مضمون "نئے اردو افسانے کا بین الاقوامی مزاج" کی مندرجۂ ذیل سطور پر :-

"منٹو نے اس وقت افسانہ نگاری کی جب دوسری عالمی جنگ ختم ہو رہی تھی - اور ملک کی تقسیم ہونے والی تھی ......... منٹو متوسط طبقہ کا ترجمان بن گیا .........."

منٹو کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی لاعلمی افسوسناک حد تک قابل اعتراض اور نخلستان کے قارئین کیلئے گمراہ کن ہے بات قارئین تک ہی ہوتی - تو کوئی بات نہ تھی لیکن اگر طلباء و طالبات نے کسی امتحان میں ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون کی بنا پر منٹو کی افسانہ نگاری کا دور دوسری عالمی جنگ لکھ دیا - تو ...... ؟

سعادت حسن کا یوم پیدائش ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء ہے - پہلا افسانہ "تماشہ" کے عنوان سے جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثہ سے متاثر ہو کر منٹو کے نام سے چھپوایا - تاکہ پولس کی گرفت سے بچ سکیں اس طرح وہ سعادت حسن منٹو ہو گئے - ہفتہ وار "مصور" کی ادارت اور امپیریل فلم کمپنی کی منشی گیری (اس زمانہ میں اسٹوری رائٹر کو منشی کہا جاتا تھا) کے دوران میں ہی اردو افسانہ نگاری میں انھوں نے اپنا ایک مقام بنا لیا تھا جب کہ کرشن چندر اور بیدی نے ابھی لکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا - کرشن چندر نے پہلی کہانی ۱۹۳۶ء میں لکھی تھی - منٹو اردو کا وہ واحد افسانہ نگار تھا جس نے ادبی پرچوں سے اپنی کہانیوں کا معاوضہ وصول کیا - منٹو میٹرک کے امتحان میں دو مرتبہ فیل ہوتے تھے اور دونوں مرتبہ اسی مضمون میں جس کبھی آگے چل کر وہ بڑے ادیب بنے یعنی اردو میں - اسی لحاظ سے وہ اپنے آپ کو ان پڑھ کہتے تھے -

جب تنقید نگاروں نے ان کے بارے میں لمبے چوڑے مضامین لکھنے شروع کئے اور حسب عادت

اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دینے کے لئے غیر ملکی مفکروں کے نام گنوانے لگے۔ کہ منٹو فلاں اور فلاں سے متاثر ہے۔ تو منٹو نے لکھا۔ کہ:۔

" میں نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں کیا۔ فرائڈ کی کوئی کتاب ابھی تک میری نظروں سے نہیں گزری۔ ہیگل کا میں صرف نام جانتا ہوں اور ہیولک ایلس کا بھی میں نے نام سن رکھا ہے —— "

منٹو نے کس طبقہ اور کس ماحول پر قلم اٹھایا ہے؟ یہ جاننے کے لئے اور اس کے فن کا تجزیہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جائے۔ ادھر ادھر سے اقتباسات نقل کر دینے سے مضمون نگار کا بھٹک جانا قدرتی امر ہے ۔

محمود رحمانی سنبھلی

محترم ایڈیٹر صاحب۔ آداب و تسلیمات۔!

" نخلستان " جنوری تا مارچ ہاتھ میں آیا۔ سادہ و پرکار سرورق، دیدہ زیب کتابت و طباعت سلیقۂ ترتیب مضامین، دودھیا گداز کاغذ، یقین کیجئے! تھوڑی دیر تک تو ادبی مجلہ کی صورت ہی دیکھتا رہ گیا۔ یہ سمجھ میں نہ آسکا۔ " اس کو دیکھوں یا اس سے بات کروں " کچھ سنبھلا تو مندرجات پر نظر پڑی " پیغمبر آخر الزماں اور فلاح نوع انسانی " ڈاکٹر محمد علی زیدی کے خامۂ اعجاز رقم کا مرہونِ منت ہے۔ یہ مضمون باعتبار نوعیت نخلستان کے مزاج میں انقلاب کا ضامن ہے بھرپور ادبیت اور حقائق کی پاسداری کا حسین امتزاج ہے۔

" جمالیاتی لمحوں کا شاعر " پروفیسر محمد حسن کی ذہنی اپج کا آئینہ دار ہے مگر تشنہ ہے موصوف کا شمار ملک کے دیدہ ور ناقدین میں ہوتا ہے۔ ان کی ذات سے جوش کی گہرائیوں میں اترنے اور تفصیلات میں جانے کی توقع، جہاں تک میں سمجھتا ہوں کوئی غلط بات نہ تھی۔

سید مدبر علی زیدی نے جوش کی شاعری کا نہایت دلنشین تجزیہ کیا ہے اور اشعار کے انتخاب میں صاحب نظر ہونے کا ثبوت دیا ہے ساتھ ہی کلیم الدین احمد کے بیجا اعتراضات کی جڑیں بھی ہلا کر رکھ دی ہیں۔

"ہم نے فراق کو دیکھا تھا" ایک صاف سادہ اور سلجھا ہوا مضمون ہے جس میں جا بجا لہجے کی ندرت، اسلوب کی انفرادیت سر اٹھاتی نظر آتی ہے۔ مصحفی، عزیز، جوش اور اقبال و میر کے باب میں فراق کی جچی تلی رائے مضمون کی قدر و قیمت میں اضافہ کا باعث ہے۔

"درد کا مداوا" ایک مختصر افسانہ ہے جو حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھانے کی کوشش کا درجہ رکھتا ہے اس میں شک نہیں کہ عصر حاضر میں وفا کی تلاش سراب سے کم نہیں

"راجستھان کا ادبی شہر ٹونک" ٹونک کی ادبی سرگرمیوں کی روداد پیش کرتا ہے جس کی اپنی ایک افادیت ہے۔ اور اب آئیے حصۂ نظم کی طرف۔

نازش پرتاپ گڈھی نے جوش ملیح آبادی میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو سمو دیا ہے۔ طرز بیان بھی جوش جیسے شاعر کے شایان شان ہے۔ "دھوپ۔ چاندنی" میں جذبات کا فقدان ہے۔ دھوپ ہے مگر مرجھائی مرجھائی۔ چاندنی ہے مگر پھیکی پھیکی "لفظوں کا مصوّر" بھیگے ہوئے خیالات کی آئینہ دار ہے۔

مصرعہ۔ پھر بھی تری شناس کا قائل رہا وفا۔ دائرۂ فہم سے باہر ہے۔

احمد رئیس کے قطعات جاندار ہیں۔ میکش کی غزل میں بھی بعض خوبصورت شعر ہیں ——— ہاں مصرعہ۔ ماضی کے جادوگر کا جو حسن کمال تھا۔ محل نظر ہے۔ اختر لکھنوی کی یوں تو دونوں ہی نظمیں بلیغ ہیں۔ تاہم مجھے "قطرے کا سہارا" زیادہ پسند ہے۔ تمثیلی انداز نظم کی جان ہے

مضطر صدیقی کے "گلہائے عقیدت" کے بارے میں یہ پیشگوئی کی جا سکتی ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے سخت جان ہیں۔ کہ بادخزاں کے جھونکے بھی ان کو بے رنگ و نکہت نہ کر سکیں گے۔ قوی ٹونکی کی غزل اپنے اندر بلا کا تیکھا پن رکھتی ہے۔ لب لہجہ کی بے باکی نے اشعار میں چنگاریاں بھر دی ہیں۔ بزمی ٹونکی غزل کے مزاج شناس ہیں۔ قدرت نے ان کی طبیعت میں سوز و گداز کا آتش فشاں رکھ دیا ہے۔ خالد سحر کے اشعار بھی بے ساختگی کی عمدہ مثال پیش کرتے ہیں ہلکے پھلکے ضرور ہیں لیکن مؤثر ہیں۔

ڈاکٹر اختر نظمی کی دو رباعیاں دل کو زخمی کر گئیں۔ ڈاکٹر اظہار مسرت اعجازی کی تضمین قابل قدر ہے۔ مصرعہ "کھلا کرتے ہیں کیچڑ ہی میں کنول" بند کے خوبصورت تاثر کو مجروح کر رہا ہے طلحہ تابش کا آخری قطعہ جدّت کا حامل ہے۔ مہدی پرتاپ گڈھی کی نظم پڑھ کر اپنا برسوں پرانا شعر ذہن میں گھوم گیا۔ دیکھ کر حال ابن آدم کا آدمیت کو شرم آتی ہے۔

ستارہ جے پوری کی غزل پڑھتے ہوئے مایوس سا ہو چلا تھا کہ اچانک اس شعر پہ نظر ٹھہر گئی۔

بھوک اور پیاس کا مارا ہوا ابنِ آدم
آج کے دور کا آئینہ لگے ہے مجھ کو

"اے خدا" میں آرٹ کا انداز تخاطب بڑا ہی معصومانہ اور پیارا ہے شاعری کیا ہے درد کی پکار ہے۔ اشعار حسن فطرت کے چھلکتے ساغر ہیں۔ رزمی ٹونکی کے قطعات میں بھی چبھن ہے۔ بیکس کے منتخب اشعار شعریت کی دولت سے مالامال ہیں۔ حبیب الرحمٰن نیازی بھی کسی سے کم نہیں مختصر بحر میں خوبصورت پُر تاثیر اشعار نکال کر داغ اسکول کی پیروی کا دم بھرتے ہیں۔ وارث احسنی کے یہاں بے ساختگی اور بے تکلفی کی ادا ملتی ہے وہ باتوں باتوں میں نازک کیفیات کی تصویر کشی کر جاتے ہیں۔ نارائن شیل کی غزل، عصری آگہی کی غماز ہے۔ مگر کہیں کہیں الفاظ کا جامہ تنگ ہوتا نظر آتا ہے۔ بہر کیف وہ ایک باشعور شاعر ہیں۔ میری اپنی بھی ایک غزل اس شمارہ میں شامل ہے۔ لیکن اس کے بارے میں فیصلے کا حق ارباب ذوق کو پہنچتا ہے۔

اس ساری خامہ فرسائی کا مقصد سیکھنا سکھانا ہے نام و نمود یا نمائش علم و فن نہیں امید کہ میرے احباب مجھے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

ڈاکٹر اظہار مسرت اعجازی۔

مکرم و محترم۔ سلام بالادب

جنوری تا مارچ کا شمارہ مئی کی ۵ کو ملا۔ اس تاخیر سے ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ مجھ ایسے دور افتادہ ادب لوگوں کی بے صبری منتہائے عروج پر پہنچ جاتی ہے مذکورہ شمارہ بھی اپنی روایات پر پوری وضع داری کے ساتھ کاربند ہے۔

ڈاکٹر زیدی صاحب کے قلم سے رحمۃ للعلمین کی عظمت کا بیان۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ مضمون کیا ہے عقیدت و محبت کے موتی ہیں جنہیں حسنِ الفاظ کی جلا دے کر شیرینیٔ کلام کے دھاگوں

میں پرویا گیا۔ اور پھر فصاحت بیان کی خوشبو میں بسا کر سینۂ قرطاس کی زیب و زینت بنا دیا گیا ہے۔
جمالیات جوشؔ پر پروفیسر محمد حسن صاحب کی جولانیٔ قلم اپنے بھرپور انداز کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ جوشؔ کی شاعری پر مدیرؔ علی زیدی کا طویل مضمون عرق ریزیٔ فکر اور فنکاری بیان پر دلالت کرتا ہے لیکن "حسین اور انقلاب" سے اتفاق کرنا اور "ذاکر سے خطاب" کو ابتذال اور رکاکت میں شمار کرنا کچھ عجیب سی بات لگی۔ میرے خیال سے دونوں ہی نظموں کا مقصود شجاعت و بے باکی اور جذبۂ ایثار کو ظاہر کرنا، شان و شوکت اور ذاتی مفادات پر ترجیح دینا ہے۔
"نذرانۂ نظم جوشؔ" کو انقلاب کے تیوروں کے ساتھ یاد کر کے نازش پرتاپ گڈھی نے اپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا بھی منوایا ہے۔ منشر صدیقی کے گلہائے عقیدت برائے نذر جوشؔ بہت ہی شگفتہ و شاداب ہیں لیکن المیۂ موضوع کا کیا کیجئے؎ ہر پھول کی قسمت میں کہاں ناز عروساں

کچھ پھول تو کھلتے ہیں مزاروں کے لئے بھی!

اسی قبیل کی شاعری میں طلحہ تابش کا آخری قطعہ بھی پسند آیا۔ فراقِ فراقؔ کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لئے ملاقات کے پس منظر کے ساتھ ایک اچھا مضمون قلمبند کر کے سیدہ شان معراج نے ثابت کیا ہے کہ وہ نظم کی طرح نثر پر بھی مکمل دسترس رکھتی ہیں۔ جوشؔ و فراقؔ کی مشترکہ یاد کے ضمن میں احمد رئیسؔ کا انداز، خصوصاً چوتھا قطعہ بلا شبہ ایک انمٹ یادگار کے طور پر زندہ رہے گا۔ رہی اس موضوع پر خوشترؔ گرامی کی خوش بیانی! اس پر تبصرہ؟ نا - بابا - نا! - اکیڈمی کے تعزیتی جلسے میں اردو زبان و ادب کے ان عظیم سانحات پر نیاز مند نے بھی ایک قطعہ پڑھا تھا؎

اُدھر تو نظم کا بے تاج بادشاہ گیا — اِدھر غزل کے محافظ نے جان کو ہارا
یہ مصرعہ جوشؔ کی تربت پہ لکھ دیا جائے — ترے فراق کے غم نے فراقؔ کو مارا

ڈاکٹر اختر بستوی کی نظمیں۔ ترقی پسندی کی غماز ہیں، خصوصاً "قطرے کا سہارا"۔ انگریزی کے مرثیہ نگار گمریز کا عکس خیال پیش کرتی ہے "پیش رفت" کا تجزیاتی تاثر یقینی طور پر دوامی فکر ہے لیکن چند اثر کو ذہنی بے راہ روی نے بالکل بے اثر بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر اختر نظمی نے رباعی کے ضمن میں بھی روایت شکنی کا عمل نیک اختیار کیا ہے۔ جدید رجحانات کی کامیاب پیش کش کے لئے انھیں مبارکباد۔ غزلوں میں اس بار عام سا انداز ہے صرف بزمی نوشی کے یہاں نادر الکلامی اور ندرت بیان نظر

آتی ہے۔ مخمور جالی کے یہاں تخلیق بھی تنقیدی مزاج کی آئینہ دار ہے۔ ستارے چاند پوری کی غزل حسب حال کہی جا سکتی ہے۔ بیکش کے یہاں زمین اچھی ہے لیکن آبیاری تشنہ! وارث احسنی کا ایک شعر بہت حسین ہے لیکن ترتیب یوں ہونی چاہیئے تھی ؎

تصادم ، محبت ، تعلق ، فراق

بہ سبب حادثہ ایک دم ہو گیا

"درد کا مداوا" ایک بے حد خوبصورت تقسیم ہے جس کا کلائمیکس پہلے چونک اٹھنے پر اور پھر لگاتار سوچتے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔!

## قیصر رشید بھارتی۔ ٹونک

جناب سکریٹری صاحب۔ تسلیمات

نخلستان کا تازہ شمارہ جنوری تا مارچ ہر اعتبار سے لائق تعریف ہے۔ اپنے تمام لوازمات کے ساتھ مجموعی اعتبار سے معیاری ہے۔ گوشۂ نگراں میں زیدی صاحب نے اپنا دل ہی کھول کر رکھ دیا ہے تمام حالات، مشکلات اور احساسات کی ایک خوبصورت تصویر کھینچ دی ہے۔

ڈاکٹر سید محمد علی زیدی کا مضمون "پیغمبر آخر الزماں اور فلاحِ نوعِ انسانی" عقیدت و محبت سے لبریز ہے۔ جوش اور فراق پر لکھے گئے مضامین بھی بہت کامیاب رہے۔ پروفیسر محمد حسن صاحب نے اپنی ادبی کاوش میں جوش کو بالکل نئے انداز سے پرکھا ہے جس کے مطابق جوش کے کلام میں لمحوں اور صدیوں کا تسلسل پایا جاتا ہے اور ان کے تہذیب انسانی کے کامیاب شاعر ہونے کی دلیل ملتی ہے۔ سید مدبر علی زیدی نے جوش کے کلام کا بغور مطالعہ کر کے فنکارانہ تجزیہ فرمایا ہے۔ سیدہ شانِ معراج نے فراق پر اس انداز سے مضمون لکھا ہے جیسے خود ہماری ملاقات حضرت فراق سے ہوگئی ہو۔ جناب عزیز اللہ شیرانی نے اپنے تحقیقی مضمون "راجستھان کا ادبی شہر ٹونک" میں ٹونک کا تعارف علم و ادب کی روشنی میں کرایا ہے۔

ریاست ٹونک کے جملہ حکمرانوں کی ادبی خدمات اور ادب نوازی کا عہد بعہد خاکہ کھینچ کر موصوف نے تاریخ ٹونک کو تاریخ ہند سے منسلک کر دیا ہے اور دورِ حاضر کے شعراء و ادباء ٹونک کو منظرِ عام پر

لانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ فنکاروں کے مختصر تعارف کے ذیل میں آپ نے جدید اور غیر متعارف شعراء و ادباء نیز قلمکاروں کو خاص طور سے پیش نظر رکھا ہے۔

مجموعی حیثیت سے آپ کا یہ مضمون ایک کامیاب اور قابل ستائش مضمون ہے جس کے لئے موصوف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

گوشۂ منظومات بھی کچھ کو چھوڑ کر سارا کا سارا معیاری ہے۔ پسند آیا۔ دور حاضر جدت کا دلدادہ اور حامی ہے۔ اور نخلستان اپنے اندر فن میں نئے پن کو جگہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور یہی اس کی پذیرائی اور کامیابی نیز خوش آیند مستقبل کی ضمانت ہے۔

خدا کرے نخلستان دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے۔

سہ ماہی

جے پور

# نخلستان



راجستھان اردو اکیڈمی کا جریدہ

سہ ماہی

# نخلستان

جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء

جلد:- ۴ —————— شمارہ:- ۲



## ناشر

راجستھان اردو اکیڈمی
جے ۳۰ ۔ سبھاش مارگ ۔ سی اسکیم،
جے پور ۳۰۲۰۰۱

سکریٹری راجستھان اردو اکیڈمی پرنٹر پبلشر نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر راجستھان اردو اکیڈمی جے پور ۳۰۲۰۰۱ سے شائع کیا۔

سہ ماہی

# نخلستان

قیمت ——— فی پرچہ ——— تین روپے

زرسالانہ ——— دس روپے

ترسیل زرومراسلت کا پتہ

دفتر راجستھان اردو اکیڈمی
جے ۔ ۳ ۔ سبھاش مارگ سی اسکیم
جے پور ۔ ۳۰۲۰۰۱

کاتب :۔ سلیم و آصف فرقانی ٹونکی

# ترتیب

# ترتیب

# گوشۂ نگراں

"نخلستان" کا تازہ شمارہ قارئین کی نذر ہے۔ چند بعید از اختیار امور کی وجہ سے جن میں کاتب صاحب کا غیر ذمہ دارا
ال اور دخل اندازی بھی شامل ہے۔ اس کی اشاعت میں تاخیر ہو گئی۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں نیز
عائی مہینے سے سکریٹری کا تقرر نہ ہونے کی وجہ بھی کسی حد تک ذمہ دار ہے۔ میری یہی کوشش و خواہش
ہی ہے کہ "نخلستان" جو راجستھان سے شائع ہونے والا واحد جریدہ ہے۔ معیاری ہو اور وقت
لے۔ بہرحال تاخیر کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ اور ایسی تدابیر اختیار کر رہا ہوں کہ تاخیر کے امکانات
ے کم تر ہو جائیں۔ یہاں میں چند امور کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جن میں سب سے
م امر اردو داں اور اردو نواز حضرات کا تعاون ہے۔ جس کے بغیر نہ کوئی اخبار شائع ہو سکتا ہے
ر رسالہ۔ ہر منزل، ہر مرحلہ پر اس کی ضرورت ہے۔ مواد کے لئے اہل قلم حضرات کا تعاون اور فرو
بقا کے لئے قدر دانوں کا تعاون۔ اول الذکر کے متعلق یہ عرض ہے کہ نثر نگاروں سے کئی گنا زیادہ
شعرائے کرام کا تعاون حاصل رہا۔ ہر صاحب فہم اس کی وجہ جانتا ہے۔ نثر نگاروں میں بھی معیاری تخلی
روں کا تعاون حاصل ہونا ضروری ہی نہیں بلکہ خوش نصیبی ہے۔ جتنا اہم یہ تعاون ہے اسی قدر ا
خریداروں کا تعاون ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ بسیار کوشش کے باوجود "نخلستا
کے خریداروں کی تعداد تین سو سے تجاوز نہیں کر سکی۔ اور فی الوقت تو یہ تعداد بہت ہی کم ہے۔ اس
شِ نظر اس کو ماہانہ بنانے کی آرزو مایوسی میں تبدیل ہو رہی ہے۔ جب اردو دوستوں کی تعا
شعاری کا یہ عالم ہو تو کسی روزانہ اخبار، ہفتہ وار، پندرہ روزہ ماہانہ رسالہ کی اشاعت کی جرأ
رنا اس ترقی پذیر دور میں تیشہ سے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ راجستھان میں جہاں اردو دا
ں تعداد ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہے اور جہاں بے شمار گفتار کے غازی موجود ہیں "نخلستان" سے
فل شعاری حیرت انگیز ہے۔ میرا مقصد اس کو خود کفیل بنانا نہیں ہے میں تو اس کے مالی خسارہ میں اگر یہ
راد کے لئے مفید ثابت ہو سکے۔ فائدہ ہی سمجھتا ہوں میری خواہش اس کی پذیرائی میں اضافہ کرنا ہے۔ م
قصد یہ ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچے تاکہ اردو کو فروغ حاصل ہو۔ "نخلستان" کی اشاعت
روغ دینا آپ کا ادبی و اخلاقی فرض ہے۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ اس میں ہر سن و سال اور ہر دو جنس کی وابستہ
سامان ہو۔ یہ محض تحقیقی و تنقیدی مقالات سے بوجھل ہی نہ ہو بلکہ اس کی شمولات نثر و نظم کی تمام اصناف
محیط ہوں۔ ہر صنف سخن کی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن محض دو یا تین اصناف ہی مکمل ادب کی تشکیل نہیں کرتیں بہ
ی صنفوں کی کمی خاص طور سے طنز و مزاح، ڈراما، سوانحی خاکے وغیرہ کی غیر موجودگی گراں گزرتی ہے
میری اہل قلم حضرات سے گذارش ہے کہ اس طرف توجہ دیں اور خواتین سے خصوصی توجہ کا طالب ہوں یہ صلائے عام
دور و نزدیک کے ادبی حلقوں میں اس کی جس طرح پذیرائی ہوتی ہے اس کا کچھ اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو
ے تحت پیش کئے جاتے ہیں۔ قارئین کو اپنی بے لاگ رائے کے اظہار کی پوری آزادی ہے اور ان کی وقیع آراء سے
ں اس کے ادبی معیار اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے ادبی مباحث بھی فروغ ادب کے لئے صحت مند علام
ے۔ البتہ ہم اتنی احتیاط ضرور برتتے ہیں کہ تنقید و تعریض غیر ادبی نہ ہو اور کسی کی ذات پر حملہ نہ ہو۔ آپ اپنی تخل

خطوط اکیڈمی کے دفتر کے پتے پر ارسال کیجئے۔

گذشتہ ماہ میں میری تحریک اور عالی جناب احمد بخش سندھی وزیر قانون واوقاف حکومت راجستھان
ایماپر جناب کے۔ کے بھٹناگر صاحب کمشنر تعلیمات نے اپنی صدارت میں ایک اجلاس منعقد کیا تھا جس میں
نے اور لال صاحب نے شرکت کی۔ ہمارے علاوہ ڈائریکٹر آف ایجوکیشن، ڈپٹی سکریٹری محکمہ تعلیم اور
م جوائنٹ ڈائرکٹرس اس میں موجود تھے۔ اردو سے متعلق تقریباً تمام امور پر ہمدردانہ ماحول میں غور
وخوض کیا گیا۔ کچھ معاملات طے ہوئے اور کچھ زیر غور ہیں۔ ان کی تفصیلات آئندہ شمارہ میں ممکن ہوا تو
ین کروں گا۔ یہ جلسہ تقریباً تین گھنٹہ جاری رہا۔ اور اردو کے متعلمین و معلمین سے متعلق گیارہ بارہ امور پر بحث ہوئی۔
ن مجھے یہ سن کے حیرت ہوئی جب تمام جوائنٹ ڈائرکٹرس نے ایک زبان ہو کے یہ کہا کہ ہمارے علاقوں میں اردو سے متعلق کوئی مطالبہ
یں ہے نہ کوئی شکایت ہے۔ جو شکایات اکیڈمی کے دفتر میں وقتاً فوقتاً موصول ہوئی ہیں وہ تمام میں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ چنانچہ
نے وہ سب بتائیں ان میں بعض زیر غور تھیں اور باقی تمام پر کارروائی کی جا چکی تھی۔ میں اردو کے مسائل کے سلسلے میں وزیر
لی راجستھان عزت مآب شیو چرن ماتھر صاحب محترمہ کملا صاحبہ وزیر تعلیم اور دیگر وزراء سے کئی مرتبہ مل چکا ہوں۔ سب کا رویہ
مدردانہ ہے وزیر اعلیٰ نہ صرف وسیع القلب ہیں بلکہ اردو کے شائق بھی ہیں عالی جناب سندھی صاحب کو اردو سے جس
ر دلچسپی اور لگاؤ ہو۔ وہ کم ہے اردو کے مسائل سے انھیں عملی دلچسپی ہے اور اردو کے موقف کی پرزور وکالت کرتے ہیں
ن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خدمت گذاران اردو بھی خود میں عملی جذبہ پیدا کریں۔ محض گفتار سے کام نہیں چلتا۔ انفرادی
اجتماعی طور پر اردو کی تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کی جائیں اور جہاں جہاں حکومت کے احکام پر عمل نہیں ہو رہا ہے انھیں
کام تک پہنچائیں۔ میں اکیڈمی کے دفتر میں ایک گوشوارہ تیار کروا رہا ہوں جس میں ابتدائی اور ثانوی درجات کے متعلق
مام معلومات مثلاً طلبہ وطالبات کی تعداد مدرس کا نام اور اہلیت مدرسہ کا نام پتہ وہاں کوئی کمی ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ
ین ظاہر ہے کہ اس کی تکمیل انجمنوں اور افراد کے تعاون سے ہی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں اردو اکیڈمی کا دفتر ان سے تعاون
ور مدد کرے گا۔

اس سال راجستھان اردو اکیڈمی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سال رواں سے ابتدائی درجات کے غریب طلبہ وطالبات
اردو کی نصابی کتابیں مفت فراہم کی جائیں اردو اور ہندی کے اخباروں میں اسے مشتہر بھی کر دیا گیا ہے۔ لیکن تادم تحریر پچیس
یں سے زیادہ کے نام موصول نہیں ہوئے ہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ راجستھان اردو اکیڈمی کے فیوض سے چند شہروں کے
وگ ہی استفادہ نہ کریں بلکہ یہ فیض راجستھان کے دور دراز علاقوں تک پہنچے۔ امید ہے کہ اردو انجمنیں اس کار خیر
یں ہماری مدد کریں گی۔

اردو اکیڈمی کے مختلف منصوبوں پر عمل شروع ہو چکا ہے۔ راجستھان کے شعراء وادبا کی تخلیقات کی اشاعت پر مالی
مداد، اردو کی معیاری کتابوں پر انعامات ضرورت مند اور مستحق طلبہ وطالبات کو وظائف اور ابتدائی درجات کے طلبہ و
البات کو مفت کتابیں فراہم کرنے کے سلسلہ میں اشتہارات جاری کر دیئے گئے ہیں۔
شعراء کو علاج کے لئے رقوم بھی ادا کر دی گئی ہیں۔ دیگر منصوبوں پر بھی عمل جاری ہے۔
میری تمام اہل ذوق اور ہمدردان اردو سے گذارش ہے کہ اس جریدہ کی ہر طرح اعانت کریں۔

یہ خبر انتہائی رنج وملال سے پڑھی جائے گی کہ جناب مستان بیکانیری نے جو راجستھان کے کہنہ مشق اور مقتدر شاعر
تھے ۱۰ محرم الحرام کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ جناب مستان مرحوم کا مجموعہ کلام "ہوش کی مستی" شائع ہو چکا ہے وہ عرصہ سے علیل تھے۔
خداوند عالم مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا کرے۔

(محمد علی زیدی نگراں)

# اداریہ

نخلستان کے پچھلے شمارہ کے اداریہ میں راجستھان کے اہل قلم اور خصوصاً ایسے اضلاع کے شعراء و ادباء سے، جن کی اب تک اس جریدے میں نمائندگی نہیں ہوئی ہے۔ یہ درخواست کی گئی تھی۔ کہ وہ اشاعت کے لئے اپنی تخلیقات عنایت فرما کر "نخلستان" کو راجستھان کی صحیح نمائندگی کا موقع فراہم کرائیں۔

اسی کے ساتھ راجستھان میں تحقیقی کام کرنے والے حضرات کی توجہ بھی اس جانب مبذول کرائی گئی تھی۔ کہ وہ اپنے موضوعات سے متعلق تحقیقی مضامین مرحمت فرمائیں۔ اگرچہ اس سلسلے میں کوئی عملی پیش رفت ابھی نظر نہیں آئی تاہم مذکورہ شمارے سے متعلق موصولہ خطوط میں ادارہ کی اس تجویز کو، نظر تحسین سے دیکھا گیا ہے اس سے مذکورہ تجویز کی مقبولیت پر روشنی پڑتی ہے

اس تجویز کے ذیل میں ضلع بانسواڑہ (راجستھان) سے جناب شاہد میر صاحب لکچرر شعبۂ نباتیات گورنمنٹ کالج بانسواڑہ کے مرسلہ مکتوب اور حسب ذیل کتب کا تذکرہ غیر واجب نہ ہوگا۔

(۱) "ہفت رنگ" ۔ شعرائے بانسواڑہ کے انتخاب کلام کا مجموعہ

(۲) "آوازیں" (دیوناگری رسم الخط) ایضاً

یہ دونوں گلدستے بزم ادب بانسواڑہ نے شائع کئے ہیں۔!

ان شعری مجموعوں کی روشنی میں بانسواڑہ کے ادبی ماحول کا جائزہ آئندہ شمارے میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ضلع بانسواڑہ میں اس سے پہلے اردو شعر و ادب کا سراغ نہیں ملتا جناب شاہد میر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کہ انھوں نے دس بارہ سال پہلے وہاں "بزم ادب" قائم کی اور بہت قلیل عرصہ میں شعر و ادب کا ایسا ماحول بن گیا۔ کہ "بزم ادب" بانسواڑہ نے دو شعری گلدستے شائع کر دئیے جن کے ذریعہ وہاں کے شعراء سے تعارف حاصل ہو سکا۔ (باقی صـ ۹ پر)

# جدید اردو مرثیے کے خدوخال
# مراثیِ جوش کے آئینے میں


کاظم علی خاں

لکچرار شعبۂ اردو
شیعہ ڈگری کالج۔ لکھنؤ


انیس و دبیر نے انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک اپنی غیر معمولی ادبی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اردو مرثیے کے قصرِ نفیس کو اوج و عروج دے کر اتنا رفیع کر دیا کہ عرصہ تک مرثیہ اس بلند حصار میں بند رہ کر باہر نہ نکل سکا۔ قصرِ مرثیہ میں بعد کو ساقی نامے اور بیانیہ عناصر کا دور دورہ تو رہا مگر یہ معمولی تبدیلی مرثیے کو انیس و دبیر کے بنائے ہوئے حصار سے باہر نہ نکال سکی۔ اردو مرثیہ برسوں انیس و دبیر کی بنائی ہوئی شاہراہِ محفوظ پہ گامزن رہا۔ اور نئے راستے کے خطرات سے دوچار ہونے کی جرأت نہ کر سکا۔

انیس و دبیر کے بعد مرثیے کو نئی راہوں پر لانا آسان نہ تھا۔ مرثیہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد روایتی مرثیے کے حصار میں ہی اسیر رہی مگر جوش ملیح آبادی نے سنہ ۱۹۲۰ء کے آس پاس "آوازۂ حق" نام کا مسدس لکھ کر اردو مرثیے کو انیس و دبیر کے روایتی حصار سے باہر نکالا۔ جدید مرثیے کے خدوخال کی تشکیل میں جوش کا یہ ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ مانا جاتا ہے۔

جوش کے مسدس "آوازۂ حق" سے قبل اردو مرثیے کو دورِ حاضر کے تصورات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جن مرثیہ نگاروں نے ابتدائی کوششیں کی ہیں ان میں شاد عظیم آبادی، مرزا

جعفر اوج، ناظر حسین ناظم، اور دلّو رام کوثری کے نام ملتے ہیں[1] مگر اردو مرثیے پر روایتی رنگ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ ان حضرات کی ابتدائی کوششیں اس میں کوئی بڑی تبدیلی لانے میں کسی قابلِ ذکر کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکیں۔ شاد، اوج، ناظم اور کوثری، جدید اردو مرثیے کی تاریخ میں جوش کے پیش رو ہونے کے باوجود اس اہمیت سے محروم رہے جو جوش کو نصیب ہوئی۔ جوش کے دوش بدوش جدید اردو مرثیہ کو تقویت پہنچانے میں نسیم امروہوی، سید آل رضا اور جمیل مظہری کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں[2]۔

تاریخ مرثیہ کے اوراق شاہد ہیں کہ جدید مرثیے کے باقاعدہ معرضِ وجود میں آنے سے قبل بیسویں صدی عیسوی کی ابتدائی دو دہائیوں کے دوران اردو مرثیے پر عموماً روایتی اور تقلیدی رنگ غالب تھا۔ مرثیہ نگاروں میں عام طور پر جدت اور اپج مفقود تھی سفارش حسین لکھتے ہیں:—

"..... پچھلوں کے نقشِ قدم پر چلنا اور اس طرح چلنا کہ پاؤں لغزش نہ کریں۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی، دنیا بدل رہی تھی، وقت کروٹ لے رہا تھا۔ مگر یہ آنکھیں موندے لیکھ پر چلے جا رہے تھے۔"

(اردو مرثیہ ص ۴۵)

---

[1] دیکھئے!:۔ (۱) اردو مرثیہ:۔ سفارش حسین۔ دہلی۔ طبع جولائی ۱۹۶۵ء ص ۳۸۹ تا ۳۹۲

(۲) دبستانِ دبیر:۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی لکھنؤ طبع مئی ۱۹۶۶ء ص ۲۲۲ تا ۲۲۴۔ نیز ص ۱۷۸ تا ۱۷۹

(۳) رزم نگاران کربلا: ڈاکٹر صفدر حسین لاہور طبع ۱۹۷۷ء ص ۲۱۶، ۲۲۲، ۲۷۳ نیز

(۴) لب فرات:۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین لاہور طبع ۱۹۷۶ء ص ۳۵۹ —— ص ۲۸۸ تا ۲۹۰ (حاشیہ)

[2] (۱) جدید مرثیے کے تین معمار ہلال نقوی۔ کراچی طبع دسمبر ۱۹۷۷ء

(۲) ۱۰ آتی رضا:۔ سید آل رضا کراچی طبع ۱۹۸۱ء

(۳) وجدان جمیل:۔ مرتبہ:۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین لاہور طبع ۱۹۷۸ء ص ۶ تا ۷۔ نیز ص ۶۹ و بعد

ان ناسازگار حالات میں اردو مرثیہ جس جمود سے دوچار تھا۔ اسے دور کرکے صنف مرثیہ کو روحِ عصر سے ہمکنار کرنے کے دشوار گزار کام میں شاد و ناظم جیسے مرثیہ نگاروں کی ابتدائی کاوشیں ناکام ہو چکی تھیں۔ تاریخ مرثیہ کی اس کٹھن منزل میں جوش ملیح آبادی کے جیسے جیالے باصلاحیت انقلابی شاعر نے اردو مرثیہ پر توجہ کرکے اسے نئی زندگی کے مسائل کا ترجمان بنانے کا تاریخی کام سرانجام دیا۔

جوش کے اس اقدام سے مرثیے نے اپنی کھوئی ہوئی مقبولیت دوبارہ حاصل کرلی میرے نزدیک جدید مرثیہ انیس و دبیر کے تعمیر کردہ قصرِ مرثیہ کی فصیل میں ایک ایسا در ہے جس نے مرثیے میں نئے تصورات کو راہ دی۔

جدید اردو مرثیے نے جوش، آلِ رضا اور نسیم امروہوی کی سرکردگی میں زندگی کے مسائل سے آنکھیں چار کرنا سیکھا۔ ادب کو زندگی کے مسائل سے قریب لانے کی جو تحریک سرسید، حالی اور محمد حسین آزاد جیسے مصلحین نے شروع کی تھی اس کے اثرات مختلف اصناف میں رفتہ رفتہ سرایت کرتے جارہے تھے۔ اس تحریک کے ہمہ گیر اثرات سے اردو مرثیہ کب تک بچ سکتا تھا۔ ادبی تاریخ کے تیز دھارے نے اردو مرثیے کی سمت و رفتار کو بھی آخر کار متاثر کیا۔ مرثیہ گوئی نے زمانے کے ہاتھوں ایک نئی کروٹ لی۔ صنفِ مرثیہ نے اپنی فرسودہ "آؤٹ آف ڈیٹ" قبا کو اتار کر جدید "اپٹوڈیٹ" لباس زیب تن کیا۔ اور یہ تبدیلی اردو مرثیے کی تاریخ میں ایک نئے باب کا عنوان بن گئی۔

جدید مرثیہ ابتدا میں روایتی مرثیے سے اتنا مختلف محسوس ہوا۔ کہ وہ ایک عرصے تک مسدس کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ کیوں کہ روایتی مرثیے کے حامیوں نے مرثیے میں اس تبدیلی کو قبول نہ کیا۔ اور جدید مرثیہ کو مرثیہ نہ مان کر اسے مسدس کا عنوان دیا۔ جدید مرثیہ برسوں مسدس کہا جاتا رہا۔ لیکن اب رفتہ رفتہ یہ مسدس کی جگہ جدید مرثیے کے نام سے موسوم ہونے لگا ہے۔ حالانکہ آج بھی ۱۹۸۳ء کے نصف آخر میں لکھنؤ کے بعض حضرات جدید مرثیے کو مسدس ہی کہتے ہیں۔

جدید مرثیہ فکری میلان اور فنی پیشکش میں قدیم اور روایتی مرثیے سے کس حد تک

مختلف ہے؟ جدید مرثیے اور روایتی مرثیے میں فرق کے اہم پہلو کیا ہیں؟ ان بنیادی سوالا پر غور کئے بغیر جوش کی مرثیہ نگاری کا مطالعہ تشنہ رہے گا۔ جوش نے جدید مرثیے کے ذریعہ قدیم مرثیے کو جن اوصاف سے روشناس کرایا۔ ان کی وضاحت اور قدروقیمت کا تعین ہی میرے اس مقالے کا موضوع بحث ہے۔

جدید مرثیے نے قدیم مرثیے کے فارم کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے مسدس ہی کو اپنے لئے منتخب کیا۔ جوش نے مرثیہ نگاری میں اپنے شاگرد ہلال نقوی کو ۵ دسمبر ۱۹۷۹ء کے ایک انٹرویو میں مرثیے کی ہیئت کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"فارم میں تبدیلی لانا کوئی ضروری نہیں ہے مسدس میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ جن میں موسیقیت بھی ہوتی ہے اور گنجائش بھی۔! اثر اور جوش دونوں باتیں اس سے پیدا ہوتی ہیں اس لئے مسدس مرثیے کے لئے بہترین شکل ہے۔"

(جدید مرثیے کے تین معمار۔ ص ۱۶)

۱۹۲۰ء سے ۱۹۷۱ء تک تقریباً ۔ ۵۱ سال کی مدت میں کہے جانے والے جوش کے جو نو عدد مرثیے دستیاب ہیں وہ بلحاظ ہیئت سب کے سب مسدس ہی میں ہیں اور ان کو میرے عزیز شاگرد ضمیر اختر نقوی سلمۂ نے اپنی کتاب بعنوان "جوش ملیح آبادی کے مرثیے" میں مرتب کر کے سنہ ۱۹۸۱ء میں کراچی سے شائع کرا دیا ہے۔

عزیزی ضمیر اختر نقوی نے اس کتاب کا جو نسخہ مجھے بھیجا تھا اس پر ۲۰ جولائی ۱۹۸۱ء تاریخ مرقوم ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب کراچی میں ۲۰ جولائی ۱۹۸۱ء سے قبل ہی جوش کے دوران حیات میں شائع ہوگئی تھی۔ جوش نے ان مراثی کی اشاعت کے بعد ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء میں وفات پائی تھی۔

جدید مرثیہ اپنے ارتقائی سفر میں ہیئت کی منزل تک تو قدیم مرثیے کا ساتھ دیتا رہا۔ لیکن اس سے آگے بڑھنے پر جدید مرثیہ روایتی مرثیے کا ساتھ چھوڑ کر اپنے لئے

نئی راہیں منتخب کرنا ہے۔ جدید مرثیے کی نئی راہ کی پہلی منزل عنوان کی شکل میں ملتی ہے قدیم اور روایتی مرثیے عنوان سے عموماً محروم ہوتے تھے اور ان کی پیشانی پر "مرثیہ در حال جناب" جیسے اندراج ہوتے تھے مرزا دبیر کے سینکڑوں مرثیوں میں سے صرف ایک مرثیہ بعنوان "اے شمع قلم انجمن افروز رقم ہو" مشمولہ "دفتر ماتم" جلد ۱۳ صفحات ۲۰۷ تا ۲۱۶ مظہر حق کے عنوان سے ملتا ہے۔ یہ روایتی مرثیہ استثنائی حیثیت رکھتا ہے۔

دبیر نے اپنے اس مرثیہ کا عنوان "مظہر حق" دراصل تاریخ کے باعث رکھا تھا۔ مظہر حق سے ۱۲۵۳ھ سنہ خرج ہوتا ہے۔ اس مرثیے پر تلاش دبیر طبع دسمبر ۱۹۷۹ء (ص ص ۶۳، ۲۶۶، ۲۸۵ نیز ۴۴۲) میں تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔ بہرحال عہد انیس و دبیر کے قدیم مرثیے عنوان سے عموماً محروم ملتے ہیں[۱]۔ اس کے برعکس جوش کے بہ تفصیل ذیل تمام جدید مرثیوں میں عنوان کا التزام ملتا ہے[۲]

| نمبر | عنوان | سن تصنیف | تعداد بند |
|---|---|---|---|
| ۱ | آوازۂ حق | ۱۹۱۸ء یا ۱۹۲۰ء | ۹۲ |
| ۲ | حسین اور انقلاب | ۱۹۴۱ء | ۶۸ |
| ۳ | موحد و مفکر | ۱۹۵۶ء | ۱۱۶ |
| ۴ | وحدت انسانی | ؟ | ۷۶ |
| ۵ | طلوع فکر | ۱۹۵۷ء | ۱۱۰ |
| ۶ | عظمت انساں | ؟ | ۸۸ |
| ۷ | آگ | ۱۹۵۹ء | ؟ |
| ۸ | زندگی اور موت محمدؐ و آل محمدؐ کی نظر میں | ۱۹۶۵ء | ۸۶ |
| ۹ | پانی | ۱۹۷۱ء | ۵۹ |

---

[۱] جوش ملیح آبادی کے جدید مرثیوں سے قبل سید ناظر حسین ناظم متوفی ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء کے بعض مرثیے عنوان کے ساتھ لکھے گئے تھے جن میں مرثیہ بعنوان "قرآن اور حسین" بھی شامل تھا۔ (رزم نگاران کربلا ص ۲۰۹۔ و۔ ص ۲۲۳)

بقیہ اگلے صفحہ پر......

ان اعداد و شمار سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جوش کے نو مرثیوں میں سے صرف دو کی تعدادِ بند سو سے زیادہ ہے۔ باقی دوسرے مرثیوں کی تعدادِ بند سو سے کم ہے گویا جوش نے اپنے جدید مرثیوں میں اختصار کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور اختصار کی روایت جدید مرثیے کی پسندیدہ روایت بن چکی ہے۔

کلاسیکی یا روایتی مرثیہ فارغ البالی کے زمانے کی شے تھا اور اس کی طوالت پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ روایتی مرثیوں میں ڈیڑھ سو بند ہونا معمولی بات تھی اور کبھی کبھی تو مرثیہ ڈھائی تین سو بند تک کی خبر لاتا تھا۔

انیس و دبیر کے طویل مطبوعہ مرثیوں کا جائزہ لینے پر انکشاف ہوتا ہے۔ کہ انیس نے چھ درجن سے زائد ایسے مرثیے کہے ہیں۔ جن کی تعدادِ بند ۱۲۰۔ یا اس سے بھی زیادہ ہے۔ اور دبیر کے مطبوعہ مراثی میں اسی طوالت کے مرثیوں کی تعداد سوا سات درجن سے بھی زیادہ ہے۔

بحوالہ انیس نمبر ماہِ نو کراچی سنہ ۱۹۷۲ء ص ص ۲۵۹ تا ۲۶۷

نیز تلاش دبیر ——— ص ص ۲۸۳ تا ۳۱۹

ان اعداد و شمار کے علی الرغم جوش کے دستیاب مرثیوں میں ایک مرثیہ بھی ایسا نہیں جو ۱۲۰ بند کا حامل ہو۔ جدید مرثیہ نگاروں نے مرثیہ کو ایجاز و اختصار سے ہمکنار کرایا۔ تاکہ عصرِ حاضر کی مصروف زندگی پر اس کی طوالت بار نہ ہو اور یہ صنف آج کی مصروف زندگی میں بھی مقبول ہو سکے۔

---

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ

... گویا جدید مرثیہ کے لئے عنوان یا موضوع کی روایت جوش کے مرثیوں سے قبل موجود ضرور تھی مگر مقبول نہ ہوئی تھی۔ اس روایت کو جوش ملیح آبادی کے جدید مرثیوں سے مقبولیت ملی۔ اب عنوان جدید مرثیے کی پہچان بن چکا ہے۔

ٹ بحوالہ جوش ملیح آبادی کے مرثیے۔ مرتبہ ضمیر اختر نقوی۔ کراچی طبع سنہ ۱۹۸۱ء۔ جوش کے جن نو عدد مرثیوں کی تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔ ان کے علاوہ دو نامکمل مرثیوں کا اور بھی پتہ چلتا ہے جن میں سے ایک کا عنوان "وفاداری" ہے اور دوسرا مرثیہ حضرت زینبؑ کے دربارِ شام سے متعلق ہے۔

بحوالہ:۔ (۱) جدید مرثیے کے تین معمار۔ ص ۳۸

(۲) جوش ملیح آبادی کے مرثیے۔ ص ۴۰۔ حاشیہ

مرثیہ جیسی طویل نظم کو اختصار سے روشناس کرانے کے لئے جدید مرثیہ نگاروں کو روایتی مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں قطع و برید سے کام لینا ناگزیر تھا۔ روایتی مرثیے کے اجزاءِ ترکیبی میں یہ دس حصے شامل تھے :۔

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| چہرہ | اجرا | سراپا | رخصت | آمد | رجز |
| جنگ | شہادت | بین | خاتمہ | یا | دعا[1] |

ان میں سے بعض اجزاء اب جدید مرثیے سے خارج ہو چکے ہیں

روایتی مرثیہ، جنگ کے حصہ میں رہوار اور تلوار کی تعریف میں جس مبالغہ آمیز طول کلامی سے کام لیتا تھا وہ جوش کے جدید مرثیوں سے قبل شاد عظیم آبادی کو بھی گراں گزر رہی تھی۔ نقی احمد ارشاد کے بموجب، شاد کے نزدیک رزم، صف آرائی، رہوار اور تلوار کی تعریفیں مرثیہ کے لئے غیر ضروری چیزیں تھیں جیسا کہ شاد عظیم آبادی کی اس رباعی سے ظاہر ہے :—

صرصر ہو خوش خرام کیا اس سے ہوا | یا برق بنی حسام، کیا اس سے ہوا
جس کام کے واسطے ہوئے آپ شہید | سچ پوچھو تو وہ کام، کیا اس سے ہوا[2]

جوش ملیح آبادی نے بھی مرثیہ میں تلوار اور رہوار کی تعریف کے متعلق اپنے انٹرویو کے دوران اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا — کہ :—

"یہ باتیں اب تضییع نوانائی ہیں ———"

(جدید مرثیے کے تین معمار ص ۳۱)

جوش سے اسی انٹرویو میں ہلال نقوی نے پوچھا تھا —:—

"کیا آج کا مرثیہ گوشت غرا بیش سے ہٹ کر اپنا کوئی راستہ بنانے میں کامیاب ہوا ہے ۔؟"

---

[1] روایتی مرثیے کے ان اجزائے ترکیبی کی تفصیل کے لئے دیکھئے ۔:۔

تلاش دبیر :۔ کاظم علی خاں ۔ لکھنؤ، طبع دسمبر ۱۹۷۹ء ص ص ۲۰۵ تا ۲۴۸

[2] فکر بلیغ :۔ مولفہ شاد عظیم آبادی، مرتبہ :۔ نقی احمد ارشاد لکھنؤ طبع اگست ۱۹۷۲ء ص ۱۲ - ۱۳

جوش کا جواب تھا:۔

"ہاں یقیناً کامیاب ہوا ہے۔ کیوں کہ انیس کے یہاں تلوار تھی، گھوڑا تھا، رخصت رخصت تھی۔ اور اب یہ باتیں ختم ہو چکی ہیں ـــــــ"

(جدید مرثیے کے تین معمار ص ۳۶)

جوش کے اس بیان کے علی الرغم نسیم امروہوی اور آل رضا جیسے جدید مرثیہ نگار تلوار اور گھوڑے کے بیان کو مرثیے کے لئے غیر ضروری نہیں مانتے ۔ (جدید مرثیے کے تین معمار ص ۳۱، ۳۲) اور کم از کم خود جوش کے ابتدائی مرثیے "آوازۂ حق" میں کلاسیکی مرثیے کے متعدد اجزاء ملتے ہیں ۔ جن میں چہرہ، سراپا، رجز، جنگ، شہادت اور بین کو ضمیر اختر نقوی نے بھی محسوس کیا ہے ۔ [۱]

"آوازۂ حق" کے ۲۸ بند کے چہرے میں جوش نے مناظر فطرت کی عکاسی اور توحید و تصوف کے مسائل پر گفتگو کی ہے ۔ کلام جوش اور "یادوں کی برات" کے صفحات شاہد ہیں ۔ کہ جوش کو مناظر فطرت سے گہری دلچسپی رہی ہے ۔ ۱۹۲۰ء میں "قصر سحر" کی تعمیر میں یہی جذبہ کار فرما تھا [۲] اور ۱۹۲۰ء کے آس پاس کہی جانے والے جوش کے مرثیے "آوازۂ حق" کا چہرہ بھی مناظر فطرت کے بیان سے خالی نہیں ۔ ـــ

اے دوست بتاتا ہوں تجھے روح کے اسرار | صدموں سے اگر چور ہے تیرا دل بیمار
آنکھیں تو اٹھا دیکھ ذرا حسن کے انوار | یہ چاند، یہ سورج، یہ نباتات، یہ کہسار
کیوں تیرے خیالات، پریشاں ہیں برادر
اک غم ہے، تو سو عیش کے ساماں ہیں برادر

---

۱؎ عزیزی ضمیر اختر نقوی نے یہاں "آوازۂ حق" میں "آمد" کا بھی ذکر کیا ہے ۔ جو مجھے اس مرثیہ میں نہیں مل سکی ہے
(جوش ملیح آبادی کے مرثیے ص ۲۹)

۲؎ یادوں کی برات :۔ جوش ملیح آبادی ۔ مطبوعہ شالیمار آفسیٹ پریس نئی دہلی، طبع جون ۱۹۸۲ء ۔
ص ۱۶۵ و ما بعد

غنچوں کی حیا، گل کی ہنسی، اوس کے گوہر      زرتار شفق، سرد ہوا، باغ معطر
رنگین گھٹا، قوسِ قزح، مہرِ منور      نغمے یہ پرندوں کے، پہاڑوں کے یہ منظر

ہے کون سی خوبی جو یہ تو میں نہیں ہے
کیا باغِ ارم صبح کے پرتو میں نہیں ہے

(جوش ملیح آبادی کے مرثیے ص ۸۹)

"آوازۂ حق" کے چہرے میں سنہ ۱۹۲۰ء کے آس پاس جوش نے تصوف و توحید کے مسائل بھی چھیڑے ہیں۔ "یادوں کی برات" ص۔ص ۱۶۶ تا ۱۶۹ سے انکشاف ہوتا ہے کہ ۱۹۲۰ء کے آس پاس جوش پر تصوف و تقشف اور صوم و صلوٰۃ کے اثرات طاری تھے۔" آوازۂ حق" کے چہرے میں جوش کی زندگی کے اسی دور کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ آوازۂ حق کے بند ۲ تا ۵ بند ۷، بند ۱۳ تا ۱۵، بند ۱۸ تا ۲۸ ملاحظہ ہوں۔

آوازۂ حق کے بند نمبر ۳۶ میں جوش نے یزیدی فوج کے ایک پہلوان کا سراپا بھی نہایت اختصار سے پیش کیا ہے اور بند نمبر ۳۷ تا ۴۹ میں امام حسینؑ کا رجز اور اخلاقی درس بھی شامل ہے۔ بند نمبر ۵۶ تا ۷۷ میں امام حسینؑ کی جنگ ہے جس میں بعض بند تلوار کی تعریف میں بھی ہیں۔ البتہ اس مرثیہ میں امام حسینؑ کے رہوار کی تعریف کا التزام نہیں۔ آوازۂ حق کے بند نمبر ۷۸ تا ۸۷ میں شہادت و بین کے حصے بھی ملتے ہیں۔

اس تجزئے سے پتہ چلتا ہے کہ کلاسیکی مرثیے کے اجزائے ترکیبی کے اثرات سے جوش کی مرثیہ نگاری کا ابتدائی دور خالی نہیں رہا ہے بعد کے بھی بعض مرثیوں میں جوش نے چہرہ و ماجرا شامل رکھا ہے۔ اس کی مثال "حسین اور انقلاب" کے بند نمبر ۱ تا ۱۹ میں ملے گی۔ جوش کے مرثیے "وحدت انسانی" کے بند نمبر ۴۹ تا ۵۶ میں آمدو شہادت کا ذکر ہے۔ مرثیہ بعنوان "پانی" کے بند ۸، تا ۳۴ میں جوش نے اختصار سے امام حسینؑ کی جنگ کے ماتحت تلوار کی بھی تعریف کی ہے۔ مزید برآں چہرہ جوش کے اکثر بلکہ تمام تر مراثی میں شامل ملتا ہے۔ البتہ رہوار کی تعریف تلاش کے باوجود مجھے جوش کے کسی بھی مرثیے میں نہیں ملتی۔ گویا جوش نے اپنے جدید مرثیوں میں کہیں کہیں کلاسیکی مرثیے کے اجزائے ترکیبی کو انتخابی شکل میں اپنے طور پر برتنے میں پس و

و پیش نہیں کیا ہے۔ جوش کے جدید مرثیے کے ایوان کی آرائش میں کہیں کہیں قدیم مرثیے کے ساز و سامان کے نقوش جلوہ گر ہیں۔

کلاسیکی مرثیہ، کربلا کے خونچکاں واقعے کی یاد کو عقیدت مندانہ انداز میں تازہ رکھنے کے لئے محدود ہو تھا۔ جوش نے اپنے جدید مرثیوں میں کربلا کے واقعات کو عصری زندگی کے مسائل سے مربوط کرنے کی شعوری طور پر کوشش کی ہے۔ گویا جوش نے اردو مرثیے کو ماضی کے حصار سے نکال کر حال کی سرحدوں تک پہنچا دیا ہے۔

عصری مسائل کا بیان جدید مرثیے کا وہ قابل ذکر پہلو ہے جس سے کلاسیکی مرثیے عموماً خالی نظر آتے ہیں۔ یہاں لفظ عموماً میں نے اس لئے استعمال کیا ہے۔ کہ مجھے مرزا دبیر۔ (متوفی ۹ مارچ ۱۸۷۵ء) کے بھی دو مرثیے عصری حالات کے بیان میں ملے ہیں۔ ان میں سن ۱۲۵۳ھ کا ایک مرثیہ "مظہر حق" کے تاریخی عنوان سے دفتر ماتم کی تیرھویں جلد کے آخری مرثیے کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دبیر کا یہ مرثیہ تعزیہ داری کی مخالفت میں ایک تحریر کے جواب کی شکل میں ہے۔

دبیر کا دوسرا مرثیہ "اے قہر خدا رومیوں کو زیر و زبر کر" دفتر ماتم جلد ۱۲ (طبع جنوری ۱۸۹۶ء) صفحات ۱۵۴ تا ۱۶۷ میں موجود ہے۔ عہد دبیر کے دوران کربلا میں قتل عام کا ایک سانحہ رونما ہوا تھا جس میں بعض علمائے اسلام بھی شہید ہوئے تھے۔ اس مرثیہ میں دبیر نے اپنے عہد کے اسی واقعہ کو بیان کیا ہے۔

نجات حسین عظیم آبادی کے بموجب عہد دبیر کا یہ واقعہ ذی الحجہ ۱۲۵۸ھ مطابق جنوری و فروری ۱۸۴۳ء میں رونما ہوا تھا۔ اور دبیر نے اس قتل عام کے بیان پر مشتمل اپنا یہ مرثیہ ۲۵ ربیع الآخر ۱۲۵۹ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۴۳ء کو میر باقر سوداگر کے امام باڑے واقع لکھنؤ میں پڑھا تھا۔

دبیر کے ان دونوں مرثیوں کے متعلق میری کتاب تلاش دبیر ص ۹۳، ۹۷، نیز ۲۹۶/۲۹۷ میں اجمالی گفتگو موجود ہے۔ بہرحال عصری واقعات کے بیان میں دبیر کے یہ دونوں ہی مرثیے استثنائی حیثیت کے حامل ہیں۔ اور ہم کلاسیکی مرثیوں کو عموماً عصری مسائل کے اس بیان

سے خالی پاتے ہیں جو جدید مرثیے میں عموماً ملتا ہے۔

جوشؔ نے ۱۹۲۱ء کے آس پاس کے مرثیے "آوازۂ حق" میں تحریک آزادیٔ ہند کے علمبردار مجاہدوں کو واقعات کربلا دِکھا کے درس دے کر جنگ آزادی کی راہ میں پیش آنے والے مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔ ؎

اے جوشؔ یہ اب تک ہے اسی خون کی تاثیر
ہوتی ہے بالاعلان بڑی شان سے تکبیر
اب بھی جنھیں ملتی ہے رہِ عشق میں تعزیر
صد شکر کہ خوش ہو کے پہن لیتے ہیں زنجیر
ڈرتے ہی نہیں دیکھ کے جلّاد کی صورت
زنداں میں چلے جاتے ہیں سجّاد کی صورت

اک کھیل ہے ان کے لئے شاہوں کی جلالت
سینوں میں ہے ایمان زبانوں پہ صداقت
کوشش ہے کہ آزاد ہوں پابندِ مصیبت
سر جائے تو جائے۔ نہ گرے تاجِ خلافت
تقدیر ہے جس قلب میں ایمان کی بو ہے
پنجاب کے ناکردہ گناہوں کا لہو ہے

بے درد کی حسرت کو نکلتے نہیں دیکھا
کاغذ کی کبھی ناؤ کو چلتے نہیں دیکھا
ظالم کو کبھی پھولتے پھلتے نہیں دیکھا
ٹھوکر ہے یہ وہ جس سے سنبھلتے نہیں دیکھا
وہ تخت ہے کس قبر میں وہ تاج کہاں ہے
اے خاک بتا زورِ یزید، آج کہاں ہے

(جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے۔ ص ۶۲، ۶۳)

"حسینؑ اور انقلاب" ۱۹۴۱ء کا مرثیہ ہے اور جوشؔ نے اس کے چہرے میں اپنے دور کی سفّاکیوں اور شقاوتوں کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اسی مرثیے کے آخری حصہ میں جوشؔ نے جنگ آزادی کے جیالے مجاہدوں کو یہ پیام دیا ہے۔ ؎

پھر حق ہے، آفتابِ لبِ بام اے حسینؑ
پھر بزم آب و گل میں ہے کہرام اے حسینؑ
پھر زندگی ہے سست و سبک گام اے حسینؑ
پھر حرّیت ہے موردِ الزام، اے حسینؑ
نخلستان

ذوقِ فساد و ولولۂ شر لئے ہوئے
پھر عصرِ نو کے شمر ہیں خنجر لئے ہوئے

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار — اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہریار — پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار

اے زندگی، جلالِ شہِ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسین دے

بل کھا رہے ہیں دہر میں پھر سیم و زر کے ناگ — گونجے ہوئے ہیں گنبدِ گرداں میں غم کے راگ
پھر موت رخشِ زیست کی تھامے ہوئے ہے باگ — تا آسماں بلند ہو اے زندگی کی آگ

فتنے کو اپنی آنچ کے جھولے میں جھونک دے
ہاں پھونک دے قبائے امارت کو پھونک دے

اے دوستو! فرات کے پانی کا واسطہ — آلِ نبی کی تشنہ دہانی کا واسطہ
شبیر کے لہو کی روانی کا واسطہ — اکبر کی ناتمام جوانی کا واسطہ

بڑھتی ہوئی جوان امنگوں سے کام لو
ہاں تھام لو حسین کے دامن کو تھام لو

آئینِ کشمکش سے ہے دنیا کی زیب و زین — ہر گام ایک بدر ہو، ہر سانس اک حنین
بڑھتے رہو یونہی پئے تسخیرِ مشرقین — سینوں میں بجلیاں ہوں زبانوں پہ یا حسین

تم حیدری ہو سینۂ اژدر کو پھاڑ دو
اس خیبرِ جدید کا در بھی اکھاڑ دو

دیکھو وہ ختمِ ظلم کی حد ہے بڑھے چلو — آتا ہے خود یہ وقت مدد ہے بڑھے چلو
بڑھنے میں عزتِ اب و جد ہے بڑھے چلو — وہ سامنے حیاتِ ابد ہے بڑھے چلو

الٹے رہو کچھ اور یونہی آستین کو
الٹی ہے آستیں تو پلٹ دو زمین کو

(جوش ملیح آبادی کے مرثیے ص ۷۸، ۸۰)

قدیم مرثیہ بخشش و نجات کا ایک روحانی وسیلہ تھا مگر جدید مرثیے میں روحانیت سے زیادہ ارضیت نے جگہ پائی۔ قدیم مرثیہ مذہبی اور اخلاقی نظم تھی جدید مرثیہ قومی یا اصلاحی نظم بن گیا۔ قدیم مرثیہ روحانی زندگی اور حقانیت کا پیکر تھا۔ جدید مرثیہ مادّی زندگی کے مسائل کا ترجمان اور حقانیت سے زیادہ حقیقت نگاری کا نمونہ بن گیا۔ قدیم مرثیہ اپنی تمام تر روحانیت کے باوجود تاسّیِ حسین کا واضح درس نہ دیتا تھا اس کے برعکس جدید مرثیے نے اپنی ارضیت کے باوصف تاسّیِ حسین کا درس اتنے صاف اور واضح انداز میں دیا۔ کہ یہ وصف جدید مرثیے کی اہم ترین شناخت بن گیا۔ جیسا کہ جوش ملیح آبادی کے مندرجہ ذیل چند بیانات سے ظاہر ہے :—

(الف) " جو مرثیہ تاسّیِ حسین پر ابھارے وہ جدید ہے اور وہ مرثیہ جو تاسّیِ حسین پر نہ ابھارے۔ چاہے اس عہد جدید میں لکھا جائے لیکن وہ قدیم مرثیہ ہی کہلائے گا۔ "

(جدید مرثیہ کے تین معمار ص ۲۳)

(ب) " مرثیہ گو کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ بکا پر تان ٹوٹے۔ لکھتے وقت کوئی مصرعہ یا بند رقت قلب کا آجائے تو وہ اور بات ہے لیکن اس کی نیت یہ نہ ہو۔ کہ رُلا کر اٹھائے۔ بلکہ جھنجھوڑ کر کر اٹھائے۔ باطل سے ٹکرانے کی جرأت، سلطان جابر کے سامنے حرف حق کہنے کی جرأت اور جذبۂ تاسّیِ حسین، ان چیزوں کا پیدا کرنا مرثیہ گو شاعر کا فرض ہونا چاہیئے۔ "

(جدید مرثیے کے تین معمار ص ۲۱)

---

(ج) " یہ جذبہ والی بات اس لئے ہے کہ پہلے جو مرثیے کہے جاتے تھے۔ وہ صرف بکا کے لئے کہے جاتے تھے۔ اور مآل مجالس ہچکیوں پر ختم ہو جاتا تھا۔ اور اب جدید لوگ یہ کوشش کرتے ہیں۔ کہ ہمت تازہ

کریں اور باطل سے لڑنے کا ولولہ پیدا کریں۔ تو یہ جدید و قدیم والی
بات درست ہے —"

(جدید مرثیے کے تین معمار - ص ۲۴)

---

نسیم امروہوی نے اپنے ۱۹۳۶ء کے جدید مرثیے میں لکھا تھا :—

بپا جو کرتے ہو مجلس شہِ ہدیٰ کے لئے ۔۔۔ اشاعتِ غمِ مظلومِ کربلا کے لئے
نہ صرف بہرِ بُکا ہے نہ واہ واہ کے لئے ۔۔۔ یہ مدرسہ بھی ہے اک دینِ مصطفیٰ کیلئے

نہیں یہ بزم، ہدایت کا باب ہے گویا
حسین علم و عمل کی کتاب ہے گویا

(جدید مرثیے کے تین معمار - ص - ۲۴، ۲۵)

---

ابتی) مرثیے میں شہادت و بین کے حصوں پر زور ہونے کے باعث مرثیے میں المیہ
و حزنیہ عنصر کبھی کبھی اسے قنوطیت سے ہم آہنگ کر دیتا تھا۔ جدید مرثیے میں قنوطی رنگ کی جگہ
رجائی انداز رکھا جانے لگا۔ تاکہ سامعین معرکۂ کربلا سے عزم و عمل کا ایک نیا جذبہ لے کر
مجلس سے اٹھیں اور کارزارِ حیات میں حق کی حمایت میں باطل سے برسرِ پیکار رہیں —

جوش کے ہر جدید مرثیے میں یہ پہلو عزیز رکھا گیا ہے۔ بخوف طوالت مثالوں کو نظر انداز کرکے
سطور ذیل میں جوش کے مختلف مرثیوں کے ان حصوں کی نشان دہی کی جا رہی ہے۔ جن میں
جوش نے تاسیِ حسین کی دعوت دی ہے۔ یا تاسیِ حسین کے تابناک انجام کی تصویریں پیش
کی ہیں :—

| | | | |
|---|---|---|---|
| (۱) | آوازۂ حق | بند نمبر ۸۷ تا ۹۲ | - جوش ملیح آبادی کے مرثیے - ص ۹۲، ۹۳ |
| (۲) | حسین اور انقلاب | " ۵۷ تا ۹۷ | " " " " ص ۷۸ تا ۸۰ |
| (۳) | موحد و مفکر | " ۸۵ تا ۱۱۶ | " " " " ص ۱۰۰ تا ۱۰۶ |
| (۴) | وحدتِ انسانی | " ۶۲ تا ۷۶ | " " " " ص ۱۲۱ تا ۱۲۴ |

(۵) طلوعِ فکر — بند نمبر ۱۰۲ تا ۱۱۰ - جوش ملیح آبادی کے مرثیے ص ۱۴۷ تا ۱۴۹
(۶) عظمتِ انسان — " ۶۴ تا ۸۸ " " " ص ۱۶۵ تا ۱۷۰
(۷) زندگی و موت محمد و آلِ محمد کی نظر میں — " ۶۱ تا ۸۶ " " " ص ۱۸۵ تا ۱۹۰
(۸) پانی — " ۵۶ تا ۵۹ " " " ص ۲۰۴

قدیم مرثیے میں واقعات کربلا کے بیان پر ہی اصل توجہ تھی - جدید مرثیے نے بیانیہ عنصر سے زیادہ معرکۂ کربلا کے اسباب و نتائج کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی سعی کی ہے - جدید مرثیہ اب خالص بیانیہ نظم نہ رہ کر ایک ایسی تجزیاتی نظم بن گیا ہے جو تجزیہ پسند جدید ذہن کو دعوتِ غور و فکر دے کر عصرِ حاضر میں اپنے لئے جگہ بنا سکتی ہے - اور مقبولیت حاصل کر سکتی ہے -

قدیم مرثیہ واقعہ نگاری کے مختلف فنکارانہ پیرایوں کا نمونہ ہوتا تھا - اب جدید مرثیے نے اس کی جگہ فکری استدلال، نفسیاتی بصیرت اور علامت نگاری کی جانب توجہ کر کے قدیم اور روایتی مرثیے کی فرسودہ ڈگر اور پامال رہ گزر پر چلنے کے بجائے اپنے لئے نئی راہیں تلاش کر لی ہیں -

جوش نے اپنے جدید مرثیوں میں کہیں قلم کو عظمتِ انسان کا نشان قرار دیا ہے کہیں آگ اور پانی کو زندگی کی علامتوں کے روپ میں بڑے دلنشیں طور پر پیش کیا ہے -

قلم کے متعلق جوش کی خامہ فرسائی کا ایک نمونہ دیکھئے -

دونوں عالم کو اٹھائے ہوئے شانے تیرے — بر ربطِ گیتی و گردوں میں ترانے تیرے
جس قدر بھی ہیں زمانے وہ زمانے تیرے — تند رو وقت کے دھاروں میں فسانے تیرے
دورِ پارینہ - کہ ہے وقت کے ایوانوں میں
سانس لیتا ہے ترے زندہ کتب خانوں میں

جوش ملیح آبادی کے مرثیے ص ۱۵۲

---

اب پانی کے بیان میں جوش کے خامہ کی شاعری ملاحظہ فرمائیے -

پانی خوش اضطراب و خوش انداز و خوش جمال — خوش آب و خوش خرام و خوش آواز و خوش مقال
شیریں قوام و شیشہ مزاج و گہر خصال — سرشاری و شگفتگی و رقص و وجد و حال

سرمایۂ آب و رنگ کی تانیں لئے ہوئے
لاکھوں ہر ایک بوند میں جانیں لئے ہوئے
پانی چناب و راوی و گنگا و رودِ نیل　　جوئے حیات و کوثر و تسنیم و سلسبیل
رقّاص بے نظیر و غزل خوانِ بے عدیل　　موجِ ہوا پہ ہمسرِ گلبانگِ جبرئیل
دستِ خنک میں ساغرِ زمزم لئے ہوئے
کلیوں کی خوابگاہ میں شبنم لئے ہوئے
پانی ہزار روپ سے ہوتا ہے متجلی　　شبنم، بہار، گونج، گرج، راگنی، جھڑی
بالی، درخت، دوب، ثمر، برگ خشک کلی　　کونپل، شگوفہ، کاہ، کلی، پھول، پنکھڑی
کرتا ہے نصب موج پہ خیمے حباب کے
بھرتا ہے وقتِ صبح کٹورے گلاب کے
پانی، بخار، سحاب، گھٹا، جھلملی، دھواں　　سنبل، بنفشہ، لالہ، سمن، سروِ بوستاں
شاداب و نرم و نازک و سرشار و شادماں　　بستان و سبزہ زار و خیابان و گلستاں
آنچل رخِ صبیح پہ آبی سے لئے ہوئے
کاندھوں پہ زندگی کے گلابی لئے ہوئے
(جوش ملیح آبادی کے مرثیے ص ۱۹۳-۱۹۴)

---

اب "آگ" کے باب میں جوش کے شعلہ بار قلم کی سرگرمیاں دیکھئے۔ !:— ۵
آگ، دانائی، تامّل، دوربینی، آگہی　　آگ، جولانی، حرارت، مسکراہٹ، روشنی
آگ ہنسی، سرخوشی، مستی، جوانی، زندگی۔　　آگ گویائی، خطابت، شاعری، پیغمبری
اوصیاء کی جلوہ باری انبیاء کی روشنی
گبر کا ایمان، ترسا کے خدا کی روشنی
آگ کی جولانیاں ہر جوہرِ محلول میں　　حلقۂ مشموم میں، مشروب میں ماکول میں
راکھ میں بھوبل میں ذرّوں میں دھوئیں میں دھول میں　　برف میں شبنم میں، یخ میں پتیوں میں پھول میں

جولائی تا ستمبر ۵۳ء

اس تپاں گردوں کُرے کے خشک تر میں آگ ہے
دشت کے سینے میں دریا کے جگر میں آگ ہے

نفعِ تاب و تب کی ضامن فیضِ حدت کی کفیل — قعرِ دوزخ میں بلا، ایوانِ جنت میں جمیل
گاہ موجِ کینہ پرور، گاہ موجِ سلسبیل — غیظ میں نمرود؛ نفتِ نار، گلزارِ خلیل

عرصۂ پُرخاش میں گرزِ گراں تولے ہوئے
حجلۂ اخلاص میں بندِ قبا کھولے ہوئے

اور جب خوش ہو تو پیغامِ بقا دیتی ہے آگ — زندگی کو اپنے دامن کی ہوا دیتی ہے آگ
ظلمتوں کو دولتِ نور و ضیا دیتی ہے آگ — سنگ کو یاقوتِ احمر کی قبا دیتی ہے آگ

اور اسے ڈھونڈھو تو فرِّ سروری دیتی ہے آگ
سروری کیا چیز ہے پیغمبری دیتی ہے آگ

(جوش ملیح آبادی کے مرثیے ص ۲۰۷ تا ۲۰۹)

---

روایتی مرثیہ جن قدیم صنائع و بدائع سے گراں بار تھا جدید مرثیے میں انھیں اس حد تک بار نہ ملا لیکن جوش نے اپنے جدید مرثیوں میں تشبیہات و استعارات اور مناظرِ قدرت کو جن نئے نئے دلنشین پیرایوں میں بیان کیا ہے اور زبان کو جس فن کارانہ مہارت اور چابک دستی سے استعمال کیا ہے۔ وہ ان کی قادرالکلامی پر دال ہے۔

قدیم مرثیوں میں امام حسینؑ کی مدح کا اپنا ایک انداز تھا۔ جوش کے جدید مرثیوں میں بھی یہ قدیم روایت دہرائی گئی ہے۔ مگر یہاں اس کا انداز بالکل نیا اور قدیم مرثیوں سے یکسر مختلف ہے۔ جوش حضرت امام حسینؑ سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے اس عقیدت کے نقوش جگہ جگہ "مراثی جوش" میں ثبت ملتے ہیں۔ اور ان کی جلوہ گری "یادوں کی برات" ص ۳۱۴، ۳۱۵ میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ جوش کے ایک مرثیے سے امام حسینؑ کیلئے منظوم خراجِ عقیدت دیکھئے![9]

"تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بدم — دشتِ ثبات و عزم ہے دشتِ بلا و غم
صبرِ مسیح و جرأتِ سقراط کی قسم — اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم

نخلستان

جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہو
جس سورما کا اسمِ گرامی حسینؑ ہے

جو اک نشانِ تشنہ دہانی تھا وہ حسینؑ
گیتی پہ عرش کی جو نشانی تھا وہ حسینؑ
جو خلد کا امیرِ جوانی تھا وہ حسینؑ
جو اک سنۂ جدید کا بانی تھا وہ حسینؑ

جس کا لہو تلاطمِ پنہاں لئے ہوئے
ہر بوند میں تھا نوحؑ کا طوفاں لئے ہوئے

ہرچند اہلِ جور نے چاہا یہ بارہا
ہو جائے محو یادِ شہیدانِ کربلا
باقی رہے نہ نام زمیں پر حسینؑ کا
لیکن کسی کا زورِ عزیزو! نہ چل سکا

عباسِؑ نامور کے لہو سے دُھلا ہوا
اب تک حسینیت کا عَلَم ہے کھلا ہوا

( جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے ص ۷۲ - ۷۵)

---

روایتی مرثیہ سامعین کے مذہبی عقائد اور جذبات کو چھونے والی ایک تاثراتی نظم تھی - جدید مرثیہ تاثراتی نظم سے زیادہ اب ایک متفکرانہ اور فلسفیانہ نظم ہے - جدید مرثیے کا فکری آہنگ جب زیادہ بلند ہوا - تو اسے "حکمت مآب مرثیے" کا نام دیا گیا - اور اسے اقبال کی ناکام تقلید سے تعبیر کیا گیا -

( لبِ فرات ص ۳۸۲ - مقالہ ڈاکٹر نیّر مسعود)

جدید اردو مرثیے کے ان مثبت پہلوؤں کے ساتھ ہمیں اس میں بعض منفی پہلو بھی ملتے ہیں جنھیں نظر انداز کرنا جدید اردو مرثیے پر اصلاح و ارتقا کے دروازے بند کرنے کے مترادف ہوگا - لہٰذا اس ضمن میں بھی بعض گوشے گوش گزار ہیں -

جدید مرثیے میں واقعاتِ کربلا کے بیان سے زیادہ ان واقعات کے اسباب و عواقب کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے - بیانیہ حصے کی کمزوری نے جدید مرثیے کو مکالمہ نگاری، کردار نگاری اور رزم و بزم کے بیانات جیسے متعدد دلچسپ پہلوؤں سے محروم کر دیا - جو کلاسیکی مرثیے

کی دلچسپی میں معاون تھے۔

جوش کے جدید مرثیوں میں منظر نگاری کی جھلکیاں تو ہیں۔ لیکن مکالمہ نگاری، کردار نگاری اور رزم و بزم کے بیانات کے لحاظ سے جوش کا جدید مرثیہ کلاسیکی مرثیے کی رنگارنگ دلچسپیوں کا حامل نہیں محسوس ہوتا۔ کلاسیکی مرثیوں میں واقعات کے بیان کے ماتحت مختلف کرداروں کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کی فنکارانہ جھلکیاں ملتی تھیں۔ جن کی جانب جوش کے جدید مرثیے میں زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔

جوش کے بیشتر مرثیوں میں امام حسین ہی کے بارے میں گفتگو ملتی ہے۔ مراثیِ جوش میں واقعۂ کربلا کے دوسرے بہت سے افراد و کردار، بار نہیں پاتے۔ جدید مرثیوں کو بیانیہ حصوں میں اپنی کمزوری دور کر کے واقعہ نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری جیسے پہلوؤں پر مناسب توجہ دینی چاہیئے۔ تاکہ مرثیہ اپنی ان ڈرامائی کیفیتوں کو برقرار رکھ سکے جو اس کی دلچسپی کی ضامن اور دل نشینی میں معاون ہوتی ہیں۔

جدید مرثیوں میں بیانیہ حصوں کے ساتھ ساتھ بینیہ حصے بھی کمزور ہوتے ہیں اور یہ صورت حال مرثیے کے موضوع اور رثائی مزاج کے خلاف ہے۔ جدید مرثیے کو اگر مسدس کے نام کی جگہ مرثیے کا نام پانا ہے تو اسے مرثیہ کے حدود میں رہتے ہوئے اُس صنف کے رثائی تقاضوں کا بھی احترام کرنا ہوگا۔

جدید مرثیے میں مفکرانہ خیالات تعلیم یافتہ طبقے کی تو دلچسپی کا سامان ہو سکتے ہیں مگر عام لوگوں کے لئے انھیں سمجھنا آسان نہیں۔ مفکرانہ خیالات اگر مرثیے کی قبولیت کے دائرہ کو تنگ کریں تو ہمارے جدید مرثیہ نگاروں کو اس کمی کے تدارک کے لئے کوئی نہ کوئی موثر طریقہ کار لازماً اختیار کرنا ہوگا۔

واقعۂ کربلا کو جدید زندگی کے مسائل سے مربوط کرنے میں اس امر کو بہر حال ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ زندگی کے معمولی معمولی معاملات کو معرکۂ کربلا جیسے غیر معمولی اور عظیم واقعہ کے بار بار مماثل و مساوی قرار دینے سے واقعۂ کربلا کی عظمت کم ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں جدید مرثیہ نگار کو اعتدال و توازن کا دامن نہ چھوڑنا چاہیئے۔

نخلستان

جدید مرثیے میں عصری مسائل کی ترجمانی اسے وقتی دلچسپی کی شے ضرور بناتی ہے ۔ مگر حالات بدلنے اور وقت گزرنے کے بعد ان مرثیوں کی اپیل کم ہو جائے گی ۔ نتیجہ میں جو مرثیہ آج دلچسپی سے سنا جا رہا ہے وہ کل حالات بدل جانے پر تقویم پارینہ کی طرح طاق نسیاں کی آرائش کا سامان بن جائے گا

اس کے برخلاف انیس و دبیر کے کلاسیکی مرثیے ماہ و سال کی گردش میں ماند ہو کر تقویم پارینہ بننے کے بجائے آج بھی سکۂ رائج الوقت بنے ہوئے ہیں ۔ لہٰذا جدید مرثیے کو حال کے دامن سے اتنا زیادہ وابستہ نہ ہونا چاہیئے ۔ کہ مستقبل سرے سے اس کو قبول کرنے سے ہی انکار کر دے ۔

عصری مسائل کو جدید مرثیے کی گرفت میں لیا جا سکتا ہے لیکن جدید مرثیے کا عصری مسائل کی گرفت میں آ جانا کسی طرح سود مند نہ ہوگا ۔

# "تیری باتیں ہیں کہ نغمے تیرے نغمے ہیں کہ سحر"

ڈاکٹر علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو
سینٹ جانس کالج آگرہ

مخدوم پر مضمون لکھتے وقت ایک جگہ پروفیسر احتشام حسین نے لکھا تھا :-

"تخلیق کی عظمت میں خالق کی عظمت پوشیدہ ہے۔ کیونکہ عملِ تخلیق کی ہر منزل پر دونوں ساتھ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کا پتہ چلتا ہے۔"

پروفیسر موصوف کا یہ گراں قدر جملہ اور دیگر معتبر تنقیدی کتابوں کے تنقیدی خیالات سے تخلیق میں بہرحال خالق کی شخصیت منعکس ہوتی ہے۔ ہم نے زمانۂ طالب علمی سے سنا اور یہی عقیدہ استوار رکھا۔ کہ شاعری اور شاعر کو کبھی الگ الگ نہیں دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ کبھی شاعر اپنی شاعری کے ذریعہ اور کبھی شاعری، شاعر کی شخصیت کی پہچان بنتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جب ہم غالب، منٹو، فراق اور کسی حد تک جوش و مجاز (اور بھی نام لئے جا سکتے ہیں) وغیرہ کا بہ غائر نظر مطالعہ کرتے ہیں اور ان کے ارد گرد کی زندگی کی ایک ایک پرت الٹتے ہیں۔ تو خود بخود ان تنقیدی اقوال میں ایک ارتعاش سا پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور یہ قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ دورِ حاضر کے بعض نقادوں نے تو اس طرح کی توجیہات پر زیادہ کان بھی نہیں دھرے وہ شاعری کو محض شاعری کی حیثیت سے ہی دیکھنے کے قائل ہیں۔

فراق پر ہی مضمون لکھتے وقت۔ ظ۔ انصاری نے لکھا تھا۔

" ازدواجی زندگی کی تلخ کامی، کتنی ہی تلخ حقیقت کیوں نہ سہی۔ تاہم وہ ان کی شخصیت کے بھرے ہوئے جام کی تلچھٹ ہے۔ اس سے ان کی شخصیت کا خمیر اٹھا ہے۔ نہ کہ شاعری کا۔"

عام طور پر خیال یہ ہے کہ فن کار کو ایسے فروعی اور کمزور حالات سے بے نیاز رہنا چاہیئے غالب زندگی بھر پریشان رہے۔ اور اپنی بیوی کی شکایت کرتے رہے لیکن مسکراہٹوں کے ساتھ، اس لئے ان کو مشکلیں آسان لگنے لگیں۔ میر تو نے تو ہنس ہنس کر جینا سیکھا تھا۔ زندگی کی ساری تلخیوں کو اپنی ہنسی میں پی گیا۔ اور بھی معقول فن کار بھی اسی طرح جیتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ فراق صاحب کے اوپر کم عمری ہی میں مصیبتیں آ گئیں۔ ۱۹۱۸ء میں جب فراق کی عمر تقریباً بائیس سال کی تھی ان کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت انتقال کر گئے۔ اس حادثہ نے ان کے اوپر خاصا اثر ڈالا۔ لیکن اس سے بھی بڑا حادثہ اس سے قبل ۱۹۱۴ء میں ہو چکا تھا جب سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ایک ناموزوں لڑکی کے ساتھ ان کی شادی کر دی گئی تھی۔

اپنی شادی کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں :۔

"مجھے اور میرے خاندان کو دھوکہ دے کر ایک صاحب نے میری شادی ایک، ایسے خاندان میں ایسی لڑکی سے کر دی کہ میری زندگی ایک ناقابل برداشت عذاب بن گئی۔ میری بیوی میں کوئی اخلاقی عیب نہیں تھا۔ لیکن معمولی سے معمولی انسان سے بھی یہ لڑکی کند ذہن اور نااہل تھی۔ صورت میں کشش نہ تھی بلکہ الٹے ناپسندیدگی کا اثر پڑتا تھا۔ تب سے آج تک میری زندگی ایک ناقابل برداشت تکلیف اور تنہائی کا شکار رہی۔"

(شاہکار فراق نمبر)

کہا یہ جاتا ہے کہ شادی کے پورے ایک سال بعد تک فراق کو نیند نہیں آئی اور شاید اسی ناآسودگی کی بنا پر ہی وہ سیاست اور شاعری و ادب کی طرف مڑے تھے اور فراق بنے تھے۔ فراق صاحب کے ساتھ جس طرح کے ابتدائی واقعات پیش آئے وہ اکثر لوگوں کے ساتھ پیش آ جاتے ہیں۔ لیکن ہر کوئی فراق نہیں بن جاتا۔ یہیں سے ان کی انفرادیت کی راہیں شروع ہوتی ہیں۔

فراق صاحب کو اپنی ذاتی زندگی میں جو الجھنیں، معاشی پریشانیاں اور جنسی ناآسودگیاں ملیں۔ ان سب نے مل جل کر ابتداء میں غم، تاریکی، اور مایوسی کی ایک ایسی شکل اختیار کر لی

جو شاعرانہ وجدان او جمالیاتی حس کی شناخت بن جایا کرتی ہیں ۔

عام خیال یہ ہے کہ زندگی کی مایوسیاں انسان کو آرٹسٹ بنانے میں مدد تو دیتی ہیں ساتھ ہی ساتھ ایک مخصوص نفسیات کا انسان کو حامل بھی بنا دیتی ہیں اگر آپ فراق کی شاعری کا بغور مطالعہ کریں گے تو ان کے یہاں قدم قدم پر، غم ، رات ، اور رات سے پچھلے پہر کا ذکر ضرور ملے گا ۔

چند مثالیں ملاحظہ کیجئے ۔ ! :۔

میں ہوں راتوں کی کہانی مجھے کہتے ہیں فراق
مجھ سے اے انجم و مہ آنکھ نہ پھیرو دیکھو

---

افق سے تا افق یہ کائنات محو خواب تھی
نہ پوچھ دے گئے ہیں کیا مجھے وہ لمحے رات کے

---

تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

---

جن لوگوں نے فراق کی شاعری اور فراق صاحب دونوں کو قریب سے پڑھا اور سمجھا ہے وہ مجھ سے اتفاق کریں گے ۔ کہ فراق کئی شخصیتوں کا ایک نام ہے اوپر سے نیچے ، خارج سے باطن ، ان کے اندر کئی قسم کے انسان بیک وقت جیتے رہے ۔ اکثر و بیشتر متضاد بھی رہتے دل میں ایک چہرہ معمولی سے کائستھ کا تھا جس کے بطن سے تخیل ، سوچ بچار میں سماپن اور کبھی کبھی تو گھناؤنا پن جھلکتا نظر آتا تھا ۔

خیال رہے ۔ کہ یہ چہرہ فراق کا ہرگز نہیں تھا ۔ بلکہ ضلع گورکھپور کے بانس گاؤں کے ایک کائستھ کا تھا ۔ جو اپنے والد کے انتقال کے بعد پریشان ادھر ادھر بھٹکتا پھرا ۔ پھر جواہر لال نہرو کی عنایت سے اپنے گھر کا لالن پالن کیا اس شخص کے اندر پیسے کی اہمیت کوٹ

کوٹ کوٹ کر بھری تھی کیونکہ اس نے تکلیفیں جھیلی تھیں۔ اور اس کی یہی سوچ اس قدر حاوی ہوتی تھی۔ کہ بعد میں فراق کو بھی چھو لیتی تھی۔

دوسرا چہرہ رگھوپتی سہائے کا ہے ایک سادہ سے انسان کا جو ۱۹۱۳ء میں میٹرک پاس کر کے ایف۔ اے کی تعلیم کے لئے الٰہ آباد آیا اور اچھے نمبروں سے پاس کر کے کرسچن کالج لکھنؤ اور سناتن دھرم کالج کانپور میں بحیثیت مدرس پڑھانا شروع کیا۔ پڑھنے پڑھانے کی یہ ادا بھی جلد ہی فراق کو چھو لیتی ہے۔

تیسرا اور شاید چوتھا چہرہ فراق کا ہوتا تھا۔ فراق گورکھپوری کی شخصیت اس قدر توانا ذہین اور طاقتور تھی۔ کہ جب اس کی چمک اٹھتی تو پھر نہ وہ کائستھ رہ جاتے تھے نہ رگھوپتی سہائے نہ جانے یہ دونوں چہرے کن تہوں میں دب جاتے۔

میں نے اپنی آنکھوں سے فراق کے اندر کئی شخصیتیں دیکھی ہیں۔ حیرت میں پڑا ہوں خوف بھی محسوس کیا ہے۔ اور حقارت بھی۔ لیکن پھر اپنی ہی آنکھوں سے اسے تبدیل ہوتے بھی دیکھا ہے۔ تبدیلی کا وہ منظر ——— ہونٹوں میں کانپتا ہوا سگریٹ، گلاس میں چھلکتا ہوا جام آسمان کو چھوتی ہوئی تخیل کی لہریں اور چشم زدن میں فراق ان سب پر ایسا غالب آتا ہے کہ خدا کی پناہ پھر ایسے ماحول میں گل افشانیٔ گفتار کا ایسا سلسلہ چلے گا، علم و فضل کی ایسی بجلیاں کوندیں گی کہ سماعت جگمگا اٹھے گی۔ ہوش و حواس فضا میں تیرتے نظر آئیں گے بس یہیں پر، اسی مقام پر نہ جانے کتنی بار فراق صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر یہ احساس ہوا۔ کہ فراق صاحب کی ذاتی شخصیت اور شاعرانہ شخصیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جب وہ شاعر ہوتے تھے تو ان کی ڈھلی ہوئی نفسیات، علمی چمک اور تخلیقی قوت کام کرتی رہتی تھی۔

بچپن کے حالات، غیر موزوں شادی، ازدواجی زندگی کی تلخی، لیکن اس وقت وہ صرف فنکار ہوتے تھے ایک معمولی انسان کی سوچ اور فکر سے بالکل پرے۔ ایسا کیوں۔؟ جبکہ اقوال زریں ہمیں بتاتے ہیں۔ کہ خالق اور تخلیق باہم شعوری اور لاشعوری طور پر تخلیقی سفر میں وابستہ رہے ہیں۔ یہ ایسی گتھی ہے۔ جس پر ابھی خاصی بحث کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم

فی الوقت یہ سوچ کر چلیں کہ تخلیقی عمل میں خالق کی وہی شخصیت جڑی رہتی ہے جو تخلیق کار کی ہوتی ہے۔ حساس اور ایمان دار تخلیق کار کی - اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔

دنیا کا تقریباً ہر شخص کئی پردوں اور پرتوں میں سمٹا رہتا ہے ۔ تضادات کا شکار رہتا ہے۔ پھر شاعر اور ادیب کو اس دنیا سے الگ کر کے کیسے دیکھا جا سکتا ہے ۔ ؟

---

فراق صاحب کے بچپن کے بارے میں پڑھا - یا ان کی زبان سے سنا جوانی کے قصے وہ اکثر مزے لے لے کر خود ہی سناتے تھے - ان کے وہ تمام حالات جو اُن کے شاعرانہ محرکات کا سبب بنے میں نے نہیں دیکھے ۔ میں تو ان سے اس وقت ملا جب انھیں ان کی زندگی کی بھرپور خدمات کا صلہ ہندوستان کے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ کی شکل میں مل چکا تھا ۔ جس کی خوشی میں انھوں نے اپنے گھر پر ایک جلسے کا اہتمام کیا تھا - اور الٰہ آباد کے اردو ، ہندی اور انگریزی کے عمائدین ادب اس میں شریک تھے یہ غالباً ۱۹۷۰ء کی بات ہے جب بی اے کا ایک حقیر طالب علم پروفیسر احتشام حسین صاحب کی صحبت کا سہارا لے کر اس جلسے میں پہنچا ۔ آج بھی وہ منظر یاد ہے ۔

گھر کے چوکور آنگن میں فراق صاحب تن تنہا دولھا کی طرح بالائے تخت جلوہ افروز تھے اور نیچے فرش پر ادیبوں اور قلمکاروں کا اجتماع ، فراق صاحب تمام لوگوں کے سوالات کا ترکی بہ ترکی جواب دے رہے تھے لطیفوں اور قہقہوں کی گونج میں سماعت اور فہم دونوں ہی اسی قدر گم ہو گئی تھیں ۔ کہ ذرا بھی یاد نہیں ۔ کہ کن کن باتوں پر قہقہے بلند ہوئے تھے اور وہاں کیا کیا سوالات اٹھے تھے ۔

---

کچھ دنوں کے بعد ایک جلسے کی صدارت کی درخواست کے سلسلہ میں ان سے ذاتی ملاقات ہوئی انھوں نے مجھ سے لائبریری سے کچھ کتابیں منگوائیں اور یہ سلسلہ ایسا چل پڑا ۔ کہ بلا مبالغہ چھوٹی بڑی ملا کر کم از کم ڈیڑھ دو سو صحبتیں میں نے ان کی خدمت میں گذار دیں ۔ ان کے قدموں میں بیٹھ کر شاعری اور اس کی تفہیم کی الف - بے - سیکھنے کی کوشش کی - اور شعر و ادب کی بنیادی قدروں سے واقف ہونے کی جرأت کی - تبادلۂ خیال کے آداب سے آگاہ ہوا - بڑے

بڑے ناموں کے ذریعہ چھا جانے والے خوف اور دھند کو فراقؔ صاحب نے کم کیا۔ اسی تدبیر کے ذریعہ نہیں کسی سنجیدہ تحریر کے ذریعہ نہیں بلکہ بس عام گفتگو، روزمرّہ بول چال، لطیفوں اور قہقہوں کے ذریعہ۔

لیکن یہ سب باتیں اسی وقت ممکن ہوتی تھیں۔ جب وہ فراقؔ ہوتے تھے اور یہ بھی عموماً اسی وقت ہوتا تھا جب کوئی انھیں فراقؔ بنانے والا پہنچ جائے ورنہ گھر میں جب بھی داخل ہوتے تو وہ کچھ اور ہوتے۔ کبھی نوکر پر غصہ کر رہے ہوتے۔ کبھی جھاڑو دینے والی ملازمہ پر برس رہے ہوتے سبزی، دال وغیرہ کی مہنگائی پر باتیں ہو رہی ہوتیں۔ یا زیادہ سے زیادہ ان کے لان میں لگے ہوئے پیڑ پودوں پر باتیں ہو رہی ہوتیں۔

فراقؔ صاحب کو پھولوں کے پودے بہت پسند تھے خواہ وہ کسی قسم کے پھول ہوں بس ان کا خوش رنگ ہونا ضروری ہوتا۔ ایک بار مجھے لان میں لے جا کر ایک ایک پودے کے بارے میں تفصیل سے بتاتے رہے۔ کہ کس پودے کو کہاں سے، کس طرح سے، اور کتنی قیمت میں حاصل کیا ہے۔ کون کتنی زندگی کا حامل ہے اور کون اب ختم ہونے والا ہے۔ جب ہم ختم ہونے والے پودوں کے قریب پہنچے۔ تو بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔ کہ :-

"حضور! ان میں سے ایک پودا آپ مجھے عنایت کر دیں۔ میں..."

میرے منہ سے جملہ مکمل بھی نہ ہو پایا تھا۔ کہ بگڑ گئے۔ اور بولے :-

"خبردار! یہ پودے میری جان ہیں انھیں جوش اور مجنوں بھی مانگیں تو نہیں دے سکتا۔"!

پھر خود ہی زیر لب بڑبڑائے :-

"جوش سالا کیا آئے گا مانگنے! وہ تو خود ہی مرجھائے ہوئے پھول کی طرح اپنی خوشبو کھو رہا ہے۔"

---

انگریزی ادب کے بعض مفکّرین کا خیال ہے۔ کہ جس فن کار کی ابتدائی زندگی ناکام اور مایوس کن رہتی ہے اس کے یہاں ایک مخصوص قسم کی انا اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے لکھنے پڑھنے کی ابتدا اکثر اپنے حالات سے متعلق لکھ کر کرتا ہے۔ انگریزی میں خود سوانحی

ناول کے پیچھے کچھ اسی قسم کے جواز پیش کئے جاتے ہیں ۔
فراق صاحب کے سلسلہ میں یہ بات مانی جاسکتی ہے کہ وہ زبردست talesmonger تھے ۔ خود بھی کہتا ۔ جوش نے انھیں مجموعۂ اضداد بھی کہا ۔ شاعری میں بھی آپ ملاحظہ کریں تو ان کے زیادہ تر قطعوں میں ، فراق آسمان کو چھوتا نظر آئے گا ۔
اپنے سلسلہ میں انھوں نے جو بھی اور جب بھی لکھا ۔ مبالغہ کو ہمیشہ ساتھ رکھا لیکن یہ سب کچھ ان کی تحریریں ملتا ہے عام تحریریں اس طرح کی جھلک میں نے شاذ و نادر ہی دیکھی ۔
اسے میں قدرت کی ستم ظریفی ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے فراق صاحب کو اس وقت پایا جب وہ مائل بزوال تھے ۔ جسم کی آنچ نکل رہی تھی ۔ سانسوں میں تھکن کے آثار نمایاں ہو چلے تھے لیکن ذہن ہمیشہ تازہ اور چاق و چوبند رہتا ۔ آنکھوں میں چمک اور تیزی مرتے دم تک ختم نہ ہونے پائی ۔ دماغی طور پر میں نے ان کو ہمیشہ بیدار پایا اور ایسی ایسی گفتگو کرتے دیکھا ہے کہ میں حیران رہ جاتا تھا ۔ ایسا لگتا تھا ۔ کہ گفتگو ہی میں تخلیق ہو رہی ہے
یہ میری کمزوری رہی کہ اتنے قریب رہ کر بھی میں نے فراق صاحب کی شاعری کو کم پڑھا ان کی نثر کو اور بھی کم ۔ سنا ہے کہ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی ہے من آنم کے نام سے ۔ لیکن میں نے فراق صاحب کو جو کچھ بھی سمجھا ہے یا ان سے جو کچھ سنا ہے ان کی غیر معمولی فنکارانہ گفتگو کے ذریعہ ۔ جب کبھی ان کی انگلیوں میں جنبش شروع ہوتی ۔ آنکھیں ڈوبنے لگتیں پتلیوں کا رقص شروع ہوتا ۔ دماغ تفکر کی سانسیں لینے لگتا تو ہم سمجھ لیتے کہ الہامی اور تخلیقی گفتگو کا وقت آگیا اور ہم ہمہ تن محو ہو جاتے ۔ دوران گفتگو میر آتے غالب و اقبال آتے ۔ مومن مصحفی اور امیر مینائی کا بھی ذکر آتا ۔ داغ اور نوح کے چرچے بھی ہوتے ۔ گفتگو کا اتار چڑھاؤ بڑے بڑے وبدبوں کی اونچ نیچ فیصلہ کرتی چلتی کہ وہ کس شاعر کو کیا مقام دے رہے ہیں ۔ داغ نوح ، سیماب کا ذکر کرتے وقت ان کے حلق سے باریک قہقہہ نما آوازیں نکلتیں لیکن جلد ہی وہ سنجیدہ ہو کر کہتے ۔ کہ اردو شاعری کو مخلصانہ لے اور استادانہ آہنگ سے مالا مال کرنے میں جو کام ان لوگوں نے کیا ہے وہ فراق بھی نہ کر سکا ۔
اسی طرح وہ عزیز اور آرزو کا ذکر بھی قدر سے کیا کرتے تھے ۔ پھر دوران گفتگو اگر فراق کا نام

آجائے تو آجائے ورنہ انھیں فرصت کب تھی ۔ کالی داس تلسی داس کیٹس ورڈز ورتھ، ٹینی سن، میر انیس و امتی وغیرہ سے نیچے اترنے کی ۔

---

کسی رسالے کے لئے میں نے ایک بار ان سے سجاد ظہیر کے بارے میں کچھ گفتگو کی اور بات ترقی پسند تحریک کی چل پڑی ۔ تحریک کے بارے میں انھوں نے جو نتیجہ نکالا ۔ اسے آپ بھی سن لیجئے ۔ بولے ۔ :۔

"۔ تحریک اس وجہ سے پھلی پھولی کہ اس کو سجاد ظہیر لے کر چلے تھے اور سجاد ظہیر اپنی تحریک سے زیادہ عظیم تھے اور تحریک ان کے مقابلے میں کمزور ——"

اسی دن ادب، جمالیات اور وجدان پر ایسی ایسی باتیں کیں ۔ کہ مجھ سے نادان طالب علم پر ان نرم و نازک اور فلسفیانہ باتوں کا اس وقت کچھ اثر ہی نہیں پڑا ۔ لیکن ایسا ضرور ہوا تھا کہ میرا وجود زمین سے اوپر اٹھ کر حدود میں تیرنے لگا تھا ۔ علمیت سے پر گفتگو کے جادو سے دوچار ہونے کے ایسے موقعے کہاں نصیب ؟ وہ باتیں مجھے بعد میں سردار جعفری کے نام ایک خط میں بھی نظر آئیں ۔ دو تین جملے پیش خدمت ہیں ۔

" میرے نزدیک ادب برائے ادب کا مفہوم داغ اور نوح کی شاعری نہیں بلکہ حافظ اور کیٹس کی شاعری ضرور برائے ادب ہے ۔ اس فقرے میں برائے ادب کا مفہوم نہ برائے لفاظی ہے نہ برائے چونچلہ نگاری نہ برائے مناعی نہ برائے سطحیت ۔ بلکہ برائے ادب کے معنی جمالیاتی مہک اور برائے جمالیاتی وجدان ہیں جس کا کوئی تعلق بھٹکنے سے نہیں ہے ۔ "

یہ وہ فراق ہیں جنھوں نے پریم چند آثر سے لے کر پروفیسر اعجاز حسین اور پروفیسر احمد علی وغیرہ کے ساتھ مل کر الہ آباد میں ترقی پسند تحریک کی کانفرنس کے اہتمام میں اپنی فعالیت کا ثبوت دیا تھا ۔ ہر ذی شعور قلم کار کے تفکرات و تخیلات کی کئی منزلیں ہوتی ہیں ضروری نہیں کہ ایک صاحب فکر جو کل تھا وہ آج رہے اور جو آج ہے وہ کل بھی رہے ۔

فراق صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ۔ ابتدا میں وہ ذاتی الجھنوں سے دامن بچانے کے

لئے سیاست اور جنگ آزادی میں مصروف ہو گئے ترقی پسند تحریک کے پرزور حامی اور کارکن رہے لیکن رفتہ رفتہ جب حالات معمول پر آنے لگے تو اندر کا رومانی فن کار انھیں لے گیا شاعری کی اس سرمئی فضا میں جس کے پچھلے پہر صرف معشوق کی آہٹوں اور مسکراہٹوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ۔ ؎

یہ سرمئی فضاؤں کی کچھ کنمناہٹیں
ملتی ہیں مجھ کو پچھلے پہر تیری آہٹیں
اس کائنات غم کی فسردہ فضاؤں میں
بکھرا گئے ہیں آ کے وہ کچھ مسکراہٹیں

---

فراق صاحب اپنی خارجی زندگی کی تمام آرزوؤں کو ساز جمال کی گنگناہٹوں میں ضم کر دینا چاہتے تھے اور اپنے عشق کو ایک کائناتی تصور میں جذب کر دینا چاہتے تھے جہاں سے ایک ایسی آفاقیت جنم لیتی ہے کہ جس میں رچ بس کر وہ اپنی عشقیہ شاعری کو دو سمتوں پر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں جس کی ایک سمت وہ ہے جو ہندوستانی کلچر اور لب و لہجہ کو چھوتی ہوئی اردو شاعری کی روح میں جذب ہو جاتی ہے۔ اور جس میں میر، مومن اور امیر مینائی وغیرہ کے گونج سنائی دیتی ہے۔ دو تین شعر دیکھئے :- ؎

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی جیسے رام کا بن باس

---

رات چلی ہے جوگن بن کر بال سنوارے لٹ چھٹکائے
چھپے فراق گگن پر تارے دیپ بجھے ہم بھی سو جائیں

---

خنک سیہ مہکے ہوئے سائے پھیل جائیں ہیں جل تھل پر
کن جتنوں سے میری غزلیں رات کا جوڑا کھولے ہیں

اور دوسری سمت ہندوستان کے متوسط طبقے کے گھر کے اس آنگن میں جاتی ہے جہاں ہندوستانی عورت کہیں بیوی اور کہیں ماں کی شکل میں رسوئی میں ہے۔ شوہر کی خدمت میں معروف ہے۔ یا تلسی کے پودے کو سینچ رہی ہے۔

دو رباعیاں اور ملاحظہ کرتے چلیں۔ ؎

چوکے کی سہانی آنچ مکھڑا روشن
ہے گھر کی لکشمی، پکاتی بھوجن،
دیتے ہیں کر چھل کے چلنے کا پتہ
سیتا کی رسوئی کے کھنکتے برتن

---

کس پیار سے دے رہی ہے لوری
ہلتی ہے سڈول باہنہ گوری گوری
ماتھے پہ سہاگ آنکھوں میں رس ہاتھوں میں
بچے کے ہنڈولے کی چمکتی ڈوری

---

فراق صاحب کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بھی لکھا جائے گا اس منتشر سے مقالے میں ان کا شاعرانہ تجزیہ ہرگز مقصود نہیں۔ ان کی ذاتی شخصیت اور شاعرانہ شخصیت سے متعلق اٹھتے ہوئے کچھ سوالات ہیں جو نہایت مبہم طور پر ان کے سامنے بھی اٹھے اور اب بھی ان کی یہی شکل ہے۔

میں نے ایک بار ان سے یہ بھی پوچھا تھا۔ کہ آپ اب بھی شعر کہتے ہیں۔؟ کچھ جواب نہیں ملا۔ بس ایک گنگناہٹ سی طاری ہوئی اور ایک غزل کے چند اشعار کچھ ایسے انداز سے سنائے جسے ترنم کہا جا سکتا تھا۔ نہ تحت۔ میں نے جلدی جلدی اشعار نوٹ کر لئے یہ سوچ کر۔ کہ تازہ ہوں گے۔

وہ اشعار۔ آپ بھی سن لیں۔ ؎

عشق کی آغوش میں بس اک دلِ خانہ خراب
حسن کے پہلو میں صدہا آفتاب و ماہتاب
آدمیوں سے بھری ہے یہ بھری دنیا مگر
آدمی کو آدمی ہونا نہیں ہے دستیاب
راس آیا دہر کو خونِ جگر سے سینچنا
چہرۂ آفاق پر کچھ آ چلی ہے آب و تاب
راز کے صیغے میں رکھا تھا مشیت نے جنھیں
وہ حقائق ہو گئے میری غزل میں بے نقاب

---

بعد میں دیکھا تو یہ غزل "گلِ نغمہ" میں موجود تھی —

---

یہ بالکل سچ ہے کہ فراق صاحب نے آخرِ عمر میں شعر کہنے تقریباً بند کر دیے تھے۔ انھیں اپنے اشعار زیادہ یاد بھی نہیں رہ گئے تھے۔ ذاتی محفلوں میں وہ اکثر داغ، عزیز اور آرزو وغیرہ کے اشعار مزے لے لے کر سناتے۔ مشاعروں میں شعر کم، اور لطیفے یا لطیفہ نما شعر زیادہ سناتے اور خوب ہنستے ہنساتے۔ پھر برائے نام اپنے ایک دو شعر سنا دیتے۔

الٰہ آباد کے ایک بڑے مشاعرے میں جس کی صدارت مشہور فلمی اداکار دلیپ کمار کر رہے تھے ابتدا ہی میں یہی پڑھا اور اس شعر سے اپنی بات شروع کی۔

تمھارے حسن کا حقہ تو بجھ چکا کب کا
مری وفا ہے کہ ہم گڑگڑائے جاتے ہیں

---

الٰہ آباد میں ان کی آخری تقریر ۱۹۸۱ء میں ہونے والی فانی صدی تقریبات کی افتتاحی تقریر تھی۔ وہ فانی کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے لیکن ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب کی درخواست پر (جنھیں وہ کافی عزیز رکھتے تھے) وہ تشریف لائے اور ایک نہایت جچی تلی متوازن تقریر

سے سامعین پر سحر طاری کر دیا۔ چلتے چلتے وہ یہ بھی کہہ گئے کہ شاید یہ ان کی آخری محفل ہے۔ کیونکہ اب وہ عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ جہاں :- ؎

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

---

فراق صاحب کا علم، اظہارِ علم، گفتگو، اندازِ گفتگو، شعر اور اس کی پیشکش سب اس قدر معمولی دل نواز اور جادوئی تھا۔ کہ سننے والے پر ایک نشہ طاری ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب کی کتاب " نئی علامت نگاری " کو ریلیز Release کرتے ہوئے انھوں نے جو تقریر کی۔ یا پروفیسر احتشام حسین صاحب کے انتقال پر متعدد جذباتی قسم کی تقریریں کیں وہ اس قدر نارنجی اور یادگار قسم کی تقریریں تھیں کہ آج بھی سننے والوں کے دل و دماغ میں گونج رہی ہوں گی۔

ان کی تقریر سے سماعت میں ایک ایسا تخلیقی وجمالیاتی کیف طاری ہوتا۔ کہ ہم سب تخیل کی نہ جانے کن وادیوں میں پہنچ جاتے اور ہمارے کانوں میں نغمگی اور موسیقیت کا رس گھلنے لگتا۔

فراق صاحب جیسا شاعر اور فراق صاحب جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ میری آنکھوں میں اور میرے حافظے میں آج بھی ان کی شخصیت کا رچاؤ اور گفتگو کا خوبصورت لب ولہجہ جذب و پیوست ہے۔

معمولی سے معمولی بات کرنے کی مخصوص ادا، ان کی شاعرانہ اور فنکارانہ کیفیت، ان کی آنکھوں کا رقص، انگلیوں میں جھولتا ہوا سگریٹ، ہاتھوں میں کانپتا ہوا نارنجی گلاس، کولھے پر کھسکتی ہوئی لنگی اور پھر رفتہ رفتہ لحاف کے اندر جاتا ہوا جسم، جو اپنی قوت کھو چکا تھا لیکن ان کی آواز اسی لحاف میں سے گونجتی اور کہتی۔

" اقبال کہتا ہے۔ کہ ؏

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔

"بتاؤ فاطمی۔ ! اگر ہندوستان دنیا سے اچھا ہے۔ تو پھر بُرا ملک ہے۔ ؟"
میں اس سوال سے سٹپٹا جاتا، پھر وہ خود ہی بول پڑتے۔

"ہم کو اسی طرح کے سستے قومی جذبوں نے مات دی ہے سچ یہ ہے۔ کہ ہندوستان سارے جہان سے بُرا ملک ہے۔ جہاں جمہوریت قے کر رہی ہو۔ سیاست ننگی ہو کر چوراہے پر ذلیل ہو رہی ہو۔ اس ملک کی دانشوری۔۔۔"

پھر وہ نڈھال ہو جاتے اور سر ایک طرف ڈھلک جاتا۔

فراقؔ صاحب کی شخصیت کی صفائی، دل و دماغ کی بے باکی اور ذہن کی چابکدستی نے انھیں مجسم فنکار بنا رکھا تھا۔ اور اسی لئے تمام عمائدین سیاست و ادب نے انھیں اجازت دے رکھی تھی۔ کہ وہ آزاد ہیں۔ ہر طرح سے آزاد۔

آج فراقؔ صاحب ہم میں نہیں ہیں بس ان کی یادیں ہی یادیں ہیں۔ ایسی یادیں جنھیں بھلانا تو درکنار انھیں سمیٹنا بھی ایک مشکل کام ہے۔ ایسی تہہ دار، نیرنگ اور متضاد شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنا ناممکن نہ سہی۔ لیکن ایک مشکل کام ضرور ہے۔

ظ۔ انصاری نے ٹھیک لکھا تھا۔ کہ:۔

"اُن کی شخصیت لکھی ہی نہیں جا سکتی بلکہ اس کے بارے میں کچھ باتیں لکھی جا سکتی ہیں۔ میں نے بھی اسی طرح کی ٹوٹی پھوٹی کوشش کی ہے۔"

فراقؔ کے سامنے کبھی جوشؔ، نیازؔ یا مجنوں وغیرہ کا ذکر ہوتا۔ تو وہ نہایت جذباتی ہو کر یہ شعر پڑھتے۔

اب یادِ رفتگاں کی بھی طاقت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

---

آج وہ اپنے دوست جوشؔ کے پاس جا چکے ہیں اور ہمارے پاس ان کا تحریری سرمایہ ان کی گفتگو، اور ان کی پرکشش شخصیت سے لبریز یادوں کے سرمائے کے ساتھ ہی ساتھ، ایک قیمتی سرمایۂ افتخار یہ بھی ہے کہ ہم آنے والی نسلوں سے کہہ سکیں گے کہ ہاں واقعی ہم نے فراقؔ

کو دیکھا تھا۔ سنا تھا۔ اور ان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ پتہ نہیں وہ اس پر فخر بھی کریں گی یا نہیں۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔

سچ تو یہ ہے۔ کہ :۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

▲ ▲ ▲

# نخلستان

راجستھان کا واحد موقر ادبی جریدہ
اردو دوستوں اور ادب نوازوں کی

خصوصی توجہ کا منتظر ہے

اس کی اشاعت اردو زبان و ادب کے تحفظ کی ضامن ہے

# فراق کی جمالیاتی کائنات

ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

فراق کی شاعری ہمیں ایک ایسی جمالیاتی کائنات سے روشناس کراتی ہے جو بسیط بھی ہے اور فراخ بھی۔ اعلیٰ شاعری کے بارے میں یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اس کے توسط سے ہم ایک ایسی نادیدہ، پُراسرار، ماورائی اور دلکش کائنات میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جو ہماری کائنات آب و گِل کے مقابلے میں کہیں زیادہ جاذب نظر، متوازن اور دلفریب ہوتی ہے یہ کائنات جو ایک جادودانی شانِ بہار کی حامل ہوتی ہے۔ اس کی تعمیر شاعر شعری محاکات لفظیات، تمثیلات اور اصوات و علائم سے کرتا ہے۔

یہ ایک نقش بند پلاسٹک جہان ہے جہاں انسانی وجود اور زمان کی برگزیدہ روح ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتی ہے۔ فراق کی شاعری میں یہ کائنات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

یہ کائنات اتنی کثیر الابعاد اور زندگی کے اتنے قیامت خیز جلوؤں سے معمور ہے۔ کہ بیک نظر اس کا تماشا مشکل بھی ہے اور دشوار بھی۔ اس کثرتِ نظّارہ کی خوبی یہ ہے۔ کہ یہ سب ہی عکس اور پھر ان عکسوں کے عکس شاعر کی جمالیاتی حیثیت میں اس درجہ آمیز ہو گئے ہیں کہ تصور اس کلیت کا احاطہ تو کر سکتا ہے لیکن مختلف وحدتوں میں ان کا مطالعہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

اس کی حیثیت اس شیشے کی ہے جو سورج کی تمام کرنوں کو اپنے اندر جذب کر کے

خود ایک چھوٹا سا سورج بن گیا ہے۔
فراقؔ کی شاعری میں اس غیر مرئی کائنات کی نقش گری عموماً ان کی پیش کردہ شعری مثالوں کی رہینِ منت ہے۔ اس ضمن میں چند شعر ملاحظہ ہوں :—

آہ وہ مشک بیز زلف سیاہ
جس کی ہمسائیگی نہیں ملتی

---

پہلے وہ نگاہ اک کرن تھی
اب اک جہان ہو گئی ہے

---

ہوئی ختم صحبتِ مے کشی، یہی داغ سینوں میں لے چلے
کہ طلوع ہونے سے رہ گئے کئی آفتابِ خم و سبو

---

یہ کہاں سے بزمِ خیال میں، اُمنڈ آئیں چہروں کی ندیاں
کوئی مہ چکاں کوئی خوں فشاں کوئی زہرہ وش کوئی شعلہ رُو

---

وہ تمام روئے نگار ہے وہ تمام بوس و کنار ہے
وہ ہے چہرہ، چہرہ جو دیکھئے وہ جو چومئے تو دہن دہن

---

کفِ پا سے تا سرِ نازنیں کئی آنکھیں کھلتی جھپکتی ہیں
کہ تمام مسکنِ آہواں ہے وہ پُر خمار ترا بدن

---

کبھی کچھ پہر رات کو دیکھ کے کسی سانس لیتے چراغ کو
کہ غزل ہوئی تو رگوں میں ہے وہی خستگی سی وہی تھکن

خوشبوئیں جیسے مسکرائیں    پوچھ نہ نازکی بدن

---

کس کے یہ عضو عضو سے ۔ آتی ہے خوشبوئے دہن

---

دلوں کا سوز ترے روئے بے نقاب کی آنچ
تمام گرمیٔ محفل ترے شباب کی آنچ

---

جسے سمجھتے ہیں سب موج کوثر و تسنیم
وہ آئینہ بھی ہے تپتے ہوئے سراب کی آنچ

---

گیسوئے مشکیں ہے کہ غزالاں
نرگس جادو ہے یا پرستاں

---

تیرے خرام ناز سے آج وہاں چمن کھلے
فصلیں بہار کی جہاں خاک اڑا کے رہ گئیں

---

ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حسن یار کو
اتنی طویل فرصتِ نظارگی کہاں

---

سانس کو تازہ دل و جاں کو معطر کر گئیں
اس نظر کی ٹھنڈی اور مہکی ہوئی پرچھائیاں

---

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

---

کچھ بو سی اڑ رہی ہے یہ مستانہ وار کیا
چھلکا چمن میں شیشۂ ابرِ بہار کیا

---

جو ایک برقِ نگہ سامنے سے کوند گئی
وہی تھی روحِ محبت وہی تھی جانِ فراق

---

خنک سیہ مہکے ہوئے سائے پھیل جائیں ہیں جل تھل پر
کن جتنوں سے میری غزلیں رات کا جوڑا کھولیں ہیں

---

تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بقدم
رُکے رُکے سے کچھ آنسو رکی رکی سی ہنسی

---

متنوع حسی پیکروں کے حامل ان شعروں کی باطنی کائنات، زندگی کے جن برق آسا جلووں، نیرنگیوں، تھرتھراہٹوں اور جنبشوں سے آباد ہے۔ وہ اپنی گوناگوں کیفیات کے اعتبار سے دیکھنے، چکھنے، سونگھنے اور چھونے کی چیزیں ہیں۔

ان شعری پیکروں کی آفرینش کا اصلی کمال یہ ہے۔ کہ ان پر شاعری کا دھوکا تک نہیں ہوتا۔ یہ تمام و کمال ایک عظیم مصوّر کے موئے قلم کا اعجاز معلوم ہوتے ہیں۔

اس جمالیاتی کائنات کو وجود کا مرتبہ بخشنے میں کسی بھی شاعر کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ یہ کائنات وہ ہے جہاں زلفِ سیاہ کی مشک بیزی ہمارے حواس پر چھائی جا

رہی ہے۔ جہاں نگاہ پڑ کرن ' کا اور پھر ایک جہان کا دھوکا ہوتا ہے - یہ وہ کائنات ہے جہاں خم وسبو کے آفتاب طلوع ہوتے ہیں - جن میں لذت نظارگی بھی ہے اور قلب و نظر کے لئے ایک گونہ سرور بھی - !

شاعرانہ لطافتوں سے معمور اس سرزمین میں شاعر نے جو بزم خیال سجائی ہے وہ چہروں کی تابانی سے روشن ہو گئی ہے - تندو تیز جذبات سے بھیگی ہوئی اس فضا میں نہ صرف روشنے نگارہی بوس و کنار کا متقاضی ہے بلکہ محبوب کا مرئی وجود مہزنا سر دہن بن چکا ہے یہ وہ انجمن ہے جہاں رات کے پچھلے پہر چراغ سانس لیتا ہے سانس کی آمد و شد کا یہ منظر قابل دید بھی ہے اور حاصل دید بھی - ! یہاں تن کی نزاکت پر خوشبوؤں کے مسکرانے کا گمان ہوتا ہے - یہاں عضو عضو پردہن کی ، رہوش کن خوشبوؤں کا راج ہے - یہاں فرصت نظارگی عدم طوالت سے شکوہ سنج ہے - کہ حسن محبوب کو دیکھنے کے باوجود نہیں دیکھ سکتا یہاں نظر کی پرچھائیوں میں ٹھنڈک بھی ہے اور مہک بھی - !

اس جلوہ گہہ ناز میں محبوب کا وجود شبنم و گل میں ڈھل گیا ہے - جس پر کبھی رُکے رُکے سے آنسو' اور کبھی ' رکی رکی سی ہنسی ' کا گمان ہوتا ہے - !

فراق کے شعروں سے برآمد شدہ یہ جمالیاتی کائنات جس قدر جاذب توجہ اور حیرات کن ہے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے -

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ فراق کے ہاں پیکر سازی یا صورت گری کا یہ عمل کسی شاعرانہ صنعت گری کا نتیجہ نہیں - اس نوع کی تمثال سازی صرف ایک اعلیٰ درجے کی خالص شاعری ( pure poetry ) ہی میں دیکھنے کو ملتی ہے - یہ ایک سیال حقیقت ہے جو شعر کے رگ وریشہ میں گرم خوں کی مانند گردش کرتی ہے -

مذکورہ جمالیاتی کائنات میں حسی تلازمات کی وساطت سے عالم وجود میں آئی ہے ان میں نادر الوجود تشبیہات و استعارات نے خصوصی رول ادا کیا ہے -

البتہ فراق کی شاعری میں ایسے مرحلے بھی آئے ہیں جہاں ان کی عمیق فراست علامتی تمثال بن کر نمودار ہوئی ہے - اس ضمن میں چند اشعار توجہ طلب ہیں -

تھی ایک بوئے پریشاں بھی دل کے صحرا میں
نشانِ پا بھی کسی آہوئے ختن کے ملے

---

کبھی دادِ شوق نہ دے سکا مرے دل کو پرتوِ دلبری
کہ لرز گیا ہے یہ آئینہ جو لپک گئی ہے کوئی کرن

---

فرق کرنا نور اور ظلمت میں مشکل ہو گیا
اس غزالِ مست سے پوچھو کوئی دن ہے کہ رات

---

تغافل اور بڑھا اس غزالِ رعنا کا
فسونِ غم نے بھی جادو جگائے ہیں کیا کیا

---

شب عدم کا فسانہ گدازِ شمع حیات
سوائے کیفِ فنا میرا ماجرا کیا ہے ؟

---

یوں اترتی جانے والی اے نگاہِ شرمگیں
ڈوب کر دیکھیں اترتا ہے ترا نشتر کہاں

---

خوں تھا کلیوں کا دل بادِ صبا بے چین تھی
جلوۂ گلزار ڈوبے تھے ترے نشتر کہاں

---

جامِ دل کی تہہ میں موجِ خوں سی اٹھ کر رہ گئی
اپنی قسمت میں کوئی چھلکا ہوا ساغر کہاں

جو ہر غنچہ و گل میں ہے اک اندازِ جنوں
کچھ بیاباں نظر آتے ہیں گریبانوں میں

---

یہاں ایک بار پھر ہم شاعرانہ تخیل کی اسی بہشت میں پہنچ جاتے ہیں جس کی سیر سے دل نہیں بھرتا۔ شاعر کے عرصۂ حواس پر اتھاہ خوشبوؤں کی بارش ہو رہی ہے۔ اس انجانی اور پر اسرار کائنات میں ان خوشبوؤں کا منبع اور سرچشمہ وہ آہوئے خجستہ گام ہے جس کے قدموں کے نشان وادیٔ دل پر ابھر آئے ہیں۔ "آہوئے ختن" کے وجود سے برآمد ہونے والی یہ لازوال خوشبو شاعر کی زیست کا واحد سہارا ہے۔

تیسرے شعر میں غزالِ مست ایک بار پھر شاعر کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ شاعر اس آہوئے تیز گام کے تعاقب میں اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں دن کی سپیدی اور شب کی سیاہی اس کے لئے اپنی معنویت کھو چکی ہیں۔ وہ زمان و مکاں کی قیود سے ماورا ہو چکا ہے۔ اور اس کی تمام تر جستجو اور شوق کا مرکز و محور صرف ایک ذات ہے جس کی بندگی اس کا شیوہ ہے۔ یعنی غزالِ مست، جو ابدی زندگی کا ایک پر اسرار نقش بن کر ابھرتا ہے۔

چوتھے شعر میں غزالِ رعنا ایک بار پھر نمودار ہوتا ہے۔ غزالِ رعنا، جو سرمستی، رعنائی دلبری اور دلربائی کا ایک لازماتی مظہر ہے۔ جو شاعر کے وجود کو اپنی عشوہ طرازیوں کے سبب ہر آن ایک نئی خلش اور ایک نئی چبھن سے ہمکنار رکھتا ہے۔ اس کی ذات ان کیفیات کا تجربہ کرتی ہے جو معرضِ اظہار میں بھی نہیں آسکتیں۔

دوسرے شعر میں پرتو دلبری کی معنویت غیر معمولی رمزیت کی حامل ہے اس پرتو دلبری کا تعاقب شاعر کو تمام عمر آتش زیر پا رکھتا ہے۔ یہ ایک سرِّ معانی ہے جس کی گرہیں کھولنا شاعر کے لئے بھی ممکن نہیں

اس مخفی اور لامتناہی حسن کا گہوارہ شاعر کا دلِ حزیں ہے شاعر کے یہاں خانۂ ذات میں صرف یہی ایک ایسا آئینہ ہے جو پرتو دلبری کے ارتعاشاں کو کسی قدر انگیز کر سکتا ہے البتہ خود اس آئینہ کی نازکی کا یہ عالم ہے کہ آفتاب کی کرن کے بوجھ کو بھی اٹھانے سے

اس کے پاش پاش ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ چہ جائیکہ 'پرتو دلبری' جو نہ جانے کتنے آفتاب کی شعاعوں کا گہوارہ ہے

آٹھویں شعر میں 'جلوۂ گلزار کے نشتر' کی معنویت فراق کے ہمہ جہتی جمالیاتی تصورات کے تناظر میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے اس نشتریت میں جو لذت آمیز کسک اور گداز ہے اس کے مظاہر فراق کے تخلیقی سفر میں بار بار نظر آتے ہیں۔

البتہ اس شعر میں 'جلوۂ گلزار کے نشتر کے ڈوبنے کا سماں ایک ایسا شعری تجربہ ہے جو زندگی کے طولانی سفر میں شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس نوع اور اس انداز کے دوسرے کتنے اشعار ہیں جو یہاں شاعر کے تصور جمال کی رفعتوں اور لامحدود امکانات کو نمایاں کرنے کے لئے مزید پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ میرا یقین ہے کہ رنگ و بو کے اتنے دل نواز اور اس درجہ کثیر الابعاد تصوراتی پیکر اردو غزل میں اقبال کے بعد فراق کے علاوہ کسی اور کی شاعری میں نظر نہیں آتے۔ علاوہ ازیں فراق کا یہی عدیم المثال شعری اسلوب ہے۔ جو ان کی شناخت کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

فراق کی جمالیاتی کائنات میں تموج، شوریدگی، ربودگی اور فشار کے بجائے ہمیں ایک ایسی باوقار زندگی کا سراغ مل جاتا ہے جو ایک اعلیٰ تر اور عظیم تر شاعری کا سب سے بڑا انعام ہے۔ یہ کائنات اپنی تمام تر خوشبو اور رنگت کے ساتھ ایک نئی صبح و شام کے سانچہ میں ڈھل گئی ہے۔

▲ ▲

# فراق اور ہندوستانی جمالیات

ڈاکٹر افغان اللہ خاں
لکچرر شعبۂ اردو
گورکھپور یونیورسٹی۔ گورکھپور

سنسکرت کی طرح ہندی شعر و ادب میں بھی جمالیاتی عناصر کی فراوانی ہے۔ یہ بھی کہنا غلط نہ ہوگا کہ سنسکرت ادب کی طرح ہندی ادب کا نقطۂ آغاز بھی جمال ہی ہے۔ نہ صرف ہندی ادب بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کا ادب جمالیات ہی کے محور پر گھومتا ہے۔ اسی لئے ہندی ادب کے ایک نقاد نے کہا ہے :۔

" شعر و ادب کا مقصد رسوں کی تخلیق ہے۔ چھند، النکار، گن اور ریتی اس کے اہم اجزا ہیں جس کے ذریعہ رسوں کی تخلیق ہوتی ہے —— "

ہندی شاعری اور فن سے بحث کرتے ہوئے ہزاری پرشاد دویدی جی نے یہ بھی فرمایا :۔

" شاعری ایک فن ہے اور فن کا خاص مقصد حسن اور اس کی قدروں کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ یہی جمالیاتی قدریں شاعری کی اعلیٰ قدریں ہیں۔ "

دویدی جی نے جمالیاتی قدروں یا حسن کو دو خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک حسن وہ ہے۔ جسے ہم دیکھ سکتے ہیں۔ چھو سکتے ہیں۔ جس کا کوئی ٹھوس وجود ہوتا ہے جیسے کسی مرد یا عورت کا خوب صورت جسم، پھول، دریا، جھرنا۔ وغیرہ۔

دوسرا حسن وہ جس کا تعلق موجودات سے نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کی حیات سے ہوتا ہے جیسے محبت، ہمدردی، قربانی، معافی کا جذبہ وغیرہ۔

دوبیدی نے ظاہری حسن پر داخلی حسن کو ترجیح دی ہے۔ ان کے خیال میں انترنگ سوندریہ (داخلی حسن) ہی فن کو آفاقیت بخشتا ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ ظاہری حسن کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ شاعری اور فن میں حسن و جمال کی ان دونوں قدروں کو داخل کیا جائے کیونکہ یہی شاعری کی اعلیٰ قدریں ہیں۔ جو ہماری اخلاقی، روحانی اور جمالیاتی حس کو مردہ ہونے سے بچاتی ہیں۔

دوبیدی جی کا یہ خیال قدیم ہندوستانی ادب اور قدیم نقادوں کی رایوں کو سامنے رکھ کر قائم کیا گیا ہے ہم قدیم ہندوستانی ادب کا مطالعہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے۔ کہ قدیم ہندوستانی ادب کا مقصد ہی حسن و جمال کی تشکیل تھا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش، اور خوبصورت کو زیادہ خوبصورت بنا کر پیش کرنا ہندوستان کی روایت رہی ہے۔

یہ روایت صرف ادب تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ اس کا اظہار ہندوستان کے تمام ہی لوگوں کی روزمرہ کی زندگی سے بھی ہوتا ہے۔

ہندوستانی سماج جس قدر مذہبی واقع ہوا ہے اتنا ہی آرٹ کا دلدادہ بھی۔ آپ ان ہندوستانی گھروں کو جو آج سے سو سال پہلے بنے ہیں۔ اگر دیکھیں تو یہ محسوس کریں گے کہ گھر بنانے والے کے پیش نظر مذہب اور آرٹ دونوں تھے۔ مکانوں اور مندروں کی دیواریں ان پر کھدے ہوئے حسین نقوش نہ تو خالص مذہبی ہیں اور نہ خالص فنی آرٹ۔ وہ تصویریں جو مندروں کے دروازوں اور دیواروں پر کھدی ہوئی ہیں۔ ان میں مذہب اور تخیل، دونوں ہی کو دخل ہے۔

دراصل قدیم ہندوستانی ادب، نقاشی اور مصوری، ہندو مذہب اور ہندوستانی تہذیب کا پُرتخیل علامتی اظہار ہے۔ نقاشی، بت تراشی اور مصوری سے قطع نظر خوب کو خوب تر بنا کے پیش کرنے کی عادت سی نظر آتی ہے جس کا اظہار ہندوستان کے ہر حصے کے انسانوں کی زندگی کے ہر گوشے سے ہوتا ہے۔ سرسوتی اور دشاوتار (بھگوان کے دس اوتار) یا انھی کلش یا کمل، سڑک پر چلتے ہوئے آج بھی کہیں کہیں مکانوں کے دروازوں پر بنے ہوئے نظر آئیں گے۔ گھروں کے اندر لکڑی کی کاریگری، کھمبے، تانبے اور پیتل کے برتن اور طرح طرح

کے تانے ہندوستانی آرٹ کی غمازی کرتے ہیں۔

ہندوستانی عورت چاہے وہ سکھ ہو یا ہندو ہو یا مسلمان، ساری اور بلاؤز کا ایسا انتخاب کرتی ہے جس سے اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے وہ رنگوں کے انتخاب میں اس اعتدال سے کام لیتی ہے جس طرح ایک مصور اپنی تصویر کے رنگوں کا انتخاب کرتا ہے۔

"بندی" ایک خالص ہندوستانی سنگار ہے۔ ماتھے کی یہ بندی، عورت کے حسن، کپڑوں، اور جاذبیت کے بیچ نہ صرف ایک اعتدال پیدا کرتی ہے بلکہ اس بات کی بھی غمّازی کرتی ہے کہ یہ عورت خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوش قسمت بھی ہے۔ کیونکہ اس کے ماتھے کی بندی اسی وقت مٹ سکتی ہے جب کہ اس کا شوہر مر جائے یعنی ہندوستانی عورت کا سنگار اس کا شوہر ہی ہے۔

اس طرح کے سینکڑوں علامتی اظہار آپ کو نظر آجائیں گے جو ہندوستان میں رائج ہیں۔ اس لئے یہ بات قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے۔ کہ ہندوستانی زندگی جتنی مذہبی ہے اسی قدر آرٹسٹک بھی۔

ہندوستان کی یہ عام روش رہی ہے کہ وہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنا کر پیش کرے اس کا اظہار اجنتا اور ایلورا کے غاروں سے لے کر دسہرے کے جلوسوں اور دیوالی کے جلتے ہوئے چراغوں تک سے بھی ہوتا ہے دیواروں پر گوبر اور پھول کی پتیوں سے بنائی گئی "سنجھیاں" ہندوستانی ذوق و جمال کی غمّازی کرتی ہیں۔ اسی لئے سنسکرت ادب میں "شرنگار رس" کو رس راج مانا گیا ہے۔ ویسے تو سنسکرت اور ہندی میں رسوں کی تعداد "نو" بتائی گئی ہے۔ شرنگار رس کے متعلق ایک ہندی نقاد کی رائے ہے:—

> "رسوں میں شرنگار رس کا مقام سب سے بلند ہے اور اس کی اہمیت اور رسوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ بھرت نے اسے پُچّی، میدھیہ اجول اور فلسفہ سے بھرا ہوا بتایا ہے۔ سنسکرت کے استادوں اور ہندی کے نقادوں، دونوں نے ہی شرنگار رس کی خاص اہمیت کا اقرار کیا ہے۔"

شرنگار رس پر بحث کرتے ہوئے اس کی ایک تعریف اسی نقاد نے اس طرح کی ہے:۔

"ادبی نقطۂ نظر سے عورت مرد کے عشقیہ جذبات سے متعلق تمام باتیں "شرنگار رس" میں داخل ہیں ۔"

اس رس کی تشکیل میں عورت کے "وبھاؤ" "انوبھاؤ" اور سنچاری بھاؤوں کے جمع ہونے پر شرنگار رس کہا جاتا ہے ۔

اگر ہم ہندی ادب کی تاریخ کا اجمالی جائزہ لیں۔ تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہندی کے شعرا ء متقدمین و متوسطین کا سارا کا سارا ادب "شرنگار رس" کی شاعری سے بھرا ہوا ہے ان شعراء کی شاعری، محبت اور اس سے متعلق تمام جذبات کی شاعری ہے چاہے وہ بھگتی کال ہی کی شاعری کیوں نہ ہو۔

ہندی کے تمام بھگتی کال کے شعراء نے کرشن کو ایک آدرش پریمی اور رادھا کو ایک آدرش پریمیکا مان کر ہی شاعری کی ۔ اس طرح کرشن عشق اور رادھا حسن کی علامت کے طور پر ابھر کر سامنے آجاتے ہیں ۔ دراصل عورت اور مرد کے عشقیہ جذبات کے بغیر شرنگار رس کی شاعری ممکن بھی نہیں ہے ۔ کیونکہ شرنگار رس عورت اور مرد کے عشقیہ جذبات کے ارد گرد گھومتا نظر آتا ہے بغیر رتی کے شرنگار رس کی شاعری ممکن بھی نہیں اس لئے ہندی شاعری میں حسن و جمال کے معنی عورت ہی کا حسن و جمال ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ فطرت کے حسین مظاہر، احساس اور رنگ و بو اس حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں ۔

ہندی ادب کے نقادوں نے شرنگار رس کی شاعری کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا سنجوگ شرنگار ہے اور دوسرا بیوگ ۔ سنجوگ ، عاشق اور معشوق کے وصال سے متعلق ہے اور بیوگ عاشق و معشوق کی ہجر کی کیفیت کا ترجمان ہے ۔ اس کو ہم تلسی داس کی دو چوپائیوں سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں :۔

## چوپائی

**سنجوگ شرنگار**

رام نے جنگل کے حسین پھولوں کو اکٹھا کر کے ایک ہار بنایا ۔ اور اپنے ہاتھوں سے سیتا کو پہنا دیا اور ان کے قریب پتھر پر بیٹھ گئے۔

یہ شرنگار رس کی شاعری ہے اس چوپائی میں سیتا استھائی بھاؤ ہیں جس پر اس شرنگار رس کی تشکیل ہوئی ہے۔ پھول اور تنہائی سے بھرا ہوا جنگل اس احساس کو اور دوبالا کرتا ہے۔ ماحول کے اس اثر کو ادب میں ونبھاؤ کہتے ہیں۔

## چوپائی

**بیوگ سرنگار**

سیتا نے اپنی آنکھوں میں پانی بھر کر کہا۔ کہ کب رام کے خوبصورت اور سانولے جسم کو دیکھ کر ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ آہ بھر کر کہتی ہیں۔ کہ رام نے مجھے ایک دم بھلا دیا۔

اس چوپائی میں سیتا پر ہجر کی کیفیت طاری ہے۔ وہ رام کو یاد کر رہی ہے اور نہ صرف رام کو بلکہ ان کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو بھی۔ یہاں "بیوگ" رام کے نہ ہونے سے۔ اور سیتا کے رام کو یاد کر کے رونے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے بیوگ شرنگار کہا جاتا ہے۔

شری اجودھیا سنگھ اپادھیائے، ہری اودھ، بابو گلاب، ہری شنکر شرما، پنڈت رام دہن شرما، اچاریہ للیتا پرشاد شکل اور ڈاکٹر انند پرکاش ڈکشٹ نے بھی شرنگار رس سے متعلق اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ جو مختصراً یوں ہیں:-

(۱) شرنگار عشقیہ جذبات کا مظہر ہے۔ بغیر عشق اور محبت کے دنیا کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ شرنگار کا تعلق عام انسانی زندگی سے ہوتا ہے اور رسوں کے مقابلے میں اسی لئے اس کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔

(۲) محبت کا جذبہ انسانوں کے علاوہ سارے جانداروں میں پایا جاتا ہے یہاں تک کہ بیل اور پھولوں میں بھی۔

(۳) تمام رس سرنگار رس سے نکل کر شرنگار رس میں ڈوب جاتے ہیں۔

(۴) شرنگار رس ہی پہلا اور آخری رس ہے

(۵) اس کا استھائی بھاؤ محبت ہے جو پیدائش سے لے کر موت تک انسانوں کے دلوں میں پرورش پاتا رہتا ہے۔ یہ جذبہ مرنے کے بعد ہی ختم ہوتا ہے۔

(۶) بیوگ شرنگار بھی سنجوگ کے بعد ہی پیدا ہوا ہوگا

اگر ہندی اور سنسکرت کی مذکرہ روایت کو سامنے رکھ کر ہم فراق کی شاعری کا جائزہ لیں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ فراق کی شاعری کا نقطۂ آغاز حسن و جمال ہی ہے۔ حسن و جمال فراق کے یہاں ایک متحرک شے ہے جو ان کی شاعری میں روح کی طرح جاری و ساری ہے۔

فراق کے یہاں حسن کا وہی تصور ہے جو ہندی شعراء کا۔ مگر فراق ہندی شعراء سے ان معنیٰ میں مختلف ہیں۔ کہ انھوں نے حسن و جمال کی کائنات کو سمجھنے کے لئے بطور قدر کے استعمال کیا ہے۔ اور حیات و کائنات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے وہ حیات و کائنات کے حسن کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔

حیات و کائنات کے اس رشتہ کا احساس فراق سے پہلے اور کہیں نظر نہیں آتا فراق کی شاعری میں وہی حسن نظر آتا ہے جو اجنتا کی تصویروں اور ٹیگور کی لازوال نظموں میں موجود ہے۔ دراصل دونوں کی بنیاد یہی دھرتی اور اس کا حسن و جمال ہے۔

ہندی شاعری میں (جدید دور سے قطع نظر) جمال یا حسن کا مطلب، صرف عورت کا حسن و جمال ہے یہ الگ بات ہے کہ ہندوستان میں عورت کے تصور میں دیویت کا تصور بھی پنہاں ہے عورت ماں بھی ہے اور بہن بھی، گھر کی لکشمی بھی، ساتھ ہی ساتھ ایک خوبصورت عورت یا محبوبہ بھی، ہندی شعراء نے عورت کے انگ انگ کو لفظوں سے دبوچ لینے کی بھرپور کوشش کی ان شعراء نے عورت کو بھرپور عورت کی شکل میں ایک مرد کی نظر سے دیکھا، اس کی تمام تر نفسیات کے ساتھ فراق کی شاعری میں حسن کے معنیٰ تقریباً وہی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی یہ حسن، فطرت کے حسن سے ہم آہنگ ہوتا نظر آتا ہے۔

رشید احمد صدیقی نے فراق کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے:-

"فراق کی شاعری میں عورت کا ضرورت سے زیادہ عمل دخل ہے۔ جیسے یہ طلب کبھی آسودہ نہیں ہوتی۔ عاشقی اور شاعری کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس میں مقبول عام وہ ہے جہاں عاشقی و شاعری کا محور عورت کا حسن و جمال ہے۔ اس طرح کی شاعری کا بھی ایک مقام ہے —"

یہ صحیح ہے۔ کہ فراق کی شاعری کا محور بھی عورت ہی کا حسن و جمال ہے مگر فراق نے عورت کو

اردو کے اور غزل گو شعراء کی نظر سے نہیں دیکھا۔ بلکہ ایک شاعرانہ ذہن رکھنے والے ہندوستانی مرد کی نظر سے دیکھا غالباً اسی لئے ان کے کلام پر جنسیت اور جسمانیت کی پرچھائیاں بھی پڑ گئی ہیں۔ ان کا یہی احساس انھیں دوسرے شعراء سے منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

---

اے جسمِ نازنین۔ اے نگاہِ نظر نواز
صبحِ شبِ وصال تری ملگجاہٹیں

---

دن کو سورج مکھی ہے، وہ نوگل
رات کو ہے وہ رات کی رانی

---

حسن ہے ایک بے بندھا موتی
یا اک بے سونگھا ہوا پھول

---

ہوش فرشتوں کے بھی اڑا دیتے
تیری یہ دوشیزہ نگاہیں

---

(فراق کی رباعیوں میں یہ احساس اور بھی کھل کر سامنے آیا ہے)

فراق کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ کہتے ہیں :۔

"فراق کی شاعری بنیادی طور پر محبت کے رس جس کی شاعری ہے ان کے جمالیاتی احساس کی بنیاد خالص زمین پر ہے۔"

حسن وجمال کا یہ زمینی احساس جس کی طرف گوپی چند نارنگ نے اشارہ کیا ہے۔ فراق سے پہلے اور ان کے معاصر شعراء کے یہاں بھی موجود ہے۔ اس زمینی احساس کو ہم فراق کی شاعری کا ایک اہم جزو قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن اسے کُل نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ فراق کے یہاں حسن وجمال صرف حسن وجمال ہی نہیں۔ بلکہ حیات وکائنات کو سمجھنے کے لئے بطور رمز استعمال کیا گیا ہے۔ اور حیات وکائنات سے رشتہ کا احساس بھی ہوتا ہے۔

ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں حیات وکائنات اور حسن وجمال ہم آہنگ ہو کر ایک اکائی بن گئے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں :—

جو ہونٹوں پر ترے محدود ہوتی ہے سحر ہوتے
افق پر دور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے

---

دیکھئے یا عالم یہ ہے حسن خمار آلود کا
صبح کو لیتی ہے جیسے کائنات انگڑائیاں

---

وہ تبسم لب نازنیں، وہ بہار پیکر دلنشیں
وہی ادھ کھلی سی کلی کلی، وہی تازگی سی چمن چمن

---

جائسی اور بہاری کے وہاں بھی عورت کے حسن کو کائناتی پس منظر میں دیکھا گیا ہے نیز ہندی شعراء کے یہاں کائنات اور حسن میں وہ ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی جو فراق کے کلام میں موجود ہے۔

بہاری وغیرہ نے محبوب کے سراپا کو بڑی چابک دستی سے بیان کیا ہے مگر ان شعراء نے اپنی تمام کوششیں سراپا نگاری پر ہی صرف کر دی ہیں۔ غالباً اسی لئے ان کا اظہار معلوماتی ہو کر رہ گیا ہے۔ مگر فراق کا یہ احساس معلوماتی یا تاثراتی ہی نہیں ہے بلکہ نفسیاتی

اور جسمانیت سے بھرپور ہے۔ ان کی شاعری میں محبوب کی وہ تمام ظاہری و باطنی خوبیاں موجود ہیں۔ جن سے شاعری کے فکرو احساس متاثر ہوتے ہیں۔ اور قلب و نظر تسکین پاتے ہیں:۔

فراق کائنات کی ہر شے کو نہ صرف ایک فطرت پسند یا جمالیاتی شعور کی تربیت یافتہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ اس سے اپنا باحیات کا رشتہ بھی قائم کر لیتے ہیں:۔ ؎

یہ نرم نرم ہوائیں ہیں کس کے دامن کی
چراغ دیر و حرم بھی ہیں جھلملائے ہوئے

---

اک عالم شب تاب ہے بل کھاتی لٹوں میں
راتوں کا کوئی بن ہے کہ ہے کاکل پیچاں

---

فراق کے اس جمالیاتی شعور کی بنا پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انھیں بالکل اسی طرح شاعر فطرت کہا جا سکتا ہے جیسے کہ جوش کو۔ مگر یہ حقیقت نہیں۔ فراق، جوش کی طرح صرف شاعر فطرت نہیں۔ بلکہ وہ تمام تر انسانی تعلقات کے شاعر ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ ان کے اکثر اشعار میں ایک لامحدود فضا کا احساس ہوتا ہے۔ جو غالباً اس امر کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی اندرونی نغمگی کو فطرت اور فضا کے ترنم سے ہم آہنگ کر دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

یہ فضا اور یہ احساس انگریزی شاعر ورڈس ورتھ، اور ہندوستانی شاعر ٹیگور کے لازوال نغموں میں موجود ہے۔ ورڈس ورتھ کی یہ آواز فراق کے یہاں کون سی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔ ا:۔ ؎

اک آگ لگا دیتی ہے غنچوں کے دلوں میں
غنچوں کی رگوں میں جو پری ڈول رہی ہے

---

نخلستان

یہ کہانی ، اداس ، تنہائی
لیتی ہے پچھلی رات انگڑائی

---

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں ، یاد سی آکے رہ گئیں

---

کیف بردوش بادلوں کو نہ دیکھ ۔ !
بے خبر! تو مچل نہ جائے کہیں ۔ !

---

فراق کی شاعری کی یہ جسیاتی وجمالیاتی کیفیت اور لامحدود فضا کا احساس نہ صرف ان کے وقار ہی کو بلند کرتا ہے ۔ بلکہ ان کو اردو کے دوسرے شعراء سے ممتاز بھی کرتا ہے ۔

---

# فراق کی شاعری پر ایک نوٹ

## اسلم پرویز

جب قصیدے کا قافلہ عرب کے ریگستانوں سے روانہ ہوا تو اس کے ساتھ قدرتِ کلام مبالغہ اور مدح و ذم کا مختصر سا اسباب بھی تھا۔ جب یہ قافلہ ایران کی سرزمین پر آن کر اترا۔ تو یہاں تہذیب کی حکمرانی تھی۔ فضا سرسبز و شاداب تھی اور ریگستانی وسوداگرانہ طرزِ زندگی کے مقابلہ میں وہ آسائش اور شائستگی تھی۔ جو زرعی تہذیب سے عبارت ہے قصیدے نے عرب کے ریگستانوں کے دامن میں چھوٹے چھوٹے نخلستان ضرور دیکھے تھے لیکن ایران کی تو پوری دنیا ہی نخلستان تھی۔

غرض ایران کی سرسبز و شاداب فضا میں قصیدے نے ستانا شروع کیا اور اس کے وہ قبائلی اعصاب جن میں ہر وقت ایک تناؤ سا رہتا تھا یہاں رہ کر نرم پڑنے شروع ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایرانی تہذیب کی تخم کاری سے قصیدے کی کوکھ سے غزل نے جنم لیا برسوں کے بعد غزل کا یہ کارواں ہندوستان روانہ ہوا۔

ہندوستان کی فضا ایران سے اتنی ہی مختلف تھی جتنی خود ایران کی فضا عرب سے۔ اگر ایران ایک ایسا ملک تھا جو سرتاپا نخلستان تھا تو اس کے مقابلے میں ہندوستان ایک نخلستانی برِّاعظم تھا۔ تہذیب اور روایت کی جڑیں ایران کی سرزمین میں اگر گزوں تک پہنچی تھیں تو ہندوستان میں یہ سلسلہ میلوں نیچے تک پہنچا ہوا تھا۔

ہندوستان پہنچ کر غزل نے کروٹوں پر کروٹیں لیں۔ ولی، سراج، میر، مصحفی، آتش

نخلستان

غالب، مومن، جگر، فانی، اصغر، حسرت اور پھر فراق ۔

کچھ عرصہ پہلے یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ غزل اب شاید تھک سی گئی ہے غزل کا ایک مخصوص ڈکشن تھا جسے مخصوص کے بجائے محدود کہنا شاید زیادہ صحیح ہو۔ اس کا ایک مخصوص علامتی نظام تھا۔ یہاں تک کہ ایک مخصوص نظام الفاظ بھی۔ اس لئے نہ تو غزل میں پہاڑ، پتھر، اور کدال جیسے لفظ ہی بھلے لگتے تھے اور نہ اس میں دال کی فریاد کا مضمون ہی بیان کیا جا سکتا تھا۔ ہاں اس میں شان و شکوہ اور قدرت کلام کا مظاہرہ کیا جا سکتا تھا۔ طبقہ اشرافیہ کے مشاغل عشق بیان کئے جا سکتے تھے۔ رکیک قسم کی چھوٹی معاملہ بندی ہو سکتی تھی لیکن مرد اور عورت کے وہ معاملات جو ہندی کے شاعر بہاری کا طرۂ امتیاز ہیں ادا نہیں ہو سکتے تھے ۔

ایک اعلیٰ پایہ کا غزل گو ہونا جس قدر محال تھا۔ غزل کا شاعر محض ہونا اتنا ہی آسان تھا چنانچہ اردو میں غزل کے شعرائے محض کی کوئی کمی نہیں ۔ اردو کے اکثر غزل گو شعراء (سب نہیں) اپنا تمام زر زور شباب، زور کلام پر صرف کر دیا کرتے تھے اور شاید اسی لئے کلیم الدین احمد کو یہ کہنا پڑا تھا۔ کہ :۔

"غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے"

کلیم الدین احمد نے یہ بات کہنے میں قدرے جلد بازی سے کام لیا اور ایک سرے پر میر کی، اور دوسرے سرے پر فراق کی غزل کا پوری طرح نوٹس لئے بغیر ہی یہ بات کہہ گئے

فراق اس صدی کے سب سے بڑے غزل گو شاعر ہیں۔ سب سے بڑے غزل گو اس لئے ہیں کہ انھوں نے غزل کو ایک نیا موڑ دیا ہے اس صدی کے چھٹے دہے سے غزل نے جو ایک نئی انگڑائی لی ہے۔ اور نئے آب و رنگ کے ساتھ شاعری کے میدان میں جو اپنا سکہ جمایا ہے وہ اسی لئے ممکن ہو سکا ہے کہ اس وقت اردو میں لگ بھگ چالیس برس سے فراق موجود تھے اور غزل کو گل و بلبل، شمع و پروانہ، اور ساقی و شراب کے علاوہ بھی ایک زبان مل چکی تھی ۔

اردو غزل کا پودا فراق سے کئی صدی پہلے سے ہندوستان کی فضا میں سانس لے رہا تھا اور گنگا و جمنا کے پانی سے اس کی آبیاری ہو رہی تھی۔ لیکن اس کو شاید ہندوستان کی مٹی ہی نصیب نہیں تھی اس لئے کہ یہ پودا عجمی روایت کے گملوں میں پرورش پا رہا تھا۔ فراق نے غزل

کے اس پودے کو ان گملوں سے نکال کر ہندوستان کی زمین میں بو یا ہے ۔ اور دھرتی کے ساتھ اسے پیوست کیا ہے ۔

فراق کے ہی ہم عصر اور اتنے ہی عظیم شاعر جوش ہیں ۔ لیکن جوش کی شاعری کا حسن وہی ہے جو گملوں میں لگے ہوئے پودوں کا ہوتا ہے ۔ تراش ، خراش ، کاٹ ، چھانٹ ، بہتر بن مٹی ، اور کھاد کی مدد سے پودوں کو حسین سے حسین شکل دی جا سکتی ہے انھیں جگہ بدل بدل کر رکھا جا سکتا ہے ۔ زیادہ دھوپ کی ضرورت نہ ہو تو انھیں چھاؤں میں بھی کیا جا سکتا ہے ، تیز بارش سے اگر ان پتیوں کو نقصان پہنچنے کا ڈر ہو تو انھیں سائبان میں رکھا جا سکتا ہے ۔ اگر ان کی شاخیں بوجھل ہو کر جھولنے لگیں تو انھیں کھپچی پھنسا کر سہارا دیا جا سکتا ہے ۔ غرض ان پودوں کو زیادہ سے زیادہ خوشنما بنانے میں باغبانی کی پوری صنعت کو کام میں لایا جا سکتا ہے ۔

اس کے برعکس زمین سے سر اٹھانے والے پودے موسموں کی آغوش پلتے ہیں زمانے کے گرم و سرد کو جھیلتے ہیں ۔ لیکن ان کے قدم زمین میں جمے ہوتے ہیں ۔ ان میں توانائی اور تازگی ہوتی ہے ۔ خودروی ہوتی ہے اور ایک ایسی مہک بھی ۔ جس میں دھرتی کا سوندھا پن گھلا ہوا ہوتا ہے ۔ یہ فراق کی شاعری ہے ۔

اس دور کے غزل گو شعراء میں حسرت اور فراق ہی دو ایسے شاعر ہیں جو غزل کے آڑے وقت میں اس کے کام آئے ہیں ۔ حسرت نے غزل کی آبرو بچائی ہے اور فراق نے اسے ایک نئی آبرو بخشی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جا سکتا ہے ۔ کہ اگر حسرت ہندو ہوتے تو یقیناً وہ فراق ہوتے اور اگر فراق مسلمان ہوتے تو وہ اردو غزل کے حسرت ہوتے ۔ اور جب یہ کہا جا رہا ہو ۔ کہ فراق غزل کے اتنے بڑے شاعر اس لئے تھے کہ وہ ہندو تھے ۔ تو اس کا مطلب یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ عظیم غزل گو شاعر ہونے کے لئے محض ہندو ہونا کافی ہے ۔

عظیم غزل گو ہونے کے لئے اس مخصوص شخص کا ، جسے ہم رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے نام سے جانتے ہیں ۔ ہندو ہونا ضروری تھا ۔ اور خوش قسمتی سے وہ ہندو تھا ۔ اک جگ چالیس سال پہلے نیاز فتحپوری نے فراق کے بارے میں ایسی ہی بات کہی تھی ۔

" لکھنؤ کی متعدد ملاقاتوں میں میں نے یہ اندازہ تو کر لیا تھا کہ یہ شخص

غیر معمولی ذہین ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ اس
کا ایک قدم نہایت مضبوط پتھر پر قائم ہے۔ اور دوسرا ایسی متزلزل
چٹان پر کہ ذرا سا اشارہ گرا دینے کے لئے کافی ہے لیکن چونکہ یہ خوش قسمتی
سے ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لئے اس مہلک لغزش سے
بچ گئے اور اب انھیں نہایت استحکام کے ساتھ بلند چوٹی پر چڑھتے
دیکھ رہا ہوں ــــ "

فراق کے ہندو ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی شاندار تہذیبی روایات کے امین ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ہندی کی قدیم شعری روایات کو بھی اپنے مذاقِ سخن میں سمویا ہے۔ انھوں نے اپنے مذاقِ سخن کی تکمیل میں فنکارانہ مزاج کی ان حدوں کو چھو لیا ہے۔ جہاں تہذیب اور روایت میں پوری طرح شرابور ہو کر ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ عجم ان کی آگہی ہے اور ہندوستان ان کی میراث ـ

فراق نے اپنی رباعیوں کے مجموعے روپ کے دیباچے میں کہا ہے :ـ

" شاعری میں میری کوشش خواہ غزل ہو یا نظم یا رباعی محض اضطراری چیزیں نہیں تھیں۔ بلکہ ان کوششوں میں، میں ہندوستان اور ہندوستان کے کلچر کی تھرتھراتی ہوئی زندہ رگوں کو چھو لینا چاہتا تھا ـ "

چنانچہ ہندوستان اور ہندوستان کے کلچر کی تھرتھراتی ہوئی زندہ رگوں کو چھو لینے کے لئے انھوں نے سنسکرت کی قدیم شعری روایات کا جائزہ لیا اور اپنے مذاقِ سخن خصوصاً رس اور النکار کو سمونے کی کوشش کی ـ

روپ کی رباعیوں میں انھوں نے سنگار رس سے خوب کام لیا ہے اور اپنی تمام شاعری میں زبان اور بیان کی سطح پر وہ النکار سے پر سجاوت دکھائی دیتے ہیں ـ

سنگار رس، محض عشق و محبت میں ڈوب جانے کا ہی نام نہیں ہے بلکہ اس سے لطف اندوز ہو کر آگے بڑھنے کا بھی نام ہے۔ سنگار رس کے وسیلے سے ہی انھوں نے زندگی میں ڈوب جانا سیکھا ہے۔ اور ان کے اسی ڈوب جانے میں ان کا تمام تر احساسِ جمال اور احساسِ زیست

پوشیدہ ہے جیسے بڑے ہی سلیقے سے بروئے کار لانے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ کام آسان نہیں۔

فراق کا ہر نقاد و شاید ان آسمانوں کو نہ چھو سکے جہاں فراق کا سر ٹکرا رہا ہے لیکن اس زمین کی نشان وہی تو ہر لکھنے والے کا پہلا کام ہے جس پر فراق کے قدم ہیں۔

ڈوب جانے والی اس کیفیت کے اظہار کے لئے زبان کے بنے بنائے سانچوں سے کام نہیں چل سکتا تھا اس لئے اس کیفیت نے اپنا میڈیم خود ڈھونڈھ نکالا جسے ہم بجا طور پر فراق کا انداز کہہ سکتے ہیں۔

آخر میں فراق ہی کے سلسلہ میں نیاز فتحپوری کا یہ جملہ بھی توجہ کے لائق ہے:۔

"شاعری کی اصل روح چاہے کچھ بھی ہو۔ لیکن اس روح کو ہم جس جسم کے اندر دیکھتے ہیں۔ وہ میری رائے میں صرف الفاظ کا رکھ رکھاؤ ہے۔"

# زندگی کی صداقتوں کا شاعر

# عارف نقشبندی

ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی

کبھی کبھی یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ موجودہ دور میں کیا کوئی وزیر بھی شاعر بن سکتا ہے تو جواب ملے گا ہرگز نہیں۔ کہاں وزارت کے پیچیدہ مسائل اور کہاں شاعری کے نرم و نازک جذبات و تخیلات، دونوں چیزیں ایک دوسرے کے برعکس ہیں ایک کو دوسرے سے کوئی لگاؤ نہیں مگر جناب عثمان عارف کو دیکھ کر ہمیں اپنی مفروضہ منطق کی صحت میں شک ہونے لگا۔ پھر بھی یہ بات تو کہنی ہی پڑے گی کہ عثمان عارف پہلے شاعر ہیں اور بعد میں وزیر —— ان کی جڑیں شاعری میں پیوست ہیں۔ ان کا خمیر شاعری کے آب و گل سے تیار ہوا ہے۔ وہ پیدا ہوتے ہیں بحیثیت شاعر کے لیکن ان کی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ وزیر کی حیثیت سے۔

ان کے والد بیدل بریکانیری اردو کے اچھے شاعر تھے جو بیخود دہلوی کے تلامذہ میں تھے اس لئے عارف کی سرشت میں شاعری ابتدا ہی سے رچ بس گئی تھی۔

ان کے کلام کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ "نذر وطن" ان کی قومی اور وطنی شاعری کا مجموعہ ہے، "عقیدت کے پھول" حمد و نعت اور منقبت کا مجموعہ ہے، ایک مجموعہ قطعات و رباعیات کا ہے، "قلم کی کاشت" اور "نور زندگی" میں ان کی غزلیں شامل ہیں۔

عارف صرف شاعری نہیں بلکہ مسلک طریقت سے بھی وابستہ ہیں، تصوف سے انھیں

ازلی مناسبت ہے اور وہ نقشبندی مسلک سے نسبت رکھتے ہیں ۔ اس رجحان نے ان کی شاعری میں عارفانہ رنگ پیدا کیا ہے ۔ وہ تغزل سے بھی اپنا دامن بچا نہیں سکے ہیں چاہے وہ کلاسیکل تغزل ہو یا جدید تغزل ۔ ان کی غزلوں میں دونوں کی کارفرمائی ملتی ہے ۔

غزل کا شاعر جب شعر کہنے بیٹھتا ہے تو اس کے لئے حد بندی قائم نہیں کی جا سکتی ۔ کہ وہ کچھ مخصوص موضوعات پر ہی طبع آزمائی کرے اس کے آگے بڑھے گا تو ہاتھ کاٹ دئے جائیں گے شاعر کی طبع رواں کو کون روک سکتا ہے وہ اس معاملہ میں آزاد ہے جو جذبہ جس وقت دل میں پیدا ہوتا ہے وہ شعر کے لباس میں عالم وجود میں آتا ہے ۔ اب یہ اپنے اپنے جذبہ کی بات ہے اور اپنے اپنے تخیل کا معاملہ ہے کہ وہ کس رنگ میں اپنا جلوہ دکھائے ۔

اگرچہ غزل کے شاعر کے لئے کسی موضوع کی تخصیص نہیں کر سکتے تاہم کچھ خاص موضوعات ضرور ایسے ہوتے ہیں جو شاعر کی فطرت اور طبیعت سے ہم آہنگی رکھتے ہیں اور وہی موضوعات اس کی شاعری پر غالب رہتے ہیں ۔

مثلاً کسی کے ہاں خالص حسن و عشق ہے کسی کے ہاں مشاہدۂ حق کی گفتگو ہے کسی کے ہاں صف ماتم بچھی ہوئی ہے کوئی اپنی شکست کی آواز ہے کسی کے کلام سے کافور کی بو آتی ہے ۔ اور کہیں بادہ و ساغر کھنکتے ہیں ۔ غرض یہی چیز ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے متاثر کرتی ہے ۔

عارف نے کہنے کو تو بہت کہا اور خوب کہا ۔ ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ۔ ہر خیال اور ہر جذبے کو انھوں نے مختلف رنگ میں پیش کیا ۔ مگر ان کے کلام کا بیشتر حصہ زندگی کی حقیقتوں اور صداقتوں کے بیان پر مشتمل ہے ۔ ان کی کسی غزل کو دیکھ لیجئے ۔ اس میں دو چار شعر اس موضوع پر ضرور ملجائیں گے اور کہیں کہیں پوری غزل اسی خیال کی ترجمانی کرتی نظر آئے گی ۔ یہ ان کے عمیق مشاہدے وسیع مطالعے اور تجربات کا نتیجہ ہے ۔

وہ اس دنیا کو اور اس کے نشیب و فراز کو سطحی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کی گہرائیوں میں جاتے ہیں ۔ وہ ہر حادثے اور واقعے سے اثر پذیر ہوتے ہیں اور اس سے کوئی نتیجہ نکالتے ہیں انھیں آج کے انسان کے کرب کا احساس ہے وہ کسی ایک شخص کے غم کو انفرادی غم نہیں سمجھتے بلکہ پورے مجموعہ کا حادثہ تصور کرتے ہیں ۔ ــہ

منصور کا وہ دور تھا۔ یہ میرا دور ہے
ظلم و ستم سے وقت کے مصلوب میں بھی ہوں

---

انساں ہے غم کے بوجھ سے کتنا دبا ہوا
یہ زندگی ہے یا کوئی سینے پہ سنگ ہے

---

بازار میں دنیا کے، کیا لینے کوئی جائے
اک جان اب انساں کی بازار میں سستی ہے

---

میرا بھی چہرہ پڑھیئے۔ سراپا ہوں داستاں
تاریخ روزگار کا مکتوب میں بھی ہوں

---

اخبار کے صفحوں پہ تو ہے دل کی سیاہی
حالات جو سچ ہیں چھپے۔ چہروں پہ چھپے ہیں

---

مصیبت اور پریشانی کا احساس وہی شخص کر سکتا ہے جو خود اس سے دوچار ہو رہا ہو۔ قالینوں اور نرم صوفے پر سونے والے انسان کو اس کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔ گرفتار بلا ہی درد کا درماں تلاش کر سکتا ہے طوفاں حوادث میں ڈوبنے والے کی نگاہیں ہی ساحل کی متلاشی رہتی ہیں۔ ے

ڈوبنے والے سے طوفاں کی حقیقت پوچھو
ڈوبنے والا ہی ساحل کا پتہ دیتا ہے

---

یہ دنیا والوں کا دستور ہے کہ یہاں ہر شخص اپنے آپ کو پاکباز اور پارسا سمجھتا ہے اپنے چہرے

کے داغ کبھی کو نظر آتے ہیں مگر وقت انسان کی طرح عصبیت کا شکار نہیں اس کا آئینہ تو ہر ایک چہرے کے داغ دکھا دیتا وقت کا سایہ گنہگار اور پارسا دونوں پر پڑتا ہے۔ ؎

اپنے چہرے کے کیسے داغ نظر آتے ہیں —
وقت ہر شخص کو آئینہ دکھا دیتا ہے

---

میرے چہرے سے تو ظاہر ہیں خطائیں سچ کہا
آپ نے آئینہ شاید ان دنوں دیکھا نہیں

---

یہ دنیا ایک بازار کی طرح ہے جہاں ہر شخص کی ایک قیمت لگی ہوئی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ کوئی جنس گراں مایہ ہے اور کوئی ارزاں اور کوئی بری طرح جنس ارزاں، مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ سودے بازی سب کے لئے ہوتی ہے۔ عارف اس نکتے سے واقف ہیں:- ؎

قیمت ہو کم و بیش تو یہ بات جدا ہے
بازار میں دنیا کے ہر اک شخص بکا ہے

---

یہ دنیا تکلیف و راحت، آسائش و مصائب، اور شادی و غم کا مرکب ہے یہاں پھولوں کی بھی بارش ہوتی ہے اور پتھروں سے بھی چکنا چور ہونا پڑتا ہے یہاں شراب ناب سے ہی لذتِ کام و دہن حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ دُردِ قدح کا بھی مزہ چکھنا پڑتا ہے۔ یہاں دوست بھی ہیں اور دشمن بھی۔ اب یہ اپنے اپنے ظرف اور سلیقے کی بات ہے کہ کون پھول پھینکتا ہے اور کون پتھر۔؟ ؎

اہل دنیا کا سلیقہ ہے یہ اپنا اپنا
پھول برسے تو کسی سمت سے پتھر آئے

---

وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں منظر کتنے،
پھول برسے تھے وہیں برسے ہیں پتھر کتنے

نخلستان

انسان ایک اکائی ہے وہ اکیلا اس دنیا میں آتا ہے اور اکیلا ہی چلا جاتا ہے بظاہر دیکھنے میں وہ عزیزوں، دوستوں، اہل غرض اور اہل مطلب میں گھرا رہتا ہے مگر حقیقت میں وہ تنہا ہی ہے اور اس تنہائی کا احساس اسے خون کے آنسو رلاتا ہے ؎

بھیڑ میں ایک زمانے کی گھرا ہوں لیکن
اپنی تنہائی کا احساس رُلاتا ہے مجھے

---

عارف موجودہ دور سے مطمئن نہیں۔ وہ دور جو مہذب و شائستہ کہلاتا ہے جو ترقی کے ساز و سامان سے مالا مال ہے۔ جو نئے علوم اور نئے افکار سے بہرہ در ہے جو تہذیب کی معراج پر پہنچا ہوا ہے لیکن اخلاقی طور پر یہ دور انحطاط بہ انحطاط ہے۔ اخلاقی قدریں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ سچی محبت اور ہمدردی مفقود ہو رہی ہے اس کی جگہ تصنع اور ظاہر داری نے لے لی ہے عارف کی شاعرانہ اور عارفانہ نگاہ اس کو پہچانتی ہے وہ اس کا شدید احساس کرتے ہیں اور اس پر بھرپور طنز کرتے ہیں ؎

شائستہ زمانے کا کیا ذوقِ نفاست ہے
باطن میں عداوت ہے ظاہر میں محبت ہے
آؤ تو اجازت ہے۔ جاؤ تو اجازت ہے
یہ دورِ ترقی میں آئینِ محبت ہے

---

عارف جو کچھ دیکھتے ہیں وہ ایک صوفی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ انسان کے غرور، تکبر اور نخوت کو توڑنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس فانی دنیا میں کسی کو بقا نہیں یہ حضرت انسان بھی تو بادۂ انانیت کے نشے میں جھوم رہے ہیں۔ ان کا نشہ بھی ایک دن ہرن ہو جائے گا مگر آج یہ خدا بنے بیٹھے ہیں۔ عارف اسی غفلت سے انتباہ کرتے ہیں۔ ؎

عہدے کا نشہ ہے کہ انا، جھوم رہا ہے
کرسی پہ جو بیٹھا ہے وہی آج خدا ہے

اپنی کرسی پہ خدا بن کے جو بیٹھا تھا کبھی
چار دن کے بعد بے دفتر ہوا بے گھر ہوا

---

انھیں انسان کی پستی کا شدید احساس ہے۔ اس کرب کے سائے ان کے کلام میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں وہ انسان کی اس پستی کو دیکھ کر کبھی اس پہ طنز کرتے ہیں۔ اور کبھی اسے غیرت دلاتے ہیں اور کبھی کفِ افسوس ملتے ہیں۔ ؎

کتنی پستی پہ زمانہ اسے لے آیا ہے
آدمی، آدمی ہونے سے بھی شرمایا ہے

---

ہونے کو تو اس دور میں کیا چیز نہیں ہے
انسان کو ڈھونڈو کوئی انساں بھی کہیں ہے

---

اس دورِ خود پرست میں دیکھا جو غور سے
عارف خدا بہت ملے انسان کم ملے

---

ہوگا یہ کبھی مالک و مختارِ زمانہ
اب ہاتھ میں انساں کے نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

---

وہ انسان کی ہوس پر گہرا طنز کرتے ہیں۔ ؎

آگ بجھ جائے مگر آج کے انسان کی پیاس
بجھ نہیں سکتی پلا دے اسے دریا کوئی

---

بات یہ ہے کہ انسان کو خود اپنی ذات کا عرفان نہیں وہ خدائی کا تو دعویدار بن گیا۔ مگر انسانیت

کا دعویدار بننے کو تیار نہیں اگر اسے اپنی ذات کا صحیح عرفان ہو جائے تو معاشرے کی خرابیاں ساری دور ہو جائیں گی ۔ عارف اسے احساس دلاتے ہیں ۔

انسان سے بڑا نہیں کوئی جہاں میں
عرفان ، پر کہاں ہے اسے اپنی ذات کا

---

دوسری جگہ انسان کی عظمت ملاحظہ ہو ۔

مضبوط ہوں اس درجہ تو نازک بھی ہوں اتنا
فولاد کی دیوار ہوں شیشے کا بدن ہوں

---

عارف زندگی کے معاملے میں قنوطیت کا نظریہ نہیں رکھتے وہ اس سے بھاگنے کی کوشش نہیں کرتے وہ زندگی کی قدروں کا احترام بھی کرتے ہیں اور جینے کا سلیقہ بھی سکھاتے ہیں ۔ وہ زندگی کا صحت مند اور مثبت نقطہ نظر رکھتے ہیں ۔ وہ کانٹوں میں الجھ کر بھی زندگی گزارنے کی خو کرنا چاہتے ہیں ۔

جینا جسے آتا ہے بہر حال جیا ہے
کانٹوں میں بھی رہتے ہوئے ہر پھول کھلا ہے

---

جینے کا سلیقہ کرے پیدا کوئی عارف
جنت بھی یہیں ملتی ہے دنیا بھی یہیں ہے

---

وہ وقت کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں ۔ جمود و تعطل کے وہ قائل نہیں فرسودہ روایات کو وہ زندگی کی راہ میں حائل سمجھتے ہیں ۔ وہ بے جان روایات کہن کے بت توڑنا چاہتے ہیں ۔ کیونکہ ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے ۔ ان بوڑھے درختوں کا تعطل ارے توبہ
صدیوں سے کھڑا پہلے جو قدم آج وہیں ہے

ہر روز نیا رنگ بدل لیتی ہے دنیا
فرسودہ مزاجوں کو کچھ احساس نہیں ہے

---

وہ زندگی کو خوابوں کا ایک سانحہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ اسے ایک حقیقت کے روپ میں پیش کرتے ہیں اور زندگی کو خواب سمجھنے والے کو وہ مردہ دل سے تعبیر کرتے ہیں۔ ؎

کہتا ہے زندگی کو جو خوابوں کا سانحہ
وہ مر گیا ہے اصل میں زندہ نہ جانیئے!

---

عارف وقت کے چلنے کی تلقین کرتے ہیں اور ع

چلو اس طرف کو ہوا ہو جدھر کی

پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ورنہ وقت سب کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ جو وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہتا ہے وہی ساحل پر پہنچتا ہے ورنہ طوفانی موجیں اسے بہا کر لے جاتی ہیں ؎

جو وقت کے دھاروں کو نہ سمجھے وہی عارف
سیلاب میں ڈوبے ہیں تلاطم میں بہے ہیں

---

وہ گزرے ہوئے وقت کا ماتم نہیں کرتے بلکہ آنے والے لمحات سے استفادے کی امید رکھتے ہیں ؎

جانے دو ڈوبتے سورج کی جو لالی جائے
زندگی ایک نئی صبح میں ڈھالی جائے

---

عارف کی زندگی کا نصب العین۔ خدمت خلق، ان کا مشرب۔ صلح کل، ان کا دین و ایمان۔ انسان اور انسانیت سے محبت کرنا ہے ان کے کلام میں اس قسم کے بیشتر شعر ملتے ہیں جو ان کے مزاج کی غمازی کرتے ہیں۔

نخلستان

وہ صوفی ہیں - عارف ہیں، تصوف کے خرقہ پوش ہیں اس لئے وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں - وہ ایک خدا ترس اور خدا شناس انسان کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہوتی ہے - مثلاً

ے انسانیت کا درد ہے سرمایۂ حیات
عارف عزیز رکھنا اسے اپنی جان سے

---

ذوق نے بھی کہا تھا - ع
دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
عارف نے بھی اسی مضمون کو مختلف پیرائے میں بیان کیا ہے - ے
وہ خاک کا پُتلا ہے مٹی کا ہی پیکر ہے
جس دل میں نہیں الفت وہ دل نہیں پتھر ہے

---

جرم سنگیں ہے مرا خاص نگاہوں میں یہی ے
عام انساں کی مصیبت پہ پگھلنا کیوں ہے

---

وہ کسی کو غیر نہیں سمجھتے ان کے لئے سارا جہاں اپنا ہے یہی ان کا مسلک ہے ے
عارف کی نظر میں ہے کوئی غیر نہ دشمن
سارا ہی جہاں اس کو تو اپنا سا لگے ہے

---

عارف کی شاعری اخلاقیات کا ایک باب ہے وہ اپنے سینے میں ایک درد بھرا دل رکھتے ہیں وہ دل جو دوسروں کی مصیبتوں پر پگھل جاتا ہے - انتقامی جذبہ ان کی نظر میں پسندیدہ نہیں وہ ظلم کا مقابلہ اخلاق اور محبت سے کرنا چاہتے ہیں وہ دشمن کو بھی اپنے دام محبت میں اسیر کرنا جانتے ہیں - طاقت اور نفرت کو محبت میں اور پیار میں تبدیل کرنا ان کا شیوہ ہے - اور یہی وہ طرز عمل ہے جو انسان کو انسان سے قریب کرتا ہے یہی وہ آئین ہے جو عالمی برادری کو وحدت عطا

کرتا ہے۔ ؎

بخشیں جو تمھیں موت انھیں زندگی دے دو
ارباب محبت کا یہ دستور رہا ہے

---

وہ پیار انھیں دے دو پھولوں میں بدل جائے
جس ہاتھ میں خنجر ہے جس ہاتھ میں پتھر ہے

---

جو آپ کے شایاں ہے وہ آپ کئے جائیں
ہم اہل محبت ہیں شکوہ نہ شکایت ہے

---

یہ شجر کا ظرف تھا بدلے میں ہم کو پھل دیئے
جب کبھی پتھر ہمارا ڈال پر جا کر لگا

---

عارف کی شاعری رنگا رنگ خیالات اور پاک و پاکیزہ جذبات کی قوسِ قزح ہے۔ لطیف اور نازک احساسات کا ایک گلدستہ ہے۔ اعلیٰ اور ارفع افکار کا صحیفہ ہے۔ سماج اور معاشر پر گہرا طنز ہے۔ عصری حسیت کا شدید احساس ہے، مستقبل کا اشاریہ ہے اعلیٰ اقدار کا احترام ہے انسان دوستی کا شاہکار ہے۔ زبان بڑی صاف اور سادہ ہے۔ نہ ثقیل الفاظ ہیں اور نہ پیچیدہ ترکیبیں۔ حسین استعارے اور خوبصورت تشبیہوں نے کلام کے حسن میں اضافہ کر دیا ہے شعریت اور نغمگی ان کی غزلوں کی جان ہے جن میں خلوص کی مہک بھی ہے اور تاثیر کا طلسم بھی۔ اسلوب شائستہ اور دلنشیں ہے جو ان کی تخلیقی صلاحیت اور فنی بصیرت کی آئینہ داری کر رہا ہے۔

# احسان دانش - احسانِ دانش

ڈاکٹر اظہار مسرت اعجازی

یہ مختصر مقالہ "انجمن ترقی اردو راجستھان کی علاقائی کانفرنس" منعقدہ ۱۸ ، ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۲ء - بمقام "سوچنا کیندر جے پور" پڑھا گیا۔
اظہار مسرت اعجازی

احسان دانش کا شمار، ہندو پاک کے ان شعراء میں ہوتا ہے جو اپنے یقین محکم اور عزم مصمم نیز عمل پیہم کی بدولت ایک معمولی سپاہی سے جدید شعر و ادب کے سالار اعظم بنے۔

شاعری کی کسی خصوصی صنف میں عظیم المرتبت بننے کے بجائے اس صاحب دانش نے زندگی کے ایک اہم نمائندہ، اور معاشرے کے ایک ستائے ہوئے فرد یعنی مزدور کی ذات کو اپنی شاعری کا محرک و محور بنایا۔ دانشمندی اور سمجھداری کا یہی اعجاز، ادب و شاعری کے لئے ایک احسان کی حیثیت اختیار کر گیا۔

انیس کے مراثی کے بعد اردو تاریخ میں منظر نگاری کے باب کو انجام بخیر کہہ دیا گیا تھا۔ بعد کے شعراء نے "گاہے گاہے باز خواں" کے طور پر اپنی شاعری میں کہیں کہیں اس خوبی سے مستفیض ہونے کی کوشش کی ہے۔ احسان دانش کے دو قطعات نے منظر نگاری کے فن کو رشک عزم و عمل یعنی مزدور، بے آسرا کی زندگی سے ہم آہنگ کرنے میں کتنی چابکدستی دکھائی ہے ملاحظہ ہو —— !

شام کے بے نور سناٹوں میں آبادی سے دور
جا رہا ہے ایک پتلی نہر میں بہتا ہوا
جیسے اک مزدور مزدوری سے گھر آتے ہوئے
مشکلوں کی داستاں تقدیر سے کہتا ہوا

اور اسی طرح -

دن کے چڑھتے ہی پسینہ آگیا مزدور کو
لگ گئی رستوں کو چپ تپنے لگا مہر منیر
دھوپ کی شدت سے چمکی اس طرح گنگا کی ریت
یورشِ آلام سے جیسے مجاہد کا ضمیر

---

نازک خیالی شاعر کو حسین تشبیہات و تمثیلات سے جوڑ دینا کوئی کمال نہیں۔ لیکن خنگلی درختوں اور ان کے لوازمات سے شاعری کا رشتہ ثابت کرنا کچھ احسان دانش ہی کا کام ہے۔ ؎

تھا گھاؤ کلھاڑی کا جو کیکر کے تنے پر
ہے گوند اسی زخم کے حلقے سے نمایاں
ہے سینۂ شاعر بھی اسی طرح کہ اس میں
ہر زخم ہے رنگینیٔ اشعار کا ساماں

---

قدیم و جدید شاعری کو عام طور پر بتدریج دل و دماغ کی شاعری سے موسوم سمجھا جاتا ہے لیکن جس طرح میڈیکل سائنس کی رو سے دل و دماغ ایک وحدت تجسیم کے دو ناقابل تقسیم اعضاء ہیں بالکل اسی طرح قدیم و جدید شاعری، کو انسانی ارتقائے حیات سے کما حقہٗ ہم رشتہ و ہمنفس تسلیم کرنا بھی ایک معقول اور لازمی امر ہے۔

اردو شاعری میں یاد اور جذبے کو دل سے اور فہم و ادراک کو دماغ سے متعلق و منسلک کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن دانش احسان نے ان دو مختلف مضامین کو کس خوبصورتی سے یکجا کیا ہے ؎

نخلستان

جب کسی کی یاد آ کر تلملا جاتا ہے دل ،
جگمگا اٹھتی ہے کچھ اس شان سے بزمِ دماغ ،
جیسے ساون کی برستی رات میں اک نازنیں
صحن میں زینے سے اترے ہاتھ میں لے کر چراغ

---

یادوں کے سیلِ بے کراں کو اشکوں کی صورت شہرِ انتظار کی جانب موڑ دینا شعرائے اردو کا کمال کہنہ مشقی ہے۔ لیکن اس مضمون کو احسان کے بیان میں ایک انوکھی ہی ندرت مل گئی ہے ۔ ے

ٹوٹتا ہے ناگہاں جب کوئی پیمانِ وفا
ایسا غم محسوس کرتا ہے دلِ راحت پسند
جیسے گرم آنسو لبوں کی تھرتھری کے ساتھ ساتھ
پھینکتے ہیں دل کی گہرائی سے آنکھوں میں کمند

---

حسینوں کی کج ادائی اور دوستوں کی بے توجہی ، انسان کی معاشرتی زندگی پر تو اثر انداز ہوتی ہی ہے لیکن ذاتی دنیا بھی اس طوفانِ بلاخیز کی زد میں آئے بغیر نہیں رہ سکتی ۔ ے

احسان جو کل تھے مرے آغوش کی زینت
وہ آج ملاتے بھی نہیں مجھ سے نگاہیں
ویران ہیں فکر و نظر و قلب و تصور
جیسے کہیں طاعون میں اجڑی ہوئی راہیں

---

لیکن جب بے وفائی ، ریا ، اور دھوکہ دہی بن بدل جاتی ہے ۔ تو صاحبِ ظرف شاعر خود اپنے آپ میں بھی احساسِ شرمندگی سے مغلوب و پشیمان ہونے لگتا ہے ۔ ے

---

میں جب دن بھر کے ہنگاموں کو دہراتا ہوں فرصت میں
تو ہر اک سانس پیغام ترشّحِ ندامت لے کے آتی ہے
ارادہ نیکیوں کا جس طرح عہدِ جوانی میں
محبت جب ریا کی چوٹ کھا کر بیٹھ جاتی ہے

---

جوانی کے حوصلے وقت کے سفر کے ساتھ سرد ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب جوش و خروش کی جگہ بردباری اور سنجیدگی کا اقتدار قائم ہونے لگتا ہے خیال موت سے درسِ حیات حاصل کرنے کا عمل بظاہر کارے دارد ہے لیکن شاعری کے پردے میں ناممکنات کا کہاں دخل ہے۔ ؎

عمر سے دامن چھڑا لیتا ہے جب دورِ شباب
زندگی کو اس طرح پاتی ہے اک طبعِ غیور
جیسے روشنداں کے شیشوں سے ہنگامِ غروب
بند کمرے میں در و دیوار پہ بجھتا سا نور

---

یہ اور بات ہے۔ کہ نجی ضبط و اختیار کی عدم موجودگی میں اسی ماحول کے کسی پرعبرت منظر کی یاد بھی تازہ ہو جائے۔ ؎

سرخ تاریکی ہے مغرب کی طرف چھائی ہوئی
کر رہا ہے زیرِ لب گردوں زمیں سے کچھ سوال
ڈوبتے سورج کے رخ پر ہے وہ مایوسی کا رنگ
جیسے اک مدقوق دوشیزہ بوقتِ انتقال

---

شاعرِ محنت کشاں حضرت احسان دانش کا یہ احسانِ دانش ہے کہ انھوں نے ظلم و جبر کے خلاف ایک ایسی جنگ میں حصہ لیا۔ جہاں فراوانیٔ جذبات کی بدولت گرمی

اور غیر منصفانہ عمل کی پوری پوری گنجائش موجود تھی لیکن اس سب کے باوجود شاعر نے کسی بھی حالت میں خیر کے راستہ کو نہیں چھوڑا اور بلند کردار کی مثال بنا رہا۔ ؎

صبح سے تا شام بھونرا لاکھ کلیوں میں رہے
آ نہیں سکتا مگر اس کی سیہ روئی میں فرق
یوں ہی وہ نیکوں میں رہ کر نیک ہو سکتا نہیں
ہو چکا ہو سر بسر جو ظلمت عصیاں میں غرق

---

بلاشبہ یہ ان کے مخلصانہ عمل اور مومنانہ جرأت ہی کا اعجاز تھا کہ مزدوروں کا شاعر ہونے کے باوجود معاشرے کے کسی دوسرے شعبہ میں بھی انھیں کبھی نفرت یا ناپسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

آج وہ عظیم فن کار جسمانی طور پر تو واقعی ہم میں موجود نہیں لیکن اس کی تخلیقات زندگی کی تلخیوں سے ہم آغوش ہونے والے ہم نا پختہ ذہنوں اور نابالغ عقلوں والے تشنۂ فہم و دانش کے لئے سرمایۂ احسان عظیم ہے۔

---

# وہ افسانہ جس کو میں کوئی نام نہ دے سکی

تسنیم کاظمی
ملکہ گنج، نئی دہلی

وہ حقیقتیں جو افسانہ بن گئیں۔ وہ افسانے جو حقیقت نہ بن سکے جن کے ساتھ زندگی کے بیش بہا راز وابستہ ہیں جن پر موسمِ بہار کے ابر پارے شبنمِ حیات لٹا گئے لیکن نوشگفتہ کلیاں مسکرائیں اور پھول بننے سے پہلے افسردہ ہو گئیں۔ بہار کی رنگینیوں سے نا آشنا رہیں۔ یہ ابر پارے، یہ کلیاں، یہ شبنم، یہ رازِ سربستہ، یہ بہاریں، یہ مسکراہٹیں، یہ بیش بہا راز، یہ حقیقتیں یہ افسانے ہم اور آپ ہی میں سے ہیں کہیں اور سے نہیں آئے۔

حیران ہوں کہ اتنی دولتیں ایک ہستی میں کیسے سمائیں۔ شیریں گفتاری، دوست نوازی، سادگی، سرشاری، شاعری، لطیفہ گوئی، قانون دانی، اجلا اجلا سا سجل مذاق، آہِ نیم شب کا سوز، دل کی تڑپ کا خزانہ لٹا دینے کا سلیقہ، ہمیشہ اس کی زیرِ لب مسکراہٹ نے اس کی ہستی کو ایک انوکھا روپ دیا تھا۔

کبھی تو اس کی قانونی صلاحیت کا چرچا نزدیک و دور پھیل جاتا کبھی سجھے ہوئے مقدمہ کی پیروی کے لئے کیس کو ہاتھ نہ لگاتا۔ اس کا نام ہی مقدمے کی کامیابی کی ضمانت تھا۔ اگرچہ لوگ طنز سے "بیرسٹر" کہتے، وکالت کیا کرتا ہے خود کو شہنشاہ سمجھتا ہے۔ لوگ نہ صرف اس سے جلتے۔ بلکہ اس کی اجیالہ، اس کی پارکر پین اس کی جگ مگ کرتی انگوٹھی کی جہت سے، اس کے جامہ زیب جسم اور نوع بنوع سوٹ سے بھی لوگوں کے پتنگے لگتے۔

عمر کا سنجیدہ دور ہے - لڑکے اونچی کلاسوں میں تعلیم کے لئے ملک سے باہر گئے ہوئے تھے ۔ بیوی ، گھر گرہستی میں ایسی گرفتار ہوئی - کہ چودہ طبق روشن ہوگئے ، بالوں میں چاندی آگئی شادی کب ہوئی - کس کی پسند ناپسند سے ہوئی - اس کو توبس یہ یاد ہے کہ جب حجلۂ عروسی میں دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا - تو وہ نور جہاں تھی - آرائش نہ تھی ۔

نور جہاں ، آرائش کی چھوٹی بہن - ! اس کے دل سے ایک کراہ اور منہ سے بے ساختہ آرائش نکلا - یہ مولوی بھی کیا الٹا سیدھا نکاح پڑھا دیتے ہیں - دونوں بہنوں کی شادیاں ایک ہی دن ہوئیں - اور اس پاگل کے حصہ میں آرائش ، میری زندگی کے خوابوں کی حسین تعبیر ـــ میری محبت کا خزانہ چلا گیا ــــ ...

جینے کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا - پڑھا لکھا وکالت پاس کی ، پریکٹس کرنے لگا - حالات کے نشیب فراز سے گزر کر مجبوریوں سے سمجھوتہ کرلیا - مگر آرائش کی یاد ہر زنجیر کو توڑ کر ہمیشہ وہی جھنکار لاتی جس میں محبت کے ملکوتی نغمے ہوتے - خاص کر جب فصیلیں اونچی اور پہرہ سنگین ہو تو محبت کی اہمیت کا احساس دل کی ہر دھڑکن کو تب و تاب بخشتا ہے ۔

وہ محبت کا مفہوم خوب سمجھتا تھا - جب مصلحت محبت سے ٹکراتی ہے تو محبت نہیں رہتی بلکہ سودے بازی ہو جاتی ہے - صرف محبت کے مٹتے ہوئے نقوش رہ جاتے ہیں ۔

شام کو کچہری سے واپس آکر ہمایوں نے اپنا گیرج میں کھڑی کردی بنگلے میں جاکر بیوی کے سامنے نوٹوں کے ڈھیر ڈال دئیے - چائے کے انتظار میں کچھ دیر ٹہلتا رہا پھر اپنے کمرے میں جاکر مسہری پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں - ذہن میں اب بھی گلستان آراستہ تھا - سنہرے خواب چھن چھن کر برس رہے تھے ۔

وہ غافل نہ تھا - کہ پچیس برس پہلے جو پودا بویا تھا - اس پر اب بھی شگوفے مہک رہے ہیں !

" کپڑے نہیں بدلئے گا - " ؟ بیوی کی تحکمانہ آواز نے چونکا دیا -

" نہیں - ! چائے پی کر ابھی جانا ہے - ! "

" کیشن پر کہیں باہر - " ؟

نہیں - ! شہر میں ایک دوست سے ملنا ہے کھانے کے وقت فون کردوں گا - !

بیوی نے چائے کی ٹرالی سامنے کھسکاتے ہوئے "ہوں" کو ذرا لمبا کھینچ کر کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ ہٹاری کھول کر بڑا سا پان بنا کر منہ میں ٹھونس لیا۔ اس کا غم غلط کرنے کا یہی پرانا طریقہ تھا۔

کیا قسمت لکھی گئی تھی میری۔؟ سب کچھ ہے مگر دل کا چین نہیں۔ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر اپنے سنگھار سہاگ میں شرکت گوارا نہیں کر سکتی۔ ہمایوں۔! کاش۔ تم، ایسی ہی محبت مجھ سے کرتے جیسی آرائش سے ہے۔ تم ہر طرح میرے ہوتے۔ صرف میری ہی محبت کے امین ——!

سوچتے سوچتے زمانہ گزر گیا۔ دو میٹھے بول سننے کے لئے جی ترس گیا۔ میرے لئے گھر کو گلزار بنا دیا۔ بچے بڑے ہو گئے۔ چاروں اچھی پوزیشن سے پاس ہوتے ہیں کوئی انجینیر بنے گا کوئی تاجر کوئی ڈاکٹر، کوئی کپتان ——

تم میرے رفیق! میری زندگی کے ہم سفر، دریا کے کناروں کی طرح سامنے ہوتے ہوئے بھی الگ رہو گے۔ دل کے ملاپ کے لئے اپنی واں رہے گی ——

"آج میں آپ کے کمرے میں آجاؤں۔" ساری کے پلو کو مسلتے ہوئے دلی کیفیت سے جنگ کرتی رہی۔

"آجاؤ۔ ڈارلنگ! اچھا میں ہی تو تمھارے کمرے میں رہوں گا۔ کئی دن سے فرصت ہی نہ تھی۔ جاہ رہا تھا۔ مؤکل بہت تنگ کرتے ہیں۔ خاص کر عورتیں۔ ٹھیک بات بتاتی ہی نہیں نہ بتائیں بھی کیا۔؟"

"کیا چاہ رہے تھے۔؟"

"تمھیں ساتھ لے جا کر فلم دکھا لاؤں۔!"

مرد کے ایک ہی جملے سے عورت کا دل سنور جاتا ہے اس کے دل میں پھول کھل گئے

"کیا نام ہے فلم کا۔؟"

"نکاح"

طنزیہ ہنسی کا خفیف انکار چھلک گیا۔ نکاح یا طلاق۔ اس نے کہا

نخلستان

ایک ہی معنیٰ ہیں دونوں کے - زندگی کی وادیوں کو جاتے ہوئے راستے بدل جاتے ہیں - وادیاں نہیں بدلا کرتیں -

"ہاں - ! کیوں آنا چاہتی تھیں تم - میرے کمرے میں رات کو"

اس نے قاتل نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا - - -

"شبخون مارنے - ! کیا آپ یہ سمجھے - کہ میں رہزن ہوں کوئی - ؟"

"نہیں - رہزن نہیں صرف زن - شب خون نہیں دل خون کرتے - !"

"کچھ ضروری باتیں کرنی تھیں - یہاں نوکر، مالی، باورچی، سب کان لگا دیتے نوکروں کے سامنے اس طرح کی باتوں سے ہمارے وقار کو صدمہ پہنچتا ہے - " !

"اچھا جی - ! خوش آمدید - ! میں دس بجے آجاؤں گا - یہ رکیٹ رکھدو موسم خراب ہے میں ایک گلاس پانی بھیج دو - کلب نہیں جاتا - ہوا تیز ہے - !"

"آرائش - نہیں نورجہاں - کچھ گرم کپڑا پہن لو - ہوا سرد ہے -"

"میں آرائش نہیں ہوں ویرانہ ہوں آنکھیں جھوٹ نہیں بولا کرتیں اور دل بھی !"

"بھول، غلطی ہو ہی جاتی ہے بیگم - !" اس نے ہتھیار رکھ دئیے - "معاف کردو"

"میں گل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر - "

وہ اپنے دل میں گنگنانے لگی - اس گنگنانے پر خود ہی سے شرما گئی - اپنے آپ ہی آپ مسکرا کر کہہ اٹھی -

"میں گل سجاؤں کہ کلیاں سجاؤں کمرے میں"

معاف کردو ! معاف کردو ! - کہتا ہوا بہتی ہوئی چال سے، باہر چلا گیا -

بادلوں سے چاند چھپ جاتا پھر نکل آتا - ہلکی ہلکی پھواریں پڑنے لگیں - تو تیزی کے ساتھ حبا پہنچا —— !

"ہائیں - یہ تم بھیگ رہی ہو - " !

ہاں ایسے ہی پھواریں پڑتی رہیں تو شاید دل کی آنچ کم ہو جائے -

تا - نا - دل کی تو اور بڑھ جاتی ہے ان شبنمی موتیوں سے

چھ سے نو تک ۔ کہہ رہی تھی ۔ کہ "نکاح" اچھی فلم ہے ۔

موسم بڑا کافرانہ ہے ۔ آٹھ بجنے والے ہیں ۔

وہ چھتری والی نہ آتی ہو اس دن تو بجے نکلے تھے گلفام ۔

وہ کیا آئے گی انتظار میں الجھ رہی ہوگی بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا ۔

یہ موسم، یہ باراں ، یہ نشاطِ روح کی گھڑیاں مشکل ہی سے ملتی ہیں

اس کی آواز میں طرازی اور مٹھاس لوٹ آئی ۔ لبوں پر ایک شریر مسکراہٹ ابھری ۔

تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو بدرِ منیر ۔!

اگر میں تم سے یہ پوچھوں کہ اس طرح میری طرف کیوں دیکھ رہی ہو ۔؟

میں تو یہ دیکھ رہی ہوں کہ تمھاری آنکھوں میں ستارے سے کیسے روشن ہیں اور وہ پُرفریب مسکراہٹ کے ساتھ اور نزدیک ہوگئی اور فاتحانہ شان سے دیکھا

شکریہ ۔! میری آنکھیں نہ ان میں طوفان اٹھتے ہیں نہ شرارے لپکتے ہیں نہ نوکیلے خنجروں کی سی تیزی کہ پتھروں کے دل میں تیر جائیں ۔ تمھاری بادامی آنکھوں کی طرح ۔ پھر وہی ہنسی کی بجلی چمکی جو دل میں ہلچل مچا دیا کرتی تھی ۔

"ہوں ۔!"

اگر میں بھی ہجر کی آنچ میں سلگتی شوہر کے پاؤں دھو دھو کر پینی یعنی سادہ نری قسم کی ہستی ہوتی نہ جانے یہ خاموشی کی سرگوشیاں کیسے کیسے راز کھولتی ہیں ۔

بیرسٹر کو چونکا دیا ۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ ریشم کے سیاہ لچھے میں الجھ گیا ۔ صحن میں لگے آڑو کے ستواں درخت تنہائی بجانے لگے تیز و تند ہوائیں چلنے لگیں ۔ رائے بیل کی بیلیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوگئیں ۔ پھولوں کے ڈھیر لگ گئے ۔

یہ طوفان جان لے کر رہے گا پارے کی طرح بکھر جانے کو بے قرار تبسم ۔

وہ شعلے کی طرح لپک رہی تھی سانس الٹی سیدھی چلتی گئی ۔ جیسے بیرسٹر اس کی تمام سرشاریوں کا انتقام لے رہا ہے ۔

آرائش ۔ بجلی چمکی تو میں دیکھ رہا ہوں کہ اس درخت کی آڑ میں جو کھڑکی ہے وہاں سے

کوئی دیکھ رہا ہے۔ صاف آنکھ نظر آئی تھی۔ انسانیت بیدار ہو گئی ۔

زیبا کا کمرہ ہے۔ وہ تو سنیما دیکھنے گئی ہے ۔ ! کے بج گئے ۔ ؟

میں بتاتی ہوں ۔ پونے نو بجے ۔ وہ چھری والی، چھری یہیں چھوڑ گئی تھی یہ لیتے جاؤ اپنی چھری ۔ تیزی کے ساتھ کھڑکی سے چھری چل کر بیرسٹر کے کوٹ کے شانے میں پھنس گئی میں فلم دیکھنے کہاں گئی تھی ۔ مجھے اس فلم کو جو ختم کرنا تھا ۔ چیخ کر محلے کو بلاتی ہوں یہ روز روز کا چکر نہیں چلے گا ۔ بھائی پریس گیا ہے تو کیا ۔ میں جو ہوں ۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل آیا ۔ بنگلے [illegible] ے میں کھڑے ہو کر کال بیل کا بٹن دبایا ۔ دل دھک دھک ہو رہا تھا سانس کی رفتا[illegible] سے تیز چل رہی تھی ۔ دروازہ کھلتے ہی گھبراہٹ کے ساتھ دوڑ کر بیوی کے کمرے [illegible] گیا ۔ گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی ہوئی بیوی کے قریب گر گیا ۔ مجھے سنبھالو ۔۔۔۔ ! ۔ مجھے سہارا دو ۔۔۔۔ ! مری نور ۔ ! میں بھٹک گیا تھا ۔ روشنی ۔۔ روشنی ۔۔ نور ۔ ! میں تمہارا ہوں ۔ صرف تمہارا ۔ مری زندگی کی ساتھی ۔۔۔۔

تم ۔ ! بڑے ظالم انسان ہو ۔ !

"تھا ۔۔ لیکن اب نہیں ۔۔۔

▲ ▲

# مہاتما گاندھی اور اردو

ہما میرٹھی
چیف ایڈیٹر ماہ مسیحی دور
اندور



مہاتما گاندھی کو میں نے دیکھا ہے۔ ان سے بات چیت بھی کی ہے۔ اسکول اور کالج کی تعلیم کے ایام میں ان کی انگریزی تصانیف کے اقتباس کورس کی کتابوں میں بھی پڑھے ہیں۔ یہ آزادی کے پہلے کی بات ہے۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ دوسری عظیم جنگ میں انگریزوں کی خیرخواہی کی نمائش کرنے والے بے شمار لوگ اپنے مکانات پر قدآور "وی" "V" لگا کر چرچل کے نعرۂ فتح مندی کی ترجمانی کرنے کے عادی تھے۔ آزادی ملنے کے بعد انھیں لوگوں نے نیشنل کانگریس کے جھنڈے کو اپنے اپنے گھروں پر لہرانا شروع کر دیا۔ ایسے ابن الوقت لوگ ہر شہر کے گلی کوچوں میں صدیوں سے پائے جاتے ہیں۔

اسی زمانے میں کچھ ایسے خاندان بھی تھے جو نہ تو نمائش کے لئے کھدّر پہنتے تھے اور نہ گاندھی اور نہرو ٹوپی پہنتے تھے۔ مگر ان میں جذبۂ حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ آزادی کے بعد بھی یہ لوگ اسی روش سے رہ رہے ہیں۔ اور ان کا جذبۂ حب الوطنی آج بھی بے مثال ہے۔

گاندھی جی کا آنا جانا میرٹھ بھی رہتا تھا۔ عام طور پر ان کے میزبان ان دنوں بڑے سرمایہ دار لوگ تھے۔ لیکن وہ معمولی انسانوں سے ملنے اور ان کے ہاں ٹھہرنے کو کبھی کسرِ شان محسوس نہیں کرتے تھے۔

راجستھان کی کسی ریاست کے دیوان کے ایک قریب ترین رشتہ دار مسٹر دیالال ان دنوں میرٹھ میں تھے۔ گاندھی جی کبھی کبھار ان کی کوٹھی پر بھی شب بسری کر لیتے تھے۔ ان دنوں تقریباً روزانہ ہی مجھے مسٹر دیالال کے دولت کدے پر جانے کا اتفاق رہتا تھا۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ جب میں مسٹر دیالال سے ملنے گیا۔ تو ان کے ہاں ہی مہاتما گاندھی جی کے درشن بھی ہو گئے۔

میں ان دنوں ہتھیار بند بغاوت پر یقین رکھتا تھا۔ گاندھی جی کی عدم تشدد کی پالیسی مجھے پسند نہیں تھی۔ لہٰذا دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے میں نے دیالال صاحب کے یہاں پر ہی گاندھی جی سے بھی بے لاگ باتیں کہیں۔

میری مادری زبان اردو ہے۔ لہٰذا میں نے گاندھی جی سے جب بھی بات چیت کی اردو ہی میں کی۔ اور مجھے یہ دیکھ کر بے پایاں مسرت ہوئی۔ کہ جواہر لال نہرو کی طرح گاندھی جی بھی بہت آسانی سے اردو بول لیتے تھے اتنا ضرور تھا۔ کہ ان کے لب و لہجہ میں قدرے گجراتی لہجہ موجود تھا۔ وہ س کو 'ش' بولتے تھے مگر اپنے جذبات کی ترجمانی بخوبی طور پر اردو میں کر سکتے تھے۔

ہندی ہماری قومی زبان ہے۔ اس کے بارے میں مجھے گاندھی جی سے اختلاف نہیں تھا۔ انھوں نے دوران گفتگو اکثر و بیشتر اس پہلو پر زور دیا۔ کہ جنھیں ہندی نہیں آتی ہے انھیں ہندی سیکھنا چاہیئے خصوصی طور پر انھوں نے بارہا یہ بات کہی تھی کہ مسلمانوں کو چاہیئے۔ کہ وہ ہندی سیکھیں۔

اس کے ساتھ انھوں نے یہ مشورہ بھی بارہا دیا تھا۔ کہ وہ ہندو جو دیانت داری سے بھارت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں انھیں نہ صرف اردو بولنا۔ بلکہ اردو لکھنا بھی سیکھنا چاہیئے۔

وہ نہ صرف اردو کی ہی حمایت کرتے تھے۔ بلکہ اردو رسم الخط کی بھی حمایت کرتے تھے۔

یہ بات سارے جہان پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ کہ گاندھی جی کا مقولہ تھا۔ کہ:-

Practise what you preach.

وہ خود بھی باعمل عالم تھے۔ انھوں نے جو کچھ بھی کہا ہے اس پر عمل بھی کر کے دکھایا ہے۔

اس سے بھی بڑی بات یہ ہے۔ کہ گاندھی جی جو کچھ سوچتے تھے۔ وہ بغیر کسی مصلحت کی چاشنی کی آمیزش کے ویسے ہی الفاظ میں ادا کر دیتے تھے۔ جیسے انگریزی میں Loud Thinking کہتے ہیں۔

گاندھی جی بار بار جیل آتے جاتے رہتے تھے۔ ایکبار جب وہ جیل گئے۔ تو فرصت کے لمحوں میں انھوں نے اردو رسم الخط کو سیکھ لیا۔ اور پھر اردو رسم الخط ہی میں لکھنا بھی انھوں نے شروع کر دیا تھا انھوں نے اپنے ہاتھ سے اردو میں خطوط بھی لکھے ہیں۔ غالباً انھوں نے اردو میں پہلا خط، اردو کے مشہور مصنف، منشی پیارے لال شاکر میرٹھی کو لکھا تھا۔ جو شاید ان دنوں لکھنؤ میں تھے۔ اور دوسرا خط حکیم عبدالمجید خواجہ کو لکھا تھا۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے ایک اور خط اردو ہی میں لکھا تھا۔ جو بندے ماترم کے ایڈیٹر کے نام تھا۔ اس خط کی دو سطریں اس طرح تھیں۔

## گاندھی جی کا خط

### بنام:- ایڈیٹر بندے ماترم - !

"تلک مہاراج نے آدھے شلوک میں ہند کو سکھایا۔ کہ سوراج ہمارا حق ہے۔ اگر ہم ان کے بھگت ہیں تو کھدر پوش بن کر سوراج حاصل کر کے اپنی بھکتی کا ثبوت دیں ——— "

سنہ ۱۹۲۴ء ہی میں ایک اور اردو خط انھوں نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو لکھا تھا۔ اور اس میں مولانا کو۔ بھائی عبدالماجد کہہ کر تخاطب کیا تھا۔

ان دنوں جامعہ ملیہ دہلی سے رسالہ "جوہر" شائع ہوتا تھا۔ جنہیں سے یہ رسالہ جوہر کا "اقبال نمبر" شائع کرنے جا رہے تھے۔ گاندھی جی سے اس نمبر کے لئے کچھ لکھ کر بھیجنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ گاندھی جی نے اس کا جواب جس خط میں اپنے ہاتھ سے دیا۔ اس کی نقل سطور ذیل میں ملاحظہ فرمائیے - !

## نقل خط

"مورخہ ۹ر جون سنہ ۱۹۳۸ء بھائی محمد حسین صاحب - !

آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں، میں کیا لکھوں ——؟

لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں - کہ جب ان کی مشہور نظم "ہندوستاں ہمارا" پڑھی - تو پھر میرا دل ابھر آیا - اور بارہا وہ جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا - اسی نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے -

آپ کا

سیگاؤں وردھا -

مو - کے گاندھی "

سنہ ۱۹۳۹ء میں مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کا اجلاس کر رہے تھے - مولوی صاحب نے گاندھی جی کو شمولیت کی دعوت دی گاندھی جی نے اس کے لئے معذرت طلب کی اور ۲۶ دسمبر ۱۹۳۹ء کو انھوں نے مولوی صاحب کو اپنے ہاتھ سے اردو میں خط لکھا - جس کی نقل سطور ذیل میں ملاحظہ ہو ——

" بھائی صاحب - !

آپ کا تار ملا - مجھے دکھ ہے - کی دکہ) آپ کے جلسے میں - میں حاضر نہیں ہو سکتا ہوں - میری امید ہے کہ جلسہ ہر طرح کامیاب ہوگا - آپ جانتے ہیں - کی دکہ) میں اردو زبان کی طرقی (ترقی) چاہتا ہوں - میرا خیال ہے - کی دکہ) سب ہندو جو ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اردو سیکھیں - اور مسلم ہندی سیکھیں - !

سیگاؤں وردھا

آپ کا

۲۶ $\frac{۱۲}{۳۹}$ء

گاندھی "

حیات اللہ انصاری گاندھی جی کے بہت قریب تھے - وہ گاندھی جی کے ہمراہ کئی بار میرٹھ دیوالال صاحب کے ہاں بھی آئے -

بیگم حیات اللہ انصاری - کو بھی گاندھی جی سے جنون کی حد تک عقیدت تھی - ان کو یعنی سلطانہ فاطمہ بیگم حیات اللہ انصاری کو بھی گاندھی جی نے ۲۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو اردو میں

جو خط لکھا تھا۔ اس کی نقل پیشِ خدمت ہے۔

"۱۲ستمبر ۱۹۴۱ء

بی بی سلطانہ کو میں نے میرا سوت دیا ہے اسے وہ بیچے گی۔ اور اس

کے جو پیسے ملیں گے وہ دین بندھو میموریل میں دیے جائیں گے

مو۔ کے۔ گاندھی"

انصاری خاندان کو گاندھی جی نے اردو کے اندھی خطوط لکھے ہیں۔ اسی طرح منشی پیارے لال تنا کر میرٹھی کو بھی بارہا خطوط لکھے ہیں۔

گاندھی جی بھی اپنی ہستی کو ہمارے اس غیر دیانت دار پریس سے نہیں بچا پائے۔ جو ہمیشہ بات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا عادی ہے۔

۱۹۴۲ء کا زمانہ ہمارے ملک کا اہم انتہائی تاریخ ساز زمانہ تھا۔ سلطانہ فاضیہ بیگم کو گاندھی جی سے شکایت ہوئی کہ گاندھی جی اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھنے لگے ہیں۔ انھوں نے مہاتما گاندھی جی سے شکایت کی۔ کہ آپ نے ایسا کیوں کہا ہے؟ کہ :-

"اردو مسلمانوں کی زبان ہے وہ چاہیں تو رکھیں۔ چاہیں تو مٹا دیں۔"

گاندھی جی نے فوری طور پر ان کی اس تحریری شکایت کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تو بیگم گاندھی جی سے ملنے گئیں۔ گاندھی جی کبھی کبھی منھ سے نہ بولنے کا برت رکھ لیا کرتے تھے۔ وہ دن بھی ان کے ایسے برت کا تھا۔ لیکن جب گاندھی جی نے سلطانہ بیگم کے چہرے کے آثار اور چڑھاؤ کو دیکھا۔ تو انھوں نے انسان کے دل کے آر پار دیکھنے والی آنکھوں سے ان کے جذبات کو پڑھ لیا۔ چنانچہ اس خیال سے کہ بیگم کو مزید غلط فہمی کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑے انھوں نے اسی وقت اردو میں اپنے ہاتھ سے یہ سطریں لکھ کر سلطانہ بیگم کو تھما دیں :-

"یہ قول غلط طور پر میری طرف منسوب ہے۔ میں نے کبھی یہ نہیں کہا ہے۔ پریس والے بات کو توڑ مروڑ کر پیش کر دیتے ہیں۔"

افسوس کہ یہ خط اب ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ بہر حال اس کا جتنا حصہ محفوظ ہے اس

کی نقل ہدیۂ ناظرین ہے۔ :-

"تم نے میری بحث دیکھیں تھی۔ سچ بات یہ ہے کی۔ (کہ) میں نے کبھی ایسا نہیں کہا ہے۔ میں نے جو کہا تھا وہ چھپا ہے میں نکال کے بھیج سکتا ہوں۔ کیا کیا جائے۔ اخباروں میں میرے بارے میں بہت سی غلط باتیں لکھی جاتی ہیں اگر کل تک رہنا ہے تو آجاؤ۔ کچھ بات کریں گے اور کچھ بتاؤں گا —"

قاضی نجم الدین احمد صاحب اندرکوٹ، میرٹھ میں قیام پذیر تھے ۱۹۴۵ء کی بات ہے اسی سال میں نے یوپی بورڈ کا انٹرمیڈیٹ امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کرلیا تھا میں گرم دل کا آدمی تھا۔ قاضی صاحب مجھے بہت سمجھایا کرتے تھے۔ کہ جذبات میں اعتدال سے کام لوں۔ تعلیم کے کئی برس ۱۹۴۲ء کی تحریک کی نذر ہو چکے تھے۔

گاندھی جی اور قاضی کے مراسم، خلافت کی تحریک کے زمانے سے چلے آرہے تھے۔ گاندھی جی گڑ بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ اور سب جانتے ہیں کہ میرٹھ، گڑ اور شکر کا گڑھ ہے۔ گاندھی جی کے معتقد اکثر انھیں کھانے پینے کی چیزوں کی سوغات بھجوایا کرتے تھے۔ افسوس کہ ایسے لوگوں کے خاندان کے کئی لوگ آج بھوک اور افلاس کے ہاتھوں برباد بھی ہو چکے ہیں۔ کیا انقلاب زمانہ ہے۔ قاضی جی بھی گاندھی جی کو میرٹھ کا گڑ بھیجا کرتے تھے۔ قاضی جی انگریزی زبان کے بھی ماہر تھے۔ ایک بار بے خیالی میں انھوں نے گاندھی جی کو میرٹھ کے گڑ کے ساتھ، انگریزی میں اپنا خط بھی بھیج دیا۔ گاندھی جی کو قاضی جی کا انگریزی میں خط لکھنا ناگوار گزرا۔ چنانچہ گاندھی جی نے قاضی کو اردو میں خط لکھنے کی طرف اشارہ دیا۔ خطِ مذکور کی نقل — ذیل میں ملاحظہ ہو۔

برلا ہاؤس — بمبئی　　　　۱۶ اپریل ۴۵ء

بھائی احمد۔ !

آپ مجھے انگریزی میں کیوں لکھیں؟ گڑ تو میرے سیوا گرام چھوڑنے کے بعد ملا۔ سلطانہ نے آج تک مجھے کیوں نہیں لکھا ہے۔ ان کی صحت تو اچھی ہے نا۔

آپ ان کو لکھیں مجھے خط برابر لکھے - مجلے سیوا گرام بھیجے - !

آپ کا -

مو - کے - گاندھی

گاندھی جی کو اردو سے محبت تھی جس طرح پنڈت نہرو نے اپنی میز پر اردو کے کچھ شعر اپنے ہی ہاتھوں سے لکھ کر شیشے کے نیچے رکھ لئے تھے جو ان کے مرنے کے بعد ظاہر ہوئے اسی طرح گاندھی جی کی کئی یاد داشتیں بھی اردو میں موجود ہیں -

اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی نے بڑھاپے میں جیل میں اردو سیکھی مگر وہ اس کے حسن کے شیدائی اور متوالے بن گئے - گاندھی جی کی عمر کا وہ حصہ جب انھوں نے اردو سیکھ لی تھی - بے حد اہم بھی رہا ہے اور ضرورت سے زیادہ مصروف بھی - ورنہ وہ شاید اردو میں مہارت بھی حاصل کر لیتے ان کی اردو کی جو تحریریں میری نظر سے گزری ہیں - ان میں ہجے اور املا کی خامیاں بھی دیکھنے کو ملی ہیں - گاندھی جی کا خط تحریر بھی پختہ نہیں ہوا تھا -

ظاہر ہے ایسے عدیم الفرصت عظیم انسان کے پاس ان دنوں وقت کا اس سے بہتر مصرف موجود تھا - اور اس کام کے لئے جو سرمایۂ وقت درکار ہوتا ہے - وہ ان کے پاس موجود ہی نہیں تھا -

لیکن ان مدعیوں کے لئے جو اردو سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں یہ بات عبرت کے تازیانے سے کسی طرح کم نہیں ہوگی - کہ گاندھی جی نہ صرف اردو جانتے ہی تھے - بلکہ اس میں اپنے جذبات کی ادائیگی کے لئے تحریریں بھی لکھتے تھے -

▲ ▲

# خطبۂ صدارت

{یہ خطبہ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی، چیرمین راجستھان اردو اکیڈمی نے، اکیڈمی کے اجلاس عام منعقدہ ۲۵ جولائی ۱۹۸۳ء میں دیا تھا۔}

حضرات گرامی۔!

مجلس عام کے اس اجلاس چہارم میں، میں آپ سب کا خیر مقدم کرتا ہوں اور عید سعید کی نیک تمناؤں کے ساتھ دوبارہ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔!

حضرات۔! راجستھان اردو اکیڈمی کی کارگردگی کا اجمالی خاکہ کتابچے کی شکل میں آپ کو پیش کر دیا گیا ہے اس کے مطالعے سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا۔ کہ اکیڈمی نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اور نامساعد حالات میں اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے حتی الامکان کوشش کی ہے اور بہت کافی حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے۔

اکیڈمی کے دستور العمل میں اغراض و مقاصد کی طویل فہرست درج ہے لیکن آپ اگر بنظر غائر مطالعہ کریں تو میری طرح آپ بھی اس نتیجہ پر پہنچیں گے۔ کہ ان سب میں اہم ترین غرض و غایت اردو زبان و ادب کی ترویج و بقا رہے۔ اور وہ تمام ہدایات جنھیں اغراض و مقاصد کے ذیل میں درج کیا گیا ہے مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ اردو کی ترویج و بقا کے حصول ہی کا ذریعہ ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ترویج میں ہی اردو کی بقا کا راز مضمر ہے۔

مختلف الخیال بہی خواہان اردو مجھے اپنے قابل قدر مشوروں سے نوازتے رہے ہیں۔ لیکن میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں اور بیشتر اہل رائے حضرات کا بھی یہی خیال ہے کہ اردو کی ترویج میں سب سے زیادہ اہمیت اردو کی تعلیم کو اور خصوصاً ابتدائی درجات کی تعلیم کو حاصل ہے۔

نخل اردو جو ہمارے لئے **نخل آرزو** کی حیثیت رکھتا ہے تب ہی پروان چڑھ کے بار آور ہو سکتا ہے کہ جب اس کی اصل مضبوط و توانا ہو۔ اور صالح غذا جڑوں کے ذریعہ پہنچتی رہے اس لئے میرا منصوبہ یہ ہے کہ تحتانی درجات کی تعلیم پر پوری پوری توجہ دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ ارباب حکومت کی بھی خصوصی توجہ مبذول کراتے رہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اردو پڑھنے والے غریب طلباء و طالبات کو اردو کی کتابیں اکیڈمی کی جانب سے مفت فراہم کی جائیں اور یہ امداد مستحق طلباء و طالبات کو اعلیٰ سطح تک دی جائے۔

اکیڈمی کی یہ فیض رسانی راجستھان کے چند شہروں یا ضلعوں تک ہی محدود نہ رہے بلکہ راجستھان کے دور و دراز قصبات اور دیہات تک بھی یہ فیض پہنچے اردو کا کوئی طالب علم خواہ وہ کسی بھی مذہب و ملت کا ہو محض غربت و ناداری کی وجہ سے اردو کی تعلیم سے محروم نہ رہے۔ اس وقت جو امداد اس مد سے دی جا رہی ہے۔ اس سے میں مطمئن نہیں ہوں میری خواہش و کوشش یہ ہے کہ وظائف کی امداد، ۲۵ و ۳۰ طلباء تک ہی محدود نہ رہے بلکہ اس تعداد میں کافی اضافہ ہو۔

ہمارا وطن، ہماری ہر دل عزیز وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کی بے مثل قیادت میں جس سرعت رفتار سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

ہماری عظیم رہنما کو جن جن پیچیدہ مسائل کا سامنا ہے ان سے بھی ہم خوب واقف ہیں اور ملک کو جو جو خطرات لاحق ہیں وہ بھی ہمارے پیش نظر ہیں۔ اردو ادب عظیم روایات کا حامل ہے اس نے دور غلامی میں آزادی کا، پستی میں بلندی کا، منافرت و افتراق میں یگانگی و یکجہتی کا، اور جنگ و جدل میں صلح و آشتی کا جھنڈا بلند کیا۔ جب بھی وطن عزیز پر خطرات کے بادل منڈلاتے ہیں۔ ہم اردو والے سر بکف میدان میں نکل آتے ہیں۔ ہم اپنے فرائض کو بھولے نہیں ہیں آج بھی ہم میں وہی جذبہ کارفرما ہے۔ راجستھان کے ادیب و شاعر، تعمیر وطن میں اپنا فرض ادا کریں اور راجستھان اردو اکیڈمی انھیں نوازے۔

ہماری ہمیشہ یہی کوشش ہوگی کہ راجستھان کے ادیب و شاعر تعمیری ادب کی تخلیق کریں ایسے صالح اور توانا ادب کی جو ملک و قوم کے لئے مفید ہو۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے طباعت و اشاعت

کی مد میں جو رقم مختص کی گئی ہے وہ اگرچہ کم ہے لیکن کچھ پیش رفت ضرور ہے۔
جے پور میں اردو کتابت اسکول کا قیام، راجستھان اردو اکیڈمی کا ایک قابلِ فخر کارنامہ ہے یہ اگرچہ عہد طفولیت سے گزر رہا ہے لیکن مستقبل قریب میں یہ ایک اہم اور مفید ادارہ کی حیثیت حاصل کرلیگا یہ بہت سے افراد کو صرف روزگار ہی فراہم نہیں کرے گا۔ بلکہ ایک اہم فن یعنی خطاطی کو جو جے پور سے تقریباً معدوم ہوتا جارہا تھا۔ نئے سرے سے ترقی و فروغ کے مواقع فراہم کرے گا۔
یہاں مجھے ایک اور کمی کا احساس ہوتا ہے۔ میری یہ دلی خواہش رہی ہے کہ راجستھان کے تمام شہروں میں نہیں۔ کم سے کم راجستھان کی راج دھانی میں اردو کی تعلیم کے ایک یا دو ایسے مراکز قائم کیے جائیں جہاں شائقین کو اردو کی نوشت و خواند سے واقف کرانے کا انتظام ہو۔ اکثر حضرات نے اس کی فرمائش کی ہے اور میں خود بھی اسے اردو زبان کے ترویجی سلسلے کی ایک اہم کڑی تصور کرتا ہوں۔ ایک اندازے کے مطابق ایک مرکز پر سات آٹھ ہزار روپے سالانہ کا خرچ ہے۔ لیکن اس کی افادیت واہمیت کے پیش نظر یہ رقم زیادہ نہیں۔
ہم اس سلسلے میں صوبائی اور مرکزی حکومت سے خط و کتابت کر رہے ہیں اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اکیڈمی اپنے طور پر ایسے مراکز قائم کرنے کی کوشش کرے گی۔
میں اردو کی تعلیم کے سلسلے میں بھی خط و کتابت کے ذریعہ ارباب حکومت سے رابطہ قائم کیے ہوئے ہوں اکثر حضرات سے ملاقاتیں بھی کر چکا ہوں اور کافی حوصلہ افزا گفتگو ہوئی ہے۔ عزت مآب شیو چرن ماتھر صاحب وزیر اعلیٰ راجستھان نے اردو کے مسائل پر تفصیلی گفتگو کرنے کے لئے وقت دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ وہ علم دوست اور ادب نواز انسان ہیں۔ اور انھیں اردو زبان کے فروغ وارتقا سے کافی دلچسپی رہی ہے۔

ناشکر گزاری ہوگی اگر میں عالی جناب احمد بخش صاحب سندھی وزیر قانون واوقاف کا خلوص دل سے شکریہ ادا نہ کروں وہ نہ صرف اکیڈمی کے معاملات میں ذاتی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ بلکہ اردو کے جائز حقوق کے حصول میں ہماری مدد بھی کرتے رہے ہیں۔
میں اس موقع پر ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے میرے ساتھ پورا تعاون

کیا۔ اور ان میں سر فہرست محترم کھیم چند وائس چیرمین کا اسم گرامی ہے۔
اکیڈمی کے دیگر اراکین کا بھی میں ممنون ہوں جنھوں نے اکیڈمی کے کاموں میں ہمرا ہاتھ بٹایا۔ جناب عبدالحی شمیم نے چند ماہ کے لئے اپنا ذاتی مکان بلا معاوضہ اردو کتابت اسکول کے لئے عنایت کیا۔ اس کے لئے متشکر ہوں۔
مجھے امید ہے کہ آج کے اس اجلاس میں تعمیری تجاویز سامنے آئیں گی اور اکیڈمی کے بجٹ پر دانشورانہ غور و خوض کیا جائے گا۔
میں ایک مرتبہ پھر آپ سب حضرات کا پرتپاک خیر مقدم کرتا ہوں۔ !

شکریہ۔ !

## انتقالِ پُر ملال

۱۶ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو راجستھان کے ایک منفرد شاعر مستان بیکانیری کا ۶۱ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون
ادارہ مرحوم کے پسماندگان کا شریک غم ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین ! 
مستان مرحوم کا مجموعۂ کلام دیوناگری رسم الخط میں "ہوش کی مستی" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے

ادارہ




اکیڈمی کے چیرمین ڈاکٹر محمد علی زیدی اُردو کتابت اسکول کی افتتاحیہ تقریب
میں تقریر کرتے ہوئے۔ آپ کے پاس بیٹھے ہیں وزیر قانون عزت مآب
جناب : حمد بخش سندھی اور اکیڈمی کے وائس چیرمین جناب کھیم چند ماتھر




اردو کتابت اسکول جے پور کی افتتاحیہ تقریب میں تقریر کرتے ہوئے
[illegible]

# غزلیات و منظومات

## غزل

مہدی پرتاب گڑھی

دل میں یقین شوکت فردا لئے ہوئے ہے
قدموں تلے شکستوں کا صحرا لئے ہوئے ہے

اندھے کنویں میں ذات کے محبوس تھی حیات
باہوں میں اپنی سوچ کا پہرا لئے رہے

سرشار جس کے کیف سے تھی میری زندگی
ہونٹوں پہ اس خیال کا بوسہ لئے رہے

اک مسئلہ کھڑا رہا معیارِ عہد کا
زہراب عصر نو کے مسیحا لئے رہے

سڑکوں پہ دونوں سمت درختوں کی تھی قطار
ہم پھر بھی سر پہ دھوپ کا ٹکڑا لئے رہے

وہ روشنی کے شہر میں آئے تو کیا ملا
اذہان میں جب اپنے اندھیرا لئے رہے

لب پر غم حبیب کا مہدی تھا تذکرہ
سینے میں اپنے ہم غم دنیا لئے رہے

## غزل

احمد رضا خاں رزمی ٹونکی

وہ بات وہ انداز وہ کردار نہ چاہو
جو بزم میں دیکھا تھا سر دار نہ چاہو

حالات کا اندازہ مرے حال سے کر لو
للہ زباں سے مری اظہار نہ چاہو

اک بار اگر بیٹھ گئے اٹھ نہ سکو گے
دوران سفر سایۂ دیوار نہ چاہو

دوبارہ جو مانگو در تدبیر سے مانگو
تقدیر سے اک بات کو ہر بار نہ چاہو

صلۂ ارباب وفا چاہو جو خود کو
دنیا کو وفا کے لئے تیار نہ چاہو

جس چیز کی تقدیر بہ تغیر ہو، فنا ہو
کیسی بھی ہو اس چیز کو زنہار نہ چاہو

یہ خون شہیدانِ فلسطیں کی ہے آواز
اے اہل عرب سونے کے انبار نہ چاہو

کل تم بھی تو چل سکتے ہو اس راہ پہ رزمی
اوروں کے لئے راہ کو پُر خار نہ چاہو

## نظم قومی یکجہتی سے متعلق

مضطر صدیقی پانسواڑہ

یہ خاک مرے دیش کی صد رشکِ جہاں ہے
اس خاک پہ قربان مرا دل مری جاں ہے

یہ ملک ہے اک مرکزِ تہذیب و تمدن
ہر روئے انساں ہر اک ذرے سے عیاں ہے

ہے سایۂ گنگ نانک و چشتی کا تقدس
رام اور سری کرشن سا بھگوان یہاں ہے

ہندو بھی مسلماں بھی ہیں اس دھرتی کے بیٹے
کہنے کو ہیں دو جسم مگر ایک ہی جاں ہے

زنار ہیں رکھتا ہوں میں تسبیح کے دانے
دل محوِ نوا سنکھ و ناقوس و اذاں ہے

تلسی کے لب و لہجہ میں خسرو کے ترانے
کیا خوب ہم آہنگئ تفسیر و بیاں ہے

ہیں جلوہ فگن تاج و اجنتا کے در و بام
اک وادئ کشمیر ہی صد رشکِ جہاں ہے

تاریخ ادب آج بھی دیتی ہے گواہی
ہندی ہی نہیں اردو بھی بھارت کی زباں ہے

مضطر ہے جواں عظمتِ فن روزِ ازل سے
اک علم و ادب کا یہاں سیلاب رواں ہے

اس خاک پہ قربان مرا دل مری جاں ہے

## غزل

ایوب اثر۔ شاہجہاں پور

کبھی حیات کا ماحول سازگار تو ہو
وہ ایک پل کو سہی موسمِ بہار تو ہو

جو دل ہو بس میں تو دنیا میں کیا نہیں ہوتا
کسی کو دل پہ مگر اتنا اختیار تو ہو

میں جس کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھا ہوں
اسے بھی کاش کبھی میرا انتظار تو ہو

یہ سچ ہے میں بھی نئی روشنی کا قائل ہوں
مگر اجالوں میں تھوڑا خلوص و پیار تو ہو

گلہ ہو کیسے زمانے کی بے وفائی کا
ہمیں بھی اپنی وفاؤں پہ اعتبار تو ہو

نہ جانے کیوں مرے احباب مجھ سے بدظن ہیں
مری طرف سے کبھی کوئی انتشار تو ہو

گنہگار بھی اتنا برا نہیں ہے اثر
گنہگار مگر خود پہ شرمسار تو ہو

# دو غزلیں

## نذیر فتحپوری

بے رنگ منظروں میں بکھر کر غبار سا
تجھ سا دھنک مزاج بھی بے رنگ ہو گیا

تھا ایک دوسرے سے کچھ ایسا ہی واسطہ
دھرتی کی پیاس دیکھ کے بادل برس پڑا

بکھرے پڑے ہیں لفظ تخیل کی ریت میں
نوکِ قلم سے جن کے غزل کا بدن سجا

صحرائے زندگی میں مسائل کی دھوپ سے
جو شخص بھی ملا وہ سلگتا ہوا ملا

اک سیلِ بے ثبات کی جرأت تو دیکھئے!
مٹی کے ڈھیر جیسا مرا گھر بنا گیا

اس آدمی کو دیجیے کیوں کر سزا نذیر
اپنے کئے پہ خود جو پشیمان ہو گیا

—— ✻ ——

## بسمل سعیدی

ساقی کے نام لیوا میخانے رہ گئے ہیں
میخانوں میں بھی خالی پیمانے رہ گئے ہیں

بن کر جو اک حقیقت دنیا پہ چھا گئے ہیں
دنیا میں آج ان کے افسانے رہ گئے ہیں

قبروں میں سونے والو تم کو پکارتے ہیں
عشرت کدے جو بن کر غمخانے رہ گئے ہیں

دیکھ اے نگاہِ عبرت آثارِ عہدِ ماضی
آبادیوں کے ہو کر ویرانے رہ گئے ہیں

اے گوشِ اہلِ عبرت تم سن سکو تو سن لو
یہ کچھ حقیقتوں کے افسانے رہ گئے ہیں

اے شمع صبحِ محفل! ان کو جلا کے بجھنا
دو چار اور تیرے پروانے رہ گئے ہیں۔

دیوانوں کو جو بسمل بدنام کر رہے ہیں
دیوانوں میں ابھی کچھ فرزانے رہ گئے ہیں۔

# حیاتِ پائندہ

محمد امان اللہ خاں شیدا نصیر آبادی

حادثہ جب بھی کوئی ایسا گزر جاتا ہے  ذہن بے چارگی و یاس سے بھر جاتا ہے
نشۂ زیست کا افسوں سا اتر جاتا ہے  یعنی جب اہلِ وفا میں کوئی مر جاتا ہے۔

میرے افکار میں ہیجان بپا ہوتا ہے
میرے جذبات میں طوفان بپا ہوتا ہے

سوچتا ہوں۔ کہ یہ دنیا کا ثبات کیسا ہے  جو کہ بس ایک ہی جھٹکے میں اتر جاتا ہے
آدمی وقت کے حملوں سے سدا لڑتا رہا  موت کے ایک ہی حملے سے وہ مر جاتا ہے۔

ایسے حالات میں یوں میرا ذہن کہتا ہے
بحرِ ظلمات کو یوں شمعِ ضیا دیتا ہے
آدمی حسنِ عمل سے ہی جو جینا سیکھے
تلخئ موت سے کیسے مٹا سکتی ہے
موت کی آہنی دیوار میں چھپ جانے کے بعد
منزلِ حسنِ عمل اس کو جِلا سکتی ہے
الغرض دوستو۔! اعمالِ حسیں کرتے رہو
پھر اگر موت کبھی آتی ہے تو تم مرتے رہو

# دو غزلیں

## احمد نفیس کراچی

اڑتی خوشبو کو شجر ہم نے کیا
خود کو دریائے ہنر ہم نے کیا

پتھروں سے ہم نے مانگی روشنی
خشک دریا میں سفر ہم نے کیا

الجھنیں جب نت نئی پیدا ہوئیں
گفتگو کو مختصر ہم نے کیا

سب کے دروازے مقفل دیکھ کر
ختم خوابوں کا سفر ہم نے کیا

جو کہا وہ حرفِ آخر ہو گیا
زندگی کو معتبر ہم نے کیا

آپ کو یہ عظمتیں ہم نے ہی دیں
آپ کو افلاک پر ہم نے کیا

رک گیا تھا زندگی کا کارواں
پھر سے آغاز سفر ہم نے کیا

رہگزاروں پر جلائیں مشعلیں
دشت کو خوشبو کا گھر ہم نے کیا

چارہ سازی کا بھرم ہم نے رکھا
خود علاج چارہ گر ہم نے کیا۔

## مخمور جمالی سنبھلی

کروٹیں ارمان یوں لیتے ہیں اکثر رات کو
جس طرح تڑپیں کہیں زخمی کبوتر رات کو

دن تو ہنس کر چاند سے چہروں میں اپنا کاٹ لے
اوڑھ لے گا پھر اداسی کا کفن گھر رات کو

جب کسی گوشے سے دل کے جھانکتی ہے بے کسی
قتل ہو جاتا ہے ہر رنگین منظر رات کو

ہوش والوں کی ملامت کا نشانہ بن گیا
جب کوئی گھبرا کے نکلا گھر سے باہر رات کو

کیا خبر تھی آپ اپنے خون کا پیاسا ہے وہ
آستیں میں رکھ کے جو نکلا تھا خنجر رات کو

ہو گیا وہ بھی رئیس شہر کی موٹر کی نذر
تھک کے سو جاتا تھا جو سائل سڑک پر رات کو

اس وفا ناآشنا نے لی نہ بھولے سے خبر
پڑ گئے خوابوں کے آئینہ پہ پتھر رات کو

جس کا جلوہ دیکھنے کو ہر نظر ہے بیقرار
خود الٹ دیتا ہے وہ چہرے سے چادر رات کو

کوئی تدبیر سکوں مخمورؔ کام آتی نہیں
جب خیالوں میں بپا ہوتا ہے محشر رات کو

# محبّت

مختار ٹونکی

خدا کا اک عطیہ ہے، محبت ایک نعمت ہے
گراں مایہ، یہ تحفہ ہے محبت ایک دولت ہے

محبت نورِ یزداں ہے محبت ظلِ سبحانی
محبت جامِ عرفاں ہے محبت کیفِ ایمانی
محبت آبِ حیواں ہے محبت ابرِ نیسانی
سراسر یہ سعادت ہے سراپا ایک رحمت ہے
محبت ایک تحفہ ہے محبت ایک دولت ہے

محبت باعثِ امکاں، محبت جانِ عالم ہے
محبت زیورِ انساں محبت حسنِ آدم ہے
محبت آیۂ رحماں محبت اسمِ اعظم ہے
نظامِ زندگی قائم محبت کی بدولت ہے
محبت ایک تحفہ ہے محبت ایک دولت ہے

محبت پاک جذبہ ہے محبت ذوقِ کامل ہے
متاعِ زندگی ہے اور یہی دنیا کا حاصل ہے
اگر دنیا سمندر ہے، محبت اس کا ساحل ہے
اسی کا نام راحت ہے اسی کا نام عشرت ہے
محبت ایک تحفہ ہے محبت ایک دولت ہے۔

# محبت

مختار ٹونکی

محبت جاری وساری زمیں سے آسماں تک ہے
اسی کی کارفرمائی مکاں سے لامکاں تک ہے
محبت ہے وہاں تک حکمرانی جہاں تک ہے
محیطِ وسعتِ گیتی، محبت ہے محبت ہے
محبت ایک تحفہ ہے محبت ایک دولت ہے

محبت ہی سے یہ دنیا حسیں معلوم ہوتی ہے
بڑی دلکش بلا کی دلنشیں معلوم ہوتی ہے
نظر میں پھر یہی خلدِ بریں معلوم ہوتی ہے
محبت ایک دوشیزہ کی طرح خوبصورت ہے
محبت ایک تحفہ ہے محبت ایک دولت ہے

محبت جس میں ہوتی ہے وہ دل بیدار رہتا ہے
محبت کے نشے سے ہر گھڑی سرشار رہتا ہے
وہی دل شاد دنیا میں، بس اے مختار رہتا ہے
بشر کے واسطے یہ تو بہت ہی بیش قیمت ہے
محبت ایک تحفہ ہے محبت ایک دولت ہے۔

# غزل

میکش اجمیری ، نیماہیڑہ

آنکھوں نے ضبطِ غم کے فرائض نبھا لئے
پلکوں میں آنسوؤں کے شرارے چھپا لئے

اس نے بھی اپنے آپ کو محتاط کر لیا
ہم نے بھی احتیاط کے پہرے بٹھا لئے

یہ کون سا مقام شبِ ہجر ہے جہاں
یادوں نے گزرے لمحوں کے بستر بچھا لئے

یہ کون آنے والا ہے میرے مکان میں
آنگن میں چاند تاروں نے بستر لگا لئے ۔

آخر کو کام کر گئی ، پاکیزگی مری
اس نے تکلفات کے پردے ہٹا لئے

دستِ جنوں کی خوب رہیں کارسازیاں
لوگوں نے اپنے ہاتھ میں پتھر اٹھا لئے

میکش ، رقیب ، دوست کی صورت میں آ گئے
ہم نے بڑھا کے ہاتھ سہارے کٹا لئے

# غزل

ڈاکٹر سخاوت شمیم

اس نے کچھ کہنے سے پہلے یہ نہ سوچا ہوگا ۔
میرے احساس سے اس کا کوئی رشتہ ہوگا

آئینہ سے کبھی باہر جو نکلتا ہوگا
اجنبی شخص کا ہمدرد سا چہرہ ہوگا

منتظر شام کے لمحوں میں سمائی ہے حیات
اب نہ رات آئے گی کوئی نہ سویرا ہوگا

یوں تو کچھ لوگ چلے آئیں گے چیخیں سن کر
کوئی مجروح صداؤں کا مسیحا ہوگا

ملنے والوں کو کتابوں کا گماں گزرا ہے
آپ کی ذات پہ الفاظ کا پہرا ہوگا

گم نہ کر دے کہیں ہنگامۂ ہستی اس کو
گھر سے ہر شخص یہی سوچ کے چلتا ہوگا ۔

ہم اگر مر بھی گئے لوگ نہ مانیں گے شمیم
تم اگر جینے دو گے تو بھلا کیا ہوگا

# غزل

تسنیم فاروقی - لکھنؤ

آندھیوں میں اس کا کاروبار ہے
زندگی اک ریت کا مینار ہے

عاجزی انسان کا معیار ہے
پھول میں خوشبو نہ ہو بیکار ہے

عکس آتا ہے تو آنے دیجیئے!
آئینہ وہ کیا جو بے دیدار ہے

شیش محلوں میں سجی ہیں حسرتیں
چند لوگوں کے لئے بازار ہے

خیریت چاہو تو کیوں اس سے ملو
وہ تو اک چلتی ہوئی تلوار ہے

اپنی رسوائی کا مجھ کو غم نہیں
مجھ کو اس کی شہرتوں سے پیار ہے

اب بھی سنتا ہوں تری آہٹ کا ساز
آج تک جذبات میں جھنکار ہے

ہاں مگر کچھ خاص لمحوں کے لئے
انگ انگ اس کا مجھے شہکار ہے

جنگ تک تسنیم کو لائے ہیں لوگ
ہاتھ میں مانگے کی اک تلوار ہے

# غزل

ڈاکٹر یوسف جاوید کراچی
(پاکستان)

کبھی خزاں کے نہج پر کبھی گلوں کی طرح
ترا خیال بھی آیا تو موسموں کی طرح

جو سنگِ میل ہیں ان کو سکوں مبارک ہو
ہمارا کام گزرنا ہے قافلوں کی طرح

خوشا وہ بوند جو آنکھوں کا نور بن کے رہی
رہے وہ اشک جو پھیلے سمندروں کی طرح

مجھے تو ایک خلش چاہیے - بنامِ حیات
وہ دل نہ دے کہ رہے دل میں حسرتوں کی طرح

گرا کے دیکھ نشیمن پہ بجلیاں صیاد!
ہماری آنکھ بھی برسے گی بادلوں کی طرح

مجھے وہ غم بھی میسر ہے جو تری خاطر
لبوں پہ رقص کرے مسکراہٹوں کی طرح

ہمارے واسطے کھولے گا کون دروازہ
ہم آہٹوں کی طرح ہیں نہ دستکوں کی طرح

حقیقتاً تو وہی باشعور تھے جاوید
جو اپنے گھر میں بھی ٹھہرے مسافروں کی طرح

---

# دو غزلیں

**سلیم واصف فرقانی ٹونکی**

باغِ عالم کی فضاؤں کو مکدّر دیکھ کر
ہوں سراسیمہ عروجِ فتنہ و شر دیکھ کر

بے حیائی، خود سری، عریانیت، بے پردگی
اس نئی تعلیم کے حیراں ہوں جوہر، دیکھ کر

پے بہ پے اقدارِ انسانی کی یہ پامالیاں
دیکھنا ہے اور کیا محشر، یہ محشر دیکھ کر

وہ نظر، وہ دل، وہ جذبہ، وہ تخیل اب کہاں
جو تڑپ اٹھے مگا، دل سوز منظر دیکھ کر

مطمئن ہرگز نہیں اِس کیفیت سے اہلِ ہوش
ہیں مگر چپ گردشِ دوراں کے تیور دیکھ کر

ہوش کھونا جوش میں، کارِ خرد منداں نہیں
پاؤں تو پھیلے مگر اے دوست چادر دیکھ کر

کثرتِ غم بھی نہیں، منت پذیرِ کائنات
تم بھلا ہوتے ہو کیوں حیران و ششدر دیکھ کر

قعرِ دریا کی خبر لانے کے داعی! ہوشیار
سیرِ دریا، زورِ امواجِ سمندر دیکھ کر

اپنے ظرفِ مے کشی کا لیجے پہلے جائزہ
ہاتھ پھر واصف بڑھانا سوئے ساغر دیکھ کر

**خواجہ صلاح الدین عشقی**

بہت اداس، بہت سوگوار گزرے ہیں
ترے بغیر جو لیل و نہار گزرے ہیں

ترے بغیر ہر اک رنگ و بو کے نظّارے
مذاقِ فطرتِ نازک پہ بار گزرے ہیں

وفورِ شوق ملاقات میں ترے عشاق
حصارِ دار سے پروانہ وار گزرے ہیں

کبھی حوادثِ دوراں سے منہ نہیں پھیرا
جدھر سے گزرے ہیں ہم باوقار گزرے ہیں

رہِ نیاز میں ہر ہر قدم پہ دیوانے
بہ رنگ ناز بصد افتخار گزرے ہیں

ترے کرم کے بھروسے نے حوصلہ بخشا
تری نظر کے سہارے سے پار گزرے ہیں

متاعِ قلب و نظر، حاصلِ حیات و ممات
وہ چند لمحے جو نزدیکِ یار گزرے ہیں

عطا ہوا ہی نہیں کچھ انھیں شعورِ حیات
تری نظر سے جو بیگانہ وار گزرے ہیں

سکونِ قلب انھیں کو عطا ہوا عشقی
جہانِ سوز میں جو بے قرار گزرے ہیں

# غزل

طربؔ میرٹھی - دیوبند

رنگ و روغن ہے مگر چہروں میں زیبائی کہاں
ڈھونڈھنے والو! اداکاروں میں سچائی کہاں

پانی پانی ہو گئے سب حادثوں کے زلزلے
جسم میرا کپکپایا، روح تھرّائی کہاں

چاپلوسی دور میں خود دار انساں کیا کریں
تشنہ کاموں کی سمندر سے شناسائی کہاں

آئینوں کو ہے غلط فہمی، کوئی ان سے کہے
پتھروں کے پاس اعجازِ مسیحائی کہاں

اپنے ہی دل کی حقیقت آدمی پہچان لے
کوئی بھی دریا ہو اس میں اتنی گہرائی کہاں

اس ستمگر نے بتاؤ تو کرم کس پر کیا،
کب ہوا یہ، چاندنی سورج نے برسائی کہاں

بے کفن ہے لاش سچائی کی ہر اک شہر میں
جن کی آنکھیں ہیں ان اندھوں کو نظر آئی کہاں

میں تو اپنے آپ سے ہی آجکل ناراض ہوں
میرے ہونٹوں پر شکایت وقت کی آئی کہاں

میری نظریں مطمئن ہوتی نہیں میں کیا کروں
جو کبھی تھی اب نظاروں میں وہ رعنائی کہاں

اور پھیلے اور بڑھ جائے غموں کا سلسلہ
زندگی میری مسرت کی تمنائی کہاں

دھوپ سے بیزار ہوں سائے کی حسرت بھی نہیں
کچھ نہ پوچھو زندگانی مجھ کو لے آئی کہاں

اپنے ہی اندر سے ابھری روشنی کی اک کرن
اس اندھیرے میں کسی نے راہ دکھلائی کہاں

دل میں رہتے ہیں بسے، یادوں کے ہنگامے طربؔ
مجھ کو تنہائی میں بھی ملتی ہے تنہائی کہاں

# حسنِ نظر

نوٹ

اس عنوان کے تحت قارئین نخلستان کے بعض خطوط کے اقتباسات ہر ماہ ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔ لیکن قارئین کی رائے سے ایڈیٹر کا اتفاق ضروری نہیں۔

ادارہ

## اجنبی۔ اورنگ آبادی

مکرمی! خلوص بے کراں۔

نخلستان کا مشترکہ شمارہ ایک عزیز دوست کے توسط سے دیکھنے کو ملا۔ پرچہ کی کتابت و طباعت نہایت عمدہ ہے۔ کاغذ دیدہ زیب، تخلیقات کی ترتیب و تزئین آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کی ضامن ہیں۔ پرچہ صوری و معنوی اعتبار سے اچھا ہے۔ اس اردو کُشی کے دور میں پرچوں کو پابندی سے نکالنا، ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے مصداق ہے۔ آپ واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید کہ آپ بخیر ہوں گے

فقط۔ آپ کا ممنون کرم

اجنبی اورنگ آبادی

## قاضی انصار صاحب۔ کھنڈوہ

محترمی! تسلیمات۔

نخلستان کا ایک شمارہ نظر سے گزرا۔ راجستھان کے بنجر علاقہ سے اردو ادب کی آبیاری یہ آپ ہی کا حق ہے۔ معیار سے لے کر کتابت و طباعت تک سب کے لئے مبارکباد قبول فرمائیں۔ فقط

مخلص

قاضی انصار

## جبار غنی ۔ رانچوی

برادرم محمد علی زیدی صاحب ۔ ! سلام ورحمت ۔

نخلستان کا سہ ماہی شمارہ باصرہ نواز ہوا ۔ میں آپ کی اس عنایت کا کافی مشکور ہوں آپ نے اردو کے شیدائیوں کو جس اسٹیج پر لا کر کھڑا کر دیا ہے وہ ایک اہم مدیرانہ فرض ہے ۔

" فلاح نوع انسان اور پیغمبر آخر زماں " پڑھ کر معلوم ہوا کہ آپ بھی کسی مقرر سے کم نہیں زبان میں بلا کی سلاست و روانی موجزن ہے ۔ مضمون مختصر ہی سہی ۔ لیکن قرآن کی ساری آیتوں کا ترجمہ اور مخصوص قابل غور باتیں اس میں اجاگر ہو گئی ہیں ۔ آپ کی بالغ نظری اور نکتہ رسی کی داد تو بہر حال دینی ہی پڑے گی ۔

سید مدبر علی زیدی صاحب کا مقالہ " جوش کی شاعری کا فکری اور فنی تجزیہ " کو اگر ایک ثقافتی سرمایہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا نہایت ہی عمدہ تجزیہ ہے ۔ پروفیسر موصوف نے جوش کی اور ان کی شاعری کا گہرا اور نہایت ہی ڈوب کر مطالعہ کیا ہے ۔

سیدہ شان معراج کا مقالہ جو فراق پر ہے ۔ وہ فرسودہ روایت کی ایک چاشنی ہے اسے پڑھ کر طبیعت سیر نہیں ہوتی ۔ اپنی بڑائی آپ ظاہر کر کے کوئی بڑا نہیں بن سکتا ۔ حق تو یہ ہے کہ اپنی تعریف دوسرے کی زبان سے سننے میں زیادہ مزا آتا ہے ۔

اپنی اہمیت کے ساتھ ساتھ اپنے میاں ، رونق رضا صاحب کی تعریف کے پل باندھ کر اپنے آپ کو اور بھی شرمندہ کیا ہے ۔ یہ کہاں کی حماقت ہے ۔ اپنے محبوب کی داد اگر محبوبہ دے تو بس اسے انتہائی حقیقی محبت ہی کہا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بے مائیگی کا ایک بین ترین ثبوت بھی ہے ۔ اس موقع پر اپنا ہی ایک شعر ذہن میں آ گیا ہے ؎

اپنے کو کھو کے یار کو پایا ہے ہمنشیں
مقصد ہوا ہے عشق کا یوں آشکار آج

دوسرا شعر بھی سن لیجئے ۔ ! ؎ ——

وہ کہہ رہے منہ پہ مرے اپنے دل کی بات
شاید ہے مجھ پہ آپ کو کچھ اعتبار آج

تیسرا شعر بھی گوش گزار کر دوں۔ ؎

کہہ دو جو بات کہنی ہو، کہہ دیں گے کان میں
ہم سے غنی سے اچھی ملاقات ہے جناب

---

عزیز اللہ شیرانی کا مضمون جو شہر ٹونک پر ہے۔ بلاشبہ بزم راسخ اور رنگ اخوت سے لبریز ہے فن خوشنویسی، مشاعروں کا انعقاد، ار دو تحقیق و تنقید، یہ سب کچھ پڑھ کر **ٹونک** کے ادبی ماحول اور خوش فہم واقفات کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اسلام عشرت کا افسانہ "درد کا مداوا" ایک منی افسانہ ہی ہو کر رہ گیا ہے مکیش اجمیری محمور رجبالی اور وارث احسنی کی غزلیں بے حد عشق و انبساط میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ وارث احسنی کا یہ شعر پسند خاطر ہے۔ ؎

تصادم، تعلق، محبت، فراق
یہ سب واقعہ ایک دم ہو گیا

---

بڑی طوالت اور شوخی ہے اس شعر میں، وارث صاحب واقعی اپنے شعر کے وارث ہیں۔
وارث صاحب کے اس شعر پر، اگر میں تنقید کروں تو کیا مضائقہ ہے۔

اک تماشا گہہ حیرت نہیں دنیا کا نظام
آدمی خود ہے زمانے میں تماشا یارو

---

محمور رجبالی سنبھلی، بہت سنبھل کر شعر کہتے ہیں۔ جدت طرازی دیکھئے۔!

شراب پی کے مذمت کریں شرابی کی
گناہ کر کے چلو ہم بھی پارسا ہو جائیں

---

یہ تو دہی بات ہوئی جناب۔!

نخلستان

رات بھر خوب پیا صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

---

اور اگر میں یوں کہوں تو کیا بیجا ہوگا۔ ؎

دل ہو مصفا، کیسی کدورت
لاؤ صراحی، ڈھالو شراب

---

نخلستان کی نئی مجلس ادارت کی تشکیل میں ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی اور جناب عزیز بیکانیری کے نام دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی ہے۔ ان کی باریک نظری اور سخن سنجی سے ہم ضرور فیضیاب ہوں گے اور بلاشبہ اس جریدہ کو مزید فروغ حاصل ہوگا۔ نخلستان کے سرپرستوں کی تعداد میں ضرور اضافہ ہونا چاہیئے۔ اگر ہم سب ہی لوگ مل کر اپنے اپنے قرب و جوار میں اس کے چند خریدار بنوا لیں تو ضرور خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ انشاءاللہ میری کاوشیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اچھے فنکاروں اور ادباء و شعراء کی امدادی رقوم میں بھی کافی حد تک اضافہ ہوا ہے۔ اکیڈمی کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے مجھے تو بس یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک لائق اور مدبر نگراں ہی کسی رسالے کی رگ جان ہے۔ آپ بڑا دل گردہ رکھتے ہیں جو راجستھان جیسے علاقہ میں اردو کی بہی خواہی اور کارکردگی میں ہمہ تن شب و روز مصروف و منہمک ہیں۔ آپ کے عزائم پاک ہی نہیں بلکہ بہت بلند ہیں۔ کیونکہ :— ؎

جن کے دل جدت افکار کے ہوتے ہیں امیں
توڑ کر قید روایات نکل جاتے ہیں

---

نظموں کی جانب سنجیدگی کے ساتھ توجہ دیں تو شمع آبادی بر نازش پرتاب گڑھی کی نظم معیاری اور انوکھی ہے باقی نظمیں وقت کی پکار ہی کہی جا سکتی ہیں —

---



## جاوید اشرف قیص۔

محترم المقام مونس ۔ آنجہٴ خلوص و نیاز

تازہ نخلستان ہم پیش نظر ہے۔ معیاری بزم صداقتی، حسین اور جاذب نظر ہے۔ ہاں اپنے تک

سامنے اس کے جا کے دیکھو کبھی
عکس کیا شے ہے آئینہ کیا ہے

مطالعۂ صحیفہ کیا ہے؟ دلی جذبات کی تسکین آوری ہے یہ پرچہ۔ کہ جلوے قلب و نظر پر چھا جاتے ہیں اور ذوقِ دید اور جذب و الفت کا مادہ کم و کاست نہیں ہونے پاتا۔ ہر لمحے فروزاں ہی ہوتا جاتا ہے۔ لہٰذا اسی جذبے کے تحت سب سے پہلے "پیغمبر آخرالزماں اور فلاح نوع انسان" پر نظر پڑتی ہے ایک ایک لفظ سے صداقت ایک ایک فقرے سے عقیدت، اور ایک ایک عبارت سے محبت کی روشنی پھوٹ پڑتی ہے جس سے قاری کا ذوقِ مطالعہ اور ذہن روشن ہوا اٹھتا ہے۔ اور ناظم بھی سراپا سرشار ہوا نظر آتا ہے۔!

ڈاکٹر سید محمد علی زیدی صاحب۔! ے

وہ ہے تو، جس نے کیا ہے مجھے سرشار وفا
وہ ہے تو جو مجھے دیوانہ بنا جاتا ہے

---

جوشؔ ملیح آبادی جمالیاتی لمحوں کے شاعر ہیں۔ پروفیسر محمد حسن نے اپنی دلکش تحریر سے ان کے شبابیاتی لب و لہجے، خمریات اور گہرائی و گیرائی کے مؤثر نقوش ابھارے ہیں۔

سید مدبر علی زیدی نے جوش کی شاعری کا فکری اور فنی تجزیہ قلمبند کیا ہے فکر میں تو وہ اقبال کے حریم بزم، اور فن میں انیسؔ کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔ لیکن مدبر علی زیدی کا انھیں میر اور غالب کے صفوی اور تغزلی صلابت اور صلائے خاص و عمیق کا پیغمبر بنانا درست نہیں۔

ہم نے فراق کو دیکھا تھا" سیدہ شانِ معراج کا خاصا اور سچا مضمون ہے۔

اسلام عشرت کا افسانہ "درد کا مداوا" پڑھ کر مجھے "انسان کی کہانی" از ادھنا" یاد آ گئی۔ بے ساختہ دل میں کسک سی اٹھی اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے آہ! کتنے دلپذیر ہوتے ہیں ایسے واقعات

عزیز اللہ شیرانی، راجستھان کے ادبی شہر ٹونک کا جائزہ اور منظر کشی آغاز ریاست کے عہد حاضر تک اردو ادب کی روشنی میں دلکش انداز میں کرتے ہیں۔ ٹونک سے ہمیں مندرجۂ ذیل نایاب اشیاء اور ہستیاں دستیاب ہوئیں۔

بہارِ سخن، قصر علم، فرحت الشعراء، رسالہ صلاح الدین اور امیر نامہ فارسی لالہ ہمت رائے۔ ، مولوی نجف علی خاں، استاد حنیف، خراشیں اور موضح التجوید، اور ان کے مصنف حافظ و قاری بہترین شاعر و ادیب جناب سلیم اللہ صاحب واصف فرقانی ٹونکی ندیم، مختار شمیم، مولانا سید منظور الحسن برکاتی۔ جدید نظم، جھلک اور پیاس وغیرہ

علاوہ ازیں ٹونک میں اردو تعلیم و تدریس تحقیق و تنقید، شنن دھارا، چار بیت، مشاعرے کا انعقاد اور فن خوشنویسی کے کلاس کی ابتدا، قابل صد آفرین ہے۔ اس کے بعد یہاں اردو پرنٹنگ پریس کی مزید توقع کی جا رہی ہے خدا کرے جلد قائم ہو۔!

میکش اجمیری کی غزل سے لمحۂ سحر پھوٹ رہا ہے۔ ڈاکٹر اختر بستوی کی بھی دونوں نظمیں مقصد حیات اور قطرے کا سہارا، قارئین کے دلوں کو مسحور کر رہے ہیں۔ آہ جوش میں مضطر صدیقی نے گلہائے عقیدت کھلائے ہیں۔ رفیق عالم فریدی ٹونکی کی فنی پختگی مسلم ہے۔ لیکن مندرجۂ ذیل مقطع خاص طور پر قابل غور ہے۔

غزلخواں تو بہت ہیں اے رفیق اس دور میں لیکن
سخنور، ماہر فن، دیدہ ور دیکھا نہیں جاتا

---

تو ہی ٹونکی صنف غزل کے بجائے صنف نظم کی زمین اختیار کریں تو بہتر ہے!، اشعار محشر عباسی نے اچھے اشعار پیدا کئے ہیں۔ ابن احسن بزمی ٹونکی نے فانی سے استفادہ کیا ہے ـــ خالد سحر عابدی کی غزل آسان بحر میں ہے مگر متاثر کرتی ہے ـــ سلیم واصف فرقانی ٹونکی کے ردیف اور قافیے دقیق ہیں ـــ اور غزل کا مطلع اور پانچواں شعر تو بہت ہی عمدہ ہیں۔

ڈاکٹر اختر نظمی کی رباعیات پر نظر ڈالی دوسری رباعی اچھی ہے مگر پہلی رباعی کا یہ شعر غیر موزوں ہے اور سہو قواعد کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔

ہم ایسے ہیں پانے کو بھی کھونا سمجھا
بے فکری کو اوڑھنا بچھونا سمجھا

رباعی کا وزن اتنا آسان ہے۔ شش منظوم رباعی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ قطعہ ہو گیا — ڈاکٹر اظہار مسرت اعجازی کی تضمین بر اشعار ساحر لدھیانوی متاثر کن ہے۔ !

---

## صالح محمد خان۔ شاعر صابئی ٹونکی

محترم جناب۔ !     السلام علیکم۔

نخلستان کا شمارہ ملا رسالے کا معیار بہت اچھا ہے بے حد خوشی ہوئی۔ کہ آپ نے ہر ممکن اصنافِ سخن اور اصناف ادب کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی صاحب کی تخلیق پیغمبر آخر الزماں کی جدت بیان اور خوش اسلوبی نے مثال قائم کر دی۔ دیگر مضامین بھی پسند آئے اس کے ساتھ ہی یہ بھی خوشی ہوئی کہ آپ نے ٹونک کے جدید و قدیم شاعروں کی غزلیں اور نظمیں بھی شائع فرمائی ہیں۔

---

## تسنیم فاروقی۔ لکھنؤ۔

دو ہفتہ سے زائد دن گزرے۔ کہ نخلستان ملا تھا۔ سرورق پُر شکوہ، معیاری، اور حسین و جمیل تھا بہت پسند آیا اور تمام احباب کو دکھانے کو جی چاہا۔ سبھی نے تعریف کی۔

اداریہ میں اکیڈمی کے مقاصد اور راجستھانی صاحبان قلم کے سلسلے میں جہاں جہاں جو جذبات، آمیز تحریر ہیں۔ ان کا دلی طور پر اثر قبول کیا۔

**خطاطی کا بھی شاندار مظاہرہ ہے۔ نام نخلستان میں۔ !**

آنجناب کی شوکت ترتیب اور صحافت کی خوش مذاقی ہر ہر ورق میں نمایاں ہے پرچہ مجموعی طور پر طباعت سے کاغذ تک ایک خوش آیند گرمیٔ شوق کا امین ہے

معاف فرمائیے گا۔ ایک آدھ مضمون کچھ ایسے بھی ہیں جو اس سے قبل یا ماضیٔ بعید میں بعض اوراق و جرائد میں میری نظر سے گزر چکے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سہ ماہی میگزین ہے اہمیت مقالات

مقصود ہوگی۔

احسان دانش اور تصور انقلاب (عزیز اندوری) ایک منفرد مضمون ہے اور بڑی ہی نبض شناسیوں کا مظہر ہے۔

فراق مجموعۂ اضداد - سید عبدالباری، مضمون تحقیقی، مدلل اور نفسیات کلام فراق پر، ایک دستاویزی سند ہے۔

حصۂ نظم میں بالخصوص وہ شعراء جو راجستھان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو پڑھ کر کچھ ہی ممنون کا احساس ہوا۔

حکومت راجستھان مبارکباد کے لائق ہے کہ وہ اپنے صوبائی تمدن، تاریخی استحکام اور تہذیبی پھیلاؤ کے لئے اردو کے بہتر سے بہتر لکھنے والوں کی خدمات کو سراہنے کے جذبات رکھتی ہے۔ اور اردو ادب معاشرت کو راجستھان کی شہریت اور شہرت کا ذریعہ سمجھتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ ہندوستان کی دیگر اکائیوں کی طرح راجستھان اردو اکیڈیمی بھی ملک وطن کے کلچر کو رنگ روغن فراہم کرنے میں پیش پیش رہے گی۔

---

## مخمور جمالی سنبھلی -!

مکرمی آداب - !

اپریل تا جون کا شمارہ نخلستان پیش نظر ہے - اس بار ادبی مقالات کا حجم و معیار سزاوار التفات ہے۔ "اقبال اور مناظر فطرت" کے روپ میں محمد بدیع الزماں بزور براہین و دلائل یہ باور کراتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کا معتدبہ حصہ قدرتی نظاروں کے گرد گردش کرتا ہے اور وہ اپنے قاری کو فطرت کی روح میں اتر کر فکر و تامل کے بحر بے کراں میں غرق کر دیتے ہیں۔ گویا ان کا حال یہ ہے - کہ :- ؎

دل ہو بیدار تو ایسے بھی مقام آتے ہیں
ہر خموشی سے تکلم کے پیام آتے ہیں

"فراق - مجموعۂ اضداد" فراق کے فن، اور شاعرانہ صلاحیت پر سیر حاصل مضمون

ہے۔ فراقؔ کی بے لگام جنسیت سے مضمون نگار کو جو شکوہ ہے وہ بجا ہے۔ البتہ اقبالؔ اور ٹیگورؔ کی طرح پیغامبری کا مطالبہ کسی قدر بے جا ہے ہر شاعر کی ایک انفرادیت ہوتی ہے خدا معلوم عبدالباری صاحب کیوں فراقؔ کی شخصیت کا گلا گھونٹنے اور ان کی انفرادیت کا خون کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

"یادوں کی بارات" ایک مربوط مضمون ہے۔ جو جوشؔ کی نثر نگاری سے بحث کرتا ہے اس میں جوشؔ کی ادیبانہ حیثیت پر متوازن انداز میں تبصرہ ملتا ہے۔ عزیز اندوری نے احسان اور ان کے تصور انقلاب پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف کی شاعری کے پس منظر کو بڑے فنکارانہ پیرائے میں ابھارا ہے۔ ان کے خیالات و نظریات میں خاصی جان ہے۔ اشعار کا انتخاب بھی قابل داد ہے۔

ڈاکٹر روشن اخترؔ نے خنداںؔ کی نظم کا خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔ واقعی خنداںؔ نے اس نظم میں ہندو تہذیب کے عناصر کو دلاویزی کے ساتھ سمویا ہے۔ "میرؔ اور اجتماعی شعور" ایک مختصر اور ہلکا پھلکا مضمون ہے جس کے ذریعہ انجم عثمانی نے میرؔ کو اپنے دور اور ماحول سے باخبر شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے یہ الگ بات ہے کہ ان کے بیشتر کلام پر داخلی رنگ کا غلاف چڑھا نظر آتا ہے۔

سالکؔ کے اردو پر کہے گئے اشعار میں شعلوں کی لپک بھی ہے اور غنچوں کی مہک بھی، جذبات کی گرمی، احساسات کی شدت، طرز ادا کی رعنائی و زیبائی۔ کیا ہے جو یہاں نہیں۔ زبان و بیان کا رچاؤ اور ذوق و شعور کا نکھار ان کے اشعار کی بقا کا ضامن ہے۔

تسنیمؔ فاروقی کی غزل کی فضا عام غزلوں کی فضا سے متمیز ہے۔ احساس کی تازگی، اور آہنگ کی ندرت اس کی خصوصیت ہے لیکن ارباب ذوق جس تشنگی کی تلاش میں رہتے ہیں وہ ان کے یہاں خال خال نظر آتی ہے۔ بزمیؔ ٹونکی کی غزل کا پہلا شعر ہی دامن دل کھینچ لیتا ہے۔ ہر شعر انتخاب کا حکم رکھتا ہے ان کی طبیعت میں سوز و گداز بھی ہے اور وہ ما فی الضمیر کو حسن و خوبی سے ادا کرنے کا گر بھی جانتے ہیں۔ مہر جے پوری کی غزل میں زندہ رہنے والے شعر ہیں مگر ان کا مطلع کوئی خوشگوار تاثر نہیں چھوڑتا اس کو پڑھ کر ذہن معاً غالبؔ کے اس شعر کی جانب منتقل ہو جاتا ہے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

احمد رئیس کے اشعار میں اسلوب کا اچھوتا پن ملتا ہے۔ مگر مصرعہ اڑتے پتوں کی طرح جابجا ہو گئی ہیں سمجھا دوں: خارج از وزن ہے۔ یوسف ثانی کی غزل بھی بے کیف نہیں۔ لیکن وقت ہے ثانی بڑا ہی طوطا چشم" میں طوطا کا الف گر رہا ہے۔ راشد جمال کی غزل کے دو شعر پسند آئے لیکن وہ مطلع میں بری طرح لٹک کر رہ گئے ہیں۔ ظفر ہاشمی کے یہاں سوچ کے نئے افق ابھرتے نظر آتے ہیں۔ سلیم و آصف فرقانی کے قطعات بھی ٹھیک ہیں۔ راز اناوی کی غزل کوئی خاص کشش نہیں رکھتی۔ اظہار مسرت کا قطعہ فکر کی توانائی اور طرزِ اظہار کی برنائی سے ہمکنار ہے۔ شاہد آمیر نئی راہوں اور نئی منزلوں کے مسافر ہیں۔ ڈاکٹر فضل امام کی بلند پروازی مسلم ہے بعض اشعار سوز و گداز کا لاوا اگلتے ہیں اور مقطع فنی بصیرت کا غماز ہے۔ ندیم القادری کی غزل پختہ کاری کا منجھا ہوا نمونہ ہے۔ رئیس علی گڑھی کی غزل جدیدیت کی ترجمان ہے۔ جمیل قریشی کی غزل بھی ان کے فن کے شباب کا پتہ دیتی ہے۔ واحد برہمی کی غزل بے کیف سی ہو کر رہ گئی ہے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ ذاتی غور و فکر سے کام لیں اور اساتذہ کے کلیات کی طرف رخ نہ کریں۔

## خوش نصیب خاں ٹونکی

محترمی! تسلیمات

اگرچہ نخلستان کا مستقل خریدار نہیں ہوں پھر بھی کہیں سے شمارہ حاصل کر کے مطالعہ ضرور کر لیتا ہوں۔ ہر شمارہ کے مطالعہ کے بعد تعریف و توصیف میں نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس پر خود بخود کچھ تحریر ابھر آتی ہے جسے ہر بار آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا ارادہ کرتا ہوں لیکن بے ادبی کے خیال سے ڈرتا ہوں لیکن شمارہ جنوری تا مارچ سب ہی شماروں سے زیادہ دلنشیں لگا۔ جس میں جدید محقق اور دانشوروں سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ اس کے سابقہ شماروں میں بھی بہترین نقادوں، محققوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں سے ملاقات ہوتی رہی ہے ان سب باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ راجستھان کے علم و ادب کے گہوارے میں بہت سے ادبا اور شعرا ایسے ہیں جو غیر معروف ہیں جنھیں منظر عام پر آنا چاہیئے اور نخلستان کسی حد تک یہ خدمت انجام دے رہا ہے۔

"حسن نظر" دیکھ کر محسوس ہوا کہ نخلستان کے قارئین نثری مضامین اور نظموں کا مطالعہ بھی توجہ کرتے اور اپنے تاثرات کا اظہار بھی فرماتے ہیں۔ قارئین کے تنقیدی خطوط کسی بھی رسالے کے معیار کو پرکھنے

ہیں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ آپ کا یہ عمل قابلِ ستائش ہے۔

ڈاکٹر محمد علی زیدی صاحب کی پیشکش ان کے اعلیٰ خیالات کی ترجمان ہے۔ اور پیغمبر آخرالزماں اور فلاحِ نوعِ انساں" نہایت ہی دلکش اور قابلِ احترام مضمون ہے۔

پروفیسر محمد حسن صاحب نے "جمالیاتی لمحوں کا شاعر" میں جوش کی شاعری میں لمحات کے عرفان کا عظیم کارنامہ پیش کیا ہے موصوف نے جوش کی بیانیہ شاعری میں اس نئی لہر کی نشاندہی فرمائی ہے جس میں جوش، انسانیت کے صدیوں کے تہذیبی سرمائے کا نچوڑ لمحوں میں پیش کر دیتے ہیں اس کے باوجود جوش کے متعلق مختلف نقادوں نے اپنے نظریات عام کئے ہیں جو اب بھی زیرِ بحث ہیں ان میں سے کچھ نظریات کی وضاحت سید مدبر علی زیدی صاحب نے اپنے مضمون "جوش کی شاعری کا فنی و فکری تجزیہ" میں فرماتی ہے۔

" ہم نے فراق کو دیکھا تھا" میں محترمہ سیدہ شان معراج نے فراق کو غزل گو کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ انھوں نے فراق کے کلام میں عشق اور عورت کے تصور کو جسمانی و روحانی امتزاج کا ترجمان بتایا ہے سیدہ صاحبہ کا حسنِ عقیدت کے ساتھ فراق کی شخصیت کو پرکھنا محض جذباتی نہیں بلکہ حقیقت سے قریب ہے کیونکہ فراق وہ پہلے عظیم شاعر ہیں جنھوں نے قدیم آریائی تہذیب کے نقوش ابھارے ہیں اور جنس کے موضوع کو عبادت کا درجہ عطا کیا ہے اس جنس سے زیادہ، روحانی کیفیت کا سرور ان کی بیشتر جمالیاتی غزلوں اور رباعیوں میں پایا جاتا ہے

عزیز اللہ شیرانی صاحب کا مضمون " راجستھان کا ادبی شہر ٹونک" شعر و ادب کی خدمات کا ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں عہدِ نواب امیرالدولہ سے موجودہ دور تک کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے یہ ایک بہت ہی اہم اور قابلِ قدر کارنامہ ہے ادب کے طلبہ جو راجستھان میں دنیائے شعر و ادب پر ریسرچ کر رہے ہیں ان کے لئے یہ مضمون ایک روشن مشعل کی مانند ہے جس کی رہنمائی میں وہ یقیناً مستفید ہوں گے۔

افسانہ " درد کا مداوا " کوئی خاص دلچسپ نہیں۔ جگہ جگہ جملوں کی بے ربطی اکھرتی ہے لیکن اپنے مقصد تک پہنچنے کیلئے مصنف ترتیب کا لحاظ رکھتا تو یقیناً یہ ایک بہت ہی اچھا افسانہ ثابت ہوتا۔!

تمت

راجستھان اُردو اکیڈمی کا جریدہ

سہ ماہی

# نخلستان

اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء

جلد :۔ ۴ —————— شمارہ :۔ ۳

ڈاکٹر سید محمد علی زیدی (نگراں)
(چیرمین اکیڈمی)

## مجلسِ ادارت

ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی — مدیر اعلیٰ
سید منظور الحسن برکاتی — مدیران
محمد یوسف عزیز بیکانیری


—— ناشر ——

راجستھان اُردو اکیڈمی
بی۔ ۲۰ سبھاش مارگ۔ سی اسکیم
جے پور ۳۰۲۰۰۱

سکریٹری راجستھان اردو اکیڈمی پرنٹر پبلشر نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر راجستھان اردو اکیڈمی جے پور ۳۰۲۰۰۱ سے شائع کیا

سہ ماہی

# نخلستان

قیمت ——— فی پرچہ ——— تین روپے

زرِ سالانہ ——— دس روپے

ترسیلِ زر و مراسلت کا پتہ

## دفتر راجستھان اردو اکیڈمی

جے۔۳ سبھاش مارگ۔ سی اسکیم

جے پور ۳۰۲۰۰۱

# ترتیب

# ترتیب

## نعت۔ غزلیات۔ منظومات

# گوشۂ نگراں

**نخلستان** کا تازہ شمارہ سالِ نو کی مبارکباد کے ساتھ قارئین کی نذر ہے۔

ادبی حلقوں میں نخلستان کی جو پذیرائی ہوئی ہے اور جو تعریفی و توصیفی خطوط موصول ہوئے ہیں ان سے ہماری ہمت افزائی ہی نہیں ہوئی بلکہ عزم و حوصلے کو بھی تقویت ملی ہے۔ میری اپیل نے پرستارانِ ادب کو اس جانب متوجہ کیا ہے اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ بعض حضرات نے نخلستان کے خریدار بنانے کی مہم کا آغاز کر دیا ہے ان میں سے عزیز شاگرد حبیب الرحمان نیازی صاحب لیکچرار گورنمنٹ کالج سوائی مادھو پور کا نام قابلِ ذکر ہے جنہوں نے سترہ خریدار بنائے اور اس تعداد میں اضافہ کرنے میں کوشاں ہیں میں بارہا تحریر کر چکا ہوں کہ نخلستان کے خریدار بڑھانے سے میرا مقصد نہ اس مالی خسارہ کو پورا کرنا ہے جو اس کی اشاعت میں ہوتا ہے نہ اس کی مقبولیت کا اندازہ کرنا ہے بلکہ ہماری خواہش ہے کہ اجمیر سے نکلنے والا یہ واحد جریدہ زیادہ سے زیادہ حضرات کے ہاتھوں میں پہنچے۔ وہ اس سے استفادہ کریں۔ یہاں کی علمی و ادبی کارگزاریوں سے واقف رہیں اور ہم یہ فخر سے کہہ سکیں کہ نخلستان اس قدر تشنہ کامانِ ادب کی سیرابی کا سامان مہیا کر رہا ہے۔ جس دن نخلستان کی اشاعت ایک ہزار ہو گئی میں اسے ماہانہ کر دوں گا۔

۲۹ نومبر ۱۹۸۳ء کو دردرگاہ میں راجستھان اردو اکیڈمی نے راجستھان وقف بورڈ اور کل ہند سمپردائک ورودھی تنظیم جس کے جنرل سکریٹری سعید حسین صاحب ہیں کے اشتراکِ عمل سے قومی یکجہتی پر ایک عظیم جلسہ کا انعقاد کیا تھا۔ اس جلسہ کی صدارت عالی جناب احمد بخش سندھی صاحب وزیر لسانیاتی اقلیات، اوقاف اور قانون نے کی۔ اور عزت مآب شیو چرن ماتھر صاحب

وزیر اعلیٰ راجستھان اور آنریبل جسٹس بی کے بنرجی عدالت عالیہ راجستھان کے صدر نشین (چیف جسٹس) مہمانِ خصوصی تھے۔ راقم الحروف نے مہمانانِ گرامی قدر اور صدر محترم اور دیگر معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے راجستھان میں اردو کے مسائل کی جانب محترم وزیر اعلیٰ کی توجہ مبذول کرائی۔ راجستھان میں اردو کے طلبا، طالبات، اساتذہ وغیرہ کی مشکلات بعض مقامات پر ثانوی درجات میں اردو تعلیم کا انتظام نہ ہونا۔ اردو کی تعلیم حاصل کرنے والوں کی روبہ زوال تعداد راجستھان اردو اکیڈمی کی امداد میں اضافہ وغیرہ۔ یہ حقیقت ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ہمارے ہر دلعزیز وزیر اعلیٰ اردو کے فروغ کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں انہوں نے اس وقت بھی اعانت کی جب وہ برسرِ اقتدار نہیں تھے۔ فرقہ پرستی کے وہ سخت دشمن ہیں۔ باہمی اتحاد و یگانگت کے علمبردار ہیں۔ ماتھر صاحب نے اس جلسہ میں اردو سے متعلق چند اعلانات کئے جن اسکولوں میں آٹھویں درجہ تک اردو کی تعلیم دی جاتی ہے ان میں آگے کے درجات میں اردو کی تعلیم کا انتظام کر دیا جائے گا۔ اب تک نویں درجہ میں اردو کی تعلیم کا اجراء کرانے میں بہت دقت پیش آتی تھی۔ اور اکثر اجازت حاصل کرنے میں کئی سال لگ جاتے تھے) اقلیتی زبانوں کی تعلیم دینے کے لیے سو اساتذہ کا تقرر کیا جائے گا۔ جو طالبات بی اے میں اردو کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں انہیں ہر سال سو روپے ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ جو طلبہ اور طالبات اردو میں ایم اے میں زیر تعلیم ہیں اگر انہوں نے بی اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا ہے تو ڈیڑھ سو روپے ماہانہ وظیفہ پانے کے مستحق ہوں گے اکیڈمی کی ایک لاکھ روپے کی مزید امداد کا بھی اعلان کیا تاکہ راجستھان میں اردو زبان و ادب کو فروغ حاصل ہو۔ عالی جناب احمد بخش سندھی صاحب نے اپنی بصیرت افروز اور جامع تقریر میں بالکل درست فرمایا تھا کہ آج تک کسی وزیر اعلیٰ نے اردو کے لئے ایسے اہم اعلانات نہیں کئے تھے بلکہ میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے کسی صوبے میں جہاں تک مجھے علم ہے طلبہ اور طالبات کو اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظائف نہیں دیئے جاتے ان کے علاوہ بھی اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے متعلق اعلانات کئے۔ ماتھر صاحب کے تدبر، عالی ظرفی اور وسیع النظری کی یہ اعلانات روشن مثال ہیں۔ جب سے راجستھان کی حکومت کے سربراہ ہوئے ہیں۔ ہمارا صوبہ راہ ترقی پر تیزی سے گامزن ہے میرا اپنا نخلستان ۔

فرض سمجھتا ہوں کہ وزیرِ اعلیٰ کے ان اہم اعلانات کے لئے اپنی جانب سے اور راجستھان اُردو اکیڈمی کی جانب سے اظہارِ تشکر کروں۔ جناب احمد بخش سندھی صاحب جو ہمیشہ اُردو زبان کے فروغ اور اقلیتوں کی بہبود کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ مجھے توی اُمید ہے کہ ان اعلانات کے پیشِ نظر اردو کی تعلیم کو اور اُردو زبان و ادب کو یقیناً فروغ حاصل ہوگا۔ اور اُردو دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گی۔

۶ دسمبر ۱۹۸۳ء کو راجستھان اُردو اکیڈمی کے زیرِ اہتمام مرکز اطلاعات عامہ جے پور کے وسیع ہال میں ایک جلسہ کا انعقاد کیا گیا جس میں اُردو کے مشہور و معروف ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ صدر شعبۂ اُردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے "جوش اور ہندوستان کی تحریکِ آزادی" کے عنوان پر ایک جامع اور مبسوط مقالہ پیش کیا۔ شرکائے بزم نے نارنگ صاحب کا مقالہ بہت پسند کیا اور بعض حضرات نے سوالات بھی کئے جن کے پروفیسر موصوف نے تسلی بخش جوابات دیئے۔ راقم الحروف نے صدرِ جلسہ کی حیثیت میں معزز مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے سامعین سے اُن کا مختصراً تعارف کرایا اور اُن کی ادبی خدمات اور موضوعِ مقالہ پر روشنی ڈالی۔ اختتامِ جلسہ وائس چیرمین جناب کیم چند ماتھر کے اظہارِ تشکر اور بحث و تمحیث پُر مغز اظہارِ خیال کے بعد ہوا۔

اس سہ ماہی میں کئی اسکولوں کے ابتدائی درجات کے بچوں کو کئی سو اُردو کی کتابیں راجستھان اُردو اکیڈمی کی جانب سے بطورِ عطیہ دی جاچکی ہیں۔ مسلم گرلز ہائر سیکنڈری اسکول جے پور کی لائبریری کے لئے تقریباً روپے کی نصابی و ادبی کتابیں خرید کر کے بطورِ عطیہ دی جاچکی ہیں۔

اُردو کی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے اور بھی کئی منصوبے بنائے گئے ہیں مثلاً تحتانی، وسطی اور فوقانی سطح پر جن اساتذہ کے نتائج قابلِ ستائش رہے ہیں۔ انہیں اکیڈمی کی جانب سے انعامات دیئے جائیں۔ یا جن اسکولوں میں گذشتہ تین سالوں میں اُردو کے طلبہ اور طالبات کی تعداد میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہو۔ اُن اسکولوں کے صدر مدرسوں اور اُردو کے معلمین کو انعامات دیئے جائیں۔

کتابوں کی اشاعت کے لیے مصنفین کو مالی امداد دینے کی مد میں اضافہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ چند مسودے موصول بھی ہو چکے ہیں۔ کتابوں پر انعامات کا بھی جلد ہی اعلان ہونے والا ہے۔

اکیڈمی نے شعراء و ادبا کے معالجے میں امداد کے لئے جو رقم مختص کی تھی وہ بھی تقریباً دی جا چکی ہے۔ تین شاعروں کو علاج کے لیے مختلف رقوم دی گئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اکیڈمی کے سکریٹری کے عہدے پر کسی کا تقرر ہو جاتا تو کارکردگی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی۔ اور زیادہ تندہی سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرسکتا۔

۱۹۸۳ء پرستارانِ اردو کو ختم ہوتے ہوتے بھی ایک دوامی صدمہ دے گیا۔ میری مراد پروفیسر کلیم الدین احمد کے سانحۂ ارتحال سے ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد افقِ تنقید پر ایک دم طلوع ہوئے۔ وہ انگریزی کے پروفیسر تھے اور اردو ادب پر عمیق نظر رکھتے تھے۔ مغربی تنقیدی اصولوں کی روشنی میں انھوں نے اردو ادب پر تلخ و تند تنقید کی۔ مثلاً اردو غزل وحشی صنفِ سخن ہے۔ حالی اعلیٰ تنقیدی صلاحیت رکھتے تھے لیکن انگریزی ادب سے ناواقفیت کی وجہ سے ان کا دماغ اوسط درجے کا تھا۔ میر درد، سودا، غالب اور مومن کے لئے بھی انھوں نے اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا۔ اقبال کی کئی مقبول و مشہور نظموں پر بھی جارحانہ تنقید کی لیکن اردو غزل کی مذمت نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ اردو کے تقریباً تمام ناقدین جن میں کچھ ناپختہ ذہن انگریزی ادب سے قطعی ناواقف اور سطحی معلومات رکھنے والے بھی شامل ہو گئے تھے۔ کلیم الدین مرحوم کے ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئے۔ حالانکہ غزل کی شان میں گستاخی اور حضرات بھی کر چکے تھے۔ یہاں تک کہ اُسے گردن زدنی قرار دے دیا تھا۔ لیکن کلیم الدین مرحوم کو ہر طرف سے ہدفِ ملامت بننا پڑا اور یہ شور اس قدر بڑھا کہ اس ہنگامے میں کچھ سستی شہرت کے خواہاں ناقد بن بیٹھے اور کلیم الدین کا نام تو اردو کے صفِ اوّل کے ناقدین میں آ ہی گیا۔ آج اردو کا کوئی بھی طالب علم کلیم الدین احمد سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔ مرحوم سے مغرب زدگی کی وجہ سے کچھ لغزشیں بھی ہوئیں ان کے معترضین بھی ان کی علمی اور تنقیدی صلاحیت کے قائل ہیں۔ انھوں نے تنقید میں جارحانہ انداز بھی اختیار

کیا۔ اور ادب میں بت شکنی بھی کی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے ایک نئی راہ کی نشاندہی کی، اردو ادب میں "اردو تنقید پر ایک نظر، سخن ہائے گفتنی، اردو میں فن داستان گوئی اور عملی تنقید جیسی گراں قدر تصانیف کا اضافہ بھی کیا۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کی وفات اردو ادب کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

حمد، نعت اور منقبت اردو ادب کے اہم جزو ہیں۔ گزشتہ قمری مہینہ سرورِ کائنات فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ولادت باسعادت کا تھا۔ اس لئے بارگاہِ رسالت میں عقیدت کے پھول نذر کرنے کی سعادت بھی حاصل کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا ہر پہلو اور ہر گوشہ سبق آموز ہے۔ ہر دور میں اس کی اہمیت رہی ہے اور قیامت تک اس کی عظمت اور اہمیت وہی رہے گی جو حضور کی حیات پاک میں تھی۔ میں نے سیرت پاک پر مقالوں اور نعتیہ کلام کو سب پر ترجیح اور فوقیت دی ہے۔ اسی وجہ سے بعض گراں قدر مقالے انشائیے، اور منظومات اس شمارے میں جگہ نہیں پا سکے۔ میں ان سب حضرات سے معذرت خواہ ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگلے شمارے میں اس کی تلافی کر دی جائے گی۔

میں نخلستان کے ذریعہ قارئین تک ان کے وسیلے سے دیگر حضرات تک یہ پیغام پہنچانا چاہتا ہوں کہ ہم خدمت گزارانِ اردو، اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے اپنے باہمی اختلافات طاقِ نسیاں پر رکھ کر متحد ہو کے کوشش کریں۔ یہ وقت عمل کا ہے لفظی ہنگامہ آرائی کا نہیں۔ میں اربابِ حکومت سے اکثر اردو کے فروغ و ترقی کے سلسلہ میں ملاقاتیں کرتا رہتا ہوں اور میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ حکومت اردو زبان کو اس کا جائز حق دینے کی خواہش مند ہے۔ اس کی ترقی کی خواہاں ہے۔ راجستھان اردو اکیڈمی کو اردو کی تعلیم کے سلسلہ میں جو شکایات موصول ہوئی ہیں انہیں بلا تاخیر متعلقہ حکام تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور بحمد للہ ان کا تدارک بھی ہو جاتا ہے۔ اردو کے فروغ کے لئے راجستھان اردو اکیڈمی کا تعاون ہر فرد اور ہر انجمن کو حاصل کرے گا میں اس کا یقین دلاتا ہوں۔

محمد علی زیدی
نگراں

# آخری نبی کریم پیکرِ خلقِ عظیم

ڈاکٹر محمد علی زیدی

ضابطۂ اخلاق کا نام مذہب ہے اور اصول و ضوابطِ اخلاق سے انحراف کا نام کفر۔ اسی لیے ہر مذہبِ حق نے اپنا اپنا ضابطۂ اخلاق اپنے ماننے والوں کے لئے لازمی قرار دیا۔ ان میں نوعیت اور درجات کا فرق ہو سکتا ہے لیکن مقصد اور بنیاد تقریباً مشترک ہے جس قدر ضابطۂ اخلاق مکمل ہوگا اسی قدر اس کی گرفت مکمل ہوگی۔ کیوں کہ اس کا مقصد روح و عمل کی پاکیزگی پیدا کرنے اور بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر زندگی بسر کرنے کے طریقے کی تعلیم دینا ہے۔ انسان اس وجہ سے اشرف المخلوقات ہے کہ اسے قدرت نے عقل و تمیز عطا کیا۔ نیک و بد، خیر و شر، برائی اور بھلائی میں فرق کرنے کی صلاحیت عطا کی۔ اور پستی و بلندی کا امتیاز بخشا، بنی نوعِ انسان میں آپس میں روابط پیدا کئے اور ان مختلف النوع رشتوں کی نوعیت سمجھنے کی صلاحیت عطا کی، انسان کا انسان سے رشتہ، انسان کا اپنے قرابت داروں سے رشتہ، اپنے ہمسایوں سے رشتہ، اپنے اہلِ وطن سے رشتہ، اپنے معلم سے رشتہ اور اپنے پیدا کرنے والے سے رشتہ، حاکم کا محکوم سے اور محکوم کا حاکم سے رشتہ، ان رشتوں کی بہت سی اقسام ہیں اور ان میں سے کوئی بھی رشتہ ایسا نہیں ہے جسے نظر انداز کیا جا سکے۔ اس لیے ضابطۂ اخلاق بھی ایسا ہو جو انسان کی داخلی، خارجی، مخفی، ظاہری، سماجی، عملی، تہذیبی، سیاسی، مدنی غرض پوری زندگی پر محیط ہو حتیٰ کہ اپنے سے ارذل اور پست مخلوقات سے بھی اس کا کیا رشتہ ہو۔ اس کی تعلیم بھی دی جائے ورنہ جذبہ پرستش غلط راہوں پر چل کے گمراہی کا باعث بن سکتا ہے اور ایسا بھی ہوا ہے۔ کبھی اس نے

اس جذبہ سے مغلوب ہوکر جانوروں اور درختوں کی پرستش کی اور کبھی اپنے ہی تراشے ہوئے بتوں کی کی پوجا کی، کبھی آگ کو اپنا معبود بنایا تو کبھی سورج کو، کبھی موجیں مارتے ہوئے دریاؤں کے پانی کی پرستش کی تو کبھی اپنی ہی جنس کے سامنے سجدہ ریزی کرنے لگا۔ اس کی بے بصری اس کو پستی کی طرف لے جاتی رہی۔ مائل بزوال اشیاء کے سامنے اس کی جبین نیاز جھکتی رہی۔ اصل کو چھوڑ کے سائے کا تعاقب کرتا رہا، خالق کو چھوڑ کے مخلوق کی عبودیت کا دم بھرتا رہا۔ وحدت کو نظر انداز کرکے کثرت سے رشتہ جوڑتا رہا، نتیجہ یہ ہوا کہ عقبیٰ بھی بگڑ گئی اور دنیا بھی ہاتھ نہ آئی تمام رشتوں کو بھلا بیٹھا۔ مائیں میراث پدر بن گئیں، بیٹیاں، باعث ننگ بشر بن گئیں حرام و حلال کی تمیز نہ رہی، نشہ میں مخمور رہنے لگا، تمام رشتے بھلا بیٹھا۔ کوئی قید رہی نہ کوئی بندش نہ کوئی ضابطۂ اخلاق رہا، منصفانہ سماجی نظام قائم ہونے کا امکان نہ رہا۔ ضابطۂ اخلاق ایک ایسا سلسلہ ہے جس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے جڑی ہوئی ہے جس طرح ایک برائی دوسری برائی کو جنم دیتی ہے اسی طرح ایک بداخلاقی دوسری بداخلاقی کا باعث بنتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص محض کاذب ہو اور اس میں دوسری اخلاقی برائیاں نہ ہوں۔ یا محض خائن ہو اور دوسرے اخلاقی عیوب سے پاک ہو، یا محض مے خوار ہو اور دوسرا کوئی عیب اس میں نہ ہو یا محض عیاش ہو اور نیک سیرت بھی ہو۔ جس طرح دماغ کی صحت کے لئے تن کی درستی لازمی ہے اسی طرح روح کی صحت کے لئے نفس کی پاکیزگی اور برائیوں سے اجتناب ضروری ہے مذہب تہذیب نفس کرتا ہے یہ محض عبد کا معبود سے رشتہ ہی نہیں جوڑتا بلکہ آدمی کو وحشی سے سے انسان اور انسان سے فرشتہ بناتا ہے۔ اس میں وہ اخلاقی جوہر پیدا کرتا ہے کہ جو نفس کی طہارت و پاکیزگی کا باعث بنتا ہے۔ یہ زندگی کے ہر داخلی اور خارجی پہلو کو متاثر کرکے ایک ایسے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ کہ جس سے شعور و ضمیر کی بصیرت پیدا ہوتی ہے جس سے عرفان نفس ہوتا ہے۔ اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے" انا عبد ذلیل و انت رب جلیل" اس عظیم و مہتم بالشان تعلیم کے لئے، ایسی عظیم ہستی اور ایسے ہادی برحق کی ضرورت تھی جو الوہی صفات رکھتے ہوئے پیکر بشریت بھی ہو۔ جو اخلاق کی تعلیم بھی دے اور عمل کرکے بھی بتائے جو اصول بھی بتائے اور

اُسے عملی تجربہ گاہ میں صحیح ثابت کر کے بھی دکھائے جو یہ بھی کہے کہ میں تم جیسا ہی بشر ہوں۔
اور یہ بھی فرمائے کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے جو انسانی پیکر ہو مگر اس کا سایہ نہ ہو۔ جو امین ہو تو ایسا کہ کافر اور مشرک بھی اس کی ایمانداری کا دم بھرتے ہوں اور "الامین" کے خطاب سے پکاریں جو سچا ہو تو ایسا کہ اپنے اور پرائے اس کی سچائی کا لوہا مانتے ہوئے "الصادق" کہیں جو عبادت گذار ہو تو ایسا کہ معبود خود کہے کہ "اے میرے چادر لپیٹنے والے رات کو نماز کے لیے کھڑا ہو مگر پوری رات نہیں تھوڑی رات" جو دوزخ سے ڈرائے اور جنت کی بشارت دے جو روشن چراغ ہو اور کفر کی ظلمت کو نیست و نابود کر دے، جو ہادی ہو، مصلح ہو، راہ نما ہو اور معلم اخلاق ہو جس کی حق گوئی و بے باکی کا یہ عالم ہو کہ۔
اگر اسے حق گوئی سے باز رکھنے کے لیے بڑے سے بڑا لالچ دیا جائے تو وہ یہ جواب دے کہ "اگر تم میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دو تو بھی میں کلمۂ حق کہنا بند نہیں کروں گا۔" مشرکین پتھروں کی بوچھار کریں، غلاظتیں ڈالیں، ہر طرح کی اذیتیں دیں لیکن اُس کی زبانِ مبارک پر ایک ہی کلمہ ہو۔ "قولو الا الٰہ الا اللہ تفلحوا" کہو کہ نہیں ہے کوئی اللہ سوائے ایک اللہ کے اور فلاح پاؤ۔ اخلاق ہو تو ایسا کہ خالقِ اخلاق خود کہے کہ "اے رسول میں نے تمہیں خلق عظیم پر فائز کیا،" جس کی حیات طیبہ کا ہر لمحہ سبق آموز ہو۔ جو صبر و تحمل کا پیکر ہو۔ اگر سنگباری سے لہولہان ہو جائے تو بھی صبر و تحمل کے وہ جوہر دکھائے کہ جو انسانی طاقت سے باہر ہو۔ ایذا رسانوں کے حق میں بجائے بد دعا کرنے کے دعائے خیر کرے۔ عفو و درگذر کرنے والا ایسا ہو کہ اگر فاتح کی حیثیت سے مفتوح شہر میں داخل ہو تو عام معافی کا اعلان کرا دے۔ اپنے سب سے بڑے دشمن کے گھر کو دارالامان قرار دے۔ اگر حکومت کرے تو اس شان سے کہ حاکم و محکوم کا فرق مٹا دے حاکم بوریا نشین ہو، خود فاقے کرے لیکن محکوم کو ننگا بھوکا نہ رہنے دے۔ شفقت ہو تو ایسی کہ حضرت زید جیسے آزاد کردہ غلام ماں باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیں۔ اور آقا کے قدموں کو نہ چھوڑیں عالم ہو تو ایسا کہ علم کا شہر ہو جس کو رحمان نے تعلیم دی ہو۔ عالم حقیقی نے پڑھایا ہو اور جس کا شاگرد رشید "سلونی" کا دعویٰ کرے جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ دنیا میں بڑے بڑے عالم

ہوئے ہیں۔ جن کی علمیت کا لوہا آج بھی مانا جاتا ہے۔ لیکن سوائے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شاگردِ رشید تھے کسی نے از آدم تا ایں دم یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو کچھ پوچھنا ہو مجھ سے پوچھ لو۔ وہ ذات پاک جو یہ سبق دے کہ عالم باعمل کی سیاہی کا قطرہ خونِ شہید کے قطرے سے زیادہ گراں قدر ہے۔ وہ عظیم ہادی جو رہبانیت و فنا کی تعلیم نہ دے بلکہ تزکیہ نفس و پاکیزگیٔ روح کی تعلیم دے جو ضعیفوں کو کردار و اخلاق کی قوت سے طاقت ور بنا دے جو ماؤں بہنوں بیٹیوں کے پاکیزہ رشتوں کا احترام کرنا سکھائے۔ جو عورت کو جس کا درجہ جنس بازار سے زیادہ نہ تھا۔ مردوں کی ہمسری عطا کرے اور وراثت میں شریک بنائے جو اُم الخبائث یعنی شراب کو اس طرح ترک کرائے کہ عادی قدح خوار چشم زدن میں تائب ہو جائیں اور زندگی بھر منہ نہ لگائیں جو متکبروں کو منکسر مزاج، مغروروں کو خاک نشین لٹیروں کو محافظ، دروغ گویوں کو صدق گو، خود غرضوں کو بے لوث، مردم آزاروں کو رحم دل، سنگ دلوں کو رقیق القلب، جنگ جوؤں کو صلح جو، بداخلاقوں کو با اخلاق، گمراہوں کو راہ نما، اور کثرت پرستوں کو وحدت پرست بنا دے۔

معبودِ حقیقی کی رحمت جوش میں آئی۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی دعا قبول ہوئی۔ حضرت عیسیٰ کی پیش گوئی کے سچ ثابت ہونے کا وقت آگیا، انبیاء و مرسلین جس کی آمد کی خبر دیتے آرہے تھے اس کے ظہور کا وقت آگیا صدفِ آمنہ سے وہ دُرِ یتیم برآمد ہوا جس کا انسانیت کو انتظار تھا۔ جو قدرت کا شاہکار تھا جس کے انتظار میں ریگزارِ عرب کے بگولے اُٹھ اُٹھ کے راہ دیکھ رہے تھے۔ غارِ حرا چشم انتظار وا کئے ہوئے تھا۔ مکہ معظمہ کی پہاڑیاں تعظیم کے لئے کھڑی ہوئی تھیں ماہِ کامل جس کی جدائی کا داغ لئے سرگرداں تھا۔ یتیم عبداللہ آگیا، مادرِ گیتی پھولی نہیں سماتی تھی۔ نسیمِ سحر پیشوائی کو بڑھی، کلیوں نے چٹک کے نغمہ تہنیت گایا۔ پھول خوشی سے کھل اٹھے۔ درخت مستانہ وار جھومنے لگے۔ تاروں میں چمک آگئی، گلوں میں مہک آگئی۔ شاخوں میں لچک آگئی۔ باغِ معرفت میں بہار آگئی۔ مومنین کے سردار آگئے، انبیاء و مرسلین کے پیشوا آگئے، شفیعِ روزِ جزا آگئے۔ حضرت محمد مصطفیٰ آگئے۔ حبیبِ خدا آگئے۔

جو عظیم ہستی جو خداوند قدوس کی نشانیاں لے کے آیا، عبد اور معبود کے درمیان وسیلہ

اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء

بن کے آیا۔ عروجِ انسانیت کی آخری بلندیوں کی نشاں دہی کرنے آیا۔ ملکوتی صفات سے متصف ہو کے آیا۔ خدائے واحد کا پرتو بن کے آیا۔ وہ محمود یہ محمد، وہ شریک یہ لاجواب، وہ بے مثل یہ بے مثال، وہ خالقِ عالمین یہ رحمت اللعالمین، وہ نورِ حقیقی یہ نورِ مجسم، وہ حق یہ حق نما، وہ خالقِ بشر یہ سید البشر، وہ مالکِ روزِ جزا یہ شفیعِ روزِ جزا، وہ محبوبِ حقیقی یہ محبوب کا حبیب، وہ خالقِ کون و مکاں یہ امامِ انس و جاں، وہ معبود یہ عبد، وہ خالق یہ مخلوق، وہ خدا یہ ناخدا، وہ اللہ یہ آیت اللہ

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎ رُخِ مصطفےٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

وہ عظیم ترین ہادی کہ جس نے مہد سے لحد تک کے ضابطۂ حیات کی تعلیم دی۔ جس نے حرام سے بچنے اور حلال کو اختیار کرنے کا سبق دیا۔ جس نے ہمسایوں کے حقوق بتائے جس نے دل، دماغ اور زبان کی ہم آہنگی کا حکم دیا۔ جس نے آپس میں بھائی چارہ پیدا کرایا جس نے حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد ادا کرنے کی تعلیم دی۔ جس نے قلوب کی صفائی کا طریقہ بتایا۔ جس نے زندگی کا نصب العین بتایا جس نے بخل، تنگ دلی، خود غرضی، نفع اندوزی، سنگ دلی، سخت مزاجی، جہل و سفاہت، حرص و طمع، رشوت ستانی اور ذخیرہ اندوزی جیسی بُری خصلتوں کی مذمت کی اور ان کے بجائے سخاوت فراخدلی، بے غرضی، حاجت روائی، کارسازی، رحم دلی، تفکر و تعقل، بے ریائی، شفقت، اخوت، سیر چشمی، عدل و انصاف جیسے اوصافِ حمیدہ اور اعلاء خصائل اختیار کرنے کی تلقین کی حضورِ اکرم سرورِ کائنات کا خود عمل کرکے بتانا۔ آخری خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ حقیقتاً وہ روشن منارہ ہے جو قیامت تک مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ نیک و بالغ نظر انسان کی راہنمائی کرتا رہے گا۔ اسی خطبہ پر تکمیلِ دین اسلام مکمل ہوئی کیونکہ یہ مکمل ضابطۂ اخلاق کا درس تھا اسی دن خداوند عالم نے نعمت عطا کی اور ہمارے لئے دینِ اسلام پسند فرمایا آج پیروانِ اسلام کو ہی نہیں بلکہ دنیا کو اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے یہ تاجدارِ دو جہاں سید الثقلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری خطبہ نہیں بلکہ روحِ اسلام ہے۔ اس کا ہر ہر لفظ علم و حکمت کا خزانہ ہے، نیکیوں کا سرچشمہ ہے اور کامیاب زندگی بسر کرنے کا ضابطہ ہے۔ مکمل نظامِ حیات ہے۔ عظیم الشان درسِ اخلاق ہے۔ یہی وہ تعلیمات تھیں جنہوں نے دنیا میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ یہی وہ کلمات تھے جنہوں نے



تما ستان

ورقِ دل سے ہزاروں بتوں کے نشان مٹا کے نقشِ الا اللہ ہمیشہ کے لیے ثبت کر دیا جس نے دین کی کلید قفلِ دنیا کو کھولنے کا کامیاب طریقہ بتایا۔ اس عظیم ترین خطبہ کے چند اقتباسات یہ ہیں۔

"مسلمان وہ ہے کہ تمام مسلمان اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے کہ کسی بھی انسان کو اس سے جان و مال کا خطرہ نہ ہو۔"

"مہاجر وہ ہے جو تمام برائیوں کو ترک کر دے اور مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔" (مماسیر کردہ)

"اے لوگو سنو جہاد فی سبیل اللہ میں ایک شام اور ایک صبح چلنا بھی دنیا اور دنیا کی تمام دولتوں سے بڑھ کر ہے۔" دیکھو غیبت کر کے اپنے مردہ بھائی کا گوشت نہ کھاؤ۔

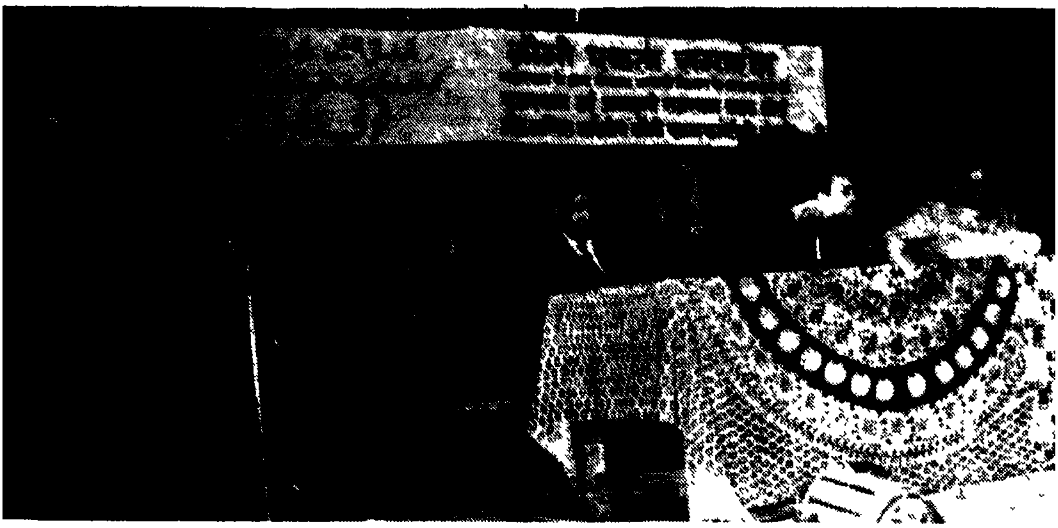
"اے لوگو! اپنی عورتوں پر تمہارا حق ہے اور ان کا حق تم پر ہے۔ تمہارا عورتوں پر یہ حق ہے کہ وہ تمہاری عزت و ناموس کی حفاظت کریں اور کوئی بدکاری عمل میں نہ لائیں۔ عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ تم خوش دلی سے ان کو کھانا کپڑا دو۔ دیکھو عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ وہ اللہ کی بندیاں ہیں۔ خدا نے تم کو ان پر فوقیت دی ہے۔ عورتوں کے معاملہ میں خوفِ خدا سے کام لو۔"

"خبردار ظلم نہ کرنا! خبردار ظلم نہ کرنا، خبردار ظلم نہ کرنا، کسی بھی شخص کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لینا روا نہیں جس کے پاس کسی کی امانت ہے۔ وہ احتیاط سے اس کی حفاظت کرے۔ اور اسے ادا کرے۔"

یہ وہ سنگ کارنامہ ہے جس پر عمل کر کے مسلمان ہی نہیں پوری نوعِ انسانی ظلم و ستم، خوں ریزی و بربریت سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ دورِ حاضر میں کہ جب پوری دنیا جوہری ہتھیاروں کے خوف سے لرزہ براندام ہے اور تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ جبکہ قومی و نسلی برتری اور سائنسی ترقی کے نام پر بے گناہوں کا خون پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے، جب کہ تنگ نظری و فرقہ پرستی کا زہر فضا کو مسموم کر رہا ہے۔ جب کہ ہوسِ اقتدار نے نیک و بد میں امتیاز کرنے کی

صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ جب خود غرضی کی وجہ سے ہر انسان، انسانوں کے لاتعداد ہجوم میں خود کو تنہا محسوس کر رہا ہے۔ ان اصولوں کی اہمیت کس قدر بڑھ جاتی ہے جن ضابطۂ اخلاق کی تعلیم اس عظیم ترین معلم اخلاق نے آج سے چودہ سو برس پہلے دی تھی۔ آج بھی ان کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی اس وقت تھی اور قیامت تک اتنی ہی رہے گی۔ مادر گیتی کتنی ہی گردشیں کر لے۔ زمانے میں کتنے ہی انقلابات آئیں، انسان ماہ و پروین پر کتنی ہی کمندیں ڈالے۔ سائنس کی کتنی ہی محیر العقول ایجادات کی جائیں، لیکن ان اصولوں کی اہمیت میں کمی نہیں آئے گی۔ یہ اصول اس عظیم ہستی کے وضع کردہ ہیں جو لوح تھا، قلم تھا، نور تھا۔ جوہر تھا۔ اور باعثِ تخلیق کائنات تھا۔ جس نے مٹی کے تودوں کو انسان اور انسان کو فرشتوں سے بالاتر بنا دیا۔ جس نے غبار راہ کو وادی سینا کا فروغ بخشا، جو نوح کا سفینہ تھا، موسیٰ کا جلوۂ طور سینا تھا۔ ابراہیم کے عرفان و یقین کی خاتم کا نگینہ تھا۔ اور دمِ عیسیٰ کا خزینہ تھا۔ جس کا مقام قاب قوسین ہے جس کا مرتبہ مجمع البحرین ہے۔ ہر صاحبِ ایمان کا دل جس کا مسکن ہے۔

سلام ہو ہمارا اس ہادئ برحق پر جس نے ہمیں گمرہی و ضلالت سے بچا کے نیک صراطِ مستقیم دکھایا۔ سلام ہو ہمارا اس محسنِ اعظم پر جس نے انسانیت کو سربلندی عطا فرمائی۔ سلام ہو ہمارا خدا کے اس حبیب پر جس نے عبد کو معبود سے ملایا۔ سلام ہو ہمارا اس پیغمبرِ آخر الزماں پر جس نے دولتِ ایمان سے ہماری جھولیوں کو بھر دیا۔ سلام ہو ہمارا اس مقدس و متبرک ہستی پر جو عالمین کے لئے رحمت بن کے آیا تھا۔ جو گنہگاروں کی شفاعت کا وسیلہ ہوگا۔



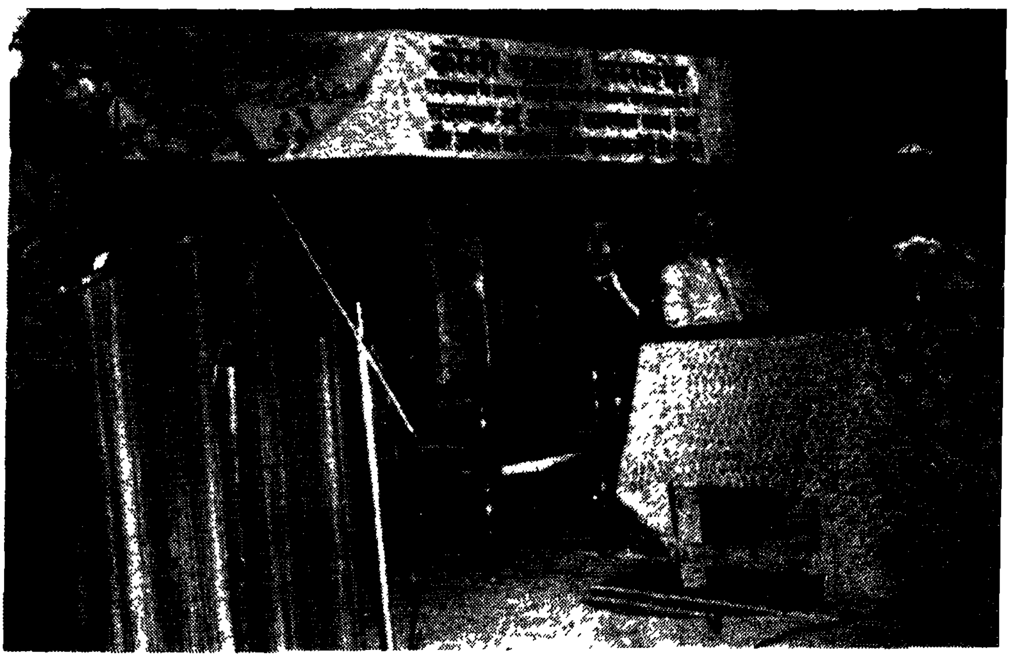
اکیڈمی کے جلسہ میں جناب ڈاکٹر محمد علی زیدی تقریر کرتے ہوئے اور (دائیں سے)
عالی جناب احمد حسن سدھی ویرداوں، عزت مآب شیو چرن ماتھر صاحب وزیر اعلیٰ
راجستھان عالیجناب جسٹس پی کے بنرجی چیف جسٹس راجستھان ہائی کورٹ اور جناب
مجلس سکریٹری ساہتیہ اکیڈمی دہلی




آنریبل جسٹس پی. کے. بنرجی چیف جسٹس راجستھان مہمان خصوصی شرکائے جلسہ کو
خطاب کرتے ہوئے.



عزت مآب شیوچرن ماتھر صاحب وزیر اعلیٰ راجستھان مہمان خصوصی اہل جلسہ سے خطاب
کرتے ہوئے۔ آپ نے اردو اور اقلیتوں سے متعلق کئی اہم اور تاریخی اعلانات کئے۔



عزت مآب احمد بخش سندھی وزیر قانون و اوقاف وغیرہ صدر جلسہ قومی یکجہتی پر تقریر کرتے ہوئے

سید محبوب الرحمٰن نیازی
میسرجی کا باغ جے پور

# خلق نبوی ؐ

آقائے نامدار حضور سرکار دو عالم صلعم نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ اسلام اور ایمان و اخلاق پر موقوف ہے۔" حضور نبی کریم صلعم کی سیرت پاک اور اخلاق کا بیان انسان کے بس سے باہر ہے۔ یہ وہ کام ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور وہی سب سے بہتر کرنے والا ہے۔ کلام الٰہی کا ایک مختصر جملہ "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیم" اخلاق نبی کریم کو مکمل طور پر بیان کر گیا ہے۔ جو کچھ بھی انسان کے عقل و فہم میں آسکا جس قدر بھی بیان کی قوت عطا کی گئی۔ حضور کی سیرت کے بارے میں تحقیق، علم محبت، شوق، جذبۂ ایمانی یا محض حق بیانی کے تحت ان چودہ سو برس میں جو کچھ کہا جا چکا ہے وہ اسی جملہ کی تفسیر کا کوئی پہلو ہوگا۔

حضور نبی کریم صلعم نے اسلام کو عین اخلاق بتایا ہے اور اعمال کی نسبت صاف صاف ارشاد ہے کہ اعمال میں سب سے بہتر نیک خلق ہے۔ اخلاق کی خوبی دین کی خوبی ہے اخلاق کا اچھا ہونا محبت الٰہی اور بد اخلاقی بغض الٰہی کی دلیل ہے۔" عبادت میں بھی آپ نے ہر موقع پر پاکیزگیٔ اخلاق کی نصیحت فرمائی ہے مثلاً "جس شخص کی نماز اس کو بے حیائی کی باتوں اور برے کاموں سے نہ روکے تو اس کی نماز سے سوائے خدا کی دوری کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ روزے میں جہاں کھانے پینے کی ممانعت ہے وہاں یہ بھی حکم ہے کہ جھوٹ، غیبت، چغلی نظر بد وغیرہ سے روزہ باطل ہو جاتا ہے" بہت سے روزے رکھنے والے ایسے ہیں کہ جن کو

سوائے بھوک پیاس کے اور کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔" "بہت سے شب بیدار ایسے ہیں کہ جن کو سوائے جاگنے کے کچھ نصیب نہیں ہوتا" غرض اعمال میں محض ظاہری شکل وصورت ہی کو پیش نظر نہیں رکھا گیا بلکہ ان کے اندرونی اثر کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اور سارے اخلاق اور تمام اعمال کی بناء نیت پر رکھی گئی ہے۔" انما الاعمالُ بالنیات" ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو آپ کو صاحبِ خُلقِ عظیم فرمایا ہے تو آپ نے بھی اس کی عملی تعلیم دی ہے۔

حضورؐ کے اخلاق میں سب سے نمایاں آپ کا صبر، حلم اور عفو ہے۔ آپ کی پوری حیاتِ مقدس اس کی آئینہ دار ہے۔ ہجرت سے پہلے آپ پر نماز کی حالت میں اونٹ کی اوجھڑی اور غلاظت ڈالی گئی۔ آپ کی راہ میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپ پر سنگ باری کی گئی جس سے تن مبارک لہولہان ہو گیا۔ آپ کو شہید کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی مگر آپ نے نہ صرف صبر کیا بلکہ کبھی ایذا رسانوں کے لئے بددعا تک نہ کی۔ بلکہ یہی فرمایا کہ" الٰہی میری قوم کو راہِ نیک دکھا یہ مجھے جانتے نہیں ہیں۔"

آپ غور کیجئے کہ کفار آپ کو تبلیغ اسلام سے روکنے کے لئے کیا کیا لالچ دیتے ہیں دنیا کی تمام بہترین چیزیں آپ کو فراہم کرنے کا ذمہ لیتے ہیں۔ حسین سے حسین دوشیزہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کو کہتے ہیں۔ مگر ان چیزوں پر ایک لمحہ کے لئے بھی نظرِ التفات نہیں پڑتی اور ارشاد ہوتا ہے کہ" اگر پہاڑ کو سونے کا کر کے مجھے دیدو تب بھی اپنا مشن یا اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف ملتفت نہیں ہو سکتا۔" جس زہد کی عملی تعلیم صحابۂ کرام کو آپ سے پہنچی اس کی تاثیر یہ تھی کہ چار دانگِ عالم میں سلطنتِ اسلام پھیلا کر بھی بادشاہت کی حالت میں ٹاٹ کے کپڑے پہنتے تھے اور چمڑے کا پیوند لگاتے تھے۔ اور پیٹ بھر کر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔ جس قدر تکالیف آپ نے تبلیغ کلمۃ الحق میں برداشت کی ہیں جن کی بابت ارشاد ہے کہ" کسی نبی کو اتنی ایذا نہیں دی گئی۔ جتنی مجھے دی گئی" اس کے باوجود شانِ کرم و عفو نے وہ عملی تعلیم دی ہے جس کی مثال نہیں ہے۔

ایک مرتبہ جس زمانے میں آپ مدینہ طیبہ میں بہزاراں تعداد رونق افروز تھے ایک یہودی نے اپنے چند درم کے لئے جن کے آپ مقروض تھے بہت بیہودگی اور سختی کے ساتھ ایسے وقت میں تقاضا کیا کہ جس وقت حضور اکرم صلعم مجمع اصحاب میں رونق افروز تھے۔ اس کا طرز تخاطب سب کو ناگوار ہوا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو ڈانٹا تو حضورؐ نے فرمایا کہ "کیا کرتے ہو تم کو چاہئے کہ مجھ کو قرض ادا کرنے کی نصیحت کرو اور اس کو نرمی سے تقاضا کرنے کی ہدایت کرو۔ پھر آپ نے قرض ادا کیا اور کچھ زائد رقم یہ فرما کر مرحمت فرمائی کہ یہ اس ڈانٹ ڈپٹ کا بدلہ ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دن حضور اکرم ایک ایسی چادر اوڑھے ہوئے تھے جس کا کنارا سخت تھا ایک اعرابی آیا اور چادر کو اس سختی سے کھینچا کہ وہ آپ کی گردنِ مبارک میں پیوست ہو گیا حضورؐ کا جسم مبارک نہایت نازک اور لطیف تھا۔ گردن میں پھندا لگنے سے سخت تکلیف ہوئی اس اعرابی نے کہا کہ ہم لوگ بھوکے ہیں۔ آپ ہم کو کیوں نہیں دیتے۔ آپ نے فرمایا تم میری گردن چھوڑ دمیں تم کو دوں گا اس نے کہا میں اس وقت تک آپ کو نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ مجھ کو نہیں دیں گے۔ یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے اس وقت حضورؐ کی خدمت میں حضرت ابوہریرہ اور چند اصحاب حاضر تھے۔ آپ مسکرائے اور اس کو دو اونٹ جن پر کھجور اور جو لدے ہوئے تھے عطا فرمائے۔ جب حضور نے اس کی خواہش پوری فرما دی تو اس نے چادر مبارک چھوڑی

۸ھ میں جب مکہ فتح ہوا تو سرکار دو عالم صلعم حرم کعبہ میں کھڑے ہوئے اور ایک کثیر مجمع میں تقریر فرمائی جس کے چند الفاظ قابل توجہ ہیں۔ "آج زمانۂ جاہلیت کے تمام غرور، انتقام اور تمام خون بہا میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ اے قریش خدا نے تمہارے نسب کے غرور کو پامال کر دیا۔ یاد رکھو تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے" اس کے بعد ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جنہوں نے حضور اکرم اور آپ کے رفقاء کو برابر ۲۱ سال تک ایذائیں پہنچائیں تھیں۔ پتھر برسائے تھے گھر میں آگ لگائی تھی تپتی ریت پر لٹا کر پتھر سینے پر رکھے تھے ظلم و بربریت کی حد کر دی تھی اور جو اس وقت اپنے شرمناک مظالم کو یاد کر کے

سہمے جارہے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا "آج تم سے باز پرس نہیں کی جاتی جاؤ تم لوگ آزاد ہو"۔ سراقہ ابن مالک ملک نے ہجرت کے دوران آپ کا پیچھا کیا تھا اور آپ کو شہید کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ گرفتار کر کے حضور میں پیش کیا جاتا ہے۔ وحشی جس نے آپ کے عم بزرگوار حضرت حمزہؓ کو بڑی بیدردی سے قتل کیا تھا۔ اور ہندہ جس نے ان کا کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔ مکہ کے اسیروں میں موجود تھے۔ ہبا جس نے معصومہ اقدس کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو ایسی حالت میں کہ آپ حاملہ تھیں اور اونٹ پر سوار ہو کر ہجرت کے ارادے سے جا رہی تھیں اپنے نیزے سے اس عفیفہ عرش منزل کو فرش زمین پر دھکیل دیا تھا جس سے آپ کی وفات ہو گئی یہ بھی پا بہ جولاں خدمت اقدس میں پیش کیا گیا۔ آپ نے ان سب کو معاف فرمایا۔ اللہ اکبر اس سے بڑھ کر اور کیا رحم ہو گا اس سے فزوں تر اور کیا سلوک ہو گا کیا تاریخ عالم اس حسن سلوک کی مثال پیش کر سکتی ہے؟ اس حسن اخلاق کا اثر تھا کہ عرب جیسے وحشی آپ کا دم بھرنے لگے۔ اسی قوت قدسیہ کا اثر تھا کہ ام المومنین ام حبیبہ کا باپ ابوسفیان اپنی مدت کی بچھڑی ہوئی بیٹی سے ملنے مدینہ پہنچا اور ایک چٹائی پر بیٹھنے لگا تو حضرت ام حبیبہ نے جلدی سے وہ چٹائی اٹھالی۔ ابوسفیان نے دریافت کیا" کیا یہ چٹائی میرے لائق نہ تھی یا میں اس چٹائی کے لائق نہ تھا۔" ام المومنین نے جواب دیا " یہ حضرت سرور عالمؐ کا فرش مبارک ہے اور تم ایک پلید مشرک ہو ایسی قابلیت نہیں رکھتے کہ ایسے جلیل القدر انسان کا فرش تمہارے ناپاک قدموں سے آلودہ ہو۔ اس مقدس ہستی کی روحانی طاقت کا کرشمہ تھا کہ اپنے غلاموں اور وحشی غلاموں، ریوڑ چرانے والوں کو جہالت کی پستی سے نکال کر اوج عتیق تک پہونچا دیا اور شتربانوں کو صاحب تخت و تاج کر دیا۔ جوش ملیح آبادی نے خوب کہا ہے ؎

فقر کو جس کے تھی حاصل کج کلاہی وہ رسولؐ ؛ گلہ بانوں کو عطا کی جس نے شاہی وہ رسولؐ
زندگی بھر جو رہا بن کر سپاہی وہ رسولؐ ؛ جس کی ہر اک سانس قانون الٰہی وہ رسولؐ
جس نے قلب تیرگی سے نور پیدا کر دیا ؛ جس کی جان بخشی نے مردوں کو مسیحا کر دیا

حضور اکرمؐ نے ہر کوہ دراور مصیبت زدوں کی طرف ۔ ہر فن کی طرف ۔ ہر امر دینی و دنیاوی کی طرف متوجہ کیا۔ "تم علم حاصل کرو اگرچہ تحصیل علم کے لئے تم کو چین جیسے دور دراز ملک میں جانا پڑے ۔ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے " یہ فرما کر علم کا شوق پیدا فرمایا۔ "اسلام میں رُہبانیت نہیں ہے ۔ کہ تم جنگلوں اور پہاڑوں میں ترکِ علائق کر کے بیٹھ جاؤ" یہ فرما کر مسلمانوں کو نصاریٰ کی خصلتِ رُہبانیت سے روکا جس طرح نیت کی صفائی اور دل کی صفائی کی تاکید فرمائی اسی طرح ریاکاری اور نام و نمود سے بچنے کی بھی ہدایت فرمائی چنانچہ فرمایا "تھوڑی سی ریاکاری بھی شرک میں شامل ہے ۔ اور خدائے تعالیٰ نے ریاکار پر جنت حرام کی ہے"

سچائی کے متعلق فرمایا کہ "سچ پر قائم رہو اگرچہ اس میں تم کو ہلاکت بھی نظر آئے اس واسطے کہ فی الواقع اس میں نجات ہے اور جھوٹ سے بچو اگرچہ اس میں تم کو نجات نظر آئے ۔ اس لئے کہ وہ فی نفسہ ہلاکت ہے ۔ بندہ کا ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مذاق میں بھی جھوٹ بولنا نہ چھوڑے ۔"

امانت کے متعلق فرمایا کہ جس میں امانت نہیں اُس میں ایمان نہیں ۔ جس میں عہد کی پابندی نہیں اس کا دین نہیں"۔ وفائے عہد کے لئے فرمایا کہ "قیامت کے دن سب سے اچھے خدا کے وہ بندے ہوں گے جو صاف دل سے عہد کو پورا کریں ۔" غزوہ بدر سے پہلے آپ کے ایک صحابی کو کفار نے پکڑ لیا اس عہد پر چھوڑا کہ اس جنگ میں وہ حضورؐ کے ساتھ ہو کر نہ لڑیں جب وہ صحابی حضورؐ کی خدمت میں آئے اور یہ حال عرض کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "ہمیں کفار کے مقابلے میں صرف خدائے تعالیٰ کی مدد کی ضرورت ہے ۔ عہد کا وفا کرنا سب سے مقدم ہے تم عہد پورا کرو ۔"

پرہیزگاری اور تقویٰ کی نسبت ارشاد ہے کہ "انسانوں میں مجھے سب سے زیادہ پرہیزگار عزیز ہیں ۔ خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں ہوں ۔" اے لوگو! تمہارا خدا ایک ہے ، تمہارا باپ ایک ہے عربی کو عجمی پر ، عجمی کو عربی پر ، گورے کو کالے پر کالے کو گورے پر سوائے پرہیزگاری

کے کوئی فضیلت نہیں ہے۔ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

بیم و رجا کی نسبت فرمایا کہ "خوف و رجا جس دل میں جمع ہیں۔ خدا اس کی امید کو پورا کرے گا۔ اور خوف سے امن نصیب کرے گا۔ انسان کے واسطے یہ علم کافی ہے کہ وہ خدا سے ڈرتا رہے اور یہ جہالت کافی ہے کہ وہ خود بین نہ ہو" زُہد اور دنیا کے بارے میں فرمایا "زہد فی الدنیا حلال کو حرام کر لینے یا مال کو ضائع کر دینے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ جو چیز تمہارے قبضہ میں ہے اس پر تمہارا بھروسا اس چیز سے زیادہ نہ ہو جو خدا کے ہاتھوں میں ہے" عیش پسندی سے بچنے کی تاکید فرمائی۔ تاجر کے بارے میں فرمایا کہ سچا اور امین تاجر شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔"

صنعت و حرفت کے بارے میں فرمایا "کسی شخص نے کبھی کوئی کھانا اس کھانے سے بہتر نہیں کھایا جو اپنے ہاتھ کی محنت سے کما کر کھایا ہو۔ اللہ اس بندے کو دوست رکھتا ہے جو صاحبِ حرفہ ہو" کاشتکاری کو مبارک پیشہ ارشاد فرمایا ہے۔

قناعت کے لئے فرمایا ہے کہ "وہ ایسا مال ہے جو کبھی خرچ نہیں ہوتا جو شخص اپنے حصۂ رزق سے ناراض ہو کر شکایت کرتا پھرے اور صبر نہ کرے اس کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوگا اور جب وہ خدا کے حضور میں حاضر ہوگا تو اس کو ناراض پائے گا۔" فرمایا کہ "صبر نصف ایمان ہے" "صبر دو ہیں۔ ایک وہ جو مصیبت پر کیا جائے یہ اچھا ہے دوسرا وہ جو خواہشاتِ بد کے مقابلے میں ہو یہ اس سے بھی اچھا ہے۔

رحمدلی کے لئے فرمایا کہ اس کا دائرہ انسانوں سے بڑھ کر جانوروں تک وسیع ہونا چاہیئے۔ ہمدردی کو اسلام کی خاص علامت فرمایا۔ مہمان نوازی کی بے انتہا تاکید فرمائی ہے۔ اور اس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی سنت بیان فرمائی ہے حلم اور عفو کی نسبت ارشاد ہے کہ تم میں سب سے زیادہ قوی وہ شخص ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو سب سے زیادہ قابو میں رکھے۔ اور سب سے زیادہ حلیم وہ ہے جو قدرت پا کر درگذر کرے؛ جس کا نمونہ آپ نے فتح مکہ کے دن

دکھایا۔ شکر گزاری کے بارے میں فرمایا "جنت میں اول شکر گزار طلب کئے جائیں گے جو خدا ذکر فارغ البالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں ادا کرتے تھے۔" مدد و اعانت کے بارے میں ارشاد ہے " اپنے بھائی کی ایک دن کی مدد ایک مہینہ مسجد میں معتکف ہونے سے بہتر ہے۔ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔" قرابت داروں سے سلوک کے بارے میں فرمایا ہے۔ اے مسلمانو! تم میں اچھے وہ لوگ ہیں جو اس حد تک اپنے کنبے کی مدد کریں کہ گناہگار نہ ہوں اور قرابت داروں کو چھوڑنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔" مرتبہ شناسی کے بارے میں ارشاد ہے " صلح و صفائی کرا دینا روزہ نماز اور صدقے سے بہتر ہے۔" "جو شخص آدمیوں سے شرم نہیں کرتا وہ خدا سے بھی شرم نہیں کرتا۔" حیا اور ایمان باہم ملے ہوئے ہیں۔" چغلخور جنت میں داخل نہ ہوگا۔" "جھگڑالو آدمی خدا کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے جو کسی معاملے میں بغیر علم کے جھگڑا کرے۔" غیبت کے بارے میں ارشاد ہے کہ "تم جانتے ہو غیبت کیا چیز ہے اپنے بھائی کا ایسا ذکر کرنا کہ اگر وہ سنے تو برا مانے۔ اگر وہ بات واقعی اس میں ہے تو وہ غیبت ہے اور اگر نہیں ہے تو بہتان ہے۔ غیبت کرنا ایسا ہے جیسے آدمی کا گوشت کھانا" ارشاد فرمایا کہ "فحش گوئی اور لعنت کرنے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" اہل کلمہ کو کسی گناہ پر مت بناؤ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہنے والے کو کافر کہتا ہے وہ خود کفر سے قریب ہے۔ جانوروں کو بھی برا کہنا یا ان پر لعنت بھیجنا روا نہیں ہے۔ خوشامد پسندی کو برا بتایا ہے۔ فرمایا کہ "آدمیوں کو اپنی تعریف پسند کرنا ان کو اندھا اور بہرہ بنا دیتا ہے۔ خوشامد اور حسد مومن کے اخلاق میں نہیں ہے منہ پر کسی کی تعریف کرنا اس کو ذبح کرنا ہے۔"

ارشادات نبویؐ کے بیش بہا خزانے کے چند ذرے بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں ان سے ہی آپ کو نبی کریم صلعم کی پاک زندگی، خلوص و صداقت، صبر و قناعت، خلق و محبت کا اندازہ ہو جائے گا۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ فخر عالم و آدم محمدؐ صلعم۔

سید مدبر علی زیدی
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو و فارسی
راجستھان یونیورسٹی جے پور

# سرورِ کائنات کی اخلاقی تعلیمات

سرورِ کائناتؐ کا ظہور اس وقت ہوا جب تمام عرب شرک اور بداخلاقی کی ظلمت میں ڈوبا ہوا تھا۔ جنگ و جدل، شراب خوری، زناکاری، دختر کشی اور ظلم و جور کا بازار گرم تھا۔ عورتوں اور غلاموں کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ بے ایمانی، بدنفسی، عیاشی، فریب و دغا غرض کہ تمام بداخلاقیاں عام ہو گئی تھیں۔ خدا نے اپنے بندوں کو شرک و جہالت سے بچانے کے لئے اپنے پیارے نبیؐ کو اس زمین پر اتارا جہاں سب سے زیادہ جہالت و بداخلاقی تھی۔ رسول اللہؐ نے اپنے قول و فعل سے جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا وہ حسنِ سلوک اور حسنِ اخلاق تھا۔ نبی کو بھیجنے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کیونکہ وہ امراضِ روحانی کا طبیب ہوتا ہے اور لوگوں کو راہِ مستقیم دکھاتا ہے۔ نبی کی بعثت مافوق الفطرت اور مافوق العقل چیزوں کے بتانے کے لئے نہیں ہوتی۔ نبی ان چیزوں کو آسان تمثیلوں کے ذریعہ سے بتاتا ہے۔ جو ازروئے عقل و فطرت ممکن ہیں۔ آنحضرتؐ کو خدا نے رحمت اللعالمین کا خطاب دیا اور کائنات کے لئے سراپا رحمت بنا کر بھیجا۔ نبی آخر الزماںؐ نے سچے دینِ اسلام کی تبلیغ کی جس کی بنیاد حسنِ سلوک اور حسنِ اخلاق پر رکھی گئی ہے۔ سرسید نے فرمایا تھا کہ قرآن پاک خدا کا قول ہے اور فطرت خدا کا فعل ہے اور قول و فعل میں مطابقت ہونا ضروری ہے۔ اس لئے ہادیٔ برحق نے جس دین کی اشاعت کی وہ ایک فطری مذہب ہے، اور آنحضرت کی تعلیمات بھی

فطرت اور عقل کے عین مطابق ہے۔

ہمارے رسول نے عملی طور پر ان تعلیمات کا اپنی زندگی میں قدم قدم پر مظاہرہ کیا۔ اسلام کی پہلی تعلیم اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں وہی خالق قادر اور حاکم ہے یعنی سوائے خدا کے کسی سے خوف مت کرو۔ اور اس کی ذاتِ اقدس پر مکمل یقین رکھو۔ یہی یقین عین ایمان ہے۔ سرورِ کائنات نے سب سے پہلے اسی بنیادی کو اپنے عمل سے ثابت کیا۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب سرورِ کائنات کفارِ قریش کے ظلم و ستم کو برداشت کر رہے تھے کہ حکم خداوندی نازل ہوا کہ مکّہ سے مدینہ کو ہجرت کرو۔ آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور ادھر حضرت علیؓ ابن ابی طالب رسولؐ خدا کے بستر پر آرام فرما رہے تھے۔ تلواروں کے سایے میں محو استراحت تھے۔ یہ رسولِ خدا کی صحبت اور تعلیم کا اثر تھا کہ ؎

یقین مرگ کفار سو گئے بستر پہ احمدؐ کے
علیؑ نے جان کی پرواہ نہ کی بھائی کی الفت میں

اُدھر کفار قریش رسولِ اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ دونوں ہی حضرات نے ایک غار میں پناہ لی اور کفار قریش بھی تعاقب کرتے ہوئے اسی غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر سخت ہراساں تھے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ "یارسول اللہؐ اب ہم کیا کریں؟ کفار کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ہم صرف دو ہی ہیں" خدا کے رسول نے جواب دیا "نہیں ہم دو نہیں ہیں۔ بلکہ تین ہیں۔ ہمارے ساتھ ہمارا خدا بھی تو ہے۔ وہی ہماری حفاظت کرے گا" اور خدا نے حفاظت کی اور دونوں سلامتی کے ساتھ مدینہ پہنچ گئے۔ یہ آنحضرتؐ کی تعلیمات کا ہی نتیجہ تھا کہ آپؐ کے اصحاب ایک آہنی عزم کے مالک بن گئے اور اسلام کو اقصائے عالم میں پھیلا دیا۔

جو لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا وہ دراصل غلط فہمی کی بنا پر ایسا کہتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی مذہب یا تحریک صرف تشدد اور طاقت کے بنا پر نہیں

پھیلی اور اگر کچھ عرصہ کے لئے پھیلی بھی ہے تو صرف عارضی طور پر۔ اصل میں اسلام کے پھیلنے کی وجہ اس کی حقانیت، صداقت اور اس کے اصولوں کے عین انسانیت کے مطابق ہونے کی ہے۔ ابتدا ہی میں رسولِ اکرمؐ نے اپنے قول و فعل سے یہ دکھا دیا کہ سچا اسلام رحمدلی، عفو و درگذر غرباء نوازی، صبر و رضا، فیاضی اور سخاوت، سادگی اور بے خوفی غرضیکہ تمام اخلاقی خوبیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ مستند احادیث کے حوالے سے اسے ثابت کیا جا سکتا ہے حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم حسد سے بچتے رہو، کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا لیتا ہے جس طرح آگ ایندھن کو۔ (ابو داؤد۔ مشکوٰۃ)

حسد کرنا تو کجا سرورِ کائنات نے تو اپنے دشمنوں کے حق میں بھی دعائے خیر کی اور کبھی کسی دشمن کو بھی اپنی ذات سے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ایک مرتبہ آنحضرتؐ ایک کھجور کے پیڑ کے نیچے محوِ خواب تھے کہ آپ کے ایک دشمن نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا۔ فوراً تلوار میان سے نکالی اور آنحضرت کو جگا کر کہنے لگا کہ "اے محمدؐ اب کون ہے جو تمہیں میرے ہاتھ سے بچائے گا"۔ آپ نے نہایت استقلال سے فرمایا "خدا"۔ اس شخص پر اس بیباک جواب کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے تلوار نیچے ڈال دی۔ رسول اللہ نے اب تلوار اٹھالی اور اس شخص کے سَر پر تان کر فرمانے لگے "اب بتا تجھے بچانے والا کون ہے ؟" اس شخص نے جواب دیا "افسوس مجھے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔" آپؐ نے فرمایا کہ "رحمدلی انسان کی سب سے بڑی خوبی ہے" اور اسے اس کی تلوار واپس کر دی۔ اس شخص نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔

حضرت جریر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔

(بخاری و مسلم بشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق)

جنگ خیبر کے موقع پر ایک یہودی ضعیفہ نے رسولِ خداؐ کو گوشت بھجوایا جس میں اس نے زہر ملا دیا تھا۔ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ نے اسے نوش کیا لیکن پھر جلد ہی گوشت کھانے سے منع فرمایا اور ضعیفہ کو بلا کر پوچھا کہ تم نے زہر کیوں دیا۔ بڑھیا نے جواب دیا کہ میں نے یہ سوچا

کہ اگر آپؐ سچے نبی ہوں گے تو یہ زہر آپ پر اثر نہیں کرے گا۔ اور اگر آپؐ سچے نبی نہیں ہوں گے تو آپ کی رحلت کے بعد ہم یہودی سکون سے رہ سکیں گے۔ آپؐ کے اصحاب نے بڑھیا کو سزا دینی چاہی لیکن آپؐ نے منع فرمایا اور اُسے بغیر کسی ضرر کے واپس جانے دیا۔

رسولِ خداؐ نے اس بات پر زور دیا کہ کبھی کسی کا حق مت مارو اور حق دار کو اس کے حق سے محروم نہ کرو۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم مظلوم کی بددعا سے بچو۔ کیونکہ مظلوم جب بددعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے اپنا حق مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی حقدار کو اس کے حق سے محروم نہیں کرتا (بیہقی۔ مشکوٰۃ)

اب دیکھیے کہ اس قول پر رسولِ خدا نے کس طرح عمل کیا جب سرورِ کائناتؐ کی رحلت کا وقت آیا تو آپ نے مسجد میں وعظ فرمایا اور کہا اگر میں نے کسی پر ظلم کیا ہو تو مجھ پر دعویٰ قصاص کا کرے اور ہرگز درگذر نہ کرے۔ حضارِ مسجد سے ایک شخص عکاسہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگرچہ میری مجال عرض کی نہ تھی مگر الامر فوق الادب گذارش کرتا ہوں کہ ایک روز آپؐ نے مجھ کو تازیانہ مارا تھا۔ اگر وہی تازیانہ ہو تو میں عوض اس کا لوں۔ جناب رسولِ مقبولؐ نے حضرت سلمان سے حضرت فاطمہ زہرہؓ کے گھر سے وہی تازیانہ منگوالیا اور عکاسہ کو دیدیا۔ عکاسہ اٹھا اور کہا کہ یا نبی اللہ جس روز آپ نے مجھ کو کوڑا دستِ مبارک سے مارا تھا یاد کرتا ہوں کہ میں ننگی پیٹھ تھا۔ پس عوض پورا تب تک نہیں ہو سکے گا جب تک کہ آپ بھی پشتِ اقدس سے جامۂ مبارک کو علاحدہ نہ فرمائیں۔ مقامِ عبرت اور محلِ حیرت ہے کہ رسولؐ کو ایک ادنیٰ شخص کے معاوضہ میں یہ اہتمام بوجہ خوف خداوندکریم ہو۔ پس آپؐ نے پوشاکِ اطہر کو فوراً تنِ مطہر سے جدا کیا جس وقت کہ جامہ جسمِ مبارک سے علیحدہ کیا عکاسہ بکمالِ اشتیاق دوڑا اور مہرِ نبوت پر جو کہ پشتِ اطہر پر تھی بوسہ دیا اور کہا ؎

گرا پاؤں پر اور کہا یا نبی ٭ مجھے آرزو ایک مدت سے تھی
کہ مہرِ نبوت کو دیکھوں ذرا ٭ عوض تازیانہ کا حیلہ کیا

مرا یہ گناہ بخشدو یا رسول ۔ کیا دھوکے سے میاں نے مقصد حصول

رسول خدا نے اپنی بعثت کا مقصد ہی حسن اخلاق کی خوبیوں کو عوام تک پہونچانا بتایا تھا۔ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (میں بھیجا ہی اس لئے گیا ہوں کہ اخلاق کی خوبیوں کو مکمل کر دوں) آپ نے خوش اخلاقی کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا۔ مَا مِنْ شَیْئٍ اَثْقَلُ فِی الْمِیْزَانِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ (اعمال کی ترازو میں خوش اخلاقی سے زیادہ وزنی کوئی عمل نہیں۔)

(ابو داؤد)

انسان کے اعضائے ظاہری کی طرح جن سے اس کے جسم کی آرائش و زیبائش ہوتی ہے اس کی کچھ باطنی قوتیں بھی ہیں جن سے اس کی روح نکھرتی اور سنورتی ہے۔ ان میں چار بنیادی قوتیں ہیں۔ قوۃ عقلیہ، قوۃ علمیہ، قوۃ غضبیہ، قوت شہوانیہ۔ یہ چاروں قوتیں جب افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال و میانہ روی کی راہ اختیار کریں تو ان سے "اخلاق حسنہ" کا ظہور ہوتا ہے چنانچہ آپؐ نے اپنے ۲۳ سالہ دور نبوت میں اپنے اقوال اور اعمال سے اور کردار سے قدم قدم پر اخلاق عالیہ اور اخلاق حسنہ کی وہ شمعیں روشن کیں کہ ہر شخص ان کی روشنی میں انسانیت کے اعلیٰ مقام کی طرف رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ اخلاق انسان کی باطنی خصلتوں اور عادتوں کے اعتدال توازن اور صفائی کو کہتے ہیں۔ جس طرح انسان کی ظاہری شکل و صورت کا حسین ہونا اس کا کمال خیال کیا جاتا ہے پھر جس طرح کسی کے ظاہری حسن کے لئے صرف چند اعضاء کا خوبصورت ہونا کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ اس کی آنکھ، ناک، لب، رخسار، اور جسم کے تمام اعضاء خوبصورت ہوں اور ان میں تناسب اور موزونیت بھی پائی جائے۔ اسی طرح انسان کے باطنی حسن کے لئے ضروری ہے کہ نیک دلی، نرم مزاجی، حیا و شرم، کرم و رحم، ہمت و شجاعت سب اوصاف اعتدال کے ساتھ پائے جاتے ہوں۔

آنحضرتؐ نے انسانوں کو اس باطنی حسن کو حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔ حضرت جریرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص نرمی اور مہربانی سے محروم کیا جاتا ہے وہ ہر نیکی سے محروم کیا جاتا ہے۔ (مسلم۔ مشکوٰۃ)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں ذرہ کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ یہ سُن کر ایک شخص نے عرض کیا کہ آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی تکبر میں داخل ہے۔ حضورؐ نے فرمایا نہیں۔ اللہ تعالیٰ جمال والا ہے۔ جمال کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو حق کا انکار اور دوسروں کو ذلیل سمجھنا ہے۔ (مسلم۔ مشکوٰۃ)

آنحضرت نے ہمیشہ اعتدال و توازن کو ضروری قرار دیا اور تمام بداخلاقیوں سے دور رہنے پر زور دیا۔ یہاں تک کہ شیریں کلامی کو دینِ اسلام قرار دیا۔

حضرت عمرو بن عبسہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا اے اللہ کے رسول اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا شیریں کلامی۔ (مسند احمد)

حضورؐ نے ہمیشہ غیبت کرنے سے منع فرمایا کسی کی برائی کا ذکر دوسروں کے سامنے کرنے سے منع فرمایا۔ ایک شخص نے دریافت کیا کہ اگر میرے بھائی میں کوئی ایسی بات موجود ہو جو ناپسندیدہ ہو تو کیا یہ بھی غیبت میں شامل ہے کہ میں اس کا ذکر کروں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر وہ بات تیرے بھائی میں موجود ہے۔ جو تو کہہ رہا ہے تب تو تو نے اس کی غیبت کی۔ لیکن اگر وہ بات جو تو کہتا ہے اس میں نہیں ہے تب تو تو نے اس پر بہتان لگایا۔ (مسلم۔ مشکوٰۃ۔ باب حفظ اللسان)

ایک داعیٔ حق صرف الفاظ کے طوطا مینا بنانے کے لئے نہیں اٹھتا بلکہ وہ انسانی زندگیوں میں خوشگوار اصلاحی انقلاب پیدا کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے اس لئے اس کا حقیقی میدان عمل کا میدان ہے وہ انسانی زندگیوں کی کھیتی میں اصلاح کا بیج بوتا ہے اور خوشگوار اخلاق و کردار کی فصل اگاتا ہے۔ آنحضرتؐ نے صرف زبان سے ہی خوشگوار اخلاق کی تبلیغ نہیں کی بلکہ بار بار اس پر خود عمل کر کے دکھایا۔ تمام روایتیں اس بات پر متفق ہیں کہ رحمدلی اور درگذر میں رسول اکرم نے ایسی مثالیں قائم کیں جو اس ہادیٔ برحق

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

راشد جمال فاروقی

اے بی بی انٹر کالج ویر بھدر، دہرہ دون

# نئی غزل کا شناخت نامہ

غزل اُردو کی آبرو یا نیم وحشی صنف، ہو یا نہ ہو لیکن سخت جان ضرور ہے اس امر سے انکار کی جرات نہ مرحوم رشید احمد صدیقی کو ہو سکتی تھی اور نہ کلیم الدین احمد کو۔ غزل کی سخت جانی کا وصف اس کے تغیر پسند رویہ میں مضمر ہے۔ جمود اور تعطل غزل کا شیوہ نہیں۔ زمانے کی نبض پر غزل گو شعراء کی انگلیاں ہمیشہ سے رہی ہیں۔ اس صنف شعری کی غنائیت ایمائیت، رمز، سرشاری اور ہمہ گیر وسعت ایسے اوصاف ہیں جو غزل کو مقبول خاص و عام بنائے ہوئے ہیں۔ آج غیر اُردو داں طبقہ میں بھی غزل کا اپنا ایک مقام ہے۔ غزل گائکوں نے لوگوں کو دیوانہ بنا دیا ہے۔ مہدی حسن، فریدہ خانم، اقبال بانو، غلام علی، جگجیت سنگھ، چترا سنگھ نیز بے شمار دیگر فنکار اپنے منفرد انداز میں عروس غزل کو سجا سنوار رہے ہیں۔ ہر مہذب شخص، دوران گفتگو، برمحل اشعار اپنی وسیع معلومات کے ثبوت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

غزل کا مزاج بہت نازک، دھیما دھیما اور پُر اثر ہے۔ چنانچہ کوئی انقلابی تبدیلی غزل کی صنف میں کبھی نہیں آسکی بلکہ یہ بہت غیر محسوس طریقہ پر بدلتی رہتی ہے غزل کی جڑیں اپنی دھرتی میں پیوست رہتی ہیں۔ اور بدلتے موسموں کی ہواؤں کا ادراک بھی اُسے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ کے دَور کی غزلیات غالبؔ کے دَور سے الگ شناخت رکھتی ہیں۔ نیز غالبؔ کے اسلوب

اور بعد کے شعراء کے لہجے میں زبردست فرق نمایاں ہے یہی بات جدید تر غزل پر صادق آتی ہے۔

آج کی غزل آج ہی کی آواز میں بولتی ہے۔ جدید تر غزل کا دامن اسی قدر بے پایاں ہے جس قدر یہ وسیع و عریض کائنات۔ اب غزل اپنے مروجہ دائروں سے باہر کی ہواؤں کا لمس محسوس کر رہی ہے۔ حسن و عشق، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات، اخلاقیات کی جملہ اقدار۔ فلسفہ کی موشگافیاں، نفسیاتی گتھیاں، عصری مسائل، سائنسی اور صنعتی پیچیدگیاں، نئے انسان کی بے چہرگی، لاچاری، بے بسی، استحصال، تنہائی، گلیمر میں چھپی بد صورتی، منتشر ہوتے ہوئے مذہبی ایقان، بکھرے ہوئے مشترکہ خاندانوں کی عدم مرکزیت سے پیدا شدہ بے شمار مسائل دو نسلوں کے مابین تصادم GENERATION GAP نئی نسل کا نسبتاً زیادہ تیز رفتار صنعتی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے میں دشواری ... اور ... اور بے شمار دیگر مسائل کا زہر ہمارے نئے شاعر کا مقدر ہے۔ چنانچہ وہ کسی کی تصوراتی بہشت کی بشارت نہیں دے سکتا۔ جدید شاعر اپنے پیش رووں سے زیادہ حقائق پسند ہے۔ وہ خوش فہمیوں کی دنیا میں نہیں جیتا۔ اسے اپنے قد اور استطاعت کا عرفان ہو چکا ہے۔ اس کا لہجہ زیادہ غیر رومانی سپاٹ، بیانیہ اور کہیں کہیں طنزیہ ہو گیا ہے۔ لفظیات کے معاملے میں بھی وہ اپنے پیش رووں پر پوری طرح انحصار کر کے نہیں بیٹھ رہا۔ اس کی لفظیات دو خانوں میں منقسم نہیں ہیں (میرا مقصد کتابی اور عملی لفظیات کی اس روش سے ہے جو ہمیشہ الگ الگ اکائیاں بن کر رہیں۔) جن الفاظ کو وہ بولتا ہے، گھر پر، دفتر میں، دوکان پر، بازار میں، کلب میں، پارٹیوں میں، یا بیٹھکوں پر وہی الفاظ اس کی غزلیں بولتی رہیں۔ قدیم یا روایتی غزلیہ لفظیات اپنے عصری تقاضوں اور مسائل کے اظہار پر قادر تھے۔ آج کے نئے معاشرے کو فوکس (FOCUS) کرنے کے لئے نئے الفاظ ناگزیر ہیں۔ جدید شاعر کسی مذہبی، اخلاقی یا سیاسی نظریۂ فکر سے الحاق و وابستگی (                    ) کا روادار بھی نہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر بشیر بدر کے یہ الفاظ میری بات کو اور واضح طور پر سمجھنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔

" نئی غزل کا واسطہ اسکول، کالج، دفتر، مشین، ٹرک، کار، فلم، کرکٹ، سادہ چست پوشاک، ترشے بال، بے مقصد قہقہے، دھواں، جنگ زدہ جلتی ہوئی زندگی کی بدبو، ناگ پھنی، پیاسا وغیرہ سے ہے۔ ہم ازم سے بہت ڈرتے اور بدکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کبھی ازم سے شاعری یا شاعر کا بھلا نہیں ہوا۔ ہرن ہوا کی طرح تو اُڑ سکتا ہے لیکن گدھے کی طرح بھاری میلے کپڑے کی لادی نہیں اٹھا سکتا۔ ہمیں گدھے کی اہمیت کا اعتراف ہے۔ لیکن ہرن کو گدھا بننے پر مجبور نہیں کرنا چاہیئے۔"

شمس الرحمان فاروقی نئی شاعری کو اس طرح متعارف کراتے ہیں۔

" داخلی و معنوی اعتبار سے میں اس شاعری کو جدید کہتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم، خوف تنہائی، کیفیت، انتشار، اور اس ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج سے اظہار کرتی ہے۔ جو جدید صنعتی اور مشینی تہذیب کی لائی ہوئی خوشحالی ذہنی کھوکھلے پن، روحانی دیوالیہ پن، اور احساس بے چارگی کا عطیہ ہے ...

نیا شاعر، شاعری کو صرف شاعری سمجھتا ہے۔ فلسفہ، پروگرام، مناظرہ، بحث و تمحیث، نصیحت وصیت، اشتہار یا اخبار نہیں .... "

نئی غزل زندگی کو اس کی تمام وسعتوں کو ایک وحدت کی شکل میں دیکھتی ہے اور اس طرح سکہ بند نظریات، خانوں اور نعروں سے ناوابستگی کا اظہار کرتی ہے۔ نئی غزل کے اہم نام اس طرح گنائے جا سکتے ہیں۔ ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی، ظفر اقبال، بانی، شہریار، محمد علوی، مظہر امام، مخمور سعیدی، ندا فاضلی، منصور سبزواری، کمار پاشی، آشفتہ چنگیزی، پرکاش فکری، مشتر خانقاہی، فضل جعفری، بمل کرشن اشک، سلطق فاروقی، بشر نواز، پروین شاکر، کشور ناہید، اور باقر مہدی وغیرہ ان شعراء نے غزلیہ لفظیات کو از سر نو خلق کیا، ایک عظیم تر اجتہاد زبان اور بیان دونوں میدانوں میں جاری ہے۔ چند فیشن ایبل رسائل کے زیر اثر کچھ پختہ ذہن شعراء بھی مہمل بکنے لگے۔ ان کا خیال ہے کہ اسطرح وہ اپنی ایک الگ شناخت بنا سکیں گے، جبکہ اہمال پسندی کو کبھی درخور اعتنا سمجھے جانے کا جواز ہی نکلتا ن

پیدا نہیں ہوتا۔ یہ جدیدیت زندگی ان لوگوں کی صلاحیتوں کو ضائع ہی کر رہی ہے۔

لیکن جہاں جہاں نئے شعراء فن اور زندگی کے تئیں ایمان دار ہیں۔ وہاں وہ نئے سنگ میل نصب کر رہے ہیں۔ نئے جہات کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ الفاظ کی وسعتوں اور نئے امکانات کی تلاش نیز زندگی اور زندگی کے تمام تر مثبت و منفی عوامل تک رسائی داخلیت اور خارجیت کی ہم آہنگی ان کا نصب العین ہے۔

یہی معیارِ دیانت ہے تو کل کا تاجر
برف کے باٹ لئے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

---

کھلی آنکھیں تو پھر لگتی گئی چپ
ہوئے ہم بے زباں منظر بہ منظر

——— مخمور سعیدی

جو جہاں ہے قدم جمائے رہے
کیا خبر کب زمیں چلنے لگے

——— شہریار

یہ رات گزرے تو دیکھوں طرف طرف کیا ہے
ابھی تو میرے لئے سب کچھ آسماں میں ہے

——— بانی

لرز گئی جو آنکھوں کے آئینوں میں کبھی
کٹے پھٹے اندر کی انتہا ہی تو ہے

——— ظفر اقبال

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

——— ناصر کاظمی

میں روز ادھر سے گذرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گذروں گا کون دیکھے گا

(مجید امجد)

کوئی رستہ کہیں جائے تو جانیں
بدلنے کے لئے رستے بہت ہیں

(محبوب خزاں)

کچھ تلخ و ترش ہو تو مزا یاریوں میں ہے
ہر وقت کی مٹھاس ریاکاریوں میں ہے

(بشر نواز)

خیال آتا ہے رہ رہ کے لوٹ جانے کا
سفر سے پہلے ہمیں اپنے گھر جلانے کا

(آشفتہ )

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

(بشیر بدر)

جھکتا نہیں تو کاٹ لے سر میرا زندگی
مجھ سے مرے غرور کی قیمت وصول کر

(فضیل جعفری)

آکے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے

(شکیب جلالی)

گھٹ کے سارے پھول ہنگاموں کی رونق ہو گئے
خالی گلدانوں سے باتیں کر کے سو جائیں گے ہم

(زہرہ نگاہ)

سبز پیڑوں سے بھری ننھے جزیروں کی طرح
خواب جیسی بستیاں دیکھے زمانہ ہو گیا

(پرکاش فکری)

محولہ بالا انتخاب مکمل نہیں ہے۔ لیکن آج کے شعری رویے کی نمائندگی پوری طرح کرتا ہے۔ نئی زندگی کی حیثیت کی آئینہ دار ہے۔ نئی غزل میں پرانے الفاظ کو نئے مفاہیم اور نئی وسعتیں دی جا رہی ہیں۔ علامتوں اور استعاروں میں نئے سماج کا عکس تلاش کیا جا رہا ہے۔ لفظوں کی تراش خراش اور توڑ پھوڑ جاری ہے۔ نیا شیش محل تعمیر کرنے کے لئے قسطوں میں گرتے ہوئے دیمک زدہ کھنڈروں کو گرا دینا تخریبی عمل نہیں تعمیری رجحان کا پتہ دیتا ہے۔

کیا خبر کوئی دفینہ مل جائے
آؤ دیوار گرا کر دیکھیں!

# چشمِ مستعار

رؤف خوشتر
صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج بیدر

ماہر معاشیات، لیسا اوقات، اشرف المخلوقات کو صاحبِ وسائل و صاحبِ مسائل میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان کی ایک عام پہچان یہ ہے کہ اول الذکر مرض اور آخر الذکر قرض میں جکڑے رہتے ہیں۔ ہمارا شمار متوسط طبقہ سے ہے۔ اس لئے ہماری زندگی قرض و مرض سے عبارت ہے اب تنہائی ہو یا توانائی (ابھی) ہر چیز مستعار ہے۔ فردسے لے کر ملت سبھی قلت کے شکار ہیں۔ لوگ نہ جانے کیا کیا مانگ کر گذر بسر کرتے ہیں۔

ہم اب تک شعر و ادب میں مانگے کا اُجالا چاند کا ہالا جیسی اصلاح سنتے آئے تھے۔ کیا پتہ تھا کہ ایسے بھی دِن دیکھنے نصیب ہوں گے۔ ٹھہریئے ساری مصیبت تو اِسی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، اب آپ سے چشم پوشی اچھی نہیں لگتی۔ ہوا یہ کہ ہر روز ابنِ صفی کے ناول پڑھنے اور ہر جمعہ پابندی سے نئی فلم دیکھنے پر ہماری جیب سے پہلے آنکھوں نے جواب دیا۔ اور آنکھیں ہماری گلیوں کی طرح ہمیشہ کے لئے اندھیرے میں ڈوب گئیں۔

ایسے میں ہمارے روشن دماغ اور آنکھوں والے دوست نے آئی بینک EYEBANK کا اشتہار پڑھ کر سنایا کہ اب ہم بے نور و رنگ کی آنکھوں کے بدلے پُر نور آنکھیں لگوا سکتے ہیں گویا" اور لے آئیں گے بازار سے گر پھوٹ گئیں، والا معاملہ ہے۔ اب آپ زر سے نظر بھی خرید سکتے ہیں۔ آئی بینک کے اعلان میں ہمیں اُمید کی کرن نظر آئی۔ دوست کے ہمراہ آئی بینک پہنچے۔

ڈاکٹر صاحب "میری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے" گنگنا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو ٹٹول ٹٹول کر مصافحہ کرنے میں بالآخر کامیاب اس لئے ہوئے کہ جھٹ انہوں نے ہمارے ہاتھ میں ہاتھ دیا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہاتھ دینے میں ماہر ہیں وہ تو ہمیں سر آنکھوں پر بٹھانے پر مُصر تھے۔ ہم نے سوچا کہ آنکھیں تو چلی گئیں۔ اب کیا ہاتھ بھی گنوانا ہے۔ ہم معذرت کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہاتھوں ہاتھ لینے کے بعد آنے کا سبب پوچھا۔

ہم نے کہا

"بندے کو کیا چاہئے دو آنکھیں۔ مانگے کا اُجالا چاہتا ہوں۔ ماں باپ یوں ہی چاند سا بیٹا نہیں کہتے تھے چاند بھی تو روشنی کے لئے محتاجِ سورج ہے۔ مجھے چشم مستعار وہ بھی اُدھار چاہئے۔

وہ کہنے لگے۔

"باتوں سے لگتا ہے کہ آپ صرف آنکھوں کے اندھے ہیں لوگوں کی آنکھوں (عقل کے علاوہ) پر بھی نقل کا پردہ پڑ گیا ہے۔ اسی لئے تو اپنی اچھی خاصی آنکھیں بدلنا چاہتے ہیں۔ دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر اوب گئے ہیں اب دوسروں کی آنکھوں سے کائنات کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔

یوں بھی دوسروں کے نین اور سجن اچھے لگتے ہیں، اب ہم دوسروں کی نظر سے اپنا نقطہ نظر بدل رہے ہیں، رسم ہو یا چشم اب ہر شئے کو انسان بدلنا چاہتا ہے۔ لیکن آپ کا معاملہ مختلف ہے۔ آپ دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے آنکھیں نہیں بدل رہے ہیں"

خیر بتلایئے کہ آپ کو کیسی آنکھیں چاہیئے۔ پتھرائی ہوئی، شرمائی، گھبرائی، آنسو بھر آئی یا بولتی، ڈولتی، بولتی، نشہ گھولتی، سارے راز کھولتی یا پھر کترانے والی۔ ٹکرانے والی، شعلہ برسانے والی۔

ان ساری آنکھوں کے ان حرکات و صفات کے اعتبار سے دام الگ الگ ہیں۔

اب غالب چشم طوطا چشم صفت، کترانے والی آنکھوں کی پیوندکاری چاہتے ہیں۔ اسی لئے اِن کے دام سب سے زیادہ ہیں۔ سب سے کم دام شرمانے والی باحیا آنکھوں کے ہیں۔

آپ کو راز کی بات بتلاؤں تاکہ آپ کی تیسری آنکھ کھل جائے پچھلے دِنوں منسٹر صاحب تشریف لائے تھے۔ وہ نیند سے بھاری اور ہر احساس سے عاری آنکھیں مانگ رہے تھے، وزیر بننے کے بعد ان کی اور یجنل آنکھیں ووٹروں کو پہچان کر انھیں پریشان کر رہی تھیں۔ یہی نہیں بقول اُن کے غریبوں اور بے بسوں کے حال پر آنسو بہاتی تھیں اب ایسی بے وفا اور غیر سیاسی آنکھیں اُن کے کِس کام کی ؟

ہمارے یہاں سے آنکھیں بدلوا کر اب وہ مزے میں ہیں، نہ وہ ووٹروں کو پہچانتی ہیں نہ آنسو بہاتی ہیں بلکہ عوام کو بہکاتی ہیں۔ اُن کو میں نے ایک مشہور و مرحوم اداکار کی آنکھیں لگوائیں جو پل پل میں اپنا رول بدلتی ہیں۔

صاحب یہ تو ہوئیں بڑوں کی بڑی بڑی آنکھیں میرا مطلب ہے باتیں، اب لوگ نہ جانے کیوں دوسروں کے دکھ درد میں رونے والی آنکھیں نہیں پوچھتے؛ ۔ ادیبوں اور فن کاروں کی آنکھیں ہیں اپنی آئی بینک میں نہیں رکھتا اِن کی کوئی مانگ ۔ نہیں کوئی خریدار نہیں، کیونکہ اِن آنکھوں کے متعلق مشہور ہے کہ "سارے جہاں کا درد ہماری ۔ نظر میں ہے۔" عام آدمی اتنے آنسو کہاں سے لائے جو ایسی حساس آنکھ لگوائے۔

مختلف پیشوں اور طبقوں سے وابستہ افراد آنکھوں کے انتخاب میں بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہیں۔ پھر بھی ہم جیسے جہاں دیدہ جو قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ اُن کی پسند کو تاڑ جاتے ہیں۔ اور وہ آنکھوں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے" کہہ کر آنکھیں موند لیتے ہیں ۔"

چنانچہ سوشل ورکرچوں کی چور سادھوؤں کی، سادھو انشورنس ایجنٹوں کی، ایجنٹ اداکاروں کی، اداکار وزیروں کی آنکھیں لگوانا چاہتے ہیں تاکہ دوسروں کو اُلّو بنا کر سیدھا کریں۔

"اب تو لوگوں کی آنکھوں کا پانی مرگیا ہے۔ نوجوان والدین سے، بیویاں شوہروں سے طلباء اساتذہ سے تحت حکام سے ٹکرانے والی آنکھیں مانگتے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کی اتنی ساری بصیرت افروز باتیں سن کر ہمارے دل پر اندھیرا چھا گیا (آنکھوں پر تو پہلے ہی تھا)

اُٹھ کھڑے ہوئے اور چلنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے بے نور جانے کی وجہ دریافت کی۔ ہم نے جواب دیا۔

"ایسے مانگے کا اُجالا کس کام کا۔ اس سے تو اچھا ہے کہ ہماری آنکھیں بے نور رہیں" تاکہ اس بے حس دُنیا اور ہوس پرست انسانوں کو نہ دیکھ سکیں، بندہ اندھا ہی رہے گا۔"

غیر مطبوعہ

---

## بقیہ: سرورِ کائنات

کے شایانِ شان تھیں۔ فاتح مکہ نے جب اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کو پابہ زنجیر دیکھا تو انہوں نے عام معافی دی حتیٰ کہ ابوسفیان جیسے بڑے دشمن کو نہ صرف یہ کہ معافی دی بلکہ اُن کے گھر کو ے امن بنا دیا۔ صفوان بن اُمیہ کو معاف فرمایا جو اسلام اور پیغمبر اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ حضور نے وحشی کو معاف فرمایا جو آپ کے چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا اور ابوسفیان کی بیوی ہندہ کی بھی جان بخشی کی مائی جس نے آپ کے چچا کا کلیجہ چبایا تھا۔

حبیب الرحمٰن نیازی
لکچرر، گورنمنٹ کالج سوائی مادھوپور

# فراق - حیات و شاعری

۱۹۸۲ء کا سال اُردو شعر و ادب کے لئے قہرِ خداوندی سے کم ثابت نہیں ہوا جس نے اُردو شاعری کی چار عہد ساز شخصیات کو ہم سے جدا کر دیا۔ یہ شخصیتیں جوشؔ، فراقؔ، احسان دانشؔ، اور حفیظ جالندھری تھیں۔ جوشؔ اگر نظم کے بادشاہ تھے تو فراقؔ شہنشاہِ تغزل، احسان اگر دکھیوں کے مسیحا تھے تو حفیظ مصلحِ قوم میرے مقالہ کا موضوع فراقؔ ہے اس لئے میں فراقؔ کی حیات اور شاعری کے متعلق ہی کچھ عرض کروں گا۔

رگھوپتی سہائے فراقؔ، منشی گورکھ پرشاد عبرتؔ کے یہاں ۱۸۹۶ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ منشی گورکھ پرشاد اپنے وقت کے بڑے وکیلوں میں سے تھے۔ اور پرانے کایستھ گھرانوں کی روایت کے مطابق عربی فارسی اور اردو میں اچھی دست گاہ رکھتے تھے اس کے ساتھ ساتھ اُردو کے اچھے شاعر بھی تھے۔ عبرتؔ تخلص تھا فراقؔ نے بھی اپنے گھرانے کی روایت کے مطابق اپنی تعلیم کا آغاز اُردو فارسی سے کیا اُن کے لئے اُردو سے محبت ہونا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اور شاعری سے دلی لگاؤ بھی ان کے نزدیک کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کیونکہ ان کے نزدیک۔ گھر میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ اور خود اُن کے والد گورکھ پرشاد عبرتؔ ایک اچھے شاعر تھے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد فراقؔ کی تعلیم کا آغاز ماڈل اسکول گورکھپور سے ہوا اور اپنی بے پناہ ذہانت کی وجہ سے ہر درجے میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔ ۱۹۱۳ء میں جبلی ہائی اسکول گورکھپور

نے اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کیا۔ پھر الہ آباد آکر میور سنٹرل کالج میں داخلہ لیا۔ اس وقت کالجوں میں اُردو تعلیم کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ اس لئے مجبوراً فراق نے انگریزی زبان و ادب فلسفہ اور معاشیات کے مضمون چنے۔ فراق نے، ۱۹۱۵ء میں انٹر میڈیٹ کا امتحان ساتویں پوزیشن کے ساتھ پاس کیا اسی دوران ان کی شادی ہوئی لیکن یہ ان کو راس نہیں آئی۔ وہ پریشان رہنے لگے۔ ایک جگہ فراق نے لکھا ہے کہ "میری شادی نے میری زندگی کو ایک موت بنا کر رکھ دیا ہے" اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ شاید ان کی ضرورت سے زیادہ جمال پرستی ہو۔ زندگی عذاب ہوتے ہوئے بھی فراق اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگے۔ انہوں نے تمام ذہنی اور جسمانی تکالیف کو جھیلتے ہوئے میور سنٹرل کالج الہ آباد سے بی اے کیا۔ اور یونیورسٹی میں چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ حکومت نے ڈپٹی کلکٹروں کا عہدہ پیش کیا مگر وہ اس کو قبول نہ کر سکے۔ اور کانگریس میں شریک ہو کر جیل چلے گئے۔ اب تک یہی عام خیال رہا ہے کہ فراق کا انتخاب آئی سی ایس میں بھی غالباً ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا۔ انہوں نے بھی اپنے آئی سی ایس میں منتخب ہونے کی بات کہی ہے۔ مگر ابھی پچھلے دنوں جے پور میں ایک سیمینار جوش، فراق اور احسان دانش پر ہوا تھا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے فراق کے دوست اور شاگرد پروفیسر محمد عقیل رضوی نے فراق سے اپنی تیس سالہ رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا "کہ یہ بات درست نہیں ہے کہ فراق کا آئی سی ایس کے لئے انتخاب ہوا تھا۔ میں نے ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۲۲ء تک کے گزٹ تلاش کئے۔ اس میں آئی سی ایس میں منتخب ہونے والوں میں فراق کا کہیں نام نہ پایا۔ تو فراق نے اس بارے میں معلومات چاہی پہلے تو انہوں نے کہا کہ ہاں میرا انتخاب ہوا ہے۔ پھر جب میں نے گزٹ کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے میرے ایک دوست نے لندن سے یہ اطلاع دی تھی کہ میرا انتخاب آئی سی ایس کے لئے ہو گیا ہے۔" اس تقریر کو سننے کے بعد راقم الحروف کو بھی تجسس ہوا کہ کیا بات ہے اتفاقاً اس سیمینار میں ڈاکٹر افغان اللہ خاں بھی موجود تھے جنہوں نے فراق پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے۔ ان سے جب میں نے اس کی وضاحت چاہی تو انہوں نے بھی کہا کہ یہ بات درست ہے کہ فراق آئی سی ایس نہیں ہوئے تھے۔ خیر جو کچھ بھی ہو فراق کی اہمیت میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تقریباً دس سال تک فراق

کی اہمیت میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تقریباً دس سال تک فراق نے جنگ آزادی کی جدوجہد میں پوری طرح حصہ لیا جیل سے رہائی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے انہیں گورکھپور سے الہ آباد بلاکر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا انڈر سیکریٹری مقرر کیا مگر اس عہدے پر فراق زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکے۔ ۱۹۳۰ء میں آگرہ یونی ورسٹی سے انہوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کا امتحان دیا۔ اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد الہ آباد یونی ورسٹی میں انگریزی کے لیکچرر مقرر کیے گئے جہاں سے ۱۹۵۹ء میں سبکدوش ہوئے اور آخر تک الہ آباد میں ہی رہے۔

جدید اردو غزل کو معنوی رفعت دینے والوں میں فراق کا نام سرفہرست آتا ہے۔ فراق کو عوام و خواص دونوں نے پسند کیا انہوں نے زندگی ہی میں وہ شہرت اور نام پایا جو کسی دوسرے کو آج تک نہیں نصیب ہوا۔ فراق نے غزل کو نئی زندگی اور توانائی بخشی۔ غزل کو تصنع مبالغہ آمیز اور روایتی باتوں سے پاک کیا غزل کو حقیقت اور جذبات کا آئینہ بنایا۔ فراق کی غزلوں میں عشق و محبت کے تمام واقعات و کیفیات ملتی ہیں۔ لباس کی خوشبو، جسم کا لمس، بندی کا رنگ، مانگ کا سندور یہ باتیں نئی نہیں ہیں مگر فراق نے جس خوبی سے انہیں بیان کیا ہے وہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ اردو غزل کی تاریخ میں فراق قدیم و جدید درمیان کی ایک کڑی کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔

فراق کی شاعری کا آغاز الہ آباد میں آنے کے بعد ہوا۔ جہاں انہیں پروفیسر ناصری کی صحبت حاصل ہوئی پروفیسر ناصری کی صحبت نے فراق کے دل میں دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دی۔ انہوں نے اپنا شروع کا کلام ناصری کو ہی دکھایا۔ انہوں نے فراق کو مفید مشورے دیئے۔ اور اس طرح ان کا شوق پروان چڑھنے لگا جب فراق جیل میں تھے تو وہاں بھی اُن کی ملاقات عارف، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، اور مولانا آزاد جیسے لوگوں سے رہی۔ ان حضرات کی صحبت نے ان کی شاعری کو اور جلا بخشی۔

فراق دراصل غزل کے شاعر ہیں اور چونکہ غزل کا اصل موضوع عشق و محبت ہے اس لئے فراق کی شاعری بھی حسن و عشق اور جمالیات پر مبنی ہے لیکن ان کا حسن و عشق عام حسن و عشق سے الگ ہے اس میں سطحیت نہیں ہے بلندی ہے۔ فراق اسی میں ساری کائنات کا حسن دیکھتے ہیں ۔

پڑ گئی سازِ کائنات میں جان
وہ گلِ نغمہ وہ صدا ہیں آپ

فراق کی شاعری میں جہاں ایک طرف حسن و عشق ہے وہیں دوسری طرف سوز و گداز کی بھی انتہا ملتی ہے ان کی شاعری سوز و گداز اور حسن و عشق کا حسین سنگم ہے ۔

یادِ جاناں کوئی کہانی چھیڑ
رات کٹتی نہیں تیرے غم کی

غرض کے کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہوگئی ہے

فراق کا مشاہدہ بہت گہرا ہے ان میں سوچنے سمجھنے اور برتنے کی پوری صلاحیت ہے وہ اپنی شاعری کے ذریعہ انسانی جذبات کو پوری طرح ابھارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ فراق کی غزلوں میں وہ اثر ہے۔ جو آج تک کسی اور شاعر کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ فراق کے کلام کو پڑھنے کے بعد بھڑکے ہوئے جذبات کو ایک عجیب قسم کا سکون ملتا ہے ۔

مدتیں گذریں تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

شریک بزم ہو کر یوں اچٹ کر بیٹھنا تیرا
کھٹکتی ہے تری موجودگی میں بھی کمی تیری

فراق کی شاعری صرف حسن و عشق اور سوز و گداز کی ہی شاعری نہیں ہے وہ وقت کے تقاضوں کو پوری طرح سمجھتے ہیں زمانے کے چلن کا انہیں پوری طرح احساس ہے وہ اس دور کے انسانوں کی محرومیوں اور ناکامیوں سے خوب واقف ہیں۔ ان کے نزدیک اس دور میں کوئی چیز اپنے آپ نہیں ملتی بلکہ چھینی جاتی ہے ؎

لینے سے تاج و تخت ملتا ہے
مانگے سے بھیک بھی نہیں ملتی۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، فراق خالص غزل کے شاعر ہیں وہ مجاز سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں توانائی کے ساتھ ساتھ انفرادیت کو بھی جگہ دی ہے۔ ان کے اشعار میں بلا کی شیرینی اور لطافت ہے ؎

اس ادا کا تیری جواب نہیں
مہربانی بھی سرگرانی بھی

وہ آنکھ زبان ہو گئی ہے
ہر بزم کی جان ہو گئی ہے

فراق کی شاعری کا ایک بڑا حسن یہ بھی ہے کہ انہوں نے ہندی کے نرم و نازک اور رسیلے الفاظ سے غزل کی شیرینی میں اضافہ کیا ہے۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ ہندی والے اردو کے جمالیاتی حسن کو پہچانیں اور ہندوستانی زبان کی طرح ہی اسے اپنائیں ؎

قاتل اس کو کون کہے
ہنس مکھ آنکھیں کومل گات

جھلک ریشمی جسم کی پیرہن میں
کسی دیپ مالا کی ہے جھلملاہٹ

اس میں کوئی شک نہیں کہ فراق غزل کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ بھی ایک نئی راہ نکالی ہے۔ چونکہ فراق زبردست وطن پرست تھے اس لئے انہوں نے اپنے جذبات کو نظموں کے ذریعے عوام تک پہنچایا ہے۔ اور وطن کی ہر ممکن حفاظت کی تلقین کی ہے اسی قسم کی ایک نظم اُن کی "تلاشِ حیات" ہے جس میں آزادی کے بعد اہلِ ہند کی کیا ذمہ داریاں ہیں اس کی طرف اشارہ ہے کچھ اور نظمیں بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ جیسے "داستانِ آدم" اور "دھرتی کی کروٹ" وغیرہ۔ اس کے علاوہ انہوں نے خطیبانہ اور بیانیہ نظمیں بھی کہی ہیں۔

غزلوں اور نظموں کے علاوہ فراق کی رباعیات کا بھی ایک اہم درجہ ہے ان کی رباعیات میں گنگا جمنی رنگ، ہندوستانی معاشرہ کی جھلک، عورت کا کنوارا روپ ماں کا پیار، پنگھٹ کا منظر اور سہاگن کا سنگھار وغیرہ کے ساتھ ساتھ فکر کا عنصر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

کھوئی ہوئی ہستی کا بہم ہو جانا　　آزاد فریب کیف و کم ہو جانا
تو رازِ حیات پوچھتا ہے مجھ سے　　وہ راز ہے شائستہ غم ہو جانا

---

پنگھٹ پہ گگریا کے چھلکنے کا یہ رنگ　　پانی ہچکولے کے بھرتا ہے ترنگ
کاندھوں پہ، سروں پہ دونوں باہوں پہ کلس　　مدانکھڑیوں میں سینوں میں بھرپور اُمنگ

---

دوشیزۂ فضا میں لہلہایا ہوا روپ　　آئینۂ صبح میں جھلکتا ہوا روپ
یہ بزم نکھار یہ سج دھج یہ سگندھ　　اس میں ہے کنوارے پن کے ڈوبا ہوا روپ

فراق کی رباعیات میں گہری وسعت، نرمی و شگفتگی اور ذہن کو جھنجھوڑنے کی صلاحیت ہے

اور نہ ہی ایک رباعی گو کی خصوصیت ہوتی ہے

یہاں فراق کی شاعری کا پورا محاکمہ تو نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ہی میں خود کو اس قابل سمجھتا ہوں۔ آخر میں اتنا ضرور عرض کر دوں کہ فراق کسی معمولی شخصیت کا نام نہیں وہ ایک عہد ساز شخصیت تھے اور ایسے انسان بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ بقول خود ان کے ؎

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی ہم عصرو
جب یہ دھیان آئے گا ان کو تم نے فراق کو دیکھا ہے

میں اس کو یوں پڑھتا ہوں ؎

آنے والی نسلیں ہم پر رشک کریں گی اے لوگو
جب یہ دھیان آئے گا ان کو ہم نے فراق کو دیکھا ہے

# ۵ار جنوری ۱۹۸۴ء تک

# راجستھان اُردو اکیڈیمی کی کارکردگی اور مالی امداد کی رپورٹ

## تعلیمی وظائف

اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے ان مستحق طلباء/طالبات کو وظائف عطا کئے گئے جنہوں نے اُردو میں نمبر حاصل کئے۔ یہ وظائف بحساب -/۲۵ روپیہ فی کس ماہانہ دیئے گئے۔ مجموعی رقم سالانہ -/۴۵۰۰ مختص کی گئی تھی۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ جناب اخلاق احمد -/۳۰۰ ٹی ڈی سی (سال اول) گورنمنٹ کالج سوائی مادھوپور

۲۔ جناب عبدالمجید -/۳۰۰ ٹی ڈی سی (سال دوئم) ″ ″ ″ ″

۳۔ جناب فرمان احمد -/۳۰۰ ٹی ڈی سی (سال سوئم) سکھاڑیہ یونیورسٹی اودے پور

۴۔ جناب ابرار حسین قریشی -/۳۰۰ XI کلیان ہائر سیکنڈری اسکول سیکر

۵۔ شہنا خانم -/۳۰۰ XI مسلم گرلز سیکنڈری اسکول جے پور

۶۔ ″ شمیم بیگم -/۳۰۰ XI ″ ″ ″ ″ جے پور

۷۔ ″ فردوس -/۳۰۰ XI ″ ″ ″ ″ جے پور

۸۔ ″ نادرہ -/۳۰۰ XI ″ ″ ″ ″ جے پور

۹۔ ″ مشرف جہاں -/۳۰۰ XI ″ ″ ″ ″ جے پور

۱۰۔ جناب ذوالفقار احمد -/۳۰۰ XI گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول دوسہ

۱۱۔ ″ زاہد ارشد -/۳۰۰ XI گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول موتی کٹلہ جے پور

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱۳۔ | جناب مسعود اختر | -/۳۰۰ | X/ | مسلم ہائر سیکنڈری اسکول | جے پور |
| ۱۴۔ | " ذاکر حسین | -/۳۰۰ | X/ | گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول | دوسہ |
| ۱۴۔ | ناہید بدر | -/۳۰۰ | X/ | کملا نہرو ہائر سیکنڈری اسکول | جے پور |
| ۱۵۔ | " سعیدہ مسرت بیگم | -/۳۰۰ | | | |
| ۱۶۔ | " خورشید زہرہ | | | | جے پور |

# ۲۔ راجستھان کے شعراء اور ادبا کی بیوگان کو مالی امداد

اردو اکیڈیمی کی ذیلی کمیٹی کی سفارش پر راجستھان کے کُل چودہ شعراء اور سات بیواؤں کو سالانہ مالی اعانت بحساب مبلغ -/۱۲۰۰ روپے و مبلغ -/۶۰۰ روپے علی الترتیب دی گئی جو رقم مجموعی طور پر مبلغ -/۲۱۰۰۰ ہوتی ہے۔

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۔ | محترمہ رابعہ خاتون | ٹونک | -/۶۰۰ | روپیہ |
| ۲۔ | جناب عبدالرحمان پارسا کوثری | جے پور | -/۱۲۰۰ | " |
| ۳۔ | " غلام حسین کلیم | جھنجھنو | -/۱۲۰۰ | " |
| ۴۔ | " سید عبدالقادر غناں | ٹونک | -/۱۲۰۰ | " |
| ۵۔ | " محمد صدیق صاحب | ٹونک | -/۱۲۰۰ | " |
| ۶۔ | " محمد حسین اختر قادری | اودے پور | -/۱۲۰۰ | " |
| ۷۔ | " عبدالسلام بیگ شفیق | جھالاواڑ | -/۱۲۰۰ | " |
| ۸۔ | " غلام نبی اسیر قریشی | بیکانیر | -/۱۲۰۰ | " |
| ۹۔ | " سید نقی حسین پیام | جے پور | -/۱۲۰۰ | " |
| ۱۰۔ | " محمد انور خاں انور | چتوڑ گڑھ | -/۱۲۰۰ | " |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۱۔ محترمہ ادریسی فاطمہ | بینا پیٹرہ | ۱۲۰۰/- | روپیہ |
| ۱۲۔ جناب انصار حشر عباسی | جے پور | ۱۲۰۰/- | " |
| ۱۳۔ " امتیاز علی خورشید | اجمیر | ۱۲۰۰/- | " |
| ۱۴۔ " سید محمد صابر صابر | اجمیر | ۱۲۰۰/- | " |
| ۱۵۔ محترمہ نفیشا بانو | سیکر | ۱۲۰۰/- | " |
| ۱۶۔ جناب بنارسی داس رسا | جے پور | ۱۲۰۰/- | " |

## ۳۔ بیمار شعراء کو معالجہ کے لئے فوری مالی امداد

اس ضمن میں کل رقم مبلغ -/۱۵۰۰ روپیہ بطور مالی امداد فراہم کی گئی۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ | جناب چاند نرائن نکو مہتر صاحب | ۱۵۰/- |
| ۲۔ | " دین محمد مستان صاحب مرحوم | ۲۰۰/- |
| ۳۔ | " علی احمد ہاشمی صاحب | ۳۰۰/- |
| ۴۔ | " سلطان مرزا صاحب | ۳۵۰/- |
| ۵۔ | " بزمی ٹونکی صاحب | ۵۰۰/- |

# اسکولوں میں درجہ اوّل سے درجہ پانچویں تک
# بطور عطیہ کتب مہیا کی گئیں

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| اے۔ گورنمنٹ مڈل سکول سورج پول | جے پور | ۷ کتابیں | ۱۰- ۱۷ | |
| بی۔ پنچایت سمیتی پرائمری اسکول نوداں | جھنجھنو | ۴۶ کتابیں | ۵۵ - ۹۶ | |
| سی مسلم گرلز اسکول | جے پور | ۴۶ کتابیں | ۱۰- ۱۱۶ | |

---

---

**۵۔** مسلم گرلز سیکنڈری سکول جے پور کی لائبریریوں کے لئے ۵۸ کتابیں ۷۵-۸۶۲ خرید کے بطور عطیہ دی گئیں۔

---

بقیہ:- علی گڑھ تحریک

سرمایہ ہی کتنا تھا اور اس پر بھی مسجع عبارت آرائی کا غلبہ تھا۔ صرف خطوط غالب اور باغ وبہار ہی اس سے مستثنیٰ تھے یہ سرسید تحریک ہی کا کمال ہے کہ اس نے اردو نثر کو اس قابل بنایا کہ اس میں ہر طرح کے علمی وادبی مسائل بیان کی جاسکیں۔

اور یوں سرسید تحریک نے مذہب، سیاست، ادب اور دیگر شعبوں میں ملک وقوم کی رہنمائی کی ہے۔

تملستان

محمد خالد عابدی

# ڈاکٹر صفدر آہ سے
# ایک انٹرویو

**محمد خالد عابدی :-** آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے ؟

**صفدر آہ :-** ۲۸ اگست ۱۹۰۵ء کو سیتاپور (یوپی) میں میری ولادت ہوئی۔

**محمد خالد عابدی :-** کیا یہ ادبی ذوق آپ کو ورثے میں ملا ہے ؟

**صفدر آہ :-** جی ہاں کہا تو یہی جائے گا۔ لیکن اس نام نہاد ادبی ورثے نے بےحد فائدے سے کہیں زیادہ نقصان پہنچایا۔ دقیانوسیت کے جراثیم میری نصف زندگی تک مجھ میں رہے۔ وہ سب میرے پسِ منظر کی دین تھے۔ میرے ذہن کے دریچے ترقی پسند تحریک نے کھولے۔

**محمد خالد عابدی :-** آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا۔ اور آپ کا ادبی رہنما کون ہے ؟

**صفدر آہ :-** میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے میری غزل ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ میں نے تک بندی اس سے پہلے ہی شروع کر دی تھی۔ رواجِ وقت کے مطابق میرے استاد نظم مرحوم تھے۔ لیکن میرے اصل استاد محمد حسین، رتن ناتھ سرشار، امراؤ جان ادا، مرزا رسوا، میر، غالب، انیس اور فارغ ہیں۔ میری نثر و نظم انہی حضرات سے بنیادی طور پر متاثر ہے۔

**محمد خالد عابدی :-** آپ کیوں لکھتے ہیں اور کیوں کر لکھتے ہیں ؟

صفدر آہ :۔ اس لئے کہ لکھنے سے مجھے صحیح معنوں میں عشق ہے میری نظم اور نثر دونوں میری حیات اور مزاج کا EXPRESSION ہیں۔ میں میز کرسی کی جگہ آرام کرسی پر یا گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ کر لکھتا ہوں۔

محمد خالد عابدی :۔ لکھتے وقت آپ کو بالعموم کس طرح کا ماحول درکار ہوتا ہے ؟

صفدر آہ :۔ خاموشی اور تنہائی۔ شور اور مجمع میں مجھ سے لکھا نہیں جاتا۔

محمد خالد عابدی :۔ آپ نے تخلص آہ کس مناسبت سے اختیار کیا ؟

صفدر آہ :۔ ایک رباعی سنئے :۔

یہ مشغلۂ عشق تو دن رات کا تھا  
خوگر دل غمگیں اپنی لذات کا تھا  
کیوں آہ کیا اپنا تخلص تجویز  
بس یہ بھی تقاضا میرے حالات کا تھا

محمد خالد عابدی :۔ آپ کی پہلی کہی ہوئی غزل کا اگر کوئی شعر یاد ہو تو ؟

صفدر آہ :۔ ۱۹۱۸ء کی غزل کا ایک مطلع لکھ رہا ہوں ؎

سیکھ لے طرز فغاں بلبل دل ناشاد سے  
روتی ہے شبنم بھی میرے نالۂ و فریاد سے

میری یاد میں یہ پہلی غزل ہے جو میں نے مشاعرے میں پڑھی تھی ؛ تک بندی اس سے پہلے ہی شروع کر چکا تھا۔

محمد خالد عابدی :۔ آپ کے استاد مرحوم (تنظم) کا طریقۂ اصلاح کیا تھا ؟

صفدر آہ :۔ اُستاد مرحوم کے مکان میں ایک کنواں تھا۔ جس کا پانی کھاری تھا۔ ان کے حکم سے روز ایک غزل کہتا تھا۔ جس کی مرحوم خوب تعریف کرتے تھے۔ آنے والوں کو سناتے اس کے بعد فرماتے تھے اسے میرے کنوئیں میں ڈال دو۔ اس کا پانی میٹھا ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کسی استاد کا دیوان کھولکر سامنے رکھ دیتے تھے۔ پہلے مصرعے چھپا دیتے تھے۔ اور دوسرے مصرعوں پر مصرعے لگانے کا حکم دیتے تھے۔ پھر اصل مصرعہ پڑھتے تھے۔ اور مصرعوں کے مقابلہ میں ان کی

مو بیاں بیان فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ عام استادوں کے کلام پر بھی
اصلاح بھی دیتے تھے۔

صفدر آہ :- میرے تلامذہ میں کوئی نہیں استفسارات کا جواب اور مشورہ الگ بات ہے

محمد خالد عابدی :- آپ نے شاگردوں کی اصلاح میں اپنے استاد نظم مرحوم کا اتباع
کیا ہے۔ یا دوسرے طریقے وضع کئے ہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ آپ
کا طریقۂ اصلاح منفرد ہے ؟

صفدر آہ :- استادی کی صلاحیتیں شاعری کی صلاحیتوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ مجھ میں استادی
کی مطلق صلاحیت نہیں۔

محمد خالد عابدی :- آپ ذہنی آسودگی کے لئے شعر کہتے ہیں یا بطور شوق ؟

صفدر آہ :- ذہنی آسودگی تکمیلِ شوق ہی کا نام ہے میں تو یہی کہوں گا کہ میں ذہنی آسودگی
کے لئے شعر کہتا ہوں۔

محمد خالد عابدی :- خود آپ کی نگاہ میں آپ کی شاعری کے انفرادی عناصر وخصوصیات کیا ہیں؟

صفدر آہ :- جذباتی اجزاء میرے کلام میں کم ہیں میں اپنی شاعری کی خصوصیت ، تکلف اور
ندرتِ خیال سمجھتا ہوں۔ ان باتوں کے اسباب میں میرا نقاد ہی لکھے گا۔ طرزِ ادا
کے نئے طریقوں میں بھی ہم عصروں سے پیچھے نہیں ہوں۔ جذباتی کے معنی ہلکی
پھلکی گانے والی چیزیں ہیں۔ اس خصوصیت میں تو میں ابتداء سے اپنے
ہم عصروں سے کم نہیں رہا ہوں۔

محمد خالد عابدی :- آپ کی پہلی تخلیق کس صنف میں تھی وہ کب اور کہاں شائع ہوئی۔

صفدر آہ :- میری پہلی مطبوعہ تخلیق ایک ناول " انجام محبت " ہے۔ میں نے یہ ناول
۱۹۱۹ء میں لکھا تھا اور صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے ۱۹۲۲ء میں شائع کی۔ سال بھر

سے زیادہ یہ کتاب ایک بلگرامی کاتب کے پاس رہی۔ جو علیل ہو کر اپنے وطن چلے گئے تھے۔

**محمد خالد عابدی:-** کیا آپ اپنی کسی تخلیق کی "شانِ نزول" کے بارے میں بتانا پسند فرمائیں گے؟

**صفدر آہ:-** مثلاً بمبئی کو عروس البلاد کہا جاتا ہے یہ بمبئی کی سوسائیٹی کی بالائی سطح کی بات ہے۔ میں نے بمبئی کے ان فاقہ کش مزدوروں کو بحیثیت شاعر پہلی مرتبہ دیکھا اور ان کی صحیح تصویر میری نظم بمبئی میں نظر آتی ہے۔ اس نظم کی شانِ نزول بمبئی کے گندے محلوں کے مشاہدات ہیں۔ اپنی منظومات میں، میں "نو بہ نو" اور اپنی رباعیوں کو سب سے اہم سمجھتا ہوں۔



**محمد خالد عابدی:-** ترقی پسند ادبی تحریک کی جامع و مستند تعریف کیا ہو سکتی ہے؟

**صفدر آہ:-** وہ شاعری جو بے مقصد اور لایعنی نہ ہو۔ بلکہ انسان اور انسانیت کی فلاح کے لئے ہو۔ فلاح کا یہ تصور انسانی محبت کا نتیجہ ہو، مبلغ کا لکچر نہ ہو جیسے اسلام سے محبت ایک مولوی کو بھی ہے اور اقبال کو بھی تھی۔ مولوی کے وعظ اور اقبال کی شاعری میں کتنا فرق ہے؟

**محمد خالد عابدی:-** ترقی پسند ادبی تحریک کس مقصد کے تحت معرض وجود میں آئی؟

**صفدر آہ:-** ترقی پسند تحریک شروع ہونے سے پہلے ادب برائے ادب تھا لیکن ترقی پسند شاعری نے ادب برائے زندگی کا نظریہ دیا۔ رجعت پسند اور مضر انسانیت ادب خواہ کتنی ہی خوبصورت زبان میں ہو لیکن وہ اعلیٰ شاعری نہیں کہلائے گا۔ علیل ادب قوموں کے ذہن کو علیل کر دیتا ہے۔

**محمد خالد عابدی:-** کیا وجہ ہے کہ ترقی پسند ادبی تحریک علمی طور پر کامیاب نہیں ہو سکی؟

**صفدر آہ:-** علمی طور پر اگر کوئی تحریک سچ مچ کامیاب ہوئی ہے تو وہ صرف ترقی پسند شاعری ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس شاعری کے دور میں عربی اور فارسی کا علم کم ہوا۔ لیکن

علوم عالم سے تمسک بڑھ گیا۔

محمد خالد عابدی:- آپ نے پہلا ڈراما کب لکھا اور وہ کہاں شائع ہوا؟

صفدر آہ:- میں اس وقت ساتویں یا آٹھویں درجے میں تھا جب میں نے "مار سیاہ" لکھا تھا۔ یہ سارا ڈرامہ مجھے زبانی یاد تھا اور اسکول سے لے کر کھیل کے میدان تک یہ بار بار مجھ سے سنا گیا۔ اسی زمانہ میں ایک بمبئی کی ناٹک کمپنی لکھنو آئی۔ اور وجاہت مرزا نے۔ جو میرے ہم جماعت تھے مل کر انگریزی میں ایک خط منیجر کو لکھا جس کی انگریزی یہ تھی I have invented a drama Mare Siyah" - ناٹک کا منیجر بھی شاید بالکل جاہل تھا اس نے مجھے طلب کر لیا۔ یہاں اسکول میں میری دھومیں مچ گئیں۔ جب میں منیجر کے سامنے پیش ہوا۔ تو وہ کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر پوچھا کہ کیا لکھا ہے تم نے؟ میں نے ڈائیلاگ شروع کر دیئے۔ دو چار منٹ مجھے سننے کے بعد اس نے مجھے روک دیا اور پوچھا ناٹک میں نوکری کرو گے میں نے جب انکار کیا تو اس نے مجھے بھگا دیا۔

محمد خالد عابدی:- ایک کامیاب ڈرامہ ڈرامہ میں کن صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے؟

صفدر آہ:- یہ سوال بہت طویل جواب چاہتا ہے۔ ملاحظہ ہو میری کتاب "ہندوستانی ڈرامہ" مختصر جواب یہ ہے کہ اس کے پاس چشم بینا برائے حیات اور قلم مصور تاثرات حیات ہونا چاہیئے۔

محمد خالد عابدی:- ایک بہترین ڈرامہ نگار کے حقیقی کمال کیا ہیں؟

صفدر آہ:- یہ کہ وہ اپنے ناظرین کے ذوق کی تسکین ایک صحت مند انداز سے کر سکے Action کی نبض پہچانتا ہو۔ کانفلکٹ اور سسپنس کو سمجھتا ہو اور بصر کے راستے ناظرین تک اپنا مافی الضمیر پہنچا سکتا ہو (ریڈیو فیچرس میں بصر کی شرط ختم ہو جاتی ہے)

محمد خالد عابدی:۔ ڈرامے میں کرداروں کی تخلیق کس طرح ہونا چاہیے؟

صفدر آہ :۔ ماحول کی مناسبت سے ہر کردار الگ الگ خصوصیات کے ساتھ ابھارا جائے کردار نگاری سے ڈرامے میں جان آتی ہے اور ڈرامے کے اندر پھیلا ہوا معاشرہ ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ ڈرامے میں کسی قدیم یا نئے خیالی معاشرے کا ہونا ضروری ہے۔ اور کردار ہی اس معاشرے کی تصویر کے خطوط اور الوان ہیں۔

محمد خالد عابدی:۔ ڈرامہ نگار کس چیز کا مرہون منت ہوتا ہے؟

صفدر آہ :۔ تخلیق کے وقت شعور حیات کا اور ڈرامہ پیش ہوتے وقت اچھے اداکاروں کا جو ڈرامہ نگار کی تحریر کی روح ناظرین تک پہنچاتے ہیں۔

محمد عابدی :۔ اردو میں ڈرامے بہت ہی کم لکھے جاتے ہیں اس کی کیا وجوہ ہیں؟

صفدر آہ :۔ اردو میں ڈرامے کا وجود قطعاً نہیں۔ پارسی اسٹیج نے اردو میں ڈرامے کے امکانات بڑی حد تک مفلوج کر دیئے ہیں۔

محمد خالد عابدی:۔ آپ اردو ڈرامے میں کن نئی کوششوں اور تجربوں کے خواہشمند ہیں؟

صفدر آہ :۔ میں ہر صحت مند کوشش اور تجربے کا خواہش مند ہوں۔ نئے تجربے ہی آرٹ میں نئے راستے پیدا کرتے ہیں۔ آرٹسٹ خلاق ہے۔ نقال نہیں تخلیق کا نئے تجربوں کے راستے سے گذرنا ضروری ہے۔

محمد خالد عابدی :۔ آہ صاحب، ایکٹ اور سین میں کیا بنیادی فرق ہوتا ہے اگر آپ اس فرق کو کسی اردو مقبول ڈرامے کی روشنی میں سمجھا سکیں تو مناسب ہوگا۔

صفدر آہ :۔ ایکٹ ایک باب ہے اور سین اس کی فصلیں ہیں۔ ایک ایکٹ آنے والے ایکٹ کے لئے تشنگی چھوڑ کر ختم ہوتا ہے۔ آخری ایکٹ میں تکمیل کا احساس پیدا کیا جاتا ہے۔ ڈرامے کے موضوع اور ماحول کے مطابق اکسپوزیشن کی ٹکنک الگ ہوتی ہے۔ فصلوں یعنی سینوں کی تدوین اسی اعتبار سے کی جاتی ہے

اُردو کا ایسا کوئی ڈرامہ میرے علم میں نہیں جس کی مثال آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔

محمد خالد عابدی :- کیا آپ اُردو کے موجودہ ڈراموں سے مطمئن ہیں ؟

صفدر آہ :- بالکل نہیں۔ بلکہ میری نظر میں اُردو ابھی ڈرامے کی تاریخ پیدائش کا انتظار کر رہی ہے

محمد خالد عابدی :- آپ کے کن کن ڈراموں کو اسٹیج کیا جا چکا ہے ؟

صفدر آہ :- میں نے انگریزی ڈرامے بہت لکھے لیکن اسٹیج کے لئے بچوں یا طالب علموں کے چند چھوٹے چھوٹے ڈراموں کے علاوہ کچھ نہیں لکھ سکا۔ یہ محدود حلقوں میں اسٹیج بھی ہوئے۔ لیکن میں اُن کو دیکھ نہ سکا۔

محمد خالد عابدی :- اسٹیج ڈرامے کے مقابلے میں آج ریڈیو ڈرامہ بہت زیادہ کامیاب اور مقبول ہے۔" کیا یہ دعویٰ درست ہے ؟

صفدر آہ :- جی ہاں! اُردو کے لئے تو درست ہی ہے کیونکہ ابھی تک اُردو کے پاس اسٹیج نہیں ہے۔

محمد خالد عابدی :- ابھی تک اُردو ڈرامے پر جو تحقیقی کام ہوا ہے۔ کیا آپ اس سے مطمئن ہیں ؟

صفدر آہ :- استغفراللہ - تحقیق کے لفظ کی توہین ہے کہ اُسے اُردو ڈرامے پر منطبق کیا جائے۔

محمد خالد عابدی :- کیا یہ خیال درست ہے کہ اسٹیج ڈرامے کی ترقی یافتہ شکل " فلم " ہے ؟

صفدر آہ :- یہ خیال بالکل غلط ہے۔ دیکھئے میری کتاب " ہندوستانی ڈرامہ " جس میں اسٹیج اور فلم کے ہر شعبے کی وضاحت کی گئی ہے۔

محمد خالد عابدی :- " فلم سے اسٹیج ڈرامے کی تقریباً موت ہو گئی " اس میں کہاں تک صداقت ہے ؟

صفدر آہ :- یہ بھی بالکل غلط ہے۔ بنگالی فلم، بنگالی اسٹیج کو نہیں مار سکے۔ مراٹھی فلم مراٹھی اسٹیج کو نہیں مار سکے۔ پھر اردو فلم نے اُردو اسٹیج کو کیوں کر مار ڈالا۔

(آپ کے سوال کا مطلب غالباً اردو فلم اور اُردو اسٹیج ہے)

محمد خالد عابدی :- امتیاز علی تاج کا ڈرامہ "انار کلی" اسٹیج کیوں نہیں کیا جا سکا؟

صفدر آہ :- اس لئے کہ وہ اسٹیج سے مطابقت نہیں کرتا۔ میں "انار کلی" کو عمدہ ادبی مکالمہ کہتا ہوں۔ لیکن وہ ڈراما قطعاً نہیں۔

محمد خالد عابدی :- اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ڈراما انارکلی میں سلیم کی ٹریجڈی ہے یا اکبر اعظم کی، آپ کا کیا خیال ہے؟

صفدر آہ :- انار کلی ایک عامی کہانی ہے ایسی کہانیوں کے نتائج ڈرامے کے اعتبار سے درست ہوں یہ ضروری نہیں۔

محمد خالد عابدی :- کیا اسٹیج ڈرامے کا کامیاب اداکار، فلم اسکرین کا کامیاب اداکار ہو سکتا ہے؟

صفدر آہ :- ہاں ہو سکتا ہے لیکن خاص دشواریوں کے بعد۔

محمد خالد عابدی :- کیا اسٹیج ڈرامے کا ارتقاء میں ٹیلی ویژن معاون ثابت ہو سکتا ہے؟

صفدر آہ :- میں ٹیلی ویژن کے متعلق ابھی کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

محمد خالد عابدی :- انگریزی، بنگالی، مرہٹی، اور ہندی ڈرامے کے سامنے اردو ڈرامے کی کیا حیثیت و اہمیت ہے؟

صفدر آہ :- ہندی ایک غیر شائستہ زبان ہے، جسے اُردو کی پھوہڑ نقل کہنا چاہیئے اس میں نہ ڈراما ہے نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ ہاں انگریزی، بنگالی اور مرہٹی ڈرامے سے اردو ڈرامے کا کوئی مقابلہ کرنا ظلم ہے۔

محمد خالد عابدی :- آپ کے نزدیک اُردو کا پہلا ڈرامہ کونسا ہے؟

صفدر آہ :- اسٹیج ہونے کے اعتبار سے ہرشچندر ہی اُردو کا پہلا ڈرامہ ہے جو منوس نخلستان

اُردو میں لکھا گیا تھا۔لیکن اُدب سے اس ڈرامے کا کوئی تعلق نہیں۔

**محمد خالد عابدی :۔** آپ کے نزدیک اُردو ڈرامے کا مستقبل ؟

**صفدر آہ :۔** اردو جیسی شاندار زبان میں جو بلاشبہ ہندوستان کی بہترین زبان ہے۔ ڈراما بھی پیدا ہوگا اور اس کا مستقبل کسی زبان کے ڈرامے سے زیادہ شاندار ہوگا۔

**محمد خالد عابدی :۔** ہندوستان میں اُردو سٹیج ڈرامے" کا مستقبل کیا ہے؟

**صفدر آہ :۔** ہندوستان سے اُردو کا مٹنا مشکل ہے اُردو کے ساتھ مستقبل میں اُردو ڈراما بھی پیدا ہوگا۔اور اس کا شاندار مستقبل بھی ہوگا۔

**محمد خالد عابدی :۔** اُردو میں مکتوباتی ادب کی کیا اہمیت ہے۔؟

**صفدر آہ :۔** اُردو ہندوستان کی حسین ترین زبان ہے ۔اس میں ادب مکتوبات بے حد حسین ہے خاص کر جس زبان کے پاس غالب کے خطوط ہوں وہ اس صنف میں کسی زبان کے سامنے نگاہیں نہیں جھکا سکتی۔

**محمد خالد عابدی :۔** ابھی تک جو مکتوباتی ادب پیش کیا گیا ہے۔کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

**صفدر آہ :۔** اس موضوع پر میں نے غور نہیں کیا ہے۔ لہٰذا اس کا مختصر جواب نہیں دیا جا سکتا۔

**محمد خالد عابدی :۔** مکتوباتی ادب کو مزید بہتر بنانے کے لئے آپ کی کیا اصلاح و تجاویز ہیں؟

**صفدر آہ :۔** ارتقاء کی گنجائش ہر صنف میں ہے۔خطوں کی تدوین کا کام جن لوگوں نے کیا ہے۔ یا کر رہے ہیں وہی اس سوال کا مناسب جواب دے سکیں گے۔

**محمد خالد عابدی :۔** کسی بھی ادب میں انٹرویو کی کیا اہمیت ہے ؟

**صفدر آہ :۔** جس شخصیت کا انٹرویو لیا جا رہا ہے اس کے خیالات، تجربات، اور احساسات کے انوکھے اور دلچسپ گوشے سامنے آتے ہیں۔اس سے قاری کو بڑی دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہے ۔مسلسل وزنی مضامین بار ذہن ہو جاتے ہیں ۔لیکن انٹرویو ذہن پر بوجھ ڈالے بغیر قاری کو بہت کچھ دے دیتا ہے۔

**محمد خالد عابدی :۔** انٹرویو کے سلسلے کو مزید بہتر بنانے کے لئے آپ کا کیا مشورہ اور تجاویز ہیں؟

صفدرآہ :- انٹرویو وکیل کی جرح نہ ہو۔ انٹرویو لینے والے کو یہ سمجھ کر انٹرویو لینا چاہئے کہ کر وہ کس کا انٹرویو لے رہا ہے۔ (شریمتی) اندرا گاندھی، دارا سنگھ پہلوان یا دلیپ کمار کے انٹرویو بالکل الگ انداز کے ہوں گے کس سے کیا معلومات حاصل کرنا ہے یہ بات انٹرویو لینے والے کو واضح طور پر معلوم ہونا چاہئے۔ انٹرویو دلچسپ ہو، بڑے اور طویل جوابات کو بار بار سوالات سے توڑا جائے۔ سوالات اور ماحول میں ادبی رنگ پیدا کیا جائے۔

محمد خالد عابدی :- آپ نے سب سے پہلے کس فلم کی کہانی لکھی؟

صفدر آہ :- محبوب مرحوم کے ساتھ غالباً "علی بابا" کی کہانی جسے ساگر میں (مرحوم) محبوب نے اُردو اور پنجابی میں بنایا تھا۔

محمد خالد عابدی :- اور بحیثیت ہدایت کار آپ کی پہلی فلم؟

صفدر آہ :- "بھوک" جو فرقہ وارانہ فسادات کی نذر ہوگئی۔ میں اپنی افتاد مزاج کے اعتبار سے ہدایت کار بننے کے قابل نہیں۔

محمد خالد عابدی :- آپ نے فلموں کے لئے لکھنا اور ہدایت دینا کیوں ترک کر دیا؟

صفدر آہ :- اس لئے کہ اپنی آخری عمر میں علمی کام کرنا چاہتا ہوں۔ اور فلم کو علم سے کوئی تعلق نہیں۔ یوں فلم کے لئے مشورے اور لکھنے کا کام اب بھی کبھی کبھی کر دیتا ہوں۔

محمد خالد عابدی :- آپ نے کل کتنی فلموں کے لئے کہانیاں لکھیں اور ہدایات دیں؟

صفدر آہ :- صحیح گنتی بتانا تو مشکل ہے لیکن شاید درجن بھر سے زیادہ کہانیاں ضرور لکھیں۔ جزوی کاموں کو بھی اگر شامل کر لیا جائے تو اس تعداد کو ڈیڑھ درجن کر دینا پڑے گا۔ ہدایت صرف ایک فلم کو دی اور سخت پریشان ہوا۔ دوسری فلم کی ہدایت نصف ہی ہی سے ترک کر دی۔ پروڈیوسر سے جھگڑا ہو گیا۔

محمد خالد عابدی :- کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ فلسفہ معمر کرتا ہے اور شاعری نوجوانی و توانائی بخشتی ہے؟

صمد رآہ :- فلسفے کی بلند پروازیوں کے بغیر میرؔ کے علاوہ کوئی شاعر صفِ اول کا شاعر نہیں بنا ہے۔ جذباتی شاعری تو عام ذہن نو مشقوں کی ہوتی ہے۔

محمد خالد عابدی :- ایک ماہر نفسیات اور ایک ذہین شاعر کے مشاہدات و احساسات میں کیا بنیادی فرق ہوتا ہے ؟

صمد رآہ :- نفسیات کے متعلق ایک ماہر نفسیات کا تجزیہ سائنسی ہوتا ہے جبکہ شاعر نفسیات کے مطالعے کے نتائج ایک پُر آہنگ وجدانی انداز میں پیش کرتا ہے۔

# اُردو

کی بقا اور ترقی کے لئے خود

# اُردو

والوں کو اپنے اپنے مقام پر انفرادی و اجتماعی

— دونوں طرح —

سچی لگن مستقل مزاجی اور ہوش مندی

سے کام کرنا ہوگا

آمنہ نکہت
(اردو ٹائپسٹ اقلیتی کمیشن)

# علی گڑھ تحریک
یا
# تحریک سرسیّد کی خدمات

علی گڑھ تحریک (سرسید تحریک) ایک ہمہ گیر تحریک تھی۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے ہندوستان اور خاص کر مسلمانوں کی سیاسی معاشی، معاشرتی مذہبی اور ادبی زندگی کو متاثر کیا جس نے مسلمانوں کو نئے علوم حاصل کرنے کی ترغیب دی، جس نے مذہب کو علوم عقلی کی مدد سے قابل قبول بنانے کی سعی کی جس نے معاشرے اور سماج کی اصلاح پر توجہ دی جس نے زبان و ادب کی آبیاری کی، جس نے احیائے ترقی کو اپنا شکار بنایا۔ گویا یہ تحریک مذہبی بھی تھی اور ادبی بھی۔

علی گڑھ تحریک کے روح رواں وہ مرد مجاہد تھا جسے سرسیّد احمد خاں کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ سرسید نے مسلمانوں کو پستی کے گہرے غار سے نکالا۔ سرسید کا عہد وہ عہد تھا جب انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو چکے تھے، اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن چکا تھا۔ انگریز ہندوستان پر فاتح اور مسلمان مفتوح تھے اور ان دونوں کے درمیان نفرت کی ایک گہری خلیج تھی۔ یہ سرسید اور ان کی تحریک کا ہی فیضان ہے جس کے طفیل دونوں قوموں کی دوری کافی حد تک کافی کم ہوئی۔ ایک طرف سرسید نے اسباب بغاوت ہند، لکھ کر انگریزوں کو تصویر کا صحیح رخ پیش کیا تو دوسری طرف ایم اے او کالج کے ذریعہ

مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی ترغیب وتحریص دلائی اور یوں مسلمان جو معاشی طور پر کافی بچھڑ گئے تھے۔ دھیرے دھیرے انگریزوں کے قریب بھی آئے اور سرکاری نوکریاں بھی انھیں ملنے لگیں۔

علی گڑھ تحریک نے سماج اور معاشرے کی اصلاح کے لئے بھی بہت کچھ کیا۔ اس تحریک نے سوئی ہوئی قوم کو مختلف طریقوں سے بیدار کیا۔ حالی اور شبلی نے قوم خفتہ کو بیدار کرنے کے لئے قومی اور ملی ترانے گائے۔ نثر اور نظم دونوں کے سہارے قوم کو بیدار کرنا چاہا اپنے اجداد کی سوانح پیش کیں۔ تاکہ ان کی زندگی سے مردہ قوم میں کچھ زندگی کی رمق پیدا ہو۔ خود سرسید اور ان کے رفقاء نے تہذیب الاخلاق کے ذریعے خفتہ قوم کو بیدار کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔

سرسید تحریک کا نمایاں کام تو ادبی خدمات ہی تھا۔ لیکن اس تحریک نے سیاست میں بھی اہم رول ادا کیا۔ مسلمان جو انگریزوں سے نفرت کرنے لگے تھے۔ دوسری طرف انگریز بھی انھیں دشمن اول تصوّر کرتے تھے۔ انگریزوں سے غلط ملط اور سرکاری نوکری میں جانا مسلمانوں کے لئے ننگ و عار تھا۔ انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا تو کجا ان سے ہاتھ ملانے پر بھی لوگ اسے رگڑ رگڑ کر دھوتے تھے۔ سرسید تحریک ہی کے طفیل یہ اجنبیت اور نفرت کی فضا دور ہوئی اور مسلمان انگریزی علوم وفنون کی تحصیل کی طرف راغب ہوئے۔

علی گڑھ تحریک کے روح رواں سرسید احمد خاں نے پہلے مذہب کی طرف توجہ کی اس موضوع پر خود انہوں نے تفسیر القرآن اور تبیین الکلام جیسی کتابیں لکھیں اس کے علاوہ سرسید نے دینی موضوعات پر کئی مضامین بھی لکھے جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے، ان چیزوں نے دینی ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ اور یوں سرسید تحریک نے مذہب میں ایک نیا طرز فکر پیدا کیا اور مذہب کے مطالعہ میں سائنس طرز فکر اور عقل و فطرت پر خاصہ زور دیا سرسید نے جس دینی فکر کی بنیاد رکھی اس کی ترقی میں ان کے رفقاء مثلاً شبلی، چراغ علی، نذیر احمد اور محسن الملک نے برابر کا حصہ لیا اور یوں علی گڑھ تحریک نے مذہب کے میدان میں بھی خاص کام کیا۔

اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۳ء

سرسید تحریک نے سیاسی میدان میں بھی مسلمانوں کی رہنمائی کی اگرچہ آج سرسید اور ان کے بیشتر رفقاء کے سیاسی افکار کو اچھا نہیں سمجھا جاتا کیونکہ سرسید تحریک کے سیاسی مسلک پر کتنی ہی تنقید کی جائے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سرسید نے اپنے عہد کے پیش نظر صحیح فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ اس طریقہ سے وہ مسلمانوں کو جو اقلیت میں تھے آگے بڑھا سکتے تھے اور تاریخ شاہد ہے کہ بعد میں علی گڑھ کے سپوتوں نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

سرسید تحریک کا بنیادی مقصد قوم کی بیداری کے لئے تھا۔ اور اس بیداری کے لئے انہوں نے ادب کو اپنا وسیلہ بنایا۔ چنانچہ سرسید تحریک کے ذریعہ ایسا ادب تخلیق ہوا جس نے مردہ قوم میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اس طرح سرسید تحریک نے ایک طرف ملک و قوم کی خدمت کی تو دوسری طرف شعر و ادب کی ترقی میں بھی اہم رول ادا کیا۔ سرسید تحریک کا جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ادبی خدمات کا بھی جائزہ لیا جائے۔

سرسید سے پہلے اردو نثر داستانوں اور تذکروں تک محدود تھی۔ سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین کو اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کی استادی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں ہے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ سرسید تحریک ہی کی بدولت اردو نثر کو صحیح معنوں میں "قوت گویائی" نصیب ہوئی ایک طرف سرسید تحریک نے اردو شاعری کو نئی جہت سے آشنا کیا تو دوسری طرف اردو نثر نے مختلف اصناف رائج کیں انشائیہ، سوانح نگاری تاریخ نویسی صحافت، دینی ادب تنقید اور ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز اس تحریک کی رہین منت ہیں اور یوں سرسید تحریک نے اردو نثر کو اس قابل بنایا کہ اس میں سنجیدہ علمی اور ادبی مسائل کو حسن و خوبی سے بیان کیا جا سکے۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں سرسید تحریک نے دینی تعلیم کو خاصہ متاثر کیا اس نے مذہب میں ایک نئے طرز فکر کا آغاز کیا۔ اس طرح سرسید تحریک نے تاریخ نویسی کو بھی اپنے مقصد کے حصول

کے لئے برتا۔ اُس سے پہلے تاریخ صرف وقائع نگاری تک محدود تھی۔ سرسید، شبلی اور دوسرے رفقا نے تاریخ نویسی کا ایک نیا معیار قائم کیا۔ چنانچہ خود سرسید نے گبن کی کتاب زوال سلطنت روما کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ "آثار الصنادید" "خطبات احمدیہ" اور اسباب بغاوت ہند" بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ شبلی بھی اگرچہ بعد میں سرسید کے مخالفین میں شمار ہونے لگے تھے لیکن شبلی اور ان کے دبستان کے دوسرے لوگ بھی سرسید تحریک ہی سے متاثر ہوئے ہیں، اس طرح بعد کے مورخ مثلاً عبدالرزاق کانپوری، شرر، اکبر شاہ خاں نجیب آبادی اور اسلم بیراج پوری بھی کسی نہ کسی حد تک سرسید تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اور یوں سرسید تحریک ہی کے ہاتھوں اردو میں تاریخ نویسی کا آغاز ہوتا ہے۔

سرسید تحریک ہی کے ہاتھوں اردو میں سوانح نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ حالی کی سوانح عمریاں حیات سعدی یادگار غالب اور حیات جاوید اور اس طرح شبلی کی سوانح عمریاں الفاروق، المامون، الغزالی، سیرت النبی اور دیگر سوانح عمریاں اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔ حالی اور شبلی نے جو سوانح عمریوں کو پیش کیں وہ آج بھی اردو میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں دیگر سوانح نگاروں میں نذیر احمد، چراغ علی، ذکاء اللہ اور شرر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سرسید تحریک ہی کے ہاتھوں اردو میں سوانح نگاری کا آغاز ہوا۔ اور اسی نے اس فن کو انتہائی عظمت اور بلندی عطا کی۔

جدید شاعری کا آغاز آزاد اور حالی کے ہاتھوں ہوا۔ لیکن اس سے پہلے ہی سرسید کے مضامین میں ایسے اشارے ملنے لگے تھے کہ شاعری کے موضوعات کو بدلا جائے یہ اشارے حالی کے یہاں کچھ زیادہ وضاحت سے نظر آتے ہیں اور ویسے بھی حالی، سرسید تحریک کے ایک سرگرم رکن تھے اس اعتبار سے اگر ہم یہ کہیں کہ اردو شاعری کو نئی جہت سے سرسید تحریک ہی نے آشنا کیا تو شاید بے جا نہ ہو۔

شاعری ہی کی طرح سرسید تحریک نے تنقید کا بھی اردو میں آغاز کیا اس سے پہلے ہماری

تنقید تذکروں تک محدود تھی۔ سرسید کے دنیا فرآنے کے بعد ہی حالی نے اپنی سب سے اہم تصنیف مقدمہ شعر و شاعری لکھکر اردو میں پہلی بار تنقید کا آغاز کیا۔ حالی کے بعد شبلی نے بھی اس میدان خاص میں اپنی تصانیف کے ذریعے کافی اضافہ کیا۔ چنانچہ حالی کی سوانح عمریاں اور مقدمہ شعر و شاعری شبلی کی شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر اسی سلسلے کی کڑی ہیں اور یوں سرسید تحریک ہی اردو میں تنقید کا بانی قرار پاتی ہے۔

سرسید تحریک کا بنیادی مقصد قوم کی بیداری تھا۔ چنانچہ اس بیداری کے لئے سرسید اور ان کے رفقا نے ادب کی مختلف اصناف کا سہارہ لیا۔ نذیر احمد نے اس سلسلے میں قصہ گوئی یا ناول نگاری کو اپنے خیالات کا وسیلہ بنایا یوں تو انہوں نے مضامین اور اپنے لیکچروں کے ذریعہ بھی قوم کو بیدار کرنے کی سعی کی۔ لیکن اپنے قصّوں کے ذریعے انہوں نے قوم خفتہ کو بیدار کرنے میں کافی اہم حصّہ لیا۔ چنانچہ انہوں نے ناول مرارت العروس بنات النعش، ابن الوقت، توبتہ النصوح، ایامی، رویائے صادقہ کے سہارے سماج اور مذہب کی اصلاح کا کام لیا۔ حالی نے بھی انھیں کی تقلید میں "مجالس النساء" لکھی۔ لیکن وہ اس میدان میں چل نہ پائے۔ بہرحال یوں سرسید تحریک ہی کے ہاتھوں اردو میں ناول نگاری کا آغاز ہوا۔

سرسید تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ انشائیہ نگاری اور صحافت ہے۔ سرسیّد نے لندن سے واپسی کے بعد "تہذیب الاخلاق" نام کا اخبار — نکالا۔ اور صحافت نگاری جو بہت پستی میں تھی سرسیّد اور ان کے رفقا ہی کا کمال ہے کہ انھوں نے صحافت نگاری کو وزن وقار عطا کیا اور سرسید کے جواب میں بے شمار اخبار اور رسائل نکالے گئے اور یوں اردو میں ایک معیاری صحافت نگاری شروع ہوئی اس صحافت نگاری ہی کے طفیل سرسیّد نے خود مضامین لکھے دوسروں سے مضامین لکھواتے ان مضامین بہت تنوع ہے ہر موضوع پر مضامین ہیں اور یوں سرسید اور ان کے رفقا نے اردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز کیا۔ یہی نہیں سرسید تحریک ہی نے اردو کو اس کا بنیادی اسلوب .. فراہم کیا۔ کیونکہ سرسید تحریک سے پہلے نثر کا

تحلستان

محمد علی کی زندگی از مہد تا لحد امواج حوادث کے تھپیڑے کھاتی رہی اور آلام زندگی کا نشانہ بنی رہی۔ دو سال کی عمر میں سایۂ پدر سے محروم ہو گئے انہوں نے حوصلہ مند اور مجسمۂ ایثار ماں کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت کے مدارج طے کئے۔ بریلی علیگڑھ اور آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ بعد فراغت تعلیم چند سال رام پور اور بڑودہ کی ریاستوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ لیکن محمد علی کی راست باز و بیباک فطرت اور فرزندان دولت انگلشیہ کے دربار، جہاں کا ہر دستور انگریز حکمرانوں کے چشم و ابرو کے اشاروں کا پابند ہوتا تھا، اجتماع ضدین تھے۔ اس طائر لاہوتی کا ذوقِ پرواز پہنائی آفاق کا متلاشی تھا۔ محمد علی نے ملازمت کو خیر باد کہا اور میدانِ صحافت میں ایک باکمال شہ سوار کی شان سے داخل ہو گئے۔

(۲)

محمد علی نے ۱۹۱۱ء میں اپنا مشہور زمانہ انگریزی اخبار کامریڈ جاری کیا جس کا دفتر ۱۹۱۲ء میں دہلی منتقل ہو گیا۔ صوری و معنوی اعتبار سے کامریڈ عدیم المثال تھا۔ محمد علی کے بے لاگ تبصرے اور معیاری مضامین اخبار کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ کرتے تھے۔ بحیثیت صحافی محمد علی کی صلاحیت اور لیاقت غیر متنازعہ ہے۔ ان کو انگریزی زبان و ادب پر عبور حاصل تھا۔ شکسپیئر کے ڈراموں کے مانے ہوئے متبحر تھے۔ تاریخ اور مختلف ممالک کے آئین کا عمیق مطالعہ تھا۔ حالات عالم اور کوائف زمانہ پر ان کی گہری نظر رہتی تھی۔ لہٰذا کامریڈ میں ان کی لکھی ہوئی ہر سطر اندرون و بیرون ملک بڑی توجہ سے پڑھی جاتی تھی۔ انگریزی تحریروں کے اسلوب نگارش میں انہوں نے میکالے کی کامیاب تقلید کی۔ معیار کی بلندی میں کامریڈ انگلستان کے اخباروں کا ہمسر تھا۔ کامریڈ ــــــ مجموعی طور پر صرف پانچ سال نکالا۔ لیکن اپنے اعلیٰ معیاری راست بازی اور بے خوفی کی بنا پر ہندوستان کی انگریزی صحافت کی تاریخ میں شان امتیاز کے ساتھ تابندہ رہے گا۔

نخلستان

سیّد محمد حامد علی
گورکھپور

# تھی اِس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

قدرت نے محمد علی کو نوع بہ نوع صفات جمیلہ سے نوازا تھا۔ وہ بیک وقت ایک شریف النفس انسان، خدائے ملک و ملت، سربکف مجاہد، شیر دل رہنما، صاحب فکر و نظر، آتش نوا خطیب، انگریزی اور اُردو کے مسلم الثبوت صحافی، بلند پرواز انشاء پرداز اور حقیقت نگار شاعر تھے،

محمد علی ایک دل آویز شخصیت کے مالک تھے۔ قلب مجلا اور سادہ مزاج کے ساتھ ایثار و قربانی کا مادہ انھیں قدرت سے ودیعت ہوا تھا۔ جفاکشی، بردباری، اور خودداری ان کی طبیعت کا خاصہ تھیں انتہائی نامساعد حالات میں بھی بار احسان سے گریز کرتے تھے، بے خوفی اور بے باکی ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ انہوں نے بڑی سے بڑی شخصیت کے سامنے بھی دلیری سے اظہار حق کیا۔ پہلی موتمر اسلامی جو ۱۹۲۶ء میں حج کے موقع پر منعقد ہوئی تھی، وہاں محمد علی نے سلطان ابن سعود کے اعلان ملوکیت کی مخالفت ان سے مخاطب ہو کر سخت الفاظ میں کی تھی جبین شاہ پر بل پڑ جانے کا وسوسہ ان کے دل میں پیدا نہیں ہوا۔ دراصل محمد علی کی شخصیت میں اقبال کا مثالی مرد مومن پنہاں تھا۔ وہ مرد مومن جس کے پاس چیتے کا دل اور شاہین کا تجسس ہوتا ہے اور جو حق گوئی و بے باکی کو آئین جواں مردا سمجھتا ہے۔

اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۳ء

ایک محب وطن اُردو اخبار کی ضرورت کے پیش نظر مولانا محمد علی نے ۱۹۱۳ء میں دہلی سے ’ہمدرد‘ کا اجراء کیا۔ مولانا کا معیار صحافت بہت اعلیٰ و ارفع تھا۔ لہٰذا انہوں نے ’ہمدرد‘ کے لئے مثالی عملے کا تقرر کیا۔ ہمدرد نے اُردو صحافت کے ایک نئے دور کا آغاز کیا ہمدرد اُردو کا پہلا اخبار تھا جو ٹائپ کے حروف میں چھپا اور پہلا روزنامہ تھا جس کے مضامین کا معیار بہت بلند ہوتا تھا۔ طنز و مزاح نگاری کے اعلیٰ معیار قائم کرنے میں ’ہمدرد‘ کو اولیت حاصل ہے۔ کامریڈ کے عملے سے وابستہ سید غلام ربانی کے مطابق ’ہمدرد‘ نے ”مسلمانوں میں اخبار بینی کا شعور اور سیاسی شعور پیدا کیا“ مولانا محمد علی نے اپنے اخبارات کے لئے مبتذل یا پست معیار کے اشتہارات کبھی قبول نہیں کئے۔ حالانکہ دونوں اخبارات خسارے سے نکلتے رہے۔

مولانا محمد علی کی طبعی راست گوئی اور بے خوفی صحافت میں بھی رنگ لائی ۱۹۱۴ء میں لندن ٹائمز میں ایک اشتعال انگیز اور لغو مضمون شائع ہوا۔ جس کے ذریعہ ترکوں کو انگریزوں کے خلاف جنگ میں شامل نہ ہونے کی ترغیب دی گئی تھی۔ اسی زمانے میں یوپی کے ایک ڈپٹی کلکٹر مسٹر عزیز الدین نے ایک مضمون بعنوان ”ترکوں کی حماقت“ لکھ کے حق نمک ادا کیا تھا۔ ان مضامین کو پڑھ کے مولانا تڑپ گئے اور انہوں نے چالیس گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد ان کا جواب ”چوائس آف دی ٹرکس“ کے زیر عنوان لکھ کر کامریڈ میں شائع کر دیا۔ انتہائی جفاکشی اور عرق ریزی سے لکھا ہوا۔ وہ مضمون بہت ہی مدلل اور پر از حقائق تھا۔ لیکن فرنگی استعماریت کے لئے مہلک اور ضرر رساں۔ محمد علی پر مقدمہ چلا وہ اور مولانا شوکت علی پانچ سال کے لئے آہنی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیئے گئے۔ ہمدرد اور کامریڈ کی ضمانت بحق سرکار ضبط ہو گئی۔ کامریڈ کی اشاعت فوراً بند ہو گئی اور ہمدرد چند ماہ نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔ ۱۹۱۹ء میں رہا ہونے کے بعد چند سال تک محمد علی کی ساری توجہ صحافت کے بجائے سیاست پر رہی، لیکن ۱۹۲۴ء میں کراچی کے سیٹھ عبداللہ ہارون کے اصرار پہ دونوں اخبارات کو دوبارہ جاری کیا۔ لیکن کامریڈ دو سال کے بعد ۱۹۲۶ء میں اور ہمدرد ۱۹۲۹ء میں بند ہو گیا۔

صحافت کے میدان میں مولانا محمد علی کی منفرد حیثیت تھی۔ مالی پریشانیوں کے باوجود انہوں نے صحافت کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا۔ اِن کی صحافت کا طرۂ امتیاز بے خوفی، صاف گوئی حق نوازی اور باطل شکنی تھی۔ صحافت میں انہوں نے ہمیشہ انصاف اور ایمانداری کو مشعل راہ بنایا۔ محمد علی کی زندگی کا ہر رخ آئینے کی طرح شفاف تھا۔ اور اس آئینے میں وہ دوسروں کو بھی دیکھتے تھے جس کا چہرہ بے عیب نظر آیا۔ اس کی تعریف میں رطب اللساں ہوگئے جس میں بدنمائی نظر آئی اس کی حروف گیری سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان کا یہ اصول اور رویہ دوست و دشمن کے ساتھ یکساں تھا۔ چند مثالیں ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ محمد علی خاں (راجہ محمود آباد) اور سر آغا خاں مولانا کے قدر دانوں میں تھے۔ لیکن جب ان کی چند باتوں کو قابل اعتراض سمجھا تو ان پر کڑی تنقید کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکے۔ صحافت میں مُداہنت، بد دیانتی اور بے جا پاسداری ان کے لئے شجر ممنوعہ کا درجہ رکھتی تھیں گاندھی جی کا ان کے دل میں بے حد احترام تھا۔ شوکت علی ان کے دل کی دھڑکن تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی اِن کے جگری دوست تھے، مولانا سلیمان ندوی کے علم و فضل کے وہ معترف تھے، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کی وہ عزت کرتے تھے لیکن "ہمدرد" کے صفحات شاہد ہیں کہ محمد علی نے ان لوگوں سے بعض امور پر شدید اختلاف کیا۔ علامہ اقبال کے کلام کے وہ شیدائی تھے۔ اور برملا اعتراف کرتے تھے کہ اقبال کے کلام کے ذریعہ انہوں نے اسلام کی بصیرت حاصل کی لیکن تحریک خلافت کے سیاق و سباق میں اِن پر سخت تنقید کی۔ اس کے برعکس اِن کی انصاف پسند طبیعت کسی دشمن پر بھی ظلم نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ریاستی حکمرانوں کے سخت مخالف تھے۔ لیکن جب انگریزوں نے ریاست نابھہ کے اصول پسند اور غیور راجہ کو گدی سے اتار دیا تو راجہ کی حمایت میں مولانا نے اپنے اخباروں کے کئی صفحات سیاہ کرڈالے۔

محمد علی کے لئے صحافت نہ تو حصول زر کے لئے تھی اور نہ وسیلۂ نام و نمود۔

قاضی عبدالغفار محمد علی کی صحافت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

نخلستان

"صحافت اُن کی زندگی کا کوئی واحد مقصد نہ تھا۔ بلکہ
وہ کسی بہتر مقصد کے لئے محض آلۂ کار تھی۔۔۔ ان کی صحیفہ
نگاری سے اُردو صحافت کا ایک نیا دور شروع کیا تھا اور
وہ اُردو کی پسماندہ صحافت میں بعض اہم اصلاحات
کے بانی تھے۔"

محمد علی نے ملک و ملت کی خدمت کے لئے صحافت کو اپنایا تھا۔ ان کی صحافت کے کچھ بنیادی اصول تھے جن پر اول تا آخر وہ سختی سے عمل پیرا رہے۔ ان کا خیال تھا کہ اخبار میں اس کے مدیر کی شخصیت منعکس ہونی چاہئیے۔ اِن کی شخصیت ترغیبات سے بالاتر ہے۔ اپنی صحافت کے بارے میں رقم طراز ہیں:۔

"میں نے صحافت پیسہ کمانے کے لئے نہیں اختیار کی
بلکہ ملک و ملت کی خدمت کرنے کے لئے۔ ہمدرد میں
ہزاروں خامیاں ہیں اور ان خامیوں کو مجھ سے زیادہ
کوئی نہیں جانتا۔ لیکن "ہمدرد" میں ایک خوبی ہے جس کی
طرف اگر اشارہ کروں تو گناہ نہ ہوگا۔ ہمدرد کے لئے
ہر شخص ہر وقت کہہ سکتا ہے کہ وہ کس رائے کا اظہار کریگا
نہ اس میں تلون ہے۔ نہ وہ اپنی رائے بیچا کرتا ہے۔"

(ہمدرد ۲۹ر فروری ۱۹۲۸ء)

مولانا محمد علی ہمیشہ سطحی اور عامیانہ صحافت سے اپنا دامن بچاتے رہے۔ ایک زمانے میں خواجہ حسن نظامی نے مولانا پر اپنے اخبار کے ذریعے حملے شروع کر دیئے جن میں زیادہ حملے ان کی ذات پر ہوتے تھے۔ مولانا محمد علی نے ان سب کے مفصل اور مدلل جواب دیتے تھے۔ لیکن نہ کبھی معیار سے گر کے لکھا اور نہ جذبۂ بغض و عناد سے مغلوب ہو کر۔ آخر خواجہ صاحب کو اپنے بے بنیاد اعتراضات کی غیر معقولیت کا احساس ہوا۔ اور انہوں نے اپنے اخبار میں "ختم خواجگی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھکر اس بحث کو ختم کر دیا۔ بعد میں خواجہ صاحب نے اعتراف کیا۔
اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء

"اخبار نویسی میں ان (محمد علی) کی نظر بہت بلند تھی۔ اردو کے ایک روزانہ اخبار کے لئے انہوں نے جو شان و اہتمام کر رکھا تھا وہ اردو اخباروں کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔"



انگریز حکمرانوں کے اشارے پر دہلی کا ایک انگریزی اخبار برابر ان کے خلاف لکھا کرتا تھا لیکن کبھی اس کو اہمیت نہ دیتے تھے۔ مولانا کے خلوص کار اور بے داغ کردار نے اس کی زبان بند کردی۔ محمد علی کے اعلیٰ صحافتی کردار کی ایک مثال ان کی شرافت نفس کی آئینہ دار ہے لالہ لاجپت رائے محمد علی کے سخت مخالف تھے لالہ جی کا انگریزی اخبار "پیپل" ہمیشہ مولانا کی مخالفت کرتا تھا۔ اور ان کے لئے نئی نئی گالیوں کی اختراع کیا کرتا تھا۔ مولانا ان سب کا سنجیدگی کے ساتھ پر از خفالق جواب دیا۔۔ کرتے تھے۔ لیکن سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرے میں جب لالہ جی مضروب ہوئے تو محمد علی یورپ کی واپسی کے بعد فوراً ان کی عیادت کو گئے چند روز بعد جب لالہ جی کی وفات ہوگئی تو محمد علی کی وسیع القلبی نے پرانی باتیں فراموش کردیں۔ اور انہوں نے لالہ جی کی ملکی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی موت کو قابل رشک قرار دیا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح صرف بپاس خاطر احباب وہ غلط بیانی یا عیب پوشی سے گریز کرتے تھے اسی طرح بدترین دشمن کی خوبیوں کا اعتراف بھی کرتے تھے اس اعلیٰ صحافتی کردار کا نمونہ شاید چند ہی مقام پر نظر آئے گا۔

محمد علی کی والہانہ، بے تکلف اور پر اثر طرز نگارش ان کو بہت سے اعلیٰ پائے کے ادیبوں سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ ان کی عبارت میں جو روانی ہے۔ تصنع اور نمائش سے اجتناب ہے اور جو دل نشین انداز ہے وہ کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے وہ اسلوب کی آراستگی پر اظہار مدعا کو ترجیح دیتے تھے۔ دولت فرنگ سے شدید جذبۂ نفرت ان کی تحریر کا محور ہوتا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کہیں کہیں حق کے مقابلہ میں باطل سے ان کی نفرت کا سیلاب زبان و بیان کے اعتدال کو بہا لے جاتا تھا۔ لیکن وہ اپنی فطرت کی گرمی بجنسہٖ اپنی تحریروں میں منتقل کر دینے پر قادر تھے۔ صفحۂ قرطاس پر ان کے دیدۂ

نخلستان

بے خوابیاں منعکس ہوتی تھیں، لیکن ان میں ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ کبھی اپنے موضوع سے بھٹکتے نہیں تھے۔ وہ اپنی تحریروں میں اپنے دل کی تڑپ اپنے ہائے نیم شبی اور اپنی آہ سحر گاہی سمو دیتے تھے اسی بنا پر ان کی تحریروں میں جلال و جمال کا خوبصورت امتزاج ہے ان کے علم و فضل کی گہرائی اور فکر و نظر کی گہرائی کی بدولت اندرون و بیرون ملک کے تقریباً تمام اہم معاملات اور واقعات ان کے اخبار کی زینت بنتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کے اخبارات محبوب خلائق رہے اور ان کی بڑی قدر و قیمت ہے محمد علی کی تحریروں کی ایک تاریخی داستاویز کی طرح ہمیشہ اہمیت باقی رہے گی۔

(۴)

دسمبر ۱۹۱۹ء میں قید فرنگ سے رہائی کے بعد علی برادران نے سیاست میں قدم رکھا۔ اور کانگریس کے اجلاس منعقدہ امرتسر میں شرکت کی۔ اس وقت ملک جد و جہد آزادی کے نازک ترین دور سے گزر رہا تھا۔ انگریز پہلی جنگ عالمگیر میں کامیاب و کامراں ہونے پر سرشار تھے۔ ہندوستانیوں پر ان کی نگاہ شرربار تیز تر ہو گئی تھی۔ ملک میں بیداری کی ہر کوشش کو وہ سختی سے کچلنے لگے تھے۔ لیکن مولانا محمد علی کی خطر پسند طبیعت کو وہی فضا سازگار ہوئی۔ امرتسر کانگریس کے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے۔ مولانا محمد علی نے کہا:

> "ہم یہاں اس لئے نہیں جمع ہوئے ہیں کہ دو زانو جھک کر یہ درخواست کریں کہ ہم کو جیل خانوں سے آزاد کرادو۔ ہم کو پھانسی کے تختے سے بچالو۔ میں اپنے لئے اپیل نہیں کرتا۔ مجھے چند آدمیوں کی رہائی کی فکر نہیں ہے۔ میں اس ملک کے نام پر بول رہا ہوں جس کی آزادی ہم کو بہت زیادہ عزیز ہے۔ بہ نسبت کسی شخصِ واحد کی آزادی کے، خواہ اس کی پوزیشن اور حقیقت کتنی ہی اعلیٰ اور بڑی کیوں نہ ہو۔ میں ضرور جیل بھیجا جاؤں۔ مسٹر تلک اگر ضرورت ہو تیسری مرتبہ جیل خانے روانہ کر دیئے جائیں۔ مسز بسینٹ دوبارہ نظر بند کر دی جائیں ... لیکن ہندوستان کو آزاد ہونے دیجئے۔ تاکہ کوئی شخص

آئندہ کسی ہندوستانی مرد اور عورت کے بارے میں
یہ نہ کہہ سکے کہ تو پیدائشی غلام ہے۔"

پہلی ہی سیاسی تقریر سے لوگوں کو محمد علی کے تیور اور عزم کا اندازہ ہو گیا۔ انہوں نے تلک کو اپنا سیاسی گرو تسلیم کیا کیونکہ محمد علی کی طرح تلک بھی ملک کی سیاسی تحریک کو عوامی بنیاد فراہم کرنے کے قائل تھے۔ اور ان کا مقصد بھی حکومت خود اختیاری کا حصول تھا۔ محمد علی اور تلک دونوں مذہب کو سیاسی مقصد کے لئے استعمال کرنے کے حق میں تھے۔ محمد علی گاندھی جی سے متاثر تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ اور ملک کے لئے گاندھی جی کی خدمات کے معترف تھے۔

کانگریس میں علی برادران کی شرکت سے ہندوستان کی سیاست میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ محمد علی کی تقلید میں اور ان کی تحریک و ترغیب سے ملک کے طول و عرض میں مسلمان کانگریس میں شامل ہونے لگے۔ کانگریس کی اہمیت اور مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا۔ اور وہ ایک عظیم قومی جماعت کی حیثیت سے آگے بڑھنے لگی۔ اس سے پہلے کانگریس میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ برطانوی سامراج کی بیخ کنی کے لئے محمد علی اپنی پوری قوت عمل کے ساتھ سرگرم تھے۔ تحریک خلافت دراصل محمد علی کی فکر و نظر کی مرہون منت ہے جس نے جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا ہے مولانا نے اپنی مجاہدانہ تگ و دو سے ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں خلافت کمیٹی کی شاخوں کا جال بچھا دیا اور ملک کے طول و عرض میں سرفروشوں کی ایک ایسی فوج تیار کر دی جو طبل جنگ کے لئے گوش برآواز تھے۔ مولانا محمد علی کی سرکردگی میں تحریک خلافت کے پرجوش مجاہدین نے صحیح وقت پر اپنی کمک سے کانگریس اور آزادی کی جنگ کو طاقت بخشی اور ان میں تیزی اور سرگرمی پیدا کر کے آزادی کی منزل کو قریب تر کر دیا۔

خلافت کمیٹی اور کانگریس کے باہمی مشورے اور تعاون سے ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون یا ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی، مہاتما گاندھی اور علی برادران نے ایک ساتھ پورے ملک کا دورہ کیا ملک بھر میں جنگ آزادی کے شعلے بھڑکنے لگے جس کی تمازت قصر بکنگھم کی دیواروں کو پگھلانے لگی۔ محمد علی ایک شعلہ نوا، مقرر تھے ان کی تقاریر نے ملک میں بیداری عمل کی فضا پیدا کی۔ نخلستان

کردی۔ محمد علی کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ اس طرح موڑ دیا کہ وہ انگریزوں کے خلاف الگ محاذ جنگ پر لڑنے کے بجائے برادران وطن کے ساتھ مل کر میدان میں آگئے اور اپنی سرفروشی و جانبازی کی داستان سے تاریخ ہند کو روشن کر گئے۔ ان کا دوسرا عظیم کارنامہ کانگریس کو ایک عظیم قومی جماعت کی حیثیت سے آگے بڑھانا ہے۔ مولانا محمد علی نے ایک کامیاب جمہوریت کے قیام و بقا کے لئے پانچ اصولوں پر زور دیا تھا۔ یعنی ہندو مسلم اتحاد، اقلیتوں میں احساس تحفظ، نسل پرستی سے گریز، طریقہ تعلیم کی اصلاح اور رائے عامہ کی تربیت۔ موجودہ دور میں بھی ان اصولوں کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب کے بغیر قوم پرستی میں حق و باطل کی تمیز ناممکن ہے اس لئے محمد علی نے ہندوستانیت اور پان اسلامیت کے درمیان مصالحت کی راہ نکالی۔ اور ہندوستان میں مذاہب کے اتحاد کا نصب العین پیش کیا جس کو وہ معاشرتی وفاق یا وفاق مذاہب کہتے تھے۔

ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کو برطانوی فوج کی ملازمت سے روکنے کے الزام پر ۱۹۲۱ء میں محمد علی دو سال کے لئے دوبارہ آہنی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیئے گئے۔ ان کی گرفتاری کے موقع پر مولانا آزاد نے لکھا تھا:۔

"ان کی گرفتاری میں ہمارے لئے کوئی غم نہیں ہے البتہ ان (علی برادران) کی عزت پر رشک! اور ان کے اور اپنے مقصد کے لئے پہلے سے زیادہ مستعدی ہونی چاہیئے۔ ۱۹۱۵ء میں ان کی نظربندی کے ۹ ماہ بعد مجھے نظربند ہونا پڑا تھا اور میں نے اس وقت حسرت سے کہا تھا کہ اس راہ میں وہ مجھ سے بازی لے گئے آج بھی ہم افسوس کرنے کی جگہ سچی مبارک باد دیں گے اور کہیں گے کہ ہم سب سے بازی لے گئے۔"

۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی کو کناڈا کانگریس اجلاس کے صدر منتخب ہوتے ان کے دور صدارت میں پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے۔ نہرو جی اپنی "آپ بیتی" "میری کہانی" میں مولانا کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"ان کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی بہت شدید ہوا کرتی تھیں
اور میں خوش قسمتی سے اِن لوگوں میں تھا جنھیں وہ پسند کرتے تھے
ہم میں الفت و محبت کے تعلقات تھے اور ہم ایک دوسرے کی
بہت قدر کرتے تھے۔ (میں) ان کی غیر معمولی سرگرمی، زبردست
قوتِ عمل اور انتہائی ذکاوت کا دلدادہ تھا۔۔۔ ہندوستان کی
آزادی کے وہ دل سے شیدائی تھے۔"

نہرو جی کی اس تحریر سے مولانا محمد علی کی قدآور شخصیت بے پناہ صلاحیت اور ملک کی سیاست میں ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تحریک ترک موالات کا ایک خاص جز حکومت سے مالی امداد پانے والے اداروں سے قطع تعلق بھی تھا۔ اس جز پر عمل درآمد محمد علی کے لئے سخت آزمائش تھی جس میں وہ پورے اترے۔ کیونکہ اس کا پہلا نشانہ علی گڑھ کو بننا تھا۔ اور علی گڑھ سے محمد علی کو عشق تھا۔ مولانا شوکت علی کی تحریر کے مطابق انھیں:-

"علی گڑھ سے بے حد محبت تھی۔ اور اولڈ بوائز الیوسی ایشن سے خاص تعلق
تھا۔۔۔ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ جب لکھی جائے گی تو اس میں
بھی جہاں ہز ہائینس سر آغا خاں، نواب وقار الملک مرحوم صاحبزادہ
آفتاب احمد خاں مرحوم کی خدمت کا ذکر آئے گا۔ وہاں محمد علی
مرحوم کی خدمات جلیلہ کا اعتراف بھی ساتھ ہی کرنا پڑے گا علی گڑھ
اور علی گڑھ کے طالب علموں سے محمد علی کو ایک عشق تھا۔"

محمد علی علی گڑھ تحریک کے حامی تھے اور سر سیّد کی خدمات کے دل سے قدرداں تھے لیکن وہ علی گڑھ کی حکومت نوازی اور تہذیب فرنگ سے مرعوبیت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ علی گڑھ میں انگریز اساتذہ کی تقرری پر بھی وہ معترض تھے جو تدریس سے زیادہ ترغیب کے فرائض انجام دیتے تھے اور طلبہ کے ذہن کو مسموم کرتے تھے۔ محمد علی ان فرنگی اساتذہ کے بخشیدہ فن شیشہ گری کے بجائے نونہالانِ قوم کو خارہ شگافی کی تربیت دلانا چاہتے تھے۔ اولاً انھوں نے
نخلستان

علی گڑھ یونیورسٹی میں اصلاح کی کوشش کی لیکن وہاں اِن کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی تو انہوں نے علی گڑھ ہی میں دیگر عمائدین قوم کے تعاون فکر و عمل سے ۱۹۲۱ء میں جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد اس طرح کی تعلیم و تربیت تھا۔ جو بچوں کو خدا پرست مسلمان اور محبِ وطن ہندوستانی بنائے۔ کچھ دنوں بعد جامعہ ملیہ دہلی منتقل ہوگیا اور اب یونیورسٹی بن چکا ہے

۱۹۳۰ء میں سخت علالت اور معالجین کے منع کرنے کے باوجود فرض شناس محمد علی نے لندن کی گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور وہاں پر وہ شہرہ آفاق تقریر کی جس نے ایوان حکومت کو لرزہ براندام کر دیا۔ اور سارے عالم میں محمد علی کی جرأت، حق گوئی اور خطابت کی شہرت ہوگئی۔

انہوں نے کہا:۔

"میں یہاں درجہ نو آبادیات طلب کرنے نہیں آیا ہوں، نہ میں درجہ نو آبادیات کے حصول پر یقین رکھتا ہوں، صرف ایک چیز ہے جس کا میں عہد کرچکا ہوں اور وہ کامل آزادی ہے۔ میں دوستانہ طور پر ایمان داری اور صفائی سے کہتا ہوں کہ تمہارا سب سے بڑا گناہ ہندوستان کی بے دست و پائی ہے۔

ہمارے ملک میں بتیس کروڑ نفوس انسانی آباد ہیں، اگر وہ لاکھوں کی تعداد میں قحط اور طاعون وغیرہ سے ہلاک ہو سکتے ہیں تو یقیناً ان میں سے کچھ برطانوی گولیوں سے مرنے کے لئے بھی تیار ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ سبق ہے جو گاندھی جی ہم کو سکھانا چاہتے تھے اور یہی وہ سبق ہے جو ہم کو اب سیکھ لینا چاہیئے۔۔۔ اصل میں جو سوال ہم کو سب سے زیادہ پریشان کر رہا ہے وہ ہندو مسلم سوال ہے لیکن اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ فی الحقیقت ہندو مسلم مشکلات بھی فوجی مشکلات کی مانند خود تمہاری پیدا کردہ ہیں۔۔۔ خدائے برتر کے حکم کے سامنے میں اوّل مسلمان ہوں دوئم مسلمان ہوں اور آخر مسلمان ہوں۔۔۔ لیکن جن امور کا ہندوستان سے تعلق ہے،

ہندوستان کی آزادی سے تعلق ہے، ہندوستان کی فلاح وبہبود سے تعلق ہے۔ میں اولاً ہندوستانی ہوں دوئم ہندوستانی ہوں اور آخر میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی کے سوا کچھ نہیں ... آج جس مقصد کے لئے میں یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنے وطن کو صرف اس صورت میں واپس جانا چاہتا ہوں کہ ارمغان آزادی میرے ہاتھ میں ہو ورنہ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔ اور اس کے بجائے ایک غیر ملک میں مرنا پسند کروں گا۔ بشرطیکہ وہ ایک آزاد ملک ہو لیکن اگر ہندوستان میں تم ہمیں آزادی نہ دو گے تو یہاں پر میرے لئے ایک قبر کی جگہ تمہیں دینی پڑے گی۔"

محمد علی کی یہ تقریر کوئی معمولی تقریر نہیں تھی ان کی آواز میں ہندوستان کے بتیس کروڑ دلوں کی دھڑکن شامل تھی۔ حصول آزادی کے عزم بالجزم کا اعلان تھا۔ تمام عمر محمد علی کی گفتار و کردار میں ہم آہنگی رہی اور وقت آخر بھی اپنے قول کی صداقت کا ثبوت دیتے ہوئے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں ایک شہید کی رشک خلق موت سے ہمکنار ہوئے ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر — یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مفتیٔ اعظم فلسطین کی خواہش و اصرار پر جسد خاکی کی تدفین سرزمین انبیا بیت المقدس میں مسجد عمر میں ہوئی۔

محمد علی، بقول رشید احمد صدیقی "وہ تیغ اصیل تھے جو رزم میں بے پناہ تھی اور بزم میں ایک جلوہ گری"

گاندھی جی نے ان کی موت پر کہا:۔

"مولانا محمد علی جوہر کی موت اس وقت واقع ہوئی جب کہ ہمیں اُن کی ضرورت تھی۔ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے زبردست کام کیا ہے"

مولانا محمد علی کی عظیم شخصیت، بے پناہ صلاحیت اور اعلیٰ لیاقت کا ساری دنیا نے

اعتراف کیا، مشہور دانشور ایچ۔جی۔ویلز کہتے ہیں "محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا۔ ان کی زبان برک کی زبان تھی اور ان کا قلم میکالے کا قلم تھا"

محمد علی نے اپنی تمام طاقت، صلاحیت اور زندگی قوم و ملت پر نثار کر دی، سیاست ہند کی تاریخ میں ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۴)

محمد علی نے شعر و ادب کے گہوارے میں پرورش پائی تھی۔ اور بچپن ہی سے ان میں سخن فہمی اور شعر گوئی کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ بڑے بھائی ذوالفقار خاں گوہر کی صحبت نے اس ذوق کو جلا بخشی۔ ان کا لڑکپن اس دور سے گزرا تھا۔ جب دہلی اور لکھنؤ میں شعر و سخن کے چراغوں کی روشنی دھیمی ہو چکی تھی۔ اور دربار رام پور کی ادب نوازی اور قدردانی نے بہت سے اساتذہ کو پناہ دے رکھی تھی، امیرؔ، عروجؔ، داغؔ، جلالؔ اور تسلیمؔ جیسے مشاہیر سخن وہاں مقیم تھے۔ اور دربار کے علاوہ گھروں میں بھی شعر و سخن کے چرچے تھے حسن اتفاق سے جوہر کے مکان کے عقب میں داغؔ کی قیام گاہ تھی۔ داغؔ کی صحبت نے بھی شعر گوئی کے شوق کو ابھارا، کالج میں آنے کے بعد سجاد حیدر یلدرم کی صحبت و رفاقت سے ذوقِ سخن اور نکھر گیا۔

محمد علی کے زمانۂ طالب علمی کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں اور جوہر کی علوئے فکر اور ندرت بیان کی داد دیں ؎

۱۔ خوش قسمتی کے آگے جھکایا نہ سر کبھی — اس خانماں خراب کو کتنا غرور تھا

۲۔ اغیار کو ہو لذت آغاز مبارک — انجام محبت میں مزہ اور ہی کچھ ہے

۳۔ اب تو کشتی کے موافق ہے ہوا — ناخدا ایک دیر ہے لنگر کھلے

۴۔ نادانیاں ہزار سہی، دوستو مگر — دانا بھی ہو گئے انھیں نادانیوں سے ہم

محمد علی کی شاعری کا زیادہ حصہ ان کی قید فرنگ کی یادگار ہے۔ محمد علی نہ تو کسی کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے اور نہ چشم و مژگان کے مقتول اور نہ کسی سراپا ناز کے عاشق دست دراز تھے۔ جس کو اکثر دھول دھپا تک برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ان کا محرکات شاعری سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ محمد علی کی شاعری کا محرک وہ انقلابی دور ہے جس سے وہ گزر رہے

تھے یا ان کی زندگی کے نشیب و فراز اور خوشی و غم اس کے محرک ہیں۔ اسی لئے ان کی شاعری سراسر آمد ہے اور ان کی شخصیت کی طرح تصنع اور تکلفات سے عاری۔ محمد علی کے اشعار ۲
ان کے دلی جذبات اور کیفیات کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ ایام اسیری کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔[۵]

۱۔ تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں — اب ہونے لگیں ان سے خلوت کی ملاقاتیں
۲۔ معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت — اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
۳۔ مستحقِ دار کو حکم نظر بندی ملا — کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ۴
۴۔ یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر — دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

جیل میں اپنی چہیتی بیٹی آمنہ کے مرض الموت کی خبر ملی تو کس طرح دل نکال کر کاغذ پر رکھ دیا۔ قادر مطلق پر بھروسہ، اس سے رحمت کی منت اور پھر تسلیم و رضا کی مثال اس کے ساتھ شاید کہیں اور ملے ۔

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں — تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم — آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو — نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

احساسات شدید اور جذبات فراواں اکثر حد و اعتدال سے نکل کر جنوں کی سرحدوں کو چھو لیتے ہیں دیگر مواقع پر یہ عیب ہو سکتا ہے ۔ لیکن شعر کے لئے یہ عیب نہیں ہے محمد علی کے بہت سے اشعار ان کی جرأت گفتار اور مثالی کردار کے آئینہ دار ہیں۔ محمد علی جوہر کے وسیع علم اور کثرت مطالعہ و مشاہدہ نے ان کی شاعری کو مضامین نو بہ نو سے مزین کر دیا ہے، جوہر کی شاعری قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی کا نمونہ ہے۔ ان کی شاعری جذبات دلی کی عکاس ہونے کے علاوہ اس دور کے احوال و کوائف کی آئینہ دار ہے ۔ جوہر کی شاعری جنگ آزادی کی تاریخ کی مستند اور معتبر دستاویز ہے۔ انگریز حکمرانوں کے ظلم و ستم کی سچی داستان ہے۔ ان کا ہر شعر کسی نہ کسی حقیقت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اسی بنا پر جوہر کے کلام کا انتخاب کرنا مشکل ہے ان کا کلام سراپا انتخاب ہے ۔ محمد علی کی طرح ان کے کلام کو بھی حیات ابدی حاصل ہے اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کوئی صاحب نظر ہی لگا سکتا ہے ۔

عزیز تر ہے متاعِ امیر و سلطاں سے وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی (اقبالؔ)

محمد علی کے مزاج میں فکر و عمل کا خوشگوار امتزاج تھا۔ وسعت مطالعہ، غور و فکر اور مشاہدات و تجربات نے اِن کی ذات کو انسان دوستی احترام مذہب اور ہر نوع کی عصبیت سے گریز کی صفات جمیلہ سے مزین کر دیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمان کے درمیان انگریز سامراج کی تعمیر کردہ دیوار کو انہوں نے اپنی ضربت کاری سے مسمار کر دیا تھا اور چشم عالم نے نظارہ کر لیا کہ محمد علی کے دورِ رہنمائی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اخوت، محبت اور تعاون کی جو فضا قائم ہو گئی تھی تاریخ میں اس کی مثال ملنی محال ہے اور جس کے دیکھنے کو آج بھی آنکھیں ترس رہی ہیں۔ محمد علی ہندوستان کے اُن رہنماؤں میں تھے جنہوں نے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو تمام مسائل پر ترجیح دی اور اپنی جانفشانی سے اُسے کامیاب کر کے دکھا دیا۔ محمد علی نے آزادیٔ وطن کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔ وہ اسی کے لئے زندہ رہے اور مرے بھی اسی کے لئے، ان کی وفا کیشی، خلوص کار اور جاں سپاری نے انھیں حیاتِ جاوداں بخش دی۔

# (مآخذ و مصادر)


۱۔ کلام جوہر مکتبہ جامعہ ۱۹۳۸ء

۲۔ علی برادران اور ان کا زمانہ از سید محمد ہادی — مکتبہ جامعہ ۱۹۷۸ء

۳۔ محمد علی جوہر شخصیت اور شاعری از محمد مونس — ادارہ انیس اردو الہ آباد

۴۔ مولانا محمد علی ایک مطالعہ — مرتبہ عبداللطیف اعظمی — علمی ادارہ دہلی ۱۹۸۰ء

۵۔ تازہ مضامین ابو الکلام — مرتبہ مشتاق احمد — مطبوعہ میرٹھ ۱۹۲۲ء

۶۔ آخری تقریر — خلافت پریس بمبئی

۷۔ مضامین محمد علی — مرتبہ محمد سرور — مکتبہ جامعہ ۱۹۳۸ء

۸۔ میری کہانی حصہ اول (ترجمہ)، جواہر لال نہرو — مکتبہ جامعہ ۱۹۵۰ء

۹۔ مولانا محمد علی۔ شخصیت اور خدمات۔ مرتبہ نظر برنی — ادبی سنگم دہلی

۱۰۔ گنجہائے گراں مایہ — از رشید احمد صدیقی — مکتبہ جامعہ ۱۹۸۰ء

۱۱۔ آج کل محمد علی نمبر — دسمبر ۱۹۷۸ء

۱۲۔ کامریڈ اور ہمدرد کے شمارے۔

ڈاکٹر رتن چند آثر
محلہ بازار سری گنگا نگر

# سورگ کہاں ہے

آپ میں سے جن صاحبان نے لال قلعہ دہلی کے دیوانِ خاص کو دیکھا ہے ان کی نظر اس محراب پر بھی گئی ہوگی۔ جسکی پیشانی پر نہایت خوبصورت میناکاری کے درمیان یہ شعر کندہ ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

مغل فرمانروا جب اس محراب کے سائے میں تختِ طاؤس پر اس طرح جلوہ فرما ہوتے تھے کہ دائیں جانب شہزادے، بائیں طرف امیر و وزیر پشت پر باریک ریشمی پردوں کے پیچھے بیگمات سامنے رقص و سرود کی محفل اور اس سے بھی آگے چاندنی رات میں چاندی اگلتے ہوئے فوارے۔ کوثر کی سی چھوٹی نہر کے بیچوں بیچ بنی ہوئی ساون بھادوں کی برجیاں۔ سارے میں بسی ہوئی عود اور گلاب کی خوشبو۔ پھر جب طبلے کی تھاپ گھنگھروؤں کی جھنکار اور نو عمر گانے والیوں کے سُریلے سنگیت کی لہریں فضا میں گونجنے لگتیں تو صافیوں میں لپٹی صراحیوں کی گردنیں جھوم اُٹھتیں اور بلوریں جام گردش میں آجاتے اور کیا بادشاہ اور شہزادے اور کیا اہلِ دربار سبھی سرور بھرے ماحول میں ڈوب کر دنیا کے رنج اور سلطنت کے فکر بھول جاتے۔ اسی طرح کی ایک محفل میں جب محمد شاہ رنگیلے کو نادر شاہ کا لاہور سے بھیجا ہوا الٹی میٹم ملا تو بادشاہ نے اُسے خریطے سے نکالا کر ایک نظر دیکھا اور پڑھے بغیر

شراب کے پیالے میں ڈبو دیا اور فرمایا ؎

اس دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولے

اہلِ دربار نے واہ واہ اور مرحبا کے ساتھ اس جرأت رندانہ کی داد دی بلکہ دو ایک نے بڑی خوشامد سے کہا "ظلِ الٰہی اس گذرئیے کی کیا مجال جو آنکھ اٹھا کر بھی ادھر دیکھے - حضور والا" - ہنوز دلی دور است"

کیا واقعی جنت وہی تھی - ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کی جنت اسی ماحول میں تھی مگر نادرشاہ کے ایک ہی حملے میں وہ جنت تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئی نہ تخت طاؤس رہا نہ کوہِ نور سب کچھ لٹ گیا - اور یہ جنت عارضی اور فانی ثابت ہوئی -

---

بعض لوگ کہتے ہیں کہ سورگ کشمیر میں ہے - مندرجہ بالا شعر جہانگیر نے اسی ارضی جنت کے لیے استعمال کیا تھا - جسے لوگ کشمیر جنت نظیر کے نام سے پکارتے ہیں اس خوبصورت وادی کو قدرت نے کس کس طرح سجایا ہے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کا روپہلا تاج جو بارہ مہینے چمک دمک دکھاتا ہے قدم قدم پر پھولوں سے ڈھکے مرغ زار، جابجا کل کل کرتے جھرنے اور سیماب اگلتے چشمے ، آئینے کی طرح شفاف ہلکے نیلگوں پانیوں سے بھری جھیلیں، طرح طرح کے لذیذ پھل اور میوے، فضاؤں میں خوشبو پھیلاتے بنفشہ اور زعفران کے کھیت اور سب سے بڑھ کر یہاں کا نسوانی حسن جسے دیکھ کر جنت کی حوروں کا گمان ہوتا ہے - لیکن قدرت نے اس علاقے کو ان تمام نعمتوں سے مالا مال کرتے وقت، غریبی بھی وافر عطا کر دی - اس کے علاوہ یہاں کی سردی اور برف باری کو برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں گو یہ سورگ لال قلعے کے سورگ کی طرح عارضی نہیں صدیوں سے چلا آرہا ہے اور چلتا رہے گا - تا آنکہ کوئی بڑا زلزلہ یا طوفان اسے تہ و بالا نہ کر دے - مگر اس جنت میں بھی ڈھونڈھنے والے کو کئی خامیاں نظر آجائیں گی - مثلاً سیاحوں سے ناواجب طریقے سے پیسہ بٹورنے کی بھاؤنا علاقائی تعصب وغیرہ

---

اب ذرا چمنستان سے باہر جنت کی تلاش کر کے دیکھیں۔ مشہور ایرانی شاعر عمر خیام نے اپنی ایک رباعی میں جنت کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی ہے ۔

A book of verse underneath the bough.
A jug of wine, a loaf of bread and thou
Besides me singing in the wilderness
And wilderness is paradise enow.

تو یہ شعر، شراب، روٹی، معشوق اور ندی کنارے پیار کا سنگیت، انہی چیزوں میں سورگ دیکھا ہے اس کا جواب آٹھ صدیوں بعد ایک ہندوستانی شاعر فیضؔ نے یوں دیا۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ویسے بھی دیکھا جائے تو عمر خیام کا سورگ ایک کلپنا ہے حقیقت نہیں۔ ایک آرزو ہے۔

اسی طرح سولہویں صدی عیسوی میں ہنری ہشتم کے وقت میں ایک وِدوان پادری THOMAS MORE ہوا ہے اُس نے پوپ کے مقابلے میں ہنری ہشتم کو چرچ کا سربراہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اسی جرم میں اُسے کلہاڑے سے سر اڑا دینے کی سزا دی گئی تھی۔ موت سے پہلے ٹاور آف لندن (TOWER OF LONDON) کے تاریخی قید خانے میں اس نے ایک کتاب لکھی تھی۔ جو (UTOPIA) کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں ایک ایسے راج اور سماج کا بیان کیا گیا ہے جس میں ہر طرح کا امن چین اور انصاف ہو۔ حکومت کیسی ہو؟ جج کیسے ہوں؟ اور لوگ کس طرح اپنے شہری حقوق اور فرائض سے عہدہ برآ ہوں یعنی بہت کچھ گاندھی جی کے رام راج سے ملتا جلتا تصور پیش کیا گیا مگر اس کی حقیقت بھی ہوائی قلعے سے زیادہ نہیں (اور افسوس کہ اس نظام زندگی و حکومت میں شاعروں کے لئے کوئی مقام نہیں) (JAMES HILTON) کی مشہور کتاب (LOST HORIZON) میں بھی اسی طرح کی خیالی جنت SHA-

SHANGRI-LA کا نقشہ ملتا ہے۔ مگر یہ دونوں تصوراتی بہشت محض خیالی ہیں۔ اور ان کا وجود ناممکن سمجھا جاتا ہے تبھی تو وہ (UTOPIAN DREAM) والا محاورہ رائج ہوا۔

---

اب پھر واپس ہندوستان چلے آئیے۔ اور رشی کیش کے پاس گنگا کے پرلے کنارے پر واقع سورگ آشرم پر ایک نظر ڈالئے۔ شہروں کے شور شرابے سے دور شانت ماحول، صاف ہوا، پوتر گنگا کا کنارا اور اس کی نرمل لہروں سے اٹھتی ہوئی روحانی سرگرم آشرم میں پوجا پاٹ، گیان، دھیان اور بھجن کیرتن کا باقاعدہ پروگرام، آشرم کے باسی دنیا کے جھنجھٹوں سے پیچھا چھڑا کر ہری چرنوں سے لو لگائے ہوتے نہ کسی سے لینا نہ دینا۔ کھانے پینے اوڑھنے بچھونے کا معقول بندوبست لیکن یہاں بھی اپنے کاموہ اور پرائے سے نفرت پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس سورگ آشرم میں داخل ہو کر بھی اکثر لوگ پابندی علائق کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہو پاتے۔ میرے ایک دوست ڈاکٹر ریٹائر ہونے کے بعد اپنی عاقبت سنوارنے کی غرض سے عزیز و اقارب سے رخصت ہو کر یہاں آ بسے پنشن آتی تو سادھو سنتوں اور دین دکھیوں میں بانٹ دیتے۔ کچھ دوائیاں خرید کر اپنے پاس رکھتے۔ اور روگیوں کا چھوٹا موٹا علاج مفت کرتے۔ چند سال تو گیان دھیان اور سیوا کے آنند میں مگن رہے۔ ایک دن لڑکے کا تار آیا کہ منا سخت بیمار ہے بس پرانا موہ جاگ اٹھا۔ بھاگم بھاگ پوتے کو سنبھالنے کے لئے چلے آئے اور ایسے آئے کہ واپس نہ لوٹے گویا اس پُرسکون ماحول اور پربھو بھگتی والے سورگ آشرم میں رہ کر بھی انہیں سورگ نہ ملا۔

---

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سورگ اور نرک، جنت اور دوزخ محض فرضی مقام ہیں یا ان میں کوئی اصلیت نہیں یہ صرف تصور کی کرشمہ سازی بلکہ ایک ڈھکوسلہ ہے۔ ایک ترغیب

اور تخویف کا سلسلہ ہے کہ اگر نیک کام کرو گے تو جنت میں جگہ پاؤ گے جہاں دودھ اور شہد کی نہریں ہیں، شراب کے حوض ہیں۔ حور و غلمان ہیں اور ہر طرح کا عیش و آرام ہے اور بُرے کام کرو گے تو دوزخ میں دھکیلے جاؤ گے جہاں آگ ہے۔ انسان کا تیل نکالنے والے کولہو ہیں یا جسم کو لکڑی کی طرح چیرنے والے آرے ہیں۔ اُبلتے ہوئے تیل کے بڑے بڑے کڑاہے ہیں۔ جن میں گنہگاروں کو کبابوں کی طرح تلا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ

یہاں ایک پرانا واقعہ یاد آ گیا جب ہم سنگاپور میں جنگی قیدی تھے۔ تو ایک صوبیدار میجر غلام اکبر بابر ایک شام ممنوعہ علاقے میں گھستے ملٹری پولیس کی نظر میں آ گئے۔ اور بچ نکلنے کی بھاگ دوڑ میں گر گئے۔ ٹخنے پر چوٹ آئی تو میرے پاس تشریف لائے۔ یہ حضرت ذات کے پٹھان، عمر کے ادھیڑ۔ طبیعت کے رنگین اور بڑے چست و چالاک بلکہ گھاگ قسم کے تھے۔ میں انہیں نام کی رعایت سے چھیڑا کرتا تھا۔ کہ اکبر کا غلام بابر کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو اس کا دادا تھا۔ خیر مرہم پٹی کرتے ہوئے میں نے کہا "قبلہ اس عمر میں ممنوعہ علاقہ یعنی RED-LIGHT AREA میں جانے کی کیا سوجھی یہاں بھی بدنام ہوئے اور عاقبت خراب ہونے کا خطرہ بھی مول لیا۔ قبلہ بازاری حوروں کے چکر میں پڑ کر جنت کی حوروں سے بھی محروم رہ جاؤ گے۔" آدمی تھے منجھے ہوئے اور نہایت خوش مذاق۔ پہلے یہ شعر سنایا۔

ایسی جنت کو کیا کرے کوئی
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں۔

پھر بڑے رازدارانہ لہجے میں بولے ڈاکٹر تم سمجھ دار ہو۔ پھر ایسا بچگانہ سوال کیوں۔

سچ تو یہ ہے ؎

جنت منت کچھ نہیں سب باغ بغیچہ ہے
دوزخ موزخ کچھ نہیں سب دیکھا شیکھا ہے

ان کی جنت اور دوزخ کی تشریح سن کر میرا دل باغ باغ ہو گیا اور میں نے بڑے پریم سے ان کی مرہم پٹی کر دی۔ ویسے دیکھا جائے کہ یہ تشریح نہ عملی بلکہ اصلیت کے بہت

قریب ہے۔

---

اب جنت کی ایک اور تصویر جو فارسی کے اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے کھینچی گئی ہے ملاحظہ فرمائیے میرے خیال میں جنت یا سورگ کی جو کلپنا اس شعر میں کی گئی ہے وہ کسی حد تک مکمل جامع اور زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

یعنی جنت وہاں ہے جہاں کوئی آزار نہ ہو اور کسی کو کسی سے کوئی کام نہ پڑے یہ ایک منفی تشریح ہے جو عمر خیام اور ٹامس مور کی مثبت تشریحوں سے بدرجہا بہتر اور جامع ہے اگر آپ جنت کے لوازمات گنوانا چاہیں کہ وہاں اپسرائیں ہوں دودھ اور شہد کی افراط ہو، خوبصورت نہریں، باغ باغیچے اور انواع و اقسام کی اشیائے خوردنی ہوں تو یہ فہرست کتنی لمبی ہوجائے گی۔ لیکن فارسی شاعر نے صرف دو باتوں کے نہ ہونے کی پابندی رکھ کر باقی سب کے لئے (اپنی اپنی پسند) کا دروازہ کھلا چھوڑ کر شعر کا دائرہ کتنا وسیع کر دیا اور جن باتوں کی ممانعت چاہی وہ بھی معنی خیز ہیں۔ لفظ آزار میں سب طرح کے دکھ آجاتے ہیں۔ مثلاً بیماری، افلاس، عشق، مصیبت، ظلم، غلامی وغیرہ دوسرے کسی سے کام نہ پڑنے میں مکمل آزادی اور شخصی خودداری کا تصور کارفرماں ہے یعنی سماجی، اقتصادی و سیاسی طور پر کسی کا محتاج نہ ہونا آپ مجھ سے متفق کریں گے کہ کسی آدمی کو کسی دوسرے سے کام آپڑے تو بسا اوقات کتنی کوفت، ذلت اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اگر آپ کو کسی دفتر یا ادارے میں کسی افسر یا اہلکار سے کوئی کام نکلوانا ہے تو سفارش، خوشامد اور رشوت کے کن کن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ اور خودداری پر کیسی کیسی ضربیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اور بعض اوقات ان تمام کاوشوں کے باوجود کوئی چھوٹا سا جائز کام بھی نہیں ہو پاتا۔ اور ان افسروں اور اہلکاروں کا رویہ اتنا ذلت آمیز

ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں قتل عمد یا خودکشی کا جذبہ سر اٹھانے لگتا ہے۔ اس کی ایک عام مثال آپ کو محکمہ ریل کے بکنگ اور ریزرویشن کلرکوں کی رعونت اور بدسلوکی کی صورت میں ہر روز دیکھنے کو ملتی ہے۔

اور خدانخواستہ اگر آپ کو کسی سے کچھ مانگنا ہے جیسے قرض یا اور کوئی مدد۔ تو وہ شخص خواہ آپ کا دوست ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے آگے ہاتھ پھیلانے کے لئے اپنے من کو کتنا سمجھانا بلکہ مارنا پڑتا ہے۔ اور اگر وہ شخص انکار کر دے تو دل پر کیا گذرتی ہے۔ اس کو ایک اُردو شاعر نے کس خوبی سے بیان کیا ہے ؎

جانا کسی کے در پہ کسی آرزو کے ساتھ
واللہ دشمنی ہے بڑی آبرو کے ساتھ

اور میرا تو تجربہ ہے کہ آپ لاکھ دوستوں کے کام آئیں مگر آپ کو دوستوں سے کام آپڑے تو دل کو صدمہ پہنچنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ بقول ہری چند اختر

ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بیوفا ہونے کا وقت آیا

---

ان سب باتوں کے پیشِ نظر آخر میں یہی گذارش کروں گا کہ سورگ اور نرک محض خیالی مقام ہیں۔ جن کا نہ کوئی جغرافیہ ہی بتا سکتا ہے۔ اور نہ جن کی کنجی کسی کے پاس ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں جہاں کوئی آزار نہ ہو اور جہاں کسی کو کسی سے کوئی غرض یا کام نہ ہو وہیں سورگ ہے اور اس سورگ کو آدمی اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنے اعمال سے خود بناتا ہے۔ بقول اقبال

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔

عمر جہاں صدیقی ایم اے

# حسرت موہانی

گرفتار محبت ہوں اسیر دام الفت ہوں
میں رسوائے جہاں آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں

حسرت نے سیاست میں عملی طور پر حصہ لیا طالب علمی کے زمانے سے ہی سیاسی تحریکوں میں حصہ لیا۔ جب آزادی کی تحریک جاری تھی اس دور میں بھی بہت سے ایسے شاعر تھے جو صرف عشق و محبت کی داستانوں تک محدود رہے۔ ان کو قومی احساس نہیں تھا قوم کا گھر جل رہا تھا لیکن وہ ذہنی عیاشیوں میں مصروف تھے۔ یا پھر بلند قامت شاعر تھے۔ جو موت کو زندگی سمجھتے رہے اور زندگی ان کے نزدیک مرگ مسلسل کا نام تھی لیکن درویش صفت قانع اور امید قلیل، مقاصد جلیل رکھنے والے شاعر حسرت موہانی وہ شاعر تھے جنہوں نے زندگی کو سادگی سے بسر کیا اور سوچ سمجھ کر وقت کا ساتھ دیا۔

انہوں نے سب سے پہلے آزادیٔ کامل کا تصور پیش کیا ان کی زندگی ایک طرفہ تماشہ بن گئی کیونکہ وہ تہذیب رسم عاشقی عیاں کر کے شان رسوائی کا اعتبار بھی بڑھاتے رہے اور حسن بے پرواہ کو خود بین و خود آرا کرتے رہے۔ لیکن دوسری جانب حقائق کی جلتی ہوئی چٹان پر کھڑے ہو کر وہ یہ بھی کہتے رہے۔

ع اچھا ہے اہلِ جور کئے جائیں سختیاں
پھیلے گی یونہی شورشِ حبِ وطن تمام

حسرت کی سیاسی شاعری پر بحث کرنے سے پہلے اجمالی نظر انکی مجموعی شاعری پر ڈالنا ضروری ہے۔

دراصل حسرت کا تغزل عشقیہ شاعری، نشاطیہ لب ولہجہ، اور سیاسی شاعری یہی ان کی غزل کا کل ہندسرمایہ ہے۔ حسرت کی زندگی اس طرح کئی خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ سیاست، صحافت، ادب، اور مذہب۔

جب عروسِ غزل پر کنکریاں پھینکی جارہی تھیں اور غزل کو معتوب قرار دیا جارہا تھا حسرت نے غزل کا احیاء کیا اور بقول رشید احمد صدیقی کے ـــــــ "حسرت نے اس زمانے میں غزل کی آبرو رکھی جب غزل بہت بدنام اور ہر طرف نرغے میں تھی۔"

حسرت کو غزل سے فطری مناسبت تھی۔ سادگی، خلوص، فنی رکھ رکھاؤ، اضطرار و انتشار، جذب و اثر، حسن نظر، جو غزل کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ یہ سب عناصر حسرت کو فطرت سے عطا کئے گئے تھے۔ وہ برملا گفتار تھے اور ایثار کا پیکر بھی۔ گفتار میں عاشق تو کردار میں مردِ کامل تھے۔ زندگی بسر کرنے کا حوصلہ انہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تغزل کے ساتھ زندگی کی جدوجہد کو بھی حسرت مرحوم نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

عشقیہ شاعری میں حسرت جذباتی انسان تھے اور اپنے جمالیاتی ذوق سے مجبور تھے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

روشن جمالِ یار سے ہے پیراہن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیراہن تمام

قصۂ شوق کہوں درد کا افسانہ کہوں

دل ہو قابو میں تو اس شوخ سے کیا کیا نہ کہوں

خود ہے اقرار انہیں اپنی ستم گاری کا
پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ میں ایسا نہ کہوں

---

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا :
کٹ گئی احتیاط عشق میں عمر
ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا

اس طرح حسرت کی شاعری کو کئی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ہر اعتبار سے ان کی شاعری کا دوسرا دور جو ۱۹۰۹ء سے شروع ہوتا ہے بہت اہم ہے یہ دور اُن کی شاعری کی بلندی کا دور کہلاتا ہے۔ اکثر غزلیں سیاسی رنگ میں ہیں۔ قید و فرنگ و مشقت، ظلم و ستم اور احتجاج یہی ان کا خاص موضوع رہا حقیقت یہ ہے کہ حسرت کی زندگی ایک مرد مجاہد اور آزادی کے سپاہی کی زندگی تھی وہ تین بار جیل گئے۔ قید بہ مشقت جھیلتے رہے۔ چکی پیستے رہے اور شعر کہتے رہے۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی زندگی بھی

حسرت صحافی زندگی میں انگریزوں کے مخالف رہے۔ اپریل ۱۹۰۸ء حسرت نے اردو معلّیٰ میں ایک مضمون انگریزوں کی تعلیمی پالیسی مصر میں شائع کیا۔ اس جرم پر ان کو دو سال سزا ملی۔ لیکن حسرت نے مضمون نگار کا نام بتانا پسند نہیں کیا اور خود ہی مجرم بن گئے۔ انہوں نے آزادی کی تحریک میں سودیشی تحریک کی موافقت کی۔ اور سودیشی اشیاء کے استعمال کی ترغیب ہندوستانیوں کو دی۔ اس لئے انہوں نے سودیشی اسٹور کھولا ملک کی اصلاحی تحریکوں میں عملی طور پر حصّہ لیا۔ خلافت تحریک کے اہم کارکن رہے آزادی کامل

کا قرارداد پیش کیا اور نعرہ لگایا اس طرح آزادی کا یہ سپاہی ابتدا میں ہی جو سوچ رہا تھا وہ بیسویں صدی کے تیسری دہائی میں واضح ہو کر سامنے آیا یعنی آزادی کامل (بھارت چھوڑو تحریک)

جنگ آزادی میں حسرت ہندو مسلم اتحاد کو ضروری مانتے تھے۔ ان کے خیال میں اس کے بغیر ہندوستانی قومیت کا تصور ناممکن تھا۔ انہوں نے تقریباً نصف صدی سیاسی جدوجہد میں گذار دی۔ بے تکلف تقریر و تحریر سے کام لیتے رہے۔ تمام مسائل کا حل ان کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان اور ہندو آپس میں مشورہ کر کے گاندھی جی سے خود مختاری بند کا اعلان کروا دیں تاکہ انگریز مسلمانوں اور ہندوؤں پر ظلم و ستم نہ کر سکیں۔ وہ تحفظ سوراج کو سب سے زیادہ فوقیت دیتے رہے اور اسی سوراج کے لیے وہ پہلی بار ۱۹۰۸ء میں دوسری بار ۱۹۱۶ء میں تیسری بار ۱۹۲۲ء میں جیل گئے۔ ان کی جیل کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے چونکہ عملی طور پر وہ سیاست کے مرد میدان تھے اس لئے یہ ناممکن تھا کہ ان کا کلام اس سے متاثر نہ ہو۔ انہوں نے اشاریت اور رمزیت سے کام نہ لیا۔ رمزیت اور اشاریت جو غزل کی جان ہوتی ہے۔ جس سے پاسباں بھی خوش ہوتا ہے اور صیاد بھی۔ بات بھی ہو جاتی اور سمجھنے والا سمجھ بھی لیتا ہے کہ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے لیکن حسرت نے اس مصلحت پسندی کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ بلکہ صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار کیا اس لئے حق گو اور بے باکی ان کا امتیاز کہلاتی ہے۔

انگریز ہندوستان میں تجارت کرتے آئے تھے لیکن تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ وہ خون چرانے لگے۔ ہندوستان کی بے شمار دولت ان کے آرام و آسائش اور عیش و عشرت کے کام آنے لگی ساتھ ساتھ ہندوستانیوں پر یہ احسان اور رہا کہ بقول اقبال اصلاح۔ آئین۔ رعایت، اور حقوق:

طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری والا معاملہ رہا۔ انگریز جابر و ظالم بنے ہوئے جمہوریت کی باتیں کرتے رہے۔ حسرت اس حقیقت کو برملا کہتے ہیں۔

رسمِ جفا کامیاب دیکھئے کب تلک رہے
حُبِّ وطن مستِ خواب دیکھئے کب تک رہے

تا بہ کجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھئے کب تک رہے

دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر زیرِ نقاب دیکھئے کب تک رہے

حسرتِ آزاد پر جو اغلامانِ وقت
ازراہ بغض و عتاب دیکھئے کب تک رہے

---

سمجھتے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریب مرگ
مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کبھی خدمتِ انگریز نہ کرتے

اچھا ہوا کہ خاطرِ حسرت سے مٹ گئی
ہیئت سی اک جو خطرۂ دار و رسن میں تھی

اقتصادی مسائل نعرہ بازی سے حل نہیں ہوتے بلکہ ان کے لئے جدوجہد کی ضرورت تھی۔ وہ تو اس حقیقت کو مانتے رہے اگر ہم چاہیں تو زنداں کو گلستاں کرلیں اور بقول احمر لاری صاحب کے دراصل ایام کی غزلوں میں ہی حسرت کو حسرت بنا دیا۔

# نعت

سید محبوب الرحمٰن نیازی
(ایم اے علیگ)

مدح خوانِ مصطفیٰ کیا جانے شانِ مصطفیٰ
جز خدا کوئی نہیں ہے رتبہ دانِ مصطفیٰ

جو ہے فرمانِ الٰہی وہ ہے فرمانِ رسول
ہے زباں اللہ کی گویا زبانِ مصطفیٰ

صبح و شام اپنے پروں سے جھاڑتے ہیں جبرئیل
سجدہ گاہِ قدسیاں ہے آستانِ مصطفیٰ

کوئی پیارا آپ کو حسنین سے زیادہ نہ تھا
تھے تو دو دم لیکن اک دل ایک جانِ مصطفیٰ

نعمتیں کونین کی یہ کہہ کے منہ تکتی رہیں
ہائے اک نانِ جویں ہے اور دہانِ مصطفیٰ

حشر کے دن کا ہمیں محبوبؔ کچھ خطرہ نہیں
اس جگہ ہونگے جہاں ہوگا نشانِ مصطفیٰ

سید احرار الرحمٰن اشک
سابق اسسٹنٹ رجسٹرار
کراچی یونیورسٹی۔ کراچی پاکستان

# نعت

لیا ہے نامِ نامی زیرِ لب پوشیدہ پوشیدہ
خبر دارند لب باہم بہم چسپیدہ چسپیدہ

جنہیں اذنِ حضوری ہے وہ شاداں بڑھتے جاتے ہیں
نظر میری بھی جاتی ہے مگر ترسیدہ ترسیدہ

گنہ گارانِ امت کیلئے وہ رحمتِ عالم
خطا پوشیدہ پوشیدہ عطا پاشیدہ پاشیدہ

زمانے کے لئے ہے ذاتِ عالی آئینہ رحمت
میری جانب بھی ہو چشمِ کرم دزدیدہ دزدیدہ

یہاں تن ہے وہاں دل ہے اسی در پہ مرا سر ہے
یہ سب فیضانِ رحمت ہے کرم بخشیدہ بخشیدہ

طلب میں انکی اشکؔ غم سے دیوانے بہت ہونگے
دریدہ جیب و دامن موئے سر ژولیدہ ژولیدہ

# نعت

## بحضور سرورِ کائنات

ڈاکٹر ایس جلال توقیر گورنمنٹ ڈسپنسری مان ٹاؤن سوائی مادھوپور راجستھان

اے صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ شانِ محمدؐ — ہے خالقِ اکبر بھی ثنا خوانِ محمدؐ

بوبکرؓ و عمرؓ، حیدرؓ و عثمان صحابیؓ — جبرئیلِ امین ہمدم و دربارِ محمدؐ

خالق نے نوازا انہیں رحمت کے لقب سے — دنیا کے لئے عام ہے فیضانِ محمدؐ

مٹی کے تھے برتن تو کھجوروں کی چٹائی — سردارِ جہاں اور یہ سامانِ محمدؐ

وہ ذہن کیا جس میں نہ ہو سودائے مدینہ — دل دل نہیں جس میں نہ ہو ارمانِ محمدؐ

ہے کاہکشاں نقشِ کفِ پا کے تصدق — انوارِ مہ و مہر ہیں قربانِ محمدؐ

ٹھوکر میں سمجھتے ہیں زمانہ کو یہ اپنی — کیا شان ہے کیا شانِ غلامانِ محمدؐ

کیوں کر نہ ہو توقیر دماغ عرشِ بریں پر
ہوں خاکِ کفِ پائے غلامانِ محمدؐ

انصار محشر عباسی

مکان نمبر ۳۸ حسن پورہ این پی سی روڈ جے پور

# اے جذبۂ دل لے چل

بیتاب ہے دل کب سے اب صبر نہیں لے چل
اے قلب حزیں لے چل، اے قلب حزیں لے چل
اے ذوقِ یقیں لے چل، اے حسنِ یقیں لے چل
" اے جذبۂ دل لے چل للہ وہیں لے چل "
سرکارِ دو عالم کے روضے کے قریں لے چل

کہنا ہے بچشم نم سرکارِ مدینہ سے
آقائے دو عالم سے دربارِ مدینہ سے
اُس مہرِ رسالت سے، انوارِ مدینہ سے
جنت کی نہیں خواہش اس دل میں انہیں لے چل
اے جذبۂ دل لے چل، للہ وہیں لے چل
سرکارِ دو عالم کے روضے کے قریں لے چل

ہیں اشک رواں پیہم اور لب پہ مناجاتیں
کہنا ہے کہ لایا ہوں حالات کی سوغاتیں

مجروح تمنائیں، کچھ درد بھری باتیں :
کچھ اپنوں کے صدمے ہیں اغیار کی کچھ گھاتیں
اب دل کو کسی صورت تسکین نہیں لے چل
سرکارِ دو عالم کے روضے کے قریں لے چل

کہنا ہے کہ لایا ہوں احساسِ پشیمانی
کہنا ہے کہ رویا ہوں اشکوں کی ہیں طغیانی
کہنا ہے اب میں ہوں اور بخت کی ویرانی
ہے شوقِ زیارت کی مدت سے فراوانی
اس نورِ مجسم کے لے چل تو قریں لے چل
اے جذبۂ دل لے چل اللہ وہیں لے چل

کہنا ہے کہ لایا ہے احساس جبیں سائی
کہنا ہے کہیں دل نے تسکین نہیں پائی
کہنا ہے رلاتی ہے پہروں مجھے تنہائی
اے کاش کبھی دیکھوں یک جلوہ بہ رعنائی
لے چل درِ اقدس تک اے ذوقِ یقیں لے چل

اب ان کو سنانا ہے کچھ درد کا افسانہ
اب ان کو دکھانا ہے حالِ دلِ دیوانہ
اب صبر و تحمل کا لبریز ہے پیمانہ
کہنا کہ لایا ہوں اشکوں کا میں نذرانہ
لے چل درِ اقدس تک اے قلبِ حزیں لے چل
اے جذبۂ دل لے چل اللہ وہیں لے چل

کہنا ہے کہ طوفاں میں امت کا سفینہ ہے

ہمیں کوئی سے عالم میں مرنا ہے نہ جینا ہے
یہ پیرہن ہستی اب آپ کو سینا ہے
معذور ہیں ہم آقا اور دور مدینہ ہے
لے چل تو وہیں لے چل اے قلب حزیں لے چل
سرکارِ دوعالم کے روضے کے قریں لے چل

کہنا ہے زمانے نے توڑے ہیں ستم کتنے
کہنا ہے کہ بھٹکے ہیں راہوں سے قدم کتنے
رکھے ہیں بھرم کتنے توڑے ہیں بھرم کتنے
ابھرے ہیں ڈبونے کو اربابِ کرم کتنے
اس پستیٔ عالم سے تو دور کہیں لے چل
سرکارِ مدینہ کے قدموں کے قریں لے چل

ہیں پائے مسلماں میں الحاد کی زنجیریں
ہر خانۂ دل میں ہیں اوہام کی تصویریں
ہیں دینِ مقدس کی اب اور ہی تفسیریں
محکوم ہیں تدبیریں، پابند ہیں تقدیریں
اوہام کی بستی سے اب دور کہیں لے چل
اے جذبۂ دل لے چل، اے جذبۂ دل لے چل

کہنا ہے مسلماں ہے اس دور کا زناری
شیوہ ہے فقط اس کا باطل کی پرستاری
مطلوب ہے بس اس کو اغیار کی غم خواری
اللہ سے بغاوت ہے، اسلام سے بیزاری
اس فتنۂ دوراں سے تو دور کہیں لے چل

سرکارِ مدینہ کے روضے کے قریں لے چل

الحاد کے بھبکے ہیں حالات کے زنداں ہیں
ابھرے ہیں نئے شغل کے آئینۂ امکاں میں
غیروں کی پرستش ہے اب کعبۂ ایماں میں
کچھ فرق نہیں باقی اب گبر و مسلماں میں
اس ظلمتِ دوراں سے ایمان و یقیں لے چل
اے جذبۂ دل لے چل للہ وہیں لے چل

یہ درد کہیں آ قا درماں کو نہ لے ڈوبے
الحاد کا یہ طوفاں ایماں کو نہ لے ڈوبے
اللہ سے یہ دوری انساں کو نہ لے ڈوبے
یہ یاس کہیں بڑھ کر ارماں کو نہ لے ڈوبے
سرمایۂ ملت کے رہزن ہیں امیں لے چل
اے جذبۂ دل لے چل للہ وہیں لے چل

قرآن مقدس سے آباد یہ سینے ہوں
عرفاں کی دولت سے آباد خزینے ہوں
ایماں سے مزین ہوں جینے کے قرینے ہوں
اے کاش کبھی ہم بھی اس طرح مدینے ہوں
اُس در پہ درودوں کے گل ہائے حسیں لے چل
اے جذبۂ دل لے چل، للہ وہیں لے چل

# نعت

## بحضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

محمد اعظم زیدی
۳۲۰ میر ہاؤس جے پور

کرم گستر و مہرباں آپ ہی ہیں
قرار دل بیکساں آپ ہی ہیں

خدا کے سوا کوئی جس جا نہیں ہے
خدا جانتا ہے وہاں آپ ہی ہیں

ہے قرآں بے شک کتاب الٰہی!
مگر اس کی روح رواں آپ ہی ہیں

سپر ڈال دے دیکھ کر جس کو دشمن
نظر جس کی تیر و کماں آپ ہی ہیں

ادھر عاصیوں کی امیدوں کا مرکز
ادھر رشک پیغمبراں آپ ہی ہیں

وہ جن کے مبارک قدم کی بدولت
مدینہ ہے دارالاماں آپ ہی ہیں

سلامی جنہیں قدسیانِ فلک دیں
قدم جن کے لے کہکشاں آپ ہی ہیں

سلام آپ پہ اے شہنشاہِ اعظم
شہنشاہِ کون و مکاں آپ ہی ہیں!

## قطعہ

محبِ احمدِ مختار ہوں سرور کا شیدائی
نظر میں کچھ نہیں وقعت اب اعظم اس زمانے کی
میری بخشش کا ساماں روز محشر ہو ہی جائے گا
انہیں کے ہاتھ میں کنجی ہے قدرت کے خزانے کی

محمد علی نصیر نیازی
خانقاہ نیازیہ خواجہ قطب بریلی (یوپی)

# نعت

تجھ سے فریاد ہے اے گنبدِ خضرا والے
تنگ کرتے ہیں غلاموں کو یہ دُنیا والے

سخت حاجت ہے غلاموں کو مسیحائی کی
ہاں ذرا ایک نظر نازشِ عیسیٰ والے

منتظر ہے تیری آمد کی نگاہِ رحمت
رحمتِ خاصِ خداوند تعالیٰ والے

آ بچالے مجھے اس قبر کی تاریکی سے
زلفِ خمدار کا صدقہ شبِ اسریٰ والے

بخش دے گا انہیں اللہ بغیر پرسش
جب پکاریں گے گناہ گار یہ مولا والے

حشر میں بندۂ مولا کی طلب یوں ہو گی
یاد کرتے ہیں تجھے دیر سے بطحا والے

آ کے قدموں سے لپٹ جائے نصیرِ عاصی
اے رسولِ عربیؐ فاطمہ زہراؓ والے

ناظم سنبھلی (مرحوم)

# نعت

(ناظم مرحوم کی عمر کا بیشتر حصہ جے پور میں گذرا۔ یہ نعت اور سعید خمسہ ان کے غیر مطبوعہ کلام سے ماخوذ ہے۔)
محمد علی زیدی

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے لطف بے حد کا
نہ ہونے پر بھی سایہ دو جہاں پر ہے محمدؐ کا
سمجھ لیں وہ تصوّر ہے جنہیں اس سبز گنبد کا
محل خلد بریں میں مل گیا اُن کو زمرّد کا
کہیں کا تذکرہ ہو عرش یا چرخ زبرجد کا
مجھے لے بیٹھتا قصہ کسی کے سبز گنبد کا
وہیں نقش کف پائے محمدؐ یاد آتا ہے
جہاں لیتا ہوں بوسہ مجھول کر میں سنگِ اسود کا
یہی تعبیر ہے حاصل زیارت کا شرف ہوگا
نظر آیا ہے مجھ کو خواب میں روضہ محمدؐ کا
کسے جنت کا باغ سبز دکھلاتا ہے اے رضواں
یہاں آنکھوں میں نقشہ کھنچ رہا ہے سبز گنبد کا
پتہ کیا دوں نکیرین اور تم کو مختصر یہ ہے
مجھے اہلِ جہاں کہتے تھے دیوانہ محمدؐ کا
وہ آئے رحمت اللعالمین بن کر زمانے میں
کرم سب پر ہے یکساں ذکر ہی کیا نیک اور بد کا

یہی انعام ہے عشقِ نبی میں جان دینے کا
طواف آکر کیا کرتی ہیں حوریں میرے مرقد کا

عنایت کی نظر مجھ پر نہ ہو کیوں حق تعالیٰ کی
وہ عاشق ہے محمدؐ کا میں خادم ہوں محمدؐ کا

ملی ہے دادِ محشر میں زبانِ قدرتِ حق سے
نتیجہ دیکھئے نعتِ نبی میں کاوشِ و کد کا

دُعا، دی آپ نے اس کو اذیت جس نے پہنچائی
زمانے سے نرالا ڈھنگ ہے خُلقِ محمدؐ کا

تری تدبیر سے اے چارہ گر صحت نہیں ہوگی
سنا دے مجھ کو پڑھ کر کوئی مطلع نعتِ احمدؐ کا

یہ دستورِ محبت اک زمانے کی زباں پر ہے
مریضِ ہوش کو کہتے ہیں دیوانہ محمدؐ کا

یقیناً جاؤں جنت میں اُمت ہوں محمدؐ کی
مری بخشش میں ناظم کام ہی کیا لفظِ شاید کا

محمد یوسف عزیز بیکانیری

# نعت شریف

یارب تیری رحمت سے پوری یہ تمنا ہو
ہوں پائے جنوں میرے صحرائے مدینہ ہو

آہوں میں اثر میری اتنا تو خدایا ہو
روضہ ہو محمدؐ کا اور چشم تمنا ہو

ہر درد کا تم چارہ ہر غم کا مداوا ہو
اے سرورِ دو عالم تو رشکِ مسیحا ہو

اے شاہِ دو عالم ہم تخلیق کا منشا ہو
ارمان ہو عیسیٰ کا موسیٰ کی تمنا ہو

تم جس کی طرف دیکھو مردہ ہو تو زندہ ہو
رحمت کی نظر ہم پر اے رشکِ مسیحا ہو

کیا چیز نہیں اس کی جو دل سے تمہارا ہو
تم مالک عقبیٰ ہو، تم مالک دنیا ہو

اے رحمت جاں اب تو ہو جائے جو ہونا ہو
یا موت ہی آجائے یا تیرا نظارا ہو

یہ عشق کی باتیں ہیں تم لوگ نہ سمجھو گے
ہم لوگ ہیں اہلِ دل تم اہلِ زمانہ ہو

اللہ نے فرمایا محبوب سے محشر میں
مختار ہو محشر کے بخشو جسے تم چاہو

یہ عشقِ محمد ہے آداب کی حد میں رہ
.بیتاب نہ ہو اتنا اے دل کہ تماشا ہو

اس بزم میں بنتی ہیں بگڑی ہوئی تقدیریں
آجائے یہاں جو بھی تقدیر کا مارا ہو

.بیمارِ غم دل نے لو موند لیں اب آنکھیں
دیکھے وہ بھلا کس کو جس نے تمہیں دیکھا ہو

دن رات عزیز اب تو خالق سے دعا ہے،
فاروق سا دنیا میں اک اور خلیفہ ہو

ارمان عزیز اب تو بجز اس کے نہیں کوئی
کعبہ کی زیارت ہو روضہ کا نظارا ہو

ناظم سنبھلی مرحوم

# مخمس

ہے اُس کے لئے لطف فراوانِ محمدؐ — ہے اس کے لئے سایۂ دامانِ محمدؐ
ہے اس کے لئے سنبل و ریحانِ محمدؐ — ہے اس کے لئے حُسنِ گلستانِ محمدؐ
ساغر میں ہے جس کے مئے عرفانِ محمدؐ

حضرت سے مرتب روداد دو عالم — حضرت ہی کا پابند ہے آزاد دو عالم
حضرت کے سبب ہی پڑی بنیاد دو عالم — حضرت ہی تو ہیں باعثِ ایجاد دو عالم
کونین ہیں شرمندۂ احسانِ محمدؐ

کتنی ہی زمانے کی فضائیں ہوں غم آگیں — کتنا ہی کوئی فرطِ مصائب سے ہو غمگیں
ہوں کتنے ہی ذکار و الم دشمن تمکیں — ہو جاتی ہے فوراً دلِ بیتاب کو تسکیں
یاد آتے ہیں جب گیسوئے پیچانِ محمدؐ

ہر شئے سے اک انوار کا عالم ہے نمایاں — ہر شئے میں نظر آتا ہے اک جلوۂ عریاں
ہر ذرۂ ناچیز ہے خورشید بداماں — رخسار میں پوشیدہ ہیں سو حسنِ گلستاں
کیوں آنکھوں میں رکھ لوں نہ بیابانِ محمدؐ

یارب کہے کیا غم کی فراوانیاں ناظمؔ — یارب کہے کیا اب بھی دامانیاں ناظمؔ
یارب کہے کیا بے سروسامانیاں ناظمؔ — یارب کہے کیا اپنی پریشانیاں ناظمؔ
سب جانتی ہے زلفِ پریشانِ محمدؐ

فضا جوکالوی

# تجسیمِ حسن

حسن کی تیرے کروں تعریف کیا غنچہ دہن
نور میں جیسے نہا کر آئی ہو کوئی کرن

آنکھ میں ڈورے گلابی یا چھلکتی سی شراب
زلف کے سائے میں رخ ہے یا دو نیم ماہتاب

ابروئے خمدار ہیں کھنچی ہوئی جیسے کماں
اف رخ تاباں ہے گویا رحل پر رکھا قرآں

ہر قدم پر اک قیامت ہر نگہ ہے فتنہ ساز
جلوے تیرے کیف پرور ہر ادا ہے دل گداز

عارضِ گلگوں سے تیرے ہیں گلوں پر اک نکھار
روئے رخشاں پر ترے لاکھوں بہاریں ہیں نثار

تم سراپا حسن ہو تم اک مجسم نور ہو
اے پری پیکر مری جنت کی تم اک حور ہو

رکھ لیا کیا سر پہ آنچل دھر لیے کانوں پہ ہاتھ
آگئی گویا سمٹ کر اوڑھنی میں کائنات

تیری پیشانی کو چھونے جھک گیا ہے آسماں
تیری راہوں میں سنوارے ہے ستارے کہکشاں

تیری پائل کی کھنک سے ہے چٹکتی ہر کلی
پاؤں تیرے دھو رہی ہے اوس مخمل پر پڑی

فرشِ مخمل ہے بچھا اور سرو ہیں باندھے قطار
سرنگوں ہیں گل یہاں اور چشمِ نرگس شرمسار

حسن ہے تیرا جہاں میں جس کا ثانی ہی نہیں
ہو سکے تعریف تیرے حسن کی ہرگز نہیں

ڈاکٹر اظہار مسرت

# تضمین

## (نعتیہ)

تبسم بر لبِ اعجاز اظہار مسرت ہے
زباں کو عزمِ گویائی نظر کو جرأت بینا
عطا فرمانے والا ہے فقط اللہ بے ہمتا
وہی خلاق اکبر ہے اسی کی ساری قدرت ہے

ازل سے پہلے کیا تھا بس وہی اک "ربِ یکتا" تھا
علاوہ لوح و کرسی کے سبھی کچھ تھا بیابانی
زمین و آسماں میں آشکارا "لاالٰہ" تھا
مگر اک نور بھی تھا عرش پر محبوب ربانی

اسی نورِ مجسم کو دیا جب پیکرِ انساں
تو پہلے حق نے پیدا کر دیا سب لطف کا ساماں
یہ سورج، چاند، انجم، کہکشاں، اودی گھٹائیں
ندی، سبزہ، گل و شبنم، ہوا، دلکش فضائیں

زمانہ بھر کے شعبہ پہ احسانِ محمدؐ ہے
"جدھر دیکھو اُدھر جلوہ تماشانِ محمدؐ ہے

# ۲ دو نظمیں

احمد رئیس
(کراچی)

مٹھی میں چھپائے جگنوؤں کو
سڑکوں پہ اکیلا گھومتا ہوں
یارو! میں تمہیں کو ڈھونڈھتا ہوں
تم لوگ کہاں ؟ کس نگر میں ؟
اک روز کبھی کہیں ملو تو
میں ساری امانتیں تمہاری
جھولی میں تمہاری ڈال دوں گا

اک سمت تھا ایک تپتا صحرا
اک سمت تھا ایک بہتا دریا
میں بیچ میں اک شجر کی مورت
سر پر تھا اٹھائے آسماں کو
دونوں کو دعائیں دے رہا تھا
دونوں کو گلے ملا رہا تھا

# غزل

حسرت لکھی نہ کوئی دلی مدعا لکھا
میں سوچتا ہوں اُس نے مجھے خط میں کیا لکھا

دَم توڑ دیں نہ تھک کے مرے دل کی دھڑکنیں
مکتوب سامنے ہے ترا بے پتہ لکھا

لوٹا چکا ہوں آپ کی ساری امانتیں
پرچہ ہے میرے پاس یہی آپ کا لکھا

زخمِ وفا کو کوئی بھی عنوان دے کوئی!
میرے قلم نے اس کو حسیں حادثہ لکھا

پھر ہو گا کس کو رہبر و رہزن کا امتیاز
اک راہزن کو میں نے اگر رہنما لکھا

جس کے بغیر تشنہ ہے تاریخ وقت کی
کس واقعہ نگار نے وہ واقعہ لکھا

تم جنتِ خیال کا شاعر کہو مجھے
میں نے تو خوں میں ڈوب کے ہر تجربہ لکھا

تحریر کون کرتا یہاں میری سرگذشت؟
خود میری شاعری نے مرا تذکرہ لکھا

فرصت ملی نہ اپنی تباہی کے ذکر سے
میں نے تمام عمر یہی مرثیہ لکھا

مخمورؔ میں ہوں شعر کی دُنیا میں مُنفرد
میں نے ہر اک صنف میں سب سے جُدا لکھا

مخمور جمالی سنبھلی
نہٹور ضلع بجنور

# غزل

انصار شمیم نیر

اک درد کی سوغات مجھے دے کے گیا ہے
وہ کرب کے لمحات مجھے دے کے گیا ہے

صدمات پہ صدمات مجھے دے کے گیا ہے
ہر موڑ پہ اک مات مجھے دے کے گیا ہے

اُمید کے شعلوں میں بدلتا رہا پہلو!
کس غم کی عنایات مجھے دے کے گیا ہے

تنہائی میں جلنا ہی تو ہے میرا مقدر
بے کیفیٔ حالات مجھے دے کے گیا ہے

ہر سانس ہے زنداں، تو ہر اک لمحہ ہے قاتل
یہ کون سے دن رات مجھے دے کے گیا ہے

پلکوں پہ بھی اب آ کے ٹھہرتے نہیں آنسو!
ساون کی وہ برسات مجھے دے کے گیا ہے۔

اک لمحۂ جاں سوز ہے صدیوں کی مسافت
ہر دور وہ لمحات مجھے دے کے گیا ہے

ہر سانس جوابوں کی گھنی بھیڑ سے گزرا
کچھ ایسے سوالات مجھے دے کے گیا ہے

مایوس کبھی بھی نہ ہوا ماضی سے اپنے
تابندہ روایات مجھے دے کے گیا ہے

مشکور ہوں محشر میں اسی شخص کا اب تک!
جو غم کی مدارات مجھے دے کے گیا ہے۔

## غزل

کسی دریا کا سنگم چاہتا ہوں
نہ جانے کب سے تنہا بہہ رہا ہوں

ہتھیلی پر رکھو تو ہوں اکائی
اگرچہ ریزہ ریزہ ہو گیا ہوں

شہر کا نام تک بدلا ہوا ہے
لفافہ کا بہت کہنہ پتہ ہوں

ودیعت ہے سما کی خود کلامی
میں اپنی ذات میں کھویا ہوا ہوں

مجھے ناٹک کے کرداروں سے سنئے
شہنشاہوں کی گم گشتہ صدا ہوں

در و دیوار کی فرمائشوں پر
میں آج اپنے ہی گھر ٹھہرا ہوا ہوں

خیالِ خام ہوں حرفِ غلط ہوں
کسی سنسان صحرا کی صدا ہوں

راشد جمال فاروقی (دیوبند)

## غزل

صدا و صوت کی بیساکھیاں نہ چل پائیں
حروف گنگ تھے وہ بے زبان ایسا تھا

شہر لوٹ کے پہچان تک نہیں پایا
میں جب گیا تھا تو اپنا مکان ایسا تھا

ملا تو اب بھی وہی خوشئ دوستی پائی
وہ مجھ کو بھول گیا ہے گمان ایسا تھا

اب اس نے کس کو چنا کون نااہل ٹھہرا
کوئی نہ جان سکا امتحان ایسا تھا

تمازتوں کا سفر تھا مگر نکل آئے
ہمارے سر پہ کوئی سائبان ایسا تھا

من کا مندر تلاش کرتا ہوں
کیا میں پتھر تلاش کرتا ہوں

دیر ہو یا حرم کہ مے خانہ
میں ترا گھر تلاش کرتا ہوں

کیوں وہ آخر بچھڑ گیا مجھ سے
جس کو اکثر تلاش کرتا ہوں

دل کا آئینہ جس نے توڑا ہے
وہ ہی پتھر تلاش کرتا ہوں

تھا تخیل میں مائل پرواز
اب کٹے پر تلاش کرتا ہوں

ان غضبناک تند شعلوں میں
اپنا ہی گھر تلاش کرتا ہوں

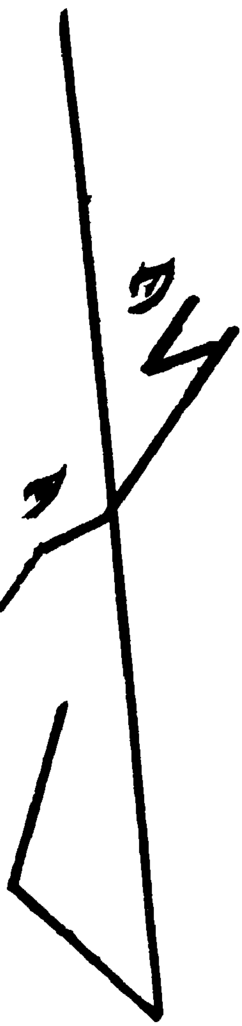
میں زمانے کی ٹھوکریں کھا کر
اب ترا در تلاش کرتا ہوں

جو نہ پایا کہیں زمانے میں!
اس کو اندر تلاش کرتا ہوں

جس میں دنیائے غم ڈبو ڈالیں
وہ سمندر تلاش کرتا ہوں

زہر پی جائے جو زمانے کا
کوئی شنکر تلاش کرتا ہوں

مقطع:- صفتا مصور جو ہوں غزل کا میں
حسین منظر تلاش کرتا ہوں



# حسنِ نظر

**نوٹ**

اس عنوان کے تحت قارئین نخلستان کے بعض خطوط کے اقتباسات ہر ماہ
ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں لیکن قارئین کی رائے سے ایڈیٹر کا اتفاق ضروری نہیں

## ڈاکٹر اظہار مسرت فتحپور۔

مکرمی چیئرمین صاحب : مؤدبانہ تسلیمات

شمارہ ۲/۴ دسمبر کی ۱۷ کو ملا۔ عام طور پر تاخیر اشاعت کو تجاہلِ عارفانہ کا رہین رکھا جاتا ہے لیکن نخلستان کی دیانتداری اس سے واضح ہے کہ جولائی ستمبر کے پرچہ میں مستان بیکانیری کی رحلت (۱۹/اکتوبر) کی خبر بھی شامل ہے۔ بیک وقت گوشۂ نگراں اور اداریہ کی موجودگی کسی جریدہ کی جدید ترین اختراع ہے۔ بہر نوع دونوں میں عملی اقدامات کا اعلان خوش آیند ہے۔ مرثیہ جیسی اہم صنف کے متعلق سے جوش جیسے عظیم شاعر کا تجزیاتی محاسبہ کچھ کاظم علی خاں جیسے عرق ریز استاد ہی کا کام ہے۔

فراق پر مختلف مقالے صرف "روایات عقیدت منداں" کا تسلسل ہی ہیں۔ ورنہ اس ضمن میں جرأت مندانہ مضمون تو صرف جگن آزاد (نیا دور۔ فراق نمبر) کے یہاں ہی مل سکا ہے۔

عارف صاحب پر راقم الحروف نے بھی کچھ لکھا ہے۔ اللہ ڈاکٹر نقوی بھی اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

تسنیم کاظمی کو ایک اچھے پلاٹ کے لئے مبارکباد۔ "مہاتما گاندھی اور اردو" اور خطبۂ صدارت معلوماتی اور موضوعاتی کالمس ہونے کی بنا پر تبصرہ کے محتاج نہیں۔ حصۂ نظم کی سبھی نگارشات قابل برداشت ہیں بشرطیکہ تسنیم فاروقی کے اس ریمارک کو نظر انداز کر دیا جائے۔ کہ لوگ نخلستان کیلئے "غیر مطبوعہ" کی شرط کو قابل اعتنا نہیں مانتے ــــ یہ ادارہ کا نہیں صاحب ترسیل کا ظرف ہے۔

نعتیہ تخلیق ارسالِ خدمت ہے جو دراصل ایک ضرب المثل پر مصرع پر تضمین ہے خیر سگالی

کی روایتی ہیئت میں تبدیلی کا تجربہ کیا گیا ہے۔

مزید کار لائقہ

احقر۔ اظہار مسرت

پیکرِ اخلاص و وفا زیدی صاحب سلام عقیدت۔

نخلستان کے تازہ شمارے کے انتظار سے تھک کر آنکھیں پتھرا چلی تھیں کہ پوسٹ مین دستِ مبارک میں محبوب رسالے لئے ناگہاں وارد ہوا۔ نگاہیں بصد اشتیاق اوراق پر تیر گئیں روح تروتازہ گلاب کی مانند مہک اٹھی۔ دل کی کلی کھل گئی۔ سرورق موجِ نور میں نہایا ہوا، ہر صفحے پر قوس قزح کا سماں چھایا ہوا۔ بیساختہ منہ سے نکل گیا ؂

اللہ رے تیرے رُخِ پر نور کا عالم
کچھ دیر تو ظلمت میں چراغاں سا لگے ہے

"جدید اردو مرثیئے" کے باب میں اتنا ہی کہوں گا کہ ایک تجزیاتی مقالہ ہے جس کی تیاری میں دیدہ ریزی انفرادی رنگ و آہنگ کو دخل حاصل ہے۔

تیری باتیں ہیں کہ نغمے تیرے نغمے ہیں کہ سحر" فراق کی پُر پیچ و خم نفسیات، تہہ در تہہ شخصیت اور آفاق گیر کلام پر منفرد طرز کا بصیرت افروز ادبی مضمون ہے۔ مختصر یہ کہ علی احمد فاطمی نے موصوف کے بارے میں کچھ باتیں لکھیں نہیں بلکہ کہی ہیں۔ وہ بھی کہنے کے خاص پیرائے میں۔ "فراق کی جمالیاتی کائنات" کو ہم ایک تشریحی کوشش کہہ سکتے ہیں جس سے فنکار کی شاعری کے بعض جمالیاتی گوشے منوّر ہوئے ہیں۔ اس کا عنوان فراق کی جمالیاتی شاعری پر ایک نظر ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ "فراق اور ہندوستانی جمالیات" مضمون نگار کے عمیق مشاہدے حکیمانہ نظر بندی ادب سے شغف کا پتہ دیتا ہے۔ "فراق کی شاعری پر ایک نوٹ" نہایت پر مغز اور نادر صنّاعی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اسلم پرویز کے اقوال میں بلا کی صحت اور توانائی ہے۔ یہ مختصر مضمون بہ اعتبار معیار طولانی مضامین پر بھاری ہے۔ "زندگی کی صداقتوں کا شاعر" عارف نقشبندی کا تعارف و تبصرہ ہے۔ اشعار کا انتخاب تسلی بخش محسوس ہوتا ہے۔

"احسان دانش" احسان دانش کے فن پر اجمالی اظہار خیال ہے مگر نئے تیور لئے ہوئے

نخلستان

ہے بانکپن کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ "وہ افسانہ جسکو میں کوئی نام نہ دے سکی" ایک بھول بھلیاں سمجھئے چند اکھڑی اکھڑی باتوں کو چونکا دینے والے طرز میں پیش کر دیا گیا ہے مگر نفسیاتی چاشنی کے ساتھ۔ مہدی پرتاب گڑھی کے شعر نمبر ۵، ۶ پسند آئے۔ دل میں اگر نہیں تو کہیں تو کہیں روشنی نہیں۔ کو انہوں نے اپنے طور پر اپنے ایک شعر میں ڈھالا ہے۔ منظر صدیقی کی نظم ایک ایسا آئینہ ہے جسمیں شوخ احساسات کے عکس مچلتے ہیں۔ کہیں کہیں چستی کی کمی کھٹکتی ہے۔

رزمی ٹونکی کی غزل ؎ اک بار اگر بیٹھ گئے اُٹھ نہ سکو گے

دوران سفر سایۂ دیوار نہ چاہو

کے وسیلے سے ذہن پر نقش رہے گی۔ ایوب اثر کی غزل مایوس جذبات کے بیساختہ اظہار کا پرتو ہے۔ اشعار کی نرم فضا، دھیمی لے نے غزل کے تاثر کو چار چاند لگا رہی ہے۔ ہاں ؎ مگر اجالوں میں تھوڑا خلوص و پیار تو ہو۔ محل نظر ہے نذیر فتحپوری آگہی کے شاعر ہیں۔ اسلوب بھی نپا تُلا ہے۔ لیکن وہ تراکیب کے استعمال میں محتاط نہیں۔ ملاحظہ کیجئے ؎ تجھ سا ڈھنگ مزاج بھی بے رنگ ہوگیا۔ بسمل سعیدی کی غزل روایتی شاعری کی معتبر آواز ہے۔ احمد رئیس کے کامیاب شعر جذبات و واردات کی منہ بولتی تصویریں ہیں "محبت" کا ہر بند اپنی جگہ شراب حسن کا ایک چھلکتا ہوا ساغر ہے انداز پیشکش بھی لطافت کی حدوں کو چھوتا ہے۔ تاہم اس میں ؎ خدا کا ایک عطیہ ہے۔ محبت ایک نعمت ہے۔ اور ؎ محبت ایک دوشیزہ کی طرح خوبصورت جیسے مصرعے مناسب نہیں معلوم ہوتے بیکش اجمیری کے یہاں تغزل کا احترام ملتا ہے۔ ان کے اشعار میں دل کی دھڑکنیں صاف سُنی جاسکتی ہیں ڈاکٹر سخاوت شمیم کی غزل کا مطلع دل کے نرم گوشے سے اُبھرا ہے اور وہ قاری کے دل میں اتر جانے کی صلاحیت کا حامل ہے۔ تیسرا شعر بھی اِن اشعار میں گنا جائے گا ابدیت جن کا مقدر ہوتی ہے۔ تسنیم فاروقی کے یہاں ایک خوشگوار، نفیس ماحول دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ اکثر باتوں باتوں میں شعر کہہ جاتے ہیں۔ ؎ ہاں مگر کچھ خاص لمحوں کے لئے۔ انگ انگ اس کا مجھے شہکار ہے۔ اس شعر میں مجھے کوئی کہنے کے قابل بات نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر یوسف جاوید کے اشعار زندگی کی حرارت سے معمور ہیں۔ اندازِ بیان شگفتہ،

ذہن شاداب ہے۔ مگر مصرعہ ثانی خزاں کے نہج پر کبھی گموں کی طرح نظر ثانی کا محتاج ہے بیلیم واصف ان شعراء میں سے ہیں جو تغزل کے شیدائی ہونے کے باوجود ذہن کے دریچے کھلے رکھتے ہیں اور عالم جوش میں بھی ہوش کا دامن ہاتھوں میں تھامے رہتے ہیں۔ وہ فن سے دیانت داری برتنے کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ صلاح الدین عشقی کے خیالات میں صحتمندی، طاقت کے نشانات ملتے ہیں۔ وہ بیباک عزائم کا درس دیتے ہیں مگر اصنافِ غزل کا میدان سر کرنے کے لئے اپنے مخصوص و محدود حصار کو توڑنا ہوگا۔ طرب میرٹھی نے تلخ حقائق کو اپنی شیریں نوائی سے خوشگوار بنانے کا کرشمہ دکھا دیا ہے۔ لہجے کا ٹھہراؤ اور آسنگ کا دھیما پن قابل لحاظ ہے۔ ان کی غزل پر بہت سے دوسرے شاعروں کی طرح خالص تنظم کا گمان نہیں گزرتا۔ نثر اور نظم کے حصّوں پر ایک نظر کرنے سے ایسا لگتا ہے۔ کہ جیسے نخلستان ہر ہر قدم کے ساتھ منزل مقصود سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ خدا کرے مستقبل قریب میں یہ جریدہ ادبی رسائل میں ممتاز حیثیت کا مالک ہو۔ فیصلے آخری نہیں ہوتے۔ حرف آخر نہیں کسی کی بات۔

(مخمور جمالی سنبھلی)



## چیئرمین راجستھان اردو اکیڈمی کو صدمہ

۳۰ نومبر ۱۹۸۳ء کو جناب ڈاکٹر محمد علی زیدی کی ہمشیرہ نے مختصر علالت کے بعد سفر آخرت اختیار کیا۔ اِنا للہِ وَاِنا الیہِ راجعون۔ اللہ تعالےٰ مرحومہ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے

این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

ادارہ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہے

(ادارہ)

راجستھان اردو اکیڈمی کا مجلہ
سہ ماہی



# نخلستان

جنوری تا مارچ / اپریل تا جون ۱۹۸۴ء

جلد نمبر ۴ ———— شمارہ نمبر ۴



ڈاکٹر سید محمد علی زیدی (نگراں)
(چیرمین اکیڈمی)

## مجلسِ ادارت

ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی
سید منظور الحسن برکاتی
محمد یوسف عزیز بیکانیری

مدیران

ناشر

راجستھان اردو اکیڈمی
جے۔۳۔ سبھاش مارگ۔ سی اسکیم
جے پور ۳۰۲۰۰۱

سکریٹری راجستھان اردو اکیڈمی پرنٹر پبلشر نے جمال پرنٹنگ پریس [illegible] سے چھپوا کر دفتر راجستھان اردو اکیڈمی جے پور سے شائع کیا

سہ ماہی

# نخلستان

قیمت فی پرچہ تین روپے

زرِ سالانہ دس روپے

ترسیل زر اور مراسلت کا پتہ

## دفتر راجستھان اردو اکیڈمی

جے۔۳ سبھاش مارگ۔ سی اسکیم

جے پور۔۳۰۲۰۰۱

# ترتیب

# ترتیب

# گوشۂ نگراں

نخلستان کے قارئین اور اُن کے توسط سے دیگر حضرات کو عید سعید کی پُرخلوص مبارک باد۔ عید کے لغوی معنی ہیں جو بار بار آئے ؛ ہماری دعا ہے کہ خوشی کے مواقع آپ کی زندگی میں بار بار آئیں۔ اس موقع پر یک جہتی اور باہمی ارتباط کے جو روح پرور مناظر نظر آتے ہیں وہ ہندوستان کے سیکولر مزاج کے آئینہ دار ہیں۔ جب مختلف مذاہب پر اعتقاد رکھنے والے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں تو نہ صرف دل کی کدورت دور ہو جاتی ہے بلکہ عالمی برادری کے پیغام محبت کی برقی لہریں لامحدود وسعتوں تک پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ عہد حاضر میں جب ہوس نے نوعِ انسان کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ جب مذہب کے نام پر وہ لوگ جن کا مذہب سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہوں۔ جب وطن عزیز پر خطرات کے بادل منڈلا رہے ہوں اور جب ہمارے قومی وجود کو خطرہ لاحق ہو رہا ہو۔ ایسے دور میں باہمی ارتباط و اتحاد کے مواقع فراہم کرنا ہمارا قومی فریضہ ہے۔ اُردو زبان کا نعرہ ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا " فضاؤں کو چیرتا ہوا خلا تک پہنچ گیا ہے۔ اور وہاں سے ان خوش آئند الفاظ کو ہم اپنے کانوں سے سن چکے ہیں۔ ہم اُردو والے نفرت کے بجائے محبت، جنگ کے بجائے صلح و آشتی، نفاق کے بجائے اتفاق اور بے وفائی کے بجائے وفاداری کے حامی رہے ہیں۔ جگر مرادآبادی مرحوم نے

جب فرقہ وارانہ فسادات کے دور میں آدمی کو آدمی کے خون کا پیاسا اور شقاوت و درندگی
پر آمادہ دیکھا تھا تو وہ بے اختیار کہہ اٹھے تھے "شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل"۔
جب ذاتی مفاد کے لئے مذہب پر سیاست کا نقاب ڈال کے اُسے آلۂ کار بنایا جاتا ہے۔
تب اُردو والے اس کی نقاب کو نوچ کے پھینک دیتے ہیں تاکہ مذہب کا اصلی معصوم چہرہ
نظر آسکے جو الوہیت کے نور سے منور ہے۔ جو اعلیٰ اخلاق کا معلم ہے اور جو سب مخلوق
سے محبت کا پیغام دیتا ہے۔ جو عبد کا معبود سے رشتہ جوڑتا ہے۔

راجستھان اُردو اکیڈمی کی جانب سے اور اس کی مالی امداد سے کئی مشاعروں اور مذاکروں کا انعقاد کیا گیا۔ اکیڈمی کی تین ہزار روپے کی مالی امداد و تعاون سے نرائن شیل صاحب نے ایک مشاعرہ کا انعقاد کوٹا میں بتاریخ ۲۸ مارچ ۱۹۸۴ء کو کیا۔ اس میں مقامی شعرا اور شاعرات کے علاوہ بیرونی شعرا نے بھی شرکت کی اور مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔

ادبی سنگم جے پور نے بتاریخ ۲۴ مارچ ۸۴ء کی شب میں راجستھان اُردو اکیڈمی کی مالی اعانت سے ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا اس مشاعرہ میں قومی یک جہتی پر شعرائے کرام نے اپنی تخلیقات پیش کیں اور راقم الحروف نے اس کی صدارت کی۔ مشاعرہ میں مقامی شعرا کے علاوہ بیرونی شعرا نے بھی شرکت کی۔ مشاعرہ نہایت کامیاب رہا۔

۱۵ مارچ ۱۹۸۴ء کو مرکز اطلاعات میں اکیڈمی کی جانب سے ایک جلسہ کا انعقاد کیا گیا جس میں عزت مآب احمد بخش سندھی صاحب وزیر قانون و اوقاف مہمان خاص تھے اس جلسہ کی نظامت کے فرائض جناب عبدالحیٔ شیمم نے انجام دیئے اور صدارت کے فرائض راقم الحروف نے صدر اکیڈمی کی صدارتی تقریر کے بعد وزیر موصوف نے بصیرت افروز تقریر فرمائی جس میں اُردو کی عالم گیر حیثیت کو واضح کیا اور حکومت راجستھان اُردو کے فروغ کے سلسلہ میں جو اقدام کر رہی ہے اُن پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد جناب شیمم جے پوری اور جناب مخمور سعیدی کے توصیف نامے جناب عبدالحیٔ شیمم نے پڑھ کر سنائے اور مہمان خصوصی سے درخواست کی کہ وہ اپنے مبارک ہاتھوں سے جناب شیمم جے پوری کو ایک ہزار روپے

کا چیک اور ایک شال عطا فرمائیں۔ (جناب محمود سعیدی اس تقریب میں شرکت نہیں فرما سکے تھے۔ اس لئے چیک اور شال اُن کے پاس بذریعہ ڈاک بھیج دیا گیا۔) اسی تقریب میں ڈاکٹر مدیر علی زیدی کو اُن کی تصنیف عصری ادب پر ایک ہزار روپے کا انعام دیا گیا آخر میں جناب شمیم جے پوری نے اپنی مرصع غزلوں کو لحن داؤدی میں سنا کے حاضرین کو محظوظ کیا۔

انجمن ترقی اُردو دے پور نے ۱۴ اور ۱۵ اپریل کو قومی یک جہتی میں اُردو ادب کا حصّہ موضوع پر دو روزہ مذاکرہ اور ایک مشاعرے کا انعقاد کیا۔ راجستھان اُردو اکیڈمی نے اس کے لئے پندرہ ہزار روپے کا گراں قدر عطیہ منظور کیا تھا۔ راجستھان اُردو اکیڈمی کی اس تقریب میں عزت مآب احمد بخش سندھی وزیر قانون و اوقاف اور عالی جناب دیوبرا صاحب وزیر مال کے علاوہ جناب خواجہ احمد عباس صاحب، جناب کیفی اعظمی صاحب، ڈاکٹر محمد علی زیدی چیئرمین راجستھان اُردو اکیڈمی، پروفیسر قمر رئیس صاحب، پروفیسر عنوان چشتی صاحب اور دیگر مشہور اہل علم نے شرکت کی۔ مذاکرہ کے مرکزکشش جناب خواجہ احمد عباس صاحب تھے جن کی صدارت میں افتتاحی جلسہ اور مذاکرہ ہوا اور مشاعرہ کے محور جناب کیفی اعظمی تھے۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے مشاعرہ کی نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیئے، مشاعرہ اور مذاکرہ دونوں ہی بہت کامیاب رہے۔ مشاعرہ میں راجستھان اور مقامی شعراء کے علاوہ ہندوستان کے صف اول کے شعراء نے بھی شرکت کی۔ کیوں کہ یہ تقاریب اہم کامیاب اور معیاری ہیں۔ اس لئے ان کی تفصیلی رپورٹ موصول ہوتے ہی من وعن شائع کر دی جائے گی جو مقالات پیش کئے گئے ان میں سے صرف ایک ہی موصول ہو سکا ہے۔ جو اس شمارہ کی زینت ہے۔

اُردو کی ترقی ترویج میں کوشاں اساتذہ کی ہمت افزائی کے لئے اُن اساتذہ کو نقد انعامات دیئے گئے جن کے ______ سکنڈری اور ہائر سکنڈری امتحانات میں صد فیصد نتائج رہے اور جن کے شاگردوں نے امتیازی نمبر حاصل کئے۔ اسی طرح اُن اُردو کے اساتذہ اور صدر مدرس کو نقد انعامات دیئے گئے جن کے مدرسوں میں اُردو کے طلبہ اور طالبات کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ اس طرح مجموعی طور پر نو ہزار روپے رقم تقسیم کی گئی۔

راجستھان اُردو اکیڈمی اُردو ٹائپنگ کا ایک تربیتی مرکز بھی جلد ہی قائم کرنا چاہتی ہے پانچ اُردو کے ٹائپ رائٹرس خرید لئے گئے ہیں اور مناسب جگہ اور تربیت دہندہ کا انتظام ہوتے ہی یہ مرکز تربیت دینا شروع کر دے گا۔ مجھے توقع ہے کہ اس گلابی شہر میں اُردو ٹائپ کرنے والوں کا فقدان جلد ہی دور ہو جائے گا۔ اور روزگار کے اور وسائل مہیا ہو سکیں گے۔

اکیڈمی کے دفتر کے لئے زی روکس کی مشین بھی خرید لی گئی ہے اُردو میں تحقیق کرنے والوں کے لئے اور قدیم مخطوطات کے تحفظ کے لئے یہ بے حد مفید ثابت ہوگی۔

ہماری کوششوں سے اور حکومت راجستھان بالخصوص عزت مآب شیو چرن ماتھر صاحب وزیر اعلیٰ راجستھان اور عالی جناب احمد بخش سندھی صاحب وزیر حکومتِ راجستھان جو اُردو کے دلدادہ اور بہی خواہ ہیں اور جن کے اُردو پر احسانات ہیں، کی ہمدردانہ شنوائی کی وجہ سے کئی مدرسوں میں اُردو کا اجرا ہوا ہے۔ اُمید ہے کہ ڈونگرپور کالج، بیکانیر اور جودھپور یونیورسٹی میں اُردو کی تعلیم کا جلد ہی انتظام ہو جائے گا۔ میں ان دونوں حضرات کا شکر گذار ہوں وزیر اعلیٰ ماتھر صاحب نے گذشتہ سال اُردو کے طلبہ اور طالبات کے لئے جو ماہانہ وظائف کا اعلان کیا تھا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ اس سال ظاہر ہوا ہے۔ قارئین کو یہ پڑھ کر مسرت ہوگی کہ بی اے اور ایم اے کے درجات میں اُردو کے طلبہ اور طالبات کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ جو اُردو کے تابناک مستقبل کی نشان دہی کرتا ہے۔

ہم اُردو زبان و ادب کے فروغ میں کوشاں ہیں۔ اِدھر کچھ حضرات اپنی تخریبی کارروائیوں میں مشغول ہیں چند روز پہلے ایک بالکل غیر معروف ہستی نے کچھ اعتراضات کئے ہیں اکثر ادارہ میں بھی ایسے خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں کسی مصرعہ کے وزن سے گر جانے یا کسی قافیہ کے غلط بندھ جانے یا کسی عبارت میں تسامحات رہ جانے کی نشان دہی ہوتی تھی۔ انھیں شائع کر دیا جاتا ہے۔ میں بارہا تحریر کر چکا ہوں کہ نخلستان کو ذاتی رنجشوں کے اظہار کا ذریعہ نہیں بننے دوں گا۔ علمی و ادبی مباحث کے لئے نخلستان میں ہر اہلِ قلم کے لئے جگہ ہے۔ جو خطوط اہلِ نظر کے موصول ہوتے ہیں۔ وہ شائع کر دیئے جاتے ہیں۔ نہ ستائش کی تمنا ہوتی ہے نہ اختلاف رائے کا خوف

ہوتا ہے۔ لیکن بعض عیب جویوں کی نظر محض فرضی معائب پر ہی پڑتی ہے اس کو کیا کیا جائے نظر اپنی اپنی ہے لیکن جب کوئی ایسا شخص جس کی کوئی ادبی کاوش نظر سے نہ گذری ہو جس کے مبلغ علم کا بھی پیمانہ ہو اور بے جا اعتراضات کرے تو یہ ہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ "کئی معشوق ہیں" اس پردہ زنگاری میں یہ یہاں کچھ تصرف سے کام لے کے کوئی معشوق ہے کے بجائے کئی معشوق ہیں، تحریر کیا گیا ہے، کیوں کہ یہ مشترکہ کاوش ہائے بے جا کا نتیجہ ہے۔ مینجنگ بورڈ جس کے ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی بھی ایک رکن ہیں کے فیصلہ کے مطابق اِن کا نام مدیران کے تحت تحریر کیا گیا تھا۔ چوں کہ وہ میرے عزیز شاگرد ہیں اور انہوں نے اصرار کیا۔ اس لئے پھر مدیر اعلا کی جگہ اُن کا نام تحریر کر دیا گیا۔ "نخلستان" بہت سے اہل قلم حضرات کو اعزازی طور پر بھیجا جاتا ہے۔ لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ راجستھان کے اہل علم اردو سے اور خصوصاً نخلستان کے فروغ سے اتنی محبت ضرور رکھتے ہیں کہ دس روپے سالانہ کی قربانی دے سکیں۔ میں با شد خموشی کے اصول پر کاربند رہنا چاہتا تھا۔ یہ چند سطور محض گذارش احوال واقعی کے طور پر تحریر کی ہیں۔ اس سے میرا منشا کسی کا جواب دینا نہیں ہے اور وہ بھی لغو و مہمل باتوں کا۔

۲۷ رفروری ۱۹۸۴ء کو ساغر نظامی مرحوم نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ساغر کا کلام اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہے۔ اور ادبی حلقوں میں اُن کی کمی جس قدر محسوس کی جائے کم ہے۔ اُن کے منظوم تراجم ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔ اُن کے انتقال سے ایک ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ اور اُن کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔ اردو ادب میں اُن کی قد آور شخصیت تھی۔ ۱۹۸۴ء کا سال جے پور کے ادبی حلقوں کے لئے ناسازگار رہا۔ ۲۲ راپریل ۱۹۸۴ء کو بروز یکشنبہ راجستھان اردو اکیڈیمی کے ایک معزز رکن اور زبان کے مشہور شاعر جناب چاند نرائن شکوہ مہرؔ نے رحلت فرمائی۔ مہرؔ صاحب اُردو کے فدائی اور داغؔ کے رنگ میں کہنے والے شاعر تھے۔ اُن کا ایک مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے اور ایک اور مجموعہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ زبان و بیان کی خوبیاں اور اُن کا لکھنوی انداز مشاعروں میں سامعین سے خراج تحسین وصول کرتا تھا۔ اردو اکیڈیمی نے اور خصوصاً راقم الحروف نے انھیں ہمیشہ متاع بے بہا سمجھا۔ دیگر

روز یعنی ۲۳ اپریل کو جب اُن کا جنازہ سپردِ آتش کرنے کے لئے جایا جا رہا تھا۔ تو میں اس میں شریک تھا۔ اور اکیڈیمی کی جانب سے اُن کے جسدِ خاکی پر گل پاشی بھی کی۔ غالباً اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے شعرا میں سے بہت کم اُن کی آخری رسوم میں شریک ہو سکے۔ میری خواہش ہے کہ ان کا مجموعہ کلام شائع کیا جائے اور ان کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے۔ وہ اس گلابی شہر کی آبرو تھے اور اہل شہر کو اُن پر بجا طور پر فخر ہے۔ جون کے آخری ہفتہ میں جناب سدرشن بالی صاحب اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے داغ مفارقت دے گئے۔ سدرشن بالی صاحب نہایت با اخلاق اور ملنسار ادیب تھے۔ اُن کے افسانے بیسویں صدی میں عرصے سے شائع ہو رہے ہیں۔ اُن کے افسانوں کے مجموعہ کی طباعت کے لئے راجستھان اردو اکیڈیمی نے انھیں ایک ہزار روپے بطور امداد دیئے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ اس کی اشاعت سے پہلے ہی داغ مفارقت دے گئے۔ بیگم سدرشن بالی صاحبہ جن کا نام شانتی بالی ہے خوش فکر و خوش آواز شاعرہ ہیں۔ انھیں اپنے رفیق حیات سے بچھڑنے کا جس قدر رنج ہو وہ کم ہے۔ ہم اُن کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ آنجہانی بالی صاحب کے افسانوں کا مجموعہ دیوناگری رسم خط میں شائع ہو چکا ہے۔ ۵ رجولائی کو یہ منحوس خبر سنی کہ حکیم فتح محمد خاں آفسر صاحب بھی راہی ملکِ عدم ہوئے۔ آفسر مرحوم سادہ لوح ملنسار اور نیک انسان تھے۔ وہ ہر مشاعرہ میں مسند صدارت پر سب سے پہلے پہنچ کے رونق افروز ہو جاتے کیوں کہ بزم سخن کی صدارت وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ لوگوں نے انھیں "جانشین ذوق" کا خطاب دیا تھا۔ اور اس کی باقاعدہ رسم ادا کی گئی تھی۔ افسر مرحوم اس رسم میں پوری سنجیدگی و انہماک سے شریک تھے۔ اکثر لوگ مشاعرہ میں انھیں ٹوک دیتے تھے "استاد یہ مصرع وزن سے گر گیا" اور وہ جواب دیتے تم فکر نہ کرو میں نے ناپ لیا ہے وہ ہر بزم کی رونق اور زعفران زار تھے۔ کسی کے کہنے کا بُرا نہیں مانتے تھے۔ اُن کے انتقال سے زندہ دلان جے پور کی محفل سونی ہو گئی۔ ہمیں اُن کے انتقال کا ملال ہے اور اُن کے سوگواران کے غم میں شریک ہیں۔

حضرات۔ اس مرتبہ نخلستان کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ اکثر خطوط میں استفسار کیا گیا ہے۔ میں نے گشتی مراسلہ تمام سرپرستانِ نخلستان کے نام ارسال کر دیا ہے۔ میں نخلستان

کے تمام قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔ اس غیر معمولی تاخیر کی بہت سی وجوہات ہیں۔ میری مصروفیات و علالت، سکریٹری کی عدم موجودگی وغیرہ لیکن سب سے اہم وجہ یہ ہوئی کہ نثری تخلیقات موصول نہیں ہو سکیں۔ کوئی بھی رسالہ محض منظومات کے بل بوتے پر شائع نہیں ہو سکتا۔ اور نثر نگاروں کی بے حد کمی ہے۔ میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد صاحب اور پروفیسر عتیق احمد صدیقی صاحب صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا خاص طور پر اور اپنے عزیز شاگردوں ڈاکٹر مدبر علی زیدی اور ڈاکٹر روشن اختر کاظمی کا عام طور پر شکر گذار ہوں کہ انہوں ——— نے میری فرمائش پر اپنی تخلیقات سے نوازا۔ اصل میں سب سے بڑی دقت اس کے ادبی معیار کو قائم رکھنے میں ہو رہی ہے۔ اہل قلم کے تعاون کے بغیر نہ کوئی رسالہ شائع ہو سکتا ہے نہ اخبار۔ میں اُن دیگر حضرات کا بھی ممنون ہوں۔ جن کے رشحات قلم نخلستان کی زینت بنے ہیں۔ ڈاکٹر عثمانی نے چند ماہ پیش اپنے اداریہ میں راجستھان کے اہل قلم سے درخواست کی تھی وہ اپنی تخلیقات نخلستان میں شائع ہونے کے لئے بھیجیں لیکن صدائے برنہ خاست۔ میری کوشش ہے کہ آئندہ تخلیقات پر معاوضہ دیا جائے اس وقت کی وجہ سے ہی دونوں ——— یعنی جنوری تا مارچ اور اپریل تا جون کے شمارے یکجائی طور پر شائع کئے جا رہے ہیں، اُمید ہے کہ قارئین کرام ہماری مشکلات کے پیش نظر اسے معاف فرمائیں گے۔ آخر میں اس شعر کے ساتھ رخصت لیتا ہوں۔

میں جب آیا تھا یہاں تازہ ہوا لایا تھا
اب یہ موسم مری پہچان طلب کرتے ہیں

❁ ❁ ❁

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

# ذکرِ اقبال

## زیرِ طباعت تصنیف "پشکن کے دیس میں" کا ایک غیر مطبوعہ باب

چار بجے مادام پوپاوانینا کی طرف سے دعوت تھی۔ صبح نو بجے کا وقت تھا میں ناشتہ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کہ ایک طالبہ اور طالب علم ایرا اور فنجا کا پہلی منزل سے ٹیلی فون آیا۔ ایرا کہہ رہی تھی۔ ہم ماسکو یونی ورسٹی کے طالب علم ہیں اور آپ کو پروفیسر نینا کے گھر لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ میں اور الیگزینڈر نیچے اُترے اور ان دونوں بچوں کے ہمراہ تھوڑی دیر میں پروفیسر نینا کے گھر جا پہنچے۔ نینا بڑے تپاک سے ملیں۔ اپنے بیٹے لیوسے انھوں نے ملوایا جس کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ اپنی ماں کو سگرٹ نہیں پینے دیتا۔ اس بات پر بہت دیر تک ہنسی مذاق چلتا رہا۔ جب ہم لوگ گاڑی میں جا رہے تھے۔ تو میرے پوچھنے پر ایرا نے بتایا کہ وہ اقبال کی مثنوی "گلشنِ رازِ جدید" پر تھیس لکھ رہی ہیں۔ اور فنجا نے بتایا کہ وہ "ضربِ کلیم" اور "فریادِ اُمت" پر کام کر رہا ہے۔ میں نے کہا پھر ہم لوگ اُردو میں کیوں نہ بات کریں۔ لیکن اُردو وہ دونوں بہت اٹک اٹک کر بول رہے تھے۔ وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ انھیں اُردو بولنے کی مشق نہیں ہے۔ فارسی دونوں اچھی بول لیتے تھے۔ اُن کی اُستانی

پریگارنیا بھی فارسی رواں بولتی ہیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر فارسی میں بات چیت رہی۔ لیکن میں چونکہ خود جدید فارسی سے آشنا نہیں ہوں، اِس لیے میرے لیے وہ دِقت موجود رہی جو ایرا اور فجا کے لیے اُردو میں بات چیت کرتے وقت پیدا ہوئی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فارسی میں بات چیت اُردو کے مقابلے میں بہتر رہی۔

پروفیسر پوپادا کا مکان بہت ہی شاندار ہے۔ چار بیڈ روم کا مکان ہے۔ ہر کمرے میں کتابوں کے ریک اور الماریاں لگی ہیں۔ ڈرائنگ کم ڈائننگ رُوم میں بھی۔ میں نے سوچا جموں میں، میری بیوی اِس صورتِ حال سے ...... نالاں ہے۔ یہاں ان کا شوہر نالاں ہوگا لیکن پتہ چلا کہ ان کے شوہر "ماسکو نیوز" کے ایڈیٹر ہیں۔ اور ان دونوں کی لائبریری مشترکہ ہے۔

پوپادا نے بات چیت اُردو میں شروع کی۔ تھوڑی دیر میں پریگارینا بھی آگئیں۔ اور اُردو کی محفل کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ میں، پریگارینا، پوپادا، ایرا، فجا ہم سب اُردو جانتے تھے۔ ایک الیگزینڈر اور ایک ایوا اس محفل میں اُردو سے ناآشنا تھے۔ ان دونوں کی خاطر ہم سب بعض دفعہ انگریزی میں بات چیت شروع کر دیتے تھے۔ پوپادا کی اسٹڈی دیکھی۔ اس میں اُردو کی متعدد کتابیں نظر آئیں۔ اقبال، پریم چند، جوش، فیض، سجاد ظہیر، آل احمد سرور، کرشن چندر، مخدوم، احتشام حسین، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، محمد عقیل، ظ۔ انصاری، مخدوم محی الدین، محمد حسن، قمر رئیس، سردار جعفری اور راقم التحریر کی اکثر کتابیں وہاں موجود تھیں۔ مجھے اپنی کتابوں میں نثر کی تو متعدد کتابیں نظر آئیں لیکن مجموعۂ کلام کوئی نظر نہ آیا۔ یہ دیکھ کر خلیل الرحمٰن اعظمی کا وہ آخری خط مجھے یاد آگیا۔ جس میں انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ آپ نے نثر میں، بالخصوص اقبال پر، جس انداز سے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس سے کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ بطور شاعر کے آپ کو فراموش کر دیں۔ اِس کی ایک جھلک میں نے پوپادا کے گھر میں دیکھ لی۔ میں اور الیگزینڈر پوپادا کے گھر میں آکے بیٹھے ہی تھے کہ پوپادا نے ایک بوتل

واڈکا کی اور ایک وہسکی کی سامنے لاکے رکھ دی۔ اور پانچ سات گلاس میں نے کہا وہسکی تو چل جائے گی۔ لیکن واڈکا نہیں چل سکے گی۔ کیونکہ اس کے پینے کے آداب میرے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں۔ پوپاوا نے کہا کہ شروع میں واڈکا تو آپ کو لینا ہی ہوگی۔ چنانچہ میں ایک پیگ واڈکا لینے کے بعد وہسکی کی طرف ملتفت ہوا، اور وہسکی میں تمام اہلِ محفل شریک تھے۔

ایرا نے اقبال کی "گلشنِ رازِ جدید" کے ساتھ محمود شبستری کی "گلشنِ راز" کا ذکر چھیڑا اور کہنے لگی تصوّف ایک بہت ہی مشکل موضوع ہے۔ میں نے حیرت سے کہا۔ کہ آپ لوگ نہ خدا کو مانتے ہیں نہ روح کو۔ آپ تصوّف کے مفہوم سے کیسے لذّت اندوز ہوتے ہوں گے۔ پریگاریناپولیس واقعی بعض مقامات بہت مشکل کا باعث بنتے ہیں مثلاً اپنے اندر سفر کرنے کے مفہوم سے ہم لوگ ناآشنا ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ سوال "گلشنِ راز" میں بہت اہم سوال ہے۔ پھر میں نے محمود شبستری کا یہ شعر پڑھا۔

کہ من باشم؟ مرا از "من" خبر کُن
چہ معنی دارد "اندر خود سفر کُن"

اور بتایا کہ پہلے مصرعے میں جو سوال ہے اُس کے معنی یہ ہیں کہ "خودی کی ماہیت کیا ہے" یا "میں" کسے کہتے ہیں۔ اور دوسرے مصرعے میں جو سوال درج ہے۔ اور جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "اپنے اندر سفر کرنے سے کیا مراد ہے" تو دراصل یہ دونوں مصرعے آپس میں انتہائی طور پر مربوط مصرعے ہیں اور ان دونوں مصرعوں میں دو سوال نہیں بلکہ ایک ہی سوال پوشیدہ ہے۔ خود محمود شبستری اِس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جب ہستی مطلق قابلِ اشارہ ہوجاتی ہے۔ یعنی جب انائے مطلق تعیّنات میں آکر متعیّن ہوجاتا ہے اور انائے مقید کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اِس انائے مقید کو "من" (میں)، یا 'خودی' کہتے ہیں۔ ساتھ ہی میں نے اپنی اس ناقص رائے کا اظہار کیا کہ ان دو سوالات کے جواب میں اقبال نے وحدۃ الوجود کا وہی تصوّر پیش کیا ہے

چو خود محمود شبستری کا ہے۔ اس ضمن میں اقبال کے اشعار یہ ہیں۔

ترا گفتم کہ ربطِ جان و تن چیست | سفر در خود کُن و بنگر کہ "من" چیست
سفر در خویش زادن بے اب و مام | ثریا را گرفتن از لبِ بام

اور اگرچہ اقبال اس مسئلے کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اس راز کا زبان پر لانا محال ہے لیکن ساتھ ہی اپنا نظریہ ان لفظوں میں بیان کر بھی دیتے ہیں۔ کہ

جُدا از غیر و ہم وابستۂ غیر | گُم اندر خویش و ہم پیوستۂ غیر

چراغے در میانِ سینۂ تُست | چہ نور است ایں کہ در آئینۂ تُست

مشو غافل کہ تو او را امینی!
چہ نادانی کہ سوئے خود نہ بینی

یہ بالکل وُہی خیال ہے جو "ساقی نامہ" میں ان الفاظ کا لباس پہن کر ہمارے سامنے آیا ہے۔

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر | مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
یہ عالم، یہ بُت خانۂ شش جہات | اِسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں | کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں | مگر عین محفل میں خلوت نشیں
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے | یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

اِس پر غالباً پر ابگا ریتا یا ایرا نے سوال کیا کہ اقبال جب کہتے ہیں کہ

بطرزِ دیگر از مقصود گفتم
جوابِ نامۂ محمود گفتم

تو وُہ "بطرزِ دیگر" سے کیا مراد لیتے ہیں۔

سوال واقعی بہت دلچسپ تھا اور بہت اہم اور یہ دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی

کہ اقبال پر کام کرنے والے روسی طلبہ اور ان کے اساتذہ کس طرح اقبالیات کی گہرائی میں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ہم بیشتر ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی طرح کلامِ اقبال سے سرسری نہیں گزر جاتے، بلکہ ہر جا جہانِ دیگر تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ میں نے اُس مجمعِ عاشقانِ اقبال کے سامنے یہ بات وضاحت سے بیان کی کہ یہ اشارہ محمود شبستری کے تصوّرِ فنافی اللہ کی طرف ہے۔ اقبال فنا فی اللہ سے جو مراد لیتے ہیں وہ مفہوم محمود شبستری کا نہیں ہے۔ انائے مقیّد کا کمال محمود شبستری اور شیخ محی الدین ابن عربی دونوں کے یہاں یہ ہے۔ بلکہ رومی کے یہاں بھی یہی ہے کہ وہ (انائے مقیّد) انائے مطلق میں گم ہو جائے۔ اقبال اس وصال کے قائل نہیں، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ انائے مقیّد اپنی ہستی برقرار رکھے۔ یہاں میں نے اقبال کے یہ شعر مثال کے طور پر پڑھے :۔

اے خوش آں جوئے تنک مایہ کہ از ذوقِ خودی
در دلِ خاک فرو رفتہ و بدریا نرسید

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذّتِ طلب
عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب
گرمیِ آرزو فراق، شورشِ ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرے کی آبرو فراق

اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاب اولیٰ
نگیرد با من ایں سودا متاع از لبِس گراں خواہی

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل — چیست حیاتِ دوام سوختنِ ناتمام
بہ بحرش گم شدن انجامِ ما نیست — اگر او را تو درگیری فنا نیست
چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی — ترا او بیند و او را تو بینی

تخلستان

اِس محفل میں اقبال کے فارسی اشعار نے اُردو اشعار کی بہ نسبت زیادہ کام دیا کیونکہ اگرچہ ہماری بات چیت زیادہ تر اُردو ہی میں رہی لیکن پریگارینا، نتاشا، اِیرا اور رفجا کی وجہ سے فارسی شاعری کا پلڑا اُردو کے مقابلے میں بھاری رہا۔

اتنے میں لیوپاوا نے کہا کہ آپ کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ اِس وقت کھانا گرم ہے۔ بعد میں ٹھنڈا ہو جائے گا۔ میں کھانا میز پر لگاتی ہوں۔ یہ کہہ کے وہ اُٹھیں۔ لیو نے اُن کا ہاتھ بٹایا اور اُنھوں نے چاول اور روسی روٹی کے ساتھ طرح طرح کے کھانے میز پر چُن دیے۔ میں نے پریگارینا سے کہا ابھی تو چھے بجے ہیں۔ کیا آپ رات کا کھانا اتنا جلد کھا لیتے ہیں۔ بولیں ہم لوگوں کے کھانے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی اور کھانے کی میز پر جا بیٹھا۔ لیوپاوا نے کھانا بہت لذیذ پکایا تھا۔ مُرغ، مچھلی، گوشت، ترکاری، چاول، ہر چیز لذیذ تھی۔ مکھن، پنیر، سلاد اس کے علاوہ تھا۔ کھانے کے دوران میں روسی آداب کے مطابق ایک بار پھر واڈکا کا دَور چلا۔ کوئی سات بجے کھانے سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد چائے آئی اور پھر ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر واپس آ گئے۔ کھانے کے دوران میں بھی اُردو زبان اور ادب کا ذکر چلتا رہا۔ اِس دوران میں مشاعرے کا ذکر آیا اور لیوپاوا نے مجھ سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ لیکن یہ فرمائش ذکرِ اقبال ہی کی نذر ہو گئی۔

پریگارینا نے "بانگِ درا" کھول کے اقبال کی نظم "میں اور تو" نکالی اور پوچھا کہ کیا "تو" سے مراد ہندو ہے۔ میں نے نظم کے ایک ایک شعر کی تشریح کی اور بتایا کہ "تو" سے مراد ہندو نہیں ہے بلکہ اِس "تُو" سے مراد ایک مخاطب نہیں کئی مخاطب ہیں۔ بنیادی طور پر اس نظم میں اقبال نے اپنا فلسفۂ حرکت اور فلسفۂ ارتقار بیان کیا ہے۔ یہ آپ کہہ سکتی ہیں کہ "تو" سے مراد " Have " ہے اور "میں" سے مُراد " Have not " ہے لیکن Have not بھی ہمیشہ Have not نہیں رہے گا۔ کیونکہ تغیّر اصولِ فطرت ہے۔ ایک ہی مقام پر قرار یا قیام نظریۂ ارتقا

کے خلاف ہے۔ اقبال "حرفِ کُن"، سے بھی یہی مراد لیتے ہیں ـــــ کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کُن فیکون ـــــ یعنی یہ کائنات ہر لمحہ ارتقا پذیر ہے۔ پر لیگا رینا نے میری بات غور سے سُنی سننے کے بعد کہا کہ اسی عنوان کی ایک نظم اور بھی ہے۔ کیا وہاں "تو" سے مراد "ہندو" ہے۔ میں نے اس نظم کے دو تین شعر انھیں سنائے۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا

کہنے لگیں ہاں یہی نظم ہے۔ میں نے کہا اس میں بھی "تو" سے مراد ہندو نہیں ہے بلکہ اِس نظم میں بحیثیت مجموعی خطاب مسلمانوں سے ہے ـ اُن مسلمانوں سے جنھوں نے غیر اسلامی طریقے اپنا لیے ہیں۔ میں نے اس نظم کے اکثر اشعار کا انھیں انگریزی میں ترجمہ کر کے سُنایا۔ بالخصوص اِس شعر کا ؎

گلۂ وفائے جفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے

جو صنم کدے میں بیاں کروں تو صنم پکارے ہری ہری

اِس پر نتاشا کہنے لگیں کہ ہاں اب بات سمجھ میں آ گئی ہے۔ پہلے اِس نظم کے متعلق میرا خیال کچھ اور تھا۔

معلوم نہیں بعض غیر ملکی طالب علمانِ اقبال کے دل میں یہ بات کیوں گھر کر گئی ہے۔ کہ اقبال کی ساری شاعری "ہندو" اور "مسلمان" کے دائروں میں محصُور ہے ہو سکتا ہے اِس کا سبب اقبال پر وہ بیسیوں کتابیں ہوں جن میں اقبال کو ایک بہت محدود انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جہاں تک نئی نسل کا تعلق ہے۔ اقبال اس وقت ایک دوراہے پر ہیں۔ اس حقیقت کو کہ اقبال کا سرچشمۂ افکار بنیادی طور پر قرآن اور حدیث ہے۔ اِس طرح سے پیش کرنا کہ "اقبال "ہندو" اور "مسلمان" کے تنگ دائروں سے باہر نہ نکل سکیں۔ کلامِ اقبال اور فکرِ اقبال کے انتہائی بے احتیاط اور غیر ذمہ دارانہ مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اقبال کو اس طرح محدود کر دینے سے اقبال اور اِسلام دونوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔
اِس کے بعد پر لیگا رینا نے خضرِ راہ " کا ذکر چھیڑا اور کہا کہ سردار جعفری کہتے ہیں۔

"آفتابِ تازہ" سے مراد سوشلزم ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ میں نے کہا میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ "خضرِ راہ" کا یہ سارا بند۔

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا

سرمایہ و محنت کی آویزش کے متعلق ہے۔ پریگاریتا کہنے لگیں میرا خیال ہے۔ "آفتابِ تازہ" سے مراد اسلام ہے۔ میں نے اس 'بند' کے بعض اور اشعار سُنا کر اپنا نقطۂ نگاہ واضح کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نتاشا مجھ سے متفق نہ ہوئیں۔ اقبال کے سوشلزم سے متعلق خیالات پر ذرا سی بات ہوئی۔ اور میں نے کہا کہ اِس موضوع پر میں نے اپنی کتاب "اقبال اور مغربی مفکرین" میں مفصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب نتاشا کے پاس تھی اُنھوں نے کہا کہ میں اِس مضمون کو پوری توجہ سے پڑھوں گی۔

نتاشا کو میں نے بتایا کہ آپ کا پتہ مجھے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے دیا تھا۔ بولیں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن میرے گھر بھی آچکے ہیں۔ میری دو بچیاں ہیں۔ ایک بارہ سال کی دوسری آٹھ سال کی۔ بارہ کو اُنھوں نے انگریزی میں Twenty کہا۔ ایرا نے ان کی تصحیح کی۔ اور کہا Twelve بولیں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے میری بڑی بچی کو دیکھ کر کہا یہ ہندوستانی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے کہا مجھے تو اِس وقت آپ سب ہندوستانی معلوم ہو رہے ہیں۔ اُردو میں ہم لوگ بات کر رہے ہیں۔ اقبال اور اُردو کے دوسرے فن کاروں کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ تو سارا ماحول ہی ہندوستانی ہے۔

گھڑی دیکھی تو نو بج چکے تھے۔ میں نے اجازت طلب کی۔ لوبا وا، پریگاریتا، ایرا اور رفیّا مجھے "یونی ورسٹی" نام کے زمین دوز اسٹیشن تک پہنچانے آئے۔ وہاں سب سے الوداع کہی۔ میں اور الیگزینڈر بجلی کے زینے سے نیچے اُترے اور ایک محل نما ریلوے اسٹیشن پر جا پہنچے۔ ریلیں ایک ایک منٹ کے بعد آجا رہی تھیں۔ ایک ڈیڑھ منٹ میں ہم ریل میں سوار ہو گئے۔ زمین دوز ریلیں بہت تیز چلتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہم "مارکس" نامی ایک اسٹیشن پر اُترے۔ بجلی کا زینہ ہمیں چشم زدن میں باہر زمین پر

لے آیا۔ وہاں سے کریملن کے سامنے ریڈ اسکوائر اور لینن کے مقبرے سے ہوتے ہوئے ہم لوگ اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔

الیگزینڈر مجھے کمرے میں پہنچا کے رخصت ہوئے اور میں کپڑے تبدیل کر کے سو گیا۔ دن میں چونکہ بھاگم بھاگ رہتی ہے۔ اور میں بہت تھک جاتا ہوں، اس لیے رات کو نیند بڑے مزے کی آتی ہے۔ ہاں ایک دن چائے کی زیادتی کے باعث صبح تک جاگنا پڑا تھا۔ اس کے بعد میں چائے اور کافی کے معاملے میں محتاط ہو گیا۔

⁂

# دُنیا میں ساٹھ کروڑ افراد

# اُردو زبان بولتے ہیں

اس کا اظہار اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی و ثقافتی تنظیم

نے

ایک جائزہ میں کیا ہے

اس سے **اُردو زبان**

کی اہمیت اور اس کے علمی کارناموں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے

پروفیسر عتیق احمد صدیقی

# سخا کی نعت گوئی

اُردو کے لسانی ارتقا کی توجیہات کچھ بھی کی جائیں، خواہ اس کے ابتدائی آثار مختلف علاقوں میں تلاش کیے جائیں، یا اس کی ابتدا کا تعلق مختلف بولیوں سے منسوب کیا جائے، اسے ملواں اور بہت سی بولیوں کا مُرکب تسلیم کیا جائے یا اس کی آزاد نشوونما کی نشان دہی کی جائے، لیکن تہذیبی سطح پر یہ بلاشبہ محبت و آشتی، میل ملاپ، رواداری اور بھائی چارے کی زبان رہی ہے۔ اس کی سرشت کی تعمیر ہی بقائے باہم اور اتحاد و یگانگت کی بنیادوں پر ہوئی۔ بازاروں اور گلی کوچوں میں اس نے لوگوں کے قلوب کو جوڑا اور مغایرت دُور کی۔ امرا کی محفلوں کو اس نے رونق بخشی اور ان سے خراج وصول کیا۔ عوامی مجمعوں میں اس کی شیریں بیانی نے دلوں کو موہ کر رواداری کے جذبات پیدا کئے۔ دیر و حرم تک اس کی یکساں رسائی ہوئی اور دونوں ہی جگہ اس کی پذیرائی ہوئی۔ یہ کبھی صوفیوں کی آواز بن کر اُبھری، کبھی سادھو سنتوں کے دل کی دھڑکنیں اس میں سنائی دیں اور کبھی یہ دونوں آوازیں اس طرح گڈمڈ ہو گئیں کہ ایک کی دوسرے سے شناخت مشکل ہو گئی۔ اس کے سہارے ایک مشترکہ تہذیب وجود میں آ رہی تھی۔ تہذیبی طور پر جو اختلاط و ارتباط ہو رہا تھا اس نے تفریق و امتیاز کی بہت سی دیواروں کو منہدم کر دیا، بُعد کو قربت سے بدل دیا، اجنبی چیزوں کو پسندیدہ بنا دیا۔ کبھی میر کی آواز سنائی دی ؎

کس کا قبلہ کیسا کعبہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

پھر برج کی پریم بھومی سے نظیر کا الاپ سنائی دیتا ہے۔

تعریف کروں میں اب کیا کیا اس مرلی دھر بجیا کی
نت بیرا گنج باکی اور بن بن گو و چریا کی
گوپال بہاری بنواری رکھ بھرنا مہر کریا کی
گردھاری سندر شام ہرن اور
یہ لیلا ہے اس نند للن من موہن قسمت بدھنا کی
رکھ سور میاں کو ڈنڈوت کر و جے بولو کرشن کنہیا کی

اور ان آوازوں کے ساتھ ہی راجہ مکھن لال مکھن کا ترانۂ شوق اٹھا ہے۔

حمید و احمد و محمود تم ہو یا رسول اللہ
سعید و اسعد و مسعود تم ہو یا رسول اللہ
ہر آن و زماں موجود تم ہو یا رسول اللہ
دل وجاں کے مرے مقصود تم ہو یا رسول اللہ
نہ باشد غیر تو دیگر پناہم یا رسول اللہ
بکن لطف و کرم بر اشک و آہم یا رسول اللہ

اور منشی شنکر لال ساقی دربارِ رسول ص میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں :۔

جب مئے عشقِ نبی ص سے مجھے مستی ہوگی بیخودی ہوگی بلندی نہ یہ پستی ہوگی
میں اگر خاک نشینِ درِ احمد ہوں گا رفعتِ عرش کی ہمسر مری پستی ہوگی

سرزمین ہند پر آپسی میل ملاپ سے جو گنگا جمنی تہذیب وجود میں آ رہی تھی ۔ اس

نے ہمیں اپنے مذہبی حدود میں رہتے ہوئے دوسروں کے عقائد مذہبی کا احترام کرنا سکھایا۔
ہندو شعراء نے نہ صرف یہ کہ رسمی طور پر اپنی شاعرانہ تخلیقات کو حمد و نعت سے شروع کیا بلکہ شعراء کو رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات میں ایسی کشش محسوس ہوئی کہ انھوں نے نعتیہ مضامین کو باقاعدہ اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ جستجو کی جائے تو اس کشش کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک بڑا سبب ان صوفیاء کی بے لوث زندگی اور پاک سیرتیں ہیں۔ جنھوں نے دنیاوی جاہ و مناصب سے دُور رہ کر پیغامِ حق سُنایا۔ اور نہ صرف اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو، بلکہ دوسروں کو بھی اپنا گرویدہ بنایا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے علاوہ بہت سے غیر مسلم شعراء نے بھی ان بزرگوں کی شان میں منقبتیں لکھ کر اظہارِ عقیدت کیا ہے۔ اور چونکہ خود ان بزرگوں کی سیرت ان کے اخلاق اور ان کی روحانیت کا سرچشمہ رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات اور تعلیمات تھیں۔ ان کے لئے ہی جذبۂ احترام اور عقیدت پیدا ہو جانا لازمی تھا۔
دکن کے راجہ مکھن لال سے لے کر شمال کے عرش ملسیانی تک ہندو شعراء کی ایک طویل فہرست ہے۔ جنھوں نے نعت اور منقبت گوئی میں اپنی طبع رسا کے جوہر دکھائے ہیں۔ یوں نہیں کہ ان حضرات نے محض رسماً یا تقلیداً دو چار شعر کہے ہوں بلکہ ان میں سے ہر ایک کا وافر کلام صنفِ نعت و منقبت میں ملتا ہے۔
یہاں یہ کہنا شاید غیر ضروری ہو کہ نعت کا تعلق مدحِ رسول ؐ سے ہے حُبِّ رسول ؐ مسلمانوں کا جزوِ ایمان ہے۔ اور اسوۂ حسنہ اس کے لئے فکری اور عملی زندگی کا نمونہ! اول الذکر کی بنا پر وہ جذبۂ محبت سے سرشار ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے اس میں اس کی والہانہ شیفتگی، گہرے قلبی تعلق، ذوق و شوق، جذب و مستی، آرزوئے دید اور روضۂ رسول ؐ تک پہنچنے کی خواہش، اور اس راہ میں جان تک نثار کرنے کی تمنّا، اور آخر میں روزِ قیامت، قیامت میں شفاعت کی امید کا اظہار ہوتا ہے۔ عاشقانہ کیف و مستی کے تمام تر اظہار کے باوجود ادب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا جا سکتا،

کہ رسول کی تمام تر شانِ محبوبی اور شانِ جمالی کے ساتھ حدِ ادب بھی مقرر کردی گئی ہے۔

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار!

ثانی الذکر سبب شاعر کو وصف گوئی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس میں سیرتِ رسول کے مختلف پہلو آجاتے ہیں۔ آپ کی ذات جامع کمالات تھی۔ اور اخلاقِ حمیدہ کا مجسم، اس میں نہ صرف اہلِ اسلام کے لئے بلکہ جملہ انسانوں کے لئے بہترین اخلاقی درس موجود ہے۔

نعت کے اس حصے میں آپؐ کے اوصاف و محامد، اخلاق و شمائل، عادات و اطوار، عبادات و ریاضات سبھی کا ذکر ہوتا ہے۔ کہیں صرف مدحیہ انداز میں اور کہیں عملی زندگی کے اعلیٰ ترین نمونہ کے طور پر دوسروں کے لئے بھی معاشرت و معیشت میں قابلِ تقلید بن جائیں۔ دراصل شعرائے اہلِ ہنود کو اسی حصے نے متاثر بھی کیا، اور نعت گوئی کی طرف مائل بھی کیا اور اسی راہ سے ان میں سے بعض حُبِّ رسولؐ تک بھی پہنچے۔

لچھمی نرائن سر لو استو سخا ایسے ہی شعرائے اہلِ ہنود سے ہیں۔ جنھوں نے اپنی شاعری کا بیشتر حصہ نعت و منقبت گوئی کے لئے صرف کر دیا۔ ان کا دیوان "معراجِ محبت" مختصر ہے۔ اس میں رباعیات، قطعات، منظومات اور غزلیات سبھی اصناف ہیں۔ لیکن تقریباً دو سَو صفحے کے دیوان میں نصف سے زیادہ نعت و منقبت کے لئے وقف ہوا۔ اس میں اردو کے علاوہ فارسی کلام بھی شامل ہے۔ یہاں ان کے نعتیہ کلام کا جائزہ مقصود ہے کہ غزل بہت لوگوں نے لکھی اور لکھ رہے ہیں۔ مسلم شعرا نے نعت لکھ کر اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا کہ یہ ان کا جزوِ ایمان ہے۔ لیکن ایک غیر مسلم شاعر کا نذرانۂ عقیدت اور وہ بھی اس ذوق و شوق کے ساتھ یقیناً اس قابل ہے کہ اس پر توجہ کی جائے۔

سخا کی شاعری ذوق و شوق کی شاعری ہے۔ انھوں نے ساری زندگی سرکاری ملازمت میں گذاری۔ وہ ریاست جے پور میں ناظم (کلکٹر) اور فوجدار (سٹی مجسٹریٹ) کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ انھوں نے اپنے فرائض منصبی کے ساتھ اپنے ادبی ذوق کو بھی

برقرار رکھا۔ وہ کئی واسطوں سے شاہ نصیر اور ان کے واسطے سے خواجہ میر درد کے سلسلۂ تلامذہ میں تھے۔ اس پر ان کو فخر بھی تھا۔ اور شاید یہ خواجہ میر درد ہی کا فیضان تھا کہ سخا اپنے کلام میں ایسے رندِ پارسا نظر آتے ہیں جس نے مئے خانۂ عشقِ حقیقی سے جرعہ کشی کی ہے۔ ان کی زندگی کے بعض واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں رسول اکرم ؐ اور بعض دوسرے بزرگوں سے جس والہانہ عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔ وہ محض ایک شاعرانہ ترنگ نہیں تھی، بلکہ وہ سرتاپا اس کیف میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور ان کا کلام اس بات کا شاہد ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ محض رسمی ...... بات نہیں ہے بلکہ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہے۔

اُوپر ذکر ہوا تھا کہ وصف نگاری انسانی خصائل کا ذکر ہے۔ ہم کسی شخص کی روحانی عظمت کے قائل نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے شخصی محاسن کو سراہ سکتے ہیں۔ اور ایک اچھے انسان کی حیثیت سے اس کے اخلاق و فضائل کی تعریف کر سکتے ہیں۔ اس نے جو کارنامے انجام دیئے، انسانوں کی فلاح کے لئے جو خدمات کیں، انسانی معاشرے کو اس کی ذات سے جو فوائد پہنچے، ان سب کا ذکر کر کے اس کو خراجِ عقیدت پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن شیفتگی و گرویدگی کا اظہار صرف اس صورت میں کرتے ہیں۔ جب جذبۂ محبت دل پر طاری ہو چکا ہو۔ سخا کے ہاں ہمیں ذاتِ رسول ؐ کے صرف خارجی اوصاف ہی کا ذکر نظر نہیں آتا، بلکہ شیفتگی و گرویدگی کے وہ جذبات ملتے ہیں جو مئے عشقِ رسول سے سرشاری کا مظہر کہے جا سکتے ہیں۔ ان کی نعت کے ہر ہر شعر سے مقدس محبت کے سوتے پھوٹتے محسوس ہوتے ہیں۔

ہے یہی دل جس میں ہیں اللہ اور اس کے حبیب ؐ
ہے یہی دل عالمِ اسرار سے ملتا ہوا

عجب کیا کامرانِ دوجہاں ہوں | سوالی ہوں میں شاہِ دوجہاں کا
ذرا محبوبِ حق کا چھیڑ دو ذکر | اگر ہے شوق میری داستاں کا

محمدؐ دل میں لب پہ یا محمدؐ ۔۔۔ غرض لطف آگیا دل کا زباں کا
چھپاتے ہو سخا عشقِ نبیؐ تم ۔۔۔ اثر ہے نعت میں سوزِ بیاں کا

محمدؐ ہیں میرے دل میں، مدینہ ہے مرا سینہ ۔۔۔ محمدؐ کی محبت نے کیا ہے دل میں گھر پیدا
کچھ کبھی ہو ہم کو محمدؐ پہ فدا ہونا ہے ۔۔۔ سرخرو یعنی ہمیں پیشِ خدا ہونا ہے
عشقِ محمدؐ میں یہ رو رو کے مرا مرجانا ۔۔۔ اشکِ خوں کا بھی مرے آبِ بقا ہونا ہے
نبیؐ کا عشق ہو دردِ جگر یوں ہو تو بہتر ہے ۔۔۔ ہو بندے میں خدا کا کچھ اثر یوں ہو تو بہتر ہے

اس طرح کے والہانہ اشعار ان کے دیوان میں اِدھر سے اُدھر تک بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کو پڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر عشقِ نبیؐ سے سرشار ہے۔ اس کا درد اس کی کسک اور عاشقانہ خودسپردگی جابجا نظر آتی ہے۔ اس والہانہ مستی کی لے کبھی اس سے بھی زیادہ تیز نظر آتی ہے۔ ان کی ایک ہی زمین میں دو نعتیہ غزلیں تو پوری کی پوری ایسے کیف و مستی میں ڈوب کر کہی گئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعر نے خود کو ہمہ تن اس تصور میں غرق کر دیا ہے۔ اور خود محمدؐ اور اس کی کارفرمائی کے علاوہ تمام موجودات اس کے لئے ہیچ ہیں۔ پہلی غزل کا مطلع ہے ؎

کہوں میں تم سے کیا لوگو محمدؐ ہی محمدؐ ہیں
جہاں دیکھو جدھر دیکھو محمدؐ ہی محمدؐ ہیں

مطلع ہی سے مستی و سرشاری کا عالمِ کیف نظر آتا ہے اور یہ کیفیت روبہ ترقی ہی نظر آتی ہے۔ ذرا یہ اشعار اور ان کا تیکھا اندازِ بیان تو ملاحظہ ہو ؎

دکھاؤں کس طرح تم کو مگر اچھا اِدھر آؤ
مری آنکھوں سے تم دیکھو محمدؐ ہی محمدؐ ہیں
نبیؐ کے عشق کا دعویٰ تمہیں زیبا نہیں جب تک
یہ حالت ہو، جدھر دیکھو محمدؐ ہی محمدؐ ہیں

اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ شاعر کا خروش کم نہیں ہوتا، بلکہ اس کی خودگم گشتگی

کی کیفیت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اور گیارہ اشعار پر مشتمل پہلی غزل ختم کر کے وہ دوغزلہ شروع کرتا ہے تو عالم سرخوشی میں ڈوب جاتا ہے۔ اور اس عاشقانہ نشاط کو مستانہ وار یوں ظاہر کرتا ہے۔ ؎

خدا کو اور خدائی کو محمدؐ ہی محمدؐ ہیں آہا ہا ہا' اہو ہو ہو محمدؐ ہی محمدؐ ہیں

دوسرا مصرعہ شاعرانہ اظہار بیان سے زیادہ عاشقانہ اظہار کا حامل ہے۔ ایک ایسے عاشق کا اظہار جو اپنے تمام خارجی حواس کو رہین ولا کر چکا ہو اور اب نعرۂ مستانہ کے علاوہ زبان سے کچھ بھی نہ ادا ہو پا رہا ہو۔ مگر کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ کہ عاشق کا یہ نعرۂ مستانہ ہزار شیوہ ہائے بیان پر بھاری ہے۔ مگر یہ عالم کیف' عالم دیوانگی نہیں ہے۔ اگر ہے تو ایسی دیوانگی جس پر ہزار فرزانگیاں قربان ہوں! عاشق اس عالم میں کون سی منازل طے کرتا ہے۔ اور کس مقام تک پہنچتا ہے اس کو وہی جانتا ہے' یا وہ جو خود اس راہ کے سالک ہیں اور جن کے دل کی آنکھیں روشن ہیں۔ اور اسی لئے وہ اس وحشت و دیوانگی کو رونق سے تعبیر کرتا ہے۔ ؎

نبیؐ کی محفلوں میں کاش آجائیں نظر والے

ذرا یہ رونقیں دیکھیں مری وحشت کے ساماں کی

شاعر کا یہ جذبۂ محبت پھیلتا اور بڑھتا ہے اور اس کی آتشِ شوق تیز تر ہوتی ہے تو دوری و مہجوری اس کو شاق گذرتی ہے۔ عہد رسالت تو ختم ہو چکا' کہ رسولؐ تک رسائی ہو سکتی' اب تو ہجر ہی ہجر ہے۔ اِس میں ایک عاشق کی طرح تڑپتے رہنا' اور تڑپ تڑپ کر جان دے دینا ہی بڑی سعادت ہے۔ ؎

یہ وہ ہے مر گیا جو روتے روتے ہجر احمدؐ میں

جو میری قبر پر تم نوحہ گراں ہو تو بہتر ہے

یا پھر دیارِ رسولؐ تک پہنچنے کی آرزو اسے بے چین و مضطرب رکھتی ہے۔ کہ اضطرابِ ہجر کا کچھ مداوا اس صورت میں ممکن نظر آتا ہے۔ ؎

درِ محبوبِ حق پر مجھ کو لے جا کر ذرا رکھ دو
جو تم سے ہمدموں پہ آئے یہ صورت ہی درماں کی

اہلِ اسلام نے اس بات کا اہتمام رکھا ہے کہ رسول سے تمام تر محبت کے اظہار کے باوجود ایک عداوت قائم رہے۔ اور عاشقانہ شوخی گستاخی کی حد تک نہ پہنچے۔ سحا اس نکتہ سے آشنا ہیں اور مقامِ رسالت کے احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں ؎

سیکھو کرو ہر ہر قدم پر شکر کے سجدے
حرم والو! مدینے کا سفر یوں ہو تو بہتر ہے

ولادت رسول ؐ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

تعظیم اٹھو اب یہ ادب کا ہے محل

محبت کا یہ اظہار اور احترام کی یہ شدت بجائے خود مقصد نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پسِ پشت اس امر کی تلقین ہے کہ شعار رسول ؐ کی پیروی کی جائے۔ احکام کی اطاعت دو ہی وجوہ کی بنا پر ہو سکتی ہے یا خوف و دہشت سے یا محبت سے۔ پہلی صورت میں یہ محض خارجی امر ہے اور مطیع اس کوشش میں رہتا ہے کہ کس طرح خوف کی اس حالت سے نجات حاصل کرے۔ اور اطاعت سے کبھی آزاد ہو۔ اور جب آزاد ہوتا ہے تو پھر شدید ردِ عمل کا بھی اظہار کرتا ہے۔ لیکن جو اطاعت محبت کی راہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں کسی خارجی دباؤ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ خود مطیع کے اندرون کا تقاضا ہوتا ہے۔ اور رگا ہے اس قدر شدید ہوتا ہے کہ خارجی قوتیں اس کے برخلاف بھی صف آرا ہوں تو وہ ان سے ٹکرانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ حُبِّ رسول ؐ میں بھی نکتہ پنہاں ہے کہ جس قدر محبت شدید ہوگی۔ اسی قدر احکام حق پر انسان کا زور ہوگا۔ اور یہ پابندی اس کے لئے گراں بھی نہیں ہوگی۔ عشق صادق ہو تو محبوب کی پسند و ناپسند سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ شیوۂ تسلیم و رضا عشق کی منزلِ اول ہے

عاشقِ صادق محبوب کی ہر ہر ادا پر جان دیتا ہے اور خود کو اس کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ہر چھوٹی بڑی بات میں محبوب کی تقلید کو اپنے اوپر فرض قرار دے لیتا ہے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ محبوب کا ہر ہر نقشِ قدم اس کے لئے واجب التعظیم ہے۔ یہی عشقِ رسولؐ ہے اور یہی اطاعتِ رسولؐ۔ الفت و اطاعت کے بارے میں سخاؔ کی زبان سے سُنیئے۔ ؎

اپنی اور عشقِ محمدؐ کی حقیقت کہہ دوں
بندہ ہوں اور بندہ تسلیم و رضا ہوتا ہے

سلطانِ مدینہ کی ہے طاعت فقط الفت
الفت ہے فقط طاعتِ سلطان مدینہ

سلطانِ مدینہ ہیں پئے شاہی عالم
عالم ہے پئے طاعتِ سلطان مدینہ

خدا کی بندگی یہ ہے کہ اول عشق احمدؐ ہو
خدا کا عشق کیا کہنا مگر یوں ہو تو بہتر ہے

عشق و اطاعت میں جیسے جیسے پیش قدمی ہوتی ہے، ویسے ہی ویسے انسان کے روحانی مراتب بلند ہوتے ہیں۔ اس کو عرفانِ نفس کے ساتھ عرفان حق بھی ہوتا ہے اور جب تک عشق میں ڈوب کر تجربہ نہ کیا جائے۔ اس وقت تک مقامِ رسالت کا صحیح اِدراک حاصل نہیں ہو سکتا۔ گویا عشق کی یہ راہیں مالک کو رسول شناسی اور حق شناسی کی طرف لے جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے ہستی کی جو تم دنیا میں آئے ہو
محمدؐ کو نہ پہچانا تو دنیا میں نہیں آئے

غرض یہ ہے نظر آجائے شانِ رحمت ربی
کرم وہ ہو کہ جو منکر ہوں ان کو بھی یقین آئے

فنائے عشق احمدؐ نے سخا کی آبرو رکھ لی
ہوا کیا حال ورنہ دیکھ لو منصور و سرمد کا

عین توحید ایک اقرار رسول اللہ ہے
ہے یقین اللہ پر عین الیقین مصطفٰے

کبھی عاشق کو نبیؐ کے نہیں سوتے دیکھا
جب اسے دیکھئے بیدار نظر آتا ہے

اس سے زیادہ مضحکہ خیز کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ انسان حُبِّ رسولؐ کے بھی دعوے کرے اور پھر اطاعت رسول سے بھی رُوگردانی کرے۔ رسولؐ کے رحمت اللعالمین ہونے کا مفہوم ہی یہ ہے کہ آپ کی تعلیمات نے عامۃ الناس اور ان کے ایک ایک فرد کی ایسی تربیت پر توجہ دی کہ وہ اس رنگ میں رنگ جائیں تو ان سے وہ انسانی معاشرہ وجود میں آئے جو اس دنیا کے لیئے رحمت بن جائے۔ دکھوں سے سسکتی اور کراہتی دنیا کے لیئے امن وراحت کا سبب بنے۔ اور ان دکھوں کا مداوا کرسکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ رسولؐ کے نام لیوا ان کی تعلیمات کے صحیح معنوں میں عامل بن جائیں۔ اور ان کا ہر امتی اسوۂ رسولؐ کا نمونہ بن کر..... عامۃالناس کے لئے پیغامِ رحمت بن جائے۔ سخا خود کو عاشقِ رسولؐ کہتے ہیں۔ اور ان کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ خود کو پیرو رسولؐ کہنے والے تعلیماتِ رسولؐ سے ایسی بیگانہ روی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ باہر سے اس صورتِ حال کو دیکھ رہے ہیں۔ اور اس لیئے اس کا تضاد ان کو بہت واضح طور پر نظر آرہا ہے۔ ادعا اور عمل کے اس تضاد کی ان کے نزدیک کوئی گنجائش نہیں۔ ان کو یہ بات اور بھی زیادہ گراں گذرتی ہے کہ یہ تمیز اس ذاتِ مقدس واعظم کے ساتھ ہو رہا ہے جو ان کو بہت محبوب ہے۔ اور جس سے وہ اپنی زندگی میں ترغیباتِ ذہنی حاصل کرتے رہے ہیں۔ اسی لئے وہ اس پر جھنجھلاتے ہیں، مسلمانوں کو ہمدردی کے

ساتھ جھنجھوڑتے ہیں، ان پر طنز کرتے ہیں۔ کہ تم یہ کیا غضب کر رہے ہو کہ زبان سے دعوے ایک ہے۔ اور عمل دوسرا۔ ؎

مسلماں ہے تو وہ ہے جس میں کچھ خُلقِ محمدؐ ہو
کسوٹی ہے اگر دنیا میں تو یہ ہے مسلماں کی
اس خُلقِ عملی پر ہے تمہیں دعوائے اسلام
پوچھو تو سنجا جیسے پرستار نبیؐ سے
یہ راہِ دیں ہے؟ ذرا مومنو تمھیں کہہ دو
چلے ادھر ہی جدھر کی ہوا کو دیکھ لیا
خوش ایسے مومنوں سے شارع اسلام کیا ہو
کہ جو چلتے اُدھر کو ہیں جدھر چلتی ہوا دیکھیں

بالخصوص اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ انھیں تعلیمات نے ایک دور میں کس طرح لوگوں کی کایا پلٹ دی تھی۔ اور کیسے کیسے لوگوں کو کفر و ضلالت کی تاریکی سے نکال کر حق پرستی کے نور سے ہمکنار کر دیا تھا۔ سنجا اس دَور کو بڑی تمنا سے اور اس کے لوگوں کو بڑے رشک سے یاد کرتے ہیں۔ ؎

میں کس حسرت سے اس دَورِ نبیؐ کو یاد کرتا ہوں
مسلماں جس میں تھے اہلِ وفا اہلِ وفا کیا کیا
اک مسلماں اب ہیں خُلقِ مصطفیٰ سے دُور دُور
اک مسلماں وہ تھے ہم خُو ہم قرینِ مصطفیٰ

وہ جا بجا اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اطاعتِ رسولؐ نہ صرف اس دنیا کے لئے رحمت و برکت کا سبب ہو سکتی ہے۔ بلکہ اخروی نجات کا ذریعہ بھی یہی ہے۔ اور متبعینِ رسولؐ کے لئے عقبیٰ کی فلاح کا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ اسی لئے وہ خود مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں۔ ؎

کرو تعمیل کچھ تو مومنو احکام احمد کی
شفاعت کے لئے تو چاہیئے تیار ہو جانا

اور چونکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہدایت ایک امر ربانی ہے۔ اور جب تک توفیق الٰہی نہ ہو، انسان کا مائل بہ خیر ہونا دشوار ہے۔ اس لئے وہ نبیؐ کے واسطے سے دعا کرتے ہیں۔ ؎

یا نبیؐ! کاش مسلماں ہی مسلماں ہو جائیں
کاش جاتی رہے یہ بو و ریا کی آمد

جس عشق و محبت کا ذکر یہاں تک ہوا اس کا محرک بالعموم حسن و جمال ہوتا ہے خواہ وہ خارجی ہو یا باطنی، یعنی جسمانی ہو یا اخلاقی و روحانی۔ اسی کے پیش نظر نعت گو شعراء نے رسولؐ کے حسنِ ظاہری کا بھی ذکر کیا ہے۔ کتابوں میں جہاں رسولؐ کے اخلاق و عادات اور چھوٹے سے چھوٹے عمل کی تفصیلات محفوظ ہیں، وہیں پر آپؐ کے جسمانی کوائف کا بھی تفصیلی بیان موجود ہے۔ لیکن عام حُسنِ انسانی اور حُسنِ رسول کے بیان میں بڑا فرق ہے۔ کہ آخر الذکر میں آپؐ کے مرتبہ اور عظمت و جلالت کا بھی پورا پورا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہاں بڑی احتیاط کی ضرورت اس لئے بھی ہوتی ہے۔ کہ ذرا سی لغزش مناقب گو کو ایسے مقام پر پہنچا سکتی ہے۔ جو ضلالت و گمراہی سے ملتا ہو۔ سخاؔ نے بھی حُسن ظاہر کا جا بجا بیان کیا ہے لیکن نہایت محتاط انداز میں ؎

عکس ہے کچھ رُوئے محبوبِ خُدا کے حُسن کا
نور سا چھایا ہوا جو کچھ ہے روئے حُور پر

تمھارا عشق ہے، کاکل سے دل نکلا نہ نکلے گا
یہی کاکل تو ہے اتنی دل آرا یا رسول اللہ!

اور جمال نبی کے بیان میں تشبیہ کے استعمال کا یہ انداز بھی داد طلب ہے۔ ؎

رُخِ احمدؐ نہیں دیکھا تو پھر کس طرح سمجھو گے
بتا بھی دوں اگر کیوں کر ہوئے شمس و قمر پیدا

غرض کہ سخاؔ ہر طرح سے رسولِ اکرمؐ کے ساتھ اپنے تعلق خاطر اور شیفتگی و وارفتگی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ خود کو "نعت گوئے ہند" کہہ کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ نہ صرف اس جہان میں بلکہ میدانِ حشر میں خدا کے حضور میں پیش ہونے کے وقت خود کو اس نام سے پکارے جانے کی آرزو کرتے ہیں۔ ؎

میری پرسش خدا کے سامنے کیا جانے کیونکر ہو!
"کہاں ہے نعت گوئے ہند" اگر پوں ہو تو بہتر ہے

وہ جو خود کو غزل خوانِ مدینہ اور ثنا خوانِ مدینہ وغیرہ کے القاب سے یاد کر کے اپنے اپنے قلبی تعلق کا اظہار کرتے ہیں جو ان کو مومنوں کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ ؎

ہے عزم چلیں ہم بھی زیارت کو سخاؔ کی
سنتے ہیں کہ ہے خاص ثنا خوانِ مدینہ

ذرا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے اور غور کیجئے کہ کیا کوئی مسلمان شاعر بھی اس سے زیادہ کچھ کہہ سکتا ہے۔ ؎

محمدؐ ہیں میرے دل میں، مدینہ ہے مرا سینہ
محمدؐ کی محبت نے کیا ہے دل میں گھر پیدا

سخاؔ بھی حاضرِ دربار احمدؐ ہو گیا آخر
کہاں جائے کوئی جب عاجز و ناچار ہو جائے

صاف آ رہی ہے اس سے صدائے درود و پاک
پہچانتے ہیں ہم یہ سخاؔ کا مزار ہے

آج ہم سخاؔ کی نعت پڑھتے ہیں تو اس شاعری کے سامنے سرِ فرط عقیدت سے جھک جاتا ہے۔ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جو ذہن ان خیالات

کا خالق ہے، وہ کون سے نور سے جگمگا رہا ہے۔ کونسی جوت ہے جو اس کے قلب و نظر کو منور کر رہی ہے۔ حالانکہ اس کو خود بھی یہ احساس ہے کہ :۔ ؎

کافر ہے مومنوں میں، مومن ہے کافروں میں
عشقِ نبیؐ میں یا رب کیا حال ہے سخاؔ کا

غور کیجئے تو یہ ذہن اس روایت کا پروردہ ہے جو ہندوستان میں صدیوں کے ہندو مسلم ارتباط و اختلاط سے وجود میں آئی۔ جس نے وسعت علم کے ساتھ قلب و نظر اور رواداری کے جذبات کو پروان چڑھایا۔ جس نے عصبیت بیجا کی دیواروں کو ڈھایا۔ اور آئینہ دل میں نظر آنے والی تصویروں کو صفحۂ قرطاس پر مرقم کرنے کی جرأت بخشی۔ اس نے ایسی ہستیوں کو وجود بخشا جو انسانیت کو ایک کل تسلیم کرتی ہیں۔ اور دنیا میں جہاں بھی خیر و فلاح اور حُسن و خوبی ہے۔ انھیں اس کے اعتراف میں تامل نہیں، نہ ان کے تسلیم کرنے سے اجتناب۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے سرزمین ہند پر ہندو مسلم اتحاد کی ٹھوس بنیادیں فراہم کیں۔ آج بھی ایسے ہی افراد اتحاد و یگانگت کی بنیادوں کو استوار کر سکتے ہیں۔

اس عاشقِ رسولؐ لچھمی نرائن سر یو ستوا سخاؔ نے ۱۹ / جنوری ۱۹۶۱ء کو آگرہ میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔

ہم سب ہندوستانیوں کو آزادی کی سینتیسویں ۳۷ سالگرہ

# مبارک ہو

وطن عزیز کی آزادی ایک مقدس امانت ہے جس کا

# تحفّظ

ہم سب ہندوستانیوں کا فرض ہے

ہمارے ملک اور ہماری قوم کی ترقی میں ہی ہماری ترقی اور بہبودی ہے۔ ہم سب خواہ کسی بھی مذہب کے ماننے والے ہوں آپس میں بھائی ہیں۔ کیوں کہ ہمارا وطن ایک ہے ہماری قوم ایک ہے

## اس لئے

قومی اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینا ہمارا مقصد ہونا چاہیئے۔
ملک کی سلامتی اور آزادی ہمیں اپنی
جان سے زیادہ عزیز ہونی چاہیئے

ہمارے عظیم رہنما مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو
کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہیئے

(ڈاکٹر محمد علی زیدی)

ڈاکٹر محمد علی زیدی (پہلی قسط)

# فراقؔ کی غزل گوئی۔ ایک جائزہ

اُردو غزل قلی قطب شاہ سے لے کے رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری تک بیسیوں نشیب و فراز سے گذری ہے۔ بہت سے نئے رجحانات پیدا ہوئے کچھ دیرپا ثابت ہوئے اور کچھ عارضی اس کی ہیئت و مواد و پرہیت سے تجربات کئے گئے جن میں کچھ کامیاب ثابت ہوئے اور کچھ تجربہ کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے۔ بیسیوں نئے میلانات نے جنم لیا۔ کچھ پروان چڑھے اور کچھ بے توجہی کا شکار ہو گئے۔ ردّ و قبول کا عمل جاری رہا ہے۔ ہر زندہ و توانا ادب کے لئے یہ ناگزیر بھی ہے۔ غرض یہ کہ صالح اور پائیدار روایات میں اضافہ ہوتا رہا اور فنی تصورات نکھرتے اور سنورتے رہے۔ ہر آنے والا دور اس کی دلکشی و جاذبیت میں اضافہ کرتا رہا۔ اسی کے ساتھ ساتھ غزل سماجی، سیاسی، ثقافتی اور اخلاقی اثرات بھی قبول کرتی رہی۔ متنوع انقلابات کے نقوش مرتسم ہوتے رہے۔ لیکن حسن و عشق سے اس نے اپنا دامن وابستہ رکھا۔ اس کا تخلیقی عمل جو بہت توانا اور صحت مند ہے۔ ہمیشہ جاری رہا۔ اس نے حیاتِ انسانی کی ہمیشہ ترجمانی کی ہے۔ اور اس کے نوع بہ نوع اور صد رنگ پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ کبھی اس کا لہجہ تند و درشت رہا ہے۔ اور ——— کبھی نرم و نازک، کبھی نشاطیہ اور کبھی متین و سنجیدہ اور کبھی شوخ و شنگ، کبھی سادہ اور کبھی رنگین، کبھی پیچیدہ و مبہم اور کبھی صاف و صریح،

کبھی استعاراتی و علاماتی اور کبھی سادہ و سلیس، کبھی محاوراتی اور کبھی سپاٹ، عظیم فنکاروں نے اس کے گیسو سنوارے ہیں۔ ہر صاحب طرز شاعر نے اردو غزل کی معنویت، جاذبیت اور کیفیت میں اضافہ کیا ہے۔ ولی دکنی نے اسے تصوف و سادگی سے متعارف کیا۔ میر نے اس میں سوز و گداز پیدا کیا، غالب نے تخیل کی رفعت اور فکر کی گہرائی سے روشناس کرایا۔ داغ دہلوی نے شگفتگی و لطف اندوزی سے ہمکنار کیا۔ فانی نے تمنائے موت کا جذبہ پیدا کیا۔ لیکن بقول ڈاکٹر محمد حسن فراق کی شاعری بنیادی، انتخابی (ELECTIVE) شاعری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"فراق صاحب کی شاعری بنیادی طور پر انتخابی شاعری ہے۔ انہوں نے تہذیبوں کو کبھی خانوں میں نہیں بانٹا، اسی طرح کبھی غزل کے رنگ کو بھی کبھی خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں شرماتے تھے۔ کہ وہ داغ اور نوح ناروی کے دواوین کو بھی مدتوں اپنے تکیے کے نیچے رکھے رہتے تھے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ لفظ کا عارفانہ استعمال اور پھر اس میں زندگی کی بصیرتوں اور تخصیت کی تہہ داریوں کو بھرنے کا اسلوب اور انداز سیکھنا ان کے نزدیک عبادت سے کم نہیں تھا۔ اور اس ہنر کو سیکھنے کے لئے انہوں نے سبھی اہل فن سے استفادہ کیا۔"

(عصری ادب اپریل تا جون ۸۳ ص ۸۰)

حسرت موہانی نے بھی اپنے پیشرو شاعروں سے استفادہ کیا اور اس کا اعتراف بھی کیا۔ حسرت ہی کیا تقریباً ہر شاعر نے اہل فن سے فیض حاصل کیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں اس اعتبار سے مماثلت ہے کہ دونوں نے سبھی فن کاروں سے استفادہ کیا اور کسی ایک کا مخصوص و منفرد رنگ اختیار نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ فراق کی غزل کو کسی مخصوص خانہ میں نہیں رکھا جا سکتا نہ کسی ایک اہل فن کے منفرد رنگ کی نشاندہی کی جا سکتی۔ بلکہ ان کی غزلیات مختلف دھاروں کا سنگم ہیں۔ جن میں ہر رنگ اپنی بہار دکھا رہا ہے اور ہر بو اپنی الگ مہک دے رہی ہے۔ فراق کی ذہانت ہمہ گیری اس کی متقاضی تھی کہ وہ کسی ایک کا اثر قبول نہ کریں بلکہ ہر ایک کے فن سے استفادہ کریں، انہوں نے اسلوب اور انداز کا ہنر عبادت سمجھ کے سیکھا اور اپنے ذہن و فکر کی اعلا قوتوں سے

اس کو استعمال کیا۔ شاعری کے لئے اور خصوصاً غزل گوئی کے لئے طبع موزوں ہونا ہی کافی نہیں ہے ۔ بلکہ گہرا مشاہدہ کامیاب تجربہ، فکر کی رسائی، بلند پروازیٔ تخیل اور الفاظ کا عارفانہ استعمال بھی لازمی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر شاعر موزونیٔ طبع کے بل بوتے پر میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور فراقؔ سے کم تر درجہ کا نہ ہوتا۔ فراقؔ کو اس کا احساس تھا چنانچہ اس کا اظہار اس شعر میں کیا ہے ؎

دوستو محض طبع موزوں سے
دولتِ شاعری نہیں ملتی

لیکن دولت شاعری محض ہم نوائی سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ شاعر اپنے دور کے کچھ مخصوص رجحانات و میلانات کا ترجمان ہوتا ہے۔ اور زمانہ ہر لحظہ تغیر پذیر ہے۔ زندگی کے اطوار بدلتے رہتے ہیں۔ انداز فکر بدلتے رہتے ہیں۔ اخلاقی و سماجی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ انجمنیں بدلتی رہتی ہیں۔ سوچنے اور سمجھنے کے ڈھنگ بدلتے رہتے ہیں۔ اجتماعی و انفرادی تاثرات بدلتے رہتے ہیں۔ نظر کے زاویے بدلتے رہتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ رنگِ شاعری بھی بدلتا رہتا ہے کیوں کہ شاعری زندگی سے وابستہ و پیوستہ ہے۔ ان حالات میں تقلیدی ہم نوائی کی شاعری بے وقت کی راگنی تو ہو سکتی ہے۔ لیکن شاعری نہیں ہو سکتی۔ فراقؔ گورکھپوری اس نکتہ سے واقف تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

فراقؔ ہم نوائے میرؔ و غالبؔ، اب نئے نغمے
وہ بزم زندگی بدلی وہ رنگِ شاعری بدلا

لیکن فراقؔ نے چاہے نئے نغمے الاپنے کی کوشش کی ہو اور اپنے کلام میں جھنکار اور رنگین موسیقیت پیدا کرنے کی سعی کی ہو۔ ان کے کلام میں اکثر موسیقیت و غنائیت کا فقدان نظر آتا ہے غالباً طبعی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس میں مکمل کامیابی حاصل نہ کر سکے ان کی غزلوں میں نغمگی کیفیت کم ہی ملتی ہے اور اس کیفیت کی کمی غزل کے تاثر پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بہر حال یہ بات آگئی تھی اس لئے ضمناً پیش کر دی۔ اس سے میرا مقصد تنقیص نہیں ہے۔

فراق اپنی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ انھیں اپنی ذہانت وذکاوت کی معرفت بھی حاصل تھی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ کچھ زیادہ ہی احساس تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو شاعری میں فراؔق کی بڑی قدآور شخصیت ہے اور ادب میں ان کا اعلا مقام ہے۔ فراؔق آسمانِ ادب کا ایک تابندہ ودپائندہ ستارہ ہے۔ لیکن فراؔق خود کو میؔر وغالب واقبال وداغ سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ اس کو اُن کا احساس برتری ہی کہا جاسکتا ہے اور ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ احساس برتری احساس کمتری کے ردّعمل کے طور پر پیدا ہوتا ہے یا اس کا نتیجہ ہے۔ میں اُن کے چند اشعار اس کے ثبوت میں پیش کرتا ہوں۔ جب وہ یہ فرماتے ہیں ؎

نمازِ عشق شاعری ہے اور امام فن فراق ہے
رکوع اور سجود زیر وبم ہیں صوتیات کے

یا

فراؔق احساس کی ایسی ریاضت
حقیقی شاعری بھی ہے بڑا کام

یا

سُن لو کہ فراق آج یہاں گرم نوا ہے
اس دور میں اقلیم سخن کا وہ شہنشاہ

تو اس حد تک تو درست ہے۔ وہ اپنے دور میں اقلیم سخن کے شہنشاہ تھے یا بادشاہ تھے امام فن تھے یا فن کار تھے یہ بحث طلب مسئلہ ہے بہرحال کچھ ناقدین زیادہ سے زیادہ اسے شاعرانہ تعلّی پر محمول کرسکتے ہیں۔ لیکن جب وہ یہ فرماتے ہیں ؎

غاؔلب ومیؔر ومصحفؔی ہم بھی فراؔق کم نہیں

یا

ختم ہے مجھ پر غزل گوئی دورِ آخر
دینے والے نے وہ اندازِ سخن مجھ کو دیا

تو اسے اُن کا احساس برتری ہی کہا جائے گا۔ اسی جذبہ کے تحت جوشؔ نے خود کو شاعرِ آخرالزماں کہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فراقؔ کی آواز اردو شاعری میں منفرد ہے اور الگ سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ تو آنے والا زمانہ ہی بتائے گا کہ فراقؔ پر غزل گوئی کا دورِ آخر ختم ہو گیا یا کوئی اور نرالے انداز سخن کا غزل گو پیدا ہو گا۔ لیکن بلا خوفِ تردید یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ فراقؔ نے ایسے آڑے وقت میں غزل کی آبرو رکھ لی کہ جب کچھ صاحبانِ فہم اس کی آبرو ریزی پر تلے ہوئے تھے۔ انہوں نے غزل کی دیوار کو اس وقت سنبھالا اور پائیدار بنایا کہ جب اس کی بنیادوں پر تیشے مارے جا رہے تھے۔ انہوں نے اس کا اس وقت ساتھ دیا جب اس کے پرستار بھی اس کا ساتھ چھوڑ کے مخالفوں کی صف میں شامل ہو رہے تھے۔ فراقؔ نے اپنے نئے لہجے، تیکھے پن اور حقیقت بیانی سے اردو غزل کو نئی توانائی عطا کی۔ اردو زبان ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اہل فن کے دواوین کا انہوں نے بغور مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے الفاظ کے عارفانہ استعمال پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ اور ہر صنفِ سخن سے زیادہ غزل میں اس کی اہمیت ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

میری گھٹی میں پڑی تھی ہو کے حل اردو زباں
جو بھی میں کہتا گیا حسنِ بیان بنتا گیا

زبان پر قدرت، خلاقانہ صلاحیت اور اردو سے انسیت نے اُن کی شاعری کو نرالی شان عطا کی۔ انہوں نے اپنی زندگی کو بے کیف و اداس بنا لیا لیکن کشتِ سخن وری کی ایسی آبیاری کی کہ چمن لہلہا اٹھا۔ اور اس میں وہ برگ و بار پیدا کئے کہ جو سدا بہار ہیں سرسبز و شاداب رہیں گے۔ فراقؔ نے اردو زبان میں الفاظ کا اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ لفظوں کا ایسا برمحل و بیساختہ استعمال بھی کیا ہے کہ ان کے اشعار حسنِ بیان کا نمونہ بن گئے ہیں۔ لفظ کے اضافہ کی مثال دیکھئے ؎

ہر ایک شام میں عالم ہے یوسفستان کا
پرکھنے والے تو کچھ ہو گئے پیرہن کے سلے

یوسفستان، اچپلاہٹیں، رسماہٹیں، ملگجاہٹیں، اداہٹیں، شفقستان وغیرہ بہت سے الفاظ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن میں یہاں حسنِ بیان کے چند نمونے پیش کرنا چاہتا ہوں ؎

آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے
اک شرح حیات ہو گئی ہے
پہلے وہ نگاہ اک کرن تھی
اب برق صفات ہو گئی ہے
ترغیب گناہ لحظہ لحظہ!
اب رات جوان ہو گئی ہے

یہ اداس اداس یہ بجھی بجھی کوئی زندگی ہے فراق کی
مگر آج کشت سخنوری ہے اسی کے دم سے چمن چمن

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں — خیر تم نے تو بے وفائی کی
اس دور میں زندگی بشر کی — بیمار کی رات ہو گئی ہے
جس کے لیے غزل کہوں — ایسا کوئی صنم نہیں

فراق کی غزل گوئی کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اکثر لفظوں کی تکرار سے خیالی پیکروں کے نقوش میں گہرائی پیدا کی ہے۔ جس سے رمزی اور ایمائی اثر میں اضافہ ہو گیا ہے۔ رمز و ایما غزل کی جان ہیں۔ رمزی و ایمائی کیفیت پیدا ہو جانے سے غزل کے اشعار شراب دو آتشہ بن جاتے ہیں۔ الفاظ کی تکرار سے موسیقیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور لب و لہجے کی خوشگواری بھی فراق نے اپنی اکثر غزلوں میں یہ حسن پیدا کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔ ؎

بارہا ہاں بارہا میں نے دم فکر سخن
چھو لیا ہے اس سکوں کو جو ہے جانِ اضطراب
عشق تھا ایک دن داستان داستان
آج کیوں ہے وہی بے زباں بے زباں
عشق بھی شادماں شادماں اِن دنوں
حسن بھی اِن دنوں مہرباں مہرباں

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
یاد سی آکے رہ گئیں دل کو کئی کہانیاں سے!

فراق الفاظ سے پیکر تراشی کرتے ہیں۔ یہ ایک فن ہے۔ وہی شاعر الفاظ سے پیکر تراشی کر سکتا ہے جسے الفاظ کی معرفت حاصل ہو۔ لفظوں کے صوتی و معنوی اثرات سے واقفیت رکھتا ہو۔ ان کے محل استعمال اور تلازمات سے کماحقہٗ واقف ہو، الفاظ سے نگینے جڑنا اور بات ہے اور پیکر تراشنا اور بات ہے۔ لیکن ان کے دیکھنے کے لئے بھی چشم بینا کی ضرورت ہے۔ ہر آنکھ پیکر تراشی کا حسن دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، فراق کا ہی شعر ہے ؎

لفظوں میں چہرے نظر آئیں گے چشم بینا کی ہے شرط
کئی زاویوں سے خلقت کو شعر مرے آئینہ دکھائیں

فراق کے اشعار کئی زاویوں سے آئینہ دکھاتے ہیں۔ آئینہ کا ہر زاویہ ایک الگ پیکر کا عکس دکھاتا ہے۔ لیکن چشم بینا ہونا شرط ہے۔ ان کا کلام ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں طرح طرح کے پیکر نظر آتے ہیں۔

اردو غزل کا مزاج حسن و عشق سے ـــ بہت ہم آہنگ ہے۔ عشق غزل کی گھٹی میں پڑا ہے خواہ وہ عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ہر غزل گو نے واردات و کیفیات عشق کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔ تصورات عشق بدلتے رہے ہیں اور نتیجتاً وارداتِ عشق بھی ولی سے لے کر فراق گورکھپوری تک بیسیوں نظریات عشق پیش کئے گئے ہیں۔ اردو شاعری میں خاص طور سے صنف غزل میں عشقیہ اشعار کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ میر کا عشق افلاطونی ہے جو جذبۂ پرستش کا دوسرا نام ہے۔ اس میں محض ایثار و قربانی اور عشق میں خود کو مٹا دینے کے علاوہ، تمنائے وصل کرنا بھی ہوسناکی سمجھا جاتا تھا۔ اس میں عاشق کا کام ظلم سہنا، جفائیں برداشت کرنا۔ آہ و نالے کرنا، مرغ بسمل کی طرح تڑپنا رونا اور اپنا جگر خون کرنا تھا، اپنی جان گنوا دینا کمالِ عشق تھا۔ اس کے مقابلہ میں داغ کا عشق جنس زدہ ہے جس میں ہوسناکی و لذت کوشی کا شدید رجحان ہے۔ اس میں معشوق ہی ہرجائی نہیں ہے، بلکہ عاشق بھی

۔ تو نہیں اور سہی اور نہیں سہی تک کے اصول پر عمل کرتا ہے۔ اس قسم کے عشق میں ہجر و فراق کا عذاب
نالہ و بیقراری، ایثار و قربانی، وفاداری و جاں سپاری، جگر کاوی و سینہ کوبی کا سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اس میں وصل مدام کی کیفیت رہتی ہے۔ عیش کوشی و لذت جوئی مطمح نظر
ہوتا ہے۔ میر کے مثالی عشق سے داغ کے بازاری عشق تک کے سلسلہ کی بیچ کی کتنی کڑیاں ہیں لیکن
یہ تمام نظریات عام فطرتِ انسانی سے کم میل کھاتے ہیں۔ بلکہ بعض تو بالکل غیر فطری معلوم ہوتے
ہیں۔ فراق کی ذاتی زندگی خواہ جنسی بے راہ روی کی شکار رہی ہو۔ لیکن اپنی غزلوں میں انہوں
نے جو تصور عشق پیش کیا ہے وہ نہ محض جذبۂ پرستش ہے، نہ لذت کوشی، و ہوسناکی ہے، اُن کا عشق
نہ جنس زدہ ہے نہ عشق پاکباز ہے، نہ تاک جھانک کا عشق ہے اور نہ مثالی و خیالی عشق ہے۔ ان
کا عشق جسمانی سطح سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن جنسی لذت اندوزی پر اور عیش کوشی پر ہی ختم
نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ان پر پیچ وادیوں سے گذرتا ہوا جنسی آمیزش کی منزلیں طے کرتا ہوا پاکیزہ جذبات
سے ہمکنار ہو کے ایسے اعلا و ارفع مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ کہ جہاں وہ زندگی کو متاثر کر سکے۔ نشاط
زیست کا جذبہ پیدا کر سکے۔ آلام حیات سے ہم آہنگ ہو سکے۔ اور نئی امنگیں اور نئی آرزوئیں پیدا
کر سکے۔ اس طویل سفر میں وہ غم آشنا بھی ہو جاتا ہے۔ اس غم سے جو حاصلِ حیات ہے۔ جس سے
زندگی میں بہار ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

اسی سوز و ساز کی منتظر تھی بہار گلشن آرزو!
ترے رنگ رنگ نشاط سے مرے غم کی آنے لگی ہے بو

وہ عشق میں اس لئے کھوتے ہیں کہ خود کو پا جائیں اس لئے نہیں کہ خود کو بھی گم کر دیں۔ انھیں
محبوب کی تلاش اس لئے ہے کہ اس کے وجود میں وہ خود کو گم کر چکے ہیں۔ اور اب اپنے وجود کو پانا چاہتے
ہیں۔ اس کی تلاش گویا اپنی تلاش ہے ؎

تجھے پا کے خود کو بھی پاؤں گا کہ تجھی میں کھویا ہوا ہوں میں!
یہ تری تلاش ہے اس لئے کہ مجھے ہے اپنی ہی جستجو!

فراق حسن و عشق دونوں کو ایک سطح پر مساوی مانتے ہیں۔ نہ وہ حسن کو سراپا ناز مانتے ہیں نہ عشق

کو سراپا نیاز ۔ اگر کبھی عشق نیاز مندی دکھاتا ہے تو کبھی حسن ناز برداری و پذیرائی کا پیکر ہوتا ہے ۔ اور عشق خود سر ہوتا ہے ۔ اُن کے عشق میں خودسری و نیاز مندی دونوں ہیں۔ اسی طرح حسن میں بھی پذیرائی و غرور دونوں ہیں۔ غرض حسن و عشق دونوں مساوی ہیں۔ نہ حسن کو عشق پر سبقت حاصل ہے نہ عشق کو حسن پر فوقیت ؎

سر بھی جھکا چکا ہے عشق حسن کے پائے ناز پر!
ناز اٹھا چکا ہے حسن عشق کی خودسری کے بھی!

اُن کا تصورِ حسن بھی خیالی اور مثالی نہیں ہے ۔ وہ شدید احساسِ جمال رکھتے ہیں اور اسی رنگ عالم و بو میں حسن کے پیکر تلاش کر لیتے ہیں۔ ایسے حسین پیکر جو قاری یا سامع کے لئے پُرکشش اور جاذبِ نظر ہوتے ہیں۔ اس پیکر تراشی کے لئے وہ موزوں الفاظ اور حسین و پُراثر مگر اچھوتی تشبیہات کا سہارا لیتے ہیں ۔ الفاظ کا انتخاب بھی عارفانہ شان کا ہوتا ہے ۔ ایسے الفاظ جو ترسیل کا پورا حق ادا کرتے ہیں ۔ فراق کو الفاظ پر قدرت حاصل ہے اسی لئے وہ اِن کے صوتی و معنوی اثرات سے بھرپور کام لے کے کامیاب پیکر تراشی کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

قامت ہے کہ کہسار پہ چڑھتا ہوا دن ہے ۔
جوبن ہے کہ ہے چشمہ خورشید میں طوفاں!

حُسن اِک بے بیندھا ہوا موتی یا اک بے سونگھا ہوا پھول

ہوش فرشتوں کے بھی اڑا دیں تیری یہ دوشیزہ ادائیں

وہ ہر چیز میں حُسن تلاش کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ تاریک رات بھی اُن کے احساسِ جمال کو متاثر کرتی ہے ؎

رات چلی ہے جوگن ہو کر بال سنوارے لٹ جھٹکائے
چھپے فراق گگن کے تارے دیپ بجھے ہم بھی سو جائیں!

فراق گورکھپوری کی شاعری میں خصوصاً غزلوں میں رات ایک خاص اہمیت رکھتی ہے

اور انہوں نے جگہ جگہ مختلف انداز میں اس کا ذکر کیا ہے۔ کبھی وہ سکوتِ نیم شب میں نغمۂ چنگ و رباب سنتے ہیں، کبھی وہ سنسان راتوں میں محبوب کی یادوں کی چادر تان کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور کبھی وہ رات کو رنگین بنا لیتے ہیں ؎

جیسے کھلا ہوا گلاب چاند کے پاس لہلہائے

رات وہ دستِ ناز میں جامِ شرابِ ارغواں

شعرائے اردو نے شبِ ہجر کو اکثر موضوعِ سخن بنایا ہے۔ عاشقِ صادق یہ رات کس طرح تڑپ تڑپ کے گذارتا ہے۔ اور اس پر کیا کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ ان کا مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ بعض شعرا نے وصل کی راتوں کا بھی مزے لے لے کے بیان کیا ہے وصل و ہجر کے علاوہ اُردو شاعری میں راتوں کی کوئی اور اہمیت نہیں ہے۔ چند مستثنیات ضرور ہیں۔ لیکن اُن کے ہاں اور ابھی رات کی اہمیت ہے جو شاعرِ فطرت ہی سمجھ سکتا ہے۔

فراقؔ شاعرِ فطرت تھے ؎ ہوش میں کیسے رہ سکتا ہوں آخر شاعرِ فطرت ہوں۔

چنانچہ وہ رات میں ہی فکرِ سخن بھی کرتے تھے اور شغلِ مے و جام بھی۔ رات ہی میں ان پر اشعار کا نزول ہوتا تھا۔ اور رات ہی میں رازہائے فطرت منکشف ہوتے تھے۔ وہ رندِ شب زندہ دار تھے۔ شب کے سکون میں اُن کا دل و دماغ مختلف کیفیات و جذبات کی آماجگاہ بن جاتا تھا وہ کبھی کبھی رات کے سناٹے میں اس سکون کو چھو لیتے تھے جو جانِ اضطراب ہے۔ فسونِ نیم شب مکمل خاموشی کے عالم میں اُن کی آنکھوں میں سحر ساری جگاتا تھا۔ اور ان کے کانوں میں چنگ و رباب کے نغموں کا رس گھولتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں رات کی خاص اہمیت ہے اور اپنے تجربات کی مختلف کیفیات کو انہوں نے اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔ رات کیا کیفیات مرتب کر سکتی ہے اور رات کو اس کے متعلقات کے ساتھ انہوں نے کتنے مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ اور اس سے کیا اثرات پیدا کئے ہیں ان کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکے گا ؎

اس دور میں زندگی بشر کی

بیمار کی رات ہو گئی ہے

آنکھیں بھر آتی ہیں اکثر پچھلی شب کو اے فراق
وہ خمارِ چشمِ ساقی وہ بھرے ساغر کہاں!

غم کا فسانہ سننے والو آخرِ شب آرام کرو
کل یہ کہانی پھر چھیڑیں گے ہم بھی ذرا اب سولیں ہیں

ترغیبِ گناہ لحظہ لحظہ
اب رات جوان ہو گئی ہے

یہ فسونِ نیم شب یہ خواب ساماں خامشی
سامری فن آنکھ کے جادو جگانے کی کہو!

بزمِ فطرت سربسر ہوتی ہے اک بزمِ سماع
وہ سکوتِ نیم شب کا نغمۂ چنگ و رباب

رات بھی نیند بھی کہانی بھی
ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی!

رات چلی ہے جوگن ہو کر بال سنوارے لٹ چھٹکائے
چھپے فراق گگن پر تارے، دیپ بجھے ہم بھی سو جائیں

فراق کی ایک غزل کی تو ردیف "ہیں کی راتیں" ہے۔
اس غزل کا مطلع ہے ؎

وہ چپ چاپ آنسو بہانے کی راتیں
وہ اک شخص کے یاد آنے کی راتیں

اُن کی ایک نظم کا عنوان بھی آدھی رات ہے۔

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر سید مدبر علی زیدی

# نئی نظم کا فکری و فنی تجزیہ

نئی نظم کے فکری و فنی مزاج کی تشکیل میں چار قسم کے شعراء نے حصہ لیا۔ اوّل وہ جن کے یہاں روایت اور کلاسیکیت کا احترام پایا جاتا ہے اور جو قدیم اسالیب نظم کا رچا ہوا مذاق رکھتے ہیں۔ ان شعراء میں ساغر نظامی، جگن ناتھ آزاد، جمیل مظہری، سکندر علی وجد وغیرہ کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ دوم وہ جو ترقی پسند دور سے متعلق رہے ہیں مثلاً سردار جعفری کیفی اعظمی، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی وغیرہ، سوم وہ جو ترقی پسندی کی راہ سے بہت جدید کی طرف آئے ہیں۔ مثلاً خلیل الرحمن اعظمی، شاذ تمکنت، مخمور سعیدی، ساجدہ زیدی وغیرہ چہارم وہ جدید تر شعراء جو مختلف مزاج اور مختلف اسالیب رکھتے ہوئے کسی خاص نظریہ یا مسلک سے منسلک نہیں ہیں، مثلاً شہر یار، کمار پاشی، محمد علوی، عادل منصوری وغیرہ۔

نئی نظم کے فکری و فنی مزاج کا تجزیہ دو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ فکر و فن ایک دوسرے سے پیوستہ رہتے ہیں اور ان میں ایک نامیاتی رشتہ پایا جاتا ہے اس لئے اس مقالہ میں جن شعراء پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان کے فکر و فن پر ایک ساتھ ہی نظر ڈالی گئی ہے۔ شعراء کی فکر کا تجزیہ ان کے عہد کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل کے پس منظر میں کرنا ہی مناسب ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے عہد اور اپنے ماحول کے پروردہ

ہوتے ہیں۔ اور اسی سے سب سے زیادہ متاثر بھی ہوتے ہیں۔

نئی نظم کا آغاز ایسے ماحول میں ہوا جب ملک میں انتشار اور اقدار کی شکست و ریخت اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ آزادی کے ساتھ ہی ملک تقسیم ہو گیا۔ فسادات، تباہی اور بربادی نے اقدار کو ایسا پائمال کیا کہ ملک کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ انسان وحشی درندہ بن گیا۔ نئے مسائل سامنے آئے۔ سماجی اور اخلاقی اقدار میں بھی زبردست تبدیلیاں آئیں، زندگی نئی پیچیدگیوں اور الجھنوں سے آشنا ہوئی۔ جد و جہد حیات اور کشمکش زندگی نے شدت اختیار کی۔ متضاد اور متصادم فلسفوں اور نظریات نے ذہن کو اور بھی منتشر کر دیا۔ سامراجیت، سرمایہ داری اور جاگیرداری نے نئے مظالم اور نئی سازش کو جنم دیا۔ نفسیات، وجودیت، اشتراکیت اور جمہوریت نے مختلف سمتوں کی طرف ذہن کو کھینچنا شروع کیا۔ بڑھتی ہوئی آبادی، ایٹمی جنگ کا خطر بیروزگاری، مفلسی، شہروں کی گھٹن، تنہائی، اداسی، بے چہرگی، ٹوٹتے رشتے، چور بازاری، مہنگائی، رشوت خوری اور لوٹ کھسوٹ نے انسانوں پر ایسا یلغار کیا کہ ان کے فکری توازن کو اس سے شدید نقصان پہونچا۔ مسائل کی اس پیچیدگی کی وجہ سے ہی نئی نظم میں استعارہ سازی، علامت نگاری، پیکر تراشی اور تجریدیت، و ابہام کا رجحان بڑھتا گیا۔

نئی نظم کے بیشتر شعراء روایتی بیانیہ انداز سے شعوری اور غیر شعوری طور پر انحراف کرنے لگے اور ترقی پسند شعراء کی نعرہ زنی، خطابت اور نظریاتی وابستگی کے خلاف ردعمل میں بھی شدت اختیار کی گئی۔ نئی نظم میں تجریدیت، قنوطیت، تنہائی اور اداسی کا بڑھتا ہوا رجحان بھی ماحول اور عہد کے اثرات کا نتیجہ ہے انحراف، بغاوت اور قدروں سے نفرت کا رجحان ایک حد تک عصری تقاضوں کے مطابق تھا۔ لیکن اس میں جہاں انتہا پسندی اور شدت اختیار کی گئی وہاں اس نے نئی نظم کے معیار کو پست کیا اور اس کی مقبولیت کو بھی نقصان پہنچایا سب سے زیادہ نقصان اِن شعراء نے پہونچایا، جنھوں نے الفاظ تراکیب اور زبان کی شکست و ریخت میں انتہا پسندی کا ثبوت دیا۔ اِن شعراء نے ترسیل اور ابلاغ کا گلا گھونٹ دیا، اور سماجی اور عصری تقاضوں کی مکمل نفی کا راستہ اختیار کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی نظمیں

معمہ بن کر رہ گئیں۔

نئی نظم کو تکنیک اور ہیئت کے اعتبار سے مختلف تجربات سے گزرنا پڑا ہے اور اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے نظم معریٰ، (BLANK VERSE) آزاد نظم ر FREE VERSE) اور نثری نظم (PROSE POEM) نئی نظم کی مختلف شکلیں ہیں۔ بعض نظموں میں ردیف اور قافیہ کی پابندی کے ساتھ ساتھ آزاد اور نثری نظموں کے آہنگ کو ایک ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن عموماً ردیف اور قافیہ کی پابندی کا رجحان بہت کم پایا جاتا ہے۔ بحر کی یکسانیت کو بدلنے کے لئے ایک ہی نظم میں مختلف بحریں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ یا نظم کی بحر تو ایک ہی ہے مگر ارکین کی تعداد کو کم یا زیادہ کر دیا گیا ہے۔ ہیئت کے ان مختلف تجربات کے تحت ہائی کو تر ائلے اور سائنیٹ وغیرہ کے انداز میں بھی نظمیں لکھی گئیں ہیں۔ اس کے علاوہ طویل نظمیں اور طویل مختصر نظمیں بھی لکھی گئیں ہیں۔

ہیئت اور آہنگ کے یہ مختلف تجربات بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں رکھتے جب تک کہ شعری، عصری اور جمالیاتی تقاضوں کو پورا نہ کرتے ہوں، ان کی افادیت اور اہمیت اسی پر منحصر ہے کہ یہ توضیحی ذکر کو کس حد تک تخیلی فکر اور شعری تجربہ میں ڈھالنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور ترسیل اور ابلاغ کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کرتے ہیں اسی لئے ان کے لئے کسی ایک عروضی یا فنی اصول یا چند اصولوں کا تعین ممکن نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق انفرادی ذوق، انفرادی مزاج اور انفرادی فنی شعور سے ہے لیکن نئی نظم کے بعض شعراء ہیئت تکنیک اسلوب ہی نئے تجربات ہی کو شاعری کی اساس سمجھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے اور سمجھنا بھی نہیں چاہتے کہ اعلا شاعری محض تکنیک ہیئت اور اسلوب کی رہین منت نہیں ہوتی بلکہ اعلا خیالات، اعلا جذبات اور اعلا فکر کے بغیر شاعری وجود میں نہیں آتی۔

نئی نظم کے بیشتر شعراء نا وابستگی پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاعر کے لئے نظریہ کی نہیں نظر کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر کے لئے گہرا مشاہدہ اور ہر ایک چیز کو باریکی سے دیکھنے کی قوت ضروری ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ کیونکہ زندگی کے مختلف مظاہر کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے اس قدر گوناں گوں ہیں اور ان میں اس قدر تنوع

پایا جاتا ہے کہ اگر شاعر کے پاس کوئی مثبت نظریہ نہ ہو تو وہ اپنی شاعری میں کوئی بامقصد اور بامعنی پیغام پیش نہیں کر سکے گا۔ اور لاسمتی کا شکار ہو جائے گا۔ یہاں لاتعداد راستے مختلف سمتوں میں جاتے ہیں۔ منزل تک کے لئے ایک بہتر راستے کا انتخاب تو کرنا ہی پڑے گا ورنہ ساری عمر بھٹکتے ہی گزر جائے گی۔ زندگی کا مقصد ہے انسان کی اخلاقی، روحانی، مادی اور معاشرتی ترقی بہتر سے بہتر کی تلاش ہی زندگی کا مقصد ہے۔ اور یہی شاعری کا مقصد بھی ہے۔ جو نظریہ اس مقصد میں معاون ہو وہی اس عہد کا مثبت اور صحت مند نظریہ ہے۔ سردار جعفری لکھتے ہیں۔ کسی بھی عہد اور سماج میں نظریات کی آویزش دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک نظریہ منفی قدروں اور تخریبی اصولوں کی پیروی کرتا نظر آئے گا اور دوسرا مثبت اقدار اور تعمیری اصولوں کا پابند ہوگا۔ ایک کا مقصد ترقی پسندی ہوگا۔ تو دوسرے کا رجعت پرستی۔ تعمیر و تخریب، اثبات و نفی کی کشمکش ہر دور کے ادب میں مل جائے گی۔ لہٰذا منطقی طور پر یہ بالکل درست ہے کہ ایک شخص جو مثبت، تعمیری اور ترقی پسند رجحانات کا حامی نہیں ہے وہ لازمی طور پر منفی، تخریبی اور رجعتی نظریات کا حامل ہوگا۔ لہٰذا شاعری میں ناوابستگی پر زور دینا خود کو اور دوسروں کو فریب دینا ہے۔ تعمیر اور تخریب، روشنی و تاریکی کی یہ جنگ ہر جگہ اور ہر محاذ پر لڑی جاری ہے اور یہی جنگ ادب اور شاعری میں جاری ہے۔ کیونکہ زندگی اور سماج کے دیگر شعبوں کی طرح ادب اور شاعری بھی جدلیاتی قوانین کی پابند ہے۔"

مندرجہ بالا بیان ترقی پسند نقادوں کے چند خیالات پر مبنی ہے اور ان دلائل سے اتفاق کرنا ہی پڑتا ہے۔ نئی نظم میں تخریبی، منفی اور رجعتی رجحانات کی شدت ایک عام بات ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان شعراء کے پاس ایک صحت مند اور مثبت نظریہ نہیں ہے نئی نظم کے بیشتر شعراء جن منفی نظریات سے متاثر رہے ہیں، ان کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ نئی نظم جدیدیت کی فلسفیانہ اساس پر مبنی ہے۔ جدیدیت پر وجودیت انفرادیت اور نفسیات کا گہرا اثر ہے جدیدیت پر کرکے گار، ہائیڈگر، سارترے، فرائد

ایڈلر، یونگ وغیرہ فلسفیوں کے خیالات نے اثر ڈالا ہے۔ نیز کافکا، کامو، ایلیٹ، ایذرا پاؤنڈ اور لارنس کی ادبی وشعری تخلیقات اور فرانس کے زوال پسندوں ملارمے، پال ورلین، والیری، مارسل پروسٹ۔ بودلیئر وغیرہ کی تخلیقات اور خیالات تکنیک اور اسلوب سے بھی نئی نظم کے بیشتر شعراء بہت زیادہ متاثر رہے ہیں۔ نئی نظم کے فکری وفنی مزاج کی تشکیل میں آواں گارد (AVANT GARDE) کی تھیوری سے بھی اثرات قبول کئے گئے ہیں۔ اس تھیوری کے تحت مغرب میں چار تحریکیں وجود میں آئیں تھیں۔

(۱) سرریلزم SUREEALISM (۲) فیوچرازم FUTURISM

(۳) کیوب ازم CUBISM (۴) دادا ازم DADAISM.

دادا ازم کے نظام فکر میں ہر عقیدے اور اصول کی نفی کی گئی تھی۔ اس نے تمام مظاہر اور ہر حقیقت کی طرف سے ایک لاتعلقی کے رجحان کو فروغ دیا۔ فن کی تخلیق میں انتہائی انفرادیت اور خالص فن کے نظریہ کو دادا ازم نے تقویت پہنچائی۔ اس نے لاشعوری فعلیت کو شعوری فعلیت پر مقدم بتایا۔ اور تعقل سے گریز کرنے پر زور دیا۔ سرریلزم کے تحت ما فوق الحقیقت اشیاء اور لاشعوری خیالات کو پکڑنے کا رجحان بڑھا۔ ذاتی علامتوں کا استعمال، ابہام اور رمزیت میں شدت الفاظ اور زبان کی انتہائی شکست وریخت انھیں تحریکوں کے اثرات ہیں۔ وجودیت کے پرستاروں نے یہ نعرہ دیا، "داخلیت ہی حق ہے"۔ اس طرح خارجیت (OBJECTIVITY) کو اٹھا کر طاق پر رکھ دیا گیا۔ وجودیت سراسر ایک غیر سائنسی اور غیر عقلی نظریہ ہے۔

۱۹۴۰ء میں حلقۂ ارباب ذوق کا قیام عمل میں آیا۔ اسے ترقی پسند تحریک کے رد عمل کے طور پر شروع کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک نے جہاں مواد اور موضوع کو اسلوب اور ہیئت پر ترجیح دی وہاں حلقۂ ارباب ذوق میں شامل شاعروں نے اسلوب اور ہیئت ہی کو سب کچھ قرار دیا۔ یہاں تک کہ ہیئت ہی کو فن کہا گیا۔ ترقی پسندوں نے سماجی ترقی، مادی خوشحالی، طبقاتی کشمکش پر زور دیا تو حلقۂ ارباب ذوق میں شامل شاعروں نے رجعت پرستی

جنسیت، فراریت اور ابہام گوئی کے رجحانات کو پھیلایا۔

ان رجحانات کو سب سے پہلے میراجی اور ن م۔ راشد نے پھیلایا۔ میراجی کی تخلیق اس نظم میں۔ ایسی بہت سی نظمیں ہیں۔ جن میں فرائڈ کے جنسی نظریات اور لارنس کی جنس زدگی کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ میراجی نے ایک بنگالی لڑکی میرا سین سے عشق کیا تھا جس میں وہ ناکام رہے اسی عشق کی بدولت وہ ثناء اللہ سے بدل کر میراجی ہوگئے مشرقی ہندوستان کی اس عشرت انگیز عورت نے انھیں رادھا کرشن کا بھگت بنا دیا اور کرشن کی راس لیلا ان کی نگاہوں میں رقصاں رہنے لگی۔ میراجی کی نظموں میں بھی ابہام ہے۔ لیکن یہ ابلاغ کا ابہام نہیں ہے تاثر کا ابہام ہے۔ موضوع چاہے جائز جنسی تعلقات سے متعلق ہو یا ناجائز جنسی تعلقات سے میراجی کی نظموں میں تاثر ضرور ہے۔ ان کی ایک نظم "حرامی" کا یہ اقتباس ناجائز جنسی تعلقات کو پیش کرتا ہے۔ جس میں گود بھری کا تصور زرخیزی کو بتاتا ہے جو بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ سماجی اعتبار سے حرام کی اولاد نفرت انگیز ہوسکتی ہے لیکن فطری اور قدرتی طور پر اس کا تعلق محض افزائشِ نسل سے ہے۔ یہی زندگی کا بنیادی اور اہم عمل ہے۔

- قدرت کے پرانے بھیدوں میں جو بھید چھپائے چھپ نہ سکے۔
اس بھید کی تو رکھوالی ہے۔
اپنے جیون کے سہارے کو اس جگ میں اپنا کر نہ سکی۔
یہ کم ہے کوئی دن آئے گا وہ نقش بنانے والی ہے۔

| | |
|---|---|
| جو پہلے پھول ہے کیاری کا | پھر مالی ہے پھلواری کا |
| غیروں کے بنائے بن نہ سکے | اپنوں کے مٹائے مٹ نہ سکے |
| جو بھید چھپائے چھپ نہ سکے | اس بھید کی تو رکھوالی ہے |
| یہ سکھ ہے دکھ کا گیت نہیں | کوئی ہار نہیں کوئی جیت نہیں |
| جب گود بھری تو مانگ بھری | جیون کی کھیتی ہو گی ہری |

(حرامی ۔ میراجی)

اس نظم میں سماجی ردعمل کو قطعی اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ نظم کی نمایاں خصوصیت ہندی کے نرم اور سبک الفاظ ہیں۔ مثلاً بھید، جیون، جگ، کیاری، پھلواری، سکھ، دکھ، گیت وغیرہ زبان سلیس، رواں اور عوام کے روزمرہ کے نزدیک ہے۔

"جنگل میں ویران مندر" میراجی کی مشہور نظم ہے جس میں جنگل کی فضا اور تنہائی میں گم ہوجانے کا رجحان بڑا نمایاں ہے۔ نظم نہایت سلیس ہے اور کوئی علامت یا استعارہ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ صرف "چاند کی پریاں" چاند کو مجسم کرنے کا اشارہ استعمال کیا گیا ہے۔

"کچھ چاند کی پریاں مندر میں کل رات بلائی جائیں گی
ساری دیواریں پھولوں اور کلیوں سے سجائی جائیں گی
کچھ کومل نرم ہرے پتوں کے فرش بچھائے جائیں گے
پھر دھیرے دھیرے اڑتی بہتی چاند کی پریاں آئیں گی
اور مندر کی سب دیواریں جنگل کے گیت سنائیں گی۔"

(جنگل میں ویران مندر - میراجی)

یہ ان نظموں میں سے ایک نظم ہے جن میں ہندو دیومالا اور ہندی زبان کے اثرات زیادہ ہیں دھرتی پوجا کا یہ رجحان اور سرزمین ہندوستان سے جذباتی وابستگی میراجی کا ایک منفرد کارنامہ ہے۔ دوسری طرف میراجی کے یہاں جدیدیت کے وہ عناصر بھی ملتے ہیں جس نے نئی نظم کو ابہام، رمزیت، ذاتی علامتوں، تنہائی، لاسمتی، بے چہرگی جیسے رجحانات عطا کئے ہیں۔ میراجی کی نظموں میں بھی یہ رجحانات مل جاتے ہیں لیکن ان کے استعارے مبہم ہوتے ہیں ہوئے بھی کسی حد تک معنویت کے حامل ہیں اور یہ معنویت ایک نئی حیثیت کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ اس نئی حیثیت نے ہی نئی نظم کے بیشتر شعراء کو متاثر کیا ہے۔ میراجی کی ایک ایسی ہی نظم "انجام" کا یہ اقتباس دیکھئے:۔

"زمانہ ایک بے پایاں سمندر ہے۔
اور اس میں کس قدر بے کار آنسو ہیں۔

اور اس میں ساحل افسردہ کی کچھ سسکیاں ہیں
میں سب کچھ دیکھتا ہوں اور پھر ہنستا ہوں، روتا ہوں۔
یہ دو لہریں بڑھی جاتی ہیں، اس کھوئے ہوئے لمحے سے
ٹکراتی ہیں پھر لوٹ جاتی ہیں
کہ جیسے ایک ہچکی آئے اور پھر سانس رُک جائے۔
میں کیوں کھویا ہوا ہوں آج کی گہری اداسی میں ؟
مجھے یہ گریہ سنائی دے رہا ہے۔
یہی جی چاہتا ہے پاس جا کر میں اسے سُن لوں
مگر ڈر ہے جب اس کے پاس پہنچا میں تو گریہ ختم ہوگا ایک
"گہری خاموشی ہوگی" (انجام - میراجی)

اس نظم میں دو لہریں، کھوئے ہوئے لمحے، گریہ کے استعارے ایک حد تک مبہم ضرور ہیں لیکن نظم کی فضا سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اور مجموعی تاثر کی تشکیل میں معاون ہیں۔ نظم کی صوتیات، اس کی بحر اور وزن اور آہنگ میں جدت، انفرادیت اور رمزیت پائی جاتی ہے

میراجی سے کہیں زیادہ ن۔م۔ راشد کی نظموں نے نئی نظم کے فکری و فنی مزاج کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ راشد کی نظموں میں ذاتی علامتوں اور استعاروں کی بھرمار ہے۔ راشد کی ژولیدہ ذہنیت اور زوال پسندی نے ان کی نظموں کو ابہام اور بہت حد تک اہمال کا نمونہ بنا دیا۔ راشد کے یہاں علیحدگی (ALIENATION) کا رجحان بڑا قوی ہے، وہ اپنے معاشرے میں ایک اجنبی (OUTSIDER) کی طرح رہا ہے، راشد ہی نے نئی نسل کے شعراء کو بغاوت کا درس دیا۔ اس بغاوت کا رجحان منفی اور تخریبی خیالات کی طرف ہے۔ راشد کے تین شعری مجموعے "ماورا" "ایران میں اجنبی" اور "لا = انسان" منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں لہجہ کی درشتگی، سماجی رشتوں کی نفی، مریضانہ جنسیت، شکست خوردگی، انتشار اور پراگندگی کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ ان کی متعدد نظمیں مثلاً "سرگوشیاں" "دیوار" "تسلسل کے صحرا میں"

وہی کشف ذات کی آرزو، "تعارف"، زندگی سے ڈرتے ہو"، "گداگر"، "آنکھیں کالے غم کی"، وغیرہ میں ذاتی علامتیں اور استعارے کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قاری کسی مکمل تجربہ یا تاثر کو قبول نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر راشد کی نظم "سرگوشیاں" کا یہ اقتباس دیکھئے۔

"اس رشک بے بسی سے میرے دوست فائدہ؟
ہے کچھ تو اپنا زور گریباں کے چاک پر
حاصل نہیں ہے ہم کو اگر وہ شراب ناب
تو بام و در کی شہر میں کوئی کمی نہیں۔

دو پل۔ ایک پیکر یخ بستہ۔ ایک رات۔" (سرگوشیاں۔ ن۔م۔ راشد)

نظم بے ربط الفاظ کا ڈھیر ہے۔ ایک مصرع کا دوسرے مصرع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نظم کا کوئی مجموعی تاثر بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ شاعر قاری کو خالی الذہن رکھنا چاہتا ہے۔ البتہ شکست خوردگی کا ہلکا سا احساس اس نظم سے ضرور ہوتا ہے۔ اس طرح قاری کسی انقلابی تبدیلی کا تصور نہیں کر سکتا۔ ذہن کو کند کرنے کا یہ ایک خاص طریقہ ہے کہ عوام سماجی تبدیلی کی طرف دھیان نہ دے سکیں۔ انقلاب دشمن اور سرمایہ دارانہ مفادات کے حلیف شاعر عموماً یہی طریقہ اپناتے ہیں تاکہ شاعری انقلابی تبدیلیوں کا آلہ نہ بن سکے۔ شاعری میں مبہم اور نامانوس الفاظ اور علامتیں استعمال کرنے والے، مریضانہ جنسیت اور شکست خوردگی کے احساس کو پھیلانے والے شاعر اور ان کے طرفدار نقاد یہ دلیل دیتے ہیں کہ شاعری انکشاف ذات کا ذریعہ ہے۔ انکشاف ذات کو سماجی عوامل اور فرائض سے جدا کر کے دیکھا جائے تو پھر شاعری کے ذریعہ مذہبی منافرت پھیلانے، ملک کے خلاف غداری کے خیالات پھیلانے ملکی یکجہتی کو نقصان پہنچانے، جرائم پر اکسانے اور گالیاں بکنے کی بھی آزادی دینی پڑے گی کیونکہ اگر کسی کی ذات میں یہ کجروی یہ تخریب موجود ہے تو اسے بھی "انکشاف ذات" کے اصول کے تحت آزادی میسر ہوگی۔ کہ وہ جس طرح چاہے اپنی ذات کا انکشاف کرے۔ لیکن کیا کوئی مذہب

ملک یا سماج اور اس کے باشندے اس کی اجازت دیں گے۔ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں تصنیف و تالیف ایک انفرادی عمل ہوتے ہوئے بھی سماجی فرائض سے قطع نظر نہیں کرسکتا یہ ایک سماجی فریضہ بھی ہے۔ لیکن نئی نظم کے بعض شعراء انکشاف ذات اور انفرادی تجربہ کے نام پر اجتماعی، اخلاقی اور سماجی اقدار کو ذبح کرنے کو ہی فن سمجھتے ہیں۔

دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نظم میں ابہام اور ابہام نظم کے حسن میں اضافہ کرتا ہے اور غیر مربوط استعاروں کو نظم کا صوتی آہنگ ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ یہ صوتی آہنگ ہی علامت کا کام کرتا ہے۔ ایک تو آہنگ کو ہی علامت قرار دینا علامت کا مذاق اڑانا ہے دوسرے ابہام سے نظم میں حسن اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ اعتدال میں رہے۔ ابہام کا نظم کے حسن سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ تو نظم کا ایک عیب ہے، نظم میں ایک خاص صوتی فضا خلق کر دینے سے بھی نظم کی معنویت کی وضاحت نہیں ہو سکتی۔ راشد کی ایک اور نظم "تسلسل کے صحرا میں" کا یہ اقتباس دیکھئے۔ اس نظم کے لئے یہی دلیل دی جاتی ہے کہ اس کے آہنگ سے تسلسل اور تغیر کا احساس ہوتا ہے۔ اقتباس یہ ہے۔

"تسلسل کے صحرائے جاں سوختہ میں
صدائیں بدلتے مہ و سال
ہوائیں گذرتے خدوخال
تنہا نشان فراق و وصال
صبا ہو کہ صرصر کہ باد نسیم
درختوں کی ژولیدہ زلفوں میں بازی کناں
اور درختوں کے تپتے ہوئے سرخ ہونٹوں
سے بوسہ دیا۔
پہاڑوں سے پانی کے باریک دھارے
فرازوں سے اترے، بہت دور تک دشت و در

میں مچلتے رہے، پھر سمندر کی جانب بڑھے،
اور طوفان بنے،
اِن کی تاریک راتیں سحر بن گئیں" (تسلسل کے صحرا میں۔ ن۔م۔ راشد)

نئی نظم کے شعراء جو جدیدیت کے فلسفہ سے متاثر ہیں اپنی نظموں میں ذاتی علامتوں کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں اور ان کے استعمال کا جواز یہ بتایا جاتا ہے کہ موجودہ دور کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کی عکاسی کے لئے نئی علامتوں کا استعمال ناگزیر ہے۔ مثلاً وحشت، تنہائی شکست خوردگی، لایعنیت وغیرہ احساسات کی عکاسی مروجہ علامتوں کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ نئے استعاروں اور نئی علامتوں کی تشکیل ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور زبان کا دامن اسی طرح وسیع ہوتا ہے۔ لیکن استعارہ سازی، علامت نگاری اور پیکر تراشی کے بھی کچھ اصول مقرر ہیں۔ انھیں اس طرح استعمال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ معنی و مفہوم سے قطعی عاری ہو جائیں۔ کیونکہ ان کے معنی ان کے تلازمات سے ایک حد تک واضح ہو جاتے ہیں اور نظم کے الفاظ، استعارے علامتیں قطعی لاتعلق اور غیر مربوط نہیں ہوتے۔ بلکہ ایک استعارہ دوسرے استعارے کے مفہوم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں نے بھی بہت سے نئے استعارے اور علامتیں استعمال کی ہیں، مثلاً سحر، شب، خون، چراغ، صیاد، گلچیں، باغباں وغیرہ، ان علامتوں کے معنی و مفہوم میں ابہام نہیں ہے۔ کیونکہ ان الفاظ سے وابستہ خصوصیات بھی واضح ہیں اور انھیں استعمال کرتے وقت بھی ان خصوصیات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اب ذرا راشد کی نظم " میرے بھی ہیں کچھ خواب " کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ اس میں متعدد استعارے موجود ہیں۔ لیکن اپنے تلازمات سے قطعی غیر متعلق ہیں، نظم کا کوئی مجموعی تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ اور نہ نظم کا مقصد یا پیغام ہی پتہ چلتا ہے۔ اس نظم میں معنویت کا خون اس لئے ہو جاتا ہے کہ شاعر نے شعوری طور پر ایسے غیر مربوط اور نامانوس الفاظ استعمال کئے ہیں کہ نظم کے آخر میں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آخر شاعر کے خواب کیا ہیں۔ نظم میں چند

غیر مربوط خیالات ضرور ملتے ہیں۔ مثلاً خواب ہی اصل حقیقت اور زیست کا مفہوم ہیں۔ زیست کی بے ہودہ کشاکش سے دور رہو کر ان خوابوں میں گم ہو جاؤ (تاکہ چند سرمایہ دار تمام مادی وسائل پر قبضہ کئے بیٹھے رہیں) عوام کو یہ درس دیا جا رہا ہے کہ تم شعور کے بجائے لاشعور کو اپنا رہنما بناؤ۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ گھوڑے کے آگے گاڑی کو جوت دیا جائے۔ نظم یہ ہے۔

"کچھ خواب کہ مدفون ہیں اجداد کے خود ساختہ اسمار کے نیچے
اُجڑے ہوئے مذہب کے بنا ریختہ اوہام کی دیوار کے نیچے
شیراز کے مجذوب تنک جام کے افکار کے نیچے
تہذیب نگوں سار کے آلام کے انبار کے نیچے
اے عشق ازل گیر ابد تاب، میرے بھی ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب
وہ خواب جو آسودگئ مرتبہ و جاہ سے
آلودگئ گرد سر راہ سے معصوم
جو زیست کی بے ہودہ کشاکش سے ہوتے نہیں معدوم
خود زیست کا مفہوم"

(میرے بھی ہیں کچھ خواب۔ ن۔م۔ راشد)

فن فکر کو سجانے اور سنوارنے کا کام کرتا ہے۔ لیکن اس نظم میں چونکہ فکری سطح نہایت پست اور معنویت ندارد ہے اس لئے فنی اعتبار سے بھی نظم میں کوئی خوبی نہیں ہے فکری سطح پر یہ نظم ایلیٹ کی نظموں (The hollow man) اور (The waste land) سے متاثر ہے۔

ایلیٹ کی فکر میں جو زوال پسندی اور انحطاط نظر آتا ہے اس کی وجہ تو معلوم ہے۔ کیونکہ وہ جس سرمایہ دارانہ نظام کا نمائندہ اور حامی تھا۔ وہ اس کی نظروں کے سامنے ہی پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ تمام دُنیا میں ترقی پسند اور انقلابی طاقتیں آگے بڑھ رہی تھیں۔

جس نظام کی بنیاد لوٹ کھسوٹ، استحصال اور خود غرضی پر رکھی گئی ہو، اس کا انجام خوشگوار کیسے ہو سکتا ہے۔

نظم فنی اعتبار سے بھی ناقص اور لیسپت ہے ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے۔ اجداد کے خود ساختہ اسمار، مذہب کے بنا ریختہ اوہام کی دیوار، شیراز کے مجذوب تنک جام کے افکار ایسا معلوم دیتا ہے۔ جیسے کوئی شخص خواب میں بڑبڑا رہا ہے اور اس کی زبان سے اوٹ پٹانگ بے ربط جملے نکل رہے ہیں۔ جدت اور تجربہ کے نام پر خود ساختہ تراکیب، استعاروں اور علامتوں کا یہ استعمال شاعری کو ایک مذاق بنا دینے کی سازش ہے۔ ابتدائی چار مصرعوں میں اسمار دیوار، افکار اور انبار سے ایک خاص آہنگ پیدا کیا گیا ہے۔ اس طرح اوہام، جام اور آلام سے بھی ایک خاص آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح خود ساختہ اور بنا ریختہ، ابدتاب اور خواب مرتبہ وجاہ اور سر راہ سے بھی آہنگ پیدا کیا گیا ہے۔ اگر الفاظ، استعارے اور علامتیں بامعنی اور مانوس ہوں تو اس آہنگ سے نظم کی موسیقیت میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن یہ کہنا کہ یہ آہنگ معنی کی تفہیم میں معاون ہو سکتا ہے۔ سراسر غلط ہے۔ اس آہنگ کے ذریعہ کسی مخصوص احساس کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک غلط دعویٰ ہے۔ جب نظم مہمل ہو اور الفاظ اور استعارے بے معنی خود ساختہ اور غیر مربوط ہوں تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ نئی شاعری احساس کی شاعری ہے اور اس کا گہرا تعلق آہنگ سے ہے۔ لیکن اس نظم کو پڑھنے کے بعد اس کے آہنگ سے کون سا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مہمل الفاظ کے آہنگ سے کوئی ایسا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ جو انسانوں کے لئے قابل اعتنا ہو نظم کی صوتی اہمیت اسی وقت قابل اعتنا ہوتی ہے جب اس کی کوئی معنوی اہمیت بھی ہو۔

نئی نظم کو مقبول بنانے میں اختر الایمان کا نام بڑا مشہور ہے کیونکہ انہوں نے فرسودہ استعاروں اور علامتوں کو ترک کر کے ایسے استعاروں اور علامتوں کا استعمال کیا جو نئے ہونے کے ساتھ ساتھ بامعنی اور تخریبی رویہ نہیں اپنایا۔ جدیدیت میں صحت مند فکر کی مثال اختر الایمان کی شاعری میں ملتی ہے۔ انہوں نے ابہام سے بھی حتی الامکان پہلو بچایا، رمزیت اور اشاریت

کے باوجود سادگی اور سلاست کی اتنی اچھی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ ان کی نظم "عہد وفا" کا یہ اقتباس اس کا ثبوت ہے

یہی شاخ تم جس کے نیچے کسی کے لئے چشم نم ہو، یہاں اب سے کچھ سال پہلے
مجھے ایک چھوٹی سی بچی ملی تھی جسے میں نے آغوش میں لے کے پوچھا تھا۔ بیٹی
یہاں کیوں کھڑی رو رہی ہو؟ مجھے اپنے بوسیدہ آنچل میں پھولوں کے گہنے دکھا کر
وہ کہنے لگی ۔ میرا ساتھی، ادھر (اس نے انگلی اٹھا کر بتایا) ادھر، اس طرف ہی
جدھر اونچے محلوں کے گنبد، ملوں کی سیہ چمنیاں آسماں کی طرف سر اٹھائے کھڑی ہیں۔
یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں سونے چاندی کے گہنے ترے واسطے لینے جاتا ہوں رامی!

(عہد وفا - اخترالایمان)

اخترالایمان نے ہی نئی نظم میں داخلیت کے وہ عناصر شامل کئے جو نئی نظم کا ایک خاص رجحان بن گیا۔ اخترالایمان وجودیت کے فلسفہ سے بھی متاثر رہے ہیں اور وہ بھی جوہر کے بجائے وجود کو مقدم سمجھتے ہیں۔ نئے عہد کے انتشار، ذہنی کشمکش اور تنہائی کو انہوں نے ایک مفکرانہ طنز کے ساتھ پیش کیا ہے۔ "بنت لمحات" سے ان کی یہ دو نظمیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اخترالایمان کی نظمیں جدیدیت کی وہ وراثت ہیں جسے باذوق اور صحت مند فکر رکھنے والے شاعر آج بھی اپنائے ہوئے ہیں:-

آنکھ جو کھولی تو دیکھا کہ زمیں لال ہے سب
تقویت ذہن نے دی ٹھہرو نہیں خون نہیں۔
پان کی پیک ہے یہ اماں نے تھوکی ہوگی (کل کی بات - اخترالایمان)

جب اس کا بوسہ لیتا تھا سگرٹ کی بو نتھنوں میں گھس جاتی تھی
میں تمباکو نوشی کو ایک عیب سمجھتا آیا ہوں
لیکن اب میں عادی ہوں یہ میری ذات کا حصہ ہے
وہ بھی میرے دانتوں کی بدرنگی سے مانوس ہے ان کی عادی ہے (مفاہمت - اخترالایمان)

اخترالایمان کی وراثت کو آگے بڑھانے والے شاعروں کا ذکر کرنے سے پہلے ان شاعروں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ جنھوں نے نئی نظم میں الفاظ کی شکست وریخت کرکے اسے ایک مضحکہ خیز چیز بنا دینے کی کوشش کی۔ اس گروہ میں انیس ناگی، عادل منصوری، افتخار جالب، احمد ہمیش جیسے شاعر شامل ہیں۔ ان شاعروں نے پیچیدہ شعوری یا لاشعوری تجربات کے اظہار کے لئے استعارہ در استعارہ یا ایک دوسرے میں الجھے ہوئے پیکر استعمال کئے جس سے ان کی نظمیں گنجلک اور ناقابل فہم ہوگئیں۔ ایسا کبھی تو ذہنی تضادات، انتشار اور پراگندگی کو پیش کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ کبھی اسے تجربہ اور فیشن کے نام پر کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات فوق حقیقتی (Surrealistic) انداز بیان کو اختیار کرنے سے یا تجریدیت کی حد سے زیادہ رجحان سے بھی نظم ایک معمہ بن جاتی ہے۔ عادل منصوری کی یہ نظم ملاحظہ فرمائیے۔

لہو سبز، سیلاب آوا گمن
ظفر جامنی تیرگی تالیاں
کھرچتے ہیں خوابوں کو ناخن نظر
مگر مفلسی
رائگاں رت جگوں میں رطوبت رواں
پاؤں کی چوٹ لنگڑے خیالوں کو گھڑ دوڑ میدان میں
سربرہنہ صعوبت کے سایوں کے پیچھے بھگائے عدد
اشتہاروں میں لپٹی ہوئی صبح سورج کا پھل
بیجنیر پہ بند۔ (لہو سبز سیلاب آوا گمن۔ عادل منصوری)

ایسی نظمیں پڑھ کر تو شاعر کی دماغی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ ابہام جو نظم کا حسن ہے مہملیت کا شکار ہو گیا ہے۔ سماجی مسائل سے پہلو تہی کی وجہ سے بھی یہ مجذوب کی بڑ کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ شاعری کی زبان کیا ہو اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعر کو زبان کا تخلیقی استعمال کرنے کا حق ہے۔ لیکن اس نظم کی زبان تو جناتی

ہے جسے جن بھوت ہی سمجھ سکتے ہیں۔

افتخار جالب کی یہ نظم بھی دیکھ لیجئے۔ اس کا عنوان آپ جو چاہیں رکھ لیجئے۔ کیونکہ عنوان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

حرام مغز امتحان میں ہے۔
شاید تصور رکھیں درد، ہر جزو متصل، ٹوٹنے کے لگ بھگ
تراش اٹھتی ہے۔
کیا تنگ ظرف شدھ! الرجک جمیع تنظیم، دل پھیپھڑے سفید خاکستری
پپوٹوں میں دم بخود، دائمی تیراسوں کی آنکھ، آنگن
ہیں تنہا مرغی غنودگی کا شکار
نقائی مواد غدود غفلت مآب ٹھہری ہے

جدیدیت کا بڑے سے بڑا پرستار بھی اس نظم کے اسلوب، تکنیک اور لفظیات کی معقولیت کو ثابت نہیں کرسکتا۔ اس قسم کے شاعروں کا عقیدہ یہ ہے کہ جو شعر سمجھ میں آجائے وہ شاعری کے منصب سے گرجاتا ہے۔ یہ شعوری طور پر شاعری کو اور عوام کے شعور کو (Sabotage) کرنے کا طریقہ ہے۔

جدیدیت کے نام پر فراریت اور مریضانہ جنسیت پھیلانے والے شاعر سماج اور ادب دونوں ہی کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ ایک قسم کی کلبیت ہے جسے یہ لوگ بغاوت کا نام دیتے ہیں۔ مثلاً ایک جدید شاعر فرماتے ہیں۔

اِن کو گناہ کرتے ہوئے میں نے جا لیا۔
پھر اِن کے ساتھ میں بھی گنہگار ہو گیا (محمد علوی)

نئی نظم میں فراریت، گریز، کلبیت اور شکست خوردگی کے رجحانات عام ہیں۔ جب سماجی اور اقتصادی حالات سازگار نہ ہوں اور شاعر انھیں بدلنا نہ چاہتا ہو یا بدلنے کی ہمت نہ رکھتا ہو تو وہ زندگی اور سماج سے بیزار ہو جاتا ہے لیکن کیا اس کا علاج یہ ہے کہ لوگوں کو تاریک

مجبوروں کی طرف بُلا یا جائے۔ ؟ وہ بھی تو لوگ ہیں جنہوں نے ہمت و مردانگی قوت برداشت اور انقلابی قوتوں کو بروئے کار لاکر استعماریت، معاشی جبر، سماجی ناانصافی اور طبقاتی استحصال کا قلع قمع کر دیا۔ اپنے ماحول کو ساز گار بنالیا۔ اقدار کی شکست و ریخت اور کسی صحت مند اور مثبت عقیدے کے نہ ہونے کی وجہ سے بھی اِن شاعروں نے ناداری، افسردگی اور فراریت کو اختیار کیا ہے مخمور سعیدی کے مجموعۂ کلام ''آواز کا جسم'' میں یہ رجحانات آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''شمع بجھتی ہے'' کا یہ اقتباس دیکھئے۔

خیال ذہن میں کوئی نہ خواب آنکھوں میں۔
کرن کو نگلنے لگی ہے تاریکی
نفس کی جوت، نظر کے چراغ بجھتے ہیں۔
اب اس کے بعد اندھیرا ہے، گھور اندھیرا ہے۔ (شمع بجھتی ہے)

انھیں کی ایک دوسری نظم ''لہو میں ڈوبتا منظر'' کا یہ منظر بھی دیکھئے۔

دھوپ کی پھیلتی چادر
لہو میں ڈوبتا منظر
اجل کی نیرگی نے چھین لی آنکھوں کی بینائی
نظر سے زندگی کے آخری آثار بھی گم ہیں۔
یہ کوئی معجزہ ہوگا ابھی زندہ جو ہم تم ہیں۔ (لہو میں ڈوبتا منظر)

نئی نظم کے نسبتاً نئے شاعروں کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو عموماً مایوسی ہی ہوتی ہے روایت شکنی اور ہیئت شکنی کے جوش میں یہ شاعر حد اعتدال سے آگے نکل گئے ہیں۔ لیکن ایسے بھی کئی شاعر ہیں جن کی سب نظمیں اس انتہا پسندی کے ذیل میں نہیں آتیں۔ انہوں نے نظم کے فکری، فنی اور لسانی امکانات کی توسیع میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ نئی نظم کے اِن شاعروں نے زماں و مکاں کی حد بندیوں کو توڑنے کی بھی کوشش کی ہے۔ جو کہیں کامیاب ہے اور کہیں ناکام۔ ایک عالمگیر انسانی صورت حال اور آفاقی و کائناتی حدوں کو چھونے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے

علامتوں کا نیم ذاتی استعمال اِن کے یہاں خاصی تعداد میں پایا جاتا ہے۔ استعاروں کا تخلیقی استعمال اور طرزِ احساس اور آہنگ کی جدت بھی اِن شاعروں کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے لیکن یہ شاعر بھی جہاں خالص ذاتی علامتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اور آزاد تلازمۂ خیال کو اپناتے ہیں وہاں اُن کے اشعار بھی ابہام اور اہمال کا شکار ہو جاتے ہیں۔

عمیق حنفی، وزیر آغا، باقر مہدی، ندا فاضلی، بلراج کومل، شہریار وغیرہ شاعر اسی گروہ میں شامل ہیں۔ اِن کی نظمیں فکری اور فنی اعتبار سے درمیانی درجہ میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر عمیق حنفی کے لہجہ میں درشتگی، کرب، بے چینی، تناؤ، الجھن اور عصری مسائل سے پیدا شدہ بے چینی بہت نمایاں ہے۔ "سنگ پیراہن" سے لیکر "شجر صدا" تک انہوں نے جدید دور کے تضادات کو صفائی سے پیش کیا ہے۔ عمیق حنفی استعاروں اور علامتوں کا استعمال نئے تخلیقی اور اشاراتی انداز میں کرتے ہیں۔ ان کی نظم ایک دا ضح اور دیرپا نقش چھوڑ جاتی ہے اِن کی نظموں میں ابہام بہت کم ہے۔ ان کا باغیانہ رویہ بھی صحت مند ہے، سرمایہ دارانہ اور سامنتی نظام کے جبر کو تیکھے اور تلخ لہجے میں انہوں نے بہت ہی کامیابی سے پیش کیا ہے، عمیق حنفی نے اپنی ایک نظم میں جنگ کی خوفناک آگ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

دہکتی سانپ چھتری، چھاؤں
چھپائے جو الامکھیوں کے دہانے بے شمار
چھپائے اِن گنت یم دوت
فصیلِ شہر کے سایہ میں گھل جاتی ہے یکسر

طنز کے تیکھے نشتروں کے ساتھ ساتھ عمیق حنفی کے کلام میں دردمندی اور عام انسانوں کے مقدر سے وابستگی کا شدید احساس بھی موجود ہے۔ وہ تخریب کے بعد ہی نئے نظام کی تعمیر کے قائل ہیں یہ "مٹی بو دینے کی دھن" کی یہ سطریں دیکھئے۔

بیج نہیں اب وہ مٹی کھوج رہا ہوں
جس سے بارود کے ڈنٹھل پھوٹیں۔

آگ کی کونپل جیسے بجائے
لاوے کی لہریں بہہ نکلیں

عمیق حنفی کی نظموں میں ایک مثبت اور واضح نقطۂ نظر ملتا ہے جس کی وجہ سے ان کی نظموں میں آہنگ اور تاثر بھی نکھر گیا ہے۔ انہوں نے الفاظ کو نئے احساس کی ترجمانی کے لئے نئے انداز میں ضرور استعمال کیا ہے لیکن روایت شکنی میں انتہا پسندی سے گریز کیا ہے۔ اِن کی نظم "شب گشت" کا یہ اقتباس دیکھئے۔

میری آزادی کے نعرے
میری ملکیت کے ترانے
اصل میں ہیں ایک نئے زنداں کی کھوج
جو میرے اندر چھپے وحشی کو زندانی بنائے۔
ڈھونڈتا پھرتا ہوں وہ زنجیر جس میں
میرے اندر بھونکتا کتا بندھے

نئے زنداں کی کھوج، زنجیر کی تلاش، بھونکتا کتا بندھے، اندر کا وحشی، وغیرہ نئے معنوی تلازمات اور توسیعات کے حامل ہیں۔ طبقاتی جبر، مشینی نظام، استحصال، افلاس اور بوسیدہ نظام کے اندرونی تضادات کو عمیق حنفی نے تیکھے اور حساس لہجہ میں پیش کیا ہے۔
آزاد نظم میں عمیق حنفی کی طویل نظمیں "سندباد" اور "شہرزاد" کامیاب تجربہ کہی جا سکتی ہیں تصوریت پر عمیق حنفی کی نظم "المیہ" پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھیں خیال کو واضح اور پر زور اور مربوط انداز میں شعری پیکر میں ڈھال دینے پر کیسی قدرت حاصل ہے۔

ایک جوان بھرپور بدن کا
محض تصور بن جانا۔
گوشت پوست سے عاری یادیں ڈھل جانا
دل کو چھلنی بنا کر اس میں چھن جانا۔

چھنتے چھنتے بن جاتا اک ترا خیال
اُف انسانی جسم کا اتنا بڑا زوال

علامتی اور پیکری اسلوب کی معنویت اس میں ہے کہ وہ تمثیلی سطح پر نہ اتریں اور لفظ کے لسانیاتی امکانات کو بروئے کار لا سکیں۔ متضاد یا مخالف علامتی پیکروں کے استعمال سے نظم کی معنویت اور تاثر دونوں کو نقصان پہنچتا ہے اور قاری کا ذہن بھٹک جاتا ہے۔ نئی نظم میں جن علامتوں کا استعمال ہوا ہے وہ زیادہ تر یا تو نامانوس ہیں یا تمثیلی سطح پر اتر آتی ہیں۔ علامت کی تعریف کرتے ہوتے کالرج نے لکھا تھا کہ "علامت فرد میں نوع اور عام میں خاص کے نیم روشن نفوذ" کا نام ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ عام الفاظ علامت کا درجہ تب ہی حاصل کر پاتے ہیں جب شاعر ان میں مخصوص معنویت اور اہمیت پیدا کر سکے اور بار بار اسی مخصوص معنویت اور اہمیت کی تکرار پائی جائے۔ یہاں تک کہ اس کے تلازمات ایک حد تک معین ہو جائیں۔ لیکن جب نئی نظم کے شاعران نئی علامتوں کا استعمال عادت کے غیر شعوری انتخاب سے مجبور ہو کر یا بطور فیشن کے کرنے لگتے ہیں تو نظمیں ابہام اور بعض اوقات بیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں بلراج کومل کی نظم "برگ صدا" کا یہ اقتباس پڑھا جائے تو اس میں استعمال کی گئی علامتوں میں ابہام اور اہمال کا صاف پتہ چل جائے گا۔

آسمان نیل گوں اس کا سایہ حسیں
اس کے سائے میں رنگ شجر سبز، چڑھتی ہوئی
دھوپ سیال سونا۔ وہ چہرہ نگیں۔
ایک منظوم منظر، کنارے سے خام، تجریدیہ
کوکھ سے جنم لیتے تراشیدہ بازو، پریشاں گیسو۔ لب نیم جاں
چشم اور ذہن کی وحشت کا بپھرا ہوا۔
زرد عفریت، مار سیہ، کینچلی
دانت، جبڑے، شکستہ ستاروں سے گرتے ہوئے گیت میں۔

ہم سفر اجنبی کا، وہ میرا، مرے
جادۂ بے صدا کے غبارِ تمنا کا بادل، میں اڑتا ہوا لایا آہو
کی رفتار کا کوئی چہرہ یہ

یہ منظر کو کیا ہو گیا۔
اس میں دم توڑتے نفس کی منجمد
گرد آلود آنکھیں، سرِ شاخِ گل
منتظر ہیں حریفِ نوا کی جو کل تک نہ آیا، جو کابوس کے چھپاتے ہوئے
چار خنجر سرِ بام آویزاں کر کے کئی روز پہلے یہاں سے کہاں چل دیا۔
آسماں نیل گوں تھا عجب چیتھڑا
خاک دھبوں سے بنا
بارِ شام و سحر
ایک خرگوش کے نیم جاں جسم پر آ گیا۔
خامشی کہہ رہی ہے کہ برگِ صدا
گر چکا، مٹ چکا،
آج آزاد ہو
حشر تک اب مسلسل ہی بہتی رہی
گرم سفاک اندھی پریشاں پاگل ہوا (بلراج کومل - برگِ صدا)

نظم میں پہلی چار سطریں کسی قدر واضح ہیں اور خوبصورت پیکر تراشے گئے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے نظم آگے بڑھتی ہے استعارے مبہم ہو کر ایک دوسرے میں الجھ جاتے ہیں۔ ایک استعارہ دوسرے استعارے سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتا۔ استعارے، علامتیں اور پیکر انتہائی شخصی اور ذاتی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے تلازمات سے کوئی ربط نہیں رکھتیں، زرد عفریت، مارسیہ، اڑتا ہوا ہیولا آہو کی رفتار کا چہرہ، حریفِ نوا، کابوس کے چھپاتے

ہستے خنجر، خرگوش کا نیم جاں جسم وغیرہ استعارے اور علامتیں معنی و مفہوم سے یا تو عاری ہیں یا انتہائی مبہم ہیں۔ مکمل نظم پڑھنے کے بعد بھی کوئی مکمل تاثر طاری نہیں ہوتا۔ البتہ دہشت خوف، بیچارگی اور ناامیدی کا ایک مبہم سا احساس ضرور ہوتا ہے۔ لیکن نظم سے نہ علت کا پتہ چلتا ہے نہ معلول کا، شاعر کا ذہن انتشار اور پراگندگی سے بھرا ہوا ہے۔ اسی لئے وہ منتشر اور پراگندہ خیالات کو نامانوس استعاروں میں پیش کر رہا ہے۔

وزیر آغا نئی نظم کے ایک معتبر شاعر ہیں۔ اِن کی نظموں میں دیو مالائی اور اساطیری علامتوں کا اچھا استعمال ملتا ہے۔ ان کی نظموں سے دھرتی پوجا کی مہک آتی ہے۔

وزیر آغا یونگ کے نظریات سے کافی متاثر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں آرکی ٹائپ اور اجتماعی لاشعور کے تجربات کو بھی پیش کیا ہے۔ انہوں نے آرکی ٹائپ (Arche Type) علامتوں کا استعمال بھی کیا ہے۔ اِن کی نظموں میں عموماً سماجی یا سیاسی افراد کے ذاتی جذباتی، تہذیبی اور معاشرتی میلانات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ان کی نظم "سکوت" کا یہ اقتباس دیکھئے۔

تھا منجمد سا سکوت طاری
لپٹ چکی تھی خموش پیڑوں سے رہگذر کی
حسین ناگن
لڑھکتے پتھر بھی تھم چکے تھے۔
فضا بھی چپ تھی ہوا بھی بوجھل
تھے سرد پیڑوں میں دبکے بیٹھے ہزاروں بے حس
خموش پنچھی
گھنیری شاخوں کا اوڑھے کمبل
عجیب سا تھا سکوت طاری
نہ کوئی راہی نہ کوئی آہٹ

نہ خشک پتوں کی سرسراہٹ
تھا اس قدر دم بخود اندھیرا
کہ پشت ایک پیڑ سے لگائے
میں ۔ رہگذر کے کنارے بیٹھا
گزرتے لمحوں کی چاپ تک کو
خود اپنے کانوں سے سن رہا تھا (وزیر آغا ۔ سکوت)

ذات میں ڈوب جانے کا رجحان نئی نظم کا عام رجحان ہے ۔ وجودیت کے مفکرین نے زندگی اور ذات کو قطعی علیحدہ قرار دیا اور زندگی کی بے معنویت پر زور دیا ۔ خوف مایوسی ، قنوطی کا احساس اور زوال پسندی کو حرز جاں بنا لیا گیا اور لاشعور کے بے ربط خیالات کو نئی نظم میں عجیب طریقوں سے پیش کیا گیا ۔ اس کے ساتھ ہی وٹ گن اسٹائن کی علامتی اشاری زبان (sign language) کے تصور کو اختیار کیا گیا ۔ اس سے نئی نظم کی ایسی نظمیں جن میں لاشعور کے بے ربط خیالات کو وٹ گن اسٹائن کی علامتی اشاری زبان میں پیش کیا گیا ۔ معمہ بن گئیں ۔ مختلف شاعروں کا طرز احساس بھی مختلف ہے اسے پیش کرنے کا طریقہ بھی ہر شاعر کے یہاں مختلف ہے ۔ یہاں تک کہ بعض اوقات شاعر اپنے مخصوص احساس کو آہنگ سے ہی پیش کرنا چاہتا ہے اور الفاظ کی معنوی اہمیت پر قطعی دھیان نہیں دیا جاتا ۔

نئی نظم کے نسبتاً نئے شاعروں میں ایسے شاعر گنتی کے ہی ہیں جنھیں لفظیات کی معنوی اہمیت کا بھی احساس ہے اور ذاتی یا عصری خیالات کو بہتر تکنیک اور واضح اسلوب میں پیش کرنے کا سلیقہ بھی آتا ہے ۔ یہاں ایسے ہی چند شاعروں کی نظموں کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں ۔"

یہ خوش وقتیوں کی گھڑی ہے
طواف غم ذات سے باز آؤ
میرے داغ کے دائرے پر
انھیں الاؤ
دم واپسیں خود جلاؤ (ساجدہ زیدی ۔ دم واپسیں)

دوا کی شیشی میں سورج
سلگتی آگ میں چاند
اکھڑتی سانسوں میں رہ رہ کے ایک نام کی گونج
تمہارے خط کو —
کئی بار پڑھ چکا ہوں میں
کوئی فقیر کھڑا گڑگڑا رہا تھا ابھی
بنا اٹھے اسے دھتکار کر بھگا بھی چکا (ندا فاضلی ۔ سرحد پار کا ایک خط پڑھ کر)

ایک نکڑ پر
نیلی، پیلی، سبز نلکیاں
صابن کے پانی سے
ننھے صاف بلبلے بنا رہی ہیں
یہ منظر کتنا اچھا ہے
اس نکڑ کی سمت ہی رخ ہے تیز ہوا کا
آؤ جلدی سے اونچی سی دیوار بنائیں
روک لیں، ہم سب تیز ہوا کو
اس نکڑ پر
نیلی، پیلی، سبز نلکیاں، صابن کے پانی سے
ننھے صاف بلبلے اور بنائیں (شہریار ۔ نئی نسل کے لئے ایک نظم)

سمندر جب گھنا تاریک ہو اور رات کا آخری ستارہ ڈوب جانے کے لئے بیتاب ہو
تو مجھ سے مت کہنا کہ میرے گھر کے آنگن میں مہکتی کیاریوں پر تتلیوں کے پر چمکتے تھے
مجھے معلوم ہے،

میں سب سمجھتا ہوں کہ ہنسی دھوپ کیا کیا رنگ دھرتی پر بچھاتی ہے
کہ اپنے شہر کی اونچی عمارت پر کھڑے ہو کر یہ منظر میں نے دیکھا ہے

(کمار پاشی ۔ یہ منظر میں نے دیکھا ہے ۔)

---

ان نظموں کے فکری وفنی رجحانات کے تجزیہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نئی نظم اب بھی تجرباتی دور سے گذر رہی ہے ۔ یہ تجربات موضوع و مواد ، تکنیک اسلوب اور ہیئت سبھی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اکثر و بیشتر نظموں میں لب ولہجہ نیم ذاتی اور نیم روائتی ہے ۔ کہیں ابہام اعتدال کے دائرہ میں ہے تو کہیں یہ بڑھ کر اہمال تک پہنچ جاتا ہے ۔ زبان کا تخلیقی استعمال اور اس کا سلیقہ سب کو میسّر نہیں ہے ۔

ڈاکٹر روشن اختر کاظمی

# سرگذشتِ دانش

حیاتِ انسانی تضادات کا مجموعہ ہے۔ کبھی صبحِ درخشاں ہے۔ کبھی شبِ دیجور، کبھی لالۂ صحرائی ہے کبھی چھوئی موئی کی نازک بیل۔ کہیں اس کے سائے میں عشق و محبت کی آنکھ مچولی ہوتی ہے اور کہیں موت کا خونی ناچ۔ کہیں دولت کی ریل پیل ہے اور کہیں مفلسی نے اپنا ڈیرا جما رکھا ہے۔ غرض زندگی ایک عجیب و غریب معمہ ہے۔ جسے سمجھنا بھی دشوار ہے اور سمجھانا دشوار تر اسی لئے ایک مشہور شاعر نے زندگی کی پیچیدگی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُسے دیوانے کے خواب سے تشبیہ دی تھی:-

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا (فانی)

زندگی دیوانے کا خواب ہے یا نہیں اس پر مجھے اصرار نہیں لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ زندگی صراطِ مستقیم نہیں بلکہ اس کی راہیں بڑی پُرپیچ ہیں۔ زندگی ایک بحرِ ذخار ہے جس کی طوفانی لہروں میں انسان ایک حقیر تنکے کی طرح بہتا رہتا ہے اور حالات کے تھپیڑے اکثر اسے اس کی منزل سے دور پہنچا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان گم کردۂ منزل ہو کر زندگی کو جبرِ مسلسل سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور حالات کے آگے سپر انداختہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ

حالات کے جبر اور دباؤ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا بھی آسان کام نہیں ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر انسان اپنے ماحول کا اسیر ہوتا ہے، وہی ماحول جو حالات سے پیوستہ ہوتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ حالات کی دین ہوتا ہے۔ پھر بھی ماحول ایک بڑا وسیع لفظ ہے۔ جس کی تعریف کرنے کا نہ یہ موقع ہے اور نہ محل۔ لیکن صرف اتنا واضح کرنا مقصود ہے کہ انسان کی شخصیت کی تعمیر میں ماحول کی حیثیت منفی بھی ہو سکتی ہے اور مثبت بھی، یہ خود انسان کی فطری صلاحیت ردّ و قبول پر منحصر ہے کہ وہ اپنے ماحول سے کس طرح متاثر ہوتا ہے۔ اور اپنی مخفی صلاحیتوں کو کس طرح بروئے کار لاتا ہے۔

احسان دانش کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھیں جس قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونا پڑا، اُن سے عہدہ برآ ہونا عام قوت ارادی کے انسان کے لئے ناممکن تھا۔ ان کی خود نوشت سوانح عمری "جہان دانش" ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اُن کی زندگی بے نقاب ہے۔ ان کی پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو شرافت اور نجابت کے لحاظ سے فرد تھا۔ لیکن معاشی حالت انتہائی ہی کمزور تھی۔ یہاں تک کہ اُن کے والد کو محنت مزدوری کر کے اپنے گھر والوں کا رزق مہیا کرنا پڑتا تھا۔ انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری کے ابتدائی صفحات میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔

"میں قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوا اور وہیں اپنے نانا بو علی شاہ کے یہاں پرورش پائی جو ایک غریب سپاہی تھے۔ ان کے انتقال پر میرے والد باغپت سے ترک سکونت کر کے کاندھلہ آگئے، ممکن ہے اس وقت بھی کچھ بچا کھچا سرمایہ ان کے پاس ہو۔ لیکن جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ نہر جمن شرقی میں کھدائی کرنے والے ٹھیکیداروں کے یہاں مزدوروں کے جماعت دار تھے۔ اور جب جماعت داری نہ ملتی تو ٹوکری اور پھاوڑے سے مزدوری کرتے اور گھر کا گذارہ کرتے" صفحہ ۲۴-۲۵

واضح رہے کہ یہ وہ دور تھا کہ جب شرفاء میں مزدوری کرنا فعل ناخوب سمجھا جاتا تھا

اور آج بھی جبکہ طبقاتی تفریق کے خلاف ہر جانب سے آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے ملک میں مزدوروں کی جو حالت ہے اور ان کی زندگی کا جو معیار ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ غلامی کے دورِ سیاہ میں جب مزدور کے اوقات تلخ تر تھے اور جس کے بزرگ ماضی میں صاحبِ قلم رہ چکے ہوں اس کی ذہنی و جذباتی کشمکش کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔ احسان دانش کے بزرگوں کے صاحبِ قلم ہونے کا ذکر بھی جہانِ دانش میں موجود ہے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"میرے والد ماجد قاضی دانش علی کا وطن قصبہ باغپت ضلع میرٹھ تھا۔ یہ دریائے جمنا پر لبِ ساحل آباد ہے۔ اگرچہ قضاء ہمارا جدی امتیاز تھا۔ لیکن میرے والد کا تعلیم میں خام رہ جانا بتاتا ہے کہ خاندانی طور پر تو پشتوں سے انحطاط شروع ہو چکا تھا جس کا شباب مجھے نصیب ہوا" (صفحہ ۲۴)

مختصر طور پر یہ کہنا بجا ہے کہ احسان دانش نے اپنا بچپن جتنے سخت حالات میں بسر کیا اس کی مثال کم از کم اردو شاعروں میں بہت کم ملتی ہے۔ انھیں حالات کے تحت ان کی باقاعدہ تعلیم بھی نہ ہو سکی۔ کیونکہ مفلسی اور تنگدستی میں گھرے ہوئے خاندان کے لئے تعلیم کا بار برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کمسنی سے ہی احسان دانش کو خاندان کی کفالت کے لئے مختلف قسم کی محنت مزدوری کرنے پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ لیکن ان کی زندگی کی کہانی صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک بہت خوبصورت اور توانا پہلو بھی ہے۔ وہ خوبصورت پہلو ان کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے۔ زندگی کے نامساعد حالات اور ماحول کی ناموافقت کے باوجود ان کا ذوقِ شعری روز نکھرتا گیا، ان کی شاعرانہ صلاحیتیں بیدار ہوتی گئیں یہاں تک کہ وہ اپنے دور کے بہت اچھے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔

احسان دانش کی شاعری کی ابتدا کاندھلہ میں ہی ہو گئی تھی۔ لیکن اس کا کوئی نمونہ نظر سے نہیں گذرا۔ خود ان کا بیان بھی یہی ہے کہ اس دور کا کلام انہوں نے محفوظ نہیں رکھا۔ دراصل ان کی شاعری کے عروج کا سہرا شہر لاہور کے سر ہے۔ حالانکہ وہ صرف

تلاشِ معاش میں لاہور آئے تھے۔ اور وہاں پہنچنے کے بعد بھی عرصہ تک ان کا ذریعہ معاش محنت مزدوری ہی رہا۔ لیکن ان کی شاعری بھی ترقی کی منازل سے گذرتی گئی یہاں تک کہ انہیں مشاعروں میں بھی مدعو کیا جانے لگا اور رفتہ رفتہ ان کی شہرت ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔

احسان دانش کی شاعری میں عمومی طور پر لیکن نظم میں خصوصی طور پر ایک انفرادی رنگ نمایاں ہے اس کا سبب بھی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ انہوں نے زندگی کے جن مصائب کو خود برداشت کیا تھا۔ اور اپنے طبقے کو برداشت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہیں کو اپنی نظموں کا عنوان بنایا۔ صرف رسمی طور پر یا ترقی پسندی کی لہر میں بہہ کر زندگی کے کریہہ مناظر کی نقاب کشائی اور پسماندہ طبقوں کی عکاسی انہوں نے نہیں کی بلکہ ان کی شاعری خود ان کے تجربات اور مشاہدات کی دین ہے۔ جس میں صداقت کی تڑپ ہر ہر لفظ میں رچی بسی نظر آتی ہے۔

احسان دانش کی شخصیت میں ان کی خودداری تو ہر جگہ پر نمایاں نظر آتی ہے، حالانکہ وہ جس قسم کے حالات سے دوچار تھے ان میں قدم قدم پہ پاسِ خودداری کو مجروح بھی ہونا پڑتا تھا کیونکہ غربت اور افلاس کے سایہ میں خودداری کی حفاظت دشوارترین امر ہے پھر بھی چونکہ انہیں اپنے " قوائے ذہنی و جسمانی پر بھروسہ تھا۔ اس لئے انہوں نے حتی الامکان اپنی خودی کو بچانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ایک مخصوص قسم کی تلخی ان کے مزاج کا جزو لازم بن گئی۔ جس کی جھلک ان کی نظموں میں بھی پائی جاتی ہے۔

اِن کی نظمیں درد و غم میں ڈوبی ہوئی ہیں جنہیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے دل اور دماغ میں سماجی نابرابری، دولت کی غلط تقسیم نیز سرمایہ دار طبقہ کے خلاف ایک آتش فشاں پھٹ پڑنے کو بے قرار ہے۔ ممکن ہے، اگر مذہب کی گرفت ان کی شخصیت پر سے ڈھیلی پڑ جاتی تو وہ تشدد کی راہ اختیار کر لیتے، یہ بھی ممکن ہے کہ اِن کی شاعری نے اِن بھڑکتے ہوئے شعلوں پر شبنم افشانی کی ہو، اس نقطۂ نظر کو مولانا تاجور نجیب آبادی کے قول سے تقویت پہنچتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

— وہ اگر شاعر نہ ہوتا اور ماحول سازگار نہ مل جاتا تو شاید اب تک پھانسی چڑھ چکا ہوتا۔ اس میں ایک کچلی ہوئی بغاوت اور زخمی غیرت بولتی ہے۔ جسے وہ شاعری کا نام دیتا ہے، اس کی خاندانی شرافت اور اسلامی تہذیب کی دیواریں اسے روکے ہوتے ہیں ورنہ اب تک کیا تھا ..... اس کی زندگی ایسی گھاٹیوں سے گزر کر آئی ہے کہ کوئی دوسرا ہوتا تو ڈھیر ہو گیا ہوتا۔ لیکن تمام مصائب کے باوجود اس کا دل کمزور اور روح گدلی نہیں ہوئی ہاں تھان کا ٹرا آمزور ہے"۔

احسان دانش کی شاعری پر تنقیدی نقطہ نظر سے گرفت دشوار نہیں بلکہ آسان ہے کیوں کہ اُن کی تعلیم خود ان کے ذوق مطالعہ کی رہین منت تھی۔ ان کا شعور بھی کسی مخصوص ضابطہ یا نظریہ کا پابند نہیں تھا۔ پھر بھی اِن کے اشعار میں صداقت اور انسان دوستی، سوز و گداز کی خوبیاں موجود ہیں اور یہی سبب ہے کہ جب وہ اپنی نظمیں اپنی دردبھری آواز میں پڑھتے تھے تو اکثر مجلس عزا کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ ان کی تلخ نوائی اور کرخت لب ولہجہ اکثر ناقدین کے لئے محلِ نظر رہا ہے مجھے اس ضمن میں غالب کا ایک شعر یاد آ رہا ہے ؎

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اور اقبالؔ نے اس سلسلہ میں اس طرح اظہار خیال کیا تھا۔

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

احسان دانش کی انقلابی نظموں میں بھی اکثر تخریبی عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ خون کی سرخی شفق کو شرماتی ہے، حکام کے ساتھ ساتھ مدرس بھی پا بجولاں ہیں، مدرسے ویران ہیں، غرض زندگی کی جملہ نشانیاں خاک و خون میں غلطاں نظر آتی ہیں۔ اس قسم کی نظموں کو پڑھ کر ناقدین فن کی پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔ لیکن میرا نقطۂ نظر جو غلط بھی ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ نظمیں اس نظام حکومت کے رد عمل کے طور پر عالم ظہور میں آئی ہیں۔ جو ظلم و جبر کی بنیادوں پر قائم تھا یا بعض ممالک میں آج بھی قائم ہے۔ خود ان کی تحریر بھی اس سلسلہ میں ایک دستاویز

کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"اگرچہ ہمارا ملک آج اچھی خاصی ترقی کر رہا ہے مگر پس ماندہ طبقے کے لئے ان اجارہ داروں کے یہاں آج بھی رحم والضاف نہیں ملتا۔ اندیشہ پرست آج بھی تعلیم کو عام نہیں کرتے اور انجام سے باخبر ہونے کے باوجود غلط روی سے باز نہیں آتے۔ کاش وہ یہ سمجھ سکیں کہ اس طرح تو انقلاب اور بھی قریب آجاتا ہے۔ میں خونریز آندھیوں کی سنسناہٹ اور قصر خوردہ صاکوں کی دہل سن رہا ہوں وہ دن دور نہیں جب ہزاروں انسانوں کی خوراک کو دبا کر بیٹھنے والے ملبوں میں دب جائیں گے بے رحموں اور ناانصافیوں کے پندار کی دستاویزیں ٹھوکروں میں پامال کردی جائیں گی۔۔۔۔۔ اب کا انقلاب وہ۔۔ انقلاب ہوگا کہ بدکاروں اور ظالموں کے سینوں پر وقت کا تشدد نیزوں کے ہل چلائے گا۔ تاکہ ان کی گندی اور متعفن مٹی پاکیزگیوں کی کاشت کے قابل ہو جاتے۔۔۔۔ آخر کب تک اس خود پروری کی دوغلی پالیسی سے دنیا بے خبر رہے گی۔ اور خون انسانی شیر مادر کی طرح حلال سمجھا جائے گا۔" (جہاں دانش صفحہ ۳۴۷)

اس تحریر پر کسی قسم کے تبصرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن احسان دانش کی انقلابی نظموں میں اس صورتحال کی جھلک اگر نمایاں نظر آتی ہے تو اس پر چیپا بر جبیں ہونا یا انھیں تخریب پسند سمجھنا غلط ہے۔

احسان دانش نے اپنی زندگی کی پہلی سانس ایک مزدور گھرانے میں لی تھی اگرچہ انھیں زندگی میں بحیثیت شاعر شہرت وعزت حاصل ہوئی، کاملین فن کی صحبتیں نصیب ہوئیں لیکن وہ ذہنی اور جذباتی طور پر ہمیشہ اپنے طبقے کے وفادار رہے اور ہمیشہ اپنے قلم سے مزدوروں اور پسماندہ طبقے کی نمائندگی اپنا فرض اولین سمجھتے رہے۔

وہ ایک فطری شاعر تھے انھیں کسی استاد کا شاگرد بننے کا شرف حاصل نہ ہوا۔ لیکن خود ان کے بے شمار شاگرد آج بھی موجود ہیں جو شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی اور ادب میں ان کا اپنا مقام ہے۔ اظہار اثر رقم طراز ہیں۔

"میں نے احسان صاحب کو صرف اپنی شاعری کا استاد کبھی نہیں مانا بلکہ میں ان کو

زندگی کا استاد مانتا ہوں۔ کسی شخص کا کردار بنانے میں ماں کے بعد اس کے اعتقاد کا ... حصہ ہوتا ہے۔ میں بھی اس مقولہ پر یقین رکھتا ہوں، اس لئے کہتا ہوں کہ "احسان صاحب ... صرف شاعری میں ہی میرے استاد نہیں بلکہ میں نے ان سے جینا سیکھا ہے"

(بیسویں صدی جون ۱۹۸۰ء)

دوسروں کو درس حیات دینے کا حوصلہ وہی انسان کر سکتا ہے جس نے زندگی میں کبھی شکست محسوس نہ کی ہو اور یہ خصوصیت احسان دانش کی شخصیت کا جزو لاینفک تھی۔ ان کی حیات اور شاعری اردو ادب کا ایک اہم باب ہیں جن سے مردہ دلوں میں جوش حیات موجزن ہوتا ہے"

"آتش خاموش" "دارین" (بقیہ مجموعہ) "فصل سلاسل" "نوائے کارگر" "شیرازہ" اور "گورستان" ان کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ "جہان دانش" ان کی خود نوشت سوانح ہے جس نے جوش جیسے عظیم شاعر سے داد و تحسین وصول کی۔

اِن اوراق پریشاں کی ابتدا زندگی کے جس تضاد سے ہوئی تھی۔ یہیں احسان دانش کے حالات زندگی اور کارناموں میں وہ تضاد واضح نظر آتا ہے اور ان کے کارنامے یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ اگر انسان میں فطری صلاحیتیں موجود ہیں۔ اگر اسے جد و جہد کا سلیقہ ہے۔ اگر اسے اپنی راہ پر یقین کامل ہے تو وہ ہزاروں دشواریوں کے باوجود اپنی منزل تک ضرور پہنچ جائے گا۔ احسان دانش کی داستان حیات بے شک قطرے کے گہر بننے کی کہانی ہے۔

یہ اِدھر اُدھر یہ جہاں تہاں میری کاوشوں کے ہیں معجزے!
جہاں جا کے میں نے اذان نہ دی وہاں آج تک بھی سحر نہیں

---

محمد خالد عابدی، آل انڈیا ریڈیو اندور

# ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی سے ایک انٹرویو

**محمد خالد عابدی:** ہاشمی صاحب، آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے۔

**ہاشمی صاحب:** سندیلہ، ضلع ہردوئی (یوپی) میں۔ تاریخ ولادت یکم جولائی ۱۹۱۳ء مطابق ہائی اسکول سارٹیفکٹ۔

**محمد خالد عابدی:** کیا آپ کا اصل نام اور قلمی نام یہی ہے۔

**ہاشمی صاحب:** جی ہاں۔

**محمد خالد عابدی:** ہاشمی صاحب آپ کا سلسلۂ نسب کیا ہے؟

**ہاشمی صاحب:** سادات زیدی ہے۔

**محمد خالد عابدی:** آپ نے ڈاکٹریٹ کس زبان اور کس موضوع پر کیا ہے؟

**ہاشمی صاحب:** پی ایچ ڈی کا موضوع۔ دلی کا دبستان شاعری } اُردو
ڈی لٹ 〃 〃 〃 تدوین کلیات ولی

**محمد خالد عابدی:** کیا آپ کے بزرگوں میں بھی ادیب و شاعر گزرے ہیں؟

**ہاشمی صاحب:** موزوں طبعی ایک بڑے چچا اور دادا میں بھی تھی۔ کبھی کبھار، دو چار شعر کہے۔ باقاعدہ شاعری نہیں کی۔ دادا مولوی سید مظہر علی، نے نثر میں اپنی سوانح عمری مطبوعہ ۱۸۹۴ء یادگار چھوڑی، اس کے علاوہ ایک روزنامچہ (۹۰۰) صفحات غیر مطبوعہ ہے۔

محمد خالد عابدی:۔ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب اور کس طرح ہوا۔

ہاشمی صاحب:۔ پہلے رسالہ "غنچہ" (بجنور) میں بچوں کی ایک دو کہانیاں چھپیں غالباً ۱۹۲۱ء میں۔ پھر الناظر (لکھنؤ) میں ایک افسانہ غالباً ۱۹۲۹ء میں پھر رسالہ نگار (لکھنؤ) میں پہلا تنقیدی مضمون بعنوان شاعری اور بیکاری،

محمد خالد صاحب:۔ آپ کی پہلی تخلیق کس صنف میں تھی۔ اور وہ کہاں شائع ہوئی۔؟

ہاشمی صاحب پہلے ایک سیاسیات کی کتاب کا ترجمہ سیاسی نظریئے، کے نام سے حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا تھا۔

محمد خالد عابدی:۔ آپ کا پہلا ادبی رہنما کون ہے؟

ہاشمی صاحب:۔ حامد اللہ افسر میرٹھی صاحب مرحوم

محمد خالد عابدی آپ کی کتاب "ادب کا مقصد" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "علم عروض" سے بھی آپ کو دلچسپی ہے۔ تو علم عروض آپ نے شاعری کے لئے سیکھا تھا یا محض طلباء کو سمجھانے کے لئے۔

ہاشمی صاحب:۔ ایم اے (اردو) میں زیادہ نمبر حاصل کرنے کے لئے۔ کیوں کہ ایسے سوالات کے جوابات اگر صحیح ہوں تو پورے نمبر ملتے ہیں۔

محمد خالد عابدی:۔ علم عروض سیکھنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔

ہاشمی صاحب:۔ جو طریقہ میں نے اپنے مضمون شامل کتاب "ادب کا مقصد" میں پیش کیا ہے "

محمد خالد عابدی:۔ کیا شاعر کے لئے علم عروض جاننا ضروری ہے؟

ہاشمی صاحب:۔ جی نہیں۔

محمد خالد عابدی:۔ میری دانست میں آپ کا ڈراما "بھید" ہے کیا اس ڈرامے کے علاوہ بھی آپ نے ڈرامے لکھے ہیں۔

ہاشمی صاحب یہ ڈراما میرا نہیں، برناڈ شاہ کے ڈراما، کنیڈیڈا کا ترجمہ ہے۔ میں نے ابھی تک کوئی ڈرامہ نہیں لکھا۔

محمد خالد عابدی:- تو کیا آپ نے افسانے بھی لکھے ہیں۔

ہاشمی صاحب:- نہیں، صرف ایک افسانچہ لکھا تھا جو الناظر میں چھپا تھا اب اُس کا عنوان بھی یاد نہیں۔

محمد خالد عابدی:- کیا آپ اپنے کسی مضمون یا تخلیق وغیرہ کی شانِ نزول کے بارے میں بتانا پسند فرمائیں گے؟

ہاشمی صاحب: "ادب کا مقصد" میں میرے زمانۂ طالب علمی کے تمام مضامین ہیں، اس میں ایک مضمون کا عنوان ہے "اقبال کا نوجوان اور اس کی تعلیم" یہ مضمون مسلم یونیورسٹی یونین کے ایک انعامی مقابلہ میں انعام حاصل کرنے کی غرض سے عجلت میں لکھا گیا تھا لیکن انعام کے قابل ٹھہرا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔

محمد خالد عابدی:- آج جو اُردو میں تحقیقی کام ہو رہا ہے، کیا آپ اُس سے مطمئن ہیں؟

ہاشمی صاحب:- بعض جگہ بعض لوگوں نے بہت اچھا کام کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ پی ایچ ڈی کے لیے جو مقالے لکھے جا رہے ہیں ان میں سے بیشتر قابلِ اطمینان نہیں ہوتے۔

محمد خالد عابدی:- آپ بذاتِ خود تحقیق کے سلسلے میں کن اصولوں کو روا رکھتے ہیں؟

ہاشمی صاحب سوال تشریح طلب ہے کس قسم کی تحقیق، مختلف موضوعات، مختلف قسم کی تحقیق چاہتے ہیں اور ہر قسم میں جو اصول پیشِ نظر رکھے جاتے ہیں۔ ان میں فرق ہوتا ہے۔ بہرحال ہر محقق کے لئے ضروری ہے کہ اس میں تحقیق، کھوج اور تلاش کی لگن ہو، محنتی ہو اور با فراغت بھی ہو تاکہ وہ اطمینان سے کام کر سکے

محمد خالد عابدی آپ کے نزدیک اُردو میں مکتوباتی ادب کی کیا اہمیت ہے؟

ہاشمی صاحب اس سے مکتوب نگار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

محمد خالد عابدی:- ابھی تک جو مکتوباتی ادب پیش کیا گیا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں۔

ہاشمی صاحب:- جی ہاں کافی حد تک۔

محمد خالد عابدی:- مکتوباتی ادب کو مزید بہتر بنانے کے لئے آپ کی کیا صلاح و تجاویز ہیں۔

محمد خالد عابد:- مکتوب نگار خلوص کے ساتھ اپنے مکتوبات لکھے نمائش کے لئے نہیں۔ اور اگر یہ سمجھ کر لکھے کہ اُس کے خطوط شائع نہ ہوں گے۔ تو شاید وہ تکلف و تصنع راہ نہ پاسکے جو بیشتر مکتوباتی ادب میں نظر آتا ہے۔

محمد خالد عابدی:- آپ کے نزدیک ادب میں "انٹرویو" کی کیا اہمیت ہے۔؟

ہاشمی صاحب:- انٹرویو، میں اگر سوالات کی نوعیت اور ترتیب مناسب ہو تو اس سے انٹرویو دینے والے کے خیالات اور افتادِ طبع سے کماحقہ واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔

محمد خالد عابدی:- ہاشمی صاحب ابھی تک کی آپ کی مطبوعات۔۔۔؟

ہاشمی صاحب:- ۱- کلیات ولی (ترتیب و مقدمہ وغیرہ) انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی ۱۹۴۵ء

دوسرا ایڈیشن " " (پاکستان) ۱۹۵۴ء

۲- سیاسی نظریئے (ترجمہ) حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۴۲ء، دوسرا ایڈیشن یوپی اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۰ء

۳- دکنی کا دلستان شاعری (تحقیقی مقالہ) انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی ۱۹۴۹ء ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۶ء و ۱۹۷۳ء اردو اکاڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۶ء، یوپی اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۰ء

۴- ناول کیا ہے؟ (بہ شرکت ڈاکٹر احسن فاروقی)۔ تنقید، نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۵۱ء اس کے کئی ایڈیشن ناشر اب تک شائع کر چکا ہے۔

۵- کینڈیڈا (ترجمہ برنارڈ شا) حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۴۲ء نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۵۴ء

۶- ایک نادر روزنامچہ (ترتیب)، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء

۷- ادب کیا ہے؟ (تنقید) ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء ۱۹۶۳ء

اس کے علاوہ بھی اب تک کئی اڈیشن۔ شائع ہو چکے ہیں

۸ ۔ ادب کا مقصد (تنقید)، ۱۹۵۲ء، ۱۹۶۴ء اس کے علاوہ بھی اب تک کئی اڈیشن شائع ہو چکے

۹ ۔ نو طرز مرصع از محمد حسین عطا۔ (ترتیب مع مقدمہ) ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد

۱۹۵۸، ۱۹۸۱ء

۱۰ ۔ مثنوی طوطی نامہ از حسرت دہلوی (ترتیب مع مقدمہ) نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۱ء

۱۱ ۔ مثنوی سراپا سوز از محمد صادق خاں اختر (ترتیب مع مقدمہ) نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۱ء

ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۰ء

یوپی اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۷۹ء

۱۲ ۔ بکٹ کہانی (بہ شرکت ڈاکٹر مسعود حسین خاں (ترتیب مع مقدمہ وغیرہ) عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۶۵ء

۱۳ ۔ کلیات حسرت دہلوی (ترتیب مع مقدمہ وغیرہ) خود شائع کرایا۔ ۱۹۶۶ء

۱۴ ۔ ریختۂ ولی (ترتیب)، ۱۹۶۷ء اب تک ۴ اڈیشن شائع ہو چکے

۱۵ ۔ مزیدار قاعدہ بچوں کے لئے ایک مصور اور منظوم قاعدہ نسیم بکڈپو لکھنؤ ۱۹۶۰ء

ﷺ

از اسلام اشرف - ریسرچ سکالر
راجستھان یونیورسٹی
جے پور

# سلسلہ غالب کے ایک باکمال شاعر
# مولانا کوثر سندیلوی

راجستھان کی راجدھانی جے پور کو یہ فخر حاصل ہے کہ انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے جب دہلی کے پرانتشار حالات نے وہاں اہل ادب کے لئے عرصہ زندگی تنگ کردیا اور وہ ترک وطن کرکے مختلف مقامات پر تلاش سکون و معاش کے لئے پہنچنے لگے تو راجستھان میں آنے والے زیادہ شعراء نے جے پور کو سکونت کے لئے منتخب کیا۔ چنانچہ سلسلہ غالب کے نمایاں شعراء جنھوں نے راجستھان کی طرف رخ کیا جے پور آکر سکونت پذیر ہوئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ظہیر، انور، آگاہ، راقم وغیرہ جیسے شعراء کا مسکن جے پور بنا اور جس طرح ولی دکنی نے دہلی میں شعر و ادب کا ماحول پیدا کیا تھا۔ اسی طرح ان حضرات نے جے پور کو شعر و ادب کا گہوارہ بنا دیا اور بقول مولوی عبدالحق لوگ جے پور کو چھوٹی دلی کے نام سے یاد کرنے لگے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر مختصراً یہ بتا دیا جائے کہ جے پور میں انیسویں صدی کا پہلا نصف حصہ ختم ہوتے ہوتے مولانا رشید الدین فائز شعر و ادب کی شمع روشن کرچکے تھے اور ان کے بھانجے مولانا سلیم الدین تسلیم کی صدارت میں راجستھان کی پہلی بزم ادب قائم ہوئی تھی۔ جس کے زیر اہتمام ماہانہ طرحی مشاعرے پابندی سے منعقد کئے جاتے تھے جن میں ہندو اور مسلم شعراء بلا تفریق مذہب و ملت شرکت کرتے تھے

ان شعراء میں بیشتر مولانا فائز اور مولانا تسلیم ہی کے شاگرد تھے۔ اسی بزم ادب کے چار سالہ مشاعروں کا مجموعہ "فرحت الشعراء" کے نام سے منشی کندن لال نے مرتب کیا تھا جو مولانا تسلیم ہی کے شاگرد تھے۔ فرحت الشعراء پر ایک تفصیلی مضمون راجستھان اردو اکاڈمی کے سہ ماہی جریدے نخلستان میں" راجستھان کا اولین گلدستہ سخن کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جے پور میں ایک ایسا ادبی ماحول بن گیا تھا جس کو دہلی سے آنے والے شعراء نے اپنے لئے سازگار پایا اور اسی لئے جو لوگ جے پور آئے زیادہ تر یہیں کے ہو رہے سلسلہ غالب کے نمایاں شعراء میں جہاں ایک طرف آگاہ کا سلسلہ شروع ہوا وہیں دوسری طرف حضرت انور کے ذریعہ غالب کے تلمذ کا سلسلہ شروع ہوا۔ انور کے ہی شاگرد مرزا مائل تھے جو کہ جے پور میں استاد الاساتذہ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ مرزا مائل کے شاگردوں میں آنجہانی طوطی راجستھان منشی چاند بہاری لال صبا کا نام محتاج تعارف نہیں۔ مولانا کوثر بھی مائل ہی کے شاگرد تھے۔ اور ایسے بے مثل شاگرد کہ جانشین مائل طوطی راجستھان صبا بھی جب تک مولانا کوثر حیات رہے، مشاعرے میں اپنی غزل سنانے سے پہلے انھیں ضرور سنایا کرتے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت کوثر کے ذریعہ ہی مرزا صاحب کا سلسلہ تلمذ جاری رہا۔

مولانا محمد منظور کوثر اودھ کے معروف قصبہ سندیلہ ضلع ہردوئی میں ایک علم و فضل زہد و تقویٰ میں معروف خاندان کے فرد مولانا وارث علی کے گھر ۱۱ مارچ ۱۸۹۶ء کو بمقام آگرہ پیدا ہوتے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ماموں شیخ جاوید علی عباسی کاکوروی کے پاس فیروز پور جھرکہ میں مکمل کی مولانا کوثر کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ لہذا موزونیٔ طبعیت کے باعث دس گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ ابتداء میں نالاں تخلص کرتے تھے لیکن جب تسنیم نارنولوی سے آپ کے دوستانہ بلکہ برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے تو ان کی مناسبت سے کوثر تخلص اختیار کیا۔ دونوں کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دن دونوں میں طے پایا کہ دونوں اپنی اپنی ولادت کا مادہ تاریخ صرف دو لفظوں سے نکالیں اس پر مولانا کوثر بولے میں نے تو خستہ جگر نکال لیا ابھی وہ بات مکمل بھی نہ کر پائے تھے کہ تسلیم صاحب بولے میں نے سوختہ جگر

نکال لیا ہے۔

مولانا تقریباً ۸۲ سال کی عمر میں جے پور آئے اور پھر تا وقت مرگ جے پور میں ہی سکونت پذیر رہے آپ کے رشتے کے بھائی منشی معشوق علی صاحب علوی سر رشتہ دار نے آپ کی طرف سے ایک درخواست دیکر معلم اردو فارسی کے عہدے پر رکھوا دیا۔ پہلے چاند پول مڈل سکول میں اور پھر اورینٹل کالج میں معلم رہے حالانکہ ملازمت کی پابندیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حسن لیاقت کے صلے میں ترقی ملی تو بجائے خوش ہونے کے رنجیدہ ہوئے اور فرمایا معلوم ہوتا ہے میرے توکل میں خلل واقع ہو گیا۔

مولانا ایک صوفی منش انسان تھے کبھی بیمار ہوتے تو دوا ہرگز نہ کرتے تھے بلکہ طبیب سے نسخہ لیتے۔ دوا فروش سے قیمت دریافت کرتے اور اس رقم کو کسی محتاج کو دیدیتے خود فاقہ کر لیتے۔ اسی طرح امراء سے ملنے میں آپ کو ہمیشہ تکلف رہا۔ راجہ امر ناتھ اٹل صاحب وزیر مالیات جے پور نے آپ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ کار بھیج کر بلوایا مگر آپ مکان ہی سے روپوش ہو گئے۔

کوثر صاحب نہایت کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے آپ نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی مگر افسوس کہ درویشانہ زندگی اور نام و نمود سے بچنے کی خواہش کی وجہ سے کلام محفوظ رکھ نہ سکے بعد وصال جو کلام دستیاب ہوا وہ بہت ہی قلیل تھا۔ یہ سرمایہ کم و بیش چند متفرق اشعار سات نعتیں اور گیارہ رباعیات پر مشتمل ہے۔ لیکن ان کے زبان پر چڑھے اور دلوں میں اترے اشعار ہی ان کی شاعرانہ عظمت اور بقا کے ضامن بن گئے۔ آپ کی زبان نہایت صاف شستہ اور آب کوثر میں دھلی ہوئی ہے۔ تغزل کی پاکیزگی بندشوں کی چستی ترکیبوں کی خوشنمائی کے علاوہ آپ کا کلام سلاست روانی اور برجستگی کی خصوصیات سے مالامال ہے۔ سلاست اور روانی کی مثال دیکھئے۔ ؎

وفا ہم نے کی ناسزا ہو گئی
جفا آپ نے کی روا ہو گئی

ہم ہیں اور گوشۂ تنہائی ہے
تم ہو اور انجمن آرائی ہے
راز کھل جائے نہ کوثر دیکھو
اتنی خاموشی بھی گویائی ہے

آپ کے یہاں جہاں ایک طرف جوش سوز و گداز اور تصوف ملتا ہے وہیں دوسری طرف سب سے اہم خصوصیت کشش اور اثر ہے درج ذیل اشعار اس کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

مری خود رفتگی دیکھو کہ منزل پر پہنچ کر بھی
ہر اک سے پوچھتا پھرتا ہوں کتنی دور ہے منزل

ہمیں اے چرخ ضبط سوز دل منظور ہے ورنہ
دکھا دیتے تجھے نالوں میں کیا تاثیر ہوتی ہے

ہماری خامشی سے درد پنہاں آشکارا ہے
ہماری بے زبانی کہہ رہی ہے داستاں غم کی

اور حقیقت یہ ہے کہ آپ حسرت و یاس کا مرقع محرومی اور ناکامی کی تصویر تھے ہر وقت کسی خیال میں محو رہتے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے لبوں پر مہر لگا دی ہے آپ کے کلام میں جو زبان کے اشعار ملتے ہیں ان کی لطافت اور شیرینی پر تو بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے ؎

دل لگا کر جان کے لالے پڑے
میرے آگے آ گیا میرا کیا

داد کیا ملتی میری فریاد کی
داور محشر اسے دیکھا کیا

خوشا قسمت کہ وہ تصویر بن کر آ رہے ہیں غم کی
خدا نے آبرو رکھ لی ہماری بزم ماتم کی

کوثر صاحب کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مرزا مائل دہلوی

مرحوم علامہ کیفی دہلوی حضرت سائل دہلوی مرحوم مولانا حسرت موہانی مرحوم اور مولانا اطہر ہاپوڑی مرحوم جیسے استادان سخن آپ کی شعر فہمی کے معترف تھے۔ نفیس سندیلوی موج کوثر میں لکھتے ہیں کہ مولانا اطہر ہاپوڑی مرحوم نے ارشاد فرمایا کہ

"میں بڑے بڑے سخن فہم اور مشہور استادوں کی صحبت میں مدتوں رہا مگر مولانا کوثر جیسا سخن فہم میری نظر سے نہیں گزرا وہ شعر کا صحیح اور پاکیزہ مذاق اور وجدان سلیم رکھتے تھے۔

تذکرہ شعراء جے پور میں مولوی احترام الدین صاحب شاغل لکھتے ہیں۔

"مرزا مائل صاحب کا تو آخر زمانے میں یہ دستور سا ہو گیا تھا۔ کہ اپنی تازہ غزل جب تک کوثر کو نہ سنا لیں چین نہ آتا۔ ہوتا یہ تھا کہ مرزا صاحب اپنی غزل پڑھنا شروع کرتے آپ آنکھیں بند کئے بغور سنتے اور اس میں محو ہو جاتے جو شعر پسند آتا اس کی داد "ہوں" اور سیر کے اشارے سے دے دیتے اور جو ناپسند آتا اس کے لئے "اوں ہوں" کہہ کر منہ بنا لیتے"

مولانا ایک کثیر التلامذہ اور نامور شاعر تھے۔ شہر جے پور میں آپ سے مشورہ سخن کرنے والوں کی تعداد بھی اگرچہ بہت زیادہ ہے مگر جن لوگوں کو آپ کا قرب حاصل رہا۔ ان میں پارسا کوثری، پنڈت چاند نرائن تکو مہر، بھنور سنگھ نازش، منظر اور نوجوان شعراء میں حسین کوثری کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مرحوم شاگردوں میں عبدالغفور شیدا۔ ذوالفقار علی وفا افتخار علی شمیم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ غرض کہ دبستان دہلی کا وہ رنگ سخن جو حضرت انور کے ذریعہ جے پور پہنچا تھا۔ اُسے مرزا مائل نے چمکایا اور اس کے رنگ و بو سے جے پور کے ادبی ماحول کو مہکایا وہی رنگ سخن حضرت کوثر کے توسط سے جے پور کی فضا میں پھلتا پھولتا رہا اور پھیل رہا ہے۔

* * *

ڈاکٹر رتن چند اشر
گول بازار سری گنگانگر

# آنکھیں

انسان کے چہرے پر آنکھیں پرماتما کی سب سے پیاری اور پُرکار دین ہیں۔ یوں تو ناک، کان زبان اور ہونٹ بھی اپنی اپنی جگہ بہت خوب اور کارآمد ہیں، مگر آنکھ کا مقابلہ نہیں۔ کان صرف سن سکتا ہے (زیور تو افزائش حسن کا ایک جزو ہے) ناک سونگھ سکتی ہے اور چھینک کے ذریعے مضر ذرات کو باہر پھینک سکتی ہے زبان بولنے کے علاوہ ذائقہ ہی بتا سکتی ہے۔ مگر آنکھ ایک کثیر الافعال آرگن ہے جو دیکھنے کے علاوہ اور کئی کام کرسکتی ہے، بلکہ زبان کا کام بھی دے سکتی ہے، بقول شاعر۔

ہوتا ہے راز عشق و محبت انہی سے فاش
آنکھیں زبان نہیں ہیں مگر بے زبان نہیں

یا

دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے اُن سے کہدی
بات چل نکلی ہے۔ اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

شرم و حیا کے اظہار کے ساتھ ساتھ آنکھ کئی قسم کے بے حجابانہ، اشارے بھی کرسکتی ہے آدمی کے متنوع باطنی جذبات کی بھی عکاسی کرنے کی اہل ہے، مثلاً خوف، غصہ، نفرت محبت، حیرت وغیرہ، انسان کے دل میں کسی طرح کا دکھ ہو یا جسم میں کہیں بھی کوئی درد ہو

تو آنکھ ہی شریک غم ہو کر آنسو بہاتی ہے۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ — اقبال

اور بعض غم بھی اتنے جانگداز ہوتے ہیں کہ آنکھوں ہی کو لے بیٹھتے ہیں۔ جیسے اپنے عزیز بیٹے کی جدائی کے غم میں حضرت یعقوب علیہ السلام پر بیتی۔

آنکھوں کے بغیر دنیا کے بیشتر فنونِ لطیفہ تشنۂ تکمیل بلکہ تخلیق رہتے۔ یہ بڑے بڑے عجائب گھر، کتب خانے اور آرٹ گیلریاں سب آنکھوں کی بدولت وجود میں آئے۔ گو بعض حضرات کہہ سکتے ہیں کہ سورداس اور ملٹن نے نابینا ہوتے ہوئے بھی لافانی شعری ادب کی تخلیق کی مگر یہ مثالیں تو قاعدہ کو ثابت کرنے کے لئے استثنا کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن اشرف المخلوقات کہلانے والے انسان نے اس خوبصورت نعمت پر کیا کیا ظلم توڑے ہیں۔ آئیے اس کی کچھ جھلکیاں دیکھتے چلیں۔ آنکھوں پر سب سے زیادہ اور دردناک مظالم سلطنت اور اقتدار کی کش مکش میں ڈھائے گئے۔ راج پاٹ کے جھگڑوں اور تاج و تخت کی چھینا جھپٹی میں یوں تو ہر طرح کے ظلم و ستم اور زیادتیاں ہوتی رہی ہیں۔ بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا۔ بیٹے نے باپ کو مروایا، یا قید کیا۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو محض اس لئے کال کوٹھڑیوں میں ڈالا گیا۔ کہ ان کی رگوں میں شاہی خون کی آمیزش تھی اور کسی بھی اندیشۂ دور دراز کے تحت وہ تخت کے دعویدار بن سکتے تھے۔ بھائی بہنوں کے درمیان مخاصمت چلی اور ایک دوسرے کو ذلیل و خوار کیا گیا۔ وغیرہ۔

ویسے تو یہ اقتدار کی جنگ انسانی تاریخ کے ہر دور میں ہوتی آئی ہے۔ مہا بھارت کال میں بھی کوروں پانڈوں کے درمیان حصول سلطنت کی لڑائی میں دغا فریب اور اوچھے ہتھیار استعمال کئے گئے۔ بات میں بات نکل آئی ہے جسے سن کر آپ حیران ہوں گے کہ سمراٹ اشوک جس کو ہم آج تک نیک، رحمدل، اہنسا کا پجاری اور ایک مثالی حکمراں سمجھتے ہیں، اس نے تخت پر قابض ہوتے ہی اپنے بھائیوں کو کنویں میں دھکیل کر مروایا۔ یہ کنواں اب تک آگم کنواں کے نام سے قدیم پٹنہ (پاٹلی پتر) کے کھنڈرات میں موجود ہے۔ مگر حکومت اور جانشینی کی

کشمکش میں مخالفین کی آنکھوں میں گرم سلائیاں یا نشتر پھیرنے کا رواج قرونِ وسطیٰ ہی میں شروع ہوا۔ اور مغلیہ دور میں یہ کافی عام ہو گیا تھا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل امثال سے ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ بابر کے تین بیٹے ہمایوں۔ کامران اور ہندال ہندوستان، کابل اور غزنی کے حاکم تھے۔ کامران نے ہندوستان پر حکومت کرنے کے خواب دیکھنے شروع کئے اور اس مقصد کے لئے طرح طرح کی سازشیں اور فتنے برپا کئے مگر تقدیر نے یاوری نہ کی۔ آخر کار پکڑا گیا۔ ہمایوں نے پہلے تو کافی نرم دلی سے کام لیا۔ مگر امراء کے اصرار پر اس کی آنکھوں میں پچاس بار نشتر لگائے جانے کا حکم دینا پڑا۔ اور اس کے بعد اس کی زخمی آنکھوں میں لیموں کا رس نچوڑ کر نمک چھڑکا گیا۔ جس سے تڑپ تڑپ کر وہ اندھا ہو گیا۔

۲۔ ابوالقاسم شوکتی مرزا کامران کا بیٹا تھا۔ جسے اکبر کی تخت نشینی کے وقت گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ اور ازاں بعد اس کی آنکھیں بھی خراب کرا دی گئیں۔ پھر جب اکبر کے سوتیلے بھائی مرزا حکیم نے بغاوت کی تو احتیاطاً اکبر نے راجہ بھگوان داس کے ذریعے اس کا کام تمام کروا دیا۔

۳۔ شہریار۔ جہانگیر کے بیٹوں میں سے خسرو اور پرویز پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ شاہجہاں اور شہریار دونوں تخت کے دعویدار تھے۔ شہریار کے حق میں نور جہاں تھی۔ جس کی پہلی (شیر افگن سے) بیٹی لاڈلی بیگم، اس سے بیاہی ہوئی تھی۔ شاہ جہاں کے حق میں آصف خاں تھا۔ جس کی بیٹی ارجمند بانو شاہ جہاں کی بیگم تھی۔ (جو بعد میں ممتاز محل بنی) ان دونوں فریقین میں کئی سازشیں اور داؤ پیچ ہوئے مگر پلڑا شاہ جہاں کا بھاری رہا۔ شہریار شکست کے بعد لاہور کے قلعے میں چھپ گیا جہاں سے آصف خاں نے۔ اسے پکڑوا کر خنجر سے اس کی آنکھوں کی پتلیاں کٹوا دیں، شہریار اچھا شاعر تھا۔ چنانچہ اس المناک واقعہ سے متعلق اس نے ایک فارسی شعر کہا۔

زنرگس گلاب ارچہ نتواں کشید
کشیدند از نرگسِ من گلاب

ہوار۔ شاہجہاں کی زندگی ہی میں وراثت کی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ چار بیٹوں میں
سے دارا بادشاہ کو زیادہ عزیز تھا۔ اس لئے اُسے اپنے پاس رکھا تھا۔ جبکہ اورنگ زیب
کو دکن۔ شاہ شجاع کو گجرات اور مُراد کو بنگال میں تعنیات کیا ہوا تھا۔ اورنگ زیب نے چالاکی
سے مُراد کا صفایا کیا۔ پھر دارا کو جھانسا دیکر اپنے ساتھ ملایا اور شجاع کو لڑائی میں شکست دے کر
مارا اس کے بعد چیلے بہانے سے دارا کو اپنے خیمے میں بُلایا۔ اور برادرانہ شفقت دکھا کر اُسے
قید کر لیا۔ بعد ازاں اپنے ایک معتمد سے اُس کی آنکھیں نکلوادیں اور آخر میں اُس پر کفر
کا فتویٰ لگوا کر قتل کروا دیا۔

۵۔ فرخ سیر:۔ اپنے بڑے بھائی جہاندار شاہ کو قتل کرانے کے بعد سیدزادوں
کی مدد سے تخت پر بیٹھا۔ پہلے تو سیدزادوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رہا۔ بعد ازاں
ایک خوبصورت کنیز زہرہ کی وجہ سے اُن کے خلاف ہو گیا۔ اور میر جُملہ کی مدد سے دونوں
بھائیوں کو علیحدہ کر کے اُن کی طاقت کو ختم کرنا چاہا۔ حسین علی کو اودھ کا صوبے دار بنا کر دہلی
سے باہر بھجوا دیا پھر ایک سردار کو اس کا خاتمہ کرنے کے لئے مامور کیا۔ مگر سازش پکڑی
گئی اور حسین علی اپنی فوج لیکر دہلی کو لوٹا ادھر عبداللہ نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ فرخ سیر
گھبرا کر حرم سرا میں اپنی ماں کی گود میں جا چھپا مگر وہاں سے پکڑ کر تر پولیا میں قید کر دیا گیا۔
جہاں سے اس نے گارد والوں کے ذریعے سوائی جے سنگھ کی مدد حاصل کرنا چاہی۔ مگر اُن لوگوں
نے عبداللہ کو بتا دیا جس نے زہرہ کے سامنے فرخ سیر کی آنکھوں میں سلائیاں پھروادیں۔
بعد میں اُسے ہلاک کرنے کے لئے دو مرتبہ زہر دیا گیا۔ مگر اپنی سخت جانی کی وجہ سے بچ گیا تو
بالآخر عبداللہ کے خنجر نے اُسے ابدی نیند سُلا دیا۔

۶۔ شاہ عالم ثانی:۔ اس کی حکومت اور طاقت کو ایک طرف مرہٹوں نے تو دوسری
جانب کمپنی بہادر نے کمزور۔ بلکہ کھوکھلا کر دیا تھا۔ انہی دو متضاد طاقتوں کے رحم و کرم سے
اس کی بادشاہت قائم تھی۔ جس کے بارے میں کسی مسخرے نے یہ پھبتی موزوں کی تھی کہ "سلطنت
شاہ عالم از دہلی تا پالم"، شاہ عالم دوئم کی حکومت کے دوران ایک روہیلے سردار نے تحفظ کا

جھانسہ دیکر اصلی طاقت اپنے ہاتھ میں سعلی اور وہ وزیر اعظم اور امیر الامرا بن بیٹھا یہی ظالم غلام قادر روہیلہ تھا جس نے بادشاہ اور بیگمات کو طرح طرح سے لوٹنا شروع کر دیا۔ جب خزانہ بالکل ہی خالی ہو گیا ——————

تو غلام قادر نے سوچا کہ شاہ عالم نے لال قلعہ میں کسی جگہ خزانہ چھپا رکھا ہے جسے حاصل کرنے کے لئے اُس نے بوڑھے بادشاہ اور اُن کی بیگمات پر بے پناہ ظلم کئے۔ جب مزید کچھ ہاتھ نہ لگا۔ تو ایک دن بادشاہ کو دھمکی دی کہ اگر خزانے کا پتہ نہیں بتاؤ گے۔ تو تمہاری آنکھیں نکال لی جائیں گی۔ جواباً بادشاہ نے کہا کہ ظالم جن آنکھوں نے ساٹھ سال تک کلام پاک پڑھا ہے انہیں نکال کر تیرے ہاتھ کیا آئے گا۔ اس پر روہیلے کا پارہ چڑھ گیا۔ اُس نے شاہ کو زمین پر گرا لیا اور اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور اپنے خنجر کی نوک سے بادشاہ کی ایک آنکھ کا ڈھیلا نکال دیا۔ دوسرے کے لئے پاس کھڑے ہوئے ایک درباری کو تعمیل کا حکم دیا۔ جب اُس نے انکار کیا تو اس کا سر قلم کر دیا۔ جس سے ڈر کر اس کے ساتھیوں نے بادشاہ کی دوسری آنکھ بھی نکال دی۔ اور آنکھوں کے گڑھوں میں نمک ڈالا گیا۔ پھر اندھے بادشاہ کو زنداں میں قید کر دیا۔ جہاں سے بالآخر مادھو راؤ سیندھیا نے اُسے نکالا۔ شاہ عالم ثانی بھی اچھا شاعر تھا۔ اور ایک پُر درد فارسی نظم کی شکل میں اُس نے اپنی آنکھوں کا مرثیہ بھی لکھا تھا۔ اور ایک پُر درد شعر اس سلسلے میں ایک اور شاعر نے بھی کہا تھا ؎

روہیلہ کس قدر ظالم جفا جو کینہ پرور تھا
نکالیں آلِ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے

جب میں تاریخ کے یہ اوراق پڑھتا ہوں جن میں مخالفین کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیرنے یا انہیں نوکِ خنجر یا نشتر سے تباہ کرنے کا ذکر آتا ہے تو مجھے نفرت اور خوف کی ملی جلی جھرجھری سی آنے لگتی ہے۔ اور میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ کتنے زبردست ایذا پرست تھے جو ایسی سزائیں دیکر اپنی راہ ہموار کر کے خوش ہوتے تھے۔ غالباً میر نے بھی انہی واقعات سے متاثر ہو کر یہ حزنیہ شعر کہا تھا۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی!
انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

ہندوستان سے باہر امریکہ کے آبائی لوگوں ریڈانڈین میں بھی ایسی انتقامی ایذا دہی کی روایت ملتی ہے جس کا ذکر ایک امریکی مصنف نے اپنے ناول "کارپیٹ بیگرز" میں کیا ہے گورے آباد کاروں اور ان لوگوں کے بیچ جھڑپوں کے دوران اگر کچھ گورے ان ریڈانڈینز کے ہاتھوں قید کر لئے جاتے تھے۔ تو ان کو کچھ اس طرح سے سزا دی جاتی تھی۔ کہ جنگل میں زمین پر چت لٹا کر ان کے ہاتھ پاؤں میں صلیب کی صورت میں کیلیں گاڑدی جاتی تھیں پھر ان کے جسم کے نازک حصوں خصوصاً آنکھوں کے پپوٹوں پر چھری سے چرکے لگا کر ان پر شہد مل دیا جاتا تھا۔ جس کی خوشبو پر آکر جنگل کی سرخ چیونٹیاں انہیں توڑ توڑ کر کھاتی رہتیں تا آنکہ تڑپ تڑپ کے ان کا دم نکل جاتا۔ اب ذرا ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر حال کی روشنی میں آیئے۔ یہاں بھی کچھ ایسے اندھیرے گوشے مل جائیں گے۔ جہاں آنکھوں پر توڑے گئے مظالم کی داستان کم المناک نہیں اور جہاں بیسویں صدی کی ترقی جمہوریت اور مساوات از حد شرمسار مگر بے بس ہے۔

بہار کے ضلع بھاگلپور میں پولیس اور جیل ادھیکاریوں کی ملی بھگت سے درجنوں قیدیوں کی جن میں کچھ زیر سماعت بھی تھے۔ آنکھوں میں نشتر پھیر کر اور لیموں یا تیزاب وغیرہ ڈال کر بینائی سے محروم کر دیا گیا۔ شرم اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اس سازش میں ایک دو ڈاکٹر بھی ملوث بتائے گئے، مانا کہ وہ قیدی مجرم تھے۔ لیکن موجودہ زمانے میں جب جرم و سزا کا نفسیاتی مطالعہ و محاسبہ کیا جا رہا ہے۔ ایسی قرونِ وسطیٰ کی سی سزائیں دینا سراسر ناجائز بلکہ قابل مواخذہ ہے۔

اسی طرح بھرت پور کے دیہات میں کچھ نیم حکیم قماش کے لوگ آئی سرجن کا لبادہ پہن کر نازل ہوئے اور سادہ لوح دیہاتیوں کو موتیابند سے نجات دلانے کے کیمپ لگا کر نہ صرف اچھی خاصی رقم بٹوری بلکہ ان غریبوں کو اندھے بنا کر رفوچکر ہو گئے اخباروں میں کافی چرچا ہوا۔ اور حزب مخالف نے بھی شور و غوغا کیا۔ چونکہ آنکھ کے

ساتھ گھن پسنے کے مصداق، بدنامی ڈاکٹروں کی ہو رہی تھی۔ اس لئے محکمۂ صحت کے حکام حرکت میں آئے اور تفتیش کی رسمی پردہ پوشی کے بعد آئندہ کے لئے بلا اجازت ایسے کیمپ لگانے پر کچھ بندشیں لگا دیں مگر اس "زود پشیمانہ" کارروائی سے پہلے ہی وہ ظالم بوچڑ پنجاب کے انتہا پسندوں کی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ غریبوں کی آنکھیں ماری گئیں اور حکام حضرات سانپ کی لکیر کو پیٹتے رہ گئے۔ مگر اس تمام المیئے میں کچھ دوش ہمارے عوام کا بھی ہے کہ سرجری کے اس حیرتناک دور میں، جبکہ راجستھان کے لئے ہسپتالوں میں بھی آنکھوں کی خاص پیوندکاری کے ذریعے اندھوں کی بصارت بحال کی جا رہی ہے، یہ لوگ ان بدقماش، آنکھ پھوڑا جراحوں کے جھانسے میں آ جاتے ہیں اور بعض اوقات دونوں آنکھوں کی بینائی گنوا بیٹھتے ہیں۔ پھر اپنی سوجھ بوجھ کے بجائے قسمت کو کوستے رہتے ہیں، اس کا سبب غریبی سے زیادہ لاعلمی ہے جو یہ لوگ قدرت کی عطا کردہ اس نایاب بے بہا کو ہر کہ و مہ کے آگے سپرد جراحت کر دیتے ہیں جبکہ دیگر اعضاء جسمانی کی بہ نسبت اسے بحفاظت تمام رکھنا چاہئے۔ اور آنکھوں کو ایسی اہمیت دینی چاہئیے۔ جس کا اظہار اس ہندی دوہے میں کیا گیا ہے۔

کاگا سب تن کھائیو۔ چن چن کھائیو ماس
دو نین مت کھائیو، پیا ملن کی آس

❖ ❖ ❖

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں
(اقبال)

احتشام اختر کا دوسرا شعری مجموعہ

# نیلا آکاش

جدید شاعری کی معتبر آواز

(ملنے کا پتہ)

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹، گولہ مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی

# منظومات

اختر شاہجہاں پوری

# خیر البشر اللہ اللہ

جب آقا کی ہوگی نظر اللہ اللہ
شبِ غم کی ہوگی سحر اللہ اللہ

شرفِ باریابی کا بخشا ہمیں بھی
صبا کب یہ دے گی خبر اللہ اللہ

بنے غازۂ رخ تمنا ہے میری
مدینے کی گردِ سفر اللہ اللہ

بفیضِ محمد شرف یہ ملا ہے
فرشتوں سے افضل بشر اللہ اللہ

امین اور صادق ہیں یٰسین و طٰہٰ
خطاباتِ خیر البشر اللہ اللہ

مدینے کے ذرّات سے نور لے کر
چمکتے ہیں شمس و قمر اللہ اللہ

فلک سے بھی ہے مرتبے میں جو عالی
وہ روضہ وہ منبر وہ گھر اللہ اللہ

نہائے ہوئے نور ہی نور میں ہیں
مدینے کے وہ بام و در اللہ اللہ

وسیلے سے آقا کے مانگو جو اختر
دعا میں وہ ہوگا اثر اللہ اللہ

احتشام اختر

# غزل

ہمارے غم کی رعنائی بس ان کی اک نہیں تک ہے
کہ اس خاتم کی زیبائش گراں قیمت نگیں تک ہے

یہ وہ قطرے نہیں جو گوہرِ نایاب بن جائیں
ان اشکوں کی رسائی تو ہماری آستیں تک ہے

کھنڈر ہو جائیں گے دیوار و در یہ اس کے جاتے ہی
مکانِ دل کی آرائش اسی کا تو مکیں تک ہے

جو نظریں پھیر لیں اس نے تو پھر یہ سوکھ جائے گا
نہالِ دل کی شادابی نگاہِ سرمگیں تک ہے

گزرگاہِ حقائق میں ہمارا ساتھ مشکل ہے
جہاں ہے موڑ خوابوں کا ہماری حد وہیں تک ہے

٭

فریاد آزر
شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر نئی دہلی

# غزل

الگ سے نالاں تھے فرشتے، وہ خفا کس سے تھا
اختلاف اُس کا دعاؤں کے سوا کس سے تھا

یوں تو محفوظ ہے ذہن میں لاکھوں الفاظ
یاد آیا نہیں دروازہ کھُلا کس سے تھا

میرے بارے میں بڑی رائے غلط تھی اُس کی
جانے وہ میرے تصور میں ملا کس سے تھا

گر نہیں اس نے مٹایا تو مٹایا خود کو
ہم اُسی سے تھے یقیناً وہ جدا کس سے تھا

جانے تا عمر اُسے کس نے اکیلا رکھا
جانے اس شخص کا پیمان وفا کس سے تھا

جانے اس شخص کا پیمان وفا کس سے تھا

وہ اگر دور تھا مجھ سے تو تھی قربت کس سے
وہ مرے ساتھ اگر تھا تو جُدا کس سے تھا

لاکھ شکوہ ہو سماعت کو صدا سے آزر
دکھ کا کون کہے، کوئی رُکا کس سے تھا

غیر مطبوعہ

# قطعہ بند اشعار پر مشتمل ایک غزل

اہلِ دانش کا کہتن اپنی جگہ — اور میرا بانکپن اپنی جگہ
چل رہا ہوں سوئے منزل تیز گام — زندگی کی تھکن اپنی جگہ
رنگ و بوئے یاسمن اپنی جگہ — تیرا چندن کا بدن اپنی جگہ
تو پری پیکر ہے مہ وش خوبرو — ہے ہمارا حسنِ ظن اپنی جگہ
دردمندی کی لگن اپنی جگہ — اہلِ دنیا کا چلن اپنی جگہ
ہو بھلا دنیا کا یارب ہو بھلا — ہم تو رہتے ہیں مگن اپنی جگہ
ہیں مرے شعر و سخن اپنی جگہ — اور ہے من کی یتن اپنی جگہ

شاعری میراث تو میری نہیں
ہے فضاؔ یہ اپنا فن اپنی جگہ

---

# چھوٹی بحر میں چھوٹی سی غزل

بات کی بات ہے — وہ میرے ساتھ ہے
دور منزل کہاں — ہاتھ میں ہاتھ ہے
پاس بیٹھو ذرا — چاندنی رات ہے
وہ بھی چپ میں بھی چپ — کیا ملاقات ہے
ٹپکے آنسو مرے — سمجھے برسات ہے
دل پگھل جائے گا — مانا اسپات ہے

تو تو تو ہے فضاؔ
تیری کیا بات ہے

# غزل

مخمور عباسی سنبھلی
ایم اے علیگ بی ایڈ

تم سے چھٹ کر تجربہ یہ بھی ہمیں کرنا پڑا
موت آئی تک نہیں اور بارہا مرنا پڑا

زندگی کے میکدے میں پیاس جب حد سے بڑھی
جام خود اپنے لہو سے ہی ہمیں بھرنا پڑا

پھر گیا آنکھوں میں ماضی کے تعلق کا سماں
جب مِلا نزدیک سے کوئی مجھے ڈرنا پڑا

گھر کے اے دُنیائے دوں! تیرے غلط ماحول میں
جو نہ کرنا تھا مجھے وہ کام بھی کرنا پڑا

تھے گلِ تر جن کی قسمت کے وہ چن کر لے گئے
اپنا دامن خشک کانٹوں سے ہمیں بھرنا پڑا

صرف اِس اُمید پر ہو جائیگا ہلکا سفر
کس قدر سامانِ ہستی کم ہمیں کرنا پڑا

لوگ تو مخمور سن کر میری شہرت جل گئے
یہ بھی سوچا فن کی خاطر کیا مجھے کرنا پڑا

# غزل

سوز باندوی

کوئی بھی ادا تو بہ شکن کم نہیں ہوتی
شوخیٔ غزالانِ ختن کم نہیں ہوتی

تم کو مری تکلیف کا احساس کہاں ہے
ٹوٹے ہوئے کانٹوں کی چبھن کم نہیں ہوتی

اقبال نے ہر ذرہ کو اک دیوتا مانا
کچھ بھی ہو مگر خاکِ وطن کم نہیں ہوتی

یہ مقصدِ ہستی ہے یہ جینے کا سہارا
اُمید کی اے دوست کرن کم نہیں ہوتی

منزل مجھے مل جائے گی یہ کیسے کہوں میں
درماندہ مسافر ہوں تھکن کم نہیں ہوتی

اے گردشِ ایام بتا کیسے جئیں ہم
حالات کے ماتھے کی شکن کم نہیں ہوتی

موسم ہو بہاروں کا کہ وہ دورِ خزاں ہو
پاکیزگیٔ صحنِ چمن کم نہیں ہوتی

یہ کیسی نگاہوں سے مجھے آپ نے دیکھا
اے سوز مرے دل کی جلن کم نہیں ہوتی

جام کوٹی

## غزل

توبہ کا جب ارادہ کیا بادہ خوار نے
تڑپا کے رکھ دیا وہیں ابرِ بہار نے

دیدی تڑپ کے جان دلِ بیقرار نے
دیکھا کچھ اس طرح نگہِ سرشار نے

تنہائی، یاس، درد، تڑپ، رنج، آرزو
کیا کیا عطا کیا ہے مجھے تیرے پیار نے

کلیوں نے مسکرا کے وہیں سر جھکا دیا!
کیا کہدیا گلوں سے نسیمِ بہار نے

غم میں بھی اک سکون سا پائے نگاہوں میں
کیا دل عطا کیا میرے پروردگار نے

بربادیٔ حیات کا ہے جام یہ سبب
لوٹا ہے اس کو صرف کسی اعتبار نے

٭

## غزل

صبو کو جام کو شیشے کو پیمانوں کو لے ڈوبے
وہی انگڑائی اے ساقی جو میخانوں کو لے ڈوبے

تیری مخمور آنکھوں کا یہ عالم اُف معاذ اللہ
یہ دو ساغر زمانے بھر کے پیمانوں کو لے ڈوبے

حرم اور دیر کے جھگڑے تو ہیں شیخ و برہمن تک
مگر یہ لوگ اپنے ساتھ انسانوں کو لے ڈوبے

بہار آنے سے پہلے ایسی اک انگڑائی دیوانو
جو زنجیروں سے ابھرے اور زندانوں کو لے ڈوبے

یہ تبلیغِ شباب و جام یہ کیفِ غزل خوانی
کہیں ایسا نہ ہو اے جام ایمانوں کو لے ڈوبے

٭

آج دل میں کوئی نشتر سا چبھا ہو جیسے
اس نے بھولے سے مجھے یاد کیا ہو جیسے

میری روداد وفا کا یہ صلا ہو جیسے
اسطرح چپ ہے وہ کچھ بھی نہ سنا ہو جیسے

غم کے ہنگامے ہیں ایسے شب تنہائی میں
خانۂ دل میں مرے حشر بپا ہو جیسے

کس تکلف سے مجھے اس نے جھکاکر دیکھا
اجنبی کوئی سر راہ ملا ہو جیسے

زخم دل ایسا مہکتا ہے میرے سینے میں
صحن گلشن میں کوئی پھول کھلا ہو جیسے

یاد اس کی رہی ہر حال میں سائے کی طرح
ہر قدم پر وہ مرے ساتھ رہا ہو جیسے

دوستوں سے نہ ملا کچھ بھی اذیت کے سوا
میرا اخلاص بھی اب میری خطا ہو جیسے

گردش وقت نے رکھا نہ کہیں کا مجھکو
زندگی میرے لئے ایک سزا ہو جیسے

ذکر پر ان کے اب ہوتی ہے کسک سی دل میں!
شیشۂ دل میں کوئی بال پڑا ہو جیسے

اس نئے دور کے انسان کا یہ کبر و غرور
توبہ توبہ یہی مفلس کا خدا ہو جیسے

یہ بتاتے ہیں اب اٹھتے ہوئے تیزی سے قدم
پارسا جانب میخانہ چلا ہو جیسے!

پارسا کوثری جے پوری

# ۲ دو غزلیں

فریب خوردہ اندھیروں میں کھو گئے لیکن
تری نو بزم کو پرنور کر گئے ہوں گے

ہمارے اشک بھی رائیگاں نہیں جاتے
کسی کے حسن کے صفحے اتر گئے ہوں گے

انھیں کبھی جو مری یاد آ گئی ہوگی!
نقوش ماضی کے پھر سے ابھر گئے ہوں گے

وہ لوگ جن کو ملے ہیں قدم قدم پہ فریب
ترے سلوک وفا سے بھی ڈر گئے ہوں گے

خلوص رکھتے ہیں ساقی سے پارسا پھر بھی
وہ میکدے میں بہت سوچ کر گئے ہوں گے

سحر کے شام کے منظر ٹھہر گئے ہوں گے
کسی کے رخ پہ جو گیسو بکھر گئے ہوں گے

نصیب ان کے یقیناً سنور گئے ہوں گے
ترے حضور جو باچشم تر گئے ہوں گے

وہیں وہیں پہ نشان وفا ملیں گے تمہیں
ہم اہل درد جدھر سے گذر گئے ہوں گے

# غزل

جبّار غنی رانچوری
(اڑیسہ)

آ مرے سامنے خوش رنگ فضا بن کر آ
روح افزا کسی گلشن کی ہوا بن کر آ

چلتے چلتے نہ ٹھہر جائے کہیں نبضِ حیات
میرے آزارِ محبت کی دوا بن کر آ

تیری آہٹ سے ہوں بیدار چمن کے گوشے
روح کا غنچہ کھلے، تازہ ہوا بن کر آ

لہلہائے تیری آمد سے ہر اک خشک روش
موسمِ گل کی خنک تاب فضا بن کر آ

ایسا گمنام پڑا رہنا نہیں اچھا غنیؔ
عرصۂ شعر میں تصویرِ انا بن کر آ

# غزل

مضطر صدیقی
بانسواڑہ

زندگی منت کشِ آشفتگانِ دہر ہے
لوگ اب تک جی رہے ہیں یہ خدا کا قہر ہے

آئینہ خانہ بنا دے لیکن اے آئینہ گر
پہلے یہ بھی سوچ لے یہ پتھروں کا شہر ہے

ریشمی زلفوں کے اُس شبرنگ سائے کی قسم
میرے آنگن میں ابھی جلتی ہوئی دوپہر ہے

جنبشِ لب سے ہوئے روشن کئی ظلمت کدے
آپ کا حسنِ تبسم برق رو کی لہر ہے

ظرف سے ہوتا ہے مضطرؔ زہر بھی آبِ بقا
بوالہوس کے واسطے آبِ بقا بھی زہر ہے

# غزل

شاہد ساگر

دیکھنے میں تو دیوتا ہے وہ
کتنا چالاک ہے بُرا ہے وہ

ہر عمل ہے نمائشی اس کا
جب سے فنکار ہو گیا ہے وہ

وہ فرشتہ نہیں ہے انسان ہے
ہر خطا کر کے بے خطا ہے وہ

میرے نقشِ قدم پہ چلتا ہے
لوگ کہتے ہیں رہنما ہے وہ

وہ سراپا فریب ہے لیکن
دیکھنے میں تو آئینہ ہے وہ

اس کی ہستی حباب کی صورت
کون کہتا ہے زلزلہ ہے وہ

وہ سمندر سہی محبت کا
میرے آگے تو گردبا ہے وہ

بات کچھ بھی نہیں مگر شاہد
تم سے بیزار ہو گیا ہے وہ

# غزل

صحرا کی سمت چل کہ جو تازہ ہوا لگے
اِس شہر کی گھٹن میں بھلا دل بھی کیا لگے

اُس شہرِ اجنبی میں مِرا کوئی سے لگے
ہر شخص جس میں تیرا ہی دردآشنا لگے

شاید یہ اُن کی مست نگاہوں کا فیض ہے
پیتا نہیں ہوں پھر بھی مجھے نشہ سا لگے

اعجاز ہے یہ تیری محبت کا ہم نشین
جس سمت بھی نظر ہو ترا سامنا لگے

روداد زندگی کی کسے اب سنائیے
اپنے ہی غم میں آج ہر اک مبتلا لگے

یہ زندگی کی کونسی منزل ہے دوستو
اب زندگی کا نام بھی دل کو بُرا لگے

اک بار تو اِدھر بھی نگاہِ کرم حضور
شاید کسی غریب کے دل کی دعا لگے!

ستار کی دُعا ہے یہی اتنی اے خُدا
کشتی بھنور سے میری کنارے پہ جا لگے

ستار جے پوری

ڈاکٹر اظہار مسرت
فتحپور شیخاوٹی

# نئی غزل

نظروں کے پس و پیش میں منظر ہی نہیں تھا
میں سوچتا کیوں کر کہ مرا گھر ہی نہیں تھا
تقصیر مرے شیشۂ احساس کی سبھی تھی !
مجرم ترا پھینکا ہوا پتھر ہی نہیں تھا
تا عمر تگاپوئے دمادم ہی رہی تھی
راس آتا جو مجھ کو وہ مقدر ہی نہیں تھا
کچھ دھڑکن دل میں بھی پذیرائی ہوئی تھی
~~راس آتا جو مجھ کو وہ مقدر ہی نہیں تھا~~
زخموں سے مخاطب ترا نشتر ہی نہیں تھا
کب داد مجھے تلخ نوائی کی ملی تھی
محفل میں کوئی مجھ سا سخن ور ہی نہیں تھا
بیزار عمل زار پہ امید کھڑی تھی !
ہتھیاروں کے معیار کا لشکر ہی نہیں تھا

آنکھوں میں غم و یاس کی تنویر بھری تھی
اظہار مسرت کی بھی تحریک یہی تھی

# غزل

اختر شاہجہاں پوری

خونِ ناحق سے منقش بام و در ایسے نہ تھے
آج جیسے ہیں کبھی خوف و خطر ایسے نہ تھے

سایہ سایہ رونقیں تھیں سایہ سایہ جنتیں
اپنے سائے سے کبھی عاری شجر ایسے نہ تھے

بس یہی منزل یہی جادہ یہی تھے مرحلے
فرق اتنا ہے کہ پہلے ہم سفر ایسے نہ تھے

خود سری خود آگہی خود اعتمادی آ گئی
آپ کی قربت سے پہلے ہم مگر ایسے نہ تھے

تیری چاہت ہے کہ ہے ترکِ تعلق کا جنوں
اپنی حالت سے کبھی ہم بے خبر ایسے نہ تھے

ذہن و دل کو موسموں نے اس طرح بدلا کہ گو
انتظارِ شام میں وقتِ سحر ایسے نہ تھے

وقتِ رخصت ہم بھی اختر آنسوؤں کو پی گئے
ہر نظر ہم پر تھی ہم بھی بے ہنر ایسے نہ تھے

٭

# حسنِ نظر

(نوٹ)

اس عنوان کے تحت قارئین نخلستان کے خطوط یا اُن کے اقتباسات ہر شمارہ میں ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں، لیکن قارئین کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ (ادارہ)

محترم ڈاکٹر زیدی صاحب

السلام علیکم

طویل انتظار کے بعد نخلستان کا شمارہ (اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۳ء) موصول ہوا۔ شکریہ، گوشۂ نگراں سے لیکر "حسن نظر" تک سب کا سب ایک نشست میں پڑھ گیا خدا سے یہی دعا کرتا ہوں کہ آپ جس لگن دیدہ ریزی تدبر اور مستقل مزاجی سے اردو اور اہالیانِ اردو کی خدمت کر رہے ہیں، اس کا اجر خدا آپ کو عطا فرمائے اور مستقبل میں اور بھی زیادہ آپ کو اس خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

آج جب کہ دُنیا اسلام، پیغمبرِ اسلام اور اہالیانِ اسلام کے بارے میں گوناگوں غلط فہمیوں کی شکار ہے۔ اس طرح کے مضامین کی بہت ضرورت اور اہمیت ہے جو اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات کا صحیح تصور پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں نخلستان کے تازہ شمارے میں تین مضامین دیکھے جن کے مصنفین نے اپنے اپنے انداز میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر بڑے دلچسپ طور سے قلم اٹھایا ہے۔

راشد جمال فاروقی کا "نئی غزل کا شناخت نامہ" کافی دلچسپ ہے۔ خاص طور پر مجھ جیسے بے شمار قارئین کے لئے جن کا تعلق تو براہِ راست غزل اور اردو مشاعرہ سے نہیں ہے۔ لیکن وہ جدید اردو غزل اور دیگر اصناف سخن میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور تغیرات سے متعارف ہونا چاہتے ہیں۔

گوشۂ نگراں میں نخلستان کے خریدار بنانے کی پرسوز اپیل نظر سے گذری۔ انشاء اللہ کوشش کروں گا۔ کہ میں بھی اس نیک کام میں آپ کو بھرپور تعاون دے سکوں۔

سلام اور نیک خواہشات کے ساتھ

خیر اندیش۔

صابر صدیقی

رڑکی

محترمی آداب
"گلستان" اکتوبر تا دسمبر پر تبصرہ پیشِ خدمت ہے۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔

# "آخری نبی کریم پیکرِ خلقِ عظیم"

علم و دانش، عرفان و آگہی سے لبریز مقالہ ہے۔ زیدی صاحب نے سرورِ کائنات کی حیاتِ طیبہ کے جو روشن نقوش سرِ قرطاس پر ابھارے ہیں وہ ایمان کے پرسوز اور عقیدت کی گرمی سے لَو دے اٹھے ہیں۔ اگرچہ دین کی سنگلاخ زمین میں گل و لالہ کے بہار آفریں تبسم کے امکانات نہیں کے برابر ہوتے ہیں۔ تاہم موصوف نے اپنے تخلیقی جوہر سے کام لے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ خلاق ذہن کے لئے رنگ و بو کے دائروں کی کمی نہیں۔ مضمون اتنا دلنواز بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ قلب کا ذرہ بھی حرف حرف پر ایمان لانے کو مچل اٹھے گا۔ "خلق نبوی" حضورِ اکرم کے اخلاقِ فاضلہ سے بحث کرتا ہے۔ فاضل مصنف نے چن چن کر ایسی مثالیں دی ہیں جن کو مشعلِ راہ بنا کر اہلِ اسلام مادیت کے دور میں بھی دنیائے انسانیت سے خراجِ عقیدت وصول کر کے کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ سید مدبر علی زیدی اُن اربابِ قلم میں سے ہیں جنھیں الجھے سے الجھے موضوع کو سلجھا کر رکھ دینے کا فن آتا ہے، راشد جمال فاروقی نے "نئی غزل کا شناخت نامہ" میں نئی شاعری کے تعلق سے کئی سنبھلی ہوئی باتیں کہی ہیں لیکن جب ان پر جدیدیت کے جنوں کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ کچھ بہکی بہکی سی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں چند سطور سے تو صاف بغاوت کی بو آتی ہے "چشمِ مستعار" رؤف خوشتر کی ذہانت، شوخی، طباعی پر دال ہے۔ چاندنی بھی تو روشنی کے لئے محتاجِ سورج ہے۔ قابلِ اعتراض ہے "فراق حیات و شاعری" میں فراق کی زندگی کے حالات و واقعات خوش سلیقگی سے قلمبند کئے گئے ہیں بے تکلفی دامنِ دل کھینچتی ہے۔ فراق کی شاعری پر حقیقت پسندانہ اظہارِ خیال بھی اس کا ایک تابناک پہلو ہے مضمون حشو و زوائد سے بڑی حد تک پاک ہے۔ ڈاکٹر صفدر آہ کا ادبی انٹرویو ہر زاویہ سے مکمل، تسلی بخش ہے۔ بڑے اہم ٹھوس اور جامع سوال کئے گئے ہیں۔ "علی گڑھ تحریک" کا ایک

رپورٹ کا سا انداز ہے "بستی اس کے رگ و پے میں فقط ستی کردار" جوہر کی شخصیت، صحافت شاعری، سیاست کو گرفت میں لینے کی سعی مشکور ہے، اسلوب بیان مدلل ہے: "سو رگ کہاں ہے" میں باریک بیں مصور، نازک خیال شاعر کی روح سمٹ آئی ہے۔

آثر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے خشکی، بے کیفی کا سایہ اپنے انشائیہ پر از اوّل تا آخر کہیں پڑنے نہیں دیا ہے۔ "حسرت موہانی" ایک مختصر ہلکا پھلکا مضمون ہے۔ نیازی پختہ کار نعت گو ہیں فنکار نے اس نعت گو میں فنکار نے اس نعت میں فن کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔ اسے "جذبۂ دل بے چل" میں نے تخلیق کو غضب کے تیور عطا کئے ہیں۔ تعبیر کی، گہرائی کا عکاس ہے۔ عزیز واردات قلب کے شاعر ہیں۔ زبان و بیان پر بھی خاصی قدرت حاصل ہے "تجسم حسن" کی رومانی فضا پیکر تراشی، علامت پرستی اہل ذوق کے مطلب کی چیز ہے۔ اشعار سے کیف و نشاط کی مے برستی ہے۔ احمد رئیس کے یہاں کوندے کی سی اور اشتیاق جگانے والی اچھوتی تجلی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انصار محشر کے یہاں بھی بھڑکتی چنگاریوں کی کمی نہیں۔ ارشد جمالی کی پہلی غزل ترنگی، نیرنگی، شوخی کی مظہر ہے، شہر کا نام تک بدلا ہوا ہے

اب اس نے کس کو چنا کون اہل شہر ہوا

زبان کے باب میں بے احتیاطی کے آئینہ دار ہیں۔ زبان و ادب کی شریعت میں انتہا پسندی حرام ہے۔ فضا کے اشعار بھی لطف و انبساط سے خالی نہیں۔ مقطع نہ ہوتا تو غزل کا حسن مجروح نہ ہوتا۔ اظہار مسرت کے کلام کا ابتدائی حصہ وقار ہے۔ فی زمانہ ادبی اقدار کے بقاء و فروغ کے لئے ماحول قطعی ناساز گار ہو چلا ہے، مدیران کے پیش نظر اکثر ذاتی مصلحتیں رہتی ہیں دیگر امور کی اہمیت ان کی نگاہ میں ثانوی ہوتی ہے چنانچہ دہلی سے نکلنے والے مقبول ترین اردو رسالے کا جو حشر ہو رہا ہے وہ کسی کی نگاہوں سے مخفی نہیں جس کی ادبیت کی دھاک تک دلوں پہ بیٹھی رہی اب وہی فلمی مزاج میں ڈھل چکا ہے۔ یہیں سے شائع ہونے والے حلقۂ نسواں میں ہر دلعزیز ایک دوسرے اردو میگزین کا عالم یہ ہے کہ جب تک اس کے ہر شمارے کی زینت چار، چھ غزلیں طارق ازورؔ نہ ہوں فاضل ایڈیٹر کی تسکین نہیں ہوتی۔

اب شہر کی بمبئی کی سیر بھی کر لیجئے۔ یہاں ایک مرکزی ادارے کے افق سے ابھرنے والا ایک علمی جریدہ صوری حسن میں آپ اپنا جواب ہے۔ لیکن جہاں تک اس کی معنوی خوبی کا تعلق ہے مایوس کن ہے بمبئی کی سرزمین سے ہی نسبت رکھنے والا ایک اور مجلہ ایک خاص مکتب فکر و نظر کے شعراء کو چھاپنے پر مجبور ہے خواہ ان کی تخلیقات ادبی جوہر، فنی لطافت سے عاری ہوں، قابل مبارکباد ہیں مخمور سعیدی، بشیر جھنجھانوی ڈاکٹر علی زیدی جو آج بھی اشاعت کے مستحق کلام کو شرف قبولیت بخش کر اور شعراء و ادباء کی دیانتدارانہ حوصلہ افزائی فرما کر صحت مند توانا شگفتہ ادب کی تخلیق میں عملی رول ادا کر رہے ہیں یہ ادب کے وہ روشن مینار ہیں جن سے شعر و ادب کے ماحول کی تاریکیاں گریز پا رہی ہیں۔ "نخلستان" زیدی صاحب کی نگرانی میں برگ و بار لا رہا ہے احساس کہتا ہے ؎۔ تیرا ہر نقش خوبصورت ہے۔ د ذہن آذر کی کوئی مورت ہے۔

مخمور رحمانی سنبھلی

مرکز ادب عیدگاہ روڈ نہٹور۔ بجنور یوپی

برادرم ڈاکٹر سید محمد علی زیدی صاحب! تسلیمات

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہو گا۔

نخلستان کا تازہ شمارہ دستیاب ہوا تھا۔ اور پھر آئندہ نئے ایڈیشن کا شدت سے منتظر ہوں۔ چونکہ کئی سال سے نخلستان کا مستقل مطالعہ کر رہا ہوں، منظومات، غزلیات اور دیگر مضامین بھی کافی معیاری ہوتے ہیں۔ میں نخلستان کے لئے ہمیشہ اپنی تخلیقات بھیجتا رہا ہوں۔ حتیٰ کہ غزلوں کے علاوہ خطوط بھی "حسن نظر" میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ آپ کی انفرادیت اور حقائق کی نمایاں کارکردگی ہی کہی جا سکتی ہے کہ دور دراز کے شعراء و ادباء کی کبھی حق تلفی نہیں کرتے۔ ذاتیات یا صوبائی امتیازات کو آپ نے اپنے دل میں کبھی جگہ نہیں دی ہے ورنہ نخلستان میں میرٹھ، لکھنؤ، کراچی پرتاپ گڑھ، راوڑکیلا اور ایسے ہی دیگر مقامات کے لوگوں کی تخلیقات کبھی بھی دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ ایک مدبر اور باشعور مدیر کی کاوشیں ہر

نازد ہے خیال سے ادب کی معیاری نکتہ کو سمجھنے اور اُس پر غور وخوض کرنے کی استلافی ہوا کرتی ہیں۔ انسان کے تحت الشعور کو ٹٹولنا ایک اچھے مدبر کا خاص اور اہم فریضہ ہوا کرتا ہے۔

چونکہ شاعری عوامی جذبات کی مظہر ہوتی ہے۔ لہٰذا کہیں بھی شاعر اپنے کو اجنبی تصور نہیں کرتا۔ میں نے قبل اس کے اپنی تخلیقات راورکیلا سے ارسال کی ہیں۔ لیکن جب کہ میں ہفتوں سے کٹک میں ہوں۔ اڑیسہ کا ایک قدیم شہر جہاں مغلیہ عہد کے کافی دیکھنے کے لائق عمارتیں مساجد اور مقبرے ہیں۔ میں یہاں بحیثیت ایک چیف اگزامنر کے تشریف فرما ہوں۔ بورڈ آف کٹک کے گیسٹ ہاؤس میں بیٹھکر یہ خط لکھ رہا ہوں۔ شام کو ایک تازہ غزل میں نے کہی تھی۔ اُسے بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ کو ضرور پسند آئیگی۔ اُسے ضرور شائع کردیں۔ ممنون ہوں گا۔ چونکہ یہ دل کی پکار ہے۔ اور ادبی تشنگی کے لئے ایک شربت روح افزا بھی!!

شام کو کٹک کے بخشی بازار کی نکڑ پر دوشیزاؤں کی بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ زرق برق رنگین لباسوں میں ماہِ لقائیں اپنی شانِ یکتائی دکھائی ہیں۔ شربت، ناریل کا ٹھنڈا پانی، لسی کا بازار گرم رہتا ہے۔ چونکہ یہ آرین نسل سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے اجسام کی بناوٹ، رنگ و روپ، چال ڈھال عجیب سی لگتی ہے۔ چونکہ میں شاعر کی نظر سے دیکھتا اور پرکھتا ہوں اس لئے اپنے بیان سے سامعین کو متاثر کرتا ہوں۔ اڑیہ لوگوں کو اپنی جنم بھومی، گلی کوچوں اور تہذیب وتمدن پر بڑا ناز ہے۔ ان کا پہلا روپ وہ ہے جسے "لوک ساہتیہ" (عوامی ادب) کہا جاسکتا ہے۔ دوسرا روپ روایتی ہے تیسرا روپ دیوی دیوتاؤں کا اصلی روپ ہے۔ جو ان کے رگ و ریشے میں نوہانت ہیں، جذبات میں، تخیل ہیں، جذبات میں، تخیل ہیں، احساسات میں اور ایسے ہی رنگا رنگ خصوصیات میں نمایاں و اُجاگر ہیں۔

اے ایف غنی رائچوری
وائس پرنسپل، اُردو ہائی اسکول راورکیلا
اڑیسہ

بلبشہ تعلقہ

ڈاکٹر صاحب محترم سلام مسنون!

"نخلستان" ہم کو تین ماہ دس روز کی وضعدارانہ تاخیر کے ساتھ موصول ہوا۔ گویا ؎

جھوٹ بولا ہے تو صادق اس پہ قائم بھی رہو
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیئے

شمارۂ ہذا کو دیکھکر یہ یقین پختہ ہوگیا کہ اکاڈمی کے جریدہ کا تمام تر انحصار صرف ایک آدمی (یعنی آنجناب کی ذات گرامی) پر ہی ہے۔ مقام عبرت ہے کہ تین حضرات (جن میں دو باقاعدہ پڑھے لکھے بھی ہیں) کی مجلس ادارت کے باوجود بے انتہا اغلاطِ کتابت اور جا بجا بے ربط جملے بمہ تمام خوش فہمیاں اونکا منہ چڑاتے نظر آرہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ بیڑا پار لگے یا غرق ہوجائے کسی کو کوئی پرواہ نہیں۔

عام طور پر لوگوں کو یہ علم نہیں کہ ایک فردِ واحد محض اپنی اردو دوستی کے سبب ہی (بظاہر صرف اعزازی صدر ہوتے ہوئے بھی) بیک وقت اکاڈمی کے سکریٹری اور نخلستان کے نگراں کے فرائض کی (غیر ضروری ذمہ داریوں کی) ادائیگی میں کسی درجہ دردِ سر اور کتنی پریشانیوں کے بعد احتجاج میں اردو کا علم بلند کئے ہوئے ہے۔۔۔ لیکن جو لوگ حقائق سے وقفیت رکھتے ہیں ان سے کسی کی اصلیت چھپی ہوئی نہیں ہے۔

جہاں تک پرچہ میں موجود مواد کا سوال ہے سیرت کے موضوع پر مختلف مضامین ہیں لیکن تاثر نثر میں آپ کے یہاں اور نظم میں ناظم سنبھلی مرحوم کے یہاں ہی پایا گیا ہے۔ نئے چہروں میں اعظم زیدی انفرادیت کے حامل ہیں۔ باقی تخلیقات رسمی عمل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں

نخلستان کے قافلہ میں راقم الحروف تنہا فرد ہے جو ہر بار نیا تجربہ کرتا چاہتا ہے۔ لیکن ہر بار ہی کاتب کے تجربوں کا شکار بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بار کی تخلیق کے ساتویں مصرع میں قرآنی لفظ کی ترمیم اور تیرہویں مصرع میں ایک لفظ کی تحریف نے خون کے آنسو رلا دیئے ہیں۔ اس کے باوجود اردو کے نام پر ایک بار پھر قربان ہونے کے لئے حاضر ہے ایک

تمنا: خدا اردو کو نام نہادوں اور ظاہر داروں سے محفوظ رکھے۔
عرض مکرر یہ ہے کہ اردو کے عظیم مجاہد اور بے لوث خادم حضرت نازش پرتاپ گڑھی کے سانحہ ارتحال پر نخلستان کا خصوصی نمبر ایک بروقت مجہدی اور سیکولر اقدام ہوگا۔

خادم مظلوم اردو
(ڈاکٹر) اظہار مسرت
فتحپور شیخاوتی

لائقِ صد احترام قبلہ زیدی صاحب۔ تسلیمات

مزاجِ اقدس۔ کرم نامہ باعث نواز ہوا۔ اور تازہ شمارہ بھی شکریہ۔ انتہائی مودبانہ گذارش یہ ہے کہ میری غزل ۱۹۸۳ء کے جولائی تا ستمبر کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی جس کی پسندیدگی کا اظہار لوگوں نے اپنے خطوط میں کیا یہی نہیں مخمور رحمانی سنبھلی صاحب کا جو خط شائع ہوا تھا اس میں غزل کو حصہ نظم کی بہترین غزل لکھا تھا۔

میں نے ایک غزل ۸۴ء کو ارسال خدمت کی تھی جو ابھی تک شائع نہ ہو سکی حالانکہ کئی شعراء کی تخلیقات کم از کم دو دفعہ شائع ہو چکی ہیں۔ اس قسم کی شکایت مجھے اس بات کا یقین ہے کہ میری غزل کو غیر معیاری کا سرٹیفکیٹ نہیں دیا جا سکتا۔ ہند و پاک کے بہت اچھے اچھے رسائل میں غزلیں برابر شائع ہو رہی ہیں نخلستان کو میں ادبی رسائل میں سرِفہرست سمجھتا ہوں اس لئے غزل کی اشاعت کی فکر رہتی ہے۔ نہیں تو کوئی بات نہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری بات پر ناراض ہونے کے بجائے ہمدردی میں غور فرماکر اگلے شمارے میں غزل شائع فرمائیں گے۔ ایک نعت اور ایک غزل ارسال خدمت ہے۔

پیشگی شکریہ کے ساتھ
اختر شاہجہاں پوری

(الف)

راجستھان اردو اکیڈمی کا جریدہ

سہ ماہی

# نخلستان

جولائی — تا — ستمبر ۱۹۸۴ء

جلد ۔ ———— شمارہ نمبر ۳ ۲

ڈاکٹر سید محمد علی زیدی (نگراں)

(چیرمین اکیڈمی)

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی

سید منظور الحسن برکاتی

محمد یوسف عزیز بیکانیری

—— ناشر ——

راجستھان اردو اکیڈمی

جے۔۳ سبھاش مارگ ۔ سی اسکیم جے پور ۳۰۲۰۰۱

۳

سکریٹری راجستھان اردو اکیڈمی پرنٹر پبلشر نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر راجستھان اردو اکیڈمی جے پور سے شائع کیا

سہ ماہی

# نخلستان

| | | |
|---|---|---|
| قیمت | فی پرچہ | تین روپے |
| زرِ سالانہ | | دس روپے |

ترسیل زر و مراسلت کا پتہ

دفتر راجستھان اردو اکیڈمی
جے ۔ ۳ سبھاش مارگ ۔ سی اسکیم
جے پور ۔ ۳۰۲۰۰۱

# ترتیب

# ترتیب

# آہ!

## ہماری عظیم رہنما اندرا گاندھی

۳۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۸۴ء کا وہ منحوس دن تھا جس نے ہمیں اپنی عظیم و عزیز ترین رہنما سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ اس دن وہ آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی جو ظلم ناانصافی اور فرقہ پرستی کے خلاف اور غریبوں مظلوموں اور پسماندگان کی حمایت میں بلا خوف و جھجک بلند ہوتی رہتی تھی، وہ شمع بجھ گئی جس سے ترقی کا راستہ منوّر تھا جس سے تشدد ہنسا اور تباہ کاری کی تاریکیاں دور ہو رہی تھیں جس سے اندھیرے چھٹ رہے تھے۔ وہ روشن سورج غروب ہوگیا جس کی آب و تاب دنیا بھر میں نظر آرہی تھی، غریبوں کی ہمدرد، دکھیوں کی ساتھی زخمی دلوں کا مرہم، مایوسیوں اور ناامیدیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی کرن، مساوات، انسانیت اور ہندوستانیت کی جیتی جاگتی علامت ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئی۔ ظالم وحشی اور سنگ دل قاتلوں کی گولیوں نے اس دل کی دھڑکن ختم کردی جو مادرانہ شفقت و محبت سے لبریز تھا۔ جس کی ہر دھڑکن ہندوستان کے دل کی دھڑکن تھی۔ ان ہاتھوں کو بے جان کر دیا۔ جن میں ظلم و شقاوت کو روکنے کی طاقت تھی۔ وہ مضبوط توانا ہاتھ جن میں ہندوستان کا روشن

مستقبل محفوظ تھا۔ اس خونِ ناحق سے زمین کو لال کر دیا۔ جس خون میں حرارت تھی۔ دلیری تھی جس کا ہر قطرہ بہادر و جانباز ہندوستانی پیدا کرے گا۔ اِن بازوؤں کو شل کر دیا۔ جو تخریب کاروں اور ملک دشمن عناصر کا مقابلہ کر کے انھیں شکست دینے پر آمادہ تھے۔ وہ انسانیت بھائی چارہ، قومی یکجہتی اور اتفاق و اتحاد کی تصویر تھیں۔ ان کا بے رحمانہ اور سفاکانہ قتل مہاتما گاندھی کے بعد اس صدی کا دوسرا المناک واقعہ ہے۔ اِن کی یاد ہم ہندوستانیوں کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اِن سے عقیدت ان اصولوں سے محبت ہے جن کے لئے وہ زندہ رہیں اور جن کے لئے انھوں نے اپنی جان دی، ملک میں اتفاق و اتحاد قائم رکھنا، ملک کی سالمیت اور بقا کو جان سے زیادہ عزیز رکھنا سیکولرزم، سوشلزم، اور جمہوریت کے اصولوں کو فروغ دینا ملک کی ترقی کے لئے کوشش کرتے رہنا انھیں سب سے بڑا خراجِ عقیدت ہوگا۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ شمع بجھ گئی، روشنی غائب ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے ان کے قاتلوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ روشنی بجھ جائے گی لیکن روشنی قائم اور باقی ہے اندرا جی کی روح امر ہے۔ اس کی روشنی جب تک چاند چمکتا رہے گا۔ اور سورج گرمی پہنچاتا رہے گا قائم رہے گی۔ وہ قدم قدم پر ہماری رہنمائی کرتی رہے گی۔ ان کی آواز ہمارے کانوں میں گونجتی رہے گی اور ہمیں نیکی اور خیر کی طرف بلاتی رہے گی۔ اُن کی آتما ہمارے نئے وزیر اعظم محترم راجیو گاندھی کے سر پر سایہ فگن رہے گی۔ جن جوان کندھوں پر ملک کی قیادت کا بار رکھا گیا ہے۔ وہ بہت قوی

اور توانا ہیں۔ انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو اور محترمہ اندرا گاندھی کی آغوش میں تربیت پائی ہے جس کام کو ہماری رہبر نامکمل چھوڑ گئی ہیں وہ اسے پورا کریں گے۔

ہندوستان کے لوگوں کا اور بھارت کا مستقبل ان کے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔ ان کی زیر قیادت ہندوستان دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گا۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم محترم راجیو گاندھی کے ارادوں کو استقامت ملک کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی قوت اور فرقہ پرستوں اور تخریب کاروں سے لوہا لینے

کی طاقت عطا کرے۔ اور اس عظیم صدمہ کو برداشت کرنے کی ہمّت دے۔ ہم دست بدعا ہیں کہ اس عظیم ہستی کو جس کی موت بھی اتنی ہی عظیم ہے جتنی اس کی زندگی تھی۔ خداوند عالم سکون ابدی عطا کرے اور ہم سب بھارت کے نواسیوں کو اس ناقابل تلافی نقصان کو برداشت کرنے کی طاقت دے۔ (آمین)

ڈاکٹر محمد علی زیدی
چیرمین

نوٹ:-
نخلستان " پریس میں چھپنے کے لئے جا چکا تھا کہ اس جانکاہ حادثہ کی خبر ملی۔ آئندہ شمارہ آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی کے متعلق ادارہ کے اور دیگر اہل قلم کے تاثرات شائع کرے گا۔ آپ بھی اپنے تاثرات بھیجئے۔
(نگراں)

"اگر میں قوم کی خدمت کرتے ہوئے
مر بھی جاؤں تو میرے لئے یہ بڑے فخر کی بات
ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے خون کا ہر قطرہ،
اِس قوم کے فروغ میں کام آئیگا۔ اور
اسے مستحکم اور متحرک بنانے میں کارآمد
ثابت ہوگا"

شریمتی اندرا گاندھی

۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۴ء

# گوشۂ نگراں

نخلستان کا تازہ شمارہ قارئین کی نذر ہے۔ ادبی حلقوں میں نخلستان کی جو پذیرائی ہو رہی ہے اور دور دور سے صاحبانِ ادب اور سخن فہم حضرات کے جو تعریفی و توصیفی خطوط موصول ہوئے ہیں اُن سے نہ صرف میرے عزم میں پختگی، حوصلہ میں بلندی اور خدمت ادب کے جذبہ میں استقامت پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ نخلستان صحیح منزل کی جانب گامزن ہے۔ اس کا ادبی معیار روبہ ترقی ہے اور ادب اور ادیبوں کی خدمت کر رہا ہے۔ دور دور سے دانشور اہل قلم جس طرح اپنے ادب پاروں سے نوازتے رہے ہیں اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے

گذشتہ شمارہ کے لئے صوبۂ آسام سے فرمائشیں موصول ہوئیں۔ جن کی تکمیل کر دی گئی۔ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں نخلستان نے رسائی حاصل کر لی ہے۔

کاتبوں کی ستم ظریفیاں کون نہیں جانتا۔ میری ابتدا سے ہی یہ کوشش رہی ہے کہ اس جریدہ میں تسامحات اگر بالکل نہیں تو کم سے کم ہوں چنانچہ دو مرتبہ پروف ریڈنگ کی جاتی تھی۔ اور دوسری مرتبہ پروف ریڈنگ میں خود کرتا تھا۔ لیکن پچھلے دو تین شماروں کی دوسری مرتبہ پروف ریڈنگ نہیں ہو سکی اس وجہ سے کتابت کی

غلطیاں رہ گئیں اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ چند مجبوریوں کی وجہ سے یہ فروگذاشت ہوئی۔ اگر کتابت و طباعت کا کام جے پور میں ہی ہوتا تو کسی غلطی رہ جانے کا امکان نہ تھا۔ بعض تحریریں ایسی بھی موصول ہوتی ہیں جن کا صحیح پڑھنا کاتب کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ میں حتی الامکان کوشش کروں گا کہ نخلستان تسامح سے پاک ہو۔

گذشتہ اگست میں ہندو مسلم ایکتا سنگھ نے راجستھان اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے قومی اتحاد و یک جہتی پر شعبۂ فلسفہ راجستھان یونیورسٹی کے سیمینار روم میں ایک مذاکرہ منعقد کیا تھا۔ راقم الحروف نے اس کی صدارت کی اور ڈاکٹر پی کے سرلیا ستوا مجاز مہمان خصوصی تھے۔ مختلف شعبوں کے طلبا نے جن میں ریسرچ اسکالر بھی شامل تھے۔ بحث میں حصّہ لیا۔ اس قسم کے مذاکرات سے نہ صرف باہمی اتحاد و اتفاق پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ بہت سے بے بنیاد شکوک و شبہات دور کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ غیر اردو داں حضرات نے بھی اردو میں بولنے کی کوشش کی۔ میں اس خیال کا حامی ہوں کہ جس قدر فرقہ وارانہ منافرت کم ہوگی، جس قدر شکوک و شبہات کے بادل چھٹیں گے، جس قدر مسائل کو صحیح تناظر میں دیکھنے کا رجحان بڑھے گا۔ اور جس قدر قومی یک جہتی اور باہمی اتفاق و اتحاد کا رجحان بڑھے گا۔ اسی قدر اردو کو ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے

راجستھان اردو اکیڈمی کے دفتر میں اکثر ایسی شکایات موصول ہوتی رہتی ہیں کہ کسی اسکول میں طلباء و طالبات کے لئے اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں یا اردو کے استاد کا تقرر نہیں ہوا ہے۔ یا کہیں اردو کے اساتذہ کی تعداد کم ہے یا طالبات و طلباء کی اچھی خاصی تعداد اردو پڑھنا چاہتی ہے۔ مگر ان کیلئے آگے کے درجات میں اردو کی تعلیم کا اجرا نہیں ہو رہا۔ میں ایسی تمام شکایات حکومت راجستھان کے متعلقہ افسروں کو بھیج کے ان کی توجہ مبذول کراتا ہے۔ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ حکومت کے عہدیداران ان پر فوری توجہ دیتے ہیں اور ان شکایات کا جلدی ازالہ کر دیا جاتا ہے۔ کچھ معاملات ابھی زیر غور ہیں مثلاً جودھپور یونیورسٹی میں اردو کے شعبہ کا قیام۔ بیکانیر اور

دوسرے بڑے قصبات میں کالجوں میں اُردو کی تعلیم کا انتظام وغیرہ۔ اُمید ہے کہ یہ معاملات جلد ہی طے ہو جائیں گے۔ حکومت نے اُردو کے فروغ کے لئے بہت کچھ کیا ہے کرنا چاہتی ہے اور کرے گی بھی۔ لیکن تقاضائے وقت یہ ہے کہ ہم اُردو والے بھی اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو محسوس کریں۔ اور اس کے فروغ و ترقی کے لئے عملی کوششیں کریں۔ اُردو ترقی کر رہی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس کی رفتار ترقی تیز ہو۔ مشکلات اور دشواریاں ہمارے حوصلے پست نہ کریں بلکہ ہمارے حوصلہ کو بلند ہمارے ارادے کو پختہ اور ہماری قوت میں اضافہ کریں۔

میں اُن تمام حضرات کا شکرگذار ہوں۔ جنھوں نے راجستھان اُردو اکیڈمی کی کارکردگی کو سراہا ہے اور اس کے لئے تعریفی و توصیفی خطوط لکھے ہیں۔ میں نے حسن نظر میں اِن خطوط کو قصداً شامل نہیں کیا ہے۔ جن میں ایک دریدہ دہن کی ہرزہ سرائی کے دنداں شکن جواب دیئے گئے تھے اور اکثر جگہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ سستی شہرت حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے۔ ہم اس میں معاون کیوں بنیں ؂

خسروا دیدہ فرو بند و مبیں روئے رقیب
زانکہ مرہم خوش نہ باشد دیدہ ہائے ریش را

قارئین کے خطوط میں نخلستان کی جن خامیوں اور کمیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ میں حتی الامکان کوشش کرتا ہوں کہ اُن خامیوں کو دور کیا جائے۔ اور کمیوں کو پورا کیا جائے۔

(ڈاکٹر) محمد علی زیدی

# وطن عزیز کی آزادی ایک مقدس امانت ہے

جس کا

# تحفظ

## ہم سب ہندوستانیوں کا
## فرض اولین ہے

ہمارے ملک اور ہماری قوم کی ترقی میں ہی ہماری ترقی اور بہبودی ہے۔ ہم سب خواہ کسی بھی مذہب کے ماننے والے ہوں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کیونکہ

## ہمارا وطن ایک ہے۔ ہماری قوم ایک ہے

اس لئے

قومی اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینا ہمارا مقصد ہونا چاہیئے

## ملک کی سلامتی اور آزادی ہمیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہونی چاہیئے

ہمارے عظیم رہنما مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہیئے۔

(ڈاکٹر محمد علی زیدی)

پروفیسر عنوان چشتی
صدر شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

# تارِ حریرِ دو رنگ

## اردو شاعری میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے نقوش

تہذیب اور ادب کا دائرہ زندگی کی طرح بہت وسیع ہے اور اس میں انسانی زندگی کے خارجی اور داخلی نقوش اپنی پوری دل ربائی اور معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ہندوستانی مشترکہ تہذیب دورِ حاضر کی چند ممتاز تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایک ایسا دریا ہے جس کی ہر موج زندگی کی اہم حرکت کا پتہ دیتی ہے۔

میں یہاں یہ بحث نہیں کروں گا کہ تہذیب کا مفہوم کیا ہے تہذیب اور تمدن میں کیا فرق ہے یا ادب اور تہذیب کا کیا رشتہ ہے، یا ادب میں تہذیبی اقدار کس طرح جھلکتی ہیں، میں یہاں تہذیب کے داخلی اور خارجی عینی اور مادی پہلوؤں کا ذکر بھی نہیں کروں گا۔ اور ہندوستانی مشترکہ تہذیب کے آغاز و ارتقا سے بھی بحث نہیں کروں گا۔ بلکہ تہذیب کے وسیع سرچشمے کے چند عناصر کی طرف اشارہ کروں گا جس میں فکری سرمائے سے تصورِ ذات اور تاریخی نیز دیومالائی اثرات کی طرف اشارہ کروں گا۔ اور اردو شاعری کے تکنیکی پہلو

کے ایک عنصر یعنی "آہنگ" کی نشاندہی کروں گا۔ تاکہ ان سطور پر ہندوستانی مشترکہ تہذیب کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کی نمائندگی ہوجائے اور اردو شاعری کے وسیلے سے وہ پیمانہ اقدار بھی سامنے آجائے جو ان عناصر کے حسین ترین امتزاج سے۔ وجود میں آیا ہے۔

ہندوستانی تہذیب کے فکری سرمایہ میں تصورات ایک اہم فکری عنصر ہے جس کا دائرہ ایک سادہ تصور سے لیکر فلسفیانہ تصورات تک پھیلا ہوا ہے۔ وجودی فکر کی بنیاد "لاالٰہ الا اللّٰہ" پر ہے۔ جس کو صوفیا نے اپنی زبان میں لا مطلوب الا اللّٰہ لا مقصود الا اللّٰہ اور لا موجود الا اللّٰہ کہا ہے۔ وجودی فکر کا بنیادی اصول ہے "ہمہ موجودات یک وجود حق دانستن" جسکو ہمہ اوست" بھی کہہ سکتے ہیں وجودی فکر میں وجود اور موجود ایک سے زیادہ نہیں۔ یعنی حقیقت اعلیٰ ذات وصفات کا حامل ہے۔ اس نے مرتبہ قدیم یعنی باطن میں سرمو تبدیلی نہ فرماتے ہوئے، مرتبۂ ثانی یعنی خارج میں ظہور فرمایا ہے۔

مرتبۂ ذات میں حقیقت اعلیٰ واحد ہے اور مرتبۂ صفات میں تکثر اور تنوع ہے یہ تکثر اور تنوع حقیقی نہیں اضافی ہے۔ اس طرح کائنات میں جو کچھ ہے حق ہے بلکہ عین حق ہے۔ ہوالاول والآخر ہوالظاہر والباطن اس پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے وجودی فکر کی روشنی میں حقیقت اعلیٰ اور کائنات کا رشتہ غیریت کا نہیں ہے۔ بلکہ عینیت کا ہے۔ اردو شاعری میں وجودی فکر ابتدا ہی سے ملتی ہے ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں صورت عالم کو عین اور حق کہا گیا ہے اور غیر حق کی حیثیت سے کائنات کی نفی کی گئی ہے۔ مثلاً ؎

ہے غلط گو گمان میں کچھ ہے
تجھ سوا بھی جہاں میں کچھ ہے (خواجہ میر درد)

---

اصل شہود وشاہد ومشہود ایک ہیں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں (غالب)

یہ جستجو ہے کہ ہے عالم مجاز کہاں
تلاش چشم حقیقت مگر نہیں ہے مجھے (فانی)

---

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا (فانی)

---

اس عالم تصویر کو دیکھا تو یہ دیکھا
میری ہی نظر محو ہے میری ہی نظر میں (فانی)

---

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زنّاری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ (اقبال)

---

ہر ایک رُخ ترا رخ ہے ہر ایک رخ تری ذات
کروں میں کس کی طرف پشت کس کی سمت سجود (مکیش)

---

چھا گیا عالم پہ تیرا رنگ و بو میری طرح
ہو گیا سارا زمانہ تو ہی تو، میری طرح (مکیش)

---

ان اشعار میں گہرا وجودی رنگ ہے۔
ویدانتی فکر کی بنیاد ـ "ایکو برہم دوتئی ناستی" پر ہے۔ ویدانتی فکر کے مطابق کائنات کا وجود نہیں ہے۔ یہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ وجود حقیقی صرف برہم کا ہے۔ برہم خالص عقل خالص سکون یا آنند ہے۔ اور غیر متغیر ہے۔ صورت عالم "مایا" ہے۔ دھوکا اور متھیا ہے۔ جہاں اودیا ہے۔ شہودی فکر کی طرح

... تعینات کو جبر حق قرار دیتی ہے اور وجودی فکر کی طرح برہم سوا ذات باری کو وجود حقیقی قرار دیتی ہے لیکن شہودی فکر کائنات کا وجود تسلیم کرتی ہے جبکہ ویدانتی فکر کائنات کو عدم محض اور دیتی ہے ۔ وجودی فکر صورت عالم کو عین حق اور مقدس قرار دیتی ہے جبکہ ویدانتی فکر اسے مایا مایا قرار دیتی ہے اور شر نیز ناپاک قرار دیتی ہے ۔ اردو شاعری میں یہ رنگ بھی نظر آتا ہے ۔ اردو شاعری میں جہاں جہاں کائنات کے وجود کی نفی کی گئی ہے ۔ اس کو منبع شر یا ناپاک کہا گیا ہے وہاں ویدانتی فکر کا اثر ہے ۔ مثلاً ۔

عنقا کی طرح میں کیا بتاؤں
جز نام مرا نشاں نہیں ہے (درد)

---

آئینہ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر
ہے موجزن تمام یہ دریا سراب میں (درد)

---

ہاں کھا ئیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے ، نہیں ہے (غالب)

---

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں (غالب)

---

تجلیات وہم ہیں مشاہدات آب وگل!
کرشمۂ حیات ہے خیال وہ ، بھی خواب کا (فانی)

---

ہر مژہ نگاہ غلط ، جلوہ خود فریب
عالم دلیل گمرہی چشم و گوش ہے۔ (فانی)

اُردو شاعری پر اسلامی تاریخ و تہذیب اور افکار کا گہرا اثر ہے۔ مذہبی اصناف سخن مثلاً نعت منقبت مراثی اور سلام وغیرہ کی بات نہیں - یہ اثرات اُردو شاعری کے عام سرائے مثلاً غزلوں اور نظموں کی بنت میں بھی شامل ہیں۔ اور تلمیحات کی صورت میں نمایاں ہیں۔ جو قرآنی آیات و احادیث و تاریخی واقعات اور تہذیبی اشاروں پر مشتمل ہیں جن سے مخصوص مذہبی اور تہذیبی تصورات وابستہ ہیں اور ان کی اپنی مخصوص معنویت ہے۔ مثلاً ذیل میں چند ایسی ترکیبیں پیش کی جاتی ہیں۔ جو اپنا مخصوص مذہبی اور تہذیبی سیاق رکھتیں ہیں۔ یعنی مثل کلیم۔ محمود و ایاز۔ پیر کنعاں چشم زلیخا خواب یعقوب دامن یوسف، محمدؐ حیرت خانۂ۔ سینا و فارانیؑ سینہ بلال قتیل شیوۂ آزری۔ فطرت اسداللہی۔ کشتیٔ مسکین جان پاک۔ دیوار یتیم۔ اولاد ابراہیم، نمرود، خضر بے مرگ و ساماں، طلسم سامری، میراث خلیل۔ زور حیدر۔ فقر بوذر۔ بوئے اسداللہی۔ تب و تاب رومی، مقام شبیری، شعبۂ سینائی۔ کن فیکون نکتۂ لولاک وغیرہ۔ اُردو شاعری کا اسلامی پس منظر بہت وسیع ہے اور اس میں اسلامی افکار، اقدار، تاریخ، تہذیب اور تصوف کا ہر رنگ شامل ہے۔ اگرچہ کوئی اسلامی دیومالا نہیں مگر قرآنی قصوں اور تاریخی و تہذیبی واقعات میں وہ خصوصیات بھی ملتی ہیں جو یونانی اور ہندو دیومالا میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً آتش نمرود، گلزار ابراہیم کا واقعہ لیجئے۔ اقبال کا شعر ہے جس میں شعریت کے ساتھ دیومالائیت بھی ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق ؛ عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اب اقبال کی نظم ذوق و شوق کا ایک بند پڑھئے جس میں اسلامی افکار و اقدار تصوف، تاریخ اور تہذیب کی وہ طاقت و معنویت شامل ہے۔ جو اس نظم کو عالمی شاعری میں بلند مرتبہ عطا کرتی ہے۔

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرہ ریگ کردیا، تونے طلوع آفتاب
شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید، تیرا جمال بے نقاب
شوق اگر ترانہ ہو، میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پاگئے
عقل غیاب و جستجو عشق حضور و اضطراب
تیرہ و تار ہے جہاں گردش آفتاب سے
طبع زمانہ تازہ کو، جلوہ بے حجاب سے۔

اس بند کا ایک ایک لفظ اسلامی افکار و اقدار اور تاریخ و تہذیب کی علامت ہے۔ حضور اکرمؐ کی ذات گرامی کو لوح قلم اور کتاب قرار دینا اور پھر انہیں محیط تصور کرکے گنبد آبگینہ رنگ کو اس محیط میں حباب کے برابر سمجھنا وجدی فکر کا مظہر ہے اس کے ظہور سے عالم آب و خاک کو فروغ ملنا نیز ذرہ ریگ کو طلوع آفتاب کا مظہر قرار دینا۔ محض یوں ہی نہیں بلکہ " طلوع اسلام " کا بہترین منظر نامہ ہے۔ شوکت سنجر و سلیم اور فقر جنید و بایزید محض تلمیحات نہیں بلکہ ان سے اسلامی اقدار اور مخصوص صوفیانہ تصورات وابستہ ہیں اس طرح لفظ "شوق" "عقل" اور "عشق" لغوی معانی سے ماورا ہوکر مخصوص علامتی مفہوم میں ادا ہوئے ہیں۔ جو فکر اقبال میں تار حریر دو رنگ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کا سرچشمہ اسلام اور اسلامی تصورات ہیں۔

اُردو شاعری نے ہندو دھرم کے تصورات اور سنسکرتی کو بھی جذب کیا ہے۔ چنانچہ اس میں اسلامی تاریخ و تہذیب کی طرح ہندو تاریخ کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ ہندوؤں کے اوتاروں رام یا کشن وغیرہ ہندو عقیدہ کے مطابق خدا کی طاقتوں پر حا

شیوان، وشنو، دیوی دیوتاؤں مثلاً کالی، شاکری وغیرہ نیز مقدس مقامات، میلوں اور تیوہاروں کا خاصا ذکر ہے۔ اُردو شاعروں نے ہندو دیو مالا سے بطور خاص استفادہ کیا ہے۔ جس طرح قرآنی قصوں اور قدیم الہامی صحیفوں کی کہانیوں سے اُردو شاعری میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح اردو شاعری میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی ہے۔ اسی طرح ہندو دیومالا نے اردو شاعری میں ایک نئی معنویت پیدا کی ہے۔ مثال کے طور پر شیوجی اور بھسماسر کا واقعہ ہے شیوجی کی اہلیہ کا نام پاروتی ہے۔ جو ایک مقدس دیوی کا درجہ رکھتی ہے۔ شیوجی کے ایک چیلے کا نام بھسماسر تھا بھسماسر نے اپنے گرو شیوجی کی زبردست تپسیا کی اور سخت ریاضت کی جس سے شیوجی بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے چیلے بھسماسر کو "وردان" دینا چاہا۔ بھسماسر نے شیوجی سے عرض کیا کہ آپ مجھے یہ وردان دیجئے کہ میں جس کے سر پر ہاتھ رکھوں وہ بھسم ہوجائے شیوجی نے بھسماسر کو یہ وردان دیدیا اور اس کو بھسم کرنے کی طاقت حاصل ہوگئی بھسماسر ایک ہوس کار تھا۔ پاروتی کے حسن وجمال پر شیدا ہوگیا اور اپنے استاد کی اہلیہ کو حاصل کرنے کے لئے جتن کرنے لگا۔ پاروتی کو بھسماسر کی یہ بات بُری لگی۔ انہوں نے شیوجی سے شکایت کی۔ شیوجی نے ایک حسین رقاصہ (نرتکی) کا بھیس بدلا اور بھسماسر کے سامنے ناچنا شروع کیا۔ بھسماسر تو یہ تسکن رقاصہ کے حسن وکمال فن کے سیلاب میں بہہ گیا۔ وہ نشۂ ونشاط کی کیفیت میں خود بھی ناچنے لگا۔ شیوجی بھسماسر کو ناچ میں بے خود دیکھ کو ایک موقع پر اپنے سر پہ ہاتھ رکھ لیا۔ بھسماسر نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کا اپنے سر پہ ہاتھ رکھنا تھا کہ وہ خود ہی جل کر راکھ ہوگیا۔ اتنے وسیع قصہ کو اس کی پوری معنویت کے ساتھ اُردو کے شاعر نے اس طرح پیش کیا ہے۔ اور اس کو زندگی کی نئی صورت حال سے ہم آہنگ کیا ہے۔

اپنے سوا زمانے میں دیتا کسے شراب
اپنے ہی سر پہ ہاتھ رکھا اور مرگیا

اسی طرح یہ شعر ؎

یہ بیسویں دور کا انسان ہے کہ تو شنکر
بھٹک رہا ہے خلا میں میری صدا کی طرح (عنوان چشتی)

اس میں تو شنکر کی دیومالائی معنویت نئی صورت حال میں جلوہ گر ہے۔ اب نظیر اکبرآبادی کی نظم "مہادیو کا بیاہ" کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

جب بیٹھے شیلا کی شادی میں کل تینتیس کروڑ جو ہیں دیوتا
بشن آپ تھے آئے اور برہما اور اندر نارد منی اس جا
اور شنکرا نند بہت بھی اور نھاؤں سنیچر سبھی جمنا کا
وہ روپ سروپ اور پوشاکیں وہ اونچی شامیانے پر فضا
اس وقت خوشی سے مندر پر شیو بیٹھے بن کر یوں دولہا
مکھ پان کی لالی کو مہندی، اور آنکھوں بیچ لگا گجرا
ہر تار جھمکتا چہرے کا اور تاش سنہرے کا باکا
اس تار زری کے سہرے پر جوں مہر جمکتا مکٹ دھرا
ہر کان مرصع کندن تھے اور مکھ پر سونے کا سہرا
وہ سہرا مکھ پہ یوں چمکے جوں سورج ہووے کرن بھرا
وہ موتی مالے گلے جھلکیں اور ان میں لعلوں کی مالا
وہ پانگ جڑو باندو پر، اور کنگنا پہنے جھمک رہا
جب بیٹھے شیو یوں دولہا بن تب پریوں کا وال ناچ ہوا
اور کرنا سرنا جھانجھ بجے، نقارے گونجے شور مچا
یہ ٹھاٹ بنا کر دکھلایا، جب شیو نے مایا اپنی کا
ہر چار طرف آنند ہوئی، غل شور ہوا خوش وقتی کا

قطع نظر اس سے کہ اس نظم کا ذخیرہ الفاظ ہندی کے عناصر سے ماخوذ ہے اور اس پر بول چال کی زبان کا اثر بھی ہے۔ اس نظم میں شیو جی کے بیاہ کا دلکش بیان ہے

اس بند میں تینتیس دیوتاؤں کا ذکر ہے۔ بشن، برہما، اندر اور نارد منی کا ذکر ہے۔ شکر اور برہسپت نیز سنیچر کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ محض برائے بیت نہیں بلکہ ہر لفظ اپنے مذہبی تصورات اور اس کی بھرپور معنویت کے ساتھ آیا ہے۔ جس نے اردو شاعری کے دامن افکار کو وسیع کیا ہے۔

تاہم یہ دو رنگ کی کیفیت افکار کی سطح پر تو ہے ہی، اظہار کی سطح پر بھی نظر آتی ہے۔ الفاظ ہوں یا ترکیبیں، محاورے ہوں یا ضرب الامثال پیکر ہوں یا تشبیہیں، ان پر عربی و عجمی آب و رنگ کے ساتھ ہندوستانیت یا مقامی رنگ و روپ کا اثر بھی ہے۔ لیکن ایک عام خیال یہ ہے کہ اردو شاعری میں جو شعری آہنگ ملتا ہے وہ سراسر عربی و فارسی سے ماخوذ ہے اور اس پر سنسکرت کے چھند شاستر کا بالکل اثر نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری نے عربی و فارسی عروض پر اپنی بنیاد کو استوار کیا ہے۔ شعری آہنگ کی مخصوص اور متعین صورت کا نام بحر ہے۔ بحر کی بنیاد رکن پر ہوتی ہے۔ "رکن" کے معنی ستون کے ہیں۔ جس طرح مکان کی بنیاد ستون پر ہوتی ہے اس طرح عربی و فارسی بحر کی بنیاد رکن پر ہے۔ ہر رکن کا ایک مخصوص وزن ہوتا ہے۔ عروضی اصطلاح میں دو کلموں کے حرکت و سکون کے مساوی ہونے کو وزن کہا جاتا ہے۔ رکن کی جمع ارکان ہے اور زحافات کے عمل سے نئی بحریں وجود میں آئی ہیں۔ زحاف کا عمل چار صورتوں میں ہوتا ہے۔ یعنی حرف کو گھٹا کر بڑھا کر، ساکن کر کے یا متحرک کر کے نئے اوزان وضع کیے جاتے ہیں۔ اردو شاعروں نے اپنی قومی موسیقی کے مزاج کی روشنی میں عربی و فارسی کی انھیں بحروں کو برتا ہے۔ جو اردو زبان کی ساخت اور لسانی خصوصیات کے مطابق ہیں اس نکتہ کی مزید وضاحت سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اردو شاعری کی ہر صنف کسی نہ کسی عربی و فارسی بحر میں ہے۔

اردو شاعروں نے عربی و فارسی عروض کے ساتھ ہندی کے چھند شاستر پنگل سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ہمارے بیشتر نقادوں اور شاعروں کا خیال ہے کہ اردو میں محض "دوہا" چھند برتا گیا ہے۔ دوسرے چھند نہیں برتے گئے ہیں۔ اردو کے اکثر

ہندی چھندوں پر کہیں "دوہا" کہیں "دوپدے" اور کہیں "کبیر رنگ" لکھا گیا ہے
ڈاکٹر عبدالوحید قریشی نے تذکرہ شعرائے اردو میں جمیل الدین عالی کے سرسی چھندوں
پر "دوہا" لکھا ہے جو غلط ہے۔ ہندی میں دو قسم کے چھند ہوتے ہیں۔ ایک
"ورنک" اور دوسرے ماترائی" ورنک چھندوں کا انحصار ورن یا اجزا پر
ہوتا ہے اردو میں ورنک چھند نہیں ملتے۔ ماترائی چھندوں کا انحصار ماتراؤں پر
ہوتا ہے۔ ماترائیں تین قسم کی ہوتی ہیں یعنی لگھو (خفیف) گرو (طویل) اور پلیٹ
طویل ترین) پلیٹ ماترا کا تعلق موسیقی سے ہے شاعری سے نہیں۔ لگھو ماترا کی عروضی
قیمت ایک اور "گرو" ماترا کی عروض قیمت دو کے برابر ہے۔ ماترائی چھندوں
کے لئے تین بنیادی اصول ہیں۔ پہلا یہ کہ ماترائی چھندوں میں ماتراؤں کی تعداد مقرر ہوتی
ہے۔ دوسرا یہ کہ چھند میں ماترا کی تعداد کے علاوہ اِن کی نوعیت بھی مقرر ہوتی ہے۔ یعنی
یہ طے ہوتا ہے کہ مصرع میں کس مقام پر کون سی ماترا آئے گی۔ تیسرا یہ کہ چھند میں "وشرام"
یعنی وقفہ کا مقام متعین ہوتا ہے۔ اردو میں یوں تو بہت سے چھند برتے گئے ہیں لیکن
ذیل میں مختصراً صرف تین چھندوں (سرسی، سارا اور دوہا) کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سرسی چھند:۔ سرسی چھند میں ماتراؤں کی کل تعداد ۲۷ ہوتی ہے۔ چھند دو
مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر مصرعہ دو حصّوں میں منقسم ہوتا ہے۔ پہلے میں ۱۶ اور دوسرے
میں ۱۱ ماترائیں ہوتی ہیں۔ دونوں کے درمیان وشرام یا وقفہ ہوتا ہے۔ مثلاً

سب راہیں تیری جانب جائیں، میں جاؤں کس اور
چاندنی رات ترا ہی مکھ ہے ترا ہی روپ ہے بھور

(وزیر آغا)

طنز کے زہر آمیز نکیلے کانٹوں کی کیا بات
پھولوں سے بھی مرجھاتے ہیں زخمی احساسات

(زیدی جعفر رضا)

ہنگاموں کے قحط سے کھڑکی دروازے مبہوت
آنگن آنگن ناچ رہے ہیں سناٹوں کے بھوت

(سلطان اختر) ________________

سانجھ سویرے پنچھی گائیں، لے کے تیرا نام!
ڈالی ڈالی پہ ہے تیری یادوں کا بسرام

(عرفانہ عزیز) ________________

گاڑی کی کھڑکی سے دیکھا، شب کو اس کا شہر
چاروں اور رہا کالا جنگل بیچ میں اجالا شہر

(زاہد فارابی) ________________

سار چھند:۔ سار چھند میں ماتراؤں کی تعداد ۲۸ ہوتی ہے۔ ہر مصرع کے پہلے حصّہ میں ۱۶ اور دوسرے حصّہ میں ۱۲ ماترائیں ہوتی ہیں۔ دونوں کے درمیان وقفہ یا وشرام ہوتا ہے۔

عالی جی اب آپ چلے ہو، اپنا بوجھ اٹھائے
ساتھ بھی دے تو آخر پیارے، کوئی کہاں تک جائے

(جمیل الدین عالی) ________________

پچھتاوا ہے من کا موتی، اور جیون کی جیوتی
جیسے اک البیلا پتھر، ایشور روپ دکھائے

(کرشن موہن) ________________

آتی جاتی لہریں گن کر، اپنا جی بہلانا
بام کے پتے سایہ دیں گے، بستی میں مت آنا

(پرکاش فکری) ________________

دوہا چھند:۔ دوہے میں ۴۸ ماترائیں ہوتی ہیں۔ ہر مصرع دو حصوں میں منقسم

جس کے پہلے حصّہ کو "سم" کہتے ہیں جس میں ۱۳ ماترائیں ہوتی ہیں دوسرے کو "وشم" کہتے ہیں جس میں گیارہ ۱۱ ماترائیں ہوتی ہیں۔ دونوں کے درمیان "وشرام" یا وقفہ ہوتا ہے۔ دوہے کے ہر حصے کو پاد یا چرن کہتے ہیں۔ دوہے کی ۲۳ قسمیں ہیں۔ اردو میں یہ ساری قسمیں نہیں ملتیں۔ لیکن ۲۴ ماترا کا چھند ضرور ملتا ہے۔

ڈھونڈیں گے پھر ہم کہاں، ساگر ساگر پھول
اگلے برس جانے کہاں، جانے کا یہ کر بھول
شہر کیے تو یوں لگا، آج کئی دن بعد
بادل چاروں اور ہیں، اندر باہر پھول
کس کے شراب سے کل تلک ہم تھے ایک چٹان
کس کی دعا سے ہو گئے۔ ٹھوکر کھا کر پھول!

(اعجاز عبید)

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے ارتقا میں ہندو دیومالا اور اسلامی افکار کا گہرا رنگ ہے۔ اور اردو شاعری مشترکہ تہذیب کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس تہذیب کا ہر رنگ نمایاں ہوا ہے جس سے ایک طرف اردو شاعری کی عظمت اور دوسری طرف ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی طاقت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

---

نشاد اعظمی

# قومی یک جہتی — اور — نظیر اکبرآبادی

مختلف قوموں کے میل جول اور باہمی میل ملاپ کے نتیجے میں اردو زبان کا جنم ہندوستان میں ہوا اور اس کا یہ خاصہ رہا ہے کہ تعمیر و تشکیل کے ابتدائی دور سے ہی مختلف زبانوں کے الفاظ اس میں اس طرح شامل ہو گئے جیسے وہ کسی اور زبان کے لئے نہیں بلکہ اردو کے لئے ہی وضع کئے گئے ہوں۔ چنانچہ اتفاق و اتحاد یک جہتی اور میل ملاپ کی بنیاد پر ہی اردو کی نشو و نما ہوئی اور لسانی یک جہتی ہی اس کا جوہر اصلی ہے۔ یہ اپنی پیدائش سے لے کر آج تک ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے لوگوں کی محبوب زبان بن کر زندہ ہے۔ اور اس میں ہمارے ملک کی مشترکہ کلچر کی روح سمائی ہوئی ہے۔ اردو زبان ہر علاقہ کے لوگوں میں اپنی ہر دلعزیزی کا سکہ جمائے ہوئے ہے۔ اور پورے ملک کے مزاج و ماحول کی عکاسی اس کا اولین فریضہ رہا ہے۔ ایک طرح سے یہ وسیع و عریض ملک ہندوستان میں رابطے کی زبان ہے جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ نہ صرف ہندوستان کے ہر مذہب و ملت کے افراد اس کے شیدائیوں میں ہیں بلکہ غیر ممالک کے

باشندے بھی اس کی حلاوت و شیرینی کے دلدادہ ہیں اور پورے ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں میں اردو تعلیم و تدریس کے لئے باقاعدہ شعبے قائم ہیں اگر سچ پوچھئے تو اردو زبان اب ایک انٹرنیشنل لینگویج کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا کہ قومی اتحاد و یک جہتی کی بنیاد پر اس زبان کی تعمیر و تشکیل اور نشو و نما ہوئی ہے۔ چنانچہ اُردو زبان اپنے ارتقاء کے ہر دور میں اتحاد و یک جہتی اور رواداری کی ترجمان رہی ہے، اس میں ہر مذہب و فرقہ کے مذہبی خیالات و عقائد کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ جس کی بدولت ایک دوسرے کے مذہبی رسومات و عقائد کی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام اور رواداری کی نادر مثالیں اس میں ملتی ہیں۔ مختلف مذاہب کا بیش بہا ذخیرہ اُردو کے علاوہ شاید ہی کسی اور زبان میں موجود ہوگا۔

قومی اتحاد و یک جہتی کے دو متضاد رویے کارفرما ہیں۔ ایک طبقے کا رجحان یہ ہے کہ پوری قوم ایک طرح کے جذبات و خیالات اور عقائد و نظریات اختیار کر کے اس پر کاربند ہو جائے۔ جب کہ دانشوروں اور وسیع النظر لوگوں کے خیالات میں قومی اتحاد و یک جہتی کا مفہوم یہ ہے کہ بہ حیثیت ہندوستانی ملک کی سالمیت اور تحفظ کے وسیع تر مفاد کے لئے ذاتی اور چھوٹے مفاد کو قربان کر دینا قومی یک جہتی ہے اور جمہوری نقطۂ نظر کا بھی یہی تقاضا ہے کہ تعاون باہم کے اصول پر کاربند رہتے ہوئے ہم ایک دوسرے کے مذہبی اعتقاد و جذبے کا احترام کریں اور بھائی چارے کی فضا میں سانس لیتے ہوئے ملک کی تعمیر و ترقی اور نشو و نما میں بھرپور حصہ لیں۔ ذاتی طور پر میں اس صفت کو حب الوطنی کا لازمہ قرار دیتا ہوں یعنی بنیادی طور پر ہمارے اندر اپنے وطن سے محبت کا جو فطری جذبہ پایا جاتا ہے۔ اگر وہ کسی گمرہی اور بدنیتی کا شکار نہ ہو تو محض اس جذبہ کی بدولت اتحاد و یک جہتی میل جول اور صلح کل کے ثمرات و نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر ہندوستانی کو اپنے وطن سے محبت ہے تو پھر بار بار

اتحاد و یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر زور دینے اور بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ دراصل ہمارے جمہوری ملک کی سیاست میں یہ غلط رویہ مدت سے رواج پا گیا ہے کہ برسر اقتدار جماعت کو بدنام کرنے کے نقطۂ نظر سے مخالف جماعتیں باشندگان ملک کے مختلف فرقوں میں دشمنی اور نفرت کا بیج بو کر امن و سکون کی فضا کو درہم برہم کر کے سیاسی مفاد حاصل کرتی ہیں اور ملک کے وسیع تر مفاد کو قربان کر کے یک جہتی و اتحاد کی فضا کو پارہ پارہ کرنے کی مرتکب ہوتی ہیں یہ رویہ وطن کی محبت کے سراسر منافی اور جمہوری اصولوں کے خلاف ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوریت کو جو خطرات لاحق ہوتے ہیں اس میں عوام کی کم خواندگی اور عاقبت ناشناسی کا بھی دخل ہو کہ وہ اپنی عقل و فہم سے کام لینے کے بجائے دوسروں کی شاطرانہ چالوں کے شکار ہو جاتے ہیں گو کہ ہمارے ملک میں جمہوری طرز حکومت نے رفتہ رفتہ عوامی شعور کو بالیدہ بنانے میں بڑی مدد دی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب امن و امان اور اتحاد و یک جہتی کے درہم برہم کرنے والے عناصر سے عوام بھی باخبر ہو جائیں گے۔ اور یہ ناپسندیدہ عمل خود اپنی موت مر جائیگا

ہمارا ملک ہندوستان ہمیشہ سے رواداری، مذہبی بے تعصبی اور صلح کل کی پالیسی کا پیرو کار رہا ہے اور یہاں کے باشندے سدا سے امن و آشتی پسند رہے ہیں اور اتحاد و ایک جہتی کا سبق اسلاف سے انھیں ورثے میں ملا ہے۔ چنانچہ اتحاد و یک جہتی کا پائیدار اور مثبت رویہ ان کے مزاج و ماحول سے ہمیشہ ہم آہنگ رہا ہے۔ کبھی کبھی منفی رویے اور سیاسی مفادات کی عیاریاں سیدھے سادے شہریوں کو اپنے چنگل میں لے لیتی ہیں اور ایک مختصر مدت میں اتحاد و اتفاق کی قوت کو صدمہ پہنچ جاتا ہے اس کے علاوہ وہ لوگ جو منفی روّیہ اپناتے ہیں۔ انھیں بھی جلد ہی احساس ہو جاتا ہوگا۔ کہ امن و اتحاد شکنی میں دوسروں کو ہی تکلیف اور صدمہ نہیں پہنچتا بلکہ وہ خود بھی اس کی زد میں آئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایسے ہی تکلیف دہ اور خوشگوار موقعوں پر لوگوں کو ان کی غلطیوں پر ہشیار کرنا پڑتا ہے اور انھیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا جاتا ہے۔

کوئی بھی ملک جہاں کوئی مستحکم سیاسی نظام ہو وہاں نفرت و دشمنی اور فرقہ وارانہ فسادات کے ہنگامے یقینی نظم و نسق کے لئے ایک درد سر بنتے ہیں۔ لیکن نظم و نسق کی بہتری اور قیام امن و اتحاد کے لئے عوام کا تعاون بھی نہایت ضروری ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر ہر شہری کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ایسے کاموں میں ملوث نہ ہوں جس کی بدولت امن و امان اور باہمی اتحاد و اتفاق میں خلل واقع ہو۔ کبھی کبھی نامعلوم طریقے سے غیر ملکی طاقتیں بھی کسی ملک کو کمزور کرنے کے لئے اندر ایسی فضا تیار کر دیتی ہیں کہ باشندگان ملک خود ہی اپنے اور اپنے بھائیوں کے دست و بازو کاٹنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے ہتھکنڈوں سے بھی ہشیار کرنے کے لئے اتحاد و یک جہتی کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔

غالباً میں نے قومی یک جہتی کی ماہیت اور غرض و غایت پر کچھ زیادہ ہی زور دیا ہے شاید یہ میرے اور آپ کے دل کی آواز ہے میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے ہر شہری کے دل کی یہی آواز ہوگی۔ کیونکہ اتحاد و یک جہتی کی ہمارے ملک کو اس وقت شدید سے شدید تر ضرورت ہے۔

ہمارے ملک میں صوفیوں، سنتوں اور درویشوں نے ہمیشہ جو تعلیمات عام کی ہیں اور جن کے اثرات ہمارے اوپر اب بھی باقی ہیں اُن کا خلاصہ یہی ہے کہ انسانیت کا احترام بہت ضروری ہے، اتحاد و اتفاق اور میل جول میں بڑی طاقت ہے اچھے کام کرنے کا جذبہ دلوں میں بیدار رہنا چاہیئے۔ برے اور غلط کاموں سے دور رہنا چاہیئے مذہب خواہ کوئی بھی ہو نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے۔ اور برائیوں سے روکتا ہے۔ کوئی بھی مذہب غلط کاموں کی تعلیم نہیں دیتا۔ خوش قسمتی ہے اب بھی ہمارے ہندوستان کے باشندے اپنے آباد و اجداد کے دین پر مضبوطی سے قائم ہیں اور دوسرے مذاہب کے تئیں عقیدت و محبت اور رواداری کا جذبہ رکھتے ہیں اب بھی یہاں لوگوں کی رہبری کا فرض انجام دینا مذہب کے ہاتھ میں ہے اور سماج میں مذہب کو ایک بلند اور مقدس مرتبہ حاصل ہے

ہندستان کا ہر شہری اپنے دھرم اور مذہب کا امین اور اس کے اصولوں پر کاربند ہے۔ اگر ہم اپنے اپنے مذہب کی نعمت سے محروم نہیں ہوتے ہیں تو یقیناً ہم صلح پسند اتحاد و یکجہتی کے قائل، انصاف و رواداری کے خوگر ہیں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر دل سے یقین رکھتے ہیں۔

اُردو زبان کا دامن حب الوطنی کے جذبات سے معمور اور باہمی اتحاد و اتفاق کے نظریات سے مالا مال رہا ہے! خاص طور سے اُردو شاعری جو بدقسمتی سے بہت پہلے ایک مخصوص حلقہ یعنی سلاطین و امراء کی خوشنودیوں کے لئے وقف تھی۔ وقت آنے پر اس کے ہوشمند اور حساس شاعروں نے حب الوطنی اور قومی ایکتا کے لئے ایسے ترانے گائے ہیں جنھیں سُن کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ہمارے آباؤ اجداد شروع سے ہی دوسرے مذاہب کے ثقافتی میلوں اور تہواروں میں شریک و سہیم رہے اور دیگر مذاہب کے تئیں احترام اور رواداری کا کیسا جذبہ اُن کے دلوں میں موجزن رہا ہے۔ اُردو شاعری کا لگاؤ جب عوام سے ہوا تو اس کی بدولت بہت سے ایسے نیک کام انجام پائے جو بڑے سے بڑے عالموں واعظوں اور اُپدیشکوں سے نہ ہو سکے تھے۔ صحیح معنوں میں جب اُردو زبان زندگی سے قریب ہوئی اور اُس کے مسائل کی ترجمانی کرنے لگی تو رہبری و رہنمائی کا فریضہ بھی شاعری نے انجام دیا۔ اچھائیوں کی طرف لوگوں کی نظریں مرکوز ہوئیں اور برائیوں سے بچنے اور گریز کرنے کا احساس پیدا ہوا۔

اُردو شاعری میں نظیر اکبرآبادی کا نام محتاج تعارف نہیں وہ اُردو کے ایک ایسے شاعر ہیں جو صحیح معنوں میں ہندستان کے عوام اور جمہوری شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے وطن سے ٹوٹ کر محبت کی وطن کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو انہوں نے لائق اعتنا سمجھا یہاں کے رسم و رواج، مذہبی عقائد و رسومات تہذیبی تقریبات، یہاں کے موسم دریا، پہاڑ، صحرا چمن، شجر و حجر، چرند و پرند کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا اور اپنی شاعری کی بدولت انہوں نے عوام و خواص کی نظروں میں اپنی جگہ جلوہ نمائی اور سماج و معاشرت کی سچی عکاسی اور ترجمانی کرکے دلوں میں انسانیت کے احترام کا جذبہ بیدار کیا اور اخوت و بھا[illegible]

کی فضا ہموار کی۔

نظیر اکبر آبادی جن کا نام ولی محمد ہے۔ ۱۷۳۵ء میں پیدا ہوئے اکبر آباد (آگرہ) انھیں اتنا پسند آیا کہ وہ وہیں کے ہو رہے۔ فارسی و عربی و دیگر متداولہ علوم کی تعلیم انھیں دلائی گئی وہ بھاشا، پنجابی، مارواڑی، پوربی اور ہندی زبانیں جانتے تھے۔ ان کی معلومات بیحد وسیع تھیں وہ ایک عالم تھے۔ اور زندگی بھر انہوں نے معلمی کی۔ نظیر اکبر آبادی منکسر المزاج، قناعت پسند، حلیم، نیک دل، اور خلیق انسان تھے۔ اُن کے مزاج میں شوخی و رنگینی ظرافت، بذلہ سنجی کی بھی کارفرمائی تھی۔ بڑے آزاد خیال انسان دوست طبیعت کے مالک تھے۔ حلقہ احباب وسیع تھا۔ جن میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی امیر غریب بچے بوڑھے جوان سبھی شامل تھے۔ ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے لوگوں سے انھیں تعلق خاطر رہا وہ ہر ایک کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور اخلاق و مروت سے پیش آتے تھے۔ سیر و تماشہ اُن کی فطرت میں شامل تھا۔ ہندوستان کے ہندو مسلمان سبھی کے میلوں، تہواروں میں شریک ہوتے تھے۔ اپنی شاعری کو انہوں نے خارجی دنیا کے فطری مناظر اور حقائق کی ترجمانی کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور بالواسطہ اخلاقی تعلیم کا خوشگوار فریضہ بھی نامعلوم طریقہ سے وہ اپنی شاعری کے ذریعہ انجام دیتے رہے اُن کے یہاں مذہبی رواداری اور بے تعصبی کی نادر مثالیں ملتی ہیں خواہ کہیں سیر تماشہ ہو اور کوئی مذہبی و تہذیبی میلہ ہو وہ ہر جگہ پہنچ جاتے تھے۔ اور جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے حقیقت واقعہ کی سچی تصویر اس طرح پیش کرتے کہ اخلاقی تعلیم کا پہلو بھی ہاتھ سے نہ جاتا۔ انہوں نے انسانیت کو لعن طعن کر کے ذلیل و رسوا کرنے کا انداز نہیں اختیار کیا بلکہ ہوشمندی اور غیر محسوس طریقے پر برائیوں کی نشاندہی کرتے یا اُن پر زیرِ لب مسکرا دیتے۔ عوام کے سیدھے سادے جذبات اُن کے رنج و خوشی کی کیفیات کی مرقع کشی میں انھیں بڑا مزہ آتا۔

وہ انسان کی حرکات وسکنات پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ اور اُن کے مختلف اوقات میں مختلف جذبات کو بیان کرنے کا بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ حقیقت واقعہ کی تصویرکشی میں وہ جملہ لوازمات کو ملحوظ رکھتے۔ محاکات میں انھیں قدرت کاملہ حاصل تھی۔ وہ تخیلات و تصورات کے شاعر نہ تھے وہ واقعات وحقائق کو خارج میں جیسے دیکھتے تھے اپنے موقلم سے رنگ آمیزی کرکے اس طرح تصویرکشی کرتے جیسے کسی شوخ مصوّر نے انسانوں کے ہجوم کی بولتی اور جیتی جاگتی تصویریں اتار دی ہوں۔

نظیر اکبرآبادی کا ذوق شاعری روش زمانہ سے جداگانہ تھا اور انہوں نے ایسی طرز شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ جسے انہوں نے خود پروان چڑھا کر عروج پر پہنچا دیا۔ اُن کے طرز شاعری کو وقت اور ماحول نے پسند نہیں کیا۔ لیکن انہوں نے جس نقطۂ نظر کے تحت ایسی واقعی اور فطری شاعری کو رُواج دیا۔ اُسے عوام الناس کے ہر طبقہ میں مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی اور نظیر کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ ارباب علم وادب نے ناگواری کا احساس کیا لیکن جو ذائقہ اور جو لذت عوام کو اُن کی شاعری میں ملی۔ اُس سے وہ آشنا تو نہ تھے۔ لیکن شاعری کی یہ آواز اُن کے دلوں کی دھڑکن بن گئی۔ کیونکہ اس میں انھیں اپنے حالات کا ماحول کا تذکرہ شاعرانہ انداز میں پہلی بار ملا۔ مجنوں گورکھپوری نے تحریر کیا ہے۔

"نظیر ہندوستان کے شاعر تھے اور ہندوستان کی جمہوری زندگی کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اور اسالیب اور لب و لہجہ کو عوام سے ہم سطح رکھا۔ یہاں تک کہ اُن کی شاعری کو عامیانہ اور بازاری سمجھا جانے لگا۔ لیکن اُن کا نفس اور اُن کا ضمیر سماج کا ضمیر تھا جس کو ایسے اعتراضات کی پرواہ نہیں تھی۔ انہوں نے کھلے الفاظ میں کہا نہیں ہے مگر ان کا انداز بتاتا ہے کہ وہ شاعری کو جمہوری زندگی کا آئینہ سمجھتے تھے شاعر کو کوئی حق نہیں کہ وہ خلق اللہ کی زندگی سے بیگانگی برتے اور اپنے کو اُن سے علاحدہ اور برگزیدہ سمجھے اور حقیقت یہ ہے کہ جو شاعر اپنے کو ایک مخصوص

اور برگزیدہ طبقہ یا طبقہ کی چیز سمجھتا ہے اور عوام کی زندگی کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا — وہ سماج اور معاشرت کا مجرم ہے۔"

نظیر اکبرآبادی کی عوامی شاعری انھیں پیشروؤں اور مابعد کے بیشتر شاعروں سے ممتاز کرتی ہے گوکہ اس کی بدولت ان کی قدر و منزلت کو بہت بعد میں پہچانا اور سراہا گیا لیکن ادب کے ناقدین جو فرسودہ روایتوں سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے تھے نظیر کو عامیانہ اور سوقیانہ شاعر سمجھ کر انھیں نظر انداز کرتے رہے اور پھر دور جدید کا ایک زمانہ آیا کہ انھیں جدید شاعری کا باوا آدم سمجھا گیا۔ اور بیسویں صدی میں تو صحیح معنوں میں اُن کی قدر و قیمت کا تعین کیا گیا۔ ان کی شاعری کو موجودہ دور میں ایک نئی معنویت حاصل ہو رہی ہے اور انھیں نہایت دور اندیش حقیقی نطری اور جمہوری شاعر تسلیم کیا جا رہا ہے۔

نظیر اکبرآبادی کی شاعری سلیس اور عام فہم زبان میں ہے جو تصنع اور آورد سے یکسر پاک ہے۔ وہ خیالات و تصورات کے محل نہیں تعمیر کرتے بلکہ روزمرہ کی زندگی کے نئے نئے مسائل اور موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ موقع محل کے لحاظ سے موزوں اور مناسب الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ عام فہم تشبیہات و استعارات کو ہی کام میں لاتے ہیں۔ اُن کے کلام میں کسی طرح کی ژولیدہ بیانی اور اُلجھاؤ نہیں ہے۔

نظیر کا کلام اُن کے عہد کے سماج و معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے جس میں مذہبی عقائد و رسومات کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اکبرآباد کے علاقہ میں خصوصیت کے ساتھ بولی جانے والی اُس عہد کی زبان بھی فطری انداز میں کلام نظیر سے معلوم ہوتی ہے گوکہ اب بہت سے الفاظ متروک ہو گئے ہیں۔ لیکن عہد نظیر میں وہ عام طور سے بولے اور سمجھے جاتے تھے۔

کائنات میں نہ صرف انسانوں سے محبت نظیر کا ایمان ہے، بلکہ وہ حیوانوں اور چرندو پرندے بھی انسیت اور ہمدردی رکھتے ہیں، انسانی ہمدردی اور رواداری کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام میں جو مذہبی بے تعصبی کا انداز پایا جاتا ہے وہ نہایت قابل تعریف ہے

نخلستان

ایک مقام پر روح نظیر میں محمود اکبر آبادی نے ہر پہلو کی طرف مکمل کر اشارہ کیا ہے۔

نظیر کے اخلاق کا سب سے زیادہ نمایاں جوہر اُن کی بے تعصبی ہے۔

اگر وہ کسی جگہ اسلامی معاشرت کے کسی مظہر پر روشنی ڈالتے ہیں تو دوسری جگہ فوراً ہی ہندو سوسائٹی کے ہم رتبہ و ہم رنگ شے کا تذکرہ اسی حیثیت سے اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک مصرعے میں مسجد کا ذکر ہے تو دوسرے میں مندر کا ذکر لازمی ہے۔

اسی طرح نظیر اکبر آبادی کے یہاں درویشوں اور صوفیوں کی حالت رقم ہونے کے بعد ہندو جوگی اور تیاگی کا بیان ناگزیر ضروریات اخلاق میں سے ہے۔ نظیر نے اپنی شاعری میں ہندو مسلم جذبات کا ایسا نازک توازن قائم رکھا ہے جس پر مذہبی تفریق کا بڑے سے بڑا حامی اور متعصب بھی اعتراض نہیں کرسکتا۔

اگر نظیر کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو یقیناً مذکورہ امور کی از خود تصدیق ہوجاتی ہے۔ نظیر جو ایک درویش صفت انسان تھے۔ اُن کے نزدیک بنیادی طور پر اخلاقیات اور جملہ مذاہب کی تعلیمات باہم کر منافی نہیں ہیں بلکہ کسی بھی مذہب کا پیرو اُن کی نظر میں واقعی ایک مکمل انسان ہو سکتا ہے جس سے محبت اور ہمدردی ضروری ہے۔ نظیر کی ایسی انسان دوستی اور وسیع النظری کی مثالیں کم شاعروں میں ملیں گی۔ یہ صفات خاص طور پر صوفیوں اور درویشوں کا ہی طرۂ امتیاز ہیں۔ وہ سماج کے مختلف فرقوں اور گروہوں کے تہذیبی اجتماعات کو بڑے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور باہمی اعتماد اور میل جول کے ایسے منظر نامے اُن کی شاعری کا جزو لا ینفک ہیں۔ مثال کے طور پر چند بند نظم "ہولی" اور "دیوالی" سے پیش خدمت ہیں۔

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا، بیٹھے ہوں گلرو رنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہولی کی کچھ ناز و ادا کے رنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے کچھ عیش کے دم منہ چنگ بھرے
کچھ گھنگرو تال جھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس رنگ رنگیلی مجلس میں وہ رنڈی ناچنے والی ہو
منہ جس کا چاند کا ٹکڑا ہو اور آنکھ بھی مے کی پیالی ہو
بدمست بڑی متوالی ہو ہر آن بجاتی تالی ہو
مے نوشی ہو بے ہوشی ہو بھڑوے کے منہ پر گالی ہو
بھڑوے بھی بھڑوا بکتے ہوں پھر دیکھ بہاریں ہولی کی

دیوالی کے طور دیکھئے۔

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دیوالی کا — ہر اک طرف کو اُجالا ہوا دیوالی کا
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا دیوالی کا — کسی کے دل کو مزہ خوش لگا دیوالی کا
عجب بہار کا دن ہے بنا دیوالی کا

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار — کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے ادھار
کھلونے کھیلوں بتاشوں کا گرم ہے بازار — ہر اک دکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دیوالی کا

حسینوں کے نازک ہاتھوں میں بندھی رنگ برنگی راکھی دیکھ کر نظیر کے دل میں دیکھئے کیا ارماں ہیں۔

سجی ہے ہر طرف کیا کیا سلونوں کی بہار اب تو
ہر اک گلرو پھرے ہے راکھی باندھے ہاتھ میں خوش ہو
ہوس جو دل میں گذرے ہے کہوں کیا آہ میں تم کو
یہی آتا ہے جی میں بن کے باہمن آج تو یارو
میں اپنے ہاتھ سے پیارے کے باندھوں پیار کی راکھی

نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں "بنجارہ نامہ" اور "ہنس نامہ" اخلاقی تعلیم کی شاہکار تمثیلیں ہیں۔ جن میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور انسان کی چند روزہ حیات کو ایک سفر کے مانند قرار دیا گیا ہے۔

گر تو ہے لکھی بنجارہ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ منقا، سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

**ہنس نامہ**

دنیا کی جو الفت ہے تو اس کی ہے یہ کچھ راہ
جب شکل یہ ہووے تو بھلا کیونکہ ہو نرباہ
ناچاری ہو جس جا میں تو واں کیجئے کیا چاہ
سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

ہندوستان کی برسات کا منظر "برسات کی بہاریں" میں ملاحظہ کیجئے۔

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں — سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاہٹ قطرات کی بہاریں — ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں — جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں — گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

نظیر اکبر آبادی نے جہاں بلدیو جی کا میلہ، جنم کنہیا جی معجزہ حضرت علی حضرت سلیم چشتی پر نظمیں لکھی ہیں وہیں نانک شاہ گرو کی شان میں ایک بلند پایہ نظم کہی ہے۔ دو بند ملاحظہ فرمائیں:۔

ہیں کہتے نانک شاہ جنہیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو — وہ کامل رہبر ہیں جگ میں یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود مراد، امید سبھی بر لانے ہیں دلخواہ گرو — نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

جو ہر دم ان سے دھیان لگا امید کرم کی دھرتے ہیں — وہ ان پر لطف و عنایت سے ہر آن توجہ کرتے ہیں
اسباب خوشی اور خوبی کے گھر بیچ انہوں کے بھرتے ہیں — آنند عنایت کرتے ہیں سب من کی چنتا ہرتے ہیں

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

بلاشبہ نظیر اکبر آبادی کا کلام ہندوستان کے ہر مذہب اور ہر فرقہ کے لوگوں کے لئے ایک پیغام ہے۔ اُن کا پیغام ان کی تمام نظموں میں رچا بسا بھی ہے۔ وہ ہندو مسلم سکھ عیسائی غرض ہر مذہب کے ماننے والوں کا احترام کرتے ہیں اور انھیں اتحاد و یک جہتی اور میل ملاپ کے ساتھ پرسکون زندگی گزارنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کی بیشتر شاہکار نظمیں اب بھی بزرگوں اور نوجوانوں کی توجہ اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں کے بند اب بھی ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے لوگوں کی زبان پر ہیں۔ خوشامد، کلجگ، موسم زمستان، اوس، کورا برتن، ریچھ کا بچہ، چاندنی رات، بلدیوجی کا میلہ عید، شبرات، بھی اُن کی مشہور اور مقبول ترین نظمیں ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کے سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اُن کی نظموں میں ہندوستان کی دھرتی اس کے کوہ و دریا، گلشن و صحرا، اس کے موسموں کی گوناگوں کیفیات کی مرقع کشی ملتی ہے۔ اُن کے کلام میں تشبیہات و استعارات بھی خالص ہندوستانی عناصر سے ماخوذ ہیں وہ ایران و عرب کے دریاؤں اور حسن و عشق کی کہانیوں کے بجائے گنگا جمنا، ہیر رانجھا کا ذکر کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہاں کے چرند پرند کا ذکر کرتے ہیں جس کا غالباً سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انھیں اپنے وطن سے والہانہ محبت ہے کہ وہ اس کے ذرے ذرے کو لائق پرستش سمجھتے تھے۔ اُس کے جملہ مظاہر و مناظر سے انھیں فطری لگاؤ ہے اور خارجی دنیا کے حسن و جمال کے وہ زمزمہ خواں ہیں۔ اپنے وطن کے شریف معصوم اور سیدھے سادے انسانوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُن سے بے پناہ ہمدردی اور محبت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ انھیں اپنے وطن کے کورے برتن کی سوندھی خوشبو مشک وغیرہ سے کہیں زیادہ عزیز ہے

ڈاکٹر عبید الرحمٰن ہاشمی
لکچرار شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ

# قومی یکجہتی اور اقبال

شاعری جو بنیادی طور پر اپنا ایک جمالیاتی کردار رکھتی ہے اور اس سبب سے اُس کے اپنے حدود ہیں اس سے کسی منضبط خیال، فلسفے اور تصور کا استخراج بجائے خود نت نئے مسائل پیدا کر دیتا ہے، تاہم اکثر اس خطرے کو مول لینے کی ضرورت پڑتی ہے، اقبال کے مطالعے میں بھی اس خطرے سے گریز ناممکن ہے۔ قومی یک جہتی جیسے معاملات جن کے ڈانڈے یکسر سیاست سے جا ملتے ہیں۔ اُن کا کوئی واضح نقشہ کسی بڑی شاعری میں غالباً ناپید ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عظیم شاعری کا شجر وقتی، ہنگامی اور مقامی حدود و حصار کی پابندیوں میں رہ کر پوری آزادی کے ساتھ نہ پروان چڑھ سکتا ہے۔ اور نہ سرسبز و شاداب ہو سکتا ہے۔ شاعر اپنے مسلک کے اعتبار سے قومی سے زیادہ بین الاقوامی زمانی سے زیادہ لازمانی اور وطنی سے زیادہ دوامی قدروں کا محافظ اور امین ہوتا ہے۔ اقبال بھی ہمارے انھیں شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے بہت جلد اپنی شناخت کر لی، اور زندگی کے محدود اور سطحی مباحث سے نکل کر اس کی لامحدود

رفعتوں اور بے پناہ ارزانیوں کی تلاش میں سرگرم ہوگئے۔

اقبال کی اس رفیع الشان شاعرانہ کائنات کے مطالعہ سے ہمارے سامنے اس کی کئی سطحیں اور تفہیم کے کئی گوشے آتے ہیں۔ اقبال کے ہاں ابتداً بعض موضوعاتی نظمیں ملتی ہیں جن میں واضح خیالات اور شعور کی ابھری پرتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور یہ ہر اس شاعری کا خاصہ ہوتا ہے جو ابھی عالم طفولیت میں ہوتی ہے۔ ابتداً اس کے حواس کی گرفت میں صرف وہی چیزیں آتی ہیں جو اس کے اردگرد ہوتی ہیں اور جس سے وہ زیادہ مانوس ہوتا ہے۔ لیکن شاعرانہ ادراک کا یہ دائرہ بتدریج بڑھتا رہتا ہے۔ اقبال کے تخلیقی سفر پر جن کی نظر ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اقبال کے شاعرانہ تصور کی دنیا بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھی ہے۔

اس تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی شاعرانہ کائنات کے ابتدائی سرے پر کوہ ہمالہ ہے جو ہمارے تصور کو ایک سرزمین عطا کرتا ہے۔ اس عہد میں قومی یکجہتی کے نقطہ نظر سے جو چیز بہت اہم ہے وہ یہ ہے کہ شاعر کے عرصہ حواس پر رام اور گرو نانک کی عظمت کا پرتو سایہ فگن ہے، دوسرے مذاہب کے رہنماؤں کے تئیں اس درجہ عقیدت و احترام کا سبب ان شخصیتوں کی دائمی روحانی تجلی اور ان کی درخشاں تعلیمات ہی ہو سکتی ہیں جن کی کشش شاعر کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ شاعر، اسلام کا نام لیوا ہونے کے باوجود اقدار کی جستجو میں کسی تعصب و تنگ نظری میں گرفتار ہوئے بغیر ان تمام سرچشموں تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جہاں سے زندگی کے لئے مثبت اور ایجابی اقدار اسے میسر آسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں اس کے لئے دنیا کے مذاہب ہنود، سکھ، عیسائی، یہودی اور مجوسی رکاوٹ کا سبب نہیں بنتے۔ حد یہ ہے کہ اس کی نظر سوشلسٹ انقلاب سے بھی کچھ نہ کچھ صحت مند عناصر چن لیتی ہے جو اپنی مجموعی کیفیت کے اعتبار سے اسلام کی ضد ہیں۔ اسی طرح اقبال نے ان دانشوروں فلسفیوں شاعروں اور ادیبوں کے فکری سرمائے سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا جو بظاہر کسی دین کے ماننے والے نہ تھے، میری مراد مارکس، لینن برگساں، نیٹشے اور شوپنہار وغیرہ سے ہے۔

البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ جوں جوں اقبال کا فکری دائرہ وسیع ہوتا گیا، اُن

کی توجہ کا اصلی محور اسلام اور اُن کے نزدیک مثالی شخصیتیں کا درجہ جنھیں حاصل ہوا وہ دورِ نبوت سے تعلق رکھنے والی نفوسِ قدسیہ بنی رہیں۔ یعنی اقبال نے کسی مذہب اور والیان مذہب کی نفی کرنے کے بجائے اِن کی مُثبت خوبیوں کو بڑی محبت و عقیدت کے ساتھ چن لیا لیکن اسلام کی حیثیت اُن کے نظام فکر و اقدار میں نقطہ پرکار حق کی رہی اور اس لحاظ سے اقبال کی ابتدائی فکر میں اور بعد کی شاعری میں کسی قسم کا تضاد یا تصادم ہونے کے بجائے ایک مستقل ہم آہنگی تسلسل اور گہرا معنوی ربط محسوس ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کے بعض شارحین جو ابتدائی دور کی شاعری کو قومی یک جہتی اور خیر سگالی کے لحاظ سے اہم قرار دیتے ہیں۔ اور بعد کی شاعری میں فرقہ پرستی کی بو محسوس کرتے ہیں، انھیں ایسا نہ سوچنا چاہیے اس لئے کہ یہ ایک ایسی غلطی کے سزاوار ہوتے ہیں جس کا ازالہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ اور یہ غلطی محض اس لئے لوگ کرتے ہیں کہ وہ اقبال کو ٹھنڈے دل سے پڑھنے تک کی زحمت گوارہ نہیں کرتے، اُن کے نزدیک اقبال کا یہ جرم ناقابل معافی ہے کہ اقبال زندگی کے تمام مصائب و مسائل کا حل اسلام بتلاتے ہیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام پسند ہونے یا خود کو اسلام سے (IDENTIFY) کرنے کے معنی فرقہ پرستی کے کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اس ملک میں اعلیٰ ادبیات (CLASSICS) کی تمام تر سنسکرت اور ہندی روایت کا انحصار موضوع اور مواد کے لحاظ سے ہندو مت اور ہندو فلسفے پر رہا ہے، چاہے اُس کا تعلق کالیداس کے کارناموں سے یا بالمیک تلسی داس سورداس، کبیر داس اور ٹیگور وغیرہ سے ہو، ان تمام شاعروں کا ذہن اور اس کے توسط سے اُن کی تخلیقی کائنات مذہبی روح سے سرشار ہے۔ لاطینی، جرمن یونانی اور انگریزی شاعری کا سب وقیع، قابل قدر اور لافانی شاہکار اکثر وہی کاوشیں ہیں جن کا سرچشمہ عیسائیت ہے۔ کیا محض اِن وجوہ سے کہ اُن تمام افکار کی دُنیا مذہبی تجربات سے معمور ہے۔ ہم انھیں نظر انداز کرنے کی جراَت کر سکتے ہیں! شاید نہیں، اس لئے کہ اُن بیش بہا موتیوں سے خالی ہونے کے بعد ادب و شعراء کی زمین ایک چٹیل میدان کے سوا کچھ نہیں رہتی، جس سے سر ٹکرانا موت کے مترادف ہے، مذہبی یا روحانی شعور شعر و ادب کے سدا بہار شجر کے

وہ مہکتے پھول ہیں جو کبھی مرجھاتے نہیں۔ انسانی ذہن کی بے کراں وادیوں میں اُن کی خوشبو زندگی کو ایک نئے ولولے اور شوق سے ہمکنار کرتی ہے۔ اقبالؔ اُن مہکتی فضاؤں کے عاشق ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ یہ فیضان دوسروں تک بھی منتقل ہو۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب
شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرے سجود بھی حجاب

اقبالؔ نے جس عہد میں شاعری شروع کی وہ زمانہ جہاں ایک طرف ملکی سامراجیت کے سبب سخت ابتلا و آزمائش کا دور رہے وہیں یہ پورے ایشیا کے لئے انسانیت کے زوال اور بدترین ہلاکت کے لئے بھی یادگار رہے۔

یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ مغربی تہذیب کے خلاف نبرد آزمائی کی مہم کا جو سلسلہ بہت پہلے سے چلا آرہا تھا۔ اور جس کے صلے میں ۱۸۵۷ء کی تاریخ کے اوراق خاک و خون میں لت پت ہو گئے تھے لیکن واضح نصب العین اور مطمح نظر کی عدم موجودگی کے سبب یہ مہم تقریباً بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اقبالؔ کے وسیلے سے بیسویں صدی میں یہی مہم ایک نئے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب ملک کی بڑی مقتدر ہستیاں امرار و رؤسا اور اکثر مذہبی و قومی رہنما اپنے جبہ و دستار انگریزی سامراج کے قدموں پر رکھ چکے تھے۔ اور ملکی اُن کا معیار فضیلت بن چکا تھا۔ اقبالؔ نے ان کی غیرت کو آواز دی اور آگے بڑھ کر تن تنہا اُس سقراطی منصب پر فائز ہونے کے لئے تیار ہو گئے

ایک زمانہ شاہد ہے کہ اقبال کے عزائم کی پختگی، ایمان کی قوت اور شعور کی ضیا نے ان منزلوں کے نشان صاف روشن کر دیئے جن کی رمق سے بھی ابھی لوگ ناآشنا تھے۔ اور ان کی وفات کے چند ہی سال بعد اس ملک کے ہاتھ میں کامرانی کا پھریرا لہرانے لگا۔ ہمارا ملک برسہا برس کی غلامی سے نجات پا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اقبال نے مغربی تہذیب کے خلاف اس جنگ میں عقیدہ اور دین کو ایک لازمی حربے کے طور پر شامل نہ کیا ہوتا اور محاذ آزادی پر اس درجہ استقامت کا ثبوت نہ دیا ہوتا تو یہ ملک ہنوز نہ جانے کتنے عرصہ تک ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا۔ اقبال نے مغربی استعمار کے خلاف جو علمی منطقی اثباتی اور راستہ لالی محاذ قائم کیا بالآخر وہی ظفریابی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ نہ صرف یہ کہ انگریز کو ہندوستان سے نکلنا پڑا بلکہ پورے ایشیا میں اس پر زمین تنگ ہوگئی اور یکے بعد دیگرے تمام ایشیائی ممالک اس کے خونی پنجے سے نکل آئے۔ اقبال نے حصولِ آزادیٔ کامل کے لیے جو عمل اور نظریاتی محاذ قائم کیا تھا اس کی معنویت وقت کے ساتھ مزید واضح ہوتی جائے گی۔ اقبال نے مغربی تہذیب و تمدن کی بے بضاعتی کو جس طرح نمایاں کیا ہے اور اس تمدنی ڈھانچے پر جو ضرب لگائی ہے وہ اتنی شدید اور کاری ہے کہ اس کو لفظوں میں بیان کیا ہی نہیں جا سکتا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

ہوا نہ زور سے اس کے کوئی گریباں چاک
اگرچہ مغربیوں کا جنوں بھی تھا چالاک

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت!
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ان اشعار پر غور کیجئے تو یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ملکی آزادی کی جدوجہد کی طویل تاریخ میں کوئی دور اس درجہ معنی خیز تصادم کو بروئے کار لانے کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا، صرف اقبال ہی ہیں جنھوں نے اُن تصادمات کو جنم دیا اور بالآخر آزادی اُن کی دانشورانہ کاوشوں کا منطقی نتیجہ ثابت ہوئی۔

البتہ یہ بات نہایت حیرت انگیز ہے کہ جب ملکی و قومی آزادی کے سرفروشوں، جاں نثاروں شہیدوں اور غازیوں کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہمارے ملکی دانشوروں کو اقبال یاد نہیں آتے، اگر کبھی ان کا ذکر بھی ہوتا ہے تو اس انداز سے جیسے کسی کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا ہو اور اُس سے باز پرس کی جا رہی ہو۔ غور کیجئے۔ تو اس ذہنی تعصب اور تنگ نظری کے پیچھے صرف ایک محرک کارفرما نظر آتا ہے اور وہ ہے اقبال کا ملی اور دینی شعور اقبال کا یہ جرم واقعی اتنا بڑا ہے کہ بلا تامل انھیں گردن زدنی قرار دیا۔

جا سکتا ہے۔ اقبال جو بلاشبہ ایک پختہ عقیدے کے مسلمان تھے وہ عہد جدید میں اسلام کے سب سے بڑے شارح اور رہنما من تھے۔ وہ اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ کہ مغربیت کا سیل بلا خیز جو ہر چیز کو اپنی بھنور میں لا کر تباہ و برباد کرنے کے درپے تھا۔ سوئے اتفاق سے برصغیر کے مسلمانوں کے لئے یہ گھڑی کچھ زیادہ ہی آزمائشوں اور صعوبتوں کی گھڑی ثابت ہوئی۔ مسلمان قوم جہاں ایک طرف پوری دنیا میں مختلف طرح کی سیاسی ریشہ دوانیوں کی شکار تھی اس ملک میں بھی معاشی تعلیمی اور سب سے زیادہ اخلاقی خستہ حالی کی شکار تھی۔ اس کی ہیئت اجتماعیہ بکھر چکی تھی ؎

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی    پھول کو باد بہاری کا پیام آیا تو کیا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی    جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا
حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی    ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

اِن حالات میں مسلمان ملّت کی دینی بنیادوں پر شیرازہ بندی کرنا۔ کیا وقت کا سب سے اہم تقاضا نہ تھا۔ اقبال کی فکر میں گرانباری کا یہ احساس فطری وجوہ سے شدّت اختیار کرتا چلا گیا۔ انہوں نے ملّت کے نوجوانوں کو اکثر درشت لہجے میں اُن کی غفلت کوشی اور سہولت پسندی کے مضرات سے آگاہ کیا مثلاً کہتے ہیں۔

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی    کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی    ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازی افلاک    خودی کی موت ہے تیرا زوال نعمت و جاہ
کچھ قدر تو نے اپنی نہ جانی!    یہ بے سوادی یہ کم نگاہی
مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے    پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے
حیدری فقر ہے نے دولت عثمانی ہے    تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے

اقبال کو یقین ہے کہ اسلام سے سچی اور والہانہ وابستگی زندگی کو یکسر نئے رُخ پر ڈال سکتی ہے اور اُسے نئی سمت و رفتار سے آشنا کر سکتی ہے۔ ؎

ملت عالم کا مسلم کوکب تابندہ ہے
جس کی تابانی سے افسونِ سحر تابندہ ہے

حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

صنم کدہ ہے جہاں اور مرد حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے

عجب نہیں کہ مسلمان کو پھر عطا کر دیں
شکوہ سنجر و فقر جنید و بسطامی

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سر کلیم و خلیل

آہ وہ مردانِ حق وہ عربی شہسوار
حامل خلق عظیم صاحب صدقِ یقین

نفس نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

اقبال کی دینی اور معاشرتی فکر کے اس پس منظر کو ان کی اجتماعی فکر یا قومی شعور سے الگ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا، اس لئے کہ یہ تمام چیزیں ایک دوسرے سے باہم مربوط اور ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ یعنی یہ ایک دوسرے کی ضد ہونے کے بعد ان کے تکملہ کا فریضہ انجام دیتی ہے یہ خیالات بعض لوگوں کے نزدیک قومی یکجہتی کے راستے میں اصل رکاوٹ کا سبب ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں اقبال کا کیا قصور ہو سکتا ہے، یہ اگر کوئی جرم ہے تو اس کا اطلاق ہمارے ملک کے دیگر دینی و مذہبی رہنماؤں پر ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اقبال ہی کی مانند اس ملک کے غیر مسلم رہنماؤں، مثلاً راما نج اور پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ نے اپنی قوم کے افراد کے اخلاقی

بگاڑ کو دور کرنے اور اس معاشرے کی اصلاح کے لئے لگاتار کوششیں کیں کیا یہ کوششیں قومی یک جہتی کی راہ میں مزاحم کہی جا سکتی ہیں۔

اقبال کے تمام تر پیغامات کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمان جو اپنی اصل سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ دوبارہ اسی اصل کی طرف مراجعت کرے اس لئے کہ اس کی شناخت کا واحد وسیلہ اسلام ہے اور اسلام سے بیگانہ ہو جانے کی صورت میں اس کی شناخت ناممکن ہو چکی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اقبال ملت کے فرزندوں کو کہیں خودی کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ کہیں عشق کا کہیں اخوت اور مروت کا ____________

سبق پڑھاتے ہیں کہیں اسلاف کے عظیم اور لافانی کارناموں کا ذکر کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اس بیمار ملت کے مادی وجود میں طرح طرح کے فاسد مادے جمع ہو گئے ہیں۔ جب تک یہ زہریلے اثرات دور نہ ہوں گے۔ صحت جسمانی حاصل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اس کی کثافت سے نجات پانے کے لئے اسلامی سرچشمے میں محفوظ پاک وصاف اور تازہ پانی میں غوطہ لگانا از بسکہ ضروری ہے۔

ان باتوں میں بعض لوگوں کو فرقہ پرستی کی بو آتی ہے۔ کیا مثبت، آفاقی اور روحانی سرچشمہ کی خبر دینا کسی لحاظ سے فرقہ پرستی کہا جا سکتا ہے، اگر یہ فرقہ پرستی ہے تو نہایت مبارک ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہم مسلک اور ہم مذہب بھائیوں کی فلاح ومنفعت اصلاح اور طہارت کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں، یہ ان کا انسانی فریضہ ہی، اس فرض سے پہلوتہی یا غفلت ایسا جرم ہے۔ جو کسی طرح قابل معافی نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ قومی یک جہتی کے مفہوم سے آشنا ہیں وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کریں گے کہ ہندوستان جیسے عظیم و وسیع اور تاریخی ملک میں الگ الگ ملتوں کے وجود کو نہ یکسر ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی مصنوعی اور غیر فطری طریقے سے ایک دوسرے میں ضم کیا جا سکتا ہے۔ اس ملک کا بقول مسز گاندھی ایک MOSAIC CULTURE ہے۔ اور اس کا تمام تر حسن وجمال مختلف ثقافتوں کی یکسانیت کے بجائے عدم یکسانیت میں پوشیدہ ہے۔ اقبال کے آفاقی پیام کی روح بھی یہی ہے کہ مسلمان اپنی اخلاقی شیرازہ بندی

کرے۔ مسلمان کا اصلی منصب اقبال کے پیغام کے مطابق یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے قومی مفادات اور اقتصادی مسادات کا نعرہ لگاتا رہے اور اس ملک کی غیر مسلم اکثریت کا حریف بن کر سامنے آئے۔

اُن کے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی دیرینہ روایت کے مطابق ملک کی مظلوم انسانیت کی بلاتخصیص نسل و رنگ، مذہب و ملت، قلبی اخلاص اور للہیت کے ساتھ خدمت انجام دے اور اس کے صلے میں فوری مادی منفعتوں پر نظر رکھنے کے بجائے آخرت کی بخششوں کو اپنا مقصود بنائے۔ بلاشبہ اس مسلک پر گامزن ہونے کے بعد مسلمان اس ملک کے مظلوموں غریبوں، بیکسوں اور مفلسوں کی آنکھوں کا تارا بن سکتا ہے۔ لیکن جب اس نے اس مشکل کام کو چھوڑ دیا اور ادنیٰ مقاصد کے تئیں فقط منافقت جھوٹی خوشامد اور چاپلوسی کی روش اختیار کی تو کون نہیں جانتا کہ اس کی جھولی میں سنگِ ملامت کے سوا کچھ نہ آیا۔ اس طرز زندگی کے گذارنے کے صلے میں پوری قوم اس ملک میں جس کسمپرسی سے دوچار ہے وہ کہیں معاشی خستہ حالی کی صورت میں نمایاں ہے تو کہیں تعلیمی اور دوسری شکلوں میں ہوش مندوں کے لئے ایک عظیم چیلنج بن کر زبان حال سے اپنی داستان سناتی ہے۔ لیکن میرے خیال سے اس قوم کا زوال نہ تو اقتصادی ہے نہ سیاسی اور نہ تعلیمی۔ اس کا اصل زوال اخلاقی ہے جس نے پوری قوم کی ردا چاک کر ڈالی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ قوم اور برادران وطن کے لئے معاون و غمگسار مونس و مددگار ہونے کے بجائے ایک اور دردناک LIABILITY بن چکی ہے۔ اس طرز زندگی نے معاشرے میں کیسے فساد و نما کئے ہیں۔ آزادی ہند کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے۔

اقبال کا تصور ہے کہ اُن کے آئینہ ادراک پر مستقبل میں پیش آمدہ یہ مسائل بہت پہلے عکس ریز ہو گئے تھے۔ اور اسی لئے وہ اس بیمار ملت کی تعمیر نو کا خواب دیکھتے رہے تھے ؎

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام

روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے جام
قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اقبال کی تابندہ تفکر اور تعلیمات پر جن کی نظر ہے وہ آج بھی اس حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ اس ملک میں قومی یک جہتی کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے سلسلے میں مسلمان فی الواقع کوئی معنی خیز خدمت اس وقت تک انجام نہیں دے سکتا جب تک وہ اپنی ہیئت اجتماعیہ کی اخلاقی بنیادوں پر شیرازہ بندی نہیں کرتا اور وہ صرف اسلام سے سچی اور مخلصانہ وفاداری پر منحصر ہے۔

٭

(گذشتہ سے پیوستہ)

ڈاکٹر محمد علی زیدی

# فراق کی غزل گوئی۔ ایک جائزہ

رات کے پس منظر میں فراق مناظرِ فطرت کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ رات، پچھلے پہر شام ستارے، چاند اور رجوان رات وغیرہ کے مناظر اُن کی نظموں اور رباعیوں میں ہی نہیں ملتے بلکہ اُن کی غزلوں میں بھی شدید تاثر کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ انھیں مناظر فطرت سے گہرا لگاؤ تھا اور یہ رجحان وابستگی تک پہنچا ہوا تھا۔ ان مناظر کے نقوش اتنے گہرے ہیں کہ دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تاثر اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ تجربے کی صداقت اور مشاہدے کی بصیرت نہ ہو۔ فراق کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

شبِ مہ کی وہ ٹھنڈی آنچیں وہ شبنم
ترے حسن کے رسمسانے کی راتیں
جوانی کی دوشیزگی کا تبسّم
گلِ راز کے وہ کھلانے کی راتیں

تم نہیں آتے اور رات رہ گئی راہ دیکھتی
تاروں کی مخملیں بھی آج آنکھیں جھپک گئیں

اف یہ مہکی ہوئی سہانی رات
چہرۂ شب کی آب و تاب ہے تو

فرقت کی غمگیں راتوں کو یاد میں تیری رو لیں ہیں
تاروں کو جب نیند آتی ہے ہم بھی گھڑی بھر سو لیں ہیں

یہ تیرگی یہ اتری، یہ نکہتیں یہ مستیاں!
کہ کھل پڑی ہو جس طرح وہ زلف عنبریں کہیں

داستان عشق کی دہرا گئی تاروں بھری رات
کتنی یادوں کے چراغ آج جلے اور بجھے

ستارے جاگتے ہیں رات لٹ چھٹکا کے سوتی ہے
دبے پاؤں کسی نے آکے خواب زندگی بدلا

فراقؔ نے اپنے لسانی طرزِ احساس سے ایک شدید رومانی فضا پیدا کی ہے۔ اِن اشعار میں ایک داخلی کیفیت ہے جو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی اُردو کے بہت کم شاعر ایسی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔ انھوں نے رات کے مختلف روپوں میں محبوب کا نام لئے بغیر ہی حسن کو اس طرح جڑا ہے کہ سرور وانبساط کی ایک رومانی فضا پیدا ہوجاتی ہے۔ انھیں مناظرِ شب سے وہ دلکش تشبیہات واستعارات بھی حاصل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر فراقؔ کے یہ اشعار دیکھئے ؂

وہ نوبہار ناز اٹھا، فضائے صبح جاگ اٹھی
وہ تازگی، وہ حسن وہ نکھار وہ صباحتیں

تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بہ قدم
رُکے رُکے سے کچھ آنسو رکی رکی سی ہنسی

فراق کا اردو فارسی، ہندی اور انگریزی زبانوں کے ادب کا مطالعہ وسیع و عمیق تھا۔ اردو اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، انگریزی کے وہ استاد تھے اور ہندوستان کے اساطیری ادب سے انھیں پوری واقفیت تھی اسی لئے انہوں نے شعوری طور پر شاعری میں اس دھرتی کی سوندھی خوشبو پیدا کی۔ فراق اردو شاعری میں عربی و ایرانی ثقافتی اثرات کے خلاف نہیں تھے۔ بلکہ اُن کی غزلوں میں بیش تر یہی اثرات کارفرما ہیں لیکن اُن کی یہ کوشش رہی کہ ہندوستان کی دھرتی سے اس کا قریبی تعلق رہے اور یہاں کے قدیم تہذیبی عناصر کو اشعار میں جذب کیا جائے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"میں اس حقیقت کو بہت اہمیت دیتا ہوں کہ اردو شاعری میں ہندوستانی کلچر اور ہندوستانی مزاج کا غالب عنصر ہوتے ہوئے بھی اردو شاعری کو فارسی عربی اور دنیا کی دیگر زبانوں میں جو آفاقی کلچر کے عناصر ہیں انھیں ضرور جذب کرلینا چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی چاہتا ہوں کہ اُردو ادب و شاعری میں ہندوستانیت اور بلند ترین ہندوستانیت اسی طرح کوٹ کوٹ کر بھردی جائے جیسے جرمن ادب میں جرمنیت، روسی ادب میں روسیت اور حجازی ادب میں حجازیت۔" (عرضِ حال از فراق شبنمستان)

فراق کی یہ رائے بہت متوازن اور دانشورانہ ہے اور کوئی بالغ نظر اور صاحب رائے اس سے اختلاف نہیں کرسکتا۔ انہوں نے اپنے اس خیال کو قول کی حد تک ہی نہیں رکھا بلکہ خلوص نیت سے عمل بھی کیا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ہندوستانی تہذیبی عناصر کو اس طرح سمویا ہے کہ اُس میں رنگینی، گھلاوٹ سادگی اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں دیومالاؤں اور اساطیری داستانوں کی ہی بازیافت نہیں کی ہے بلکہ یہاں کی ہواؤں اور فضاؤں، موسموں اور دریاؤں، گلوں کی رنگینیوں اور بہاروں کی دلفریبیوں، تاریکیوں اور چاندنی راتوں سے استعارات و تشبیہات اخذ کرکے یہاں

کی دھرتی کی سوندھی خوشبو پیدا کر دی ہے ۔ انہوں نے ارضیت اور ہندوستانیت کے حسین مرقع پیش کئے ہیں ۔ نظموں اور رباعیوں میں اس کی گنجائش کافی ہے ۔ اس لئے ان میں انھیں اپنے فنکارانہ کمالات دکھانے کے پورے مواقع حاصل تھے ۔ اور انہوں نے ان سے استفادہ کیا لیکن غزل نازک مزاج صنف سخن ہے ۔ ایجاز و اختصار اور رمز و کنایہ اس کے عناصر ترکیبی ہیں اس کا ایک مخصوص کلچر ہے ۔ اس لئے غزلوں میں یہ ارضی خالص ہندوستانی فضا پیدا کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے ۔ لیکن غزل کے مختصر و محدود کینوس میں بھی ہندی اور سنسکرت کے مخصوص الفاظ استعمال کر کے ہندوستانی فضا پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔ ان میں ہندی اور سنسکرت کے عام فہم الفاظ کے استعمال نے ایک مخصوص ہندوستانی فضا پیدا کر دی ہے ؎

روپ ایسا حسین جیسے گناہ　　　　خلق کا حاصل ثواب ہے تو

گاہ ترس جائیں ہیں آنکھیں رسجل روپ کے درشن کو

گاہ نیند بن کے راتوں کو نین پٹوں میں آؤ ہو

---

پہروں پہروں تک یہ دنیا بھولا سپنا بن جائے ہے

میں تو سراسر کھو جاؤں ہوں یاد اتنا کیوں آؤ ہو

---

ان اشعار میں اگر ہندی کے الفاظ کے بجائے اُن کے مرادف اُردو کے الفاظ استعمال کئے جاتے تو وہ ہندوستانی اور ارضی فضا پیدا نہ ہوتی جو ان کے استعمال سے پیدا ہو گئی ۔ اگر مذکورہ پہلے شعر میں روپ کے بجائے حسن استعمال کیا جاتا تو ہندوستانی دھرتی کی سوندھی خوشبو پیدا نہ ہوتی چند اشعار اور ملاحظہ کیجئے ۔

بہت دنوں میں یاد کیا ہے بات بنائیں کیا ان سے

جیون ساتھی دکھ پوچھیں ہیں کس کو سہیں تم سونپو ہو

ماتھے سے مرے دھوپ اتری تھی سہانی
میں بھی تھا کبھی تیری نگاہوں کا گذرگاہ

---

کسی گونگے کا ہے سپنا تو سمجھا بہروں کی
عشق وہ قصّہ جسے کون کہے کون سنے

---

رات چلی ہے جوگن ہوکر بال سنوارے لٹ چھٹکائے
چھپے فراق گگن پر تارے دیپ بجھے ہم بھی سو جائیں

---

زلفِ شب گوں کی چمک پیکرِ سیمیں کی دمک
دیپ مالا ہے سرِ گنگ وجمن کیا کہنا

اِن اشعار میں نہ صرف قدیم اور جدید رنگوں کا حسین امتزاج ہے۔ بلکہ خالص ہندوستانیت بھی ہے۔ جس نے اس دیش کی دھرتی سے اِن کا رشتہ استوار کر دیا ہے۔ اِن میں جذبے کی شدت اور اظہار کی ندرت بھی ہے۔ اردو کے اور بھی ایسے شعراء ہیں جن کی شاعری میں ارضیت ہے۔ مثلاً حسرت موہانی، جوش، میر انیس، اختر شیرانی وغیرہ، لیکن اِن کے تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ کہ فراق کی ارضیت کی نوعیت جداگانہ ہے۔ میں نے مثالوں کو صرف ان کی غزلوں کے اشعار تک ہی محدود رکھا ہے۔ کیوں کہ اس مضمون میں اِن کی غزل گوئی سے ہی بحث کی گئی ہے۔

فراق اہلِ دل تھے۔ اہلِ عشق تھے اور انہوں نے ایسی من کی جوت جگائی تھی کہ جس سے حسن وجمال کی شعاعیں ہی نہیں نکلیں بلکہ حیات وکائنات کے رموز بھی آشکارا ہوئے۔ اُن کے جذبے کا سفر خارجیت سے داخلیت کی طرف ہے۔

اس خیال کی تائید میں فراق کا ہی ایک شعر پیش کرتا ہوں ؎

اپنے دِل سے غافل رہنا اہلِ عشق کا کام نہیں
حُسن بھی ہے جس کی پرچھائیں آج وہ من کی جوت جگائیں

پروفیسر احتشام حسین مرحوم نے اِن کی غزل گوئی کے خصائص اجمالاً ان الفاظ میں جامع طور پر بیان کئے ہیں۔ مرحوم نے شعرستان۔ فراق میں لکھا ہے۔

"اگر احساسات کی لطافت، جذبات کی شدت اور حُسن اظہار کی ندرت غزل میں ایک جگہ دیکھنا ہو تو فراق کی غزلیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ اِن سب کا کیمیاوی امتزاج پیش کرتی ہیں۔

فراق کے کچھ اور اشعار جو مجھے بہت پسند ہیں اور سادگی و پرکاری کے نادر نمونے ہیں ذیل میں پیش کر رہا ہوں۔

ہم سے کیا ہو سکا محبّت میں — خیر تم نے تو بے وفائی کی
دیکھ رفتارِ انقلاب فراق — کتنی آہستہ اور کتنی تیز
موت کا بھی علاج ہو شاید — زندگی کا کوئی علاج نہیں
غم فراق تو اس دن غم فراق ہوا — جب اُن کو پیار کیا میں نے جن سے پیار نہیں
تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو — تم کو دیکھیں کہ تم سے پیار کریں
غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست — وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں
ذرہ ذرہ کائنات کا رکھتا ہے اک ربط نہاں — اک پھول کو جنبش دو گے تو اک تارا کانپ اٹھے گا
زندگی کیا ہے اس کو آج اے دوست — سوچ لیں اور اداس ہو جائیں
شکوہ کیا ستم کا تو نم دیدہ ہو گئے — تم تو ذرا سی بات میں رنجیدہ ہو گئے

جب جب اُسے دیکھا ہے دل تھام لیا میں نے
انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ جو گزری

---

عظیم امروہوی

# شمالی ہند کا پہلا اردو مرثیہ نگار

# میر سیّد اسمٰعیل

شمالی ہند میں جب ہم اردو شاعری کی ابتدا اور آغاز کی جستجو میں نکلتے ہیں اور وقت کی گرد ہٹا کر تاریخ کے صفحات کی چھان بین کرتے ہیں تو اس ورق گردانی میں میر اسمٰعیل کا سراغ ملتا ہے۔ میر اسمٰعیل کا جس دور سے تعلق ہے اس دور میں اردو شعراء کے تذکرے نہیں لکھے گئے اسی وجہ سے جب ہم اردو شعراء کے تذکروں میں میر اسمٰعیل کو تلاش کرتے ہیں تو وہ نہیں ملتے۔ البتہ شیخ چاندؔ نے مرزا محمد رفیع سوداؔ سے متعلق جو مقالہ لکھا ہے۔ اس میں میر اسمٰعیل کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن اس مقالے سے ایک طویل مدّت کے بعد یعنی جب بیسویں صدی کا نصف گزر جاتا ہے۔ تب اسمٰعیل کا کچھ کلام سامنے آتا ہے اور بقول سہ ماہی "اردو" کراچی شمارہ اپریل ۱۹۵۱ء انجمن ترقی اردو پاکستان، کہ

شمالی ہند میں اس وقت تک جو پرانی اردو کتابیں دستیاب ہوئیں ان سب سے پرانی کتاب جو مجھے ملی ہے وہ وفات نامہ بی بی فاطمہؓ ہے اس کے مصنف کوئی اسمٰعیل ہیں جو امروہہ کے رہنے والے ہیں۔

بقول نائب حسین نقوی کہ "اردو ادب کی جتنی تاریخیں مرتب ہوں گی ان میں اسمٰعیل کی شخصیت کا شمول ناگزیر ہے" (اردو کی دو قدیم مثنویاں صفحہ ۹۳)

درحقیقت اسمٰعیل کا تعلق جس دور سے ہے اس دور کا جو کچھ بھی ادبی سرمایہ ہے اس پر تاریخ ادب اردو کی تعمیر ہوئی ہے اور اس کی بنیادی حیثیت ہے اب یہ ہماری اردو شاعری کا المیہ ہے کہ اس دور کا سارا سرمایہ تاریخ ادب کے سینے میں محفوظ نہ رہ سکا اور جب کلام ہی ضائع ہو گیا تو پھر شعرا کے تفصیلی حالات ملنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ہمیں تاریخ سے یہی شکایت ہے کہ شہنشاہوں، حکمرانوں، جاگیرداروں اور منصب داروں کو تو تاریخ نے محفوظ رکھا۔ لیکن فنکاروں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا بلکہ فراموش کر دیا۔ آج اسی وجہ سے اس شاعر کے حالاتِ زندگی نہیں ملتے جس نے شمالی ہند میں اردو شاعری کی تخم ریزی کی۔

جب ہم میر اسمٰعیل کے اسلاف و اخلاف کی تحقیق کرتے ہیں تو چند تواریخ مثلاً تواریخ واسطیہ۔ تاریخِ اصغری۔ نخبتہ التواریخ۔ طبقات اکبری اور سیر المتاخرین سے کچھ مختصر معلومات ہوتی ہے۔ میر اسمٰعیل کے مورثِ اعلیٰ مشہور صوفی بزرگ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت تھے۔ امروہہ سادات کی ایک بڑی اکثریت اِن ہی بزرگ کی اولاد میں ہے۔ یہ بڑے صاحب کشف و کرامات تھے۔ سید حسینؒ کے فرزند میر علی بزرگ ہوئے جو فیروز شاہ خلجی کے عہد میں اقضی القضاۃ مملکتِ ہند ہوئے۔ ابنِ بطوطہ مشہور سیاح جب امروہہ آیا تو وہ آپ ہی کا مہمان رہا۔ اس بات کا ذکر اس نے اپنے سفرنامے میں بھی کیا ہے۔ میر علی بزرگ کے بھائی سید عبدالعزیز ہوئے ان سے فیروز شاہ خلجی کی دختر منسوب تھیں۔ عبدالعزیز کی اولاد میں سید محمد میر عدل ہوئے جو عہد اکبری میں میر عدلی کے جلیل القدر عہدے پر فائز تھے اس کے بعد صوبۂ سندھ بھکر کی گورنری پر مامور ہوئے۔ ان کی وفات کی تاریخ "سید فاضل" ہے۔ آپ کے تلامذہ میں ملا عبدالقادر بدایونی مصنف "منتخب التواریخ" بہت مشہور ہوئے۔

——— سیّد محمد میر عدل کے فرزند سیّد ابوالفضل ہوئے
جو شہنشاہِ اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں کے عہد میں عمائدین میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے ہی قلعہ بنی فتح کیا۔ سیّد ابوالفضل کے فرزند سیّد ابراہیم ہوئے یہ بھی اعلےٰ مناسب پر فائز رہے اور عہدِ شاہ جہانی کی جنگ میں کام آئے اور سیّد ابراہیم کے ہی فرزند میر اسمٰعیل تھے۔ جہاں تک اسمٰعیلؔ کے ننہال کا سوال ہے وہاں کے بزرگ بھی صاحبِ علم و شجاعت ہوئے۔

میر اسمٰعیلؔ کے اخلاف میں سیّد غلام علی حقیقی بھتیجے عہدِ شاہِ جہانی میں اعلےٰ منصب پر فائز تھے۔ جن کے نام سے امروہہ کا محلہ کٹرہ غلام علی ہے جو آپ نے آباد کیا۔ میر اسمٰعیل کے ایک پوتے سیّد علی اکبر دیوانہؔ اپنے عہد میں دہلی کے مشاہیر شعراء میں تھے۔ سیّد غلام علی ثانی حسینی نبیرہ میر اسمٰعیل اپنے دور کے نام ور اور استاذ شاعر تھے۔ شاہی منصب داروں کی فہرست میں اسمٰعیل کے اسلاف و اخلاف میں ۲۸۶ افراد کے نام شامل ہیں۔

میر اسمٰعیل کی اولاد آج بھی امروہہ میں آباد ہے۔ لیکن ان لوگوں کو بھی اسمٰعیل کے حالات کا باقی علم نہیں، نایاب حسین نقوی (مرحوم)، نے بہت کوشش اور محنت کے بعد کچھ تحقیق کی ہے جس کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں کہ "میر اسمٰعیل کی ولادت نشو و نما اور تعلیم وطن میں ہوئی۔ سیّد اسمٰعیل نے متصل باغ بدلی کے ایک اسمٰعیلؔ سرائے اپنی سکونت وغیرہ کے لئے آبادی کی تھی۔ عرصہ دراز ہوا کہ وہ انقلابِ زمانہ سے ویران ہوگئی اب اس مقام پر زراعت ہوتی ہے۔ سابق میں اولادِ میر اسمٰعیل موصوف اس سرائے میں آباد تھی۔ میر اسمٰعیل کا وجود ۱۰۵۴ھ سے ۱۱۲۳ھ تک مسلّم ہے۔ وطنی روایت کے مطابق اسمٰعیل عالم گیر کے عہد میں دامن شاہی سے وابستہ ہو کر دکن چلے گئے اور کم از کم عالم گیر کے جلوس میں ۱۱۰۱ھ میں ضرور کسی شاہی منصب پر وطن سے دور تھے۔ جس کا ثبوت موصوف کے شراکت نامے سے ملتا ہے۔ (اردو کی دو قدیم مثنویاں صفحہ ۵۷-۵۹ -۱۸) صاحب تاریخ اصغری، اور تواریخ واسطیہ نے بھی اس کے علاوہ میر اسمٰعیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

میر اسمٰعیل کے ہم عصر شعرا میں حاجی محمد نوشہ۔ مولانا عبدیؔ اور فضلیؔ پانی پتی کے نام لئے جاتے ہیں۔ اور ان کے بعد کے شعرا میں فائز دہلوی۔ جعفر زٹلی اور ولیؔ ہوئے۔ ان میں فائز شمالی ہند کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ فائز سے اسمٰعیل کے عہد کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ پہلا دیوان شاعر ہیں فائز سے اسمٰعیل کے عہد کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ دیوانِ فائز میں مسعود حسن رضوی ادیب نے فائز کے دادا ابراہیم خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ عالمگیر اورنگ زیب نے تخت پر بیٹھ کر ان کو ملازمت کا شرف بخشا۔ جب کہ میر اسمٰعیل جہانگیر شاہ جہاں اور عالمگیر اورنگ زیب کے ادوار میں مختلف مناصب پر فائز رہے۔ اس طرح میر اسمٰعیل شمالی ہند کے تمام اولین شعراء کے باہمی اہم رشتوں اور کڑیوں کو ملانے والے شاعر ہیں۔

میر اسمٰعیل کے کلام کے بارے میں محققین اب تک جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ اس طرح ہے کہ اسمٰعیل کی ایک مثنوی جو وفات نامہ بی بی فاطمہؓ کے عنوان سے ہے۔ وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے سہ ماہی اُردو، کراچی جولائی ۱۹۵۱ء میں "شمالی ہند کی سب سے قدیم مثنوی" کے عنوان سے شائع کی ہے۔ جس میں ۱۳۱۷ اشعار ہیں۔ اسی مثنوی کے سلسلے میں نائب حسین نقوی کا بیان ہے کہ "وفات نامہ بی بی فاطمہؓ" حاجی مرتضٰے حسین مرحوم کے کتب خانے امروہہ سے نسیم صاحب امروہوی اپنے دادا نسیم صاحب مرحوم کے مراثی اپنے ساتھ لے گئے تھے اسی میں یہ مخطوطہ شامل تھا جس کی نقل ترقی اُردو بورڈ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ حیدر حسین یکتا رشیم امروہوی کے والد نے مثنوی کے عنوان میں علاوہ اسمٰعیل کے شجرۂ نسب کے مصنف کا سال وفات سنِ تصنیف اور سنِ نقل بھی لکھا ہے۔ (اردو کی دو قدیم مثنویاں صفحہ ۴۲) اس نسخۂ امروہہ میں ۱۳۱۹ اشعار ہیں اور دونوں نسخوں کے کل اشعار ۳۴۰ ہیں۔ اس مثنوی میں پہلے حمد پھر نعت پھر بی بی فاطمہؓ کے تفصیلی حالات اس کے بعد وفات اور بین وغیرہ ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اشعار جو مثنوی کی ہیئت میں ہیں یہ مرثیہ بھی ہیں یا نہیں؟

اس بات کے فیصلے سے پہلے ہیں مرثیے کی تاریخ پر نظر ڈالنی ہوگی۔ جب ہم مرثیے کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ابتدائی دور سے سودا اور میر کے دور تک مرثیہ ہر ہیئت میں کہا جاتا رہا ہے اور مثنوی کی ہیئت کے بھی کافی نمونے قدیم مراثی میں ملتے ہیں۔ مرثیے کے لئے مسدس کی ہیئت جب سے ایجاد ہوئی اور مخصوص ہوئی اس سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل اسمٰعیل کا دور تھا۔ لہٰذا اسمٰعیل سے مسدس کی ہیئت میں مرثیے کا تقاضا ہی غیر اصولی بات ہے۔ شبلی اور حالی سے لے کر عصرِ حاضر کے محققین تک مثنوی کی ہیئت میں مراثی پر متفق ہیں۔

"اردو میں یہ لکھا تو گیا ہے نظم کی ہر شکل میں مگر آخر میں ٹھہراؤ نظم کی چھ مصرعوں والی شکل پر ہوا۔ جسے مسدس کہتے ہیں۔ مسدس مرثیہ ضمیر کے ہاتھوں میں پہنچ کر اردو کی سب سے زیادہ اونچی اور نا تقلیدی صنعتِ سخن بن گیا" (سفارش حسین رضوی۔ اردو مرثیہ۔ صفحہ ۱۰۱) "مرثیے کی صنفی شناخت خالص طور پر موضوع پر مبنی ہے۔ یہ درست ہے کہ انیس و دبیر کے مراثی کی وجہ سے مسدس کی ہیئت اس کی پہچان میں داخل ہوگئی لیکن شروع میں اس کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں تھی اور یہ صنف ہیئت کے بجائے موضوع ہی پر اپنی شناخت کی اساس رکھتی تھی" (شمیم احمد درسِ بلاغت صفحہ ۱۴۰)

ابتدائی زمانہ کے مرثیے غزل، مثنوی اور ترکیب بند وغیرہ کی ہیئتوں میں بھی موجود ہیں" (درسِ بلاغت صفحہ ۱۴۱)

بیسویں صدی کے شعرا میں بھی اقبال نے اپنی والدہ کا مرثیہ مثنوی کی ہیئت میں لکھا ہے۔ محمد علی جوہر، سیماب اکبرآبادی اور حفیظ جالندھری نے بھی شخصی مرثیوں کے لئے غزل قطعہ۔ رباعی اور مخمس کی ہیئتیں اختیار کی ہیں۔ غرض کہ میر اسمٰعیل کی یہ مثنوی وفات نامہ بی بی فاطمہؓ ہر طرح مرثیے کے ذیل میں آتی ہے۔ اس کا آغاز اسمٰعیل اس طرح کرتے ہیں کہ ؎

الٰہی توں صاحب ہے سنسار کا ہمن توں ہے اُمید دیدار کا

ترے حکم پر سارے ہیں سگے فدا جو کچھ بتیں کہا مانیا سب سدا
ہمن عاجزن کا تو ہیں دست گیر
ترے در او پر شاہ ہیں سگے فقیر
حمد کے بعد اسمٰعیل نعت کے بھی کچھ اشعار کہتے ہیں ؎
کہوں نعت اب محمدؐ رسول دو عالم صدقِ دل سے کیجیو قبول
محمدؐ نبی ہیں سگے دُرِّ یتیم ازل سے ابد تک ہوئے مستقیم
پڑھیا نعت جو میں کہا دل نے یہ زود نبیؐ آل او پر پاک بولوں درود
حمد اور نعت کے تقریباً بیس اشعار ہیں اس کے بعد اسمٰعیلؔ اس طرح اپنے اصل
مقصد کی جانب گریز کرتے ہیں کہ ؎
علیؓ کی کفو ہیں بی بی فاطمہ
اونوں سے عجبیا نا رجو جاطمہ
اس کے بعد اسمٰعیل بی بی فاطمہؓ کی ولادت کے حالات بیان کرتے ہیں ؎
حمل سے خدیجہ جو ہیں گی مگر ہوئی پیدا دُختر بہت خوب تر
دھرا نام ان کا بی بی فاطمہؓ طفیلی انھوں کے ہمہ اور شما
اتھے لبست تاریخ آخر جماد تولد دو شنبہ کی شب راکھ یاد
ولادت کے بعد بی بی فاطمہؓ کی شادی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ ؎
اے دل اب دکھا تو بی بی کی برات فضل اون کے سیں ہو مومن کی نجات
دہیج اب بی بی جو دیکھو توں تمام جو کچھ دیا انوں کو رسولؐ انام
روپیہ صد و بست ہفت حق کی نبی مہر بی بی باندھا علیؓ حسین تبھی
شادی کے بعد ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ رسولِ مقبولؐ رحلت فرماتے ہیں۔
نبیؐ موت جو آتے کر پہونچیا بی بی فاطمہؓ غم بہت کھائیا
بی بی روتے بولی جو بابا حضور جدا ہو تمن سین پڑی مے جو دور

مجے چھوڑ تم کیوں چلے اے پدر | رہوں کیوں جدا ہوئے اس جائے پر
نبیؐ کی جو بولیا اے فرزند سن | سبھوں پہلے مجھ پاس پہونچو سن

وفات رسولؐ کے بعد بی بی فاطمہؓ کی کیا حالت ہوئی؛

شب و روز بی بی کہ جاں کھوئیا | پدر کی جدائی میں روئیا

ایک وقت وہ بھی آیا کہ بی بی فاطمہؓ کی وفات قریب آگئی اس موقع پر وہ حضرت علیؓ سے مخاطب ہوئیں اور وصیتیں کیں۔

بولی روئے کر اے علیؓ الوداع | دلی چھوڑ تم سات ہوتے الوداع
دونوں بیٹیوں سے بیٹیوں سے الوداع | دلی چھوڑ تم سات ہوتے الوداع
اتیا کہہ بولی بی بی آہ مار کر | سنو یا علیؓ میں کہوں کان دھر
مرے بیٹیوں کو خبر تم نا کرو | پیچھے سات ان کے جو ظاہر کرو
دامن مرا لے کے جو سر کے اوپر | الوں کے تن ڈالیو رو رو کر
قبر بیچ تنہا لے کر تم سب مجھے | دفن کر لیوں حق بھی اجر دے تجھے

حضرت علیؓ پر یہ سن کر کیا گذری اور دونوں بچوں یعنی حسنینؓ کی کیا کیفیت ہوئی؛

علیؓ او نصیحت سُنے کان سین | روئے بہوت بے ہوش ہو جان سے
یہی بات سن ماں سوں دونوں امام | الپس ڈھانپ کر منھ روئیا تمام

اس کے بعد ملک الموت کے آنے اور روحِ مقدس کے پرواز کرنے کا ذکر کیا ہے

علیؓ فاطمہ کوں جو دیکھا ہے | مردہ ہوئے لیٹی ہیں اس جائے پے
بولے روئے کر فاطمہؓ نیک بخت | ہمن کو دیا کو دنی ہوں سخت

وفات کے بعد غسل و کفن جنازے کا جانا اور دفن کا ذکر کیا ہے اس کے بعد حضرت علیؓ اور امام حسنؓ و امام حسینؓ کے بین اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

جدا ہوا ہمن سین چلیا تم ایتال | ہمارا دنی بیچ کیا ہوئے حال
وداع ہو قبر سیں علیؓ پھر چلے | آئے گھر موں بیٹوں سے آ کر ملے

بولے دونوں بھائی اے باباکہاں — ہماری نہ ماں ہے گی گھر کے یہاں
رو کر بولے اے ماں گئی چھوڑ کر — تنہا کیوں کے رہوے گی اوس جائے پر
علیؑ روئے کر کہا فرزند سن — نہ ہیں گے دنی بیچ بھی ہم تن

اس کے بعد حضرت علیؑ کی زبانی دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہیں ؎

دنی پانچ دن کا ہے سنیاس جان
نہ رہ توں جو غافل یو دل سیں پچھان

اس کے بعد اسمٰعیل اپنا اور اپنے وطن کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

بنی پیروی بیچ رہ اسمٰعیل — قیامت کوں بخشے گا رب جلیل
وطن امروہا میرا ہے شہر نام — اسی جائے پر میرا ہے گا قیام
دلی کے گرد بیچ وہ شہر ہے — ندی سوت کی بھی وہاں لہر ہے

آخر میں مرثیے کی تاریخ بیان کر کے مرثیے کا اختتام کرتے ہیں ؎

مہینہ جو رجب مرجب اتھا — یہ تاریخ پچیسویں ماہ تھا
اتھے سال ہجری بنی کے میاں — گیارہ سو اور پانچ تھے بوجھ جاں
جو دن چہارشنبہ لوقت ظہر — نقشہ پورا کیتا بہوت فکر کر

قصہ پورا کیتا جو سن کان دھر
پڑھو کلمہ خوش ہوئے ہر وقت پر

میر اسمٰعیل کے اس مرثیے کے علاوہ اور کوئی مرثیہ نہیں ملتا۔ البتہ ایک مثنوی بعنوان "معجزۂ انار" (بادشاہ خیبر و بلقیس) تصنیف ۱۱۲۰ھ نائب حسین نقوی (مرحوم) نے وفات نامہ بی بی فاطمہؓ کے ساتھ شائع کی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

الٰہی تو دانا ہے ہر کاج کا — سرانجام دیتا ہے محتاج کا
ملک ملک کے شاہ اور خاص و عام — حکم مان کر آتے کرتے سلام
بڑا پہلوان تھا وہ بلقیس شاہ — تکبر غروری دھرے سال و ماہ

اس کے علاوہ اسمٰعیل کی ایک مثنوی سوت ندی کے نام سے بھی بتائی جاتی ہے لیکن وہ نایاب ہے۔ حیدر حسین یکتا نے یکے از تصنیفات استعمال کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسمٰعیل نے اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جو وقت کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔

حیدر حسین یکتا نے اسمٰعیل کے لئے جو القاب و آداب لکھے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسمٰعیل کا شمار امروہہ کے علماء اور فضلا میں ہوتا تھا۔

وفات نامہ بی بی فاطمہؓ جو مذہبی عقائد پر مبنی ہے ان کے عقائد کی پختگی۔ ایمان بالغیب حمد خدائے تعالےٰ۔ شفاعت رسولؐ مقبول۔ اصحاب سے خلوص اور ائمہ سے محبّت و مودّت کا ثبوت ہے۔

یہ مرثیہ شمالی ہند کی ابتدائی زبان کی نمائندگی کرتا ہے اور اس دور کو دیکھتے ہوئے فارسی و عربی کا استعمال۔ الفاظ کے مرکّبات اور تراکیب کے استعمال سے اسمٰعیل کی زبان پر دست رس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً وعظ و نصیحت۔ خوب تر۔ مخلوق۔ خاص و عام وغیرہ۔

مرثیئے کے محققین نے شمالی ہند کی مرثیہ نگاری کے سلسلے میں جن شعراء اور جن مراثی کا ذکر کیا ہے وہ سب اسمٰعیل کے مرثیئے وفات نامہ بی بی فاطمہ کے بعد کے ہیں اس لئے یہ مرثیہ شمالی ہند کا پہلا مرثیہ اور میر اسمٰعیل شمالی ہند کے پہلے مرثیہ نگار کی حیثیت سے مرثیہ کی تاریخ میں نمایاں رہیں گے۔

ڈاکٹر سید مجتبیٰ علی زیدی
استاد - شعبۂ اردو و فارسی -
راجستھان - یونیورسٹی
جے پور

# جدیدیت، سائنسی عقلیت اور اشتراکی حقیقت نگاری

جدیدیت کو عموماً عصریت کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یعنی جو قدیم نہیں ہے وہ جدید ہے لیکن جدیدیت کا یہ تاریخی اور زمانی تصور گمراہ کن ہے کیونکہ جدیدیت محض عصریت کا نام نہیں ہے بلکہ عصری حقیقتوں اور عصری تقاضوں کے شعور اور بصیرت کا نام ہے۔ عصری حقیقتیں یا عصری تقاضے ایک نہیں بہت سے ہوسکتے ہیں۔ یہ مختلف ہی نہیں متضاد اور ایک دوسرے سے متصادم بھی ہوسکتے ہیں اور پھر ان حقیقتوں اور تقاضوں کے بھی مختلف پہلو ہوسکتے ہیں اسی لئے جدیدیت کی کوئی منطقی یا مطلق تعریف ممکن نہیں ہے البتہ اس کی مختلف تعبیریں اور تشریحیں مختلف زاویۂ نگاہ سے کی جاسکتی ہیں۔

کوئی جدیدیت کو رومانیت کی توسیع قرار دیتا ہے تو کوئی اسے ترقی پسندی کی توسیع

سمجھتا ہے اور کسی کے نزدیک یہ روایت کا تخلیقی اظہار ہے۔ سب نقطۂ نظر جزوی اعتبار سے درست ہو سکتے ہیں۔ لیکن جدیدیت کا صحیح مفہوم اس کے مختلف عناصر کے سائنٹیفک تجزیہ سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی فلسفیانہ، تاریخی و ادبی بنیادوں کا تجزیہ کرنا ضروری ہوگا۔ عصری حسیت تہذیبی شکل و صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور اس کا اظہار تین سطحوں پر ہوتا ہے۔ یعنی نظامِ تصورات، نظامِ اقدار اور ایک مخصوص جمالیاتی و فنی ذوق۔ جدید عہد کا آغاز یورپ میں نشاۃِ ثانیہ کے بعد صنعتی انقلاب شروع ہونے کے بعد مانا جاتا ہے۔ سیاسی سطح پر امریکہ کی جنگِ آزادی اور فرانس کا انقلاب جدید عہد کو قدیم عہد سے الگ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے جدید عہد کا آغاز یورپ میں سترھویں اور زیادہ قطعیت سے اٹھارویں صدی عیسوی سے مانا جاتا ہے۔ چونکہ اس کا آغاز صنعتی ترقی سے ہوتا ہے جو سائنس اور جدید علوم میں پیش رفت کا نتیجہ تھا۔ اس لئے سائنسی عقلیت اور اشتراکی حقیقت نگاری کے علاوہ وجودیت کے تمام ترجحانات بھی اسی دور سے وابستہ ہیں۔

مارکسزم اور سائنس دونوں نے معروضیت (objectivity) پر زور دیا ہے لیکن جدیدیت اور وجودیت کی فکری اساس داخلیت، موضوعیت subjectivism اور انفرادیت پر رکھی گئی ہے۔ جدید دور سائنس کا دور ہے اور معروضی تجزیہ اس دور کا مستند طریقۂ کار ہے۔ لیکن جدید دور ہی کے کئی مفکر سائنس اور عقل سے گریزاں بھی رہے ہیں۔ شوپنہار، نطشے، برگساں، کیرکے گارد، ہائیڈگر، کارل جیسپرس، ہسرل، مارسل، سارتر بھی سائنس اور عقل سے بیزار تھے۔ سائنس نے فطرت کی تفسیر پہ زور دیا۔ اور انسان کے خارجی ماحول کو آرام دہ بنایا۔ لیکن اس کے باطنی کرب اور داخلی انتشار میں اضافہ ہوتا رہا۔ سائنس نے تعمیری قوتوں کے ساتھ ساتھ انسان کی تخریبی قوتوں میں بھی بے انتہا اضافہ کر دیا۔

اشتراکیت کے مفکروں نے انسان کے داخلی کرب اور باطنی انتشار کو سائنس کی ایجادات مشینوں کے استعمال سے غیر متعلق بتایا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انسان کے باطنی کرب اور داخلی انتشار کا سبب بڑھتی ہوئی بیروزگاری، مفلسی، طبقاتی استحصال اور ذرائع پیداوار

کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ سائنس کا استعمال تخریبی کاموں کے لئے کرنا سامراجیت اور سرمایہ دارانہ نظام اور آمریت کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ اگر دنیا سے سامراجیت سرمایہ دارانہ نظام اور آمریت کو مٹا دیا جائے تو سائنس کا استعمال ہمیشہ تعمیری کاموں کے لئے اور انسانی فلاح و بہبود کے لئے ہی کیا جائے گا۔

سائنس نے مذہب اور دیگر عینی (IDEALS) نظریات کو پارہ پارہ کر دیا اور اس طرح انسان کے جذباتی اور نفسیاتی سہاروں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ نطشے نے خدا کی موت کا اعلان کیا اور سارتر نے بھی خدا کے وجود سے انکار کیا۔ یہ نظریہ جہاں فرد کے وجود کے اثبات کا نتیجہ ہے وہاں سائنسی فکر اور عقلیت کے اثرات کی وجہ سے بھی پیدا ہوا ہے۔ بلکن خدا کی عدم موجودگی میں انسان کے ذہنی اور جذباتی سکون کا کوئی ذریعہ نہ تو سائنس نے پیش کیا نہ مارکسزم نے اور نہ خدا کے منکر وجودی مفکروں نے۔ اس طرح انسان ایک ذہنی خلا ء کو محسوس کرنے لگا۔ ارتقائے بالضد، طبقاتی جدوجہد، جدلیاتی مادیت، تاریخی جبریت، ڈارون کے نظریات، شوپنہار کی ارادیت اور نطشے کی طاقت کی خواہش کے نظریات نے انسان کو جدوجہد اور کشمکش کرنے والا ایک ایسا جاندار سمجھا جو فطرت کی اندھی قوتوں کا پابند ہے۔ کوئی بھی جدید فلسفہ اس کی ذہنی آسودگی اور انتہائی منزل اور زندگی میں اس کی معنویت اور مقصد کی طرف رہبری نہیں کرتا۔ اضافی اقدار کا نظریہ جو سائنس کی ہی دین ہے انسان میں بے یقینی اور لایعنیت پیدا کرنے کا سبب بنا۔ صنعتی شہروں کی مصروف زندگی نے اس کی تنہائی اور اداسی کو بڑھا دیا۔ اور سائنسی عقلیت نے اسے بھی مشین کا ایک حقیر پرزہ بنا دیا۔ سماج کے منظم ادارے جو سائنس اور تکنالوجی کی ترقی کے بعد وجود میں آئے انسان کی انفرادیت کے لئے سخت مضرت رساں ثابت ہوئے۔ سائنسی عقلیت نے انسان کی فطری جبلتوں اور طبیعت کے فطری تقاضوں کو نظر انداز کر دیا۔ سائنس کے اس میکانیکی طرز عمل کا ردِ عمل ہونا بھی قدرتی تھا۔ جدیدیت اسی طرز عمل کے ردِ عمل کا شاخسانہ ہے۔ سائنس کے اختصاصی علوم اور حقیقت کے معنویاتی

تصور کے بجائے جذبی اور میکانیکی تصور نے انسانوں کو بھی خانوں میں تقسیم کر دیا۔ سائنسی عقلیت نے ہی انسان کو اجنبیت ر ALIENATION کا احساس دیا ہے۔ جدیدیت سائنس اور مشینوں کی دشمن نہیں ہے بلکہ اس کا تمام اختلاف اس کے طریقہ کار اور نتائج سے ہے۔ سائنس اور عقل نے انسان اور کائنات کا ہمہ جہتی شعور عطا نہیں کیا۔ اور جدیدیت اسی تلافی کا نام ہے۔ جدیدیت نے تخلیقی تجربہ کو سائنسی تجربہ پر فوقیت دی۔ سائنسی عقلیت کے اصولوں کو ڈیکارٹ اسپنوزا اور لائبنز کے فلسفوں سے تقویت ملی۔ عقلیت کے اس رجحان کے خلاف ڈیوڈ ہیوم نے اپنے تشکیلی فلسفہ کو پیش کیا۔ اس کا خیال تھا کہ انسانی فطرت کو سمجھنے کے لئے سائنسی طریقۂ کار درست نہیں ہے۔ اسے یہ جان کر افسوس اور حیرت کا احساس ہوا کہ انسان کا تجرباتی علم نہایت محدود ہے۔ ہیوم نے بتایا کہ ذہن صرف انھیں اشیاء کا تجزیہ کر سکتا ہے جو کہ حواس اور تجربات نے اس تک پہنچائے ہیں۔ انھیں ہیوم PERCEPTIONS کہتا ہے یہ دو صورتیں اختیار کرتے ہیں جنھیں اس نے تاثرات اور خیالات کا نام دیا ہے۔ اس کے نزدیک بنیادی چیز تاثرات ہیں اور خیالات کا عکس ہیں۔ جب ہم سنتے، دیکھتے، سونگھتے دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں تو ذہن پر چند تاثرات ثبت ہو جاتے ہیں اور جب ہم ان تاثرات پر غور و فکر کرتے ہیں تو خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ تکلیف یا درد کو محسوس کرنا تاثر ہے جب کہ اس احساس کی یاد خیال ہے بغیر تاثر کے کوئی خیال وجود میں نہیں آ سکتا۔ تاثر ہی خیال کو غذا فراہم کرتا ہے تخیل مختلف اور بعض اوقات متضاد خیالات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ مثلاً انسان نے گھوڑا بھی دیکھا اور پر بھی دیکھا یہ دونوں مختلف اشیاء ہیں اور دو مختلف خیال پیدا کرتے ہیں۔ لیکن تخیل کی یہ کارفرمائی ہے کہ اس نے ان دونوں مختلف خیالات کو یکجا کر کے اڑنے والے گھوڑے کا تصور پیدا کر دیا۔ حالانکہ قدرت میں اڑنے والا گھوڑا کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اس طرح انسان نے سونا بھی دیکھا ہے اور پہاڑ بھی دیکھے ہیں تخیل نے انھیں ہم آہنگ کر کے تصور میں سونے کے پہاڑ کا تصور انسانی ذہن کو دیا۔ اس طرح انسانی تخیل انسان کو وہ تصورات عطا کر سکتا ہے جو کہ قدرت اسے انفرادی طور پر بخشتے ہیں۔ اس طرح تخیل دو جداگانہ تصورات میں ربط پیدا کرنے کی

نخلستان

صلاحیت رکھتا ہے یہی تخیل سائنس اور ادب کی تخلیقی قوت کی بنیاد ہے۔ خیالات کے باہمی رابطہ کو ہیوم نے (ASSOCIATION OF IDEAS) بتایا اور اس کی تین شکلیں بتائی ہیں (۱) مطابقت (RESEMBLANCE) (۲) تسلسل (CONTIGUITY) اور (۳) سبب و نتیجہ کا تعلق (CAUSE AND EFFECT RELATION) ایک تصویر کو دیکھ کر ہمارا خیال اس اصل شے کی طرف جائے گا۔ جس کی وہ تصویر ہے یہ مطابقت ہے۔ مکان کے کسی ایک حصہ کا ذکر سن کر ہمارا خیال مکان کے دوسرے حصوں کی طرف جائے گا۔ یہ تسلسل ہے۔ اور اگر ہم ایک زخم کے بارے میں سوچیں تو ہم اس سے پیدا ہونیوالے درد پر بھی غور کریں گے یہ سبب اور نتیجہ کا تعلق ہے ہیوم نے ان میں سے سبب و نتیجہ کے تعلق کو سب سے اہم قرار دیا ہے یہی سائنس اور عقل کی بنیاد ہے ہیوم کا کہنا تھا کہ سبب اور نتیجہ میں ایک ناگزیر تعلق ہے لیکن یہ تعلق کیا ہے؟ اور اس کا ثبوت ہمارے پاس کیا ہے۔ ہم ہائیڈروجن اور آکسیجن کو علاحدہ علاحدہ کتنا ہی دیکھیں اس سے پانی بننے کا علم نہیں ہوتا۔ اس کا علم ہمیں تب ہی ہوگا جب ان دونوں کو ایک خاص مقدار میں ملا دیا جائے یعنی ($H_2 + O$) تب ہی پانی وجود میں آئے گا۔ اس لئے صرف تجربہ سے ہی ہم ایک شے اور دوسری شے کے تعلق کو سمجھ سکتے ہیں۔ اشیار کے باہمی تعلق کا کوئی تاثر ہمارے پاس پہلے سے نہیں ہوتا۔ اس طرح علیت (causality) اشیاء کی صفت نہیں ہے بلکہ باہمی تعلق کی ایک خصوصیت ہے جو ذہن میں اس وقت جگہ بنا لیتی ہے جب کہ ان کے باہمی تعلق کا ہمیں علم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر الف اور ب کے مابین سبب اور نتیجہ کے تعلق کو ہم بار بار ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس بات کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو کچھ موجود ہے اس کے موجود ہونے کا کوئی سبب بھی ہو۔ ہیوم کے ان خیالات سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ کہ انسان کے حواس اور تجربہ کی بنیاد پر ہی حقیقت کا علم ممکن ہے اور چونکہ انسانی حواس اور تجربات محدود نوعیت رکھتے ہیں اس لئے ہمیں کبھی بھی کلی حقیقت کا علم نہیں ہو سکتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایسے تمام فلسفیانہ اور سماجی نظام جو حقیقت کو کلی طور پر سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں غلط ہیں۔ ہیوم نے ادعائیت (DOGMATISM) اور مطلقیت کو مسترد کر دیا۔ ان نظریات کی روشنی میں سائنسی عقلیت اور اشتراکی حقیقت نگاری میں جو ادعائیت

اور حقیقت کلی کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے تھے اِن کا یہ زعم باطل ہوگیا۔

وجودی مفکروں نے ہیوم کے دلائل سے کام لیکر سائنس اور جدلیاتی مادیت کے معروضی طریقۂ کار پر نکتہ چینی کی۔ کرکے گارنے کہا۔۔ "داخلیت ہی حق ہے" مغربی تہذیب میں سائنسی عقلیت نے فنون لطیفہ کو بھی غیر انسانی (DEHUMANIZED) خصوصیات کا حامل بنادیا۔ اس کے خلاف بھی وجودی مفکروں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔

تاریخ اور فلسفہ صدیوں سے تجریدی (ABSTRACT) اور عمومی اصولوں سے بحث کرتے رہے اور فرد صدیوں سے پس منظر میں دکھیلا جارہا تھا۔ اس کی جگہ مختلف تاریخی، فلسفیانہ اور سائنسی نظام اہمیت حاصل کر رہے تھے۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے انسان کو منتظم اور میکانکی خصوصیات عطا کیں، کرکے گارنے ہی سب سے پہلے اس شدید اجتماعیت اور تنظیم کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس نے یونان کی تہذیب پر یہ کہہ کر نکتہ چینی کی کہ یونانیوں نے عقلی اصولوں پر اس قدر زور دیا کہ انسان کی جبلت اور فطرت کا مطالعہ پس پشت جا پڑا اور اسی وجہ سے یونانی تہذیب کا زوال ہوا۔ کرکے گارنے کہا کہ جو کچھ ہمارے باہر ہے وہ ایک غیر یقینی معروضیت" ہے انسان جب فیصلہ کرتا ہے تو وہ سراسر موضوعی اور داخلی ہوتا ہے اسے اپنی جبلتوں جذبات اور احساسات کا حکم ماننا پڑتا ہے۔

جدیدیت کے مختلف رجحانات اور اس کا موضوعی و داخلی طریقۂ کار سائنسی عقلیت اور اشتراکی حقیقت نگاری کے خلاف ایک شدید ردعمل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ایک دوسرے اہم وجودی مفکر ہسرل نے اس تہذیبی بحران کا تفصیل سے ذکر کیا۔ جو عقلیت کی شدت پسندی نے پیدا کیا ہے۔ سائنس نے مغربی دنیا کے انسانوں کے ذہن میں چند غلط رجحانات کی پرورش کی ہے۔ سائنس نے کائنات کو بنیادی طور پر طبیعاتی (PHYSICAL) اور مادی (MATERIAL) قرار دیا اور اس طرح روحانیت، مذہب، اخلاق، تہذیب و تمدن کی بہت سی اقدار کو نظر انداز کر دیا۔ سائنس نے شعور اور شے یا ذہن اور

مادہ کی ثنویت (DUALITY) کو فروغ دیا۔ جب کہ کسی شے کا درست علم نہیں ایک صحت مان کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس نے اس کی وضاحت کے لئے مظاہریت کے اصول قائم کئے جن کے تحت صداقت کی تلاش کا معیار شے کے بجائے ذہن کو قرار دیا گیا۔ کیونکہ اشیاء تو ویسی ہی ہوتی ہیں جیسا کہ ہمارا ذہن انھیں سمجھتا ہے۔

کارل جیسپرس نے سائنس کے معروضی طریقۂ کار کی نارسائی کو بتایا۔ اس نے سوال کیا کہ علم کیا ہے؟ معروضی اشیاء کو مکمل طور پر سمجھ لینا ہی علم ہے اور اسے سائنس کے ذریعہ مکمل طور پر نہیں سمجھا جاسکتا کیونکہ دراصل معروضیت آدھی یا ادھوری سچائی ہے سائنس جزوی صداقتوں کو بتاتی ہے۔ اور اشیا کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان کا مطالعہ کرتی ہے۔ یہ ہمیں کائنات کی ماہیت کا کوئی واحد نظریہ عطا نہیں کرتی۔ اگر ہم تاریخ کا سائنٹفک مطالعہ کریں تو ہمیں چند بکھرے ہوئے خیالات کا انبار نظر آئے گا۔ سائنس حقیقت کا مطالعہ حقیقت کو شے میں تبدیل کرکے ہی کرسکتا ہے۔ یعنی سائنس اور معروضیت لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے اس کی رسائی جزوی حقیقت تک ہی ہوسکتی ہے۔ وجود معروضی حقائق کا پابند نہیں ہے۔ اس لئے جب سائنس انسان کا مطالعہ بطور ایک وجود ایک فرد کے کرتا ہے تو وہ ناکام رہتا ہے۔ فلسفہ اس معاملہ میں سائنس سے بہتر ہے۔ کیونکہ فلسفہ کا بنیادی کام انسان کا مطالعہ بطور ایک وجود اور فرد کے کرنا ہے۔ اسی لئے فلسفہ کو سائنس کی نقل نہیں کرنی چاہئے۔

سارترے کا قول تھا کہ وجود کے باہر جو کچھ ہے وہ عدم ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وجود مقدم ہے جوہر پر EXISTENCE PRECEDES ESSENCE

دوسرے الفاظ میں وجود مقدم ہے۔ عقل پر اور وجود کا اگر کوئی جوہر ہے تو وہ عقل نہیں بلکہ انسانیت ہے۔ کسی شے کا حقیقی علم اس وقت ممکن ہے جب شعور اور شے مل کر ایک ہوجائیں لیکن شعور کسی شے کا شعور ہوتا ہے اس لئے ان دونوں میں علاحدگی قائم رہتی

جدلیاسی سلنے میں کسی بھی شے کا مکمل اور حقیقی علم حاصل نہیں ہوتا سارتر کا خیال تھا کہ حقیقی علم تو عقلیت سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ مادیت سے بلکہ حقیقی علم وجودیت سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے عقل اور سائینس نے انسان کو جو ایک سطحی رجائیت OPTIMISM عطا کی تھی بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں جاپان کے دو شہروں ہیروشما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کی دھماکوں سے جو تباہی آئی اس نے اس زمین پر بسنے والے جانداروں کی سلامتی کو مشتبہ بنا دیا۔ تمام سائنسداں متفق ہیں کہ تیسری عالمگیر جنگ نسل انسانی کا مکمل خاتمہ کر دے گی۔ یہ بھی جدید دور کا ایک عظیم المیہ ہے کہ اب انسان کے پاس مذہب، فلسفہ، عقل یا سائنس کے کسی نظام کا اخلاقی اقدار کے کسی بھی معیار کا کوئی سہارا نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی نسل انسان کی بقا کی گارنٹی نہیں دے سکتا۔ انسان تن تنہا اپنے وجود کی بے مائیگی اپنی زندگی کی بے مقصدیت اور کائنات کی لایعنیت کے ساتھ زندہ ہے۔"

جدیدیت کی بنیاد اسی خیال پر رکھی گئی ہے اور جدیدیت میں جو قنوطیت، گریز، فراریت اور یاسیت PESSIMISM کے رجحانات پائے جاتے ہیں ان کی اصلیت انھیں دلائل پر رکھی گئی ہے جن کا تجزیہ پہلے کیا جا چکا ہے۔

سارترے نے سب سے پہلے اس بات کو محسوس کیا کہ وجودیت بھی انسانی مسائل کو حل کرنے کا کوئی راستہ نہیں بتاتا۔ یہ سچ ہے کہ سائنسی عقلیت اور اشتراکی حقیقت نگاری کا کوئی معروضی طریقہ کار ناکافی ہے لیکن اس کا کوئی نعم البدل فی الحال انسان کے پاس موجود نہیں ہے۔ سارترے آخری عمر میں اشتراکی حقیقت نگاری کا قائل ہو گیا اور اس نے مارکس کے اصول جدلیاتی مادیت ہی کو جدید دور کا سب سے بہتر اصول قرار دیا۔ سارترے نے وجودیت اور جدلیاتی مادیت کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور ان دونوں کے یکساں عناصر کی نشاندہی کی۔ جدیدیت دو ہی فلسفوں سے زیادہ متاثر ہے ایک جدلیاتی مادیت اور دوسرا وجودیت۔ صحیح معنوں میں یہی دو فلسفے ہیں۔ اثباتیت، نتیجیت

اور منظریت فلسفے نہیں ہیں بلکہ سائنسی اور فلسفیانہ طریقۂ کار ہیں۔ جدلیاتی مادیت معروضی طریقۂ کار کو اپناتا ہے۔ اور وجودیت موضوعی طریقۂ کار کا حامی ہے۔ جدلیاتی مادیت مینیت IDEALISM اور میکانیکی مادیت MECHANICAL MATERIALISM کو مسترد کرتا ہے وجودیت بھی ان دونوں کے خلاف ہے۔ مینیت میں شعور کو وجود پر مقدم ٹھہرایا گیا تھا اور عقل کو وجود پر ترجیح دی گئی تھی۔ افلاطون سے لیکر ہیگل تک یہی رجحان پروان چڑھتا رہا۔ مارکس نے اس طلسم کو توڑ ڈالا اور جدلیاتی مادیت کی بنیاد اس اصول پر رکھی کہ "وجود شعور کو متعین کرتا ہے"

(EXISTENCE DETERMINES CONCIOUSNESS)

وجودیت کا اصول ہے کہ "وجود جوہر پر مقدم ہے" اس طرح جدلیاتی مادیت اور وجودیت دونوں ہی وجود کو مقدم قرار دیتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وجودیت جس وجود پر زور دیتا ہے وہ انفرادی وجود ہے اور جدلیاتی مادیت جس وجود پر زور دیتا ہے وہ سماجی وجود SOCIAL EXISTENCE ہے۔ دونوں میں یہ فرق بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وجودیت اور جدلیاتی مادیت دونوں ہی مطلق اقدار کو نہیں مانتے اور اضافی اقدار کے قائل ہیں۔ دونوں ہی مادہ کو جامد نہیں بلکہ متحرک مانتے ہیں۔ سائنس نے MATTER IN MOTION کے اصول کو اپنے تجربات سے سچ کر دکھایا ہے۔ دونوں ہی تغیر و تبدل کو زندگی اور حقیقت کا لازمی جز سمجھتے ہیں۔ لیکن جدید جدلیاتی مادیت ایک سائنٹفک، معروضی اور منظم فلسفہ ہے جب کہ وجودیت غیر سائنسی، غیر عقلی اور موضوعی فلسفہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وجودیت کے پیرو لاشعور کے دھندلکوں اور خوابوں کے بے ربط خیالات کو ادب میں بڑی شدت سے پیش کرتے ہیں۔ جدلیاتی مادیت تاریخی جبریت HISTORICAL DETERMINISM طبقاتی جدوجہد CLASS STRUGGLE اور معاشی جبر کا قائل ہے۔ جب کہ وجودیت تاریخ کو فرد کی کشمکش کا اظہار سمجھتا ہے۔ جدیدیت جو وجودیت سے زیادہ متاثر ہے۔ اجتماعی

اداروں اور تاریخ کے اجتماعی تصور کو کوئی اہمیت نہیں دیتی وہ طبقاتی جدوجہد کی بھی قائل نہیں جدلیاتی مادیت ایک رجائی فلسفہ ہے جب کہ جدیدیت اور جدیدیت قنوطیت اور یاسیت کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ جدلیاتی مادیت اور اشتراکیت میں اس اصول پر زور دیا گیا ہے کہ سماج کا ڈھانچہ معاشی اور اقتصادی بنیادوں پر رکھا گیا ہے اور باقی تمام چیزیں مثلاً ادب، سیاست، مذہب، قانون وغیرہ اس کے بالائی تعمیر کے حصے ہیں۔ SUPERSTRUCTURE لیکن جدیدیت یہ مانتی ہے کہ ادب، مذہب، سیاست اور قانون وغیرہ لازمی طور پر معاشی تبدیلیوں کے پابند نہیں ہیں یہ سب مظاہر ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ مارکس نے یہ نہیں کہا کہ سرمایہ دارانہ نظام کا زوال اشتراکی خیالات کی اشاعت اور تبلیغ سے ہوگا۔ بلکہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہی بذات خود داخلی تضاد ہے۔

INTERCONTRADICTION وہ اس کے زوال کا سبب بنے گا۔ اور عروج و زوال کا یہ سلسلہ جدلیاتی قوانین کا پابند ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا زوال ایک تاریخی مقدر ہے جو تاریخی جبریت کے اصول کے تحت کسی فرد یا سماج کے روکنے سے رک نہیں سکتا۔ تاریخ کا یہ اٹل اصول ہے کہ اس کی سمت مقرر ہے اور اس کے تیز دھارے کو روکنے کی قوت کسی کے بس میں نہیں ہے۔ ایک نظام ________ میں جب داخلی تضاد نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے تو اسی کے بطن سے دوسرا نظام جنم لیتا ہے۔ پہلا نظام (THESIS) کے بطن سے دوسرا متضاد نظام ANTITESIS سے جنم لیتا ہے اور دونوں کے تصادم سے ایک تیسرا نظام (SYNTHESIS) وجود میں آتا ہے۔ دنیا کی ہر تبدیلی اسی قانون کی پابند ہے۔ یہ قدرت کا اٹل اصول تاریخ پر بھی اسی طرح عاید ہوتا ہے جس طرح قدرت کے دیگر مظاہر پر عائد ہوتا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کا زوال کسی کے روکے نہیں رکتا۔ بادشاہوں اور زمینداروں نے ظلم و ستم کے تمام حربے آزمائے لیکن تاریخی مقدر کو نہیں مٹا سکے۔ اور تاریخ نے

انھیں اپنے کوڑے دان میں پھینک دیا۔ سامراجیت اور سرمایہ دارانہ نظام نے جاگیردارانہ نظام کی جگہ لی۔ جاگیردارانہ نظام (THESIS) تھی تو سامراجیت اور سرمایہ دارانہ نظام ANTITHESIS بن کر نمودار ہوئے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ ممالک نے ان دونوں نظاموں کے تصادم سے SYNTHESIS کی شکل اختیار کی لیکن پھر اس (SYNTHESIS) کے بطن سے اور (ANTILHESIS) کا جنم ہوا۔ سامراجیت کا قلع قمع ہو گیا اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف سوشلسٹ نظام کا ظہور ہوا۔ دونوں کے تصادم سے تیسرا نظام کمیونسٹ نظام کے رائج ہونے پر طبقاتی جدوجہد یعنی داخلی تضاد کا خاتمہ ہو جائیگا اس لئے پھر کسی دوسرے نظام کے آنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ تاریخی جبریت کا عمل رک جائے گا۔ پھر انسان کی بے جا جدوجہد، کشمکش اور استحصال کا زمانہ ختم ہو جائیگا اور اپنی محنت کے پھلوں کو شکم سیر ہو کر کھاتے رہنے کا زمانہ شروع ہو جائے گا۔ سرمایہ داروں اور اجارہ داروں اور ان کے حلیفوں کو اسی لئے ڈراؤنے خواب آنے لگے ہیں وہ اس بات کے لئے تو تیار ہیں کہ دنیا کو تیسری عالمگیر جنگ کی تباہی میں ڈھکیل دیا جائے لیکن اس بات پر تیار نہیں ہیں کہ دنیا سے ان کی اجارہ داری ان کا عیش و عشرت مٹ جائے۔ دنیا کا تمام ادب، فلسفہ، شاعری، سیاست اور تہذیب و تمدن کے تمام مسائل آج دو خانوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ حق و باطل کی یہ جنگ ہر محاذ اور ہر جگہ اور ہر ملک میں لڑی جا رہی ہے۔ جدیدیت بھی دو خانوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک طبقہ انسان کو فراریت، گریز، قنوطیت اور یاسیت کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ انسانی شعور کو کند کر دینا چاہتا ہے سماجی مسائل اور عصری مسائل کی عکاسی سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ تخصی علامتیں، بے ہنگم خیالات مبہم استعارے، مہمل تشبیہات استعمال کرکے یہ طبقہ ادب کو انقلاب کا نقیب

نہیں بننے دینا چاہتا۔ حق و باطل کی یہ جنگ مدتوں سے جاری ہے۔ رام اور راون، فرعون اور موسیٰ نمرود اور ابراہیم، یزید اور حسینؑ کی یہ جنگ آج بھی جاری ہے۔ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں حسینؑ کو برا کہنے کی جرأت تو نہیں ہوتی لیکن یزید کو حضرت یزید رحمت اللہ علیہ لکھنے میں ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ یہ لوگ سامراجیت، ملائیت اور سرمایہ داری فوجی آمریت اور رجعت پرستی کی طرف داری اسی لئے کرتے ہیں کہ سماج میں ان کی اجارہ داری اور لیڈر شپ سلامت رہے۔ سوشلسٹ نظام پر سطحی اور جھوٹی پھبتیاں کسنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس منفی مضحکہ خیز رُخ سے سوشلسٹ نظام کا تو کچھ نہیں بگڑتا البتہ ایسے لوگوں کے احساس کمتری کا احساس فوراً ہوجاتا ہے۔ مثلاً حسن عسکری اپنی تصنیف "انسان اور آدمی" یوں لکھتے ہیں۔ "ان کی (اشتراکیوں کی) اصطلاحیں اتنی مادیت آلودہ ہوتی ہیں کہ ان سے تانبے کے زنگ آلود پیسوں کی بدبو آتی ہے۔ اسی لئے میں نے تو کمیونسٹوں کا اخبار تک پڑھنا چھوڑ دیا ہے چونکہ دو دن میں تو ننگی تصویروں والا رسالہ آجاتا ہے۔"

جب انسان کے پاس دلائل نہیں ہوتے تو وہ ایسا ہی منفی رویہ اختیار کرتا ہے لیکن اس منفی ردعمل سے خود جدیدیت کی ادبی وقعت مشتبہ ہو جاتی ہے۔

جدیدیت نظریاتی وابستگی (COMMITMENT) کے خلاف ہے اور تخلیقی تشکیک کو ادب و زندگی کے لئے بہتر خیال کرتی ہے۔ وہ نظریہ کی قربان گاہ پر نظر کو قربان کرنا نہیں چاہتی۔ ترقی پسند تحریک کے زوال کا سبب یہی نظریاتی وابستگی تھی جس نے اسے سیاست کا آلۂ کار بنا دیا۔ یہ سچ ہونے کے باوجود یہ بھی درست ہے کہ محض نظر پر اکتفا کر لینے سے کام نہیں چلتا۔ مختلف سمتوں میں سے کسی ایک بہتر سمت کا چناؤ ضروری ہے ورنہ راہی سفر جاری کیسے رکھ سکے گا۔ اسے کسی ایک رہگذر

کا انتخاب کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ ساری عمر بھٹکتے ہی گذر جائے گی اور منزل نہیں ملے گی۔
ترقی پسند تحریک کے زوال کا سبب یہ ضرور تھا کہ اس میں نعرہ زنی اور خطابت کا دخل بڑھ گیا تھا لیکن یہ قصور ترقی پسندی کا نہیں بلکہ ناپختہ ادیبوں اور شاعروں کا ہے جو ادب اور شاعری کی ماہیت اور اس کے جمالیاتی تقاضوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے۔ ادب میں سیاسی اور سماجی موضوعات کی بھی جگہ ہے۔ یہ ادب میں ممنوع نہیں ہیں۔ لیکن ترقی پسند تحریک نے صرف اسی کو توجہ کا مرکز بنایا اور چند موضوعات کو دہراتے رہے۔ اس تکرار نے ان کے ادب کو بے لطف بنا دیا۔

ادب میں فرد کے داخلی انتشار، اس کی تنہائی، اداسی اور غمگینی، اس کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور جنسی زندگی کے لئے بھی جگہ ہے۔ لیکن جدیدیت اور اس کی پرستاروں نے اسے ہی اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ یہ دونوں طریقے ہی ادب کے لئے مضر ہیں۔ زندگی اور ادب دونوں کا حسن توازن اور اعتدال میں ہے۔

جدیدیت میں ہیئت پرستی اور مہملیت کا رجحان بھی اشتراکی حقیقت نگاری اند ترقی پسندی کی تحریک کے خلاف ایک منفی ردعمل ہے۔ کیونکہ ترقی پسند تحریک نے ادب کو سماجی و سیاسی تبدیلیوں کا ایک موثر آلہ بنا دیا تھا اور عصری شعور کی تشکیل میں اسے نمایاں کامیابی بھی ملی اس لئے جدیدیت نے اس کے جواب میں ہیئت پرستی اور مہملیت اور بے جا ابہام کا سہارا لیا۔ انفرادیت کو نراجیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ ادھر اشتراکی حقیقت نگاری نے شخصیت اور انفرادیت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور ہیئت میں صالح تبدیلیوں کو بھی انسان دشمنی کا نام دیا۔ اشتراکی نقادوں پلیخانوف، جارج ٹامسن اور اور کرسٹوفر کاڈویل نے انسانی ذوق اور جمال کی تربیت کو بھی مکمل طور پر پیداواری رشتوں کا پابند قرار دیا۔ اور محنت کے اجتماعی عمل سے اسے مربوط کیا۔ چونکہ ترقی پسندی کے

مقاصد اجتماعی ہیں اس لئے وہ ادب، جمالیات، موسیقی سب کو گھسیٹ کر اجتماعی مقاصد کے زیر تحت لے آتے ہیں۔ انتہا پسند اور غلو پسند اشتراکی اس سیاسی دستور العمل کی فرمانبرداری میں فن کی اطاعت کے منکر ہوتے گئے۔ دوسری طرف جدیدیت کے پرستار اور وجودیت کے پیرو ہر وقت کراہتے رہتے ہیں اور یتیم بچوں کی طرح بسورتے رہتے ہیں۔ جدیدیت کے تحت وجود میں آنے والا ادب دیو مالائی تصورات اور جنسی علامتوں کے ذریعہ ذہنی عیاشی کے مزے لیتا ہے اور ایک ایسا ادب پیدا کرتا ہے جس پر حقیقت خندہ زنی کرے اور مشاہدہ اپنا سر پیٹ لے۔ قاری کا ذہن سب کچھ پڑھ لینے کے بعد بھی سادہ کاغذ کی طرح صاف رہے۔ جدیدیت زندگی کی بے مقصدیت اور لایعنیت پر زور دیتی ہے۔ لیکن فطرت کا مطالعہ بصیرت سے کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہاں کوئی چیز بذات خود اپنا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ وہ کسی اعلیٰ و ارفع ہستی کی نشو و نما کا ایک ذریعہ ہے۔

اس طرح جدیدیت کی ترقی کا انحصار اس اعتدال اور توازن پر ہے جو جدلیاتی مادیت اور وجودیت کے صالح عناصر کا رہین منت ہوگا۔ جس میں نہ تو نظریاتی عصبیت نعرہ زنی اور خطابت ہوگی اور نہ داخلی مریضانہ دروں بینی اور لاشعوری جنسی کجروی ہوگی اور نہ مبہم و مہمل موضوعات اور طریقۂ اظہار ہوں گے۔

محمد خالد عابدی
آل انڈیا ریڈیو اندور

# رام لال سے ایک انٹرویو

محمد خالد عابدی :۔ رام لال صاحب آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے ؟

رام لال :۔ ۳ مارچ ۱۹۲۳ء کو میانوالی مغربی پنجاب (پاکستان) میں

محمد خالدی :۔ رام لال صاحب کیا آپ کا اصلی اور قلمی نام یہی ہے ؟

رام لال :۔ پورا نام رام لال چھابڑا ہے۔

محمد خالد عابدی :۔ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا۔ اور آپ کا پہلا ادبی رہ نما کون ہے ؟

رام لال :۔ ۱۹۴۰ء کے آس پاس افسانے لکھنے لگا تھا۔ یوں تو میرا حقیقی رہ نما میرا مطالعہ ہی تھا۔ لیکن ۱۹۴۳ء میں احمد ندیم قاسمی سے لاہور میں راہ و رسم حاصل ہوگئی تھی۔ میرا پہلا افسانہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔

محمد خالد عابدی :۔ کیا دیگر افسانوں کی طرح آپ نے بھی "شاعری" سے ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا ؟

رام لال :۔ جی نہیں۔

محمد خالد عابدی :- آپ کا پہلا افسانہ کب اور کہاں شائع ہوا تھا۔

رام لال :- پہلا افسانہ "تھوک" ہفتہ وار خیام لاہور میں ۱۹۴۳ء میں چھپا تھا۔

محمد خالد عابدی :- آپ کے اس افسانہ کی اشاعت کے بعد آپ کے عزیز و اقارب، احباب اور قارئین وغیرہ کے کیا تاثرات تھے؟

رام لال :- عزیز و اقارب کو تو اس کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ ہاں چونکہ اس افسانے کے ساتھ ایڈیٹر (شبلی بی کام) کا ایک مختصر سا تعریفی نوٹ بھی تھا اس لئے ادیبوں اور ایڈیٹروں نے اس کا خاصا نوٹس لیا تھا۔ خوشتر گرامی ایڈیٹر بلیسویں صدی لاہور نے شبلی صاحب کو فون کر کے میرا پتہ معلوم کیا تھا اور مجھے خط لکھا تھا اور اپنے رسالے میں لکھنے کے لئے دعوت دی تھی۔ احمد ندیم قاسمی اور شورش کاشمیری نے ملاقات ہونے پر بڑی تعریف کی تھی۔ قمر تسکین نے اس افسانے کو ایک انتخاب "نئی خوشبوئیں" میں شامل کیا تھا۔ اسی افسانے کی وجہ سے قمر تسکین نے مجھے اپنے ادبی ڈنر میں بھی مدعو کیا تھا جس میں شورش کاشمیری کے علاوہ کئی ادیب شریک تھے۔ وہاں اس افسانے کا کافی ذکر رہا۔

محمد خالد عابدی :- آپ کیوں لکھتے ہیں اور کیوں کر لکھتے ہیں؟

رام لال :- اپنے اظہار کے لئے لکھتا ہوں اور دوسروں کو اپنے تجربوں میں حصہ دار بنانے کے لئے لکھتا ہوں، مشاہدے اور فکر کے لمحے کوئی خیال یا خاکہ یا پورا افسانہ دے دیتے ہیں۔

محمد خالد عابدی :- کیا یہ دعویٰ درست ہے کہ افسانہ، ادب کی تمام اصناف پر چھایا ہوا ہے؟

رام لال :- جی ہاں اس وقت اردو کا افسانہ ہی ہے جو دوسری اصناف ادب سے زیادہ مقبول ہے۔

محمد خالد عابدی کیا اُردو افسانے سے "ہندی کہانی" بہت آگے ہے

رام لال :- جی ہاں ہندی والوں کے سامنے رسائل کی کمی نہیں اور انہیں اپنی ہر تخلیق کے لئے معاوضہ بھی مل جاتا ہے۔ اردو کے دو تین رسائل کو چھوڑ کر باقی رسالوں کے ایڈیٹر انتہائی طور پر قدامت پسند ہیں معاوضہ دینے کے بارے میں سب ہی بے حد کنجوس واقع ہوئے ہیں۔

محمد خالد عابدی :- ایک اچھے افسانہ نگار کی کیا ذمّہ داریاں ہیں۔؟

رام لال :- مشاہدہ کرے، زندگی کی سچی اور کھری تصویر اتارے اور فن کے دائرے سے کبھی باہر نہ جائے۔

محمد خالد عابدی :- کیا "مقصدیت" سے افسانے کا وحدت تاثر ختم ہو جاتا ہے

رام لال :- جی نہیں اگر اُسے فن کے دائرے کے اندر ہی رہنے دیا جائے۔ اور تخلیق کو پروپگنڈے کی بھونڈی شکل نہ دی جائے۔

محمد خالد عابدی :- افسانے میں "مقامی رنگ" کی کیا اہمیت ہے؟ کیا آپ نے بھی مقامی رنگ اختیار کیا ہے؟

رام لال :- مقامی رنگ، علاقائی تہذیب کی تصویر کشی کو بھی کہا جا سکتا ہے۔ جیسے پریم چند نے اتر پردیش کے دیہات کو پیش کیا۔ احمد ندیم قاسمی نے مغربی پنجاب کے دیہات کو اور بلونت سنگھ نے مشرقی پنجاب کے ہم لوگ بعض خاص خاص شہروں کے مزاج کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔

بمبئی، دلی، کلکتہ یا لکھنؤ کی۔ میں نے کسی افسانے میں میانوالی کے دیہات اور پس ماندہ طبقوں کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی اور کلکتہ اور لکھنؤ کے بارے میں بھی چند افسانے لکھے۔ مقامی رنگ کی اہمیت کی خاص جگہ یا علاقے کے مزاج کو کامیابی سے پیش کرنے میں ہی مضمر ہوتی ہے جیسے واجدہ اور جیلانی بانو کی شروع کی کہانیوں میں حیدرآباد پوری طرح جھلک کر نظر آتا تھا۔ کرشن چندر کشمیر کی زندگی پر لکھتے رہے ہیں اب وہ بمبئی کے ہر طبقے کے بارے میں کامیابی سے لکھ لیتے ہیں۔

محمد خالد عابدی افسانے میں نقطہ عروج کا کیا تصور ہے اور افسانے میں اس کی کیا اہمیت ہے؟

رام لال:۔ عروج سے مراد وحدت تاثر ہے جو افسانے کی بتدریج تکمیل کے ساتھ ساتھ قاری کو اپنی پوری گرفت میں لے کر آگے بڑھتا ہے

محمد خالد عابدی:۔ کیا واقعی "موضوع کی تلاش" افسانہ نگار کے لئے ایک مشکل مسئلہ ہے۔؟ اور آپ کس طرح موضوع تلاش کرتے ہیں۔؟

رام لال:۔ جی ہاں مشکل تو ہے۔ اگر لکھنے والا نئے سے نئے موضوعات تلاش کرنے میں یقین رکھتا ہے تو ماحول اور کردار تلاش کرنے میں بھی مشکل پیش آتی ہے۔ لکھنے والا جب تلاش اور فکر کا عادی ہو جاتا ہے۔ تو وہ اسے افسانے کی یہ جملہ خصوصیات اپنے آپ مل جاتی ہیں۔

محمد خالد عابدی:۔ "افسانہ" قارئین و سامعین کے لئے کس طرح دلچسپی کا موجب بنتا ہے؟

رام لال :۔ موضوع دلچسپ ہو، کردار متاثر کرسکتے ہوں اور زبان عام فہم اور آسان ہو۔

محمد خالد عابدی :۔ آپ افسانے کے لئے کس "اسلوب" کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور کیوں؟

رام لال :۔ اسلوب کا مسئلہ لکھنے والے کے مزاج سے جڑا ہوتا ہے۔ اس میں کسی کوشش یا تقلید کو دخل نہیں ہونا چاہیے۔ جو شخص اپنے مزاج کے مطابق بات کرے۔ وہ اس کے لئے آسان ترین ذریعہ اظہار ہوگا۔

محمد خالد عابدی :۔ آپ نے اپنے افسانوں میں کیا نئے تجربات پیش کئے ہیں۔؟

رام لال :۔ میرے لئے افسانوں میں تجربہ زندگی کے مختلف رویئے ہیں۔ جنھیں میں پیش کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ فارم وغیرہ کے تجربے ضمنی ہیں۔

محمد خالد عابدی آپ اپنے افسانوں کے "عنوانات" کس طرح قائم کرتے ہیں؟

رام لال :۔ عنوان کا رشتہ افسانے کے بنیادی خیال یا کردار سے ضرور ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے مجھے کافی تردّد کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات بہت اچھے عنوانات سوجھ جاتے ہیں۔ لیکن کبھی بڑی دقت بھی پیش آتی ہے۔

محمد خالد عابدی :۔ آپ کن اردو افسانہ نگاروں سے متاثر ہیں اور کیوں؟

رام لال :۔ میں نے سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کو اکثر پسند کیا ہے۔ دوسرے بھی کئی افسانہ نگار ہیں جن کی بعض تخلیقات کو اچھا سمجھتا ہوں لیکن میں نے کسی سے متاثر ہو کر نہیں لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ ذہنی ہم سفری کو اہمیت بھی دیتا ہوں۔

محمد خالد عابدی :۔ کیا وجہ ہے کہ "جدید افسانہ" کو لوگ اس دلچسپی سے نہیں پڑھتے۔ جیسا کہ روایتی افسانہ پڑھا جاتا ہے۔؟

رام لال :- جدید افسانہ ۱۹۳۳ء سے لکھا جا رہا ہے۔ پریم چند کے "کفن" سے روایتی افسانہ یا داستانی افسانہ اس سے پہلے لکھا جاتا تھا۔ جدید کے معنے تجریدیت یا ابہام میں مضمر نہیں ہیں بلکہ جدید رویوں میں پوشیدہ ہیں۔

محمد خالد عابدی :- ادب میں عصری آگہی سے کیا مراد لی جاتی ہے۔؟

رام لال :- اپنے گرد و پیش کی معاشرتی اور سماجی تبدیلیوں کے علاوہ عالمی حالات کی بصیرت بھی حاصل ہونی چاہیئے۔ ماضی کا شعور بھی ضروری ہے تب جا کر ایک عصری آگہی کا ایک تخلیقی احساس پیدا ہوتا ہے

محمد خالد عابدی :- ادب میں عصری آگہی سے کیا مراد لی جاتی ہے ؟

رام لال :- اپنے گرد و پیش کی معاشرتی اور سماجی تبدیلیوں کے علاوہ عالمی حالات کی بصیرت بھی حاصل ہونی چاہیئے ماضی کا شعور بھی ضروری ہے تب جا کر ایک عصری آگہی کا ایک تخلیقی احساس پیدا ہوتا ہے

محمد خالد عابدی :- بالخصوص جوگندر پال اور کشمیری لال ذاکر کی افسانہ نگاری کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں۔؟

رام لال :- جوگندر پال ایک ذہین افسانہ نگار ہیں اس کے یہاں تخلیقی جستجو کی ایک انتھک لگن موجود ہے اس نے بعض افسانے بہت اچھے لکھے ہیں۔ مثلاً کچھوئے۔ بازیافت وغیرہ بہت زیادہ لکھنے کی وجہ سے وہ یکسانیت کا شکار بھی ہو رہا ہے۔ لیکن زیادہ لکھنے سے قلم میں زنگ نہیں لگتا۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ بہت سی کہانیوں میں چند بہت اچھی کہانیاں کون سی دے سکتا ہے۔

کشمیری لال ذاکر کو میں نے زیادہ نہیں پڑھا، جتنا کچھ پڑھا ہے۔ اُس سے ــــ اس کی نئی تخلیقی دریافتوں کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ جذباتیت اور رومان میں زیادہ یقین رکھتا ہے جو پانچویں دہائی میں کچھ خاص قسم کے افسانہ نگاروں کا مزاج بن گیا تھا۔ وہ محنت اور جستجو کرنا چاہے تو اب بھی کوئی ایسی تخلیق دے سکتا ہے۔ جو اردو ادب کا ایک حصّہ بن جائے گی۔ کیوں کہ اُس کے پاس کہانی کا ایک مزاج تو ہے ہی۔

محمد خالد عابدی:۔ کیا ایک طویل افسانہ، ناولٹ کی شکل اختیار کر سکتا ہے؟

رام لال:۔ کر سکتا ہے، اگر اس میں واقعات، کرداروں اور بنیادی خیال کی تشکیل ناولٹ کے انداز سے کی جائے تو۔

محمد خالد عابدی:۔ کیا ناولٹ، افسانہ اور ناول کے درمیان کی چیز ہے؟

رام لال:۔ قریب قریب۔

محمد خالد عابدی:۔ آپ کے نزدیک ناولٹ کی جامع و مستند تعریف کیا ہو سکتی ہے؟

رام لال:۔ جو افسانے کی طرح مختصر نہ ہو اور ناول کی طرح پھیلا ہوا نہ ہو لیکن اس کی وحدت تاثر ایک افسانے کی طرح ہو اور ضخامت ناول سے اس قدر کم ہو۔ اسو سوا سو صفحات میں ضرور آ جائے۔

محمد خالد عابدی:۔ ابھی تک جو ناولٹ لکھے گئے ہیں ان میں سے آپ کسے پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

رام لال:۔ قرۃ العین حیدر کا "ہاؤسنگ سوسائٹی اور چائے کے باغ" ان کے کردار، ماحول، زبان و بیان کی وجہ سے میں نے انھیں پسند کیا ہے

محمد خالد عابدی:- "آگ کا دریا" عصر حاضر کا عظیم ناول ہے۔ کیا آپ اس امر سے اتفاق کرتے ہیں۔

رام لال:- جی ہاں۔

محمد خالد عابدی:- کیا وجہ ہے کہ اردو ناولوں پر فلم نہیں بنتے؟

رام لال:- اسے پروڈیوسروں کی بے اعتنائی ہی کہا جا سکتا ہے۔ وہ عام طور پر پڑھے لکھے نہیں ہوتے فلموں کی کمرشل مارکیٹ میں زیادہ تر مغربی فلموں کے ہی چربے اتار لئے جاتے ہیں یا عام کامیاب اور فارمولہ فلموں کی کہانیوں کو ہی جوڑ توڑ کر نئی کہانی تیار کر لی جاتی ہے۔ اس کام کے لئے بمبئی میں کئی فلمی رائٹر یہ دھندا کر رہے ہیں۔ اچھے ادبی ناول اور افسانوں پر فلم کے نقطہ نظر سے کام کرنے کے لئے اچھے اور ذہین پروڈیوسروں کی ضرورت ہے جو ادبی ذوق بھی رکھتے ہوں اور بھیڑ چال کو بدلنے کا حوصلہ بھی۔

محمد خالد عابدی:- کیا آپ نے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

رام لال:- جی ہاں۔ ریڈیو کے لئے دو درجن سے زائد ڈرامے لکھ چکا ہوں۔ جو لکھنؤ، بمبئی، دہلی، سری نگر، جموں اور جالندھر سے پیش کئے جا چکے ہیں۔ ایک ڈرامہ، آدھا آدمی، اسٹیج کے لئے لکھا تھا جو ۷۲ء میں بنارس اور لکھنؤ میں پیش کیا گیا تھا۔

محمد خالد عابدی:- آپ کا پہلا ڈرامہ، کب اور کہاں شائع ہوا تھا۔

رام لال:- پہلا ڈرامہ "شاعر" میں کئی سال پہلے چھپا تھا جس کا نام یاد نہیں رہا۔

محمد خالد عابدی:- کیا وجہ ہے کہ اب آپ نے ڈرامے لکھنا ترک کر دیئے۔؟

رام لال :۔ اب بھی کبھی ریڈیو کے لئے لکھتا ہوں۔ آج کل ٹی وی کے لئے لکھ رہا ہوں۔
اسٹیج کے ڈرامے پیش کرنے کے لئے بہت سارو پیہ چاہیے۔ اس کے علاوہ
اس کے ٹکٹوں کے لئے (PUSHSALES) کرنی پڑتی ہے۔ لوگ اپنے
شوق سے بہت کم ڈرامے دیکھنے کے لئے جاتے ہیں۔

محمد خالد عابدی :۔ کسی بھی ادب میں انٹرویو کی کیا اہمیت ہے؟

رام لال :۔ اگر انٹرویو لینے والا ادیب کے تخلیقی سوتوں کو دریافت کرنے میں کامیاب
ہو سکے اور ادیب اپنی زندگی کے ایسے عام رخ بھی بے نقاب کر دے جو
دوسروں کی نظر سے پوشیدہ ہوں۔

محمد خالد عابدی :۔ انٹرویو کے سلسلے کو مزید بہتر بنانے کے لئے آپ کی کیا اصلاح و تجاویز ہیں۔

رام لال :۔ جس کا انٹرویو لینا ہو اس کے ادب کا بھرپور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس
کے بارے میں دوسروں کے خیالات بھی معلوم ہونے چاہئیں۔ پھر وہ تو
ان سوالات کو تیار کرے جسے وہ خود جاننا چاہتا ہے۔ یا ان کے بارے
میں دوسروں کو آگاہ کرنا چاہتا ہے۔

محمد خالد عابدی :۔ کیا اُردو کا موجودہ رسم الخط بدل دینے سے اُردو زبان کی ترقی اور اعتبار
کے امکانات پیدا ہو جائیں گے؟

رام لال :۔ جی نہیں رسم الخط بدل دینے سے خود اُردو کا ہی مزاج بدل جائے گا۔
اُردو زبان کو اپنے موجودہ رسم الخط کے ساتھ ہی زندہ رہنا ہوگا۔

محمد خالد عابدی :۔ اُردو زبان و ادب کے بغیر فلم کی مقبولیت و کامیابی مشکوک ہے کیا یہ
دعویٰ درست ہے؟

رام لال :۔ کسی حد تک۔

محمد خالد عابدی۔ آپ کی مطبوعات؛

رام لال۔ انقلاب آنے تک، نئی دھرتی پرانے گیت۔ گلی گلی، وہ مسکرائے گی، کل باتیں، چراغوں کا سفر، آواز تو پہچانو، انتظار کے قیدی اکھڑے ہوئے لوگ، گزرتے لمحوں کی چاپ، یہ سب افسانوی مجموعے ہیں۔ ناولٹ مٹھی بھر دھوپ، کہرا اور مسکراہٹ۔

---

# اردو

## کی بقا اور ترقی کے لئے خود

# اردو

## والوں کو اپنے اپنے مقام پر انفرادی اجتماعی

## ـــــ دونوں طرح ـــــ

## سچی لگن مستقل مزاجی اور ہوشمندی

## سے کام کرنا ہوگا

شہناز قریشی (اجین)
ایم اے بی ایڈ

افسانہ

# قربت اور فاصلے

آج جس وقت میں گھر سے نکلی ٹھیک نو بج رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں دس منٹ لیٹ ہوگئی تھی۔ معمول کے مطابق میں روز صبح نو بجے گھر سے نکل جایا کرتی ہوں تاکہ بس میں جگہ کے لئے مجھے کسی قسم کی پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔ عزت نگر کے لئے مجھے ساڑھے نو بجے ڈبل بس ہی پکڑنا پڑتی ہے۔ جو ٹھیک گیارہ بجے مجھے اپنی منزل مقصود پر پہنچا دیتی ہے۔ میرے گھر سے بس اسٹاپ پر رکتی ہے۔ جہاں مسافر بس کے انتظار میں ایسے بے چین نظر آتے جیسے وہ بس نہ ہو ان کی محبوبہ ہو۔ اور "کیو" کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ چھوٹی موٹی جگہوں پر لوگ قطار کی یا نظم وضبط کی پابندی نہیں کرتے۔ جیسے ہی اسٹاپ پر بس آکر رکتی ہے بس میں داخل ہونے والے اترنے والے مسافروں کا انتظار کئے بغیر ہی بس میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس سے پہلے کنڈکٹر انھیں جھڑک دیتا ہے اور اپنا ہاتھ آڑا کرکے گیٹ پہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ بعض اترنے والے نازک مزاج حضرات بس میں داخل

ہم سفر بے مسافروں کی عجلت پر بڑے چراغ پا ہوتے اور غصّے سے ناک پھیلا کر کہتے یارو اترنے تو دیا ہمارے سروں پر سے چل کر بس میں بیٹھ گئے۔ اکثر روز ہی ایسا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میں وقت سے پہلے ہی پہنچ کر قطار میں تو نہیں مگر آگے کی جانب ضرور کھڑی ہو جایا کرتی ہوں تاکہ میرے بعد آنے والے مسافر یہ محسوس کرلیں کہ انھیں میرے بعد بس میں داخل ہونا ہے۔

لیکن آج بس اسٹاپ پر دس گیارہ مرد عورتیں کھڑے ہوئے دکھائی دیئے۔ بس میں جگہ ملنا مشکل ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ میں پاس کے ہی ایک قصبے عزت نگر میں ایک پرائیویٹ فرم میں ڈزائنر ہوں۔ عزت نگر ہمارے قصبے بھگت نگر سے قریب بنیالیس کلومیٹر ہوگا۔ وہاں پہنچنے کے لئے مجھے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگتا ہے میرے والد مقامی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ابھی دو سال پہلے ہی اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔ اور اسطرح وہ میری ممی اور میرے دونوں چھوٹے بھائیوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مالی پریشانی نے ہمیں آ گھیرا۔ آمدنی کے ذرائع محدود ہو گئے۔ چچا بھی آخر کب تک ہمارا ساتھ دیتے۔ مجبوراً مجھے سروس کرنی پڑی،

"وہ آگئی بس" قریب ہی کھڑی ہوئی ایک ننھی سی بچی نے چیخ کر تالی بجائی۔ میں سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے ہی بس آکر رکی بھیڑ میں ہل چل مچ گئی۔ مسافر اترنے لگے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج بہت کم لوگ ہی اُترے۔ جیسے تیسے میں بس میں داخل ہوئی۔ سیٹوں پر نظر دوڑائی کہ شاید کوئی خالی سیٹ مجھے مل جائے۔ مگر وائے قسمت کوئی سیٹ خالی نہ تھی۔ مجبوراً میں نے بس میں اوپر کی جانب لگی ہوئی راڈ میں لٹکے ہوئے چمڑے کے پھندہ نما تسمے میں اپنی انگلیاں پھنسا دیں۔ جیسے ہی بس جھٹکے کے ساتھ اسٹارٹ ہوئی کھڑے

ہوئے مسافر آگے کی جانب جھک گئے۔ آج تو شاید یہ سفر رندوں کی طرح جھومتے ہوئے گذرے گا۔ میں نے خود سے کہا۔

آس پاس کی سیٹوں پر جو مرد بیٹھے ہوئے تھے وہ صورت سے کافی مہذب نظر آرہے تھے۔ ایک دو بار انہوں نے میری جانب دیکھا بھی۔ میں نے سوچا شاید صنف نازک سمجھ کر اخلاقاً طور پر وہ مجھے اپنی سیٹ پیش کریں یا ان کے دماغ کے کسی گوشے میں "لیڈیز فرسٹ" والا مقولہ گھوم رہا ہو۔ مگر وہاں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ میرے پیچھے والی سیٹ سے سرگوشی میں ایک نوجوان اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا "یار جگہ دے دے۔ بچاری کھڑی ہے"۔ اس کے ساتھی نے بے حیائی سے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا "انھیں جگہ دے دیں ہم لوگ بارہا ان کی طرح کھڑے کھڑے سفر کرتے ہیں مگر کیا مجال جو یہ چھوٹے ہی ہم سے کہہ دیں کہ آپ اِدھر بیٹھ جایئے اور تو اور اگر پاس کھڑے بھی ہو جاتے ہیں تو انھیں ناگوار گذرتا ہے۔ اور ناک بھویں چڑھا کر کہتی ہیں ذرا ٹھیک سے کھڑے رہیئے۔ مسٹر آپ کو کھڑے رہنے کا تمیز نہیں ہے۔ ہنس ہنس کر اور رو رو کر اپنے گھر کے دکھڑے ساسوں کے ظلم وستم، اپنے نالائق بچوں کی شیطانیوں کے کارنامے اور پتی دیو کے معاشقے سنا سنا کر پورے راستے ایک دوسرے کے آنسو پونچھا کرتی ہیں۔ بھلا ان کو میں جگہ دونگا" نوجوان کو شاید اپنے تلخ تجربے کا خیال آگیا تھا۔ اس نے ایک حقارت بھری نظر میں میری جانب ڈالی اور اپنی سیٹ پر کچھ اور پھیل گیا۔ بات تو ٹھیک کہہ رہا ہے کم بخت میں نے دل میں اعتراف کیا مگر سب ہی عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں۔ مجھے اپنا توازن قائم رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ تو سہارے کے لئے راڈ کو پکڑے ہوئے ہی تھا۔ دوسرے ہاتھ میں منی پرس لنچ باکس اور آفس کی فائل تھی۔ آج اتفاق سے میں وہ ناول بھول آئی تھی جو کل میں نے اسی بس میں شروع کیا تھا۔ اکثر میں سفر کی بوریت اور تنہائی سے

سے بچنے کے لئے اپنے ساتھ کوئی ناول یا میگزین رکھ لیتی ہوں۔ ٹھیک ہی ہوا جو آج میں نے کوئی ناول یا رسالہ نہ لیا۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ کہیں کیوں لیٹ ہوگئی۔ مجھے سیٹوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں پر بھی بڑا غصہ آ رہا تھا کیسے آرام سے بیٹھے گپّیں لڑا رہے ہیں۔ کھڑے ہوئے مسافروں کی تکلیفوں اور پریشانیوں کا انھیں ذرّا برابر بھی احساس نہیں۔ یکایک پیچھے کی جانب سے کھلی ہوئی کھڑکی سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اور میری ساڑھی کا پلّو اڑ کر آگے بیٹھے ہوئے ایک بڑے میاں کے منہ پر جا پڑا۔ میری حالت اس وقت قابل رحم تھی۔ پاس کی سیٹ سے پشت کا سہارا لے کر میں نے فوراً اپنا پلّو درست کر کے کمر کے گرد اُڑس لیا تاکہ دوبارہ یہ گستاخی پلّو کسی اور سے چھیڑ خانی نہ کر سکے۔ اس درمیان فائل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ آخر کار اُن بڑے میاں کو مجھ پر رحم آ ہی گیا اور انہوں نے میری فائل اٹھاتے ہوئے خود اپنی سیٹ میرے لئے چھوڑ دی مگر اٹھتے وقت انہوں نے قدرے میری جانب جھکتے ہوئے کہا۔ میڈم آپ کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے آپ سیٹ پر بیٹھ جائیے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور بیٹھ گئی۔ سیٹ پر ایک ہوم گارڈ سپاہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کن آنکھیوں سے میری جانب دیکھا اور کچھ سمٹ کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ میں نے سیٹ پر بیٹھ کر بڑی غلطی کی ہے۔ جن بزرگ ہستی نے سیٹ عنایت فرمائی اور مجھ پر ایک احسان عظیم کیا تھا۔ وہ بار بار اپنی ناشائستہ حرکتوں سے مجھے اس بات کی یاد دلا رہے تھے کہ میں نے ان کے احسان کو کہیں فراموش تو نہیں کر دیا۔ اُن کی بوڑھی انگلیاں میری سیٹ کے پچھلے حصّہ پر جا دو جگانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ لہٰذا میں کچھ آگے کی جانب کھسک کر بیٹھ گئی لیکن کچے راستہ کے اُتار چڑھاؤ بس کے اچانک بریک اور بھیڑ کا وہ پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ایک بار تو وہ بالکل ہی مجھ پر آ رہے۔ میں نے ناگواری ظاہر کرتے ہوئے اُن کی جانب دیکھا۔ اس کے علاوہ میں

اور کیا کر سکتی تھی۔ سیٹ دیکر انہوں نے میری زبان جو بند کردی تھی اور اب مجھے اُن کی ستم ظریفیاں برداشت کرنا پڑ رہی تھیں۔ "سوری" کہہ کر حضرت ایک طرف سنبھل گئے اتفاق سے اگلے اسٹاپ پر ہی ہوم گارڈ سپاہی اتر گیا پھر کیا تھا وہ "بوڑھے نوجوان صاحب تو شاید اس کے منتظر ہی تھے فوراً خالی سیٹ پر بیٹھے ہوئے اپنے نقلی دانتوں کا چوکا بڑے خلوص سے نکال کر پوچھنے لگے۔ "میڈم آپ کو کہاں تک جانا ہے۔؟

جی میں عزت نگر جا رہی ہوں میں نے سنجیدگی سے کہا۔ آپ عزت نگر میں ہی رہتی ہیں۔! دوسرا سوال "رہتی ہوں یا نہ رہتی ہوں آپ کو کیا مطلب" میں نے دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔ مگر بظاہر خشک لہجے میں کہا "جی میں وہاں سروس کرتی ہوں میں اور اپنا رخ کھڑکی کی جانب کر لیا۔ یک بارگی بائیں جانب سے مویشیوں کا جھنڈ آتا ہوا دکھائی دیا وہ سڑک کو پار کر رہا ہے۔ ڈرائیور نے بس روک دی۔ بڑے میاں کو کھڑکی سے باہر دیکھنے کا بہانہ مل گیا۔ فوراً انہوں نے اپنا ہاتھ کھڑکی کے شیشے پر رکھا اور بالکل میرے نزدیک بلکہ میرے چہرے کے بالکل قریب انہوں نے اپنا چہرہ کر لیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کے سر سے بوڑھے بکروں کی طرح نکلنے والی بساند میری ناک میں گھسنے لگی میں نے اکتا کر اُن سے کہا "انکل جی آپ اِدھر کھڑکی کی جانب بیٹھ جایئے۔ میں اِدھر آپ کی نشست پر بیٹھ جاتی ہوں" لفظ "انکل" پر انہوں نے میری جانب ایسی قہر آلود نظروں سے دیکھا جیسے میں نے انھیں کوئی گالی دے رہی ہوں۔ "نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں آپ آرام سے بیٹھے دراصل میں دیکھ رہا تھا۔ کہ گاڑی کیوں رک گئی" انہوں نے اترتے ہوئے چہرے سے کہا اور ایک لمبی جماہی لے کر اپنا ہاتھ نشست کی پُشت پر پھیلا دیا۔ بار بار اُن کی نگاہیں میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں بظاہر تو فائل الٹ کر دیکھ رہی تھی۔ مگر پوشیدہ طور پر ان کی ہر حرکت پر میری نظر تھی۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اپنے دائیں ہاتھ میں رول کیا ہوا میگزین "تہ سن" نکالا اور اس کے صفحے الٹنے لگے۔ ایک صفحے پر آ کر ان کی نظریں

رک گئیں یہ ایک انگریز عورت کی تقریباً عریاں تصویر تھی جو سمندر کی جانب دوڑ رہی تھی۔ بڑے غور سے بڑی دیر تک وہ اس تصویر کو دیکھتے رہے۔ میگزین کو انہوں نے اس طرح پکڑ رکھا تھا۔ کہ زیر غور تصویر بالکل میرے سامنے تھی۔ بھلا اس بڑھاپے میں حسیناؤں سے اس درجہ لگاؤ تھا! شاید جوانی میں بڑے میاں بڑے رنگیلے رہے ہونگے اور اب جب کہ موت کا قاصد دروازے پر کھڑا ہے یہ عشق کی سڑھیوں پر کھڑے ہوئے راستہ ٹٹول رہے ہیں۔

کھلا ہوا میگزین گود میں رکھ کر انہوں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اور سگریٹ سلگا کر ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑا جو ہوا کے رخ کے ساتھ میرے چہرے پر بکھر گیا۔ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس بوڑھے کھونسٹ کی سوکھی انگلیوں سے سگریٹ چھین کر پھینک دوں اور اس روزنے اس کے سوکھے اور پچکے ہوئے گالوں پر طمانچہ ماروں کہ وہ اپنی بوڑھی جوانی کی ساری چوکڑیاں بھول جائے۔ مگر میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا "انکل جی وہ دیکھیئے جس کی سیٹوں سے اوپر کی جانب جلی حرفوں میں کیا لکھا ہے":

انہوں نے آنکھیں چندھیا کر اس طرف دیکھا جہاں لکھا تھا "بس میں دھومر پان ورجت ہے" اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "میڈم کون اس تحریر کی پابندی کرتا ہے۔ پھر بھی اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو یہ لیجیئے میں آپ کی خاطر اسے پھینک دیتا ہوں" یہ کہہ کر انہوں نے سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ اور ایسی نظروں سے میری جانب دیکھا جیسے مجھ پر ایک بڑا احسان کیا ہو۔ مرد فطرتاً بڑے خود غرض اور مطلبی ہوتے ہیں۔ خصوصاً عورتوں پر اگر کوئی احسان کرتے ہیں یا ان کے ساتھ رعایت برتتے ہیں۔ تو کہیں دور اس میں ان کا مطلب پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور اپنے احسان کا بدلا وہ کسی بھی صورت سے لینا چاہتے ہیں۔ مرد کی محبت بھی ایک حد تک غرض سے خالی نہیں رہتی۔ کیونکہ وہ محبت کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ جب کہ

عورت چاہے جلنے کے تصور سے سرشار رہتی ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ شاید میں اپنے راستے سے بھٹک رہی ہوں کیوں کہ ذکر تو ان پیر جواں سال کا چل رہا تھا۔ جنھوں نے اپنی نازیبا حرکتوں سے مجھے کافی زچ کر دیا تھا۔ خدا خدا کر کے اِن سے پیچھا چھوٹا، کیونکہ اگلے اسٹاپ کے لئے کنڈکٹر نے چیخ کر کہا۔ فورٹ اسٹریٹ والے مسافر یہیں اتر جائیں، وہ حضرت بڑے زور سے چونکے اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ آج تو اسٹاپ کی آمد کا پتہ بھی نہ چلا۔ پتہ چلتا بھی کیسے بڑے میاں آپ تو اپنی بوڑھی آنکھوں سے جوان خواب دیکھنے میں محو تھے۔ میں نے دل میں ہنستے ہوئے کہا۔

اچھا میڈم، بائے! شکریہ پھر ملیں گے۔" یہ شکریہ انھوں نے کس سبب سے ادا کیا میری سمجھ میں نہ آیا۔ بلکہ شکریہ تو مجھے ادا کرنا تھا کہ انھوں نے مزید بوریت سے مجھے نجات دے دی تھی۔ ابھی میں بڑے میاں کی گذشتہ حرکتوں کے بارے میں سوچ کر پیچ و تاب کھا ہی رہی تھی کہ ایک خوش پوش اور خوبرو نوجوان گہرے سیاہ رنگ کا چشمہ لگائے ہاتھ میں وی آئی پی کا بریف کیس لئے ہوئے بس میں داخل ہوا۔ اس کی نظریں چاروں طرف کا جائزہ لیتی ہوئیں میری سیٹ پر پڑیں جو کہ خالی تھی۔ نوجوان تیزی سے چل کر میری جانب آیا بڑے مہذب انداز میں اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا" ایکسکیوز می میڈم کیا یہ سیٹ خالی ہے۔ "جی ہاں میں نے قدرے مسکراتے ہوئے اُسے جواب دیا۔ تھینکیو کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔ میں خود اپنے لہجے پر حیران تھی اچانک مجھ میں یہ تبدیلی کیسے آگئی، کیوں مسکرا کر میں نے اسے جواب دیا۔ کیا اس لئے کہ میں اس کی پرکشش شخصیت سے متاثر ہو گئی تھی۔ یا اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا۔ یا وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ یا تو میں بیزار بیٹھی تھی یا اب پرسکون اور خوش تھی۔ اس کے بارے میں سوچ رہی تھی

جو گھر رکھا دیسے کسی کمپنی کا منیجر یا ایجنٹ یا پھر میڈیکل ری پریزینٹیٹو لگ رہا تھا۔ اچانک ہی اس نے ٹائم دیکھنے کے لئے اپنا ہاتھ لمبا کیا تاکہ آستین اوپر کی جانب کھسک کر گھڑی پر نظر پڑ جائے۔ اس وقت ٹھیک پونے گیارہ بجے تھے۔ میری منزل صرف اگلے پندرہ منٹوں میں آنے والی تھی۔ گذرنے والے قلیل لمحوں کے تصور نے مجھے افسردہ کر دیا "میڈم کیا وقت ہوا ہے" نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنی کلائی اس کے سامنے کر دی "اوہ" کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگا۔ کیوں؟ میری سوالیہ نظریں اس کے چہرے سے ہوتی ہوئی اس کے کھلے گریبان کے اندر سیاہ گھنے بالوں کے درمیان چمکتے ہوئے ننھے سے سنہرے لاکٹ پر پڑیں۔ شاید اس نے میری نظریں گریبان پر پڑتے ہوئے دیکھ لی تھیں۔ آہستہ سے اس نے اپنے بالوں بھرے سینے پر ہاتھ پھیر کر لاکٹ درست کرتے ہوئے کہا "آج اتفاقاً میں قریب ایک گھنٹے لیٹ ہو گیا ہوں جس کی وجہ سے میرے سارے پروگرام ڈسٹرب ہو گئے ہیں۔ مجھے ٹھیک بارہ بجے لاوس روڈ پہنچ جانا تھا جہاں میرے ہم پیشہ مسٹر چکرورتی میرے منتظر ہوں گے لیکن گیارہ بجنے ہی والے ہیں اور ابھی مجھے وہاں پہنچنے میں کم سے کم ڈیڑھ گھنٹہ چاہئے۔ اس عرصہ میں۔" "آپ کیا بزنس کرتے ہیں" میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "میں بزنس تو نہیں کرتا البتہ میڈیکل ری پریزینٹیٹو ضرور ہوں" "کریکٹ!" نا دانستہ طور پر میرے منہ سے نکلا "جی" اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ اوہ کچھ نہیں میں نے بات ٹالتے کہا کہ حقیقت میں میں نے اس کے بارے میں جو مختلف اندازے لگائے تھے ان میں سے ایک صحیح ثابت ہوا تھا۔ کیسا حسین اتفاق تھا کہ ہم دونوں ہی گھر دیر سے لیٹ چلے تھے شاید اس سفر میں ملنے کے لئے! "میں اور میرا ساتھی قریب پندرہ دن کے ٹور پر مختلف شہروں میں ڈاکٹروں سے وزٹ کرتے آج ہی روانہ ہونے والے ہیں" اس نے بات جاری رکھتے ہوئے اپنا سیاہ چشمہ اتارا، گہری اور باہم ملی ہوئی ابروؤں کے نیچے اس کی بھوری اور موٹی موٹی معصوم آنکھیں بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔ کاش یہ سفر

طویل ہو جائے میرے دل نے دعا مانگی۔ مگر مجھے اچانک ہنسی آگئی اپنی نادان خواہش پر کیونکہ چند لمحوں بعد میری منزل آنے والی تھی۔ عورت بھی بڑی عجیب و غریب فطرت کی مالک ہے۔ واقعی مجھے اس دانشور کے قول میں کچھ سچائی نظر آنے لگی تھی جس نے عورت کو ایک معمہ کہا ہے۔ کب کس وقت کس قسم کے جذبات اس کے دل میں بیدار ہو جائیں اور کب وہ انھیں عملی جامہ پہنانے کے لئے کمربستہ ہو جائے۔ کب کسی کی قربت اس کے لئے باعث مسرت بن جائے اور کب اس کا اس کا قہر بے مقصد ہی کسی پر ٹوٹ پڑے اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ بسوں اور ٹرینوں میں سفر کرتے وقت اکثر میں نے اس بات کا بڑی باریکی سے مشاہدہ کیا ہے کہ اگر کسی لڑکی یا عورت کے پاس ایسا مرد آکر بیٹھ جاتے جو اسے ناپسند ہو تو اس پھر دیکھیے وہ اس سے کس طرح اپنا دامن بچاتی ہے۔ اس مرد کا جسم تو درکنار اگر اس کے لباس کا کوئی حصہ بھی چھو جاتا ہے تو اس کے چہرے پر ناخوشگواری کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں اور جس طرح کوئی ناپاک شے سے

اپنا دامن بچاتی ہے اس مرد کا جسم تو درکنا اگر اس کے لباس کا کوئی حصہ بھی چھو جاتا ہے تو اس کے چہرے پر ناخوشگواری کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں اور جس طرح کوئی ناپاک سے اپنا دامن

حتی الامکان بچانے کی کوشش کی جاتی ہے ویسے ہی وہ عورت سمٹ سمٹا کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور اگر بے خیالی میں وہ حضرت ان محترمہ سے ٹکرا گئے تو پھر خیر نہیں۔ اچھی خاصی عزت مٹی میں مل جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم سفر صاحب محترمہ کو بھا گئے یا وہ ان کے پاس بیٹھنے کے قابل ہیں تو پھر لباس تو کیا جسم بھی ٹکرائے تو کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ اچانک ہی بس کے ایک جھٹکے نے میرے تخیلات کا تانا بانا توڑ دیا۔ میں اپنی سیٹ پر اچھل پڑی۔ سامنے کے اسٹاپ پر میری منزل تھی۔ کمپنی کی گلابی عمارت صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے سیٹ پر سے اٹھتے ہوئے اپنے ہم سفر سے نکلنے کی اجازت مانگی۔ اس نے چونک کر کہا آپ کا اسٹاپ آگیا کیا؟ جہاں وہ سامنے گلابی بانغ عمارت اس کی دوسری منزل پر ہی ہمارا آفس ہے" آپ یہیں رہتی ہیں" اس نے پوچھا۔

جی نہیں۔ بھگت نگر رہتی ہوں۔ یہاں سروس ہے آپ ڈاؤن کرتی ہوں" اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے پلٹ کر میری جانب دیکھا اور پھر اس نوجوان کی جانب کچھ مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ شاید بہت دیر سے وہ ہماری باتیں سن رہا تھا۔" ویسے مجھے پوچھنا تو نہیں چاہئے مگر پھر بھی آپ کو کیا کہتے ہیں"۔ اس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ یہ بات تو آپ کو بہت پہلے ہی معلوم کر لینا تھی اب پوچھ کر کیا کریئے گا۔ میں ایک عورت ہوں کیا یہ تعارف کافی نہیں! میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بھوری آنکھوں میں جھانک کر کہا جہاں بہت سی تمنائیں خواہشیں اور ارمان کروٹ لے رہے تھے۔ اس کا چہرہ حیرت الجھن اور شرمندگی کے ملے جلے جذبات سے ایک لمحہ متغیر ہو گیا "آئی ایم ساری" اس نے مایوسی سے کہا، اور اپنی سیاہ عینک آنکھوں پر چڑھالی۔ پھر کچھ سوچ کر اپنا تعارفی کارڈ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا" آپ کا تعارف بڑا مکمل تھا۔ مگر میں مرد ہونے کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں کچھ فرضی ناموں سے بھی جانا جاتا ہوں۔ ٹھاکر چندر پرتاپ سنگھ ایم ایس۔ سی میڈیکل ریپرزنیٹو 15 رجنیل کالج کمپاؤنڈ اجمیر" ایک سرسری نظر میں نے کارڈ پر ڈالی اور تھینک یو کہہ کر اسے اپنے پرس میں ڈال لیا۔ "بائے" میں نے دھیرے سے کہا اور بس سے نیچے اتر گئی۔ ابھی میں مشکل سے دس قدم ہی چلی ہوں گی کہ بس ایک زناٹے کے ساتھ میرے قریب سے نکلی۔ میں نے اس کھڑکی کی جانب نظر دوڑائی جہاں کچھ دیر قبل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ تاریک شیشوں کے نیچے ہونٹوں پر ایک عجیب مسکراہٹ لئے وہ نوجوان مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں بھی مسکرا کر رہ گئی۔ دل نے دھیرے سے کہا آج کا سفر برا تو نہیں رہا۔

(غیر مطبوعہ)

# منظومات

# نعت شریف

## شاہد ساگری

ہمیں ہیں جو حقدارِ باغِ ارم ہیں
شہنشاہِ والا کی اُمّت میں ہم ہیں

مدینے کی گلیوں میں جن کے قدم ہیں
بڑی شان والے بڑے محترم ہیں

سلاطینِ عالم سے رتبے میں بڑھ کر
غلامانِ احمدؐ خدا کی قسم ہیں

دو عالم ہے فیض اِن کا ہی جاری
رسولِ خدا ایسے بحرِ کرم ہیں

محمدؐ کے گیسو نظر آئے جس دن
نکل جائیں گے جو مقدر کے خم ہیں

خدا دینے والا ہے قربِ محمدؐ
یقین ہے جدائی کے ایام کم ہیں

جنھیں سرورِ دیں سے نسبت ہے شاہدؔ
کہاں ان کی نظروں میں دیر و حرم ہیں

صلاح الدین عشقی

# سلام

جانِ حزیں پہ خاص کرم حسین کا — دمساز، دلنشیں الم ہے حسین کا
حزاں کے اور کون شہنشاہِ عشق ہے — سر ہر رضائے یار پہ خم ہے حسین کا
ملتا ہے بیکسی کو سہارا خیال سے — کسی درجہ جان و دل پہ کرم ہے حسین کا
پایا ہے ہر کسی نے انہیں کی نگاہ سے — رحمت ملی ہے جس سے کرم ہے حسین کا
دلِ یار عمر ہے تازہ بہاروں سے زندگی — جب سے کہ دل پہ نام رقم ہے حسین کا
کب مل سکا کسی کو محبت کا یوں صلہ — سر عین بندگی میں قلم ہے حسین کا
رقصاں حیاتِ عشق بہر گام کیوں نہ ہو — دیکھا جدھر بھی نقش قدم ہے حسین کا
راہِ خدا میں ایسے لٹاتا ہے کون گھر — جس کی نہیں نظیر وہ دم ہے حسین کا
جس کی نہیں مثال وہ ذاتِ حسین سے — جس کا نہیں جواب وہ غم ہے حسین کا

عشقی حسابِ حشر کا کچھ غم نہیں مجھے
جو ہے شفیعِ حشر وہ غم ہے حسین کا

# یک جہتی کا گلدستہ

نجمہ عزیز مراد آبادی
بسی کرتپور۔ ضلع بجنور
یوپی

عام ہے دنیا بھر میں چرچا
دیش ہمارا ہے گلدستہ

دیش ہمارا ہے گلدستہ — رنگ برنگے پھولوں والا
سب کی خوشبو بھینی بھینی — خوشبو سے ہر ذرہ مہکا
رنگ و بو میں پھول جدا ہیں — لیکن سب رہتے ہیں یکجا
پیار محبت کی ڈوری سے — قدرت نے ہے سب کو باندھا
ہو کے جدا بھی ایک ہیں یہ سب — قدرت کا ہے بھی کرشمہ
آندھی، طوفان نے بھی اکثر — ہے ہر برگِ گل کو جھنجھوڑا
پھولوں نے ہر حال میں لیکن — قائم رکھا اپنا رشتہ
یوں وہ پھولوں کی یک جہتی میں — ڈال سکا نہ کوئی رخنہ
اس کارن ہی تو اے نجمہ
دیش ہمارا ہے گلدستہ

رنگ برنگی تہذیبوں کا — مرکز ہے یہ دیش ہمارا
ذاتیں مذہب اور زبانیں — مان بڑھاتے ہیں بھارت کا
فرق ہے یہ کہ، ہے سب کو ہی — اپنا اپنا کلچر پیارا
لیکن وقت اگر پڑ جائے — تو سب ہو جاتے ہیں یکجا
پھر بھی کچھ نادان وشتری — مطلب حل کرنے کو اپنا
اہل وطن کے دل میں اکثر — نفرت کا بھرتے ہیں جذبہ
پر سب مل کر کر دیتے ہیں — ناک میں دم ان کج رؤوں کا
اس ایکتے سے ہی تو وطن ہے — امن و ترقی کا گہوارا
اس یک جہتی سے ہی نجمہ!
دیش ہمارا ہے گلدستہ

# غزل

مخمور جمالی سنبھلی

لگتی ہے اک سراب یہاں ہر خوشی مجھے
زہراب میں ڈبو بھی دے اے زندگی مجھے

لَو دے اٹھی شباب کی گرمی سے ہر کرن
جُھلسا نہ دے کہیں یہ جواں چاندنی مجھے

اِس شہرِ سنگدل میں تو گھٹنے لگا ہے دم
صحرا میں لے کے چل مری دیوانگی مجھے

ارضی کثافتوں سے تعلق نہیں رہا
تیری لطافتوں کی مہک لے اڑی مجھے

مِلنا تھا مجھ کو مل گیا اخلاص کا صلہ
زخموں کے پھول دے تو گئی دوستی مجھے

سوچا تو ہر قدم پہ تھا انسان کا وجود
ڈھونڈا تو دور تک نہ مِلا آدمی مجھے

مانا کہ انقلاب بھی اک خواب ہے مگر
ہوتی ہے اِس خیال سے کتنی خوشی مجھے

احساس کی تہوں میں اُترنے لگا ہوں میں
ڈرتا ہوں لے نہ ڈوبے مری آگہی مجھے

سینے کے سارے راز قلم نے اُگل دیئے
رُسوا کرے گی خوب مری شاعری مجھے

مخمورؔ اس گلی میں اپنا نہ تھا کوئی
کِس نے یہ میرے نام سے آواز دی مجھے؟

کامران نجمی
پٹنہ۔ بہار

# غزل

یوں ہی سہی کہ کربِ شب تاب مر نہ جائے
تاریکیوں پہ حادثہ ایسا گذر نہ جائے

احساس کے بدن کو لہو میں ڈبوئے رکھ
یہ زخمِ جانگداز کسی وقت بھر نہ جائے

میرا بھی کچھ قصور ہے اس میں اے صاحبو!
الزامِ خودنمائی کا اُس کے ہی سر نہ جائے

اتنا نہ اس فضا میں اڑا مجھ کو لے ہوا
آشوبِ رنگ و بو میں مرا خواب مر نہ جائے

لے دے کے اک یہی تو متاعِ فقیر ہے
آنکھوں سے اشک روح سے تنہائی ڈر نہ جائے

دلکش ہے وہ بدن تو کسی اور حسن سے
پر چشم و لب سے آگے کس کی نظر نہ جائے

ہے وجہِ کامرانی یہی گردشِ ایّام
سورج مرے نصیب کا کجھی ٹھہر نہ جائے

جبّار غنیؔ

# غزل

نہ میرا ساتھی ہے کوئی نہ ہمسفر میرا
حسین شہر کی سڑکوں سے ہے گزر میرا

میں ایک مسافرِ ہستی ہوں راہ بھولا ہوں
ستارو! مجھکو بتاؤ کہاں ہے گھر میرا

ہوا کی طرح بھٹکتا ہوں میں فضاؤں میں
سنو سنو کہ فسانہ ہے مختصر میرا

مری وفاؤں کا چرچا ہے دوست و دشمن میں
میرے رقیبوں کو معلوم ہے ہنر میرا

ہمیشہ دوشِ ہوا پر سوار رہتا ہوں
بلندیوں پہ ہوا کرتا ہے سفر میرا

غنیؔ میں دل میں شہادت کا شوق رکھتا ہوں
کسی کے کام جو آتا ہوئے لے سر میرا

عظیم امروہوی

# غزل

یوں تو سرسبز ڈالی ڈالی ہے
میرے ہی گھر میں خشک سالی ہے

کیوں ہر اک ہونٹ پیاسا پیاسا ہے
کس لئے ہر نظر سوالی ہے

دیکھئے کون زد میں آتا ہے
اک دیوار گرنے والی ہے

میرے رہبر نے مجھکو بھٹکا کر
کون سی دشمنی نکالی ہے

روز کچھ پیڑ سوکھ جاتے ہیں
کون اس گلستاں کا مالی ہے

کچھ نہ رسم وفا سے ناواقف
کچھ طبیعت بھی لاابالی ہے

غم بھی انسان کی ضرورت ہے
کون سا دل غموں سے خالی ہے

☆

وارث حسنی
(چھاؤنی ٹونک)

# نظم

## (قومی یک جہتی پر)

ہو یک جہت جو ملک میں ہر ایک کارواں — ہر راہ رو کو مژدۂ منزل نصیب ہو
طوفانِ روزگار کی شدت کے باوجود — ہر کشتیٔ حیات کو ساحل نصیب ہو
پندرہ اگست کا ہے یہ مقصود ملک میں — حقِ برابری سے کوئی اجنبی نہ ہو
تقسیم روشنی ہو وطن میں کچھ اس طرح — گھر میں کسی کے سایۂ تیرہ شبی نہ ہو
احساسِ خاص و عام نہ ہو دل میں جاگزیں — سب کے لئے ہو ایک طرب زارِ زندگی
اک فرد کو وطن میں ہو جو زندگی کا حق — ہر فرد ہو اسی طرح حقدارِ زندگی
گلزارِ زیست کی ہو چمن بندی اس طرح — ہر ایک گل کا اپنی جگہ اک مقام ہو
دستورِ اتحادِ گلستاں کے نام پر — تفریقِ رنگ و بو کا تصور حرام ہو
ہر شعبۂ بقا میں مساوات یوں رہے — احساسِ کمتری کا بلندی سبب نہ ہو
میخانۂ حیات میں ساقی گری ہو یوں — ہر ہاتھ میں ہو جام کوئی تشنہ لب نہ ہو
جڑ رہا ہے ہند میں اس طور سے یہ — یہ ہند اس کی جان ہو وہ جانِ ہند ہو

وارث جو اہل ہند میں باہم ہو اتحاد
کیا شانِ اہل ہند ہو کیا شانِ ہند ہو

ایم اے انصاری

# غزل

ہم تیری محبت کو سینے میں دبا لیں گے
گر آگ لگے دل میں اشکوں سے بجھا لیں گے

تو حسن کی شمع ہے ہم عشق کے پروانے
جل کر تیری محفل میں محفل کو سجا دیں گے

زخموں کی کہانی تو اشکوں کی زبانی ہے
خاموشی سے ہم اپنی محفل کو رلا دیں گے

انجام محبت کا ظاہر ہے مگر ہم تو
جب دل سے دھواں اٹھا دامن سے ہوا دیں گے

وہ ہم سے گریزاں ہیں نفرت سی صدا کی ہے
ہم عشق میں سچے ہیں احساس کرا دیں گے

## غزل

تسنیم کاظمی

اگر کہیں ستم روزگار گزرے گا
جو اہل دل ہے وہی بیقرار گزرے گا

قبائے ناز سے جھٹکا گیا تو کیا غم ہے
میرا غبار سر کوئے یار گزرے گا

کبھی تو مہرِ محبت کی روشنی ہوگی
کبھی تو دورِ شب انتظار گزرے گا

جہانِ خلوص و محبت کے گلستاں ہونگے
وہیں سے قافلۂ نوبہار گزرے گا

میں اِن سے حالِ دلِ زار کہہ تو دوں تسنیم
کسی کسی کو بہت ناگوار گزرے گا

## غزل

غریب بدایونی

حسن کی ہر ادا داستاں داستاں
عشق ہر حال میں بے زباں بے زباں

اُف یہ ناز و ادا ہے پہیلی کوئی
میرا عہدِ وفا چیستاں چیستاں

شاخ شاخ آگ آئے نظر کیوں نہ اب
شعلہ، شبنم ہوئی گلستاں گلستاں

تو زمیں پر کہیں بھی نہ آیا نظر
کیوں نہ ڈھونڈوں تجھے آسماں آسماں

میں رہوں کیوں نہ مغموم آٹھواں پہر
میری قسمت میں غم بے کراں بے کراں

کشور سلطانہ

# غزل

الم کا یاس کا حرماں کا پیش خیمہ ہے
یہ عشق تو غمِ دوراں کا پیش خیمہ ہے

گھٹی گھٹی ہے فضا اور ہوا کا نام نہیں
یہ حبس تو کسی طوفاں کا پیش خیمہ ہے

پھر آج شام سے یادوں نے سر اٹھایا ہے
پھر آج خوابِ پریشاں کا پیش خیمہ ہے

جہاں میں شان سے جیتی ہیں متحد قومیں
کہ انتشار تو نقصان کا پیش خیمہ ہے

یہ زندگی تو مجھے پل صراط لگتی ہے
ہر قدم یہاں طوفان کا پیش خیمہ ہے

تم ارتقائے تمدّن جسے سمجھتے ہو
یہی تباہی انسان کا پیش خیمہ ہے

رہِ وفا میں ہر اٹھتا ہوا قدم کشورؔ
عتابِ گردشِ دوراں کا پیش خیمہ ہے

حبیب الرحمٰن نیازی حبیب

# غزل

باندھا ہے جب سے آپ نے پیمانِ زندگی
ہم کو بھی مل گیا ہے اِک عنوانِ زندگی

دردِ فراق درد جگر خون آرزو
سب کچھ ہی مل گیا ہمیں سامانِ زندگی

پاسِ وفا، خلوص و محبت کہیں نہیں
ایسا ہوا ہے چاک گریبانِ زندگی

صیاد گھات میں ہے اِدھر آسماں خلاف
پروانِ کس طرح چڑھے ارمانِ زندگی

اک بے وفا کی یاد کے پھولوں سے اے حبیب
ہم نے سجا لیا ہے گلستانِ زندگی

محمد علی نصیر نیازی

# غزل

تیرا شباب بڑھے حسن لا زوال رہے
ہما ا کیا ہے بہت خوب ہے جو حال رہے

مرا فریبِ نظر ہو کر اس کا روز شباب
جو بے مثال تھا یا رب وہ بے مثال رہے

صلہ ملا یہ ہمیں اپنی بے سوالی کا
نگاہِ یار میں خود بن کے ایک سوال رہے

طلسم وعدۂ فردا کھلے نہ تا بہ حیات
کسی کے آنے کا ہر روز احتمال رہے

نصیر مر مٹے ہونے پہ وہم تھا کہ انھیں
اس حادثہ کا کہیں مدتوں ملال رہے

# حسنِ نظر

**نوٹ:۔**

اس عنوان کے تحت قارئین نخلستان کے خطوط یا ان کے اقتباسات ہر شمارہ میں ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں۔ لیکن قارئین کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

براہِ کرم چند اغلاط کی تصحیح فرمالیں

- گذشتہ شماروں یعنی جنوری تا مارچ اور اپریل تا جون ۱۹۸۴ء کا نمبر سہواً ۳ ، ۴ طبع ہوگیا۔ یہ ۱ اور ۲ ہونا چاہیئے تھا۔
- صفحہ ۱۰۸ پر شاہد ساگر کے بجائے شاہد ساگری ہونا چاہیئے تھا۔
- صفحہ ۱۰۴ پر "کوٹنی" غلط چھپ گیا ہے اصل لفظ "ٹونکی" ہے۔ عمالی
- صفحہ ۱۰۱ پر چھوٹی بحر میں چھوٹی سی غزل جناب منیجر... فضا عاکوری گزر

زادِ ادارت کو ادبی

ایڈ، بی ایل،

اڑیسہ

جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء

محترمی زیدی صاحب ۔ تسلیمات !

"نخلستان" جنوری تا جون ۸۴ء کا شمارہ آئینہ نگاہ ہوا۔ گوشۂ نگراں کے تحت جہاں آپنے آپ نے نثری تخلیقات کے عدم تعاون کی شکایت کی ہے وہاں آپ نے راجستھان اُردو اکیڈیمی کی مکمل چھ ماہ کی ادبی اور ثقافتی اور معلوماتی سرگرمیوں سے قارئینِ "نخلستان" کو روشناس کرایا ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ اکاڈمی کیا کر رہی ہے ۔ اور کونسا پروگرام کب ہو گیا۔ آپ کو یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ اکاڈمی کا تاہنوز دستورالعمل ہی وجود میں نہیں آیا ہے جس کی وجہ سے اراکین اُردو اکاڈمی اپنی ہر جائز و ناجائز بات کو دستورالعمل مطمئن کر دیتے ہیں۔ لیکن اکاڈمی کی سرگرمیاں اس کے برعکس ہیں۔ آپ نے راجستھان اُردو اکاڈمی کی سرگرمیوں سے جس طرح روشناس کرایا ہے وہ لائق تحسین ہیں ۔ اور آپ بھی مبارکباد کے مستحق ۔

آپ کی اطلاع کے لئے تحریر ہے کہ میرا مکمل تضمینات کا مجموعہ "عکس در عکس" فخرالدین علی احمد کمیٹی کے جزدی تعاون سے اکتوبر نومبر ۸۴ء تک منظر عام پر آ رہا ہے جس میں ہند و پاک کے چالیس ۴۰ شعراء کے کلام کو تضمین کا جامہ پہنایا ہے۔ اور جسے تقریباً تیس مشہور و معروف ناقدین ادباء اور شعراء نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ اور اپنی گرانقدر آراء سے بھی نوازا ہے غزل کی اشاعت کے لئے انتہائی مشکور ہوں۔ لیکن نام میں تھوڑا سا فرق آگیا ہے ۔ آئندہ شمارہ میں تصحیح فرمائیں۔ نوازش ہوگی ۔ نخلستان میں ترتیب اور صفحہ نمبر ۱۰۵ پر میرا نام آپنے شاہد ساگر لکھا ہے۔ جبکہ صحیح نام شاہد ساگری ہے ۔ بقیہ حالات قابل شکر ہیں۔

خیر اندیش ،۔ شاہد ساگری

گرامی قدر ، محمد علی زیدی صاحب ! خلوص و عقیدت

"نخلستان" کا مشترکہ معیاری شمارہ جنوری تا جون ۸۴ء تاخیر کے ساتھ ۔ لیکن " دیر آید درست آید" کے مصداق موصول ہوا۔ جو روایتی اسلوب اور داخلی رجحانات سے گلابی شہر کی دوشیزہ کے مترادف ہے۔

آپ توبیشک شائقینِ ادب کو قدیم وجدید ادباء وشعراء کے فنی پرتو اور شخصیت سے بخوبی روشناس کرا رہے ہیں۔ جن کی اُردو ادب میں ایک منفرد مقام ہے اور اُن کی فنی نقطۂ نظر ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ تمام غزلیں عصری حسیت کا خوبصورت امتزاج اور اسلوب لئے ہوئے ہیں۔

مجھے بیحد مسرت ہوئی اور فخر بھی کہ اُردو کے اس بدخواہوں کے دور میں بھی آپ جیسی جے پور میں کچھ عظیم شخصیتیں ہیں جو سبھی مشکلات اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اُردو کی نکھار کے لئے شب و روز منہمک و مصروف رہتی ہیں۔ "گوشہ نگماں" سے آپ کی علمیت، ادبیت، ذہنی اختراع اور شعوری جذبات کا ثبوت ملتا ہے۔ آپ اپنے وقت اور حالات کے آپ ترجمان ہیں۔ آپ کی وضعداریاں تحفظِ وقار فن کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔! عزیزؔ بدایونی کا فکر وفن قدیم وجدید ادب کا احاطہ کرتا ہے۔ پارساؔ کوثری جئے پوری کی غزلوں کے یہ اشعار دِل کو چھو گئے ؎

وہ لوگ جن کو ملے ہیں قدم قدم پہ فریب
ترے سلوکِ وفا سے بھی ڈر گئے ہوں گے

پھر یہ شعر ؎ ذکر پہ اُن کے اب ہوتی ہے کسک سی دلمیں
شیشۂ دل میں کوئی بال پڑا ہو جیسے!

مضطرؔ صدیقی بھی پسند آئے۔ ڈاکٹر سید مدبر علی زیدی صاحب کا مقالہ "نئی نظم کا فکری و فنی تجزیہ" اُن کی کاوش جانفشانی اور ادبی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ محمودؔ جمالی سنبھلی کی غزل تخیل افروز اور فکری انگیز ہے۔

پرستاران راجستھان اُردو اکیڈیمی کو اور خصوصاً کارکنانِ مجلس ادارت کو ادبی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آپکا مخلص:- جبارؔ غنی۔ بی اے، بی ایڈ، بی ایل،
اسلام نگر بیٹیل ستی راؤ رکیلا۔ اڑیسہ

سجائی صاحب۔ تسلیم و عقیدت!

"نخلستان" ملا۔ پسند آیا۔ گوشہ نگراں" نے ہمارے اندر ایک نیا احساس پیدا کر دیا سید مدبر علی زیدی کا مقالہ "نئی نظم کا فکری و فنی تجزیہ" پڑھا۔ اس میں شکیل بدایونی غریب بدایونی، حفیظ بنارسی، نیلوفر ناہید۔ موہن پریم، جاں نثار اختر، سید شان معراج نیناجوگن، سلاح الدین پرویز، حسن کمال۔ کرشن موہن، فراق گورکھپوری، حسرت موہانی سعادت نظیر۔ وغیرہ کا بھی ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ چونکہ لوگ انہیں "آل راؤنڈر" کہتے ہیں۔

مخمور جمالی سنبھلی کا تبصرہ پڑھا۔ اچھا ہے۔ جبار غنی رائچوری کی غزل ایک خوش گوار ماحول کا آئینہ دار ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے مقالے میں ایک نئی وسعت و رفعت پیدا کی ہے۔ پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے سخا کی نعت گوئی کی دل کھول کر ستائش کی ہے بے شک لکشمی نرائن سری واستو ایک اچھے نعت گو اور حضرت محمدؐ کے سچے عاشق تھے۔" ڈاکٹر محمد علی زیدی کا فراق کی غزل گوئی کا اخلاق انروز جائزہ شمع افروز کہلانے کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر روشن اختر کاظمی نے احسان بن دانشؔ کی جو سرگذشت پیش کی ہے وہ ہمارے خاصے استفادہ کی چیز ہے۔ محمد خالد عابدی نے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سے مختصر لیکن موثر انٹرویو لیا ہے۔ مولانا کوثر سندیلوی کو میں نہیں جانتا تھا۔ جناب تو سلسلۂ غالبؔ کے ایک باکمال شاعر ثابت ہوئے۔ اسلام اشرف کو دعا رتے خلوص و عقیدت!! لگتا ہے۔ لگتا ہے اسلام اشرف صاحب اسلام عشرت کے بھائی ہیں۔ ڈاکٹر رتن چند آکر کو اچھے انشائیہ کے لئے مبارکباد۔ اختر شاہجہان پوری کی نعت اور غزل دونوں قابل تعریف ہیں۔ احتشام اختر کا تجربہ نیا ہے۔ فریاد آذر کا نظریہ انوکھا ہے۔ فضاؔ کے یہاں غزل کی ایک خوشگوار فضا ہے۔ سوز بانڈی کو پڑھنے سے میر سوزؔ کا خیال آیا ہے۔ حام ٹونکی نئی فکر کرتے ہیں۔ باسا کوثری کے خیال کی پاکیزگی

سے متاثر ہوا۔ مصطفیٰ صدیقی کو کون نہیں جانتا۔ شاہد ساگر نئے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ ستار جئے پوری کا فن اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر اظہار مسرت نئی غزل میں پرانی غزل پیش کر رہے ہیں۔۔ حسن نظر کے تحت صابر صدیقی کی اردو دوستی پسند آئی۔

آپ کی خدمات کا کسے اعتراف نہیں۔ آپ وہ نمایاں کام انجام دے رہے ہیں۔ جو بڑی مشکل سے کسی سے ہو سکتے ہیں۔ آپ کے اندر محبت، وفا اور قربانی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ جزاک اللہ! آپکا۔ غریب بدایونی ۔ رائورکیلا (اڑیسہ)

مکرمی تسلیمات

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی کے وسیلے سے سہ ماہی "نخلستان" جے پور کا شمارہ جولائی ۱۹۸۳ء تا ستمبر ۱۹۸۳ء دیکھنے کو ملا۔ راجستھان سے اردو کا اتنا معیاری پرچہ بھی نکلتا ہے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ "نخلستان" کا ادبی معیار ہر اعتبار سے مثالی ہے۔ جوش ملیح آبادی کی مرثیہ نگاری پر ڈاکٹر کاظم علی خاں کا مقالہ بہت پسند آیا۔ ویسے فراق گورکھپوری پر بھی کافی اہم مواد آپ نے پیش کیا ہے۔

اداریہ میں راجستھان میں اساتذہ اردو کا سلسلہ بھی آپ نے خوب پیش کیا ہے۔ میر انیس کے سلسلہ کے بھی کئی شاعر راجستھان رہے ہیں۔ جس میں سید سراج الدین احمد سراج امروہوی (شاگرد میر انیس) ایک طویل عرصے تک بانسواڑہ (راجستھان) رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انیس کے ایک شاگرد دھولپور میں بھی ہوئے ہیں۔ انشاء اللہ کوئی تحقیقی مقالہ "نخلستان" کے لئے پھر بھیجوں گا۔ اس وقت تو صرف ایک غزل کے ساتھ شرکت چاہتا ہوں۔ امید ہے جگہ دیکر ممنون فرمائیں گے

ملتمس ادب

عظیم امروہوی ۔ دربار شاہ ولایت امروہہ (یوپی)

محترمی تسلیم۔

لائبریری ادب و نجوم (بدایوں) میں سہ ماہی نخلستان (اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۳ء کا شمارہ پہلی مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ رسالہ دیکھکر طبیعت خوش ہو گئی۔ تمام ہی تخلیقات قابل مطالعہ ہیں۔ جس کے لئے ادارہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ نیاز مند

(شاداب ذکی۔ بدایونی)

برادرم ڈاکٹر زیدی صاحب۔ آداب

"نخلستان" جنوری تا مارچ / اپریل تا جون ۱۹۸۴ء نظر سے گزرا واقعی راجستھان اردو اکیڈمی کا یہ سہ ماہی جریدہ صحرا میں نخلستان ہے۔ نثر نگاروں میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا مضمون ذکر اقبال (زیر طباعت تصنیف پشکن کے دیس میں" کا ایک غیر مطبوعہ باب) پروفیسر عتیق احمد صدیقی کا "سخا کی نعت گوئی" سید مدبر علی زیدی کا نئی نظم کا فکری و فنی تجزیہ اور ڈاکٹر رتن چند اثر کا مضمون "آنکھیں" خاص طور سے قابل تعریف ہیں۔

پروفیسر آزاد نے اپنے روس کے قیام کا حال نہایت دلچسپ پیرائے میں قلم بند کیا ہے۔ اس سے قارئین کو یہ واقفیت ہوئی کہ روسیوں میں بھی اردو زبان و ادب اور اقبال سے دلچسپی ہے۔ اور علامہ اقبال پر روسی کام بھی کر رہے ہیں۔ پروفیسر آزاد کی یہ تصنیف خدا کرے جلد منظر عام پر آئے۔

آزاد صاحب کے اس مضمون کے بعد پروفیسر عتیق احمد صدیقی کا مضمون "سخا کی نعت گوئی" ہے مگر ترتیب میں یہ عنوان اور صدیقی صاحب کا نام تحریر نہیں کیا گیا خیر! صدیقی صاحب نے بھی نارائن سرلیا ستو سخا کی نعت گوئی پر خاص معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ مضمون کا عنوان دیکھنے سے تو یہ اندازہ ہوا کہ سخا بھی دیگر مسلم شعراء

کی طرح ایک نعت گو ہونگے۔ مگر جب اس کی تہہ میں گیا تو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ جے پور راجستھان کا یہ ہندو شاعر رسول اللہ سے کس قدر محبت و عقیدت رکھتا ہے۔ پروفیسر عتیق بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نخلستان کے ذریعہ اس نازک دور میں ایک غیر مسلم نعت گو کو متعارف کرایا۔

ڈاکٹر سید مدبر علی زیدی نے نئی نظم کا فکری وفنی تجزیہ کے عنوان سے ایک نہایت پر مغز مقالہ لکھاہے۔ انہوں نے نئی نظم کے بعض شعراء پر خاص حاشیہ تراشی کی ہے۔ ان کا یہ کہنا میرے خیال سے بالکل صحیح ہے کہ تیکنیک و اسلوب میں نئے تجربات ہی کو شاعری کی اساس نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ اعلیٰ خیالات اعلیٰ جذبات اور اعلیٰ فکر کے بغیر شاعری وجود میں نہیں آتی۔ انہوں نے ن م راشد، میراں جی اور عادل منصوری کی نئی نظموں کے کچھ ٹکڑے بھی تحریر کئے ہیں۔ انہیں پڑھنے سے واقعی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی مجذوب کی بڑ سے کم نہیں۔ میں ڈاکٹر زیدی کی جرأت قلم کو داد دیتا ہوں، ہاں جہاں بات سمجھ میں آتی ہے وہاں انہوں نے نئی نظم کے شعراء اخترالایمان، وزیر آغا اور عمیق حنفی وغیرہ کو سراہا بھی ہے۔ ان کا یہ مضمون جہاں بعض جدید لکھنے والوں کے دلوں کو چوٹ پہنچاتا ہے وہاں روایتی مگر ستھرے ذوق رکھنے والے شعراء کرام کے لئے تسلی و تشفّی کا سامان ہے

یوں تو ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی ذات محتاج تعارف نہیں مگر محمد خالد صاحب عابدی نے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سے ایک انٹرویو" نخلستان میں شائع کرا کر قارئین کو ہاشمی صاحب کے بارے میں مزید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

" فراق کی غزل گوئی۔ ایک جائزہ " میں ڈاکٹر محمد علی زیدی نے مختلف اشعار کو سامنے رکھکر فراق کی فکر ان کی غزل گوئی پر تبصرہ تو کیا مگر بعض ایسے شعر چھوٹ گئے ہیں جو فراق کی غزلوں کے اہم ترین اشعار ہیں۔

" آنکھیں " کے عنوان سے ڈاکٹر رتن چند اگر نے خاصا دلچسپ اور معلوماتی مقالہ لکھا ہے

یہ مقالہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دیگر مضامین کے درمیان تنہا ہے۔ آنکھوں کی اہمیت طرح طرح سے بیان کی گئی ہے۔ اثر کے تحریر کردہ بعض واقعات (آنکھوں پر مظالم سے متعلق) رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔

منظومات کے حصہ میں اختر شاہجہاں پوری کی نعت خیر البشر اللہ اللہ پڑھ کر روح تازہ ہو جاتی ہے۔ احتشام اختر کی غزل کا یہ شعر بہت خوب ہے ؎

جو نظریں پھیر لیں اس نے تو پھر یہ سوکھ جائے گا — نہالِ دل کی شادابی نگاہِ سرمگیں تک ہے

فریاد آزر کی غزل مرصع ہے الف کے قافیہ کے ساتھ ردیف "کس سے تھا" میں بڑا لطف ہے۔

"قطع بند اشعار پر ایک غزل" اور چھوٹی بحر میں چھوٹی غزل دونوں ہی نضا صاحب کی تخلیقات ہیں وہ اپنی جگہ دونوں ہی میں کامیاب ہیں۔ مقطع انکے خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔ نضا صاحب کا پورا نام نہ فہرست میں ہے اور نہ ہی ان کی غزلوں کے اوپر لکھا گیا ہے۔

مقطع ۔ شاعری میراث تو میری نہیں — ہے فضا یہ اپنا فن اپنی جگہ

مخمور جہانی سنبھلی کی غزل کا مطلع پڑھنے سے یوں محسوس ہوا کہ بقیہ اشعار میں بھی تغزل ہوگا۔ مگر پوری غزل پڑھ جانے کے بعد مایوسی ہوئی ان کا کوئی شعر مجھے متاثر نہ کر سکا۔

سوز باندوی کی غزل کے بعض شعر بہت پسند آئے۔

تم کو میری تکلیف کا احساس کہاں ہے — ٹوٹے ہوئے کانٹوں کی چبھن کم نہیں ہوتی

اقبال نے ہر ذرہ کو اک دیوتا مانا — کچھ بھی ہو مگر خاکِ وطن کم نہیں ہوتی

اے گردشِ ایام بتا کیسے جئیں ہم — حالات کے ماتھے کی شکن کم نہیں ہوتی

مذکورہ بالا اشعار میں کہیں تغزل، کہیں جذبۂ حب الوطنی ہے تو کہیں گردش ایام سے شکایت ہے۔ بہر حال سوز صاحب اپنی بات نہایت کامیابی سے کہہ گئے۔

جام ٹونکی کی پہلی غزل میں "سوائے فصاحت کے کوئی دل کو چھو لینے والی بات نہیں" البتہ دوسری غزل درج ذیل شعر میں ایک عزم ہے۔

بہار آنے سے پہلے ایسی اک انگڑائی دیوانو! جو زنجیروں سے اُبھرے اور زندانوں کو لے ڈوبے
اور ان کے اس شعر
یہ تبلیغ شباب و جام یہ کیفِ غزل خوانی! کہیں ایسا نہ ہو لے جام ایمانوں کو لے ڈوبے
کے خیال سے ہیں متفق نہیں۔ شباب، جام، علامتیں حقیقت و تصوف کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔
پارسا کوثر جے پوری کی دو غزلیں دیکھیں دوسری غزل کے ان کے اس شعر پر پڑھتے پڑھتے انگلی رک جاتی ہے۔ شعر بہت خوب ہے۔

انھیں کبھی جو مری یاد آگئی ہوگی
نقوش ماضی کے پھر سے اُبھر گئے ہونگے

جبار غنی رانچوری اپنی غزل کے مقطع میں کہتے ہیں ۔

ایسا گمنام پڑا رہنا نہیں اچھا غنیؔ
عرصۂ شعر میں تصویر آنا بن کر آ

انھیں گمنامی کے غار سے نکل کر عرصۂ شعر میں تصویر آنا بن کر ہی آنا چاہیئے۔
مضطر صاحب صدیقی بانسواڑہ کی غزل اچھی ہے ایک تیور ہے

جنبشِ لب سے ہوتے روشن کئی ظلمت کدے
آپ کا حسنِ تبسم برقی رو کی لہر ہے

محبوب کے حسن تبسّم کو برقی رو بتلانا لہر کہنا اردو غزل میں غالباً نئی تشبیہ ہے
شاہد ساگری کی غزل میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کسی خاص شخص کا کردار بیان کر رہا ہے مگر یہ فرد واحد کی بات ہر شخص کی بات معلوم ہوتی ہے
ستار جے پوری کی غزل میں کوئی خیال نیا پن نہیں اور نہ ہی کوئی بیان کی ندرت ہے۔ ہاں یہ شعر

یہ زندگی کی کونسی منزل ہے دوستو    اب زندگی کا نام بھی دل کو بُرا لگے

دل کو چھوتا ہے۔

ڈاکٹر اظہار مسرت کے اس شعر؛

تقصیر مرے شیشۂ احساس کی بھی تھی

مجرم ترا پھینکا ہوا پتھر ہی نہیں تھا

میں ایک احساس ہے ایک جذبہ ہے۔ ان کی غزل میں ایک مصرع دو بار چھپ گیا

اختر شاہجہاں پوری کی نعت کے علاوہ غزل بھی نظر سے گزری غزل مرصع ہے۔

مصرے ڈھلے ہوئے ہیں مگر نئے خیال کا فقدان ہے۔    مخلص؛۔ عباس فرحت۔ نرنیدنگر

ریوا۔ ایم پی۔

راجستھان اُردو اکیڈمی جریدہ

سہ ماہی

# نخلستان


اکتوبر ـــــ تا ـــــ دسمبر ۱۹۸۴ء

جلد نمبر ۵ ـــــ شمارہ نمبر ~~۴~~ ۳


نگراں ـــــ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی

(چیرمین راجستھان اُردو اکیڈمی)




ناشر

راجستھان اُردو اکیڈمی

جے، ۳ سبھاش مارگ، سی اسکیم، جے پور ۳۰۲۰۰۱

سکریٹری راجستھان اردو اکیڈمی پرنٹر پبلشر نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر راجستھان اردو اکیڈمی جے پور ۳۰۲۰۰۱ سے شائع کیا

سہ ماہی

# نخلستان

| | | |
|---|---|---|
| قیمت | فی پرچہ | تین روپے |
| زرِ سالانہ | | دس روپے |

ترسیل زر اور مراسلت کا پتہ

## دفتر راجستھان اردو اکیڈیمی

ج۔۳ سبھاش مارگ، سی اسکیم، جے پور ۳۰۲۰۰۱

# ترتیب

# گوشۂ نگراں

ڈاکٹر محمد علی زیدی

نخلستان کے قارئین کرام کو میری اور راجستھان اردو اکادمی کی جانب سے سال نو کی پرخلوص مبارکباد۔

دنیا کے عظیم ترین جمہوری ملک ہندوستان کے پارلیمانی انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوچکا ہے، کانگریس آئی کو جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے اس نے نہ صرف گذشتہ سات انتخابات کے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں بلکہ سب کو حیرت زدہ کر دیا ہے، اس نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان کے خواص ہی نہیں بلکہ عوام بھی بیدار مغز ہیں اور جمہوریت اُن کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے، یہ محترم راجیو گاندھی وزیر اعظم ہندوستان کی قیادت پر بھرپور اعتماد کا اظہار ہی نہیں تھا بلکہ اس عزم صمیم کا بھی اعلان تھا کہ ہندوستان کی سالمیت، جمہوری نظام کی تقویت، مساوات، وحریت اور مرکزی حکومت کی استواریت ہمیں نام سے زیادہ عزیز ہیں۔ محترمہ اندرا گاندھی کو اس سے بہتر نذرانہ عقیدت اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس عزم میں ہمالیہ کی بلندی، گنگ وجمن کا تقدس، تاج محل کا حسن، درگاہوں کی پاکیزگی اور سمندر کی گہرائی ہے۔ اس فیصلے سے اندرونی اور بیرونی خطرات کے بادل چھٹتے نظر آرہے ہیں، ان انتخابات میں فرقہ پرستوں، تخریب کاروں، تنگ نظروں، علاحدگی پسندوں اور فتنہ پردازوں کو منھ کی کھانی پڑی۔ ہم اردو والے ہمیشہ بین الملی اتحاد، قومی یکجہتی، مساوات، حریت، وطن پرستی اور انسان دوستی کے نقیب رہے ہیں۔ ہمیں اس کامیابی سے اس وجہ سے اور بھی زیادہ خوشی ہے کہ کانگریس (آئی) ہی وہ واحد سیاسی جماعت ہے جس نے اپنے انتخابی منشور میں اُردو کے توسیع و ترقی کا وعدہ کیا ہے، میں اس منشور کا اُردو سے متعلق اقتباس ذیل میں درج کر رہا ہوں۔

۱۹۸۰ء کے انتخابات میں کانگریس (آئی) نے چند ریاستوں میں اُردو کو بطور

ثانوی زبان تسلیم کرنے کا وعدہ کیا تھا چنانچہ اُردو کو پہلے بھی ریاست بہار میں ثانوی زبان کے طور پر تسلیم کیا جاچکا ہے ایسے ہی اقدامات دوسری ریاستوں میں کئے جائیں گے۔ کانگریس (آئی) ہماری تہذیبِ مرکب سے مالامال اس عظیم زبان کو ترقی و توسیع دینے کے موقف کا اعادہ کرتی ہے "

اب جب کہ کانگریس (آئی) تین چوتھائی سے بھی زیادہ کی اکثریت سے کامیاب ہو چکی ہے، یہ پورے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کو اُس کا جائز مقام ضرور ملے گا۔ اردو کو اگر نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے تو ان گندم نما جو فروشوں سے جو ذاتی مفاد کے لئے اُردو کی دہائی دیتے ہیں۔ جنہوں نے سیاسی بازی گری کے لئے انجمنیں بنائی ہیں اور ان کو حکام رسی اور وزرا رسی کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ یہ 'انجمنے ساختہ اند' کے ذیل میں آتی ہیں، ان حرماں نصیبوں کو نہ پہلے کچھ ملا ہے نہ آئندہ کچھ ملنے کی امید ہے۔

حکومت راجستھان اردو کے لئے فراخ دلی سے کام کر رہی ہے، ان طلبہ اور طالبات سے جو ایم، اے اردو میں زیر تعلیم ہیں، ان طالبات سے جو بی، اے کے درجات میں زیر تعلیم ہیں وظیفہ دینے کے لئے درخواستیں طلب کرلی گئی ہیں اور جلد ہی مستحقین کو وظیفے ملنے لگیں گے، اُردو کے اساتذہ کی تقرری یا اردو کی تعلیم کے اجرا کے متعلق جو شکایات اکادمی کے دفتر میں موصول ہوئی تھیں ان کی جانب حکومت راجستھان کی توجہ مبذول کرائی جاتی رہی ہے اور بیشتر پر حکومت نے فوری کارروائی کر کے مجھے مطلع بھی کیا۔ میں حکومت راجستھان کا ان اقدامات کے لئے اپنی اور اُردو دوستوں کیجانب سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

جن مدرسوں میں اُردو کی تعلیم کا انتظام نہیں تھا اور میرے توجہ مبذول کرانے پر وہاں حکومت راجستھان نے اردو کے اساتذہ کا تقرر کیا یا اردو کی تعلیم کا انتظام کیا ان میں سے چند کے نام ذیل میں درج ہیں۔ یہ اُن ہی مقامات کے اداروں کے نام ہیں جہاں کی مانگیں پوری ہو جانے کی اطلاع مجھے انجمن ترقی اردو ڈیڈوانہ کے عہدہ داروں نے دی ہے۔

۱۔ بانگور ہائر سکنڈری اسکول ڈیڈوانہ
۲۔ گورنمنٹ اپر پرائمری اسکول نمبر۱ ڈیڈوانہ
۳۔ گورنمنٹ بانگور اپر پرائمری اسکول نمبر۲
۴۔ گورنمنٹ اپر پرائمری اسکول چھوٹی چھپاری

۵۔ گورنمنٹ اپر پرائمری اسکول بلیا
۶۔ گورنمنٹ پرائمری اسکول نمبر۸ ڈیڈوانہ
۷۔ گورنمنٹ پرائمری اسکول نمبر۵ ڈیڈوانہ
۸۔ گورنمنٹ پرائمری اسکول نمبر۳ ڈیڈوانہ

ان کے علاوہ بھی ایسے مقامات میں جہاں اُردو کی تعلیم کا معقول انتظام کیا جاچکا ہے لیکن اس کی اطلاع اکیڈمی کے دفتر کو نہیں دی گئی۔ عام طور سے یہی ہوتا بھی ہے، میرے لئے یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ہر جگہ کی صورت حال سے پوری طرح باخبر رہوں خصوصاً ایسی حالت میں کہ جب گذشتہ ڈیڑھ سال سے سیکریٹری کا عہدہ خالی پڑا ہو اور ساری ذمہ داریوں کا بار مجھ پر آپڑا ہو۔ گذشتہ ماہ میں پندرہ شعراء و ادباء اور چھ شعراء کی بیوگان کو اکیس ہزار روپے مالی امداد کے طور پر دئے جاچکے ہیں۔ کتابت اسکول باضابطگی سے چل رہا ہے اور آئندہ ماہ میں تقریباً پندرہ طلبہ و طالبات فارغ التحصیل ہو جائیں گے۔ ان کی اور کتابت اسکول کی موجودگی میں جے پور میں کاتبوں اور خوشنویسوں کی کوئی کمی نہیں رہے گی، مطبع کی ضرور کمی ہے متواتر کوشش کررہا ہوں کہ جے پور میں ایک اردو کا مطبع بھی قائم ہو جائے، میری یہ بھی کوشش ہے کہ راجستھان اردو اکیڈمی کی ایک وسیع عمارت ہو جس میں اکیڈمی کا دفتر ہو ایک مہمان خانہ ہو جس میں اُردو والے قیام کرسکیں، ایک وسیع ہال ہو جس میں اجتماعات ہوسکیں اور اسی عمارت میں کتابت اور اردو ٹائپ کے تربیتی مراکز بھی قائم کئے جاسکیں۔

۲۴ نومبر ۱۹۸۶ء کو راجستھان اردو اکیڈمی کے زیراہتمام حسب سابق قومی یکجہتی کُل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس کی صدارت عالیجناب احمد بخش سندھی وزیر قانون واوقاف وغیرہ نے کی۔ اور عالی جناب نول کشور شرما وزیر ریاست برائے پٹرولیم بطور مہمان خصوصی تشریف لائے، اس میں دس بارہ ہزار ادب نواز سامعین نے شرکت کی۔ اس کی تفصیل آگے کے صفحات پر درج ہے، مشاعرے کی کامیابی کا اور مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ہندی کے اخباروں میں بھی اس کی کافی پذیرائی ہوئی اور آل انڈیا ریڈیو کے جے پور اسٹیشن نے دوسرے روز اسے نشر کیا۔ اور کچھ دن بعد ٹیلی ویژن پر بھی سامعہ و باصرہ نواز ہوا۔

ساتویں پنج سالہ منصوبہ میں راجستھان اردو اکیڈمی کی مالی امداد میں کئی گنا اضافہ ہونے کی توقع ہے۔ میں نے اکیڈمی کا تقریباً پچاس لاکھ کا مجوزہ بجٹ پیش کیا ہے، اس میں کئی

نئی تجاویز اور منصوبے پیش کئے ہیں جو اردو کے فروغ و ترقی میں مدد و معاون ثابت ہوں گے تحتانی و وسطانی سطح پر اردو کی تعلیم شرط توجہ کی مستحق ہے۔ میری ابتدا سے ہی یہ کوشش رہی ہے کہ اردو کی تعلیم اگر ان دونوں سطحوں پر فروغ پذیر ہو گئی تو اعلیٰ سطح پر خود بخود ترقی کرے گی، لیکن چند اہم مسائل بھی ہیں جن پر اردو والوں کو بالخصوص جن کا تعلق تعلیم و تعلم سے ہے کو غور کر کے اُن کے حل تلاش کرنے ہیں، اردو کا نصاب تعلیم تقریباً نصف صدی سے معمولی ردو بدل کے ساتھ ایک ہی نہج پر چل رہا ہے، جب کہ دوسرے مضامین میں بے انتہا تبدیلیاں کی جا چکی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان و ادب کی تعلیم میں دور رس تبدیلیاں کرنے کا زیادہ امکان نہیں ہے لیکن عصری تقاضوں کو پورا کرنا اور وقت کی پکار پر لبیک کہنا اہلِ دانش و بینش کا فرض ہو جاتا ہے۔ رفتارِ ترقی میں سرعت اسی وقت پیدا کی جا سکتی ہے کہ جب وقت کے تقاضوں کو پورا کیا جا سکے۔ زبان کی تعلیم کس سطح تک اور کس معیار کی ہونی چاہئے؟ ادب کی تعلیم کس سطح سے شروع ہو اور کس معیار تک لے جائی جائے؟ نصاب تعلیم میں کیا اور نئی چیزیں شامل کی جائیں؟ مثلاً ڈراما نگاری، رپورتاژ، صحافت، تربیت تعلم وغیرہ وغیرہ، بد قسمتی سے اب تک تعلیم کا تمام تر زور کتب خوانی پر دیا جاتا رہا تحتانی سطح سے اعلا سطح تک تحریر و تقریر کی جانب بہت کم توجہ دی جاتی ہے، زیادہ سے زیادہ زور طلبہ و طالبات کو "کرم کتب" بنانے پر دیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عام طور سے اُن کی تخلیقی صلاحیتیں خوابیدہ رہتی ہیں اور انھیں بیدار ہونے کے مواقع یا تو ملتے ہی نہیں اور اگر ملتے ہیں تو بہت کم۔ اس سے تربیت شعور اور ذہنی پختگی کی منزل تک پہنچنے میں غیر ضروری عرصہ لگ جاتا ہے، درسی کتب کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہے، درسی کتب کی تیاری میں بھی کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔

عام طور سے معمولی اُلٹ پھیر کے ساتھ وہی کتابیں مارکیٹ میں آجاتی ہیں جو عرصے پہلے داخلِ نصاب تھیں۔ درسی کتب کی تیاری کے لئے جس تعلیمی و فنی مہارت، نفسیاتی سوجھ بوجھ، زبان پر قدرت اور تصنیفی و تالیفی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اس کی جانب اکثر و بیشتر کم ہی توجہ دی جاتی ہے اس سلسلہ میں این سی ای آر ٹی میں قابل قدر کام ہو رہا ہے، اس سلسلہ میں کچھ کامیاب تجربات بھی ہوئے ہیں اور ہو بھی رہے ہیں۔ لیکن یہ کوششیں جزوی ہیں اس لئے ان کے نتائج بھی جزوی ہی ہونگے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے پورے تعلیمی نظام پر بحیثیت مجموعی غور کیا جائے اور مکمل تعلیمی نظام مرتب کیا جائے، سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا اردو صحافت، اُردو کی تعلیم اور اردو دانی عہد حاضر کے تقاضوں کو پورا کر رہی ہے؟ اہلِ دانش اور اہل علم کو اپنے وسیع تجربات کی روشنی

میں اس پر غور کرنا ہے۔

میری کوشش تھی کہ یہ شمارہ دسمبر کے اختتام تک کتابت وطباعت کی منزلیں طے کرکے قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ جائے اسی وجہ سے ۲ دسمبر کو کاتب صاحب کو مواد دیدیا گیا تھا لیکن پورے ایک ماہ اپنے پاس رکھنے کے بعد انھوں نے صرف سولہ صفحات کی کتابت کرکے واپس کردیا مجبوراً دوسرے کاتب کا انتظام کیا گیا انھوں نے بھی سست روی سے کام لیا۔ ان نامساعد حالات میں جن میں بیشتر ناقابل اظہار ہیں اس شمارہ کے اجراء میں تاخیر ہوگئی۔ قارئین کی شکایات سر آنکھوں پر لیکن یقین کیجئے کہ میں نے اپنی انتہائی کوشش کی تھی اور اپنی ضروری مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کے زیادہ سے زیادہ وقت دیا تھا کہ وقت پر نکل جائے لیکن اب محسوس کرتا ہوں کہ تاخیر اس کا مقدر بن چکی ہے۔

میں نے گذشتہ شمارہ میں اہل قلم حضرات سے ہماری وزیراعظم اور ہمارے وطن ہی نہیں بلکہ دنیا کی عظیم قائد آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی کے سفاکانہ قتل کے متعلق اپنے اپنے تاثرات بھیجنے کی درخواست کی تھی، شعرائے کرام نے تسلی بخش طور پر لبیک کہا، لیکن میری صدا غالباً نثرنگاروں تک نہیں پہنچ سکی، اس ذیل میں جو تخلیقات موصول ہوئیں وہ شامل کردی گئی ہیں۔

بہت سے تعریفی و توصیفی خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ میں ادب نواز حضرات کا شکر گذار ہوں کہ انھیں نخلستان کا معیار وادبی خدمت پسند آئی۔ چند خطوط جن میں گذشتہ شمارہ پر اظہار رائے کیا گیا ہے حسبِ منظر میں شامل کرلئے گئے ہیں۔ اُن حضرات سے معذرت خواہ ہوں جن کے خطوط کے جوابات اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے نہیں دے سکا۔ مجھے یہ اطمینان ہے کہ نخلستان کا ادبی معیار حسین ہوگیا ہے اور راہ بھی معین ہوگئی ہے۔ اہل قلم حضرات کا جو تعاون ملتا رہا ہے وہ اسے حاصل رہے گا۔ یہی طمانیت قلب میری محنت وجاں فشانی کا صلہ ہوگا۔

صد قصہ فزوں دارم از درد دل خسرو
لیکن بہ زباں نارم از بیم لالِ تو

# راجستھان اُردو اکیڈیمی جے پور کی جانب سے قومی یکجہتی پر

# کُل ہند مشاعرہ

---

جے پور، ۲۵ر نومبر، مانک چوک ہائر سکنڈری اسکول بالمقابل ہوا محل جے پور کے وسیع و عریض صحن میں گذشتہ شب راجستھان اردو اکیڈیمی کی جانب سے کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا، وسیع شامیانہ، رنگ برنگے برقی قمقموں اور مرکری بلبوں کی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ جگہ جگہ قومی یکجہتی کو فروغ دینے والے اشعار و اقوال اردو و ہندی رسم الخط میں لکھے ہوئے آویزاں تھے اور پنڈال کی زیبائش میں اضافہ کر رہے تھے، دیکھتے دیکھتے پورا صحن تقریباً آٹھ دس ہزار باذوق سامعین سے کھچا کھچ بھر گیا۔ ادھر لمبے چوڑے ڈائس پر دور و نزدیک سے آئے ہوئے شعرائے کرام نے اپنی اپنی جگہ لی، چند لمحوں بعد ہی جناب احمد بخش سندھی صاحب وزیر قانون و اوقاف وغیرہ اور جناب نول کشور شرما وزیر ریاست برائے مال حکومت ہند اور مشاعرے کے مہمان خاص تشریف لے آئے مشاعرے کے کنوینر جناب عبدالحئی شمیم نے مائک پر شعرائے کرام کے نام پڑھ کے سُنائے، اور شرکائے بزم کا خیر مقدم کیا پھر آپ نے راجستھان اردو اکیڈیمی کے چیرمین ڈاکٹر محمد علی زیدی کو مشاعرے کے انعقاد کی غرض و غایت پر تقریر کرنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر محمد علی زیدی نے اپنی مختصر مگر جامع تقریر میں قومی یکجہتی کی اہمیت پر تقریر کی اور ملک کی سالمیت، آزادی کی بقا، قومی اتحاد اور باہمی اخوت کو قائم رکھنے کیلئے آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی کی عظیم قربانی کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ قوم کے باپو گاندھی جی کے بعد یہ دوسری سب سے بڑی قربانی ہے، ہماری عزیز ترین و عظیم ترین رہنما محترمہ اندرا گاندھی جی کی وفات سے ہندوستان کو ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ڈاکٹر زیدی نے آخر میں صدر مشاعرہ عالیجناب احمد بخش سندھی سے حاضرین بزم کو قومی یکجہتی کا حلف وفاداری دلانے کی اور جناب وسیم بریلوی سے مشاعرے کی نظامت کے فرائض انجام دینے کی استدعا کی۔ حاضرین نے عالی جناب سندھی صاحب کے فرمانے پر کھڑے ہو کر حلف لیا۔ اس کے بعد جناب وسیم بریلوی نے مشاعرہ کی کارروائی کا صدر بزم

اجازت سے آغاز کیا اور جناب شرر ایوبی کو دعوت سخن دی۔ شرر ایوبی نے اپنی کامیاب نظم پر خراج تحسین وصول کیا۔

اس مشاعرے کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ تقریباً ہر شاعر نے اپنی نظم یا غزل سنانے سے قبل قومی یکجہتی پر نظم یا قطعہ یا رباعی پڑھی اور اس طرح قطعہ، رباعی یا نظم پڑھ کے ہماری عظیم رہنما محترمہ اندرا گاندھی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مقامی شعرا میں شرر ایوبی، اظہار مسرت اعجازی، حسین جے پوری، نادان ہوش سرحدی، ممتاز شکیب، رضی الدین رضا، جے پوری،
تقی حسین پیام، راہی شہابی، پارسا کوشری اور افتخار قمر واحدی کے علاوہ پارس رومانی جودھپوری، محمد یوسف عزیز بیکانیری، عقیل شاداب کوٹوی ڈم ڈم کوٹوی، خورشید اجمیری، عبدالقوی، قوی ٹونکی، اور راشد ٹونکی نے سامعین کو اپنی نظموں اور غزلوں سے محظوظ کیا۔ راشد ٹونکی کا یہ قطعہ جو آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی کے قتل پر نئے انداز سے اظہار غم کا آئینہ دار تھا بہت پسند کیا گیا ؎

یقین کے پاسبانوں نے بھروسہ کھو دیا اپنا
حقیقت میں درندے آج انسانوں سے بہتر ہیں
حفاظت کرنے والوں نے یہ ثابت کر دیا راشدؔ
کہ دنیا بھر کے قاتل اب نگہبانوں سے بہتر ہیں

راشد ٹونکی کی غزل بھی بہت پسند کی گئی اور سامعین نے اصرار کر کے ان سے دوسری غزل سُنی اور دل کھول کے داد دی۔

بیرونی شعرا میں ہری پرشاد خنجر بریلوی، شبنم بریلوی، مسعودہ حیات، مخمور سعیدی، ہلال رامپوری وسیم بریلوی، ڈاکٹر بشیر بدر، شمیم جے پوری، اور عالم فتحپوری نے اپنے کلام سے حاضرین کے ذوق شعری کی تسکین کا سامان ہی بہم نہیں پہنچایا بلکہ داد تحسین کے شور سے گرمی محفل پیدا کر دی۔ جناب وسیم بریلوی نے جب محترمہ اندرا گاندھی کی شخصیت اور ان کے قتل کو ان الفاظ میں پیش کیا تو ہر طرف سے داد و تحسین کا شور بلند ہوا ؎

وہ ایک پھول کی پتی گلاب کی خوشبو
ہزار کانٹوں میں جو مسکراتی رہتی ہے
بکھر کے رہ گئی اس اعتبار کے ہاتھوں
جسے بنانے کو صدیوں کا فاصلہ کم ہے

وسیم صاحب نے عصری آگہی سے بھرپور غزل اپنی لحن داؤدی میں پیش کی۔ اس کا مقطع ملاحظہ کیجئے ؎

اس کو کاندھے پہ لے جا رہے ہیں وسیم
اور وہ جینے کا حق مانگتا رہ گیا

مخمور سعیدی نے اپنے مخصوص انداز میں جب فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ فسادات کی لعنت پہ یہ دو شعر پیش کئے تو پنڈال واہ واہ کے نعروں سے گونج اٹھا۔ آپ بھی ملاحظہ کیجئے ؎

لٹی کیوں دن دھاڑے گھر کی پونجی
جو اس گھر کا محافظ تھا کہاں ہے

؎ مری آنکھوں میں ایک مسمار مسجد
مرے کانوں میں ایک زخمی اذان ہے

سامعین کے اصرار پر انہوں نے اور بھی اشعار سنائے۔ جب وسیم صاحب نے ڈاکٹر بشیر بدر کو دعوت سخن دی تو حاضرین نے تالیاں بجا کے ان کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر بشیر بدر نے ان کے ذوق شعری کی تسکین کے لئے ترنم اور تحت اللفظ دونوں میں اپنی غزلیں سنائیں۔ سامعین نے دل کھول کے داد دی۔ حالات حاضرہ پر ان کا طنز ملاحظہ کیجئے ؎

یہ لوگ جیتے ہیں خوش فہمیوں کی قبروں میں
وطن پرستی کی اس سے بڑی مثال نہیں

عالم فتحپوری نے جو بزرگ نامور اور قد آور نظم گو ہیں ایک طویل اور پراثر نظم محترمہ اندرا گاندھی کی شہادت پر سنائی۔ انہوں نے آنجہانی پنڈت نہرو کے عالم ارواح میں اپنی بیٹی کے قابل فخر کارنامے پر تاثرات پیش کئے۔ نظم جامع، سادہ اور مسحور کن تھی۔

اس نظم کا آخری شعر ملاحظہ کیجئے جو حاصل نظم ہے ؎

اس نے اپنی جان دی ہے ایکتا واسطے
بند کر دو قتل و غارت اب خدا کیواسطے

شمیم جے پوری کا دل کو چھو لینے والا کلام اور ان کا مسحور کن ترنم غزل کو شراب دو آتشہ بنا دیتا ہے۔ داد و تحسین جس قدر ملے کم ہے۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

دیر و حرم کے بسنے والو، آپس میں کیوں لڑتے ہو
یارو سب کا ایک خدا ہو ایسا بھی ہو سکتا ہے

سامعین کے اصرار پر انہوں نے اپنی دوسری غزل سُنائی ۔ یہ بھی بہت کامیاب رہی ۔ انکی غزلوں میں بھرپور تغزل ملتاہے دیکھئے ؎

میں سمجھ لوں گا سب کچھ مجھے مل گیا
میرا دست طلب تھام کر چھوڑ دے

آخر میں جے پور کے کہنہ مشق شاعر اور کثیر تلامذہ کے استاد جناب قمر واحدی نے جو باوجود اپنی کبرسنی کے مشاعرے میں آخر تک موجود رہے اور اپنی غزل اپنے مخصوص ترنم میں پڑھی ۔ جب انہوں نے غزل ختم کی تو رات کے ساڑھے تین بج چکے تھے لیکن شائقین اب بھی تشنگی محسوس کر رہے تھے ، چنانچہ مشاعرے کے دوسرے دور میں وسیم بریلوی صاحب سے گیت ، نظمیں اور قطعات ان کے دلکش ترنم میں سنے اور خوب داد دی ۔ مشاعرے کے اختتام پر جناب سعید احمد خان افسر محکمہ رابطہ عامہ نے شعرا اور شرکائے بزم مشاعرہ کا راجستھان اردو اکیڈمی اور محکمہ رابطہ عامہ کی طرف سے شکریہ ادا کیا ۔ انہوں نے ٹیلیویژن اور آکاشوانی کے حضرات کا بھی شکریہ ادا کیا جو مشاعرہ ریکارڈ کرنے آئے تھے ۔

---

(م ۔ ع ۔ ز)

اردو پڑھئے ، اردو بولئے ، اردو لکھئے

ڈاکٹر محمد علی زیدی

# رہبرِ اعظم خلقِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم

حضور اکرم، سرکار دو عالم، رہبرِ اعظم، صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی خداوند عالم نے جس کا نام محمود بھی ہے محمدؐ رکھا۔ محمود کے معنی تعریف کیا گیا اور محمد کے معنی بہت تعریف کیا گیا، یہ فرق کیوں ہے؟ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بہت تعریف اللہ کے لئے ہوتی اور تعریف رسول اللہ کے لئے۔ لیکن حضرات تعریف کے درجات ہوتے ہیں، تعریف کا معیار تعریف کرنے والے کے مرتبہ کے اعتبار سے معین کیا جاتا ہے، مدح کا معیار مداح کس پایہ کا ہے اس سے مقرر کیا جاتا ہے۔ اگر حضور سرور کائنات کی مدح صرف مخلوق ہی کرتی تو آپ کا اسم گرامی محمدؐ نہ ہوتا۔ آپ کی تعریف خالق کائنات نے کی اور بہت ہی بے حد کی، جس کی مدح معبود کرے، جس کی تعریف لسانِ قدرت کرے اگر وہ محمدؐ نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ جس کے ہر عمل کو خدا اپنا عمل بتائے۔ جس کے ہر قول کو خدا اپنا قول بتائے۔ اگر وہ اپنے ہاتھ پر بیعت لے تو خدا کہے میرے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ اگر وہ کنکریاں پھینکے تو فرمائے کہ ہم نے کنکریاں پھینکیں اور قول کے لئے تو یہ کہدے کہ ہمارا رسول اپنی خواہش نفسانی سے کوئی بات ہی نہیں کرتا، جب تک ہم وحی نازل نہ کردیں۔ اگر اس عظیم ہستی کا اسم گرامی محمد نہیں ہوتا تو کیا ہوتا؟ معبود کو اپنے بندے سے اپنے حبیب سے اس قدر محبت کہ کبھی یاسین، کبھی طٰہٰ اور کبھی مزمل کہتا ہے تو کبھی سراجِ منیر، سچ تو یہ ہے کہ حضور کی ذات و صفات کا کماحقہٗ عرفان خالق کائنات کو ہی تھا۔ ہم اُس عظیم و بزرگ ترین ہستی کو کیا پہچان سکتے ہیں ہمارا علم محدود حضور کی ذات لامحدود، ہماری فہم و ادراک ناقص حضور کی ذات کامل، ہماری

پرداز تخیل کی رسائی ایک حد تک اس بزرگ ترین ہستی کی رسائی قاب قوسین تک، ہم خاکی وہ نوری، ہم خطا کار وہ معصوم، ہم ناآشنائے رازوہ راز دار الٰہی۔ ہم حقیقت و ماہیت کائنات سے بے خبر وہ باعث تخلیق کائنات، ہم بندۂ حقیر وہ حبیب باتوقیر، ہم حضور پاک کی سیرت پاک کو کیا سمجھ سکتے ہیں اور کیا بیان کر سکتے ہیں۔

ہم اپنی آسانی کے لئے حضور کی سیرت کے مختلف پہلو مقرر کر لیتے ہیں اور اُن مختلف پہلوؤں کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ حضور کی مقدس سیرت ہے جسم کے مختلف اعضاء کو جوڑنے سے جسم تو بن سکتا ہے لیکن جسم ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ اُس میں روح بھی ہوتی ہے اسی طرح حضور کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو مربوط کرنے سے حضور کی شخصیت کی مرکزی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک کہ حقیقت محمدی کو نہ سمجھا جائے۔ یہی حقیقت محمدی سیرت طیبہ کے ہر پہلو میں نظر آتی ہے۔ حضور کی سیرت پاک کی بہت سی جہتیں ہیں ان میں عمودی جہات بھی ہیں اور افقی جہات بھی۔ ہر جہت روشن و تابناک، ایک مثالی نمونہ، دیکھئے ایک ہی آیت میں خداوند عالم نے حضورؐ کی سیرت کی کتنی جہات بیان فرمائی ہیں۔

یاایھا النبی انا ارسلناک شاھدًا ومبشرًا ونذیرًا الخ

اے نبی یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ کو اُن خصوصیات کے ساتھ مبعوث کیا ہے کہ آپ شاہد ہیں۔ ایمان و عمل کے بہتر نتائج اور اُن کی برکتوں کی بشارت دینے والے انکار حق کے بُرے نتیجوں سے آگاہ اور متنبہ کرنے والے اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والے اور آپ ایک چراغ ہیں نور پھیلانے والے (روشن کرنے والے) اور اے نبی اہل ایمان کو بشارت دیدے کہ اُن کے لئے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے، اور کہنا نہ مان منکروں اور منافقوں کا اور نظر انداز کر دے ان کی ایذا رسانی کو اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ کافی کارساز ہے۔

حضور کی سیرت کے کتنے پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ آپ شاہد ہیں یہ ایمان و ایقان کا بلند ترین درجہ ہے۔ شاہد وہی ہو سکتا ہے جس کا سینہ نور ایمانی سے منور ہو چکا ہو۔ جو قاب قوسین کی منزل پر فائز ہو چکا ہو۔ آپ مبشر ہیں، بشارت دینے والے، بشارت وہی دے سکتا ہے جو اعمال و افعال کی صحت و درستی کو جانچ سکے۔

تیسری خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ متنبہ کرنے والے ہیں۔ تنبیہہ کرنے اور بشارت دینے

میں بڑا فرق ہے دونوں کے لہجہ اور عمل میں فرق ہے۔ آپ اللہ کی طرف دعوت دینے والے ہیں، یہ کردار کا عظیم ترین پہلو ہے۔ کثرت پرستوں کو خدائے واحد کی طرف بلانا، منکروں سے ذات واحد کا اقرار کرانا، اصنام کے پجاریوں کو دعوت حق دینا یہ وہی کر سکتا ہے جس کو خدا نے مامور کیا ہو تاریک سینوں کو نور ایمانی سے منور کرنا، کفر کی ظلمت کو نور حق میں تبدیل کرنا وہ مہتم بالشان کارنامہ ہے جو خدا کا آخری رسول، سردار انبیاء، شفیع روز جزا ہی کر سکتا ہے۔

چوتھی خصوصیت یہ بیان کی گئی کہ آپ روشن چراغ ہیں، روشن تو سورج اور چاند بھی ہیں، لیکن یہ صرف روشنی دے سکتے ہیں چراغ مردہ روشن نہیں کر سکتے لیکن روشن چراغ لاتعداد چراغوں کو روشن کر سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے نور ایمان کی روشنی ہی نہیں پھیلائی بلکہ صحابہ کرام کے وہ چراغ روشن کئے جو ایوان اسلام کے ستون بن گئے، جن کی سیرت رسول اکرم کی سیرت کی آئینہ دار بن گئی، ان چراغوں سے بھی چراغ روشن ہوتے چلے گئے، حضور کی سیرت کا یہ وہ پہلو ہے جس نے وہ انقلاب پیدا کیا جس کی مثال نہ دنیا آج تک پیش کر سکی ہے نہ قیامت تک پیش کر سکے گی جس نے گم کردہ راہ کو راہنما بنا دیا۔ خدا فراموش ہی نہیں بلکہ خود فراموشوں کو خدا شناس بنا دیا۔ متکبرین کو خاک نشین، خائن کو متدین، دروغ گو کو راست گو، قاتل و غارت گر کو محافظ و داد گر، بے رحم کو راحم، جاہل کو عالم اور بے ادب کو باادب بنا دیا۔ آپ نے وہ شعور پاکیزگی پیدا کیا کہ ہر ایمان لانے والے کا ضمیر پاک ہو گیا۔ دل پاک ہو گیا، خیال پاک ہو گیا، اور روح پاک ہو گئی، یہ تھا حضور اکرم کا وہ عظیم کارنامہ، وہ معجزہ جس نے سیرتوں کو بدل دیا اور عادتوں کو بدل دیا۔

حضور کا واسطہ منافقین سے پڑا اور حاسدین سے بھی، ان دشمنوں سے بھی جو تمسخر اور استہزا سے لگا کے خون بہانے تک کی فکر میں تھے، ان غداروں سے بھی جو عہد توڑ چکے تھے، ان بد باطنوں سے بھی جو دوستی کے روپ میں جڑیں کاٹنے کی فکر میں تھے شعب ابی طالب قید و ظلم سے واسطہ پڑتا ہے کبھی جنگ کی کیفیت ہے کبھی صلح کی، کبھی ہجرت کی کیفیت ہے کبھی تدبیر منزل کی، کبھی ہادی کی شان ہے کبھی شارع کی، کبھی سیاست مدنی ہے، کبھی فتح کی کیفیت ہے اور کبھی دندان مبارک شہید ہونے کی کیفیت ہے۔ چھوٹے بڑے رشتے بھی ہیں، خاندان کے مربی، خانہ داری کے امور، حقوق زن کا احترام کرنے والے شوہر، انتہائی شفیق باپ، پدرانہ شفقت کرنے والے بھائی۔ بے حد شفیق نانا، یتیموں کے سرپرست، بیواؤں کے کفیل، غرض تاریخی طور پر حضور کی حیات مبارکہ میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے جتنے گوناگوں تعلقات و کیفیات و حالات ہو سکتے ہیں وہ تمام پہلو روشن و تابناک بن کے

دنیا کے سامنے آئے کسی انسان کی زندگی میں اتنے پہلوؤں کا تصور کرنا بھی ناممکن ہے۔ ع

کار پاکاں را قیاس خود مگیر

اُم المؤمنین حضرت عائشہ نے حضور کے خلق کا روشن نقطہ بڑے بلیغ انداز میں فرمایا ہے آپ نے فرمایا ہے کہ "حضور کے خلق کا روشن نقطہ قرآن کریم ہے" گویا حضور کی سیرت پاک قرآن حکیم کی تفسیر ہے اور قرآن کریم حضور کی حیات طیبہ کا معنوی تبصرہ، آپ کی حیات طیبہ کی عمودی محور کی ایک جہت بشریت ہے اور دوسری جہت نور ہے۔ اسی طرح افقی محور کی ایک جہت جلال ہے اور دوسری جہت جمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور کی سیرت طیبہ کی تمام جہات دنیا والوں کے سامنے آگئیں، کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی اور ان سب کی تکمیل میں حقیقت محمدی جلوہ گر ہوگئی تو گویا قرآن کریم کی تفسیر مکمل ہوگئی اور یہی وہ مقام ہے جہاں خداوند عالم نے اکملت لکم دینکم کی سند عطا کی۔ اب سیرت پاک کے تمام نورانی پہلو سامنے آچکے تھے، قرآن حکیم کی تفسیر مکمل ہوچکی تھی اس لئے دین کامل ہوچکا تھا۔ خدائے برحق نے دین کی مکمل ہونے کی ہی سند نہیں دی بلکہ اس دین اسلام کو اپنی پسندیدگی کی سند بھی عطا کی۔ دین اسلام کیا ہے ؟ حضور کی مکمل سیرت طیبہ کیا ہے ؟ قرآن حکیم کی مکمل تفسیر، اسلام کی روشن اور مکمل شکل دیکھنی ہو تو سیرت پاک کے آئینہ میں دیکھئے۔ قرآن پاک کی تفسیر میں دیکھئے، اگر اللہ سے عشق کرنا ہو تو اسلام سے عشق کرو، اور اسلام سے عشق کرنا ہو تو سیرت پاک سے عشق کرو۔ اس میں اسلام کی جلالی و جمالی شان ملے گی، سنجر و سلیم کی شوکت، جنیدؒ اور بایزیدؒ اور ابوذر غفاریؓ کا فقر اُسی ذات کے جلوہ میں۔

حضور کے عظیم مشن کا مقصد روئے زمین پر خدائے عادل کی حکومت قائم کرنا اور عالم گیر انسانی اخوت کی تشکیل تھا۔ ایک ایسے دیس کی تشکیل جس میں انسان کی اعلیٰ صلاحیتیں بروئے کار آسکیں جس میں سب کو روحانی و مادی ترقی کے مساوی مواقع حاصل ہوں، جس میں نہ حسد و بغض ہو نہ باہمی کشمکش ہو، نہ رنگ و نسل کی تفریق ہو نہ جغرافیائی حد بندی ہو۔ جس میں گورے کو کالے پر فوقیت ہو نہ طاقتور کو کمزور پر برتری حاصل ہو۔ نہ کوئی دولت مند ہو نہ کوئی غریب ہو، سب برابر ہوں سب آپس میں بھائی ہوں، معیار برتری صرف تقویٰ ہو۔ اور آپ نے اس دیس کی تشکیل کی اسی کا نام اسلام ہے، اگر آپ کو بادشاہ بننا منظور ہوتا تو رؤسائے عرب کی اُس پیش کش کو نہ ٹھکراتے جس میں کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے بدلے میں حکومت و دولت پیش کرنے کی درخواست کی گئی تھی، آپ کا منشا طاقت سے غلبہ حاصل کرنے کا نہیں تھا، خدائے واحد نے آپ کو قلوب کے فتح کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ چنانچہ آپ نے اسی کلمہ

کی تبلیغ کی۔ اسی سے ہمہ گیر وعظیم ترین انقلاب آیا۔ لوگوں کے قلوب بدل گئے، جب قلب بدلے تو زاویۂ نظر بدلا، سوچنے سمجھنے کا طریقہ بدلا، انداز فکر بدلا، سود و زیاں کا محور بدلا، اعمال وافعال کے مقاصد بدلے اور زمین وآسمان بدل گئے، دنیا بدل گئی، دلیں بدل گیا، وہ دیس یعنی اسلام آج بھی قائم ہے۔ آج بھی وہ دنیا کے لوگوں کو دعوت فکر دے رہا ہے، اس دنیا کو جو تباہی کے غار کے دہانے پر کھڑی ہے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اس دنیا کو جو قتل وغارت گری میں مصروف ہے امن وآشتی کا پیغام دے رہا ہے، اس دنیا کو جس میں مادی پریشانیاں وبال جان بن گئی ہیں روحانی سکون و مادی سلامتی پیش کر رہا ہے جو لوگ جوہری تباہ کاریوں کی طاقت آزمانے میں مشغول ہیں انھیں نیکی اور ایمان کی طاقت دینے کا وعدہ کرتا ہے کیونکہ یہ عظیم ترین اور باقی رہنے والی طاقت ہے۔ ایک ایسا معاشرہ پیش کر رہا ہے جو بدیوں سے پاک ہے اور نیکیوں سے معمور ہے۔ جس میں آدمی آدمی کا دشمن نہیں بلکہ بھائی اور نگہبان ہے۔ یہی وہ پیغام تھا جس نے قیصر و کسریٰ کے تاجوں کو بوریہ نشیں کے پیروں تلے لا ڈالا، یہی وہ تلوار خارا شگاف تھی جس نے مغرور و متکبر سلاطین کی نسلوں کو قطع کر دیا۔ جس نے بلند و پست کا امتیاز مٹا دیا اور محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ؎

کی محمد سے وفا ہم نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

لیکن ملت اسلام اس پیغام سے کس قدر نزدیک ہے، ہم اس ہادیٔ برحق کی تعلیمات پر کس حد تک عمل پیرا ہیں۔ ہم نے ان سنہری اصولوں کو اپنی زندگی میں کس قدر ڈھالنے کی کوشش کی ہے، ہم نے روح اسلام کو کس قدر قبول کیا ہے دربار رسالت میں بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں سنیئے ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر — بادشاہا عذر ہائے من پذیر
گر تو می بینی حسابم ناگزیر — از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

ہم خاتم المرسلین رحمۃ اللعالمین، سردار انبیاء، شفیع روز جزا کی شفاعت کے دعویدار ہیں لیکن کیا ہم اپنے ان اعمال کے ساتھ حبیب کبریا کو منھ دکھا سکیں گے۔ اس کا محاسبہ ہر شخص خود ہی کر سکتا ہے۔

—٭— —٭—

# ظرافت، ظریف

# اور

# دیوانجی

دنیا کے ادب کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو ہر زبان میں کم وبیش ظرافت کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہندوستان میں لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، چٹکلے، چیستان، ہزل، ریختی، ضلع جگت، تمسخر ہجو وغیرہ قدیم ظرافت کی مثالیں ہیں۔ اِن سب کا مقصد صرف تفریح ہی تھا۔ اُس زمانہ کے مزاح نگاروں میں مُلّا دوپیازہ، انشاء اللہ خاں، خسرو، نعمت خاں، سودا، جرکین، جعفر زٹلی وغیرہ کے نام خاص طور پر یادگار ہیں۔ ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے وہ زندگی کے ساتھ چلتا، بڑھتا، اور سنورتا ہے۔ زندگی میں ہونے والے اتار چڑھاؤ ادب میں بھی حسب ضرورت تبدیلیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ زندگی کے انقلابوں کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی انقلاب پیدا ہونے لگا ہے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ظرافت کا رنگ بھی نئے سانچوں میں ڈھلنے لگا اور جو ظرافت ہنسی مذاق اور تفریح کا ایک ذریعہ تھی اُس سے تمسخر کے ساتھ ساتھ اصلاح کا کام بھی لیا جانے لگا اور وہ ظرافت طنز و مزاح کے روپ میں نظر آنے لگی۔ کیونکہ دیگر اصناف کے برعکس طنز و مزاح کے پردے میں اصلاح اور تعمیر کی باتیں زیادہ آسانی سے کہی اور سمجھائی جاسکتی ہیں۔ طنز و مزاح اگرچہ ساتھ ساتھ بولے جاتے ہیں مگر طنز اور مزاح میں نمایاں فرق ہے۔ اِس کا جزوِ اوّل نہایت ضروری ہے اس کے ذریعہ قوموں کی بگڑی ہوئی حالت سدھاری جاسکتی ہے، ان میں پنپنے والے غیر ضروری رواجوں کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے، دلوں میں مذہبی اُلفت پیدا کی جاسکتی ہے، عوام کو ملک و قوم پر

نثار ہونے کی ترغیب دی جاسکتی ہے، طنز میں ظاہری طور پر ہنسی مذاق کی باتیں تو ضرور ہوتی ہیں مگر غور کرنے پر اس میں ایسے تیر و نشتر نظر آتے ہیں جو ذہن انسانی کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ طنز و مزاح کے جزو آخر سے صرف شگفتگی اور تفریح طبع ہی مقصود ہے۔

اُردو میں باضابطہ طور پر طنز و مزاح کا اعلیٰ معیار غالبؔ نے قائم کیا۔ انہوں نے اپنے اشعار اور خطوط میں بے تکلفی، شگفتگی، تفریح اور ظرافت کے جو نمونے پیش کئے اُن کی مثال کسی اور زبان کے ادب میں ملنا مشکل ہے۔ غالبؔ کی اِن خصوصیات کی وجہ سے مولانا حالیؔ نے اُنہیں "حیوان ظریف" لکھا ہے۔ غالبؔ کے بعد ظرافت کو فروغ دینے کا کام "اودھ پنچ" (اجرا ۱۸۷۷ء) نے کیا۔ "اودھ پنچ" کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین (جو خود بھی مزاح نگار تھے) مقرر ہوئے۔ اس ہفتہ وار اخبار نے زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے اُس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور بلاشبہ اُس میں شائع ہونے والی تخلیقات اردو طنز و مزاح کے ارتقاء کی راہ میں سنگ میل ثابت ہوئیں۔ "اودھ پنچ" کے ذریعہ فن کاروں کو شہرت حاصل ہوئی اُن میں رتن ناتھ سرشار، مرزا مچھو بیگ، ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، اکبر الہ آبادی نواب سید محمد آزاد، منشی جوالا پرشاد برق، اور منشی علی احمد شوق کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اِن سب میں سب سے زیادہ شہرت اکبر الہ آبادی کے حصے میں آئی، اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اکبر شوخی اور زندہ دلی کی تصویر تھے اور اُن کا ذہن ایک مصلحِ قوم کا ذہن تھا۔ اسی وجہ سے اُن کی ظرافت بامقصد تھی۔

"اودھ پنچ" ۱۹۱۳ء میں بند ہوگیا مگر دو سال بعد ۱۹۱۵ء میں شیخ ممتاز حسین عثمانی کی ادارت میں دوبارہ شروع ہوا۔ اس بار شہرت پانے والوں میں جو نام سرفہرست رہا وہ ظریفؔ لکھنوی کا ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے عبدالسلام خورشید فرماتے ہیں۔

> "اِس بار لکھنے والوں میں صرف ایک شاعر کا نام یاد رکھنا چاہئے اور وہ سید مقبول حسین ظریفؔ ہیں جنہیں محاکات میں کمال حاصل ہے"۔

("سوونیر" زیرِ اہتمام زندہ دلانِ حیدرآباد۔ مئی ۱۹۶۳ء، ص ۱۰)

اِس سے پہلے کہ عنوانِ مضمون کے دوسرے لفظ پر قلم اُٹھاؤں میرا فرض ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے چند اہم مزاح نگاروں کے نام پیش کر دوں تاکہ اُن حضرات کی حق تلفی نہ ہو۔ نثر میں ظفر علی خاں، سلطان حیدر جوشؔ، فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، ملا رموزی، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، احمد جمال پاشا، تخلص بھوپالی، اور غیور حسین کے نام قابلِ ذکر

ملیا۔ اور نظم کے میدان میں جو نام روشن ہوئے اُن میں شوقؔ بہرائچی، سید محمد جعفر، دلاور فگار، ہلال رضوی، استادؔ رامپوری، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سید مقبول حسین ظریفؔ نے ۲۴ر فروری ۱۸۷۰ء مطابق ۲۲ر ذیقعد ۱۲۸۶ھ بروز جمعرات شب کے ساڑھے گیارہ بجے محلہ مولوی گنج لکھنؤ کے ایک ایسے گھر میں آنکھیں کھولیں جو ذی علم اور زندہ دل تھا۔ ان کے باپ سید فضل حسین، فاضل جید چچا مولانا سید حسین، اور سلیم المذاق بھائی سید علی نقی صفیؔ جیسے اہل علم تھے۔ ظریفؔ کی پرورش خوش مزاج اور خوش طبع باپ کی آغوش میں ہوئی، شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بچپن سے ہی شوخ مزاج، چنچل اور بیباک تھے، ظریفؔ کی تعلیم کا آغاز اسی سال ہوا جس سال سرسید نے علی گڑھ میں کالج قائم کیا اور لکھنؤ میں طنز و مزاح کے بنیادی پرچے "اودھ پنچ" کا رسم اجرا ہوا۔ وہ مبارک سال ۱۸۷۷ء تھا۔ ظریفؔ نے اردو فارسی کی درسی کتابیں مولانا صفیؔ اور مولوی سید محمد واثق لکھنوی سے پڑھیں۔ سنسکرت اور ہندی کی معمولی تعلیم پنڈت رتن لال سے لی (جو ان کے پڑوسی تھے) اس ابتدائی تعلیم کے علاوہ اُن کے شوقِ کتب بینی اور اہل علم کی صحبت نے اُن کی علمی قابلیت کو چار چاند لگا دیئے۔ ۱۸۸۵ء میں شہزادہ سلیمان قدر بہادر کی سرکار میں میر منشی مقرر ہوئے۔ اور تین سال میں شہزادے کے پرائیویٹ سکریٹری ہو گئے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۲ء تک نواب اصغر حسین کی ریاست ہند و عراق کے انتظامات میں مصروف رہے۔ اِس کے بعد ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء تک کا زمانہ ریاست عالیہ محمود آباد کی ملازمت میں گزرا۔ ظریفؔ کی شادی ۱۸۹۶ء میں لکھنؤ کے ایک باعزت گھرانے میں میر امجد کی صاحبزادی سے ہوئی۔ اولاد میں دو لڑکے (جن کا انتقال اوائل عمر میں ہو گیا) اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ ظریفؔ کی شخصیت بے شمار خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ اُن میں ایک خوبی دوستی اور دوست نوازی بھی تھی۔ انہوں نے اپنی صدارت میں "تفریح الاحباب کلب" کے نام سے ایک انجمن قائم کی جو اپنی نوعیت کی پہلی انجمن تھی۔ اس انجمن کے ممبر ظریفؔ کے دوست احباب ہی تھے۔

یہ لوگ ہفتہ میں ایک بار (اتوار کو) جمع ہو کر شعر و شاعری، لطائف اور مختلف موضوعات پر گفتگو کر کے ایک دوسرے کو محظوظ کرتے تھے۔ اس انجمن کی شرائط میں ایک اہم شرط یہ تھی کہ گفتگو میں زبان و بیان کی غلطی کرنے والے سے کچھ رقم بطور جرمانہ لی جائے۔ جس کے اکٹھا ہونے پر اُسے دعوت وغیرہ میں صرف کیا جاتا تھا۔

ظریفؔ نے ۲۰ر دسمبر ۱۹۳۷ء بروز پنجشنبہ رات کو دو بجے وفات پائی اور محلہ کھجورہ کے ایک باغ میں سپرد خاک کئے گئے۔ حضرت صفیؔ لکھنوی نے اپنے چھوٹے بھائی کی موت پر اشکبار

آنکھوں سے دلی کیفیات کا اظہار اسطرح فرمایا ؎

جو اُٹھ نہ سکتا تھا بے سہارے وہ شورِ محشر اٹھا کے اُٹھا
ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا اُرلا کے اُٹھا

ظریفؔ کے انتقال پر سینکڑوں اہل علم وادب نے اپنے تعزیتی مراسلے بھیجے، اُن میں سے کچھ حضرات نے منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا۔ صفیؔ لکھنوی نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا، جو ظریفؔ کے لوحِ مزار پر کندہ ہے ؎

رفت وقتیکہ ظریفؔ از دنیا صفیؔ آمد ز درِ خلد ندا
مرحبا سید مقبول حسین
زائر سبط رسول الثقلین

ظریفؔ کی شاعری کا آغاز ۱۸۸۰ء میں سنجیدہ شاعری سے ہوا۔ اُن کی مشق سخن میں اضافہ اُن ہفتہ وار نشستوں سے ہوا، جن کا اہتمام صفیؔ لکھنوی اپنے گھر پر کرتے تھے، مولانا صفیؔ کے مشورہ پر ہی ظریفؔ نے مزاحیہ رنگ اور ظریفؔ تخلص اختیار کیا۔ ظریفؔ کو ۱۸۸۹ء میں پہلی مرتبہ لکھنؤ کے ایک بڑے مشاعرے میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ مشاعرہ مندرجہ ذیل طرح پر منعقد ہوا تھا۔

؏ تمنا ہے کسی کی تیغ ہو اور اپنی گردن ہو

اِس طرح میں ظریفؔ نے مزاحیہ غزل کہی جس میں پرانی شاعری پر نہایت لطیف طنز کئے، غزل کا مقطع بطور نمونہ درج ہے ؎

ظریفؔ انصاف سے کہدو وہ عاشق ہے کہ چوہا ہے
زمین قصرِ جاناں میں جو یہ چاہے کہ مسکن ہو

۱۹۰۰ء میں ظریفؔ کے گھر میں آگ لگ جانے کی وجہ سے اُن کے کلام کا ایک بڑا حصہ نذرِ آتش ہو گیا تھا۔ ان کی زندگی میں ان کا مجموعہ کلام شائع نہ ہو سکا۔ ظریفؔ کے وصال کے ۱۲ سال بعد ۱۹۲۹ء میں اُن کا مجموعہ کلام بعنوان "دیوانجی" شائع ہوا۔ جس کی اشاعت کا انتظام راجہ محمد امیر احمد خاں والیٔ ریاست محمود آباد نے کیا۔ حضرت صفیؔ نے ظریفؔ کے کلام کو یکجا کر کے مفید تشریحی نوٹ تحریر فرمائے "دیوانجی" میں موجود کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اِس کے پہلے حصے میں غزلیں، دوسرے حصے میں سلام، سہرے، قطعہ تاریخ، رباعیات، مخمس، قطعات، مثنوی، اور نوحے ہیں اور آخری حصے میں متفرق موضوعات پر نظمیں ہیں۔ ممتاز حسین جونپوری نے کتاب ہذا پر بہت طویل اور جامع مقدمہ تحریر فرمایا ہے

"دیوانجی" میں وہ تعزیتی مراسلے بھی شامل ہیں جو ظریفؔ کی موت پر لوگوں نے ارسال کئے تھے، پانچسو چار صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ صفدر پریس لکھنؤ میں چھپا۔ ظریفؔ نے جن اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اُن میں سے کچھ پر مختصر تبصرہ پیش ہے۔

**غزلیں:۔** ظریفؔ کی غزلوں میں دو طرح کے اشعار خاص طور پر ملتے ہیں، ایک قسم کے اشعار تو وہ ہیں جن میں عاشق کی موہوم کمر، گل و بلبل، مبتذل خیالات، زبردستی کی قافیہ پیمائی (بڑی طویل غزل کہنے کے رواج) والی شاعری پر طنز کیا گیا ہے۔ اس طرح کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

تمہارا موئے کمر آئے گا نظر اُن کو ۔۔۔ اندھیرے میں جو پکڑتے ہیں ٹانگ مچھر کی
رات بھر کیوں چین سے سونے نہیں پاتے ظریفؔ ۔۔۔ یادِ جاناں کیا ہے کھٹمل ہے کہ مچھر دیکھئے
مختصر تعریفِ حسن و عشق ہے بس اس قدر ۔۔۔ کچھ نہیں ہے شاعروں کے جھوٹ کا طومار دیکھئے
دہن غائب کمر معدوم اسیرِ حسن کا دعویٰ ۔۔۔ حسیں گر ایسا اگر ہو تو عجائب گھر کے قابل ہے

دوسری قسم کے اشعار وہ ہیں جو محض ہنسنے ہنسانے کے لئے کہے گئے ہیں، آپ بھی لطف اُٹھائیے ؎

تم ہوا کھانے تو نکلے ہو مگر یاد رہے ۔۔۔ بھر گیا پیٹ تو کس طرح سے خالی ہوگا
یہ بزدلی پسند نہیں ہم کو اے ظریفؔ ۔۔۔ ہر قافئے کے بعد کہیں یار بار میں
وہ سمجھتے ہیں کہ گھٹوا کے بنے آئینہ رو ۔۔۔ میں سمجھتا ہوں اُنہیں لوٹ لیا نائی نے

ان دونوں طرح کے اشعار کے علاوہ ظریفؔ نے غزلوں میں معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کے لئے بھی جابجا اشعار بکھیرے ہیں۔ نمونے کے طور پر چند شعر دیکھئے ؎

حشر میں جائے گا ہر شخص قلی کی صورت ۔۔۔ سر پہ لادے ہوئے اعمال کی گٹھری ہوگا
گتھ گئے یوں ظریفؔ دو مُلّا ۔۔۔ مُرغ لڑتے ہیں جیسے پیالے میں
کبھی گاندھی نکلتے ہیں کبھی نہرو نکلتے ہیں ۔۔۔ مسلمانو! فدائے قوم اب ہندو نکلتے ہیں

**نظمیں:۔** جیسا کہ میں نے اوپر تحریر کیا تھا کہ ظریفؔ نے غزلوں میں معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کے لئے جابجا اشعار بکھیرے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی نظموں سے مکمل اصلاح کا کام کیا ہے۔ اُنہوں نے زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح مثلاً مراسمِ مذہبی کی اصلاح، شعر و شاعری کی اصلاح کے لئے نظمیں کہی ہیں۔ چند اصلاحی نظموں کو دیکھئے ؎

ظریف نے اخلاقی اصلاح پر بہت زور دیا ہے۔ انہوں نے قومی لیڈروں رہنماؤں کا اخلاق کی تصویر کشی کے لئے "شکوۂ فقیرانہ"، "البعیر" جیسی نظمیں کہی ہیں "البعیر" کے بارے میں محقق لکھنوی فرماتے ہیں کہ "خود شتر و شتر سیرت اور شتر قامت انسان میں جو مشترک خوبیاں شاعر کے خیال میں تھیں ان کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے"

اس جملہ کی دلیل میں دو شعر پیش ہیں ؎

تیری آنکھیں بحرِ عیاری کے گویا دو حباب — کان جن میں کلمۂ حق کی صدائیں ناگوار

دیکھنے میں کس قدر سیدھا ہے تو اے زردرُو — کج روی سیکھا ہے تجھ سے ابلق لیل و نہار

جس طرح اکبر الہ آبادی نے اپنے کلام سے مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے ایک مضبوط باندھ کا کام کیا اُسی طرح ظریف نے بھی اپنی نظموں سے مغرب پرستی کی اصلاح کا کام بخوبی انجام دیا۔ اُن کی نظم "مغرب پرستی" میں ہندوستانیوں پر مغربی تمدن کے جو اثرات نمایاں ہوئے اُن کی تصویر کشی ملاحظہ فرمائیے۔

مساوات اسکو کہتے ہیں نئی تہذیب کیا کہنا — کہ یکساں ہو گئی صورت زنانی اور مردانی

یہ معجونِ مرکب ہند کو کیا نفع بخشے گی — کہ ترکیب اُسکی انگریزی ہے اور اجزا ہیں یونانی

ظریف مذہب میں نمائش کے خلاف تھے حالانکہ مراسمِ عزاداری اور ماتم کے خلاف نہیں تھے لیکن نمائشی رسوم کی اصلاح چاہتے تھے۔ جس کے لئے انہوں نے "بے فکری شیعیان ہند"، "تنقیہ شیعہ ادارات" وغیرہ نظمیں لکھیں۔ "بے فکری شیعیان ہند" کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے۔

تھیٹر کی دُھنوں میں نوحہ خوانی کام ہے اپنا — عزاداری اسی کا نام ہے رقّت سے کیا مطلب

حسین ابن علی کے نام پر ہم رونے والے ہیں — ہمیں اس برگزیدہ ذات کی سیرت سے کیا مطلب

ظریف کی نظموں پر تذکرے کے ساتھ اُن کی مبسوط نظم "شعر آشوب" کا ذکر ہونا ضروری ہے، اس نظم میں مشاعروں میں فنکارانہ صلاحیتوں کی کمی، ہوس داد، اور اہل ذوق کا صحیح نقشہ اُتارا ہے، ایک شاعر کی غزل سنکر دیہاتی کے تاثرات دیکھئے ؎

اک کہڑ با سُن کے یوں کرنے لگا اظہار رائے — یہ تو ساعر تھا پھسڈی اور بڑھیا کوئی آئے

جو مجلس میں حلیف کا ٹھوک کی نکسا دکھائے — ہم سے سوکھینوں کے دل پر کچھ رعاب بنا جائے

ڈانٹ کے للکار کے ہر اک بے بھل میں پڑھے

جو مجل مو کے یہ کہہ ڈالے مکابل میں پڑھے

اگر میں یونہی ظریف کی نظموں پر اظہارِ خیال کرتا رہا تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا اور دیگر اصنافِ سخن پر کچھ روشنی نہ پڑ سکے گی۔ لیکن چند مشہور نظموں کا ذکر کئے بغیر بھی یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکتا، ایسی نظموں میں ہوم رول، شامتِ الیکشن، سیاحتِ ظریف، مثنوی بادِ ہوائی، مہاجن نوازی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

**قطعۂ تاریخ:۔** ظریف نے مختلف مواقع پر قطعۂ تاریخ بھی لکھے ہیں، مگر انہوں نے اُس وقت بھی دامنِ ظرافت ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ۱۳۲۷ھ میں پیدا ہوئے ایک بچے کی تاریخِ پیدائش کسطرح نکالی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

تاریخ لکھدو ایک الف(۱) کھونس کر ظریف

مولود بوم زادہ ہے آغا کہیں جسے

۱۳۲۶ + ۱

۱۳۲۷ھ = ۱۹۰۹ء

**قطعات:۔** انہوں نے قطعات کے ساتھ ساتھ رباعیاں بھی کہیں ہیں۔ رباعی جیسی مشکل صنف میں بھی ظریف نے ظرافت کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں۔ حکیم منے آغا فاضل نے اپنے یہاں منعقدہ ایک مجلس میں انڈے تقسیم کئے اس بات کو ظریف لے اُڑے اور مندرجہ ذیل رباعی کہہ دی ؎

دشمن نہ تیرا کبھی تجھے عجّا دے
اللہ سخاوت کا صلہ سچا دے
ہر طرح سے ہم تیرے دعاگو ہیں حکیم
انڈے بانٹے خدا تجھے بچّا دے

اوپر آپ نے ظریف کی غزلوں، نظموں، قطعات، رباعیات، وغیرہ میں طنز و مزاح کے نمونے دیکھے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ ظریف نے اہلِ بیت سے عقیدت و محبت کے اظہار کے لئے سلام بھی لکھے۔ لیکن دامنِ ظرافت کی گرفت ڈھیلی کئے بغیر۔ ایک سلام کا مطلع سماعت فرمائیے ؎

منہ پھرایا جنگ سے ہر اک جوان و پیر نے ۔۔۔ فوجِ کیں کے دانت کھٹے کر دیئے شبیرؑ نے

ظریف کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ شاعری کے پردے میں اصلاح

کا کام کر رہے تھے، شاید اسی طریقۂ شاعری سے متاثر ہو کر اکبر الہ آبادی (ف ۱۹۲۱ء) نے ظریف کے بارے میں کہا تھا کہ "ظریف اپنی قسم کے منفرد شاعر ہیں"۔ ظریف کے کلام کی یہ خوبی ہمیشہ پڑھنے اور سننے والوں کو محظوظ کرتی رہے گی۔ اور اُن کا کلام اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رہیگا۔

---

دُنیا میں ساٹھ کروڑ افراد

# اُردو زبان بولتے ہیں

اس کا اظہار اقوامِ متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم

نے

ایک جائزہ میں کیا ہے

اُس سے **اُردو زبان** کی اہمیت اور

اس کے علمی کارناموں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد عباس

# ہندوستان میں رسوم عزاداری

## اور مرثیے کا تدریجی ارتقاء

اُردو مراثی کے مطالعہ میں اس حقیقت پر نظر رکھنا چاہئے کہ ایرانی رسوم عزداری کے مطابق ہندوستان میں عزاداری کی ابتدا ہوئی۔ اس کے اوّلین نقوش دکنی پر نظر آتے ہیں۔ دکن کی بہمنی سلطنتوں میں ایرانیوں کی بڑی قدر افزائی ہوئی تھی۔ جس کی بدولت وہاں ایرانیوں کا ایک بڑا گروہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ جو عوامی زندگی کے پہلو بہ پہلو درباری زندگی پر اثرانداز ہونے لگا تھا۔ ان ہی ایرانیوں میں میر فضل اللہ انجو کی مدد سے فیروز شاہ (۱۳۹۷ - ۱۴۲۲) نے سلطنت حاصل کی تھی۔ انھیں ہی بعد میں اپنا وزیر سلطنت مقرر کیا تھا۔ پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے اعتراف کیا ہے کہ میر انجو کے زیر اثر فیروز شاہ نے شیعی عقائد قبول کر لئے تھے، موصوف لکھتے ہیں۔

> "ایران اور عراق سے شیعہ دکن میں داخل ہو رہے تھے، سلطان اگرچہ سُنّی تھا لیکن قیاس غالب ہے کہ فضل اللہ انجو فرقۂ اثنا عشری سے تعلق رکھتا ہے،" [۱]

پروفیسر عبدالمجید صدیقی لکھتے ہیں۔

> "ہر سال وہ ایران و عرب کے ساحلوں پر اپنے جہاز روانہ کرتا جو عالم مل جاتے وہ پوری خاطرداری کے ساتھ دکن لائے جاتے،" [۲]

---

[۱] ہارون خاں شیروانی؛ دا بہمنیز آف دکن ص۱۲۶ [۲] عبدالمجید صدیقی، تاریخ دکن عہد وسطیٰ بہمنی سلطنت صد۹ ۱۲

دکنی عزاداری کے محرکات کے مطالعہ میں اس بات کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ سلطنت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہونے پر ایرانی اثرات اور شیعہ عقائد بھی ان کے حصہ میں آئے جیسا کہ ڈاکٹر رشید موسوی کے اس بیان سے وضاحت ہوتی ہے۔

"۱۴۸۲ کے قریب جب بہمنی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے تو بہمنیوں کے جانشین خود مختار سلطنتوں نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی کے علاوہ بیدر میں برید شاہی اور برار میں عماد شاہی سلطنتیں قایم ہوئیں ان سلطنتوں نے بہمنیوں میں تہذیبی اور ادبی روایات کے ساتھ ساتھ شیعہ عقائد کو ترکہ میں پایا۔ بیدر کی برید شاہی حکومت ۱۶۱۹ء میں اور برار کی عماد شاہی حکومت ۱۵۸۴ء میں ختم ہو گئی لیکن احمد نگر پر شاہی خاندان کی حکومت ۱۴۹۰ سے ۱۶۳۵ تک قائم رہی۔ جہاں تک شیعہ عقائد کی اشاعت کا تعلق ہے احمد نگر کے شاہی حکمرانوں کا دربار خاص اہمیت رکھتا ہے"[1]

زیر نظر مطالعہ میں دکنی زندگی کے تمام ثقافتی و تہذیبی پہلوؤں کا بیان نہ تو ممکن ہے اور نہ مناسب اور مرثیہ کی تاریخ میں خصوصیت سے قطب شاہی حکمرانوں کا اثر رہا ہے۔ اسے دکنی تاریخ میں درخشاں دور کہا گیا ہے۔ اس دور کے بادشاہوں نے علم کی تعلیم و ترقی کے لئے جو کوششیں کی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ قطب شاہی کا دور کا ہر فرد چاہے کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتا ہو یا ہو مراسم عزاداری کی ادائیگی کے معاملے میں متحد تھا اور شانہ بشانہ حصہ لیتا تھا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے بیان کے مطابق،

"محرم کے مراسم کو محمد قلی نے اس خوبی سے رائج کیا کہ شیعوں کے علاوہ سنیوں اور ہندوؤں نے بھی ان ایام کو خاص اہمیت سے منانا شروع کیا اور خاص کر محرم کے ابتدائی دس بارہ روز تک تو ایسی مصروفیتیں رائج ہو گئیں جن میں سلطنت قطب شاہیہ کا ہر متنفس خواہ کسی مذہب و ملت سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو حصہ لیتا تھا"[2]

رسم عزاداری محرم کے ایک عوامی شکل اختیار کر لینے کی وجہ سے عوام و بادشاہ دونوں ایک ساتھ مجالس و جلوس میں شرکت کرتے تھے۔ جس کے لئے کوئی امتیاز نہیں رکھا جاتا تھا دونوں ایک ہی ساتھ

---

[1] ڈاکٹر رشید موسوی: دکن میں مراسم عزاداری اور مرثیہ نگاری ص ۵۲، ۵۳

[2] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور: مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ ص ۱۴۳

مجالس عزا کے فرش پر مرثیہ سماعت کرنے کے لئے بیٹھتے تھے ۔ جو چند لمحوں کے لئے ہی سہی بادشاہ اور رعایا کی بیچ کی خلیج کو پُر کر دیتی تھی۔ اس طرح قومی یکجہتی کا تعمیری کام رواج پاتا رہا اور عزاداری و مرثیہ خوانی میں وسعت پیدا ہوتی رہی ۔ دکنی عزاداری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں ۔

"ان مراسم کی حیثیت ایک عوامی تقریب کی سی ہوگئی تھی، جس کی تقریب تیاریاں لوگ سال بھر کرتے تھے ۔ بادشاہی عاشور خانہ کے علاوہ شاہی محل اور دوسرے امرا کے یہاں بھی عزاداری ہوتی تھی۔ جس میں کچھ لوگ بیان شہادت کرتے تھے کچھ مرثیے پڑھتے مرثیہ خوانی میں کچھ لوگ اپنے کہے ہوئے مرثیے پڑھتے اور کچھ دوسروں کے، اسطرح داد و تحسین حاصل کرنے اور شاعرانہ انداز بیان کی مہارت کے اظہار سے اپنے کو نمایاں کرنے کے لئے کچھ لوگ مرثیے کہنے لگے ۔ اس میں داد و تحسین کے علاوہ عاقبت درست کرنے کا بھی پہلو تھا۔ لے

شمالی ہندوستان میں عزاداری کی ابتدا کب ہوئی اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا لیکن اتنا یقینی ہے کہ ہمایوں کے دور سے شمالی ہند میں عزاداری شروع ہوگئی تھی کیونکہ ۱۵۵۵ء میں جب ہمایوں نے شاہ طہماسپ کی مدد سے دہلی اور آگرہ کا تخت دوبارہ حاصل کیا تو اس کے ساتھ متعدد ایرانی سردار علما اور شعرا بھی ہندوستان وارد ہوئے جو بادشاہ کے مزاج اور دربار کے حالات پر اثر انداز ہوتے تھے، شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں ۔

"جب ہمایوں سفر ایران کے بعد ہندوستان واپس آیا تو اس کے ساتھ بے شمار ایرانی سپاہی، اُمرا، اور علما تھے اور اس وقت سے ایران اور ہندوستان کے زیادہ قریبی تعلقات کا آغاز ہوا۔ جن کی وجہ سے ہندوستان کی اسلامی تہذیب میں ایرانی اثرات تورانی اور عرب اثرات بھی زیادہ نمایاں ہوگئے ۔ ٢ے

مغلیہ دربار میں ایرانیوں کا خاصا عمل دخل رہا ہے ،اکبر کے دربار میں بیرم خاں، شیخ مبارک، فیضی، ابوالفضل، جہاں گیر کے مزاج میں نور جہاں اور آصف خاں کا عمل دخل اورنگ زیب کے دور میں نعمت خاں عالی کے مشورے سے کام ہوتے تھے ۔ دورِ اورنگ زیب تک عزاداری کا عام رواج ہوچکا تھا، ڈاکٹر مسیح الزماں نے اورنگ زیب کے دور کی عزاداری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

"اورنگ زیب کی مذہبی سخت گیری مشہور ہے ۔ لیکن اس کے وقت میں ایرانیوں

---

لے ڈاکٹر مسیح الزماں : اردو مرثیے کا ارتقاء صد ۹۴ ٢ے شیخ محمد اکرام، رود کوثر صد ۳۱۲

[redacted]

کا اثر اتنا بڑھ چکا تھا۔ کہ نہ صرف اس کے بہت سے درباری امراء اپنے محلوں میں عزاداری کرتے تھے کہ بلکہ محرم کے ایسے جلوس بھی نکلتے تھے جن میں ایک خلقت شریک ہوتی تھی اور اپنے طور پر فن سپہ گری کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس مظاہرے میں کچھ ناخوش گوار صورتیں پیدا ہوئیں تو محرم کے جلوس میں تعزیوں کے سامنے تلوار چلانے کی رسم کو اورنگ زیب نے ممنوع قرار دیا۔ [1]

اورنگ زیب کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ اول بادشاہ ہوا تو اس نے عادل شاہی بادشاہوں کی طرح تمام مسجدوں میں خطبے تبدیل کرنے کا حکم دیا۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں۔

"نئی روش کی پہل اورنگ زیب کے بیٹے اور جانشین نے کی جس نے حکم دیا کہ خطبہ جمعہ میں علیؑ ولی اللہ وصی رسول اللہ کا اضافہ کیا جائے" [2]

شمالی ہند میں عزاداری کو عمومی مقبولیت اودھ میں حاصل ہوئی۔ حالانکہ قیام سلطنت اودھ کے قبل اودھ کے اطراف میں ایرانی بہت سے قصبوں میں آباد تھے۔ جن میں زید پور، بلگرام، مصطفیٰ آباد، کڑا، جونپور وغیرہ کو مرکزیت حاصل تھی۔ لیکن جب پہلی بار میر محمد امین برہان الملک سعادت خاں کے خطاب کے ساتھ اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے تو ایرانی عمل دخل زیادہ واضح طور پر سامنے آیا۔ یہ ایرانی اپنے عقائد اور رسوم کے اعتبار سے اپنی زندگی گذارتے تھے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں۔

"کلچر کسی فرقے کے دائرے میں محدود نہیں رہتی، یہ اثرات قبول کرتی اور نئی چیزوں سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ محرم کی تقریبوں میں اجتماعی ضعیف الاعتقادی، طبقاتی فرق کی دیواروں کے ہٹ جانے کی تسکین کے جو سامان موجود ہیں ان کی وجہ سے انھیں عوام و خواص میں مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے" [3]

اردو مرثیہ میں عزاداری کی تاریخ پیش کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ان علل و اسباب کی طرف متوجہ کرنا ہے جس سے مرثیہ کو ہندوستانی تہذیبی و ثقافتی اہمیت حاصل ہوئی جو ہندوستان گیر ہو گئی۔ جس کے مطالعہ سے ہندوستان کی قومی و انفرادی زندگی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مرثیہ میں ہندوستانی رسوم کا بیان، طرز گفتگو، لب و لہجہ، حفظ مراتب، باہمی احترام، وغیرہ کے گوناگوں موضوعات نے اس صنف کو بام عروج پر پہنچا دیا جو ایک لازوال اور آفاقی قدروں کی حامل بن گئی۔ ان عناصر پر ڈاکٹر جعفر رضا نے بہت بہتر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر مسیح الزماں: اردو مرثیے کا ارتقاء صد ۹۲ ۱۲ [2] شیخ محمد اکرام، رود کوثر صد ۵۹۹ ۱۲

[3] ڈاکٹر مسیح الزماں: اردو مرثیے کا ارتقاء صد ۱۳۴ ۱۲

"اُردو مراثی مذہبی بیانات کے علاوہ تہذیبی، ادبی، ثقافتی، اور اخلاقی قدروں کی ترجمانی کا بہترین ذریعہ قرار دیئے جا سکتے ہیں، ان کے موضوعات میں تدریجی ارتقا، نظر آتا ہے۔ خاص طور پر لکھنؤ میں اردو مرثیہ تخلیقی جواہرات سے لبریز ہوا۔ مرثیہ اپنے روایتی گریہ و بکا کے مضامین کے بجائے ثقافتی و تہذیبی آمیزش کا ثبوت بن گیا اور اس میں ہندوستانی، ایرانی اختلاط سے الفاظ کے پیکر میں محسوسات انسانی کا ایسا تاج محل تیار ہو گیا جس کی مثال دنیائے ادب میں نہیں ملتی۔ اُردو مرثیے کے جمالیاتی مزاج و آہنگ، نفاست و لطافت، تزئین و ترویج میں مختلف فن کاروں نے حصّہ لیا ہے۔ انھیں گروہوں اور فرقوں کے خانوں میں تقسیم کرنا گمراہ کن ہے جس سے کسی صحیح تجزیئے و تفہیم تک رسائی ممکن نہیں ہو سکتی۔" [1]

متذکرہ بالا بیانات اس نکتہ کی طرف ہمارے ذہن کو ملتفت کرتے ہیں کہ رسوم عزا داری اور مرثیے کی تخلیق کسی وقتی جذبے کے تحت یا کسی سلطنت کے زیر اثر وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ رفتہ رفتہ عوام کے جذبات و احساسات کی ہم آہنگی و یکجہتی کے اختلاط نے اسے جنم دیا ہے جس نے تدریجی ارتقاء سے گزر کر ادب میں خود سے اپنا مقام حاصل کیا ہے۔ اردو مرثیہ میں تہذیبی، ثقافتی، اخلاقی اور ادبی پہلوؤں پر تنقیدی نظر ڈالنے پر یہ صنف اور اصناف سے کہیں بلند نظر آتی ہے۔ جس میں ہندوستانی سماج کے ہر ماننے والے برابر کے شریک ہیں۔ جس کی افادیت کو عصر حاضر کے لوگ چاہے نہ سمجھ پاتے ہوں لیکن ماضی کے لوگوں نے بخوبی سمجھ لیا تھا۔ بقول پنڈت جواہر لال نہرو۔

"ایک ملک کا احساس ایک کلچر کا احساس ہمیں ایک رشتہ میں باندھے ہوئے ہے، ہندوستان مختلف مذاہب کا ملک ہے لیکن ماضی میں مذہب نے ہمیں تقسیم نہیں کیا ہے۔"

[1] ڈاکٹر جعفر رضا: دبستان عشق کی مرثیہ گوئی ص۱۲

# شمیم جے پوری سے ایک انٹرویو

از ـــــــــــ محمد خالد عابدی، آل انڈیا ریڈیو اندور

محمد خالد عابدی :۔ شمیم صاحب! آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

شمیم صاحب :۔ ۱۹۲۸ء میں ریاست جے پور میں پیدائش ہوئی، تاریخ کا علم نہیں۔

محمد خالد عابدی :۔ آپ کا اصلی اور پورا نام کیا ہے؟

شمیم صاحب :۔ مرزا فہیم الحسن۔

محمد خالد عابدی :۔ آپ کا پہلا ادبی رہنما کون ہے؟

شمیم صاحب :۔ ادیب الملک جناب مولانا یوسف علی خاں صاحب عزیز آگاہی اسدی سے شرف تلمذ رہا، لیکن میرے خواجہ تاش حضرت ناظم عزیزی نے ابتداء میں سرپرستی کی اس کے بعد حضرت جگر مرحوم اور حضرت تسکین سے میں نے شاعری اور زندگی کے بارے میں بہت کچھ حاصل کیا۔

محمد خالد عابدی :۔ شمیم صاحب! آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب اور کس طرح ہوا؟

شمیم صاحب :۔ یہ سلسلہ سولہ سال کی عمر سے جاری ہے، میرے بڑے بھائی منشی نذیر محمد آرزو مرحوم جے پور کے ممتاز اور ہونہار شعراء میں شمار کئے جاتے تھے اُن کے احباب کی نشست گھر پر ہی رہتی تھی طبیعت لڑکپن ہی سے عاشقانہ تھی، موزوں طبع بھی تھا شاعری کی طرف راغب ہوگیا۔

محمد خالد عابدی :۔ آپ کی پہلی تخلیق کس صنف میں تھی اور وہ کہاں شائع ہوئی تھی ؟

شمیم صاحب :۔ میں نے شاعری کی ابتداء رباعیات سے کی، کچھ ہی عرصے بعد غزل کی طرف مائل ہوگیا۔ میری پانچ بیاضیں کھو گئیں ایک بیاض الہ آباد میں شفیق الہ آبادی کے مکان پر دشمنی کی وجہ سے نذرِ آتش کردی۔ اب میرا مجموعہ کلام شمیم گل کے نام سے چھپنے جارہا ہے۔

محمد خالد عابدی :۔ جب آپ کی پہلی تخلیق شائع ہو کر سامنے آئی تو اُس وقت آپ کے اور آپ کے احباب، شناسا، اقارب اور مدیران وغیرہ کے کیا تأثرات تھے۔ ؟

شمیم صاحب :۔ یہ تو اوپر عرض کرچکا ہوں کہ کوئی تخلیق منظرِ عام پر نہیں آئی لیکن اتنا عرض کروں گا کہ جے پور کے احباب اور بزرگ حضرات ہی نہیں حضرت جگر مرحوم، حضرت تسکین اور حضرت جوش جیسے اکابرین مجھے محض پسند ہی نہیں کرتے تھے بلکہ میرے مستقبل کے بارے میں بھی اچھی رائے رکھتے تھے۔

محمد خالد عابدی :۔ آپ نے ابتدائی کلام پر کس استاد سے اصلاح لی ؟

شمیم صاحب :۔ اس کا جواب بھی دے چکا ہوں کہ ابتداء میں عزیز صاحب اور ان کے شاگرد رشید حضرت ناظم سے اصلاح لیتا رہا۔

محمد خالد عابدی :۔ آپ کے استاد محترم کا طریقۂ اصلاح کیا تھا ؟

شمیم صاحب :۔ محض مصرعوں پر یا لفظوں پر نشان لگا دیتے تھے کہ ان کو تبدیل کرو اور ایک دن میں تقریباً ڈھائی سو اشعار تک کہتا تھا۔ پھر مصرعہ دیکر اپنے سامنے کہلواتے تھے۔

محمد خالد عابدی :۔ شمیم صاحب آپ نے اپنا تخلص شمیمؔ کس مناسبت سے اختیار کیا ہے ؟

شمیم صاحب :۔ میرا تخلص پہلے فہیم ہی تھا مگر حضرت جگرؔ نے فرمایا کہ تم اپنا تخلص شمیم رکھو، اُس تخلص سے بڑھاپا معلوم ہوتا ہے۔

محمد خالد عابدی :۔ کیا شمیمؔ تخلص آپ کا پہلا اور آخری ہے ؟

شمیم صاحب :۔ پہلا فہیمؔ تھا اب آخری ہی شمیمؔ ہے۔

(بقیہ ص۵۳ پر)

# اقبال اور تعلیمِ جدید

محمد بدیع الزماں
ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ
ہارون نگر کالونی، پھلواری شریف
پٹنہ

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز — ہو نہ اخلاص تو دعوئ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم — ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

---

اقبال نے انگریزوں کے رائج کردہ نظامِ تعلیم کو "ایک سازش" قرار دیا ہے اور وہ بھی "دین و مروت کے خلاف"۔ ان کے یہ اشعار ان کی زندگی کے آخری دور کے ہیں جس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مکمل پچاس سال تک اس نظامِ تعلیم کے مضر اثرات سے وہ کس درجہ متاثر ہوئے ہوں گے مگر قبل اس کے کہ اس مقالے کے موضوع اور اقبال کے مندرجہ بالا اشعار پر روشنی ڈالی جائے یہ ضروری ہے کہ اس نظامِ تعلیم کی عقبی زمین اور پس منظر کو ذہن نشین کر لیا جائے اور اس نفسیات کو بھی جو اس نظام کو رائج کرنے کی محرک تھی تاکہ ہم صحیح طور پر تجزیہ کر سکیں کہ جس نظامِ تعلیم اور علومِ مغربی سے خود اقبال نے استفادہ کیا اس کے بخیے اُدھیڑنے کی ضرورت انھیں کیوں پڑی۔ اس پس منظر کے جاننے کے بعد ہی ان کے یہ اشعار گرفت میں آسکتے ہیں۔

انگریز اس ملک میں فاتح قوم تھے۔ دو متضاد تہذیبیں، ثقافتیں اور تمدن ایک دوسرے

سے اس برصغیر میں برسرِ پیکار تھے۔ انگریزوں نے صلیبی جنگ نہ تو اس وقت بھولی تھی اور نہ وہ آج بھی بھولے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اوائل دور میں مدارس کا قائم کیا جانا صرف مشینری اداروں کے ذمہ تھا۔ کمپنی کو اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مشینریوں نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو اس ملک میں اپنے کام کا جزوِ لاینفک قرار دیا اور تبدیلیٔ مذہب کے ایک ذریعہ کی حیثیت سے انھیں اسکول قائم کرنے پڑے۔ انھوں نے اس ملک میں پہلا پریس قائم کیا، پہلا اخبار نکالا اور سب ہی ہندوستانی زبانوں میں "انجیل" کا ترجمہ کیا۔ یہ اس "سازش" کی پہلی کڑی ہے۔

جب انیسویں صدی کے اوائل میں کمپنی کا اثر و رسوخ مکمل طور پر ملک کے عظیم تر حصے پر قائم ہو گیا اور مغل اور دوسری خود مختار حکومتیں برائے نام رہ گئیں تو حکومت برطانیہ نے ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کے ذریعہ تعلیم کی ذمہ داری، مشنریوں کے بجائے خود کمپنی کو قبول کرنے پر مجبور کیا۔ جس سال ہندوستان میں پہلی یونیورسٹی قائم ہوئی تب تک ہندوستان کی تعلیمی پالیسیوں پر بنیادی خیال کرنے والے اور انھیں طے کرنے والے صرف کمپنی کے حکام ہوا کرتے تھے یا مشنریوں کے پادری مقامی یا ملکی رہنماؤں سے رائے مشورہ لینا ان کے لئے کسرِ شان تھی اس لئے کہ وہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کام کر رہے تھے۔ اسی دور میں میکالے ہوا جو ہندوستانی کلچر کو مغربی کلچر سے بدل دینے پر یقین رکھتا تھا اور لوگوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتا تھا جو بقول اس کے۔ "خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں گے مگر ذوق، رائے، اخلاق اور ذہن کے اعتبار سے انگریز ہوں گے۔" اور جو لاک کے فلسفے اور ملٹن کی شاعری کے ماہر ہوں گے۔

اس "سازش" کی دوسری کڑی، میکالے کی وہ تاریخی رپورٹ ہے جو اس نے ۲ فروری ۱۸۳۵ء کو گورنر جنرل کی ایگزیکٹیو کونسل کے رکن کی حیثیت سے کونسل میں پیش کی۔ جو مشرقی علوم اور ان علوم کی پیدا کردہ تہذیب، تمدن، ثقافت غرض ساری روایات کو ہمیشہ کے لئے دفن کرنے کیلئے اس کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ اس رپورٹ سے چند اقتباسات اس "سازش" کے پس منظر کے طور پر درج ذیل ہیں:۔

وہ ہندوستان کے اس حصے کے باشندوں کی عام بولیوں میں نہ تو ادبی سرمایہ ہے نہ ہی سائنٹیفک معلومات۔ اور وہ اتنی کم مایہ اور ٹھیٹ ہیں کہ جب تک انھیں

کسی دوسرے ذریعہ سے الا ماں نہ کیا جائے ان میں سے کسی میں بھی مفید ادبی علمی کام کو منتقل کرنے کا کام آسان نہ ہوگا - اس بات سے بھی ہر طرف اتفاق نظر آتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی استطاعت رکھنے والوں کا ذہنی ارتقاء صرف اسی زبان کے ذریعے کیا جا سکتا ہے جو مقامی نہ ہو - ''

اس رپورٹ کے اب وہ حقارت آمیز الفاظ ملاحظہ فرمائیں جو علوم مشرقی کے متعلق بے جھجک کہے گئے ہیں :-

''جب اس (انگریزی) زبان کو پڑھانا ہمارے قبضۂ قدرت میں ہے تو کیا ہم ایسی زبانیں پڑھائیں جن کے بارے میں سب کی یہی رائے ہے کہ ان میں کسی مضمون پر ایسی کتاب موجود نہیں جن کا ہماری کتابوں سے مقابلہ کیا جا سکے - جب ہم یورپین سائنس پڑھا سکتے ہیں تو کیا ہم ایسی چیزیں پڑھائیں جن کے بارے میں عالمی رائے یہی ہے کہ وہ اگر یورپ سے مختلف ہیں تو محض حقیر ہونے کی بنا پر -؟ جب ہم معقول فلسفے اور حقیقی تاریخ کی سرپرستی کر سکتے ہیں تو کیا ہمیں سرکاری صرفہ پر ایسے طبی نظریات کی حمایت کرنی چاہیئے جنھیں ایک انگریز نعلبندھی ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا - یا ایسے علم نجوم کی تعلیم دیں جس پر انگریزی اسکول کے دارالاقاموں میں رہنے والی لڑکیاں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائیں - وہ تاریخ پڑھائیں جس میں تیس فٹے بادشاہوں اور تیس ہزار سالہ طویل حکومتوں کی فراوانی ہو یا وہ جغرافیہ جس میں دودھ اور شہد کی نہروں کا ذکر ہو - ''

میکالے کا خیال تھا - کہ :-

''یورپ کے کتب خانے کی ایک الماری قدر و قیمت میں عرب اور ہندوستان کے سارے دیسی ادب کے برابر ہے - ''

اس لئے اس نے اپنی رپورٹ میں یہ تجویز بھی دی کہ مشرقی علوم کے موجودہ اداروں کو فوراً بند کر دیا جائے اور اس طرح جو رقم بچے اسے انگریزی تعلیم کی ترقی پر صرف کیا جائے - اس کی ساری تجویز گورنر جنرل اِن کونسل نے ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو منظور کر لی اور یہ فیصلہ کیا کہ :-

"گورنر جنرل اِن کونسل کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن نے خاصی بڑی رقم مشرقی تخلیقات پر صرف کی ہے۔ ہز لارڈشپ (لارڈ ولیم بینٹنگ) ہدایت کرتے ہیں۔ کہ اب امداد کا کوئی حصہ اس طرح کے مصرف میں نہ لایا جائے ........ دیسی علوم کے اسکول یا کالج میں داخلہ لینے والے نئے لوگوں کو کوئی وظیفہ نہیں ملے گا ........ وہ اب سے دیسی آبادی کو انگریزی زبان کے ذریعہ انگریزی ادب اور سائنس کی تعلیم دینے پر صرف ہونا چاہیئے۔"

(از "تاریخ تعلیم ہند" - نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا۔ نئی دہلی)

سازش کی تیسری کڑی ۱۸۵۷ء میں حکومت برطانیہ کے ذریعے کمپنی کو کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں یونیورسٹیاں قائم کرنے کی ہدایت کی ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں جیسا "تاریخ تعلیم ہند" میں مذکور ہے۔ ہندوستانی زبانیں یا تو یونیورسٹی سے سرے سے نکال دی گئیں یا پھر اُن میں ان کی حیثیت انتہائی غیر اہم رکھی گئی اور ان زبانوں کے مطالعہ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ علوم مشرقی بے توجہی کا شکار ہو گئے۔ اور اس زمانے کے ہندوستانی اپنے اور مغربی تمدن کے تقابل سے کچھ ایسے مبہوت سے ہو گئے تھے اور یہ سمجھنے لگے تھے کہ ملک کے لئے برطانوی نمونوں کی نقل سے اچھی کوئی دوسری بات نہیں ہے۔

میکالے کا تیر نشانے پر لگ چکا تھا اور ۱۸۳۵ء کے بعد جتنی نسلیں جدید تعلیم سے فارغ ہو کر نکلیں وہ میکالے کے اس خواب کی تعبیر تھیں کہ وہ :-

"خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی تھے مگر ذوق، رائے، اخلاق اور ذہن کے اعتبار سے انگریز تھے۔"

اور ان پر اکبر کا یہ شعر صادق آتا تھا۔ کہ :-

لباس وانخاد و دین وغیرت ایک لقمے میں
نئی تہذیب کا یہ پیٹ ہے یارب کہ مٹکا ہے

غیرت اور حمیت کا تو یہ عالم تھا کہ جب وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ڈگریاں لے کر نکلتے تھے تو نکلتے وقت بھی ان کو کڑوے گھونٹ پلائے جاتے تھے اور ان کے منہ کا مزا خراب تک نہ ہوتا تھا۔
اس سلسلے میں جب بات "سازش" کی ہے تو گورنر جنرل لارڈ کرزن کے ان تاریخی خطبات کا

جو اس نے کلکتہ یونیورسٹی کے ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۵ء والے تقسیم اسناد کے جلسوں میں دیئے۔ ذکر نہ کرنا اس مقالے کے موضوع کے ساتھ ناانصافی ہوگی اور ہم اقبال کے شدتِ احساس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکیں گے۔

لارڈ کرزن کے خطبہ کا ایک حصہ یہ ہے:-

"مجھے امید ہے کہ میں کوئی جھوٹا یا بد دماغی کا اشارہ نہیں کر رہا ہوں جب میں یہ کہتا ہوں کہ سچائی کا اعلیٰ ترین نظریہ بڑی حد تک ایک مغربی تصور ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اخلاقی ضابطوں میں سچائی کو اعلیٰ مقام پہلے مغرب میں ملا اور مشرق میں بعد کو اسے عزت دی گئی۔ وہاں مکاری، زمانہ سازی، حیلہ و فریب کو ہمیشہ کافی کافی حیثیت رہی ہے ہم اسے اس عام طعن سے ثابت کر سکتے ہیں جو "اورینٹل ڈپلومیسی" کے الفاظ میں جھلکتا ہے جس کا مطلب ایشیائی مکاری اور کائیاں پن ہوتا ہے۔ یہی بات اورینٹل ادب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ آپ کی رزمیہ داستانوں میں اگرچہ سچ کو بڑے مبالغہ آمیز انداز میں ایک وصف کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے مگر وہاں یہ زیادہ تر مشروط رہتی ہے اور اکثر نیک نیتی کے ساتھ دئیے گئے کامیاب فریب کی مداحی کی جاتی ہے۔"

(از لارڈ کرزن اِن انڈیا۔ جلد۔ ۲۔ بحوالہ "تاریخ تعلیم ہند")

بےحسی کا یہ عالم تھا کہ بجائے اس کے کہ ان گالیوں کا کوئی جواب دیتا۔ جلسۂ اسناد میں ڈگریاں حاصل کرنے والے یہ "ہندوستانی انگریز" غالب کا یہ شعر پڑھتے ہوئے جلسے سے باہر نکلے ؂

اتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا۔۔۔

---

یہ تھا پس منظر اس تعلیم جدید کا جس میں اقبال نے آنکھیں کھولیں ؂

یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے
بجلی کے چراغوں سے منور کئے افکار

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے! مانگ کے لایا ہے فرنگی کا نفس

---

اقبال ایک مفکر تھے۔ شاعری ان کے لئے مقصدِ حیات تھی چونکہ شاعری کا کام تعمیر و تخلیق ہے۔ یہ روح کی ایک زبردست آواز ہے اور اس اعتبار سے سماجی جنگ کی روح بھی۔ اقبال نے اس منظم "سازش" کے خلاف ساری عمر اپنے کلام میں حکیمانہ انداز میں اس کا پردہ فاش کیا۔ اس سے ان کا مقصد انسانیت کا احترام اور اپنی ذات کا اظہار تھا۔ وہ تعلیم جدید کی پیدا شدہ بداخلاقی، ذہنی آوارگی اور انسانیت دشمنی کو ہندوستانیوں کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً سم قاتل سمجھتے تھے۔ وہ ایک زندہ اور بہمہ وجوہ کامل سوسائٹی کی تعمیر کرنا چاہتے تھے جس کے سب افراد انسان ہوں اور جن میں خدائے لم یزل کے صفات زیادہ سے زیادہ جلوہ گر ہوں۔

اس جدید طرزِ تعلیم نے سب سے پہلے مذہب کو اپنا نشانہ بنایا اور وہ ساری قدریں جو مذہب سے وابستگی کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتی ہیں اس تعلیم کی نذر ہوتی جا رہی تھیں۔ ظاہر ہے الحاد کی گرم بازاری صحیح فکری احساس کی کمی کا نتیجہ ہوتی ہے اور چونکہ اقبال ذہنی تربیت کے ذریعہ نوجوانوں کے سامنے امکانات کی وسیع شاہراہیں کھول رہے تھے اس لئے سب سے پہلی بات جو ان کو اس تعلیم جدید میں نظر آئی وہ الحاد تھا جو ان کے سارے منصوبوں کی جڑیں کاٹ رہا تھا۔ چنانچہ اوائل شاعری میں انھوں نے نظم "تعلیم اور اس کے نتائج" میں اس خطرے کی نشان دہی کی :-

خوش تو ہم بھی ہیں جوانوں کی ترقی سے مگر    لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
یہ سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت، تعلیم    کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

---

اقبال کی دوررس نگاہیں اس کا اندازہ لگا چکی تھیں کہ تعلیم جدید کے فرنگی نفس نے سب سے زیادہ چھاپہ ان کے دلوں پر مارا ہے اور نتیجۃً نئی نسلوں کی روحِ اسلام قبض کرنے کی کوشش کی ہے

مغل حکومت کے زوال کے بعد مسلمانوں میں بے حسی اور بے عملی ، ناامیدی و یاس ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی ان حالات میں جدید تعلیم کے فرنگی نفس کا غالب آجانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی اس لئے انھوں نے مسلمان نوجوانوں کو اس تہذیب اور اس ورثہ کی یاد دلانی شروع کی جس سے قلب و روح میں بالیدگی ، روحانی ارتقاء ، اور اخلاق کی پاکیزگی میسر آتی ہو - اپنی نظم " طلبائے علیگڑھ کے کالج کے نام ایک پیغام میں انھوں نے اس نظام اور مقام کی یاد دلائی جس کے فروغ کا منبع " جذب حرم " ہے :-

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے ، اس کا نظام اور ہے

---

دوسری نظم " خطاب بہ جوانان اسلام " میں اقبال یوں مخاطب ہیں جیسے ذہن پر کوڑے لگا لگا کر خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے جھنجھوڑ رہا ہو - کیوں کہ " طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری " نے انھیں گہری نیند سلادیا تھا -

چند اشعار یہ ہیں :-

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے ؟ وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت ، وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

---

میکالے کا یہ کہنا کہ تعلیم ایسی دی جائے کہ ہندوستانی خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں مگر ذوق ، رائے اور ذہن کے اعتبار سے انگریز " اس کی طرف اقبال نے ایک دوسری نظم " ایک نوجوان کے نام " میں اس سازش کے نتیجہ کے طور پر نوجوانوں کا جو حال ہو گیا ہے اس کا یوں خاکہ کھینچا ہے :-

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالین ایرانی — لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل — نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈھ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

---

تعلیم جدید کے زیر اثر بدلے ہوئے ماحول سے اقبالؔ بہت پریشان تھے تہذیب حاضر نے مسلمانوں کو مغرب کے سیاسی، ثقافتی، اور تمدنی استعمار کے سائے میں لے لیا تھا۔ مغربی تعلیم کے مادی تصورِ حیات کے اثر سے اس کا اپنی ذات اور اپنے مستقبل پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ سو

بدلی زمانے کی ہوا، ایسا تغیر آگیا — تھے جو گراں قیمت کبھی اب ہیں متاعِ کس مخر
وہ شعلۂ روشن ترا، ظلمت گریزاں جس سے تھی — گھٹ کر ہوا مثلِ شرر، تارے سے بھی کم نور تر
شیدائی غائب نہ رہ، دیوانۂ موجود ہو!
غالب ہے اب اقوام پر معبودِ حاضر کا اثر
(نظم "مسلمان اور تعلیم جدید")

---

اس تغیر کے ذمہ دار اقبالؔ کی نظر میں خداوندانِ مکتب تھے۔ اقبالؔ کے تختۂ مشق زیادہ تر پیرانِ حرم اور خداوندانِ مکتب ہیں۔ اس لئے کہ ایک زندہ قوم کے لئے یہ دونوں اس کے جسم میں دو آنکھیں ہوا کرتی ہیں مگر یہ آنکھیں بے نور تھیں۔ تہذیب حاضر کی تجلّی نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔

اقبالؔ نے بھی اندرونِ ملک اور یورپ میں اعلیٰ سے اعلیٰ تر انگریزی تعلیم حاصل کی تھی۔ مگر یہ کسی مکتب ہی کی کرامت تھی کہ باوجود اس تعلیم کو حاصل کرنے کے، جس کی وہ خود مذمت کر رہے تھے، ان کی نظروں کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی نہ تو خیرہ کر سکی اور نہ اُن کی خرد پر فرنگیوں کا فسوں غالب ہوا جس کی وجہ وہ خود بتاتے ہیں کہ

اہلِ دانش عام ہیں، کمیاب ہیں اہلِ نظر    کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادہ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

(نظم :- "تربیت")

اقبال کی مندرجۂ ذیل نظمیں جدید تعلیم سے پیدا شدہ جمود، تعطل، بے حسی اور لادینیت پر مزید روشنی ڈالتی ہیں :-

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے    قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا    زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا    جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا    جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش
مدرسہ نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

(نظم :- "مدرسہ")

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں    بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار    کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

(نظم :- "اساتذہ")

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی    اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر    چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ، لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام!

(نظم :- عصرِ حاضر)

لادینی افکار کی پروردہ مغربی تعلیم میں سب سے اہم آزادیٔ افکار ہے جس کے تحت افرنگ میں سوسائٹی تشکیل پاتی ہے جہاں سماج کی ساری برائیاں زندگی کی اعلیٰ قدروں میں شمار ہوتی ہیں کیونکہ آزادیٔ افکار کی وجہ سے اگر فکر و تدبر کا سلیقہ نہ ہو تو خوب و ناخوب کی تمیز ہی مٹ جاتی ہے ۔

اقبال اس کی مذمت ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی　　رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام، تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

(نظم :۔ "آزادیٔ فکر")

یہ آزادیٔ فکر اقبال کے الفاظ میں ابلیس کی ایجاد ہے ۔

گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

---

اقبال نے جدید تعلیم کی پروردہ آزادیٔ افکار کے مضر اثرات سے عورتوں کو خصوصی طور پر اس طرح متنبہ کیا ہے ۔

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت　　ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن　　کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
ہے دین سے بیگانہ اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

(نظم :۔ عورت اور تعلیم)

مجموعی طور پر اقبال نے جدید تعلیم کی اس "سازش" کے زیر اثر بھبھوکا بن کر بھڑک اٹھنے والی نئی نسل کی بے رہروی اور لادینیت کی طرف ان کو ہر پہلو سے بار بار متنبہ کیا اور مثبت راہیں بھی بنائیں ۔

یہ مدرسہ، یہ کھیل، یہ غوغائے روا رو　　اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو
وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں　　جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اقبال کے اس شعر میں ان کی شخصیت کی جلوہ گری ملتی ہے۔ وہ تعلیم جدید پر جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس سچائی کو اپنی ذات سے الگ نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کی ذات اور ان کی شخصیت اس سچائی کا یقین کرنے میں ان کی ممد و معاون ہوئی۔ کیوں کہ ان کی زندگی کے اپنے تجربے اس میں شامل تھے۔

اسی خیال کو نظم "فرشتوں کا گیت" میں وہ اس طرح واضح کرتے ہیں :۔

دانش و دین و علم و فن ، بندگیٔ ہوس تمام
عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی !

---

خداوندانِ مکتب سے وہ اسی عشقِ گرہ کشائے کے فیض کو عام کرنے کے ملتجی تھے اس لئے خداوندانِ مکتب سے ان کی شکایت بجا تھی۔ جو تعلیم جدید کا شکار ہو چکے تھے :۔

ہنر میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے — نہ کہیں لذت افکار ، نہ افکارِ عمیق

حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ محکومیِ تقلید و زوالِ تحقیق ،

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے — سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

---

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا — کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

---

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک — نہ زندگی نہ محبت ، نہ معرفت ، نہ نگاہ

---

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ

اقبال نے انگریزوں کی رائج کردہ جدید تعلیم کو "دین و مروت" کے خلاف ایک "سازش" کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ کچھ مثبت راہیں بھی بتائیں۔ علم اور دین کے باہمی تعلق پر انھوں نے اس طرح روشنی ڈالی :— ؎

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم
وہ علم، کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

( نظم " علم و دین" )

---

جدید علم کی مادیت نے سب سے کاری ضرب روحانی ارتقاء اور تزکیۂ نفس کو لگائی تھی جس نے بت پندار کو اپنا خدا بنا لیا تھا۔ اور سطرِ قرآن چلیپا ہو گئے تھے۔ بجائے خارہ شگافی کے مغرب زدگی نے انھیں فنِ شیشہ گری سکھا دیا تھا اور یہی تھی خودی کی موت :—

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم نباتات

( نظم :- " ہندی مکتب" )

---

ایک جابر حکومت کے جاری کردہ نظامِ تعلیم کے خلاف اقبال بغاوت کا علم تو بلند کر نہیں سکتے تھے مگر فرنگی نفس کے اس یلغار کے دفاع کے آلاتِ حرب ان کے پاس ضرور تھے جس میں "خودی" اہم رول ادا کرتی ہے۔ مگر پھر سوال آتا ہے کہ اس کی ترتیب و تدوین تو مکتب و مدرسہ ہی میں ہو سکتی ہے۔

مکتب اور تربیت کے تعلق پر اقبال کے خیالات بہت واضح تھے :—

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

# ڈاکٹر اقبال کی اصلاحیں
## (خود اپنے کلام پر)

از

ذکی تال گانوی

عام طور سے ہر بڑے شاعر میں یہ عادت پائی جاتی ہے کہ وہ بار بار اپنے کلام پر نظرِ ثانی کر کے حذف و اضافہ کا عمل کرتا رہتا ہے۔ نظرِ ثانی کی وجہ سے عام طور پر شاعر کا شعوری ارتقاء، نظریات و خیالات میں تبدیلی ہوتا ہے کیونکہ جیسے جیسے شاعر کے فکر و خیال میں بالیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے ماقبل کی شاعری اس کی نظر میں نظری یا نظرِ ثانی کی محتاج ہوتی جاتی ہے جن شعراء کا کلام ان کی زندگی میں شائع ہوتا ہے ان کے پہلے ایڈیشن میں ان تبدیلیوں کے واضح نشانات ملتے ہیں بلکہ بعض شعراء نے تو اپنے مجموعۂ کلام کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشنوں تک میں حذف و اضافہ اور ترمیم و تنسیخ کا عمل جاری رکھا ہے چونکہ مجموعۂ کلام کی اشاعت سے قبل اکثر کلام اخبار و رسائل میں شائع ہو چکا ہوتا ہے اس لئے جب کلام کتابی شکل میں سامنے آتا ہے تو یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ شاعر نے کہاں اور کیا تبدیلی کی ہے۔

نظرِ ثانی کی متذکرہ بالا وجہ کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ جب شاعر کا کلام کسی جریدے میں شائع ہوتا ہے اور وہ ناقدین کے اعتراضات کا نشانہ بنتا ہے تو شاعر مجموعۂ کلام شائع ہونے پر ان قابلِ اعتراض مقامات کی اصلاح کرتا ہے۔

مذکورہ حالات سے ہر شاعر کو گزرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال بھی یقیناً ان مراحل سے گزرے ہیں۔ ان کا مطبوعہ کلام جو دواوین کی شکل میں پیش نظر ہے وہ اس کلام سے مختلف ہے جو رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوا۔ زیر نظر مضمون میں ان کی دو مشہور نظموں " ترانۂ ہندی " اور " مرزا غالب " پر اسی نقطۂ نظر سے گفتگو کی گئی ہے۔ کہ ان نظموں کی اولین شکل کیا تھی اور بعد میں انھوں نے کیا شکل اختیار کی۔

## ترانۂ ہندی:۔

نظم " ترانۂ ہندی " سب سے پہلے ماہنامہ " زمانہ " کانپور (ستمبر ۱۹۰۴ء) میں " ہمارا دیش " کے عنوان سے شائع ہوئی تھی جس کو ایڈیٹر " زمانہ " منشی دیا نرائن نگم (ف۔ ۱۹۴۲ء) نے مندرجۂ ذیل نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا:۔

> " ہندوستانی زبانوں میں اور خصوصاً اردو میں حب الوطنی اور جوشِ ملکی کے متعلق ایسی نظمیں شاذ و نادر ہی لکھی گئی ہوں گی جس میں اس ملک کی خصوصیات کے بیان کے ساتھ ساتھ انسان کے اعلیٰ ترین جذبۂ حب الوطنی کا لحاظ ہو۔ انگلستان میں ایسے گیت ہر خاص و عام کی زبان زد ہوتے ہیں اور وہاں کے باشندوں کے دلوں پر ان کا خاص اثر ہوتا ہے جنگ و جدل کے وقت اور امن و چین کے زمانے میں غرض ہمیشہ ان گیتوں کی بدولت ان کے دلوں میں اپنے وطن کی محبت تازہ رہتی ہے اور اس کی عظمت و شان قائم رکھنے کا خیال جما رہتا ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے مخدوم پروفیسر اقبال کی یہ نظم جو انھوں نے ہمارے پیارے اور پرانے دیس پر لکھی ہے ملک بھر میں ہر دل عزیز اور مفید ثابت نہ ہو۔ ہمارے نزدیک یہ چھوٹوں بڑوں اور خاص و عام ہر ایک کے مقبول ہونے کی مستحق ہے۔ "

یہ نظم " بانگِ درا " میں شامل ہے۔ راقم الحروف کے پیشِ نظر " بانگِ درا " کا ایڈیشن سیزدہم اکتوبر ۱۹۴۹ء مطبوعہ لاہور ہے۔ اس نظم میں اقبال نے پانچ جگہ ترمیم کی ہے۔

نظم کے تیسرے شعر (بانگِ درا میں چھٹا شعر) کے پہلے مصرعہ " پنجاب کیا دکن کیا بنگال بمبئی کیا " کو ماہنامہ " زمانہ " میں ہی حاشیہ پر بدل کر " مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا " لکھ دیا گیا ہے جو واقعی دوسرے مصرعہ کیلئے ہی مصرعہ مناسب تھا۔ اقبال نے جو مصرعہ پہلے لگایا تھا وہ نہ صاف تھا اور نہ دوسرے مصرعہ کے ساتھ چسپاں ہوتا تھا۔

نخلستان

نادان! ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے
ارباب ہنر کے لئے لازم ہے تگ و دو

---

یہ کہنا غلط ہوگا کہ اقبال، قدامت پرست تھے، یا جمود کے قائل تھے۔ وہ بیک وقت جدید بھی تھے اور قدیم بھی۔ وہ اس معنیٰ میں ضرور قدامت پرست تھے۔ کہ وہ دین کا دامن اپنے ہاتھ سے اور کسی بھی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے ان پر مذہب کی گرفت زبردست تھی اس لئے انھوں نے اس تعلیم جدید کو "دین و مروت" کے خلاف ایک "سازش" قرار دیا۔ کیوں کہ بقول اُن کے

لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دین کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

---

اقبال علوم تازہ کی سرمستیاں حاصل کرنے کے خلاف نہیں تھے مگر وہ پہلے "مئے یقین" سے ضمیر حیات کو پرسوز کر لینے کے قائل ضرور تھے۔ وہ ہر میدان میں میر سپہ کی سپاہ میں قُلْ ھُوَ اللہ کی شمشیر بے نیام دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ماضی کی روایتوں اور حال کو مستقبل کو ملا کر وسیع تر پیمانوں پر قدروں کا ایک نظام مرتب کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ انسانی قدریں سماجی قدروں سے ہم آہنگ ہو سکیں۔
تعلیم جدید پر ان کے جو بھی خیالات تھے ان کے دل گداختہ سے نکلتے رہے جن میں ان کا انتہائی خلوص جلوہ گر ہے۔ علوم تازہ کی سرمستیاں حاصل کرنے کی ان کی شرط ملاحظہ ہو:۔

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مؤمن ۔۔۔ قدم اٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں
کھلے ہیں سب کے لئے غربیوں کے میخانے ۔۔۔ علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

اسی سرور میں پوشیدہ موت ہے تیری
ترے بدن میں اگر سوزِ لاالٰہ نہیں

---

اقبال کے مندرجۂ ذیل اشعار طالب علموں کے ذہنوں کو ہمیشہ ہی جھنجھوڑتے رہیں گے:۔
خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے ۔۔۔ کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

( نظم :- " طالب علم " )

عرضِ مدعا یہ کہ اس سلسلہ میں آقبال کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں اس کی تصدیق پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس طرح کی ہے :-

" اقبال سے پہلے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ قرآن وحدیث کی تعلیمات کو واجب العمل سمجھنا تو درکنار ان کو تحریر و تقریر میں بطور سند پیش کرنا اپنی اور دوسرے کی ذہنی توہین سمجھتا تھا۔ یہ طبقہ اسلاف و اکابر کی روایات اور مذہبی و اخلاقی قدروں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اقبال کے کلام و پیام نے ہمارے قلب و دماغ کی یکسر قلب ماہیت کردی ہے "

ماہنامہ - نگار - رامپور ، اپریل ۱۹۶۳ء

—— ※ ——

"ہمارا دیس" کا پانچواں شعر "زمانہ" میں یوں درج ہے ؎

گودی میں کھیلتی ہیں جسکے ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جس کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

"بانگ درا" میں "جسکے" کی جگہ "اُس کی" بنایا گیا ہے، اہلِ زبان اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس جگہ "اُس کی" کا ہی محل تھا۔ اقبال نے یہ ترمیم کر کے شعر کو عیب کے دلدل سے نکال لیا۔

"زمانہ" میں چھٹا شعر اس طرح درج ہے ؎

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

"بانگ درا" میں اس شعر کے پہلے مصرع میں "ہے" کی جگہ "ہیں" لکھ کر "دن" کو جمع کے صیغہ میں لایا گیا ہے۔ یوں تو پہلی صورت میں بھی کوئی معنوی عیب نظر نہیں آتا۔ پہلی بار "کارواں" ایک ہی دن گنگا کے کنارے اُترا ہوگا۔ لیکن جمع بنا کر جو بات ظاہر کی گئی ہے وہ پہلی صورت سے زیادہ دل نشیں اور واضح ہے۔

ماہنامہ "زمانہ" میں آٹھواں شعر (جو بانگِ درا میں بھی آٹھویں نمبر پر ہے) یوں شائع ہوا ہے ؎

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں سے آسماں ہے نامہرباں ہمارا

"بانگِ درا" میں دوسرا مصرع یوں ترمیم کیا گیا ہے ؏

صدیوں رہا ہے دشمن دورِ جہاں ہمارا

"زمانہ" میں درج مصرع اور مندرجہ بالا مصرع میں زمین و آسمان کا فرق ہے، آسمان کی نامہربانی میں وہ بات کہاں جو دورِ جہاں کی دشمنی سے ظاہر ہوتی ہے۔ اقبال نے یہ ترمیم کر کے شعر کو شعر بنا دیا ہے۔

اس نظم کا مقطع ماہنامہ "زمانہ" میں اس طرح چھپا تھا ؎

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا

مقطع کے دوسرے مصرع پر مولانا عبدالحلیم شرر (ف ۱۹۲۶ء) کا "دل گداز" میں اعتراض شائع ہوا تھا "ہمارا" کے بجائے شعر کے آخر میں "اپنا" کا محل ہے"۔ اسی طرح کا اعتراض مولانا حسرت موہانی (ف ۱۹۵۱ء) نے "اُردوئے معلّٰی" کی نومبر ۱۹۰۴ء کی اشاعت میں کیا تھا۔ چونکہ اعتراض مناسب تھا جسکو

اقبال نے تسلیم کرتے ہوئے مصرع میں مناسب ترمیم کر کے شرر کے اعتراض سے گلو خلاصی حاصل کر لی اور بانگ درا میں مقطع یوں شائع ہوا ؂

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

## مرزا غالب

اقبال نے "مرزا غالب" کے عنوان سے غالبؔ کا مرثیہ لکھا ہے۔ یہ مرثیہ اولاً رسالہ "مخزن" لاہور دسمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد نظرِ ثانی کے بعد "بانگ درا" میں شائع ہوا، اس نظم میں پانچ بند ہیں، پہلا بند "مخزن" میں اس طرح شائع ہوا ہے ؂

فکرِ انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہوا     ہے پرِ مرغِ تصور کی رسائی تا کجا
روح تھا تو۔ اور تھی بزمِ سخن پیکر ترا     زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اُس حسن کی منظور ہے
صورتِ روحِ رواں ہے شئے میں جو مستور ہے

"بانگ درا" میں اس بند کے پہلے مصرع میں "کو" کی جگہ "پر"، دوسرے مصرع میں "تصور" کی جگہ "تخیل"، تیسرے مصرع میں روح تھا تو" اور "تھی"، کی جگہ "تھا سراپا روح تو" اور چھٹے مصرع میں "صورتِ روحِ رواں" کی جگہ "بن کے سوزِ زندگی ہر" شائع کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے اقبال نے یہ ترمیمیں کچھ سوچ کر ہی کی ہونگی، کوئی بات کسی کو روشن نہیں ہوتی بلکہ کسی "پر" روشن ہوتی ہے اس لئے پہلے مصرع میں "کو"، کی جگہ "پر" ہی مناسب تھا۔ "تصور" اور "تخیل" کے باریک فرق کو مدنظر رکھ کر غور کیا جائے تو اس ترمیم کو نہایت موزوں ترمیم کہا جائے گا۔ اس کے علاوہ لفظ "تخیل" نے اقبالؔ کو اتنا گرویدہ بنا رکھا تھا کہ اُن کی شاعری میں اس کا استعمال "خودی"، "شاہین"، اور "سوز" کی طرح کثرت سے پایا جاتا ہے۔ تیسرے مصرع میں "تھا تو اور تھی" کی یکجائی نے تنافر کی صورت پیدا کر کے مصرع کی فصاحت کو مجروح کر دیا تھا۔ اس لئے اقبالؔ نے اسکو نکال کر "تھا سراپا روح تو" سے تبدیل کر کے واقعی شعر کو اس نقص سے بچا لیا۔ مگر مصرع کا دوسرا ٹکڑا "بزمِ سخن پیکر ترا" پھر بھی محتاجِ فعل رہ گیا، جس پر شاید وہ دھیان نہ دے سکے۔

بند کے آخری مصرع میں "صورتِ روحِ رواں ہے" کی جگہ "بن کے سوزِ زندگی ہر" لکھ کر واقعی اقبالؔ کی تبدیلی تمرد ذہنی کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ اربابِ فکر و نظر ایک

سے پوشیدہ نہیں کہ اقبالؔ کے یہاں لفظ "سوز" کو علامت کی حیثیت حاصل ہے۔ جو اُن کے کلام میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔

نظم کا دوسرا بند "مخزن" میں اس طرح شائع ہوا ہے ؎

معجزِ کلکِ تصور ہے یا دیواں ہے یہ — یا کوئی تفسیر رمزِ فطرتِ انساں ہے یہ
بارشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ — نورِ معنی سے دل افروزِ سخن داماں ہے یہ
نقش فریادی ہے تیری شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اِس بند کو پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ اقبالؔ کے رنگِ کلام سے کوسوں دور ہے، اِس بند سے پچھلے اور اگلے بندوں میں شاعر محض آپ سے مخاطب ہے لیکن اِس بند میں دیوانِ غالب کے اوصاف بیان کر رہا ہے، جس کی وجہ سے نظم کا تسلسل باقی نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ اِس بند کے پہلے دونوں شعر "آورد" کے زمرے میں آتے ہیں، اُن میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اُنہوں نے اشعار کو گورکھ دھندہ بنا دیا ہے۔ تیسرا شعر غالب کا ہی مطلع ہے جو معمولی تصرف کے ساتھ ٹاٹ میں مخمل کے پیوند کی طرح لگا دیا گیا ہے۔ انہیں تمام نقائص کے پیشِ نظر اقبالؔ نے اس بند کا بالکل سراپا تبدیل کر دیا اب یہ بند "بانگِ درا" میں ملاحظہ ہو۔

محفلِ ہستی تیرے بربط سے ہے سرمایہ دار — جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار — تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ زار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

اقبالؔ نے "مخزن" میں چھپے بند کو "بانگِ درا" میں جس خوبی اور شعریت کے ساتھ نظم کر کے تبدیل کیا ہے اُس کا لطف اہلِ ذوق ہی اٹھا سکتے ہیں، تیسرے شعر میں غالبؔ کے مطلع کی جو حسین و دل نشیں تشریح کی ہے اُس کی داد دینا ہی پڑتی ہے اس کے علاوہ اب نظم کا تسلسل بھی قائم رہا۔

"مخزن" میں اس نظم کے چوتھے بند کا پہلا شعر اس طرح درج ہے ؎

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تصوّر کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

جبکہ "بانگِ درا" میں دوسرے مصرعے میں "تصوّر" کی جگہ "تخیل" لکھا گیا ہے اِس تبدیلی کا سبب وہی ہے

جو "مرغِ تصور" کے سلسلے میں پہلے بند کے تحت تحریر کیا جا چکا ہے۔ اسی بند کا تیسرا شعر "مخزن" میں یوں شائع ہوا ہے ؎

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ جوئندۂ دل سوزیِ پروانہ ہے

"بانگِ درا" میں اس شعر میں "جوئندہ" کی جگہ "سودائی" ہے اور یہ تبدیلی شمع و پروانہ کی موجودگی میں واقعی مناسب اور موزوں ہے۔ اس لفظ نے شعر میں ایک خاص تاثیر اور حسن پیدا کر دیا ہے جبکہ لفظ "جوئندہ" شعر کے مزاج سے میل نہیں کھا رہا تھا۔

نظم کا آخری بند "مخزن" میں اسطرح شائع ہوا تھا ؎

اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر — ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
تیرے ہر ذرّے میں خوابیدہ ہیں سو شمس و قمر — یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گوہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

اِس بند کا تیسرا مصرعہ "بانگِ درا" میں یوں درج ہے ؏

ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر

یہ سچ ہے کہ فنِ شاعری میں مبالغہ کو بھی ایک اہمیت حاصل ہے لیکن اِس میں توازن کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ ہر ذرے میں سو شمس و قمر کا پایا جانا ایک غیر متوازن مبالغہ تھا جس کو اقبالؔ نے خود محسوس کر کے مصرع میں ترمیم کی ہے اور اب یہ مبالغہ متوازن بھی ہے اور پُرتاثیر بھی۔

"بانگِ درا" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے اپنے کلام میں بہت کافی ترمیم کی ہے جس کی اصل وجہ شاعر کا ذہنی ارتقاء ہے، ہر شاعر ارتقاء کی مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا جب پختہ کاری کی منزل میں پہنچتا ہے تو وہ اپنے ابتدائی کلام پر نظرِ ثانی کرتا ہے کیونکہ اُسے اپنے ابتدائی کلام میں خیال، زبان و بیان کی بہت سی نمایاں خامیاں نظر آتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کو اپنے کلام میں تبدیلی و تحریف کرنی پڑی۔

# بقیہ :- شمیم جے پوری سے انٹرویو

محمد خالد عابدی :- کیا آپ اپنے استاذ محترم کے طریقۂ اصلاح سے مطمئن تھے ؟

شمیم صاحب :- جی ہاں ابتداءً میں ان کی سختی کھلتی تھی لیکن بعد میں اس سے مطمئن ہی نہیں پسند کرنے لگا۔

محمد خالد عابدی :- آپ کے حلقۂ تلامذہ میں کن شعراء کی شمولیت ہے ؟

شمیم صاحب : میں اکثر شعراء کو مشورہ دیتا رہا مگر اس کا اظہار نہ پسند کیا نہ مناسب سمجھا، دوستانہ مشورہ دیتا ہوں استاد کہلا کر اپنی ترقی کی راہیں مسدود نہیں کرنا چاہتا۔

محمد خالد عابدی :- آپ ذہنی آسودگی کے لئے شعر کہتے ہیں یا بطور شوق ؟

شمیم صاحب :- میں شعر مجبور ہو کر کہتا ہوں خواہ مخواہ شعر کی تکمیل نہیں کرتا، ظاہر ہے کہ ذہنی آسودگی کیلئے کہتا ہوں۔

محمد خالد عابدی :- بالعموم آپ کو شعر کہنے وقت کس طرح کا ماحول درکار ہوتا ہے ؟

شمیم صاحب :- جب شاعری کا دورہ پڑتا ہے تو ماحول سے بے نیاز ہو جاتا ہوں اس وقت ہر ماحول میں شعر ہو جاتے ہیں، میں شعر کہتے وقت کبھی گنگناتا بھی نہیں خاموش رہتا ہوں، جب شعر ہو جاتا ہے تو لکھ لیتا ہوں۔

محمد خالد عابدی :- کیا آپ اپنی کسی تخلیق کی شانِ نزول کے بارے میں بتانا پسند فرمائیں گے ؟

شمیم صاحب :- ۱۹۴۷ء کے بعد کچھ غزلیں ملکی بحران کی بنا پر ہوئیں باقی تمام شاعری عشقیہ ہے اس لئے ہر شعر کی کچھ نہ کچھ شانِ نزول ہوتی ہے اور اس کے بارے میں کیا بتاؤں کہ کس وقت کس ادا پر شعر کہا۔

محمد خالد عابدی :- خود آپ کی نگاہ میں آپ کی شاعری کے انفرادی عناصر کیا ہیں ؟

شمیم صاحب :- محبت، میری شاعری کا موضوع ہے اس کے اظہار میں وہ روایتی تہذیب و شائستگی جو بزرگوں سے ورثے میں ملی ہے اپنی شاعری کا جزو لاینفک سمجھتا ہوں، تقلیدی جذبہ نہیں رکھتا فطری جذبات کی ترجمانی کی کوشش کرتا ہوں، میری شاعری اور کردار میں کوئی بعد نہیں۔

محمد خالد عابدی :۔ کیا آپ اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ فلسفہ معمر کرتا ہے اور شاعری نوجوانی اور توانائی بخشتی ہے !

شمیم صاحب :۔ جی ہاں قطعی متفق ہوں ۔

محمد خالد عابدی :۔ ایک ماہر نفسیات اور ایک ذہین شاعر کے مشاہدات و احساسات میں کیا بنیادی فرق ہوتا ہے ؟

شمیم صاحب :۔ میں آپ کے اس سوال کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکا میرا خیال ہے کہ ذہین شاعر ہی ماہر نفسیات بھی ہوگا ورنہ غیر ذہین شاعر نفسیات کو کیا سمجھے گا ۔ جیسے انیسؔ جو بے پناہ ذہین بھی تھے اور ماہر نفسیات بھی ، دبیرؔ اس معاملے میں کمزور تھے ۔

محمد خالد عابدی :۔ شمیم صاحب ، کیا یہ ادبی ذوق آپ کو ورثے میں ملا ہے ؟

شمیم صاحب :۔ جی ہاں یہ ذوق مجھے اپنے برادر بزرگ حضرت آرزوؔ مرحوم سے ورثے میں ملا ہے جن کا سایہ بچپن ہی سے میرے سر سے اٹھ گیا ۔

محمد خالد عابدی :۔ شمیم صاحب ، کیا آپ "فن عروض" سے واقف ہیں اور یہ فن آپنے کس استاد سے سیکھا ہے ؟

شمیم صاحب :۔ یہ فن عروض مجھے ابتدائی زمانے میں کتابی صورت میں حاصل نہیں کرنے دیا سخت تاکید تھی کہ اگر عروض پر کوئی کتاب ابھی سے پڑھوگے تو اچھا شعر نہیں کہہ سکوگے ، بلکہ ۲۵ سال میں سینہ بہ سینہ اپنے بزرگوں سے سیکھتا رہا ہوں اب اس کا عادی ہوگیا ۔ یہ کمال بھی انہیں بزرگوں کا ہے ۔

محمد خالد عابدی :۔ بالخصوص آپ بھوپال کے کن شعراء سے متاثر ہیں اور کیوں ؟

شمیم صاحب :۔ میں بالخصوص بھوپال کے شعراء سے ہی ناآشنا ہوں چونکہ وہاں کبھی مشاعرے میں نہیں آیا ، صرف دو شاعر اب تک سنے ہیں ۔ جناب شعریؔ اور جناب تاجؔ بھوپالی ، افسوس کہ باقی شعراء کا کلام سننے سے اب تک محروم ہوں ۔

محمد خالد عابدی :۔ اردو ادب میں مشاعرے کی کیا اہمیت ہے ؟

شمیم صاحب :۔ مشاعروں سے ہماری تہذیب و تمدن ہمارے معاشرے کو تقویت ملتی تھی ، ہماری

زبان، ہمارے علم میں جلا پیدا ہوتی تھی، لوگوں میں ذوق لطیف پیدا ہوتا تھا۔

محمد خالد عابدی :۔ آجکل جو مشاعرے منعقد ہو رہے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

شمیم صاحب :۔ چونکہ خود مشاعروں میں شرکت کرنے پر مجبور ہوں اس لئے روشنی ڈالنا خلاف مصلحت ہے، صرف اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے، آج کا مشاعرہ محض چند متشاعر اور خوش گلو تک بندوں کا اکھاڑہ کے علاوہ کچھ نہیں۔

محمد خالد عابدی :۔ مشاعروں کو مزید کامیاب اور مقبول بنانے کے لئے آپ کیا تجاویز پیش کرتے ہیں ؟

شمیم صاحب :۔ براہ کرم ایسے سوالات نہ کیجئے کہ لوگ میرے دشمن ہو جائیں مجھے کسی کی دل آزاری گوارا نہیں، دوسرے میں اور آپ دونوں ملکر کسی تجویز کو نہیں منوا سکتے، چونکہ اب مشاعرے میں ایسے ہی سامعین ہوتے ہیں جو غزل کو گجل کہتے ہیں پھر انکو ایسی ہی شاعری بھی درکار ہے۔

محمد خالد عابدی :۔ شمیم صاحب ! آپ نے پہلی بار کس فلم کے لئے گیت لکھے تھے ؟

شمیم صاحب :۔ دل بھی تیرا ہم بھی تیرے، دھرمیندر کی پہلی فلم تھی۔

محمد خالد عابدی :۔ کیا آپ نے فلموں میں گیت کے علاوہ مکالمے یا کہانیاں وغیرہ بھی لکھی ہیں ؟

شمیم صاحب :۔ فلم میں کوئی کہانی نہیں لکھی البتہ سنفرائز کے مہمان کے لئے دو منظوم اور ادبی ڈرامے لکھے ہیں، میر تقی میر اور شاعر کا انجام محبت۔

محمد خالد عابدی :۔ کیا وجہ ہے کہ آپ فلموں میں پابندی سے گیت نہیں لکھ سکے ؟

شمیم صاحب :۔ پہلی وجہ وہاں کی گروپ بندی، دوسری وجہ میری غیرت اور خودداری نے خوشامدانہ انداز سے دور رکھا پھر میں خود بھی اس ماحول سے اب تک مانوس نہ ہو سکا۔

محمد خالد عابدی :۔ کیا اب آپ نے فلمی دنیا ترک کر دی ہے ؟

شمیم صاحب :۔ جی نہیں عنقریب ایک پکچر کے گانے لکھنے جانے والا ہوں۔

محمد خالد عابدی :۔ ابھی تک آپ نے کتنی فلموں کے گیت لکھے ہیں ؟

شمیم صاحب :- (۱) دل بھی تیرا ہم بھی تیرے ۔
(۲) راز
(۳) سہیلی
بظاہر صرف تین ہیں ۔

محمد خالد عابدی :- آپ کا پسندیدہ موسیقار کون ہے ؟ اور پسند کی کوئی خاص وجہ ؟

شمیم صاحب :- نوشاد صاحب ، مدن موہن مرحوم ، آر ڈی برمن ، چونکہ یہ لوگ کلاسیکل موسیقی سے بھی آشنا ہیں اور اُن کی دھنیں زیادہ تر اپنی ہوتی ہیں ۔

محمد خالد عابدی :- کیا یہ دعویٰ درست ہے کہ اُردو زبان کے بغیر فلم کی کامیابی اور مقبولیت مشکوک ہے ؟

شمیم صاحب :- میرا خیال ہی نہیں یقین ہے کہ صرف مشکوک ہی نہیں ناممکن ہے ۔

---

ایچ، ایس، سوڑھی
سابق پروگرام ایگزیکیٹو آل انڈیا ریڈیو جے پور

# راجندر سنگھ بیدی

## کچھ یادیں

۱۲ر نومبر کو رات ٹیلی ویژن پر یہ افسوسناک خبر سننے کو ملی کہ راجندر سنگھ بیدی اب ہم میں نہیں رہے، دماغ کی نس پھٹنے سے اُن کی موت ہوگئی، دفعتاً میری آنکھوں کے سامنے اُن سے وابستہ سب یادیں ایسے گذرنی شروع ہوگئیں جیسے اسکرین پر ایک فلم، میرے بیدی صاحب کے ساتھ ۱۹۴۴ء سے تعلقات قائم ہوئے تھے، بہت میٹھی یادیں ہیں، ان گھڑیوں کی جو ان کی صحبت میں گذریں اور وہ بھی لاہور میں، اب محض انہیں یادوں کے سہارے زندگی کے بقیہ سال گزاروں گا، بیدی صاحب میرے لئے ادب کے میدان میں ایک مسیحا تھے، صحیح ڈھنگ سے میں نے ادبی قلم کی گرفت اُن سے سیکھی۔

میری ان سے ملاقات بھی ایک عجیب اتفاق تھی۔ دسمبر ۱۹۴۴ء میں مرحوم صلاح الدین کے زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ ہمایوں میں میرا ایک افسانہ "گھنا درخت" چھپا تھا۔ یہ افسانہ گاؤں کی سماجی اور ازدواجی زندگی سے متعلق تھا، راجندر سنگھ بیدی ان دنوں آل انڈیا ریڈیو لاہور میں اُردو پروگراموں کے انچارج تھے۔ مجھے انہوں نے لاہور ریڈیو اسٹیشن پر مدعو کیا۔ اتنا تو میں جانتا تھا کہ منشی پریم چند کے بعد اردو افسانہ میں دیہاتی زندگی کا صحیح نقشہ کھینچنے والا دوسرا شخص راجندر سنگھ بیدی ہی تھا۔ لہذا میں آل انڈیا ریڈیو پہنچا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ انہوں نے مجھ سے منشی پریم چند پروفیسر تاجور نجیب آبادی اور کچھ دوسری ادبی شخصیتوں کے بارے میں بات چیت کی، افسانہ نگاری

کے بارے میں کچھ صلاح دی۔ اور جب اُن کو معلوم ہوا کہ میں اس سال گریجویشن کر چکا ہوں اور آگے پڑھنے کا کوئی ارادہ تو نہیں تو مجھے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کی طرف راغب کیا، کیا پتہ تھا کہ میرا اثبات میری زندگی کا رُخ پلٹ دیگا اُن ہی کی میز پر بیٹھ کر میں نے ایک عرضی لکھی جو انہوں نے ٹائپ کروا دی اور پھر میں اپنے آبائی گاؤں لوٹ گیا کیونکہ مجھے گاؤں سے بہت اُنس تھا۔ کوئی چار مہینے بعد مجھے آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے ایک امتحان میں شامل ہونے کے لئے کہا گیا۔ اور پھر امتحان کے کوئی تین ماہ بعد مجھے لاہور اسٹیشن پر ملازمت مل گئی۔

اس طرح بیدی صاحب سے میرا براہِ راست رابطہ قائم ہو گیا۔ وہ اکثر مجھے کوئی نہ کوئی مضمون دیتے اور کہتے کہ اس مضمون کی بنا پر ایک چھوٹا سا خاکہ لکھو۔ اور پھر مجھے اکثر اپنے لکھے افسانہ کی نقل کرنے کے لئے کہتے، بیدی صاحب نے ریڈیو کے لئے اُن دنوں لگ بھگ ایک درجن ریڈیائی ڈرامے لکھے، اُن میں سے "دسترس، آہٹ، کڑوا گھونٹ"، ریڈیائی ڈرامہ کے نظریہ سے کافی مقبول ہوئے، اُن کے ڈرامے آدھے گھنٹے سے لیکر ۴۵ منٹ تک کی ڈیوریشن کے ہوئے تھے کردار کل تین یا چار، زبان سادہ اور سلیس، انداز بالکل ذاتی اور ادبی، وہ بالکل لفاظی نہیں کرتے تھے اُن کا کہنا تھا کہ اگر کسی ڈرامہ میں کرداروں کی تعداد زیادہ ہو تو ڈرامہ کا مزہ جاتا رہتا ہے اور سننے والا بھول بھلیوں میں پڑ جاتا ہے، اُن کے ایک مسودہ میں میں نے "چاہ کنی"، کا استعمال کیا تو انہوں نے کاٹ کر اس کی جگہ "کنویں کھودنے"، کر دیا اور کہا کہ عام سننے والے کے لئے فارسی کے الفاظ ریڈیو کے پروگراموں میں استعمال میں مت لاؤ، اس کے علاوہ وہ وقت کے پابند تھے اور اگر اُن کے پروگرام میں کوئی فنکار وقت پر نہیں آتا تھا تو اُس کا کنٹریکٹ کینسل کر کے دوسرے کو رکھ لیتے تھے۔ یہ ایک اصول کی بات تھی مگر اس سلسلہ میں اُن کا "معذرت"، کا اپنا ڈھنگ تھا۔ بیدی آل انڈیا ریڈیو میں بطورِ پروگرام ایگزیکٹو آئے تھے لیکن اُن کا شوق اردو ادب کی خدمت کا تھا اور وہ اس عہدہ پر رہتے ہوئے نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے تین سال کی گورنمنٹ ملازمت کو طلاق دیدی، اور سٹاف آرٹسٹ کا کنٹریکٹ منظور کر لیا۔ اگر وہ پروگرام ایگزیکٹو رہتے تو

نخلستان

کم از کم ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کے اعلیٰ عہدہ سے ریٹائر ہوتے ، اُن کی ریڈیو کی نوکری کے پیچھے بھی عجیب سی داستان تھی ۔ بیدی نے بطور کلرک پوسٹ آفس میں ملازمت شروع کی تھی بمشکل بیس سال کے تھے جب انہوں نے اپنا پہلا افسانوں کا مجموعہ "دانہ ودام" لکھا، اور جب آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر ذوالفقار احمد بخاری نے پڑھا تو اُس نے اُسی وقت ٹھان لی کہ بیدی کی خدمات حاصل کی جائیں گی، لہذا جب ۱۹۴۰ میں لاہور میں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو انہوں نے بیدی صاحب کو بطور پروگرام ایگزیکٹو رکھ لیا۔

بیدی صاحب نے ریڈیو میں لگ بھگ پچاس کے اوپر ڈرامے اور فیچر لکھے، اور اپنی زندگی میں لگ بھگ دو سو کے قریب افسانے لکھے ، اور یہ سب کچھ یا تو رسالوں میں شائع ہوا یا کتاب کی شکل میں اور یا پھر ریڈیو کے ذریعہ نشر ہوا۔ ان سب افسانوں اور ڈراموں میں بیدی نے دیہاتی زندگی پر زیادہ زور دیا۔ چونکہ بیدی متوسط درجہ کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ، لہذا انہوں نے گاؤں کی سماجی زندگی کو زیادہ تر اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ انہوں نے شہر کے متوسط طبقے کے لوگوں کی زندگی کو اپنے کچھ افسانوں کا موضوع بنایا، اُن کا قسط واری پروگرام بعنوان صدائے بازگشت متواتر ایک سال تک لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتا رہا مگر کچھ ایسے پروگرام نشر ہوئے جنکا رشتہ سیدھی سادی متوسط درجہ کی زندگی سے متعلق تھا۔ ان کی فلم گرم کوٹ دیکھا جائے تو پروگراموں کی ایک ایسی ہی کڑی ہے۔

۱۹۴۶ء میں لگ بھگ چھ سال کی ملازمت کے بعد آل انڈیا ریڈیو سے استعفےٰ دیدیا۔ اور سعادت حسن منٹو، دیوندر ستیارتھی ، ممتاز مفتی، امتیاز علی تاج اور کرشن چندر کے ساتھ ملکر ایک ایسا ادارہ قائم کیا جس سے اردو ادب کی خدمت کی جاسکے ، اِس سلسلہ میں انہوں نے ممتاز ادیبوں کی تصنیفات شائع کرنے کا ذمہ لیا۔ اور اقتصادی طور پر کمزور ادیبوں کی مالی امداد بھی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اِس سلسلہ میں پنجاب سرکار نے بھی کچھ مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن تقسیم وطن کی وجہ سے یہ اسکیم عملی جامہ نہ پہن سکی۔ اس ادارہ کا نام سنگم پبلشنگ ہاؤس

تھا اور بعد میں بھارت میں نیشنل بک ٹرسٹ ان ہی اصولوں پر قائم ہوا۔

تقسیم کے بعد بیدی جموں پہنچے جہاں وہ آل انڈیا ریڈیو کے پہلے اسٹیشن ڈائرکٹر بنے، لیکن جموں کشمیر کے مرحوم وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ سے کچھ اختلاف ہو گئے اور انہوں نے استعفیٰ دیدیا، اور وہاں سے سیدھے بمبئی پہنچ گئے جہاں انہوں نے اپنی نئی زندگی شروع کی۔ یہ میڈیم ریڈیو اور ادب سے الگ تھلگ تھا۔ بیدی نے بمبئی پکچرز کے ساتھ پانچ سال کا کنٹریکٹ کیا انکی شروع کی دو فلمیں تھیں "بڑی بہن" اور "آرام" ان فلموں کی تکمیل کے بعد بیدی نے سنجیدہ طور پر سوچنا شروع کیا کہ ہندوستانی فلم کے معیار کو کیسے بلند کیا جائے کیونکہ فلم فائنینسر کو لگایا ہوا سرمایہ دگنے سود کے ساتھ واپس چاہیئے تھا۔ اس لئے فلم کی کہانی چاہے کتنی ہی اچھی ہو جب تک اُس میں بلا مطلب گانے اور سیکس کی عریانیت نہ ہو نہ تو فلم کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ ہی سرمایہ دار کو فائدہ ہو سکتا ہے، ریڈیو کا معیار کچھ اور ہوتا ہے اور ادب کا معیار کچھ اور۔ لیکن اس کے برعکس فلم میں افسانہ نویس کی بالکل نہیں چلتی بلکہ کئی بار تو افسانہ نویس کو گانا دیکھ کر اپنے افسانہ میں ترمیم کرنی پڑتی ہے۔ بیدی فلمی دنیا کی ان سب کمزوریوں سے واقف تھے، لیکن بے بس بھی تھے۔ البتہ بیدی نے بعد میں جو فلمیں بنائیں اُن میں تھوڑی بہت سمجھوتہ کی گنجائش رکھی، یہ فلمیں تھیں، مرزا غالب، دیوداس مدھومتی، اور داغ وغیرہ وغیرہ۔ ان فلموں میں بیدی نے ڈائیلاگ کی پیشکش اور اداکاری کی طرف زیادہ توجہ دی۔ بیشک یہ فلمیں کامیاب ہوئیں لیکن بیدی صاحب کی نسبت پروڈیوسر کی زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی،

بامبے فلمز نے بے شک بیدی صاحب کو ان افسانوں کے عوض میں کافی رقم دی لیکن بیدی کے لئے وہی مسئلہ درپیش رہا کہ آخر پیسہ ہی تو اُن کی زندگی کا مقصد نہیں تھا۔ اور پھر ادبی معیار کا تجارتی نظریہ سے کیسے معاہدہ یا سمجھوتہ ہو سکتا ہے، یہ ایک ایسی کشمکش تھی ایک ایسی الجھن تھی جو آسانی سے سلجھ نہیں سکتی تھی۔

بیدی صاحب نے ان مشکلات کو عبور کرنے اور ان کا حل ڈھونڈنے کے لئے اپنے ساتھ فلمی

دنیا کی چار شخصیتوں یعنی رشی کیش مکرجی، بلراج ساہنی، ہومی سیٹھنا ، اور خواجہ عباس کو اپنے ساتھ لیا۔ بیدی صاحب کوشاں تھے اس بات کے لئے کہ جیسے بھی ہو سکے ہندوستانی فلموں کا معیار اونچا کیا جائے۔ بیدی صاحب کی یہ اسکیم بالکل اُس اسکیم کے متوازی تھی جو انہوں نے لاہور میں سنگم پبلشنگ ہاؤس قائم کرکے کی تھی۔ انہوں نے رشی کیش مکھرجی سے ایک قسم کا مستقل معاہدہ کر لیا کہ وہ ان کی سب فلموں کے ڈائیلاگ لکھیں گے، اور اس معاہدہ کے تحت انوپما میم دیدی، ستیہ کام، ابھیمان، جیسی فلمیں مارکیٹ میں آئیں، ان فلموں میں اپنی قسم کی شائستگی، ادبی شگفتگی، اچھی سوجھ بوجھ اور میچوریٹی تھی، اس کے بعد بیدی صاحب نے ایک فلم "دستک" بذات خود لکھی اور خود ہی بنائی۔ اس فلم میں انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ ایک ایسے خاندانی شادی شدہ جوڑے کو وہ مکان کرایہ پر ملا جو پہلے ایک لحاظ سے بدمعاشوں کا اڈہ تھا اور اس کا ردعمل جو عام طور پر ہوتا ہے سماج کی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔ اور پھر اس کے بعد بیدی صاحب کی فلم پھاگن بھی سماج کی کمزوریوں کا ایک آئینہ تھا۔ لیکن عام طور پر یہ دونوں فلمیں باکس آفس پر ہٹ نہ ہو سکیں اور اس وجہ سے بیدی کو ان فلموں کی وجہ سے کافی کٹھن اقتصادیات کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت بڑا مالی نقصان ہوا جس کی وجہ سے اُن کو اپنا مکان بھی گروی رکھنا پڑا لیکن بیدی کی الوالعزمی کو چوٹ نہیں پہنچی۔

۱۹۵۷ء میں میں پونا ریڈیو اسٹیشن پر کام کر رہا تھا، ایک دفعہ ایسا ہوا کہ تین دن متواتر تعطیل آئیں تو میں نے سوچا کیوں نہ پونا ولا چلا جائے۔ پونا ولا اپنے خوبصورت قدرتی نظاروں کیوجہ سے بہت مقبول ہے اور یہاں پر لگ بھگ فلمی دنیا کی مشہور شخصیتوں کے اپنے رہائشی مکانات ہیں، وہاں اچانک میری ملاقات بیدی صاحب سے ہوئی، اور وہ مجھے اپنے ہمراہ بمبئی لے گئے رات بہت دیر تک ہم پرانے دنوں کی باتیں یاد کرتے رہے۔ اور مجھے اُسوقت پتہ چلا کہ بیدی صاحب نے اپنی ڈاک خانہ کی ملازمت کے دوران کس طرح غربت میں رہتے ہوئے بھی اپنے چھوٹے بھائی کو تعلیم دی جو بعد میں آئی، اے، ایس، میں کامیاب ہونے کے بعد منسٹری آف لا میں جوائنٹ

سکریٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ میں نے بیدی صاحب سے پوچھا کہ ریڈیو کے مقابلہ میں فلمی دنیا کیسی لگی تو بیدی صاحب مُسکرائے اور بولے، فلمی دنیا میں اپنی قسم کے مسائل ہیں، یہاں کی سیاست اپنی قسم کی ہے اور یہاں کا ماحول بالکل الگ تھلگ سا ہے۔ میں کئی بار اپنے افسانہ سے بالکل مطمئن ہوتا ہوں لیکن جب یہ افسانہ پرڈیوسر کے پاس پہنچتا ہے تو اس غریب کی وہ مرمت ہوتی ہے کہ حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ بہرحال وہ خوش تھے کہ وہ ادب اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے۔ اُن دنوں ان کی صرف دو تین فلمیں مارکیٹ میں آئیں تھیں۔ جب میں نے ان سے ایک سوال کیا کہ افسانہ نویس لاکھ کوشش کرے تاہم فائنینسر اور پرڈیوسر اس کی پیش نہیں جانے دیتے تو اُن کو غالباً میرے یہ COMMENTS پسند نہیں آئے۔ اس لئے وہ خاموش ہو گئے اور مجھے اپنے آپ پر اس قسم کے سوال کرنے کے لئے بہت افسوس ہوا۔ لیکن ایسا نہیں تھا انہوں نے میز کی دراز سے اپنا ایک افسانہ اور اُس سے منسلک اُن سوالوں کے جوابوں کا پلندہ دکھلایا جو کہ اُن کے اور پرڈیوسر کے مابین تحریر میں ہوا۔ ایک ایسے خط کی نقل بھی میں نے دیکھی جو انہوں نے ایک فلم پروڈیوسر کو بھیجا تھا، اور اس میں کنٹریکٹ کو کینسل کرنے کی معذرت چاہی تھی۔

جب میں بمبئی سے واپس آنے لگا تو مجھے انہوں نے ایک افسانہ جو کہ پنجابی میں تھا دیا اور کہا کہ اس کے ڈائیلاگ ڈرامائی انداز میں لکھ کر مجھے بھیج دینا۔ ہاں اتنا دھیان رہے کہ اس کی زبان درسی نہ ہو، چونکہ کسانی بالکل گاؤں کی زندگی سے جُڑی ہوئی ہے، اس لئے جہاں تک ہو سکے، انگریزی استعاروں اور الفاظ کا بھی کم سے کم استعمال کرنا۔ مجھے اس کام کے لئے اُنہوں نے دو ماہ کی مدت دی۔ حسب منشا میں نے اس افسانہ کی ریڈیائی شکل اُن کو بمبئی بھجوا دی، اُس کے کچھ دن بعد بیدی صاحب نے میرا ٹیلیفون پر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ADAPTATION بہت حد تک درست تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس کا یہ مطلب مت لینا کہ میں تجھے فلمی دنیا میں مدعو کر رہا ہوں، اس کام کیلئے بیدی نے پانچ سو روپیہ کا چیک بھیجا جو میں نے اُن کو

شکریہ کے ساتھ واپس بھیجدیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ ڈائیلاگ اور ریڈیائی شکل تبدیل ہوکر ایک فلم کا جزء بنی۔ جو کہ کوئی دو سال بعد مارکیٹ میں آئی۔

بیدی صاحب کچھ حد تک رنگین مزاج تھے لیکن انہوں نے انکساری اور انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ سکھ ہوتے ہوئے بھی مذہب کے زیادہ پیرو کار نہیں تھے، گھر میں پاٹھ پوجا بھی بہت کم کرتے تھے، البتہ جب کوئی مذہبی تہوار ہوتا تو اُس کے لئے دل کھول کر چندہ دیتے حال ہی کے دلی میں ہوئے دلی کے دنگوں سے اُن کو بہت دکھ ہوا۔ لیکن اُن کو اتنا معلوم نہیں تھا کہ یہ اُن کی زندگی کی آخری گھڑیاں ہیں اور وہ اِس دُکھ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

بیدی صاحب کی رفیقۂ حیات ۱۹۷۰ء میں اس جہان فانی سے رحلت کر گئیں تو اُن کو اس کا بہت صدمہ ہوا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ ایک لحاظ سے نڈھال ہو گئے، ایک خط میں مجھے انہوں نے لکھا کہ میری یہ کمی اور خلاء کوئی بھی پورا نہیں کر سکے گا۔ ان دنوں بیدی صاحب نے پنجابی میں مشہور ناول "اک چادر میلی سی"، لکھا، جسے پڑھ کر کرشن چندر بیدی سے بغلگیر ہوئے اور کہا بیدی شاید تمہیں خود نہیں معلوم کہ تو نے کیا غضب کی چیز لکھی ہے، اور پھر اس ناول لکھنے کے لئے انھیں ساہتیہ اکیڈمی کیجانب سے انعام سے نوازا گیا۔ مرحومہ اداکارہ اور فنکارہ گیتا بالی اس ناول کو فلمانا چاہتی تھیں مگر وہ اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی چل بسیں۔

بیدی صاحب کا حوصلہ پست ہوگیا جب اُن کا بڑا لڑکا نریندر اُن کی آنکھوں کے سامنے جاں بحق ہو گیا۔ اس کے بعد تو بیدی بالکل نڈھال ہو گئے، یہاں تک کہ اُن کے دماغ پر اس کا گہرا اثر ہوا۔

آخری دو سال بیدی بستر علالت پر پڑے رہے اُن کو فالج ہو گیا اور اُس کے بعد دماغ کی نس پھٹ گئی جو اُن کی وفات کا بہانہ بنی۔

اب سُنا ہے کہ خواجہ احمد عباس ہنسراج بہل کے ساتھ مل کر بیدی کی ناول "اک چادر میلی سی"، کو فلمانے کے لئے سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔

بیدی نے لگ بھگ پچاس سال اردو ادب کی خدمت کی، لگ بھگ دو سو افسانے لکھے، پچاس کے قریب ریڈیو کے لئے ڈرامہ اور فیچر لکھے، لگ بھگ بیس فلموں کی کہانیاں لکھیں اور اتنی ہی فلموں کے ڈائیلاگ لکھے، انہوں نے اردو ادب کو ایک نیا رُخ دیا جو کہ منشی پریم چند کے بعد اپنی نوعیت کا الگ ہی تھا۔

**نوٹ!** گوشۂ نگراں میں یہ تحریر کیا گیا ہے کہ طلبہ وطالبات کو وظائف ملنے والے ہیں، تازہ اطلاع یہ ہے بی۔اے، میں تعلیم پانے والی طالبات اور ایم۔اے اردو میں تعلیم پانے والے طلبہ وطالبات کو وظیفہ کی رقم کی ادائیگی شروع ہوگئی ہے، حکومت راجستھان کے وزیر اعلا کی یہ اردو نوازی قابل فخر ہے کیونکہ غالبًا ہندوستان کے کسی بھی صوبے میں اس طرح اردو کی تعلیم کو فروغ دینے کی عملی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

مجھے توقع ہے کہ دوسری ریاستوں میں بھی اس مستحسن قدم کی پیروی کی جائے گی۔

نگراں!

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
بیرو باٹی، گوہاٹی

# حیرت بہ حیثیت غزل گو

جدیدیت سے مراد دیوانہ وار وہ کاوش نہیں ہوتی جو لفظ کو اس کے معروف معنیٰ سے جدا کر کے رکھ دے، بدلتی دنیا کی احساسیت سے مرتب ہونے والے اثرات کو نئی معنویت، سماجیاتی کیفیت وغیرہ کو ادب میں ڈھالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، اردو غزل اس صورت حال سے دوچار ہے۔ آجکل کے اردو شعراء میں حیرت کا مقام و مرتبہ خاصا بلند و دقیع ہے، نکتہ رسی، مخصوص تیور، پختہ کلامی وغیرہ خصوصیات کا آئینہ دار ہے ان کے کلام کا پہلا انتخاب "ازبر" جس کی ترتیب و تہذیب جناب رام پرکاش راہی کی جمالیاتی سعی کی مرہون منت ہے، اترپردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعۂ کلام جو غزلیات و منظومات، پر مشتمل ہے معمولی تخلیقی کارنامہ نہیں ہے، اس کی ہمہ جہتی اہمیت بھی ہے اور دلکش انفرادیت بھی ہے۔ آجکل مجموعہ ہائے کلام بالعموم طول و طویل مقدمات سے شروع ہوتے ہیں جن کی توصیفی نئے بے وقت کی راگنی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی، تعارف جو شعراء اور ادبی حیثیت کے خواہاں پیش لفظ نگار حضرات یہ کیوں بھولتے ہیں کہ صحت مند ادبی ذوق رکھنے والے کلام کو دیکھتے ہیں۔ حیرت نے "بیان اپنا" کے تحت اس عیب کی واشگاف طور پر نشاندہی کی ہے کہ

"ازبر خدمت میں حاضر ہے، اس کے آغاز میں کسی دوسرے ادیب کا دیباچہ یا مقدمہ مجھے اس لئے گوارا نہ ہوا کہ ایسی تحریریں بالعموم گمراہ کن حد تک تعریفی و

یک رخی ہوتی ہیں اور ایسی ایسی باتیں شاعر سے منسوب کر دی جاتی ہیں جن کا سایہ بھی اس غریب پر نہ پڑا ہو۔"

حیرتؔ کی یہ رائے درخور اعتنا ہے۔ شاعر و سامع یا شاعر و قاری کو ایک سطح پر لانے کی صلاحیت و توانائی کلام ہی میں مضمر ہوتی ہے۔

مقابلہ ہے زبردست لایقینی سے
میں اپنا جام اُٹھالوں تو اپنا ساز اُٹھا

جام کو جلوہ جلوہ کرنے والا بادۂ کلام اگر ساز دل کو نہ چھیڑ سکے تو فروغِ بادۂ اور نغمہ سنجی دونوں معرض وجود میں نہیں آسکتے۔

حیرتؔ کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے کیونکہ وہ "از دل خیزد بر دل ریزد،، میں مضمر جملہ مفاہیم پر محیط ہے، مجموعۂ کلام کا نام ہی توجہ طلب ہے، ازبر کے معروف معنی ہیں "حفظ،، نوکِ زبان، زبانی یاد، وغیرہ، بالاستیعاب نظر لفظ بر جس کے معنی "بلند، غالب، ثمر، سینہ، ہیں پر بھی مرتکز ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس معنوی سیاق و سباق میں" ازبر،، سے مراد "از دل" بھی ہو سکتی ہے، میں مجموعۂ کلام کو اسی معنوں میں لیتا ہوں کیونکہ اس میں پیش کردہ خیالات و محسوسات جو صدق و خلوصِ دل سے استوار ہوئے ہیں دلِ سامع و قاری پر جالیاتی توانائی سے مرتب ہو جاتے ہیں۔

شعر حیرتؔ متعدد خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ محسوسات و جذبات جو تہہ در تہہ فکریات سے عبارت نہ ہوں اچھے اشعار میں متصور نہیں ہو سکتے، جذبات کی فراوانی جگر تو پیدا کر سکتی ہے مگر یگانہ و فراقؔ ایسے شاعر پیدا نہیں کر سکتی۔ فکری و نظریاتی نکات کو جذباتی و محسوساتی اظہار و ترسیل میں کشید کئے بغیر اشعار فاعلاتن مفاعیلن ارکان پر وضع ہونے کے باوجود عظمت و وقار کے اُفق جو شفق شعری سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ سلسلہ در سلسلہ، مرحلہ بہ مرحلہ منسلکات سے بھر پور رُو بہ نقطۂ عروج رواں دواں خیال کا جذبے میں غنائی و رعنائی سے

نظم ہو جانا ہی کمالِ شعریت ہوتا ہے، بشری و سماجی مسائل کو جذبات و محسوسات ہی نہیں بلکہ ترغیبات و تشویقات وغیرہ کو جلوؤں میں لئے شعری قلب و قالب سے متصف کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے، اس سے صرف بڑا شاعر ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے، ذاتی حادثات و تجربات کا سماجیاتی پس منظر میں اتر جانا اور روحانی وجد و حال میں عروج پذیر ہوتا ہی شعر کو سرخوشگی، مسرت و بصیرت سے آشنا کرتا ہے، اچھے شعر میں آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے، فرد پورے سماج کا نمائندہ ہو جاتا ہے۔ شاعر اور قاری یا سامع کے مابین کوئی دیوار نہیں رہتی۔ خود کلامی، لمحہ بہ لمحہ بدلتا ہوا ذہنی تناظر تشکک و تیقّن، افہام و تفہیم، دنیا و مافیہا سے متعلق تاثرات و تخیلات، سماجی ماحول سے مرتب ہونے والے اثرات نیز ان سے زائیدہ ردِّ عمل وغیرہ کو بہ خلوص و اہتمام مناسب و معقول درو بست فراہم کرنا وغیرہ شعری ضمیر و خمیر میں جذب ہو جاتے ہیں، فضائے شعر و سخن زمان و مکان پر محیط ہوتی ہے۔ از بر کو بالاستیعاب دیکھنے کے لئے متذکرہ مختصات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ملحوظ رہے کہ حیرتؔ کی شاعری کا تخاطب عوام سے بھی ہے اور خواص سے بھی۔ اور اس میں کسی قسم کی ژولیدگی نہیں پائی جاتی ہے۔ افہام و تفہیم کو کسی دقّت سے دوچار ہونا نہیں پڑتا، حیرت کی شاعری میں وہ شیشہ گری جو الفاظ کو مبہم علامات میں تبدیل کر کے سنگ باری کرنے لگے نہیں ملتی، سیدھے سادے الفاظ میں گفتگو کرتی ہوئی یہ شاعری نقش ہائے رنگ سے رنگ خالی نہیں ہے، "چشمِ ما روشن دلِ ما شاد"، کہتے ہوئے شاعر و سامع دونوں محوِ گفتگو ہو جاتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| ہزار منزلِ مقصود ایک ہو لیکن | ہماری راہ جدا ہے تمہاری راہ جدا |
| نکال اور ہی کچھ راہ خود نمائی کی | سجاوٹوں سے یہ پرہیز بھی سجاؤ ہے ایک |
| تعلقات کو بنیادِ زندگی نہ بنا | تعلقات بگڑتے سنورتے رہتے ہیں |
| حیرتؔ کہاں تھے دست بہ دل دیکھتے اُسے | بارش میں بھیگتا ہوا شعلہ بنا ہوا |
| پوچھ رہے ہو میرا حال | جیسے تمہیں معلوم نہیں |

فقیہہ شہر ترے واسطے بچاؤ ہے ایک　　عمل ہی ذلتِ کردار سے بچاؤ ہے ایک

آئنا لہولہان تو چہرہ کبھی نہ تھا　　پتھر سے بھی ہیں سخت تمہاری ہنسی کے پھول

تم اپنے ہو زماں اپنا مکان و لامکاں اپنے　　یہ سب تسلیم لیکن دوستو ہم خود کہاں اپنے

شاعر کو محوِ گفتگو دیکھنے کے بعد ملاحظہ ہو اس کی خود کلامی جو خود احتسابی سے لیکر تجزیۂ گرد و پیش کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے ۔ ملاحظہ ہو ے

میں خود سے محوِ تکلم تھا بے حجابانہ　　مجھے خبر نہ تھی دنیا بھی سُن رہی ہو گی

حیات میں وہ مقام آ رہا ہے اب کہ جہاں　　نہ اعتقاد معاون نہ آگہی ہو گی

یہ گھر بھی میرا ہے اُس کی تمام چیزیں بھی　　ہر ایک گوشہ میں لیکن یہ ناشناس سے لوگ

مقام آ ہی گیا زندگی میں اب وہ جہاں　　نہ کوئی خاک بسر ہے نہ کوئی مہ بہ جبیں

اپنی ہر خود سپردگی کی قسم　　میں جہاں تھا وہ میرا گھر تو نہ تھا

میں نے کب چاہا مرادوں کا سفر ایسا نہ ہو　　بس مرے احساس کو جینے سے ڈر ایسا نہ ہو

غالبًا ہم سب کی تقدیریں ہیں باہم منسلک　　لیکن اُس صورت میں کیا ہو گا اگر ایسا نہ ہو

آگے کا سفر تری قیادت میں کریں گے　　عقبیٰ سے پرے دیدۂ بینا نہیں جاتا

شکست گامی کیلئے صرف شبِ غم ہی ملی　　گردشِ وقت بالآخر ترا منشا کیا ہے

منزلوں کے باب میں رستوں سے مت کر مشورے　　منزلیں اپنے مسائل خود کیا کرتی ہیں حل

امیدِ شام کے سورج سے کچھ نہ تھی لیکن　　جب اسکو ڈوبتے دیکھا عجیب ڈر سا لگا

وہی نہ ہو کہیں معراجِ زندگی حیرتؔ
جہاں پہنچ کے مجھے عیب بھی ہُنر سا لگا

خود کلامی و خود احتسابی سے متعلق محولہ بالا اشعار بطور نمونہ مشتے از خروارے ہی پیش کئے گئے ہیں ۔ حیرتؔ کے کلام میں فلسفیانہ نیز نفسیاتی نکات بھی کسی دقت کے بغیر مل سکتے ہیں مخفی مبادہ، فلسفہ، حیات و کائنات سے متعلقہ اعتقادات و نظریات کو نہیں کہتے، فرد و ملت

کائنات و ماورائے کائنات پر بالاستیعاب نیز مسلسل نظر ڈالنے کو ہی فلسفیانہ نظر کہا جاسکتا ہے، جامِ شعر میں فلسفے کی پری کو اتارنا معمولی بات نہیں ہے۔ اگر پیش کردہ فلسفیانہ نکتہ تغزل میں نہ ڈھلا تو وہ پند و موعظت ہو کر بے کیف و سر در رہے گا۔ حیرت نے فلسفہ پڑھا ہی نہیں بلکہ برتا بھی ہے۔ درج ذیل نوعیت کے اشعار ان کے ہاں بغیر تلاش ہی نظر آتے ہیں ؎

میں تو از بر کر چکا حیرت کتابِ زندگی —— زندگی کا ہر ورق بھی کیا مجھے پڑھتا گیا

لوگ سمجھے یا نہ سمجھے اُس کا مطلب کیا خبر —— اک عبارت پڑھنے والی تھی سو میں پڑھتا گیا

کیا کیا حسین جواز تراشے ہیں زیست نے —— کم بخت لیکن اب بھی سراپا سوال ہے

گذرا ہے دل کچھ ایسے مراحل سے بھی جنھیں —— الفاظ کی گرفت میں لانا محال ہے

ترک و مطلب کے ہنگاموں کو عشق سمجھنا وحشت ہے
عشق تحیّر بے پایاں ہے عشق مجسم حیرت ہے

فکر نہیں ہے اُس عنصر کا نام محبت ہے شاید
جس سے تہذیبیں بنتی ہیں جس سے زیست عبارت ہے

منزلوں کے باب میں رستوں سے مت کر مشورے
منزلیں اپنے مسائل خود کیا کرتی ہیں حل

غرض کہ فلسفیانہ نکات کو سمو کر کہے گئے اشعار ہر صفحے پر نظر آتے ہیں، عشق تحیّر بے پایاں ہی نہیں، مجسم حیرت بھی ہے، محبت ہی وہ عنصر ہے جس سے زیست تو عبارت ہے ہی، تہذیب اور ثقافت بھی محبت ہی کی مرہونِ منّت ہیں، مگر یہ حیات' بہ محبت" دل بہ یار دست بہ کار،، پر استوار ہو کر ہی حیات و محبت ہوتی ہے، عمل کئے بغیر مسائل حل نہیں کئے جاسکتے حیرت کا فلسفہ حیات و کائنات کے دائروں کو متعدد مقامات پر چھوتا ہے، ان کا شاعرانہ لمس نرم و نازک ہوتا ہے۔ اور کسی پیش کردہ خیال کے منسلکات و ملتزمات خود بخود بیدار کر دیتا ہے۔

حسرتؔ بیبرؔ کا کلام جذباتی توانائی، منطقیاتی قبولیت اور اخلاقی جرأت وغیرہ سے متصف ہونے کی وجہ سے خاصی اہمیت ومقام رکھتا ہے، مزید برآں کلاسیکی حسن وخوبی، بیدار آگہی، متوازن ومعتدل محرکات، کار آگہانہ اظہار وترسیل، مسرت سے بصیرت تک پرواز کرتے ہوئے خیالات وتصورات، خصوصیات کی در وبست، سب کچھ ان کے یہاں ملتا ہے وہ لفظوں سے نہیں کھیلتے اور نہ ہی لفظ کو معنی سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جدیدیت کا مجنونانہ جوش وخروش جو اکثر وبیشتر ابہام سے اہمال تک ہی تگ ودو میں مصروف نظر آتا ہے، ازبرؔ میں کہیں نہیں ملتا۔

اہمال کے بھی ہم قائل ہیں بہالاؔ گر اہمال رہے
ابہام بھی خوبی ہے لیکن اہمال صفت ابہام نہ ہو

گرد وپیش، عصری تقاضے، افدار کی شکست وریخت، لمحہ لمحہ بدلتے حالات سے حیرت متحیرؔ ہوکر، دم بخود ہوکر، دیوانہ وار ولذیزیت پر نہیں اترتے، چیستانی اظہارِ بیان سے اپنی فضائے شعریت کو آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ حیرتؔ کا کلام تعدد معنویت، ( PLURIS IATION ) سے معمور، اظہار وترسیل کے صاف ستھرے ذرائع سے بھرپور اور تہہ در تہہ خیالات ومحرکات سے پُر نور ہے اور رہے گا۔ وہ ہنر شناس ہیں اور ایسے ہنر شناس جو تحسین ناشناس سے دور بہت دور رہتے ہیں۔ ازبرؔ کو سرسری نظر سے دیکھئے یا بالاستیعاب، آپ کو دلکش اشعار صفحہ صفحہ پر نظر آئیں گے، ہر شعر مزید توجہ کا تقاضا کرتا ملے گا۔

قدم بیباک ترنہ در حریم جانِ مشتاقاں
تو صاحب خانہ آخر چرا دزدانہ می آئی

یعنی قاری ہو یا سامع، حیرتؔ کے شعر میں اپنے خیالات کی بازگشت سُنے گا۔
ایوانِ کلامِ حیرتؔ میں قاری خود کو بہ حیثیت صاحبِ خانہ محسوس کرنے لگتا ہے، ازبرؔ

میں جو کچھ ہے وہ "از دل" سے عبارت ہے، لہٰذا اس میں "بر دل خیزد" کی صلاحیت بھی ہے ان کے غم دل بھی ہے، غم جاناں بھی ہے اور غم دوراں بھی ہے۔

حیرت کے اشعار میں کرب و آگہی، شدتِ جذبات، پھیلتی اور سکڑتی ہوئی موجودہ دنیا سے مرتب ہونے والے اثرات بادۂ غزل میں کشید ہو کر بڑی پرکیف کہکشانیت کی فضا پیدا کر دیتے ہیں جبکہ غالی جدید یہ چیستانی حلقہ در حلقہ گفتگو سے بے کیفی کے موجب بن جاتے ہیں، شعر کہنے کا سلیقہ چاہیئے ؎

کبھی آیا نہ سلیقہ تمہیں آرائش کا
تم سنورتے ہی رہے بال بکھرتے ہی رہے

حیرت کا کلام پُرکیف و بصیرت خوبیوں کا حامل ہے، دلکش و نرم آہنگی، فکر آگیں جذبہ، موجودہ لب و لہجہ وغیرہ خصوصیات و دروبست سے مملو اشعار حیرت مقام و مرتبہ کے حامل نظر آتے ہیں، ان کے ہاں سوز دل ہے، جو واقعی سوز دل ہے ؎

تو اے پروانہ ایں گرمی ز شمع محفلے داری
چو من از آتش دل سوز اگر سوزِ دلے داری

(فیضی)

## اختر پروین

# رشید احمد صدیقی کا اسلوب بیان

رشید احمد صدیقی کا طنز و مزاح کے اماموں میں شمار ہوتا ہے، ان کی تحریریں ایسی دلکش اور دل میں گھر کرنے والی ہیں کہ انھیں پڑھ کر قاری کی جمالیاتی حس بیدار ہو جاتی ہے، طنز و مزاح کا جمالیات سے گہرا تعلق ہے کیونکہ جس طرح حسن، ہمیں لطف و مسرت عطا کرتا ہے اسی طرح طنز و مزاح بھی ہمیں بصیرت و مسرت عطا کرتا ہے۔

اچھا ادب مسرت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی عطا کرتا ہے اور رشید احمد صدیقی کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ ان کے یہاں خالص مزاح کم ملتا ہے۔ اور اعلیٰ درجہ کا طنز زیادہ ملتا ہے اس طنز میں سماجی، سیاسی، اخلاقی، اور معاشرتی، حالات پر جو نکتہ چینی کی جاتی ہے وہی ہمیں بصیرت عطا کرتی ہے ایک اچھے طنز نگار کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تخریبی رویہ نہیں اپناتا بلکہ ملک اور قوم کے سڑے گلے ناسوروں کا آپریشن کرتا ہے ایک سرجن کی طرح طنز نگار کا کام بھی تعمیری ہوتا ہے۔

مزاح کا تعلق محض دل بستگی اور تفریح طبع سے ہوتا ہے، لیکن طنز کا مقصود محض تفریح

نہیں ہے بلکہ سماج کے غیر متوازن حالات کو متوازن کرنا ہی اس کا نام ہے ۔ رشید صاحب کی تحریروں میں خالص مزاح کے نمونے بھی بہت عمدہ ملتے ہیں اس مزاح کو پیدا کرنے کے لئے وہ مختلف حربے کام میں لاتے ہیں ۔

رشید احمد صدیقی کو مرقع کشی میں بھی کمال حاصل رہا ہے، دیکھئے شیخ نیازی کی مرقع کشی کس طرح کی گئی ہے ۔

"ہاتھ سے کمر بند پکڑے ہوئے بغل میں فٹ بال اور منہ کھلا ہوا، بھائیوں میں سے کسی نے کہا کہ حضرت ایسا بھی کیا تکلف فٹ بال کو منہ میں ہی رکھ لیا ہوتا ۔"

ایک مقام پر شیخ نیازی کو ختنہ کرانے کے لئے تیار کرنا پڑا اور انہیں طرح طرح کے لالچ دیئے گئے، رشید احمد صدیقی نے اس موقع پر جو عبارت تحریر کی ہے اس میں ایک لفظ ہی ایسا شگفتہ ہے جسے پڑھ کے بے اختیار ہنسی آجاتی ہے ۔

"نعمتوں کی قسمیں اور مقدار اتنی زیادہ دکھائی بتائی گئی تھی کہ شیخ صاحب ختنہ فروشی پر خوشی سے تیار ہو گئے ۔"

رشید صاحب کو اس بات میں بھی کمال حاصل تھا کہ وہ محض الفاظ کے صوتی اثرات سے کام لیکر مزاح پیدا کر دیتے ہیں مثلاً ان کی یہ تحریر ۔

"دنیا جہاں کے قلاش قلاقند کھاتے اور کبڑے کبڈی کھیلتے ہوں گے ۔"

رشید صاحب بعض اوقات جملوں کی الٹ پھیر سے مزاح پیدا کر دیتے ہیں ۔

مثلاً "شیخ صاحب کو گدھوں کا تجربہ نہ تھا اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ گدھوں کو بھی شیخ صاحب کا تجربہ نہ تھا ۔"

رشید احمد صدیقی کے مزاح میں جو چاشنی اور شگفتگی ہے وہ ایک رچے ہوئے مزاح کا پتہ دیتی ہے، مثال کے طور پر ان کی یہ عبارت دیکھئے ۔

"ایک دن میں نے جھنجھلا کر کہا شیخ تم نے ناک میں دم کر دیا ہے نہانے دھونے

کے بعد ذرا دیر تو صاف ستھرے رہا کرد، انہوں نے ڈرتے ڈرتے اپنی ناک پر ہاتھ پھیرا اور اس کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد کچھ اس انداز سے بولے جیسے انہوں نے میرا کہا سنا معاف کر دیا،،

ایک اور موقع پر انہوں نے اس حالت کو بیان کیا ہے جب شیخ نے ایک کڑوا کسیل پھل منہ میں رکھ لیا۔ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

،، شیخ نے پھل توڑ کر منہ میں رکھ لیا نتیجہ یہ ہوا کہ منہ کے اندر آتما پرماتما کی کھینچ تان شروع ہو گئی ،،

انتہائی تکلیف دہ کشمکش کے اظہار کے لئے اس سے بہتر شگفتہ جملہ ممکن نہیں تھا کیونکہ مرتے وقت آتما اور پرماتما کی کھینچ تان شروع ہوتی ہے۔ آتما زمین پر رہنا چاہتی ہے جبکہ پرماتما اسے اپنے پاس بلانا چاہتا ہے، اور اسی لئے نزع کی تکلیف سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن رشید صاحب نے نزع کی تکلیف یا کیفیت طاری ہونے جیسے الفاظ استعمال نہیں کئے۔

رشید احمد صدیقی کے یہاں ظرافت سے زیادہ طنز پایا جاتا ہے، انہوں نے جدید دور کی ذہنی زندگی پر بڑے دلچسپ طنز کئے ہیں۔ انہوں نے ارہر کے کھیت سے لیکر پارلیمنٹ ..... (PARLIAMENT) تک میں رونما ہونے والے واقعات، حالات اور کیفیات پر لکھ کر طنز کئے ہیں، مضامینِ رشید اور خنداں ان کی ایسی ہی تصانیف ہیں جن میں طنز یا تی روح کارفرما ہے، رشید احمد صدیقی نے فیشن پرستوں، ریاکاروں اور قومی لیڈروں اور فلاسفروں و مولویوں کی گمراہی کو طشت از بام کیا ہے۔

رشید صاحب الفاظ کے برجستہ استعمال اور ایک ہی لفظ کو ذرا مختلف انداز سے استعمال کرتے ہیں جس سے اس میں اور ہی لطف پیدا ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر یہ نمونہ دیکھئے،

،، بوڑھے قیامت کے منتظر تھے، نوجوانوں پر قیامت گزر رہی تھی ،،

تھوڑی دیر کے لئے بھول جائیے کہ دنیا میں بیوی یا بے روزگاری بھی کوئی چیز ہے، امید ہے د

بیویاں مجھے معاف کر دیں گی جو بے روزگار ہیں اور وہ بے روزگار بھی جن کے بیویاں نہیں ہیں،،
ایک اور مقام پر کچھ اس طرح لکھتے ہیں۔

"ان کی دھوتی ستر پوشی کا اتنا کام نہیں دیتی جتنا موقع پر ستر کی نمائش اور نمائندگی کرتی ہے،،

"مارواڑی عورتیں تین چیزوں کا نمونہ ہوتی ہیں گھونگھٹ، گہنا اور گندگی،،

رشید صاحب نے تمدنی معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی مسائل پر جو طنز کئے ہیں وہ محض ہنسنے ہنسانے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ ان میں گہری بصیرت ہوتی ہے، مثال کے طور پر

"لڑائی کے زمانے میں جہاں اور بہت سی دشواریاں ہیں وہاں یہ آفت بھی کم نہیں کہ بچے کپڑے پھاڑتے ہیں، عورتیں کپڑے لپیٹتی ہیں اور دھوبی کپڑے چراتے ہیں، دوکاندار قیمتیں بڑھاتے ہیں، اور ہم سب کے دام بھگتتے ہیں،،

رشید صاحب اپنے مسلمان ہونے میں اور مذہب اسلام پر کاربند رہنے کے بارے میں فرماتے ہیں۔ اس میں بھی بڑا گہرا طنز ہے وہ لکھتے ہیں۔

"میں مسلمان پیدا ہوا نہ میری پیدائش میں میرا دخل تھا نہ مسلمان ہونے میں لیکن زندگی بھر مجھے ہر بات میں دخل تھا، یعنی خودکشی بھی کر سکتا تھا اور اسلام سے بھی منحرف ہو سکتا تھا۔ میں نے زندگی اور اسلام دونوں کو ایک ہی بات سمجھا۔ ظاہر میں بھی باطن میں بھی، مجھے اسلام کا پابند رہنے میں بھی مرتے دم تک کبھی کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا، بری بات کو میں نے ہمیشہ برا سمجھا، اور ہر اچھی بات میں اسلام کو معاون پایا، کبھی ایسا بھی محسوس ہوا ہے کہ مسلمان نہ پیدا ہوا ہوتا تو بھی شاید مسلمان ہی رہتا،،

طنز و ظرافت کے بارے میں رشید صاحب کا خیال ہے کہ یہ محض کتابیں پڑھنے اور دوسروں کی نقل کرنے بے وقوف بننے، بندھے ٹکے فقرے کہنے، پینترے بدلنے سے نہیں آتا ظرافت

میں طنز مضمر ہوتی ہے، طنز میں ظرافت کو بھی داخل دیکھنا چاہئے، ان کے نزدیک ظرافت طنز سے مشکل فن ہے۔ ظرافت کیلئے خوش دلی، آرزو اور مسرت درکار ہوتی ہے، طنز میں جوش، رنج، غصہ، اور بیزاری کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

رشید صاحب کی نثر بھی ادبی نثر کا بہترین نمونہ ہے، انہوں نے لیڈروں پر بھی بڑا گہرا طنز کیا ہے، ان کے خیال میں لیڈری ایک بہت بڑا فن بن گئی ہے۔ جس طرح ہندوستان کے امراض کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا، اسی طرح لیڈروں کے اقسام بھی معلوم کرنے مشکل ہیں۔ جس طرح برسات میں کھیرے، ککڑی، پھوٹ اور بھٹے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح خاص خاص فصلوں میں فصلی لیڈر پیدا ہوتے ہیں۔

مجروح کی زبان سے انہوں نے عورتوں کی تین قسمیں بتائی ہیں، ایک تو وہ ہیں جنہوں نے سورج اور آسمان بھی نہیں دیکھے، گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں، فاقہ کرتی ہیں، بچے پالتی ہیں اور چکی پیستی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن در و دیوار کی چکی میں خود پس جاتی ہیں۔ دوسری وہ ہیں جو پان کھاتی ہیں، چھالیا کترتی ہیں، شوہر کو گالیاں دیتی ہیں، اپنے میکے والوں کی پرورش کرتی ہیں۔ تیسری وہ ہیں جو انگریزی بولتی ہیں، ساڑی پہنتی ہیں، سنیما دیکھتی ہیں، شوہران کی خدمت کرتے ہیں، اور یہ قوم کی خدمت کرتی ہیں۔

رشید احمد صدیقی روزمرہ کے واقعات کی بے رنگ یکسانیت میں قوسِ قزاح کی رنگینیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ رشید صاحب کے مضامین میں مقامی رنگ بہت زیادہ ہے اور جو لوگ علی گڑھ کی اقامتی زندگی اور اس کی مخصوص اصطلاحوں سے ناواقف ہیں وہ ان کے طنز کی گہرائی کو پورے طور پر محسوس نہیں کر پاتے۔ رشید صاحب کی سوجھ بوجھ بہت اچھی ہے اور ان کا تخیل اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں سے بھرپور ہے۔

آل احمد سرور نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"، دلچسپ فقروں، دلکش کرداروں، گہری طنز اور

دقیق ظرافت کے علاوہ ان کے یہاں نثر کا ایک منفرد اسلوب بھی ملتا ہے، جس میں اقبال کے اشعار اور ابوالکلام کی عظمت جھلکتی ہے۔"

(ص۹۰ سے آگے)

"ہندوستان نے شریمتی اندرا گاندھی جیسی بیٹی کو جنم دیا ہے جس نے ملک و قوم کی آن بان اور شان کی خاطر اپنی جان کی بازی لگائی اور اپنے خون کی آخری بوند تک قوم اور ملک کی نذر کرتے ہوئے شہید ہو گئی۔"

ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے کہ "شریمتی اندرا گاندھی وہ پہلی عورت ہے جس نے جام شہادت نوش فرمایا۔"

محترمہ اندرا گاندھی اپنی عظیم شہادت سے ہمیشہ کے لئے امر ہو گئیں، لیکن موصوفہ کے ظالم قاتل، ملک کے خود غرض حریص دشمن، شیطان کے پیرو ہمیشہ کے لئے ملعون ہو گئے۔

اندرا گاندھی زندہ باد!

ہندوستان، زندہ باد! پاکستان مردہ باد!!

جب تک سورج چاند رہے گا
اندرا تیرا نام رہے گا

:- تمت :-

# قطرۂ خونِ اندرا

# اندرِ ہندوستان!

از ــــــــــــــ محمد مصباح اللہ

رئیس المتغزلین جگر مرادآبادی مرحوم کا ایک مشہور شعر ہے

جو جن کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر!
جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

اس شعر کی حقیقت اور صداقت کی تصدیق ہندوستان کی مایہ ناز وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے اس قول سے ہوتی ہے جو موصوفہ نے اپنے قتل سے ایک دن قبل ایک بہت بڑے زبردست مجمع کو خطاب کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا تھا:

"اگر میں قوم کی خدمت کرتے ہوئے مر بھی جاؤں تو میرے لئے یہ ایک بڑے فخر کی بات ہوگی، مجھے یقین ہے کہ میرے خون کا ہر قطرہ اس قوم کے فروغ میں کام آئے گا اور اسے مستحکم اور متحرک بنانے میں کارآمد ثابت ہوگا۔"

(شریمتی اندرا گاندھی - ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

جگر مرحوم کے شعر کی روشنی میں موصوفہ کے مذکورۂ بالا قول پر غور کرنے سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جگرؔ نے جس حقیقت کی ترجمانی اپنے اس شعر میں کی ہے، عظیم رہنما شریمتی اندرا گاندھی آنجہانی اپنے قول اور اپنی زندگی کی بیش قیمت قربانی وایثار کے اعتبار سے درجِ بالا شعر کی مکمل تفسیر تھیں۔

اس قول کا ہر ہر لفظ شاہد ہے کہ محترمہ کے اس بیان میں کس قدر خلوص ہے، سچائی ہے، عزم ہے، حوصلہ ہے، ہمت ہے، ملک سے پیار ہے، دیس کے باسیوں سے محبت ہے، اور ملک و قوم کی سچی خدمت اور بے پناہ محنت کا نیک جذبہ مضمر ہے!

یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ موصوفہ کا یہ قول الہامی ہونے میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ موصوفہ کو اپنے مرگ سے آگاہی تھی۔ اور وہ اس بات سے بے خبر نہ تھیں کہ "ملک کے بعض خود غرض دشمن موصوفہ کے خون کے پیاسے ہیں"، چنانچہ محترمہ نے علی الاعلان اس امر کی منادی کر دی "میں اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لئے تیار ہوں"۔ ۳۱/ اکتوبر ۱۹۸۴ء کی صبح کو موصوفہ نے اپنے قول کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا۔ اپنے خون کا ہر ہر قطرہ قوم اور ملک کی نذر کر دیا!

اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی آنجہانی نے قوم اور ملک کی خدمت، فلاح و بہبودی و ترقی کی خاطر اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی، مادرِ وطن ہندوستان کے تحفظ کی خاطر ہر زبردست معرکہ کا مردانہ وار مقابلہ نہایت شجاعت اور تدبر سے کیا لیکن نادان اور ہوس پرست دشمنوں نے آخر کار گولی کا نشانہ بنا دیا۔

ہندوستان کی سیاسی تاریخ عظیم رہبر شریمتی اندرا گاندھی آنجہانی کی عظیم خدمات اور بے نظیر کارہائے نمایاں کو سراہتے ہوئے موصوفہ کے مذکورۂ بالا قول کو جہاں زریں حروف میں قلمبند کرے گی وہاں اس دلخراش جانکاہ حادثۂ قتل کو خون کی سیاہی سے رقم کرے گی، جس کو دیکھ کر آنے والی نسلیں خون کے آنسو روئیں گی، لیکن اس بات پر فخر کریں گی کہ:-

(بقیہ صـــ پر)

# منظومات

نسیمؔ شاہ جہاں پوری

# ذکرِ حبیب

جسے بھی عشقِ محمد نصیب ہوتا ہے
وہ دو جہاں میں بڑا خوش نصیب ہوتا ہے

تصورات کا عالم بڑا عجیب ہوتا ہے
مدینہ دور بھی ہو کر قریب ہوتا ہے

گدائے در کو میسر ہے دولتِ کونین
یہ اور بات بظاہر غریب ہوتا ہے

ملائکہ بھی درود و سلام پڑھتے ہیں
زمیں پہ جب کہیں ذکرِ حبیب ہوتا ہے

گدائی ملتی ہے اُس در کی خوش نصیبوں کو
یہ مرتبہ کہیں سب کو تصیب ہوتا ہے

غمِ فراق میں روتے میں جب بھی طالبِ دید
ہر ایک اشک میں عکسِ حبیب ہوتا ہے

قدم قدم پہ جلاتا ہوں شمعِ یادِ نبی
اندھیرا کفر کا جب بھی مہیب ہوتا ہے

نسیمؔ شافعِ روزِ جزا کی مدحت میں
قلم اٹھانے سے قاصر ادیب ہوتا ہے

مرحومہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی "امن کا مسیحا" کی رحلت پر

# نذرانۂ عقیدت


ایم اے آر، قریشی سوز
ایم اے، ایم بی)


چلتے چلتے رک گیا ہر کاروبارِ زندگی
لوگ تڑپے اڑ گیا رنگِ بہارِ زندگی
آہ و آنسو میں نظر آیا دیارِ زندگی
ہر کسی کا لٹ گیا صبر و قرارِ زندگی

اشک غم تھمتے نہیں دل کو قرار آتا نہیں
اندرا جی جا چکی ہیں اعتبار آتا نہیں

غمزدہ ہے ہر نظر سارے نظارے ہیں اداس
دل میں ہیں بیچینیاں جیون کے دھارے ہیں اداس
دیش رنجیدہ ہے انساں غم کے مارے ہیں اداس
ہر طرف ہم بے سہاروں کے سہارے ہیں اداس

آج اپنا دیس کیا دنیا ہے ڈوبی رنج میں
اندرا جی نے شہادت پائی صفدر گنج میں

بجھ گئی جل کر چتا پلکوں پہ دل کا درد ہے
آج چہرہ ہر کسی کا فرطِ غم سے زرد ہے
دامنِ احساس پر دنیائے غم کی گرد ہے
اشک جاری ہیں ابھی ہونٹوں پہ آہِ سرد ہے

چھا گئے غم کے اندھیرے دھوپ ڈھل کر رہ گئی
اندرا جی کیا گئیں دنیا بدل کے رہ گئی

وقت نے چکر چلایا زندگی جاتی رہی
دشمنی نے سر اٹھایا زندگی جاتی رہی
جسم کو زخمی بنایا زندگی جاتی رہی
موت کا سیلاب آیا زندگی جاتی رہی

آگ جیسا ظلم کا بادل برس کے رہ گیا
پھول سا اک جسم شعلوں میں جھلس کے رہ گیا

ہر بلائے ناگہانی ختم ہو کر رہ گئی
خون کی آخر روانی ختم ہو کر رہ گئی
دھرتی ماتا کی نشانی ختم ہو کر رہ گئی
امنِ عالم کی کہانی ختم ہو کر رہ گئی

سوز کیا سا ہس تھا کیا سلجھا ہوا انداز تھا
اندرا جی پر سبھی کیا ہر کسی کو ناز تھا

ہے یہ زمین اداس تو ہے وہ گگن اداس
سارا جہاں اداس ہے سارا وطن اداس

جب سے تمہارے قتل کی ہم نے خبر سُنی
آنکھیں ہیں اشک بار ہوا ہے یہ من اداس

کیا ہو گیا ہے شانتی اہنسا کا آج خون
ساری فضا اداس ہے اور ہے یوں داس

پھیلا ہوا ہے حدِ نظر تک دھواں دھواں
سورج کی آج ہو گئی ہر اک کرن اُداس

بجلی گری ہے ایسی کہ ہر شے جھلس گئی
ہے آج اپنے دیش کا اِک اِک چمن اُداس

یوں ناگہاں خزاں نے دبوچا بہار کو
سب کو دکھائی دینے لگا یہ چمن اُداس

یوں کون دیگا نور قیادت کی روشنی
یہ پوچھتے ہیں لوگ ہر اک ہے نین اُداس

نور دیوانی

# سارا وطن اُداس

## اندرا گاندھی

اختر شاہجہانپوری

تیرے جانے سے ہوا ویران سارا گلستاں
ہے ہماری بے بسی پر جب یہ ظلم آسماں
کس جگہ ڈھونڈوں تجھے تو کھو گئی ہے اب کہاں
اندرا گاندھی وزیرِ اعظم ہندوستاں

سامراجی طاقتوں کے بڑھ رہے ہیں پھر حصار
ہو نہ جائے قومی یکجہتی کا دامن تار تار
کس طرح منزل پہ اب پہونچے ہمارا کارواں
اندرا گاندھی وزیرِ اعظم ہندوستاں

بھکمری بے روزگاری مفلسی گھٹنے لگی
ساری دنیا میں تیری توقیر جب بڑھنے لگی
سب کی نظروں سے یکایک ہو گئی تو کیوں نہاں
اندرا گاندھی وزیرِ اعظم ہندوستاں

امن عالم کا اُٹھایا تو نے پرچم مرحبا
جنگ کے زخموں پہ رکھا تو نے مرہم مرحبا
کیا خبر جلتے میں کب لے لے یہ ایٹم کا دھواں
اندرا گاندھی وزیرِ اعظم ہندوستاں

دُور درشتی اور پھر پکّا ارادہ چاہیئے
بات تو کرنا ہے کم اور کام زیادہ چاہیئے
یہ ترے اقوالِ زرّیں یاد ہیں اے مہرباں
اندرا گاندھی وزیرِ اعظم ہندوستاں

کون کہتا ہے کہ تیری موت تھی اک فرد کی
سچ تو یہ ہے موت تیری موت ہے اک عہد کی
جانے کن راہوں میں اب بھٹکے ہمارا کارواں
اندرا گاندھی وزیرِ اعظم ہندوستاں

مرحبا صد مرحبا یہ آخری خواہش تری
قطرہ قطرہ خون کا بخشے جہاں کو روشنی
لایا ہے نذرِ عقیدت اختر جادو بیاں
اندرا گاندھی وزیرِ اعظم ہندوستاں

# آہ اندرا گاندھی

از
خواجہ صلاح الدین عشقی فاروقی

آہ کیسی خبر سُنائی ہے — سُنتے ہی آہ لب پہ آئی ہے
دل پہ غم کی گھٹا سی چھائی ہے — جان لیوا غمِ جدائی ہے
جو تھے نگراں اُنہیں کے ہاتھوں سے — اندرا گاندھی نے گولی کھائی ہے
نام اُن کا جُڑا تھا گاندھی سے — گاندھی ہی جیسی موت پائی ہے
مات کھائی نہ تھی کہیں اب تک — موت سے آج مات کھائی ہے
اس جہاں میں ثبات ہے کس کو — لازمی ایک دن جُدائی ہے
ان کا رہنا ابھی ضروری تھا — کیسی بے وقت موت آئی ہے
مسکرائی تھی زندگی کچھ دن — اب قیامت کا رنج لائی ہے
اب نظر آئیگی نہ یہ صورت — دائمی اِن کی یہ جُدائی ہے
ساری دنیا کو غم ہوا اُن کا — آگ ہر دل میں ہی لگائی ہے
میرے دل کی نہ پوچھئے حالت — درد ہے اور انتہائی ہے
آہ لب پہ ہے، درد دل میں ہے — سازِ غم پہ غزل سُنائی ہے
فرض اپنا نبھائیں سب عشقی — سامنے اُن کی رہنمائی ہے

## قطعات

(۱)
اس چمن کی بہار اندرا تھی — اور وطن کا وقار اندرا تھی
جس کے نیچے اماں ملے سب کو — شجر سایہ دار اندرا تھی

(۲)
صاحبِ عز و شان اندرا تھی — ہند کی جسم و جان اندرا تھی
چاہتی تھی اماں ملے سب کو — شانتی کا نشان اندرا تھی

(۳)
جانِ ہر انقلاب اندرا تھی
آپ اپنا جواب اندرا تھی
ہر طرف ہی اندھیرا چھایا ہے
ہند کا آفتاب اندرا تھی

(۴)
صاحبِ آن بان اندرا تھی
سارے بھارت کی شان اندرا تھی
پھول مُرجھا گئے گلستاں کے
اس گلستاں کی جان اندرا تھی

## بنام سہ ماہی نخلستان
۵ ۰ ہجری ۱۴

## دامنِ محب سہ ماہی نخلستان اُردو اکیڈمی جے پور
۸۴ عیسوی ۱۹

# روحِ نخلستان
۸۴ عیسوی ۱۹

## زگلِ وقار رحمانی کوٹوی خادمِ اردو ادب جودھپور
۸۴ عیسوی ۱۹

### وامقِ بھارت رتن
۵ ۰ ہجری ۱۴

جانتا ہے جو ہمالے کا وقار
بھول سکتا ہے وہ بھارت رتن کو؟
جسم کی آواز سنتا ہے بدن
اوڑھ لیتا ہے وہ اندرا من کو

### بابِ شخصیت
۵ ۰ ہجری ۱۴

تو نئے بھارت کی وہ تاریخ ہے
جس میں آتا ہے نظر تیرا وجود
وہ جہاں، فردوس ہے سنسار کا
جسم کا بھی ٹوٹ جاتا ہے جمود

### بابِ تشخیص
۵ ۰ ۱۴

تو بھارت تھی ہمارے واسطے
چاند سورج کی ضیا بیکار ہے
زندگی پاتے ہیں رستوں کے بدن
راہگیروں کا عمد بیمار ہے

### آج شرفِ شخصیت
۵ ۰ ۱۴

بنتِ حوا کے سروں کا تاج تھی
ابنِ آدم کے لئے وہ راج تھی
فخر کرتا ہے سیاست کا جہاں
پورے عالم کے لئے وہ لاج تھی

### عہد رہنمائے عظیم
۵ ۰ ۱۴

تیری ممتا کی زباں راجیو بنا
تیری شکشا کا جہاں راجیو بنا
دیش کے تن پر ضعیفی چھا گئی
قوم کی خاطر جواں راجیو بنا

### دانشِ ضمیر
۵ ۰ ۱۴

جنم لیتی ہے سیاسی کوکھ سے
شکتی دیوی، لکشمی، دُرگا بنی
روپ اُن کا دھار کر جگ کیلئے
ریر گنٹوں کے واسطے اندرا بنی

### دُرِّ اختر
۵ ۰ ۱۴

ہوگئی منسوب تیرے نام سے
قوم کے ہاتھوں میں قسمت کی لکیر
دھوپ کے کھلیان میں محفوظ ہے
بولتا ہے کھیت میں تیرا ضمیر

### شہرِ سرخیل
۵ ۰ ۱۴

میں نے رکھی ہے وفا کی آبرو
"مستند ہے میرا فرمایا ہوا"
میرؔ کے قالب میں اندرا ڈھل گئی
ہوگیا ہموار الجھا یا ہوا

### قتلِ عظمتِ دلی
۸۴ ۶۱۹

قوم کا وہ قتل تھا تیرا نہیں
قتل ہے بھارت کے نخلستان کا
خون سے اُٹھ کر شفق میں جا بسا
تلملاتا جسم ہندوستان کا

### جانِ شناخت

امن کی دیوی تجھے میرا سلام
یاد رکھیں گے سبھی تیرا مقام
تیرے قول و فعل ہی کے ماتحت
صدیوں تک زندہ رہے گا تیرا نام

علہ زعیم الملت

# قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات

## عزت مآب

## محترمہ اندرا گاندھی مرحومہ وزیر اعظم بھارت

# قطعہ

جب نہ آئی راس اندرا کو بھارت کی فضا
چھوڑ کر دنیا کی جھنجھٹ، بس گئیں سورگ میں جا
تاک میں بیٹھے ہوئے تھے دشمنانِ ملک و قوم
وحشت و غارت گری نے آخر ان کو کھا لیا
دیش پر قربان کر کے جاں امر ہو کر رہیں
قطرہ دریا میں ملا، پرماتما میں آتما

یہ مقام اندرا کو ناظم گولیاں کھا کر ملا
ہو کے ہم سب سے "جدا امرت کا ساغر پی لیا"
۶۱۹ ۸۴

ناظم سعیدی

قیاس الفاظ آخر
۶۱۹ ۸۴

"قطرہ قطرہ جسم کا میرے لہو
ملک ہی کی جان ہے" اس بات میں
آخری الفاظ سن کر سوچئے
روحِ نخلستان + ہے اس بات میں
۱۴۸۴ ۵۷۹ ۵۰ ۱۴ ۵۱

تاثرِ قدر
۵۰ ۱۴ ۵۱

قتلِ جمہوریت کی جاں کا ہوا
ملک میں امن اور اماں کا ہوا
اب محافظ ہی بن گئے قاتل
گویا گلشن میں باغباں کا ہوا

تاریخی قطعہ
۵۰ ۱۴ ۵۱

میسر تھی اک ہم کو مقبولیت
۵۰ ۱۴ ۵۱

بظاہر ہے اک قولِ محرومیت
۶۱۹ ۸۴

وفا تھا محافظ کا کردار ہائے
۶۱۹ ۸۴

ہوا لو گو وہ خونِ جمہوریت
۵۰ ۱۴ ۵۱

ندائے فکرِ غم
۵۰ ۱۴ ۵۱

جائے شانِ غم
۵۰ ۱۴ ۵۱

وفا رحمانی کوٹوی

انصار محشر

# ماتم اندرا

ہندوستان کو جس نے جگایا وہ اندرا
دشمن کو جس نے خون رلایا وہ اندرا
بھارت کا جس نے بار اٹھایا وہ اندرا
دشمن کے سر کو جس نے جھکایا وہ اندرا

اپنے محافظوں کا نشانہ وہ بن گئی
کل تھی حقیقت آج فسانہ وہ بن گئی

ہے غم سے اشکبار ہر اک چشم نم کو دیکھو
دل میں اتر گیا ہے جو اس نیش غم کو دیکھو
اپنے محافظوں کے ستم در ستم کو دیکھ
ہم رو رہے ہیں تجھکو ذرا تو بھی ہم کو دیکھ

ہندوستان کی دختر ذی شان تجھے سلام
امن و امان کی روح نگہبان تجھے سلام

تیرا ہی کارنامہ ہے ایٹم کا تجربہ
ہندوستانی ایک خلا میں پہونچ گیا
ہندوستان کو پاؤں پہ تو نے کھڑا کیا
کل تھا جو ہند آج ہے وہ فخر ایشیاء

بھارت کا رتن بن کے رہی تو جہاں رہی
بے تاج تو ہی کشور ہندوستاں رہی

حسن یقین سے دور ہے وہم و گماں سے دور
روٹھی بہار ایسی گئی گلستاں سے دور
خوشیاں ہوئی ہیں چہرۂ ہندوستاں سے دور
رہبر ہے جاں سے دور غم کارواں سے دور

اے قوم تیری شومیٔ قسمت کو کیا کہوں
اب سرنگوں ہے ملک کی عظمت کو کیا کہوں

اہلِ وطن کے واسطے رہتی تھی بے قرار
سب کچھ نثار کر کے ہوئی تو بھی خود نثار
ہر لب پہ آہ دل میں کسک آنکھ اشکبار
سارا جہاں ہے آج ترے غم میں سوگوار

اوروں سے جو ہوا نہیں وہ کام کر گئی
اپنے وطن کے واسطے آخر تو مر گئی

اے رازدارِ عظمت انساں کہاں ہے تو
فطرت شناس گردشِ دوراں کہاں ہے تو
اے ایشیا کی صبح بہاراں کہاں ہے تو
ہندوستان کی دخترِ ذی شاں کہاں ہے تو

سونی ہے آج محفل دنیا ترے بغیر
مفلوج ہو گئی ہے تمنا ترے بغیر

افسوس تیرے مرنے کا سارے جہاں کو ہے
اس سرزمین کو ہی نہیں آسماں کو ہے
پھولوں کو ہے شجر کو ہے اور گلستاں کو ہے
جو چل رہا تھا ساتھ تیرے کارواں کو ہے

منزل تھی سامنے مگر کچھ گام اور تھے
اے میرِ کارواں ابھی کچھ کام اور تھے

دنیا ہے تیرے غم سے پریشاں کہاں ہے تو
جانِ بہار روحِ گلستاں کہاں ہے تو
ہندوستان کی نیرِ تاباں کہاں ہے تو
کچھ تو بتا اے نازشِ دوراں کہاں ہے تو

منجدھار میں تو چھوڑ کے نیّا چلی گئی
کیوں کشتیٔ وطن کی کھویّا چلی گئی

ہندوستان کی ساری فضا سوگوار ہے
ہر فرد بستی چھوٹا بڑا سوگوار ہے
ہر خوش نوا و نغمہ سرا سوگوار ہے
بادِ نسیم بادِ صبا سوگوار ہے

افرادِ قوم کام جو لیتے دماغ سے
اس گھر کو آگ لگتی نہ گھر کے چراغ سے

---

# اُردو

کی بقا اور ترقی کے لئے خود

## اُردو

والوں کو اپنے اپنے مقام پر انفرادی و اجتماعی

دونوں طرح

سچی لگن ، مستقل مزاجی ، اور ، ہوش مندی

سے کام کرنا ہوگا۔

ستار جے پوری

# رہنمائے وطن

## آنجہانی اندرا گاندھی کو منظوم خراجِ عقیدت

کس قیامت کی یہ اک سحر آئی ہے
دیکھ کر جس کو ہر آنکھ بھر آئی ہے
چھا گئی ہیں ہر اک سمت تاریکیاں
دل شکستہ ہیں عالم میں پیر و جواں
ایک ماتم سا ہر سمت ہونے لگا
جس کو دیکھو وہ اندرا کو رونے لگا

سارے عالم میں محشر بپا ہو گیا
ہائے کیا ہو گیا ہائے کیا ہو گیا

روحِ انسانیت ہند کی رہنما
قوم کی ترجمان ملک کی ناخدا
ایک انمول گوہر چمکتا ہوا
دیپ انسانیت کا دمکتا ہوا
جامِ مہر و وفا کا چھلکتا ہوا
دورِ آزادیٔ ہند تکتا ہوا

چلدیا یک بیک رہنمائے وطن
چلدیا آج پھولوں کا اوڑھے کفن

لالہ و گل سے شعلے نکلنے لگے
دل عنادل کے سینوں میں جلنے لگے
یہ اچانک فضا کیا سے کیا ہو گئی
زندگی موت کی گود میں سو گئی
رونقِ ایشیاء تاجدارِ زمیں
جس کا ثانی زمانے میں کوئی نہیں

چلدیا چھوڑ کر آج گنگ و جمن
روئے گی عمر بھر جس کو خاک وطن

نعرۂ امن ہر سُو لگاتی ہوئی
سب کو درسِ اخوّت پڑھاتی ہوئی
ایک مرکز پہ دنیا کو لاتی ہوئی
یادِ صرصر میں شمعیں جلاتی ہوئی
ٹھوکروں سے پہاڑوں کو ڈھاتی ہوئی
خارزاروں کو گلشن بناتی ہوئی

آج اپنے وطن پر فنا ہوگئی
ہائے اندرا ہماری جدا ہوگئی

دشمنوں کو گلے سے لگاتی ہوئی
نفرتوں کو دلوں سے مٹاتی ہوئی
راہ بھٹکے ہوؤں کو دکھاتی ہوئی
گیت امن و محبت کے گاتی ہوئی
تلخ لمحوں میں بھی مسکراتی ہوئی
ہند کو رشکِ جنت بناتی ہوئی

جانے کیا دل میں آئی کہ چپ ہوگئی
دھرتی ماتا کی آغوش میں سو گئی

# غزل

قضاؔ جوکالوی

اِس بستی میں صحراؤں کا گھر دیکھ رہا ہوں
ویرانیاں تا حدِّ نظر دیکھ رہا ہوں

کیا دیکھ رہا ہوں میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں
لپٹا ہوا شعلوں میں نگر دیکھ رہا ہوں

جو لوگ سِکھاتے تھے ہمیں رسمِ محبّت
آج اُن کے فریب اور مکر دیکھ رہا ہوں

ہر کونے میں بستی کے ہوا کرتی ہے سازش
جھکتا ہوا تہذیب کا سر دیکھ رہا ہوں

ناپاک کئے کِس نے یہاں مسجد و مندر
انسان میں شیطان کا گھر دیکھ رہا ہوں

ہے کون یہاں دِل سے جو نفرت کو مٹا دے
کِس دل میں ہے اللہ کا ڈر دیکھ رہا ہوں

تھی آگ جو ہمسائے کے گھر میں تھی بسنتر[۱]
گھر اپنے میں اب آگ کا ڈر دیکھ رہا ہوں

بخشا ہے تمہیں تاج فقط ظلِ ہما نے
کیا بدلی ہوئی تیری نظر دیکھ رہا ہوں

کیا آج کی تہذیب ہے یہ آج کا فیشن
سوچا نہ کبھی میں نے مگر دیکھ رہا ہوں

لٹ جانے کا غم کس کو مگر دیکھ رہا ہوں
میں راہ میں راہزن کا ہنر دیکھ رہا ہوں

کچھ ایسی چمک بخشی ملمع کو جہاں نے
بے نور یہاں شمس و قمر دیکھ رہا ہوں

جس طور فضا چاہو غزل کہتے رہو تم
میں آج ترے عیب و ہنر دیکھ رہا ہوں

---

۱ بسنتر دیوتا (آگ)

# اعتماد

عظیمؔ امروہوی

کس نے یہ آفتاب قتل کیا
کس نے یہ ماہتاب قتل کیا
کس کے غم میں اداس ہے دنیا
کس نے رنگیں گلاب قتل کیا

جس نے آنکھوں کو اک کمی بخشی
جس نے دنیا کو روشنی بخشی
اس کے غم میں اداس ہیں چہرے
جس نے غیروں کو بھی ہنسی بخشی

---

کس نے پھیلائی چار سُو ظلمت
کس نے ہر دل سے چھین لی راحت
کس نے گل کی یہ شمعِ راہ گذر
کس نے لُوٹی یہ دیش کی دولت

کس قدر بیقرار ہے دنیا
ہم تن سوگوار ہے دنیا
ایک پل کا نہیں بھروسہ کچھ
کتنی ناپائیدار ہے دنیا

---

کس نے غمگیں کیا وطن یارو!
کس نے لوٹا ہے یہ چمن یارو!
آج بھارت کے چپے چپے سے
کس نے چھینا ہے بانکپن یارو!

کیوں اچانک یہ اک پرندے نے
قفسِ عنصری کو توڑ دیا
اُس کا دشمن تھا کون بتلاؤ
اُس کا دشمن تھا اعتماد اُس کا

---

# نظم بنتِ نہرو

بیتاؔل رامپوری جودھپوری

وہ جانِ وطن ! ہائے وہ نہرو کی نشانی | میدانِ سیاست میں جو رکھتی نہ تھی ثانی
راس آیا نہ افسوس اُسے عالمِ فانی | وہ جس نے لکھی خون سے اِک یُگ کی کہانی
اِک داغ جواں بیٹے کا سینہ میں چھپائے
تنظیم وطن میں رہی آنسو نہ بہائے

جلتی رہی جلتی ہی رہی امن کی دیوی | حالات سے لڑتی ہی رہی امن کی دیوی
اِک شمع تھی جلتی ہی رہی امن کی دیوی | افسوس پگھلتی ہی رہی امن کی دیوی
ہم فرقہ پرستی سے کبھی باز نہ آئے
سو قتل کئے ایسے کہ آواز نہ آئے

اس عمر بھی اُس کی عجب آن بان تھی | پیری برائے نام تھی ہمت جوان تھی
محسوس آج ہوتا ہے گویا جوان تھی | جمہوریت کی جان تھی عورت مہان تھی
شمع رہِ وفا کو عدو نے بجھا دیا
جمہوریت کا یعنی جنازہ اُٹھا دیا

دامانِ صبر و ضبط ہر اک شخص نے چھوڑا | نانک کے اُصولوں کو بڑی شان سے توڑا
اسلام سے منہ موڑ لیا رام سے موڑا | قانون کی گردن کو بُری طرح مروڑا
انسانیت کے نام کو بدنام کر دیا
اربوں روپے کے مال کو نیلام کر دیا

یارب بلندیوں پہ ترنگا نشاں رہے | قائم ہمارے ملک میں امن و اماں رہے
محفوظ ہر بلا سے یہ ہندوستاں رہے | انسان کے بن کے دیش میں ہر نوجواں رہے

ہر بھارتی جہان میں عالی مقام ہو
یوں سربلند ہند کا دنیا میں نام ہو

---

## غزل

### گوہر امروہوی

زندگی کے رستے میں حدّ امتحاں نکلی
میری راہ بھی دیکھو کس طرح نکلی
میرا گھر امروہہ حاملِ زباں ہوں میں!
میر کی زباں یارو میری زباں نکلی
بزمِ آفرینش کو ہر طرح سجانا تھا
جب ذرا شفق ڈوبی شمعِ کہکشاں نکلی
میری آہ کو لینے آئے صاحبِ جنت
میری آہِ شب گیری فخرِ آسماں نکلی
میں تو یہ سمجھتا تھا صاف چھوٹ جاؤں گا
راہِ منزلِ ہستی میرا امتحاں نکلی
ان کے بات کرنے کا کچھ عجب طریقہ تھا
صرف میری بربادی زیبِ داستاں نکلی

بدنصیب خود ہی تھے چُن سکے نہ ہم گوہر
جو بھی موج ادھر آئی لے کے سیپیاں نکلی

# حُسنِ نظر

**نوٹ**

اس عنوان کے تحت قارئین نخلستان کے خطوط یا اُنکے اقتباسات ہر شمارہ میں ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔ لیکن قارئین کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس میں کچھ ایسے خطوط بھی شامل کر لئے گئے ہیں جو گذشتہ شمارہ میں تاخیر سے موصول ہونے کی وجہ سے یا جگہ نہ ہونے کی وجہ سے شامل نہیں کئے جا سکے تھے۔

ادارہ

محترمی زیدی صاحب ! سلام مسنون

آپ کا جریدہ نخلستان جنوری تا جون ۱۹۸۷ء نظر نواز ہوا۔ سب سے پہلی بات جس نے دل و دماغ کو متاثر کیا یہ ہے کہ رسالہ سہ ماہی شش ماہی بنکر آیا ہے۔ وجہ تاخیر و مجبوری کا اظہار بھی اپنی جگہ سو فیصدی صحیح ہے۔ مگر اصول اپنی جگہ اصول ہے، رسالہ چاہے مختصر ہی ہو وقت پر شائع ہونا چاہیئے۔ خدا آپ کی مشکلات میں آسانی پیدا کرے اور رفیق کار آپ کے دل سے معین بنیں۔

پروفیسر ڈاکٹر جناب جگن ناتھ پرشاد کا مقالہ اپنے خاندانی ترکہ و ورثہ کا حامل ہے آپ کے بزرگوں نے علم و ادب کی ہمیشہ خدمت کی ہے۔ موصوف کا فارسی علم و ادب پر کس قدر عبور ہے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ موصوف نے جس ڈھنگ اور طور و طریق سے روسی طلباء کو سمجھایا ہے یہ انہیں کا حصّہ تھا۔ اور روسی طلبا و طالبات کا فارسی ادب سے محبت و شعور شغف اور دلچسپی سے بھی بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ دوسری طرف اپنے ملک کے طلباؑ و طالبات کی فارسی سے بیزاری عدم توجہی سے صدمہ بھی ہوا۔ خدا کرے کہ یہاں طلباؑ و طالبات اس بے بہا علم کی طرف متوجہ ہوں۔

اسی پرچے میں جناب لچھمی نارائن سری واستو سخا پر مقالہ دیکھ کر واقعی دلی مسرت حاصل ہوئی۔ ورنہ جے پور والے جنہوں نے اُن کو سُنا ہے بالکل ہی بھول بیٹھے تھے، نئی نسل والوں کو اُن کی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کا علم ہی نہیں ہے۔ میں نے سخا صاحب آنجہانی کو بارہا سُنا ہے، وہ نعت بہت ہی والہانہ انداز میں پڑھتے تھے اور آنکھوں سے موتیوں کی مالا نچھاور کرتے تھے۔ اُن کی سچی و دلی محبت کی تائید اُن کے اشعار کر رہے ہیں۔ اُن کے صاحبزادے نے اگر اُن کا مجموعہ نعت طبع نہیں کرایا ہے تو اُردو اکیڈمی کو یہ نیک کام انجام دینا چاہیئے۔

حضرت قبلہ مولانا منظور احمد صاحب کوثرؔ کا مقالہ بھی بہت ضروری تھا مگر اسی مقالے میں پورے طور پر اُن کے حالات زندگی اور شاعری پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ قبلہ مرحوم کے حالات فراہم کرکے مکمل تبصرہ کیا جائے، میں

انشاءاللہ اس خدمت کو حضرت عبدالرحمٰن صاحب پارسا کوثری، جناب محمد یحییٰ منظر کوثری۔ حسین احمد صاحب حسین کوثری سے حالات فراہم کرکے بہت جلد مقالہ پیش کرونگا۔

عزیزم مدبر علی زیدی سلمہٗ کا مقالہ صحیح تاثرات کا حامل ہے۔ ماشاءاللہ اچھے انداز میں نئی نظم کا تجزیہ کیا گیا ہے، یہ حقیقت ہے کہ نئی نظم میں کوئی پابندی قواعد نہ ہونے کی وجہ میں کسی محنت وکوشش کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ایک مصرع بڑی بحر میں دوسرا دو لفظوں میں کسی ربط کی بھی ضرورت نہیں۔ جس طرح چاہا اُلٹا سیدھا لکھدیا۔ خالقانِ نئی نظم اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔

حصۂ نظم ماشاءاللہ اچھا ہے۔ اور اسی میں شاعر صاحبان کو کوئی دقت ہی نہیں ہوتی جیسی چاہی غزل، نظم بھیجدی۔ اس سلسلے میں میں اہل قلم مقالہ نگار حضرات سے گذارش کرونگا کہ وہ جریدہ نخلستان کو زندہ رکھنے، پروان چڑھانے کے لئے توجہ فرمائیں۔

(۲) حصۂ نظم میں جناب ستار صاحب سلمہٗ کا جہاں عمدہ الوث بھرے کلام نے محظوظ کیا وہیں ایک صاحب جناب فضا صاحب نے دل میں خلش پیدا کی مگر ان کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے ان حضرت کا پتہ ادارہ نخلستان سے معلوم کرنے کا خواہشمند ہوں تاکہ میں براہ راست اُن سے بات کروں کہ جناب کونسی اُردو کی خدمت ہے کہ اُوٹ پٹانگ قافیہ گھسیٹے جائیں، کٹھن اور تپن قافیہ جہاں محلِ نظر میں۔ شعر ۲ میں مصرع ۲ بھی قرار ہوگیا ہے، دوسری غزل میں بات اور رات کے قافیہ میں ساتھ اور ہاتھ کا قافیہ لکھنے کی کیا تک ہے۔ ادارہ کا فرض ہے کہ مجھے ان کا پتہ لکھے تاکہ براہ راست بات ہوجائے اور نخلستان کے اوراق اس میں ضائع نہ ہوں۔

پروفیسر فراقؔ گورکھپوری پر پہلے بھی کچھ مقالے نخلستان میں نظر سے گذرے ہیں، ماشاءاللہ آپ کا مقالہ بھی خوب ہے۔ مگر زیدی صاحب کیا چلاہٹیں، رسماہٹیں، اداہٹیں، شفقتان، وغیرہ وغیرہ قافیہ فراق صاحب جیسے مسلمہ مستند اور بڑے شاعر کے لئے مناسب ہیں۔ اور کیا

اُردو کے مزاج سے میل کھاتے ہیں اور ان الفاظ میں برمحل بیساختگی کا کونسا موقع ہے اور کیا یہ کانوں کو بھلے معلوم ہوتے ہیں مگر اب تو وہ نہیں رہے ہیں اس لئے شاعر صاحبان جدید مع کثرت قافیہ لکھنے میں احتیاط برتیں گے۔

آخر میں کاتب صاحب رسالہ نخلستان سے التجا ہے کہ وہ لکھنے کے بعد نظر ثانی فرمائیں تو کرم کریں گے تاکہ سامعین و مقالہ نگار و شاعر صاحبان کو کوفت نہ ہو۔

خواجہ صلاح الدین عشقی فاروقی

محترم ڈاکٹر زیدی صاحب السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

طویل انتظار کے بعد نخلستان کا شمارہ نمبر جنوری تا مارچ / اپریل تا جون ۱۹۸۷ء موصول ہوا شکریہ۔ مدت انتظار کی پرواہ نہیں، دیر آید درست آید، اس کے مطالعہ کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جناب نے گویا گہوارۂ ادب جو مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے تھے اُن کو ایک گلدستۂ ادب کو نخلستان کے صحرا میں سجا کر اہل ذوق کی تشنگی کو رفع کرنے کا عزم مستحکم کیا ہے وہ قابل داد ہے اور جب سے اکیڈمی آنجناب کے زیر اہتمام آئی ہے راجستھان میں اردو خدام اردو ادب کی آپ نے فراخ دلی سے حوصلہ افزائی فرمائی ہے جس کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ راجستھان میں اردو اور اردو ادب ترقی کے بالاتر مقام کو حاصل کرنے میں پوری طرح کوشاں ہے یہ آپ ہی کا نتیجۂ فکر ہے۔

امید ہے جناب کی ذات گرامی سے کہ اُردو زبان کو فروغ دیکر ترقی کی بلند سطح پر پہونچا کر افتخار حاصل کریں گے۔ اب میں اس شعر کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

ہے میری روح رواں ہندی و اُردو دونوں
میری ہر ایک غزل گنگ و جمن ہوتی ہے

خاکسار:۔ عمر دین خاموش صبا

محترم زیدی صاحب۔ تسلیمات!

نخلستان جنوری تا جون سنہ ۸۴ء کا شمارہ آئینۂ نگاہ ہوا۔ گوشۂ نگراں کے تحت جہاں آپ نے نثری تخلیقات کے عدم تعاون کی شکایت کی ہے وہاں آپ نے راجستھان اردو اکیڈیمی کی مکمل چھ ماہ کی ادبی اور ثقافتی اور معلوماتی سرگرمیوں سے قارئینِ نخلستان کو روشناس کرایا ہے۔ آپ نے راجستھان اردو اکاڈمی کی سرگرمیوں سے جس طرح روشناس کرایا ہے وہ لائق تحسین ہیں۔ اور آپ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

آپ کی اطلاع کے لئے تحریر ہے کہ میرا مکمل تضمینات کا مجموعہ "عکس در عکس" فخرالدین علی احمد کمیٹی کے جزوی تعاون سے اکتوبر، نومبر ۸۴ء تک منظرِ عام پر آرہا ہے، جس میں ہند و پاک کے چالیس شعراء کے کلام کو تضمین کا جامہ پہنایا ہے۔ اور جسے تقریباً تینتیس ۳۳ مشہور و معروف ناقدین ادباء و شعراء نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ اور اپنی گرانقدر آراء سے بھی نوازا ہے۔

غزل کی اشاعت کے لئے انتہائی مشکور ہوں۔ لیکن نام میں تھوڑا سا فرق آگیا ہے۔ آئندہ شمارے میں تصحیح فرمائیں۔ نوازش ہوگی۔ نخلستان میں ترتیب اور صفحہ نمبر ۱۰۸ پر میرا نام آپ نے شاہد ساگر لکھا ہے۔ جبکہ صحیح نام شاہد ساگری ہے۔ بقیہ حالات قابلِ شکر ہیں۔

خیر اندیش ......

شاہد ساگری

گرامی قدر محمد علی زیدی صاحب ! خلوص وعقیدت ۔

نخلستان کا مشترکہ معیاری شمارہ جنوری تا جون ۱۹۸۴ء تاخیر کے ساتھ ۔ لیکن " دیر آید درست آید " کے مصداق موصول ہوا ۔ جو روایتی اسلوب اور داخلی رجحانات سے گلابی شہر کی دوشیزہ کے مترادف ہے !

آپ تو بیشک شائقینِ ادب کو قدیم و جدید ادبا و شعراء کے فنی پرتو اور شخصیت سے بخوبی روشناس کرا رہے ہیں ۔ جن کی اُردو ادب میں ایک منفرد مقام ہے اور اُن کا فنی نقطۂ نظر ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے ۔ تمام غزلیں عصری حسیت کا خوبصورت امتزاج اور اسلوب لئے ہوئے ہیں !

مجھے بیحد مسرت ہوئی اور فخر بھی کہ اُردو کے اِن بدخواہوں کے دور میں بھی آپ جیسی جے پور میں کچھ عظیم شخصیتیں ہیں جو سبھی مشکلات اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اُردو کی بقا کے لئے شب و روز منہمک و مصروف رہتی ہیں ۔ " گوشۂ نگراں " سے آپ کی علمیت ، ادبیت ، ذہنی اختراع اور شعوری جذبات کا ثبوت ملتا ہے ۔ آپ اپنے وقت اور حالات کے آپ ترجمان ہیں ۔ آپ کی وضعداری تحفظِ وقارِ فن کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں ۔ غریب بدایونی کا فکر و فن قدیم و جدید ادب کا احاطہ کرتا ہے ۔ پارسا کوثری جے پوری کی غزلوں کے یہ اشعار دل کو چھو گئے ؎

وہ لوگ جن کو ملے ہیں قدم قدم پہ فریب
ترے سلوکِ وفا سے بھی ڈر گئے ہونگے

پھر یہ شعر ؎ ذکر پر اُن کے اب ہوتی ہے کسک سی دل میں
شیشۂ دل میں کوئی بال پڑا ہو جیسے

پرستارانِ راجستھان اردو اکیڈمی کو دلی مبارکباد ! مخلص :۔ جبّار غنی رانچوی (بہار)

بھائی صاحب ! تسلیم وعقیدت

"نخلستان" ملا پسند آیا۔ گوشۂ نگراں میں نے ہمارے اندر ایک نیا احساس پیدا کر دیا سید مدبر علی زیدی کا مقالہ "نئی نظم کا فکری وفنی تجزیہ" پڑھا۔ اس میں شکیل بدایونی، غریب بدایونی، حفیظ بنارسی، نیلوفر ناہید، موہن پرکم، جاں نثار اختر، سیدہ شان معراج ہمینا جوگن، صلاح الدین پرویز، حسن کمال، کرشن موہن، فراق گورکھپوری، حسرت موہانی، سعادت نظیر، وغیرہ کا بھی ذکر ہونا چاہیئے تھا چونکہ لوگ انھیں "آل راؤنڈر" کہتے ہیں۔ مخمور جالی سنبھلی کا تبصرہ پڑھا، اچھا ہے۔ جبار غنی رانچوی کی غزل ایک خوشگوار ماحول کا آئینہ دار ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے مقالہ میں ایک نئی وسعت در فعت پیدا کی ہے۔ پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے سخا کی نعت گوئی کی دل کھول کر ستائش کی ہے، بے شک لکشمی نراین سری واستو ایک اچھے نعت گو اور حضرت محمدؐ کے سچے عاشق تھے"۔ ڈاکٹر محمد علی زیدی کا فراق کی غزل گوئی کا اخلاق افروز جائزہ شمع افروز کہلانے کا مستحق ہے، ڈاکٹر روشن اختر کاظمی نے احسان بن دانش کی جو سرگذشت پیش کی ہے وہ ہمارے خاصے استفادے کی چیز ہے۔ محمد خالد عابدی نے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سے مختصر لیکن مؤثر انٹرویو لیا ہے۔ مولانا کوثر سندیلوی کو میں نہیں جانتا تھا، جناب تو سلسلۂ غالب کے ایک باکمال شاعر ثابت ہوئے۔ اسلام اشرف کو دعائے خلوص وعقیدت !! لگتا ہے اسلام اشرف صاحب اسلام عشرت کے بھائی ہیں۔ ڈاکٹر رتن چند آتر کو اچھے انشائیہ کے لئے مبارکباد، اختر شاہجہانپوری کی نعت اور غزل دونوں قابل تعریف ہیں۔ احتشام اختر کا تجربہ نیا ہے، فریاد آذر کا نظریہ انوکھا ہے فضا کے یہاں غزل کی ایک خوشگوار فضا ہے۔ سوز باندوی کو پڑھنے سے میر سوز کا خیال آتا ہے، جام ٹونکی نئی فکر لیکر آئے ہیں، پارسا کوثری کے خیال کی پاکیزگی سے متاثر ہوا۔ مضطر صدیقی کو کون نہیں جانتا۔ شاہد ساگری نئے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ ستار جے پوری کا فن اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر اظہار مسرت نئی غزل میں پرانی غزل پیش کر رہے ہیں "حسن نظر" کے تحت صابر صدیقی کی اردو دوستی

پسند آئی ۔

آپ کی خدمات کا کسے اعتراف نہیں۔ آپ وہ نمایاں کام انجام دے رہے ہیں جو بڑی مشکل سے کسی سے ہوسکتے ہیں ۔ آپ کے اندر محبت، وفا اور قربانی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ۔

جزاک اللہ

آپ کا :- غریبؔ بدایونی

راؤرکیلا (اڑیسہ)

لائق احترام جناب محترم ڈاکٹر زیدی صاحب !

سلام و رحمت

امید کہ مزاج بخیر ہوگا، سب سے پہلے نئے سال کی پرخلوص مبارکباد ۔

نخلستان کا خریدار ہو جانے پر پہلا شمارہ ۳ جولائی تا ستمبر ۸۴ء مع رسید خریداری نظر نواز ہوا ۔ بہت بہت شکریہ ۔ میں اس کا مطالعہ شروع سے کر رہا ہوں ۔ آپ کا مضمون "فراق کی غزل گوئی ، ایک جائزہ" پڑھ لیا ہے بخدا فراق صاحب کی غزل گوئی پر آپ کا جائزہ دیانتداری پر مبنی ہے ۔ آپ کی اس رائے سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ

"فراقؔ اہل دل تھے ، اہل عشق تھے اور انہوں نے ایسی من کی جوت جگائی تھی کہ جس سے حسن و جمال کی شعاعیں ہی نہیں نکلیں بلکہ حیات و کائنات کے رموز بھی آشکارا ہوئے ۔ ان کے جذبے کا سفر خارجیت سے داخلیت کی طرف ہے"

آپ کا مخلص

نسیم شاہجہانپوری

ڈاکٹر سید محمد علی زیدؔی صاحب ، سلام و خلوص فراواں !

"نخلستان" کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا ۔ بے ساختہ چوم لیا ۔ آہ ! ہماری عظیم رہنما اندرا گاندھی کا خون سارے ہندوستان اور سارے انسانوں کے ارمانوں کا خون ہے، لاکھوں کروڑوں نفوس

میں اِکّا دُکّا کوئی ہستی پیدا ہوتی ہے، وہ بھی آسمان و زمین کی ہزاروں گردشوں کے بعد!
شہنشاہِ سخن میر محمد تقی میؔر نے اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اور علامہ ڈاکٹر سید محمد اقباؔل کی ژرف بیں نگاہ بھی اسی حقیقت کو براگندہ نقاب کرتی ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

گوشۂ نگراں سے اہم سخن اور خاص فن نمایاں ہوا۔ پروفیسر عنوانؔ چشتی نے اُردو شاعری میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے دلکش نقوش ابھارے ہیں، ان کو اپنے مقالات میں اس قسم کے اشعار بھی قلمبند کرنے چاہئیں، ؎

رکھوالا ہر اک شعر غزل کا ہو جائے
ہر شاعر ہند آج ہمالہ ہو جائے
جنوں پہ تنقید کرنیوالے خرد کی تنقیص کرنہ بیٹھیں
سنبھل سنبھل کر نظر اُٹھائیں سوال ہے غم کی زندگی کا

"قومی یکجہتی اور نظیر اکبرآبادی" کے تحت نثار اعظمی کا مضمون متاثر کن ہے۔ بے شک وہ اردو کے پہلے عوامی شاعر تھے، ڈاکٹر عبید الرحمٰن ہاشمی کا مقالہ "قومی یکجہتی اور اقبال" پسند آیا۔ ڈاکٹر محمد علی زیدی کا "فراق کی غزل گوئی کا ایک جائزہ" پڑھا۔ آپ تشریح، توضیح، تعبیر، تفسیر، معنی اور مفہوم سے صحیح طور پر واقف فرماتے ہیں۔ عظیم امروہوی نے شمالی ہند کے پہلے اردو مرثیہ نگار میر سید اسمٰعیل" پر قلم اٹھا کر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے، ڈاکٹر سید مدبر علی زیدی نے جدیدیت، سائنسی عقلیت اور اشتراکی حقیقت نگاری کو نہایت سحر کارانہ پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ محمد خالد عابدی نے رام لال سے اپنے ایک انٹرویو کے ذریعے اچھے سوالات و جوابات سے ہمیں نوازا ہے۔

شہناز قریشی کا افسانہ "قربت اور فاصلے"، اس رسالے کے مطالعہ کی جان اور ایمان ہے۔ شاہد ساگری کی نعت شریف بڑی آسان فہم، زبان میں ہے، متاثر کرتی ہے، صلاح الدین عشقی کا سلام خوب ہے، نجمہ عزیز مراد آبادی نے یک جہتی کا گلدستہ پیش کیا ہے، انہیں بھی اخوت و یگانگت کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مخمور جالی سنبھلی فکر کو فن کے خالص لہجے میں ادا کرتے ہیں، مگر جگر مراد آبادی کی طرح اکثر زیادہ اشعار کی پیداوار کی دھن میں کبھی کبھی فصاحت، بلاغت، سلاست، تسلسل اور صبر و استقلال کا دامن چھوڑ بیٹھے ہیں، کامران نجمی کامیاب شاعر ہیں۔ جبار غنی رانچوی کی غزل کا مقطع لاجواب ہے، عظیم امروہوی اچھے سخنور ہیں لیکن وہ مخالف ردیفین اور قوانین قوانی پر دھیان نہیں دیتے۔ وارث احسنی کی نظم قومی یکجہتی پر ہے اور پُر اثر ہے۔ ایم۔ اے انصاری کو پڑھ کر پاکستان میں مقیم میرے ایک مخلص دوست کی یاد تازہ ہو گئی۔ تسنیم کاظمی کی غزل میں کچھ مخفی نقطے نمایاں ہو گئے ہیں۔ غریب بدایونی شعر و ادب میں ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کشور سلطانہ نے اپنی غزل کو اوقی بنانے کی سعی کی ہے۔ مگر اس میں بھی ایک رمق باقی ہے۔ حبیب الرحمٰن نیازی اور محمد علی نصیر نیازی کے فکر و فن یکساں اور نمایاں و تاباں ہیں "حسنِ نظر" کے تحت غریب بدایونی، جبار غنی رانچوی اور عباس فرحت کے خطوط لائقِ تحسین اور قابلِ غور ہیں۔

آپ کا خیر اندیش

جاوید اشرف فیض راؤرکیلا (اڑیسہ)

محترمی زیدی صاحب ! زاد لطفہٗ !

اس مرتبہ جریدہ نخلستان بمقابلہ سابق تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر کے نظر نواز ہوا۔ واقعی دلی خوشی ہوئی۔ اس کے لئے آپ قابل مبارکباد ہیں۔ کہ ایسے نامساعد حالات میں بہت آب و تاب کے ساتھ اس کام کو انجام دیا۔

سارے ہی مقالے ماشاءاللہ بہت خوب اور بصیرت افروز علم و ادب سے بھرپور ہیں

کاوش سے معلوماتی ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جہاں مقالہ نگار صاحبان قابل تحسین ہیں وہیں آپ قابل مبارکباد ہیں کہ ان سے مقالے حاصل کئے۔ ہر مقالے نے دل و دماغ کو روشن کر کے راحت پہنچائی ہے۔

حصۂ نظم بھی خوب ہے۔ شعر کی تعریف کے لئے کوئی خاص معیار مقصود نہیں ہے ہر شخص اپنے حالات کے مطابق جو شعر ہو اسے پسند کرتا ہے، جس شخص کے حالات پر جو شعر چسپاں ہو جائے اُسکو وہی اچھا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ وہ اُس کے دل و دماغ سے ٹکراتا ہے، مجموعی طور پر ہر غزل و نظم اپنی جگہ قابل تعریف ہیں۔

میں نے پہلے خط میں بھی گذارش کی تھی کہ کاتب صاحب نظر ثانی فرمالیا کریں۔ آپ نے بھی گوشۂ نگراں میں معذرت چاہی ہے مگر کاتب صاحب نے اس مرتبہ بھی کرم فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔ (۱) میرے سلام کے شعر ۵ کا پہلا مصرع اس طرح تھا (دل یار ہا ہے تازہ بہاروں سے زندگی) جس کو اس طرح لکھا ہے (دل یاد عمر، تازہ بہاروں سے زندگی) اس مصرع کو کیا سے کیا بنادیا ہے (۲) اسی سلام کے شعر ۹ کے پہلے مصرع کے آخری لفظ (ہے) کو (سے) سے تبدیل کر کے اس شعر کے مفہوم و مقصد کو برباد کیا ہے۔ (۳) یک جہتی گلدستہ میں شعر ۵ کے دوسرے مصرع، قدرت کا ہے یہ یہی کرشمہ، اس میں لفظ (یہ) کو ہضم کر گئے ہیں۔ نظم نگار محترمہ نے یہی دیس کو دیش تحریر فرمایا ہے (۴) کامران نجمی صاحب کے شعر ۶ کے دوسرے مصرع میں "کسی کی نظر نہ جائے" کے بجائے، کس کی نظر نہ جائے لکھ کر جہاں مفہوم کو ہی نہیں بدلا ہے بحر میں بھی فرق آگیا ہے۔ (۵) کامراں نجمی صاحب کے مقطع میں پہلا مصرع غالباً اس طرح ہوگا

ہے وجہہ کامرانی یہ ہی گردش مدام

مدام کی بجائے ایّام لکھ کر مصرع کو بحر سے گرایا ہے وہیں شعر کا مقصد بھی فوت ہو گیا ہے۔ اور دوسرے مصرع کی ردیف (ٹھہر نہ جائے) کو بھی غلط فرمایا ہے۔

(۶) جناب محمد علی صاحب نصیر کی غزل کے دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں زورِ شباب، کو

رودِ شباب سے تبدیل فرمایا ہے۔

(۷) جناب شاہد ساگری کی نعت میں شعر ۲ ( دو عالم میں ہے فیض ان کا ہی جاری ) اس مصرع میں لفظ "میں" کو حذف فرمایا ہے۔ (۸) عزیز حبیب الرحمٰن نیازی کی غزل کے پہلے مصرع میں قافیہ پیمان زندگی کو پیمانے زندگی لکھ کر غلطی کی ہے، دوسرے شعروں کے قافیوں پر غور نہیں کیا۔

جناب شاداب ذکی بدایونی نے اپنے خط میں عزیز ستار جے پوری کی غزل کے لئے تحریر فرمایا ہے کہ کوئی خیال، نیاپن نہیں ہے نہ ہی بیان میں ندرت ہے، میں نے شروع میں یہ عرض کیا ہے کہ ہر شخص اپنے حالات کے مطابق شعر پسند کرتا ہے، عزیز شاداب ہر طور آسودہ حال معلوم ہوتے ہیں اس لئے ستار جے پوری کے شعروں میں جو درد، ٹیس، کسک ہے اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکے، جو بھی ستار صاحب کے حالات سے واقف ہیں وہ ہی ان کے شعروں کے درد کو محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ ان کے دل کی آواز ہے اور دردمند دلوں سے ٹکرا رہی ہے۔

(خواجہ صلاح الدین عشقی فاروقی، جے پور)

محترم زیدی صاحب، خلوص و نیاز!

نخلستان جولائی تا ستمبر اپنے دامن میں بہار خیز تبسم کی رنگینیاں سمیٹے ظہور پذیر ہوا۔

عظیم رہنما اندرا گاندھی، "خونِ دل میں ڈوبا ہوا اظہارِ تاثر ہے جس کا خلاصہ ہے۔

آندھیو شوق سے آجاؤ کہ ہم ہیں وہ چراغ
بجھتے بجھتے بھی نئی روشنی کر جائیں گے

"تارِ حریر دو رنگ" عنوان صاحب کے مضمون کو عنوان دینے کی بے مثل صلاحیت کا آئینہ دار ہے، صوفیانہ ادب پر ان کو عبور حاصل ہے، ان کے یہاں تلاش کے ساتھ اسلوب کا اچھوتا پن جھلکتا ہے، نثار اعظمی نے قومی یک جہتی کی وضاحت میں قلم توڑ دیا ہے، موضوع پر انکی گرفت مضبوط ہے، نظیر کی شخصیت اور شاعری پر اس اختصار اور جامعیت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ بے اختیار سراہنے کو جی چاہتا ہے، سطر سطر کہتی ہے "میں حقیقت نگار کے قلم سے نکلی ہوں"

قومی یک جہتی اور اقبال" کی پُر کشش تمہید، معنی خیزی کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہے، مضمون ادبی شہ پاروں سے مزین ہے، قومی یک جہتی کے عناصر کی کھوج میں دیدہ وری سے کام لیا گیا ہے "فراقؔ کی غزل گوئی" سے فراق کی شاعری کے رومانی، جمالیاتی افق روشن ہوئے ہیں۔ ہندوستانی فضا اور مناظرِ فطرت کی نقاب کشائی بھی جاذب نظر ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ محمد علی زیدی نے فراق کی ترجمانی میں فراق کی روح کو چھو لیا ہے، مقالہ ڈوب کر لکھا گیا ہے، اشعار کا انتخاب شعری بصیرت کا پتہ دیتا ہے "شمالی ہند کا پہلا مرثیہ نگار"، تعارفی خاکہ سا ہے، نقوش دھندلے دھندلے سے ہیں، سید مدبر علی کا نقطۂ نظر ترقی پسندی، جدیدیت کے باب میں بڑا متوازن ہے، اُن کے مشوروں میں صحت اور رجحان ہے، البتہ کبھی کبھی اصطلاحات کی بھرمار سے طبیعت اکتانے لگتی ہے۔ رام لال سے انٹرویو" بصیرت افروز بھی ہے اور انبساط افزا بھی جس سے ان کی شخصیت، ادبی زندگی، فکروفن کے سرچشموں کا سُراغ ملتا ہے، جابجا فنی نکات کی چاندنی چھٹکی ہے۔ افسانہ "قربت اور فاصلے"، شہناز قریشی کے حقیقت نگار قلم کا مرہون منت ہے، عورت، مرد کی نفسیات کو چھیڑتے ہوئے انداز میں پیش کیا گیا ہے، افسانہ نگار نے اپنے تلخ تجربات کو افسانے کے پیکر میں ڈھالا ہے، افسانہ کیا ہے برہنہ حقائق کا آئینہ خانہ ہے لگتا ہے ذوقِ اظہار کسی نقاب کا متحمل نہیں "اخلاقاً طور پر وہ مجھے اپنی سیٹ پیش کریں" محل نظر ہے "یک جہتی کا گلدستہ"، نجمہ عزیز کا پُر خلوص، معصومانہ جذبات سے لبریز تحفہ ہے۔ نجمیؔ کے اشعار میں تیکھا پن ہے لیکن وہ فن کے بارے میں قدرے غیر محتاط میں مثلاً ہے

ہے وجہ کامرانی یہی گردشِ ایام

جبار غنیؔ کے یہاں شگفتگی، تازہ کاری ہے، جو ان کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے، عظیم امروہوی کے اشعار دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ ان کی ذات سے اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ایم۔ اے انصاری کی غزل بھی بھی ہے، مصرع

تو حسن کی شمع ہے ہم عشق کے پروانے نظرثانی کی محتاج ہے،

عزیزؔ بدایونی شاعری کے قدیم دبستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ زبان کی چاشنی ان کے اشعار کی لذت میں اضافہ کا حکم رکھتی ہے، کشور سلطانہ سوچ سمجھ کر شعر کہتی ہیں۔ حبیب الرحمٰن نیازی سوز و گداز کے شاعر ہیں، ان میں شاعرانہ جراثیم کی کمی نہیں، نصیرؔ کے منتخب اشعار بھی خاصے ہیں۔ اس شمارے میں بعض اور تخلیقات بھی شامل ہیں لیکن وہ اپنی جانب متوجہ نہیں کرپاتیں میری غزل کا مقطع یوں ہے ؎

مخمور اس گلی میں تو اپنا نہ تھا کوئی
کس نے یہ میرے نام سے آواز دی مجھے

جو کاتب صاحب کی خصوصی عنایت سے مسخ ہوگیا ہے، تصحیح فرمادیں، اپنی غزل پر ارباب نظر کی نیک نیتی پر مبنی رائے کا انتظار رہے گا، امید ہے اہلِ ذوق عباس فرحت کی طرح سازشی ذہنوں کے ایما پر مجھ سے اور میری شاعری سے انتقام نہ لیں گے۔ حالانکہ ایسی تحریروں سے بقول ڈاکٹر محمد علی زیدی کچھ حاصل نہیں ہوتا ؎

جو اصلیت ہے چھپانے سے چھپ نہیں سکتی
تو آئینہ پر کہاں تک غبار ڈالے گا

(مخمور سجالی سنبھلی ایم اے علیگ)

محترم ڈاکٹر زیدی صاحب ، سلام مسنون

زندگی میں پہلی مرتبہ آپ کے "نخلستان" شمارہ نمبر ۳ جولائی تا ستمبر ۸۳ء کی زیارت ہوئی، جریدہ بہت پسند آیا، پروفیسر عنوان چشتی اور آپ کا مضمون بیحد پسند آیا، شمالی ہند کے مرثیہ نگار پر عظیم امروہوی کا تحقیقی مضمون بھی شاندار ہے، اور غزلیات کے حصے میں بھی شاہکار غزل عظیم امروہوی کی ہے، ویسے کشور سلطانہ اور جبار غنی کی غزلیں بھی اچھی ہیں، رام لال سے انٹرویو بھی خاصا دلچسپ ہے، ان تمام اعلیٰ تخلیقات کی اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیں، راجستھان جیسے صوبہ میں اردو زبان کی خدمت کا یہ جذبہ قابل قدر ہے آپکی اور آپکے ادارہ کی جرأت و ہمت قابل تعریف ہے ۔ مخلص

(ذیشان صدیقی)

مکرمی تسلیمات !

اپنے ایک دوست کی نشاندہی پر کہ میرے مضمون "آنکھیں" میں داراشکوہ کی آنکھیں نکالے جانے کا ذکر تاریخی حقائق پر مبنی نہیں۔ میں نے مزید چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ اس معاملے میں مجھ سے غلطی سرزد ہو گئی ہے۔

اس حد تک تو سب متفق ہیں کہ میدانِ جنگ میں اورنگ زیب سے دو تین بار شکست کھانے کے بعد دارا سر چھپانے کے لئے لاہور، ملتان، احمد آباد کچھ روز بھٹکتا ہوا بالآخر درّہ بولان کے راستے ایران جانے کے لئے عازمِ سفر ہوا مگر راہ ہی میں داور کے حاکم ملک جیون خان نے، جس پر دارا کے کئی احسانات تھے بلکہ جسے ایک بار اُس نے سزائے موت سے بھی بچایا تھا۔ پناہ دینے کا جھانسہ دیکر اسے گرفتار کر لیا اور اورنگ زیب نے مفتیانِ وقت سے فتویٰ لیکر اُس کا سر قلم کروا دیا۔

اس کے بعد کے واقعات کے بیان میں مؤرخین میں اختلاف ہے، بعض نے لکھا ہے کہ دارا کا سر ایک طشت میں ڈھانپ کر مقید شاہ جہاں کو اُس وقت پیش کروایا گیا جب وہ دسترخوان پر بیٹھا تھا۔

بعض دوسروں نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ چند ایک کا بیان ہے کہ اورنگ زیب نے ایک کینہ پرور اہلکار شریف الملک کو شاہ جہاں کی خدمت اور نگرانی پر مامور کیا تھا، اس نے اورنگ زیب کی لاعلمی میں سر بُریدہ دارا کی آنکھیں نکال کر ایک چاندی کے قلمدان میں رکھ کر شاہ جہاں کو پیش کر کے پُرانی رنجش کا بدلہ لیا تھا۔

وجہ اس رنجش یہ تھی کہ شاہ جہاں (شہزادہ خرم) کی شہزادگی

کے ایام میں نورجہاں نے دھولپور کا پرگنہ شہزادہ شہریار کو دے رکھا تھا اور وہاں شریف الملک بطور گماشتہ متعین تھا۔ شاہ جہاں نے دکن کی کامیاب مہم سے واپسی کے بعد جہانگیر کو عرضداشت لکھ کر یہ پرگنہ اپنے لئے مانگ لیا اور جب اپنے گماشتے کو اس کا قبضہ لینے کے لئے بھیجا تو اُس کی شریف الملک سے لڑائی ہو گئی، جس کے دوران شاہ جہاں کے گماشتے نے تیر مار کر شریف الملک کو کانا کر دیا تھا۔ تب سے اس کے دل شاہ جہاں کے خلاف کینہ چلا آرہا تھا۔

یہ سب واقعات میں نے ماہنامہ شبستان (اردو ڈائجسٹ) بابت اکتوبر ۷۷ء میں شائع شدہ ایک تاریخی کہانی بعنوان "اشک لازوال،، (مصنف محی الدین نواب) میں پڑھے تھے۔ اپنا مضمون "آنکھیں،، لکھتے وقت میرے ذہنی پس منظر میں اس کہانی کا تاثر موجود تھا جس کی وجہ سے سہواً دارا کی آنکھیں نکالنے کا ذکر بھی شامل مضمون ہو گیا لهذا نکتہ چیں قارئین کے خدنگِ تنقید سے بچنے کے لئے میں پیشگی اظہارِ معذرت کرنا چاہتا ہوں، امید ہے آپ اسے نخلستان کے حسن نظر کالم میں جگہ دیکر مشکور فرمائیں گے۔

آپ کا :-

رتن چند اثر ، گول بازار سری گنگا نگر

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۵

محترمی ......... آداب و نیاز

یقین واثق ہے کہ موصوف مع رفقاء اکادمی مع الخیر ہوں گے!
آج ہی آپ کا نخلِ ادب بہ نام "نخلستان" بصیرت افروز ہوا۔ آپ کی ترتیب و تزئین کی داد و تحسین آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ لیکن اربابِ طباعت اور خصوصًا فوقی صاحب اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ نہیں کر رہے ہیں۔ اگر کاتب صاحب مختصرًا ہی اردو نوازی اور فکری شاعر ہونے کا جذبۂ بیدار رکھتے ہیں تو بے لوث جذبۂ ادب کے ساتھ اپنے عظیم ورثے کے لئے ٹھوس اقدام فرمائیں۔
آپ حضرات کا یہ کارنامہ مستقبل قریب میں ایک تاریخ ثابت ہوگا۔
تمام قارئین نخلستان اپنے حلقۂ ادب میں کم از کم پانچ پانچ خریدار بنائیں۔ اور مستعار لیکر مطالعہ سے پرہیز فرمائیں۔ ساتھ ہی ادباء شعراء نیز اردو کے بہی خواہ اس نخلِ ادب کی آبیاری میں لگ جائیں۔
جریدے کے تمام لکھنے والے قابلِ صد مبارک باد ہیں کہ منتخب اور معیاری ادب برائے اشاعت بھیج رہے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی کلکِ فن "نخلستان" علم و ادب کے لئے گہر ہائے فن لٹاتا رہے گا۔ حضور آپ بھی فنکاروں کی حوصلہ افزائی فرمایا کریں۔
ایک بار پھر ہمدردانِ اردو و نثار و شعراء کی خدمتِ عالی میں نہایت ادب کے ساتھ ملتمس ہوں کہ ہندوستان

کے تمام ادبی اور علمی ماہناموں کی حوصلہ افزائی فرمائیں اور اردو کے فروغ کے لئے اور اقدامات کریں۔

کارِ ہستی کارِ ادب ہو تو کیا کہنا

خادم ادب :۔

گوہر امروہوی

دانشکدہ، مردھگان، نہٹور، بجنور،

محترمی ڈاکٹر زیدی صاحب! تسلیم!

ایک طویل انتظار کے بعد نخلستان کا شمارہ جنوری تا جون ۱۹۸۳ء موصول ہوا۔ شمارہ شروع سے آخر تک جاذب نظر تھا۔ کہتے ہیں کہ انسان جو نصیحت دوسروں کو کرے اُس پر خود بھی عمل پیرا ہو، اس کی بہترین مثال آپ نے پیش کی ہے۔ آپ نخلستان کے ذریعہ اردو نواز حضرات کو آواز دیتے ہیں۔ "اردو کی بقا اور ترقی کے لئے خود اُردو والوں کو اپنے اپنے مقام پر انفرادی و اجتماعی دونوں طرح سچی لگن، مستقل مزاجی اور ہوش مندی سے کام کرنا ہوگا"، میرا خیال ہے اس کی بہترین مثال ڈاکٹر سید محمد علی زیدی ہیں۔ جن کی جانفشانی کے بغیر جریدہ اس مقام تک نہ پہونچ جاتا جہاں آج ہے۔

میرا کلام چھپ رہا ہے۔ مگر نام وضاحت سے نہیں چھپ رہا۔

کہیں فضا لکھ دیا جاتا ہے۔ تو کہیں محض جو کالوی۔ میں بھی گنہگار ہوں۔ کلام
کے ساتھ پورا نام و پتہ نہیں لکھ رہا۔ خط تو آپ کے پاس رہ جاتا
ہے اور کلام کاتب کو دیدیا جاتا ہے۔ چنانچہ میں خود احتیاط برتونگا۔
میرے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب مخمورؔ فرماتے ہیں۔
مقطع نہ ہوتا تو غزل کا حسن مجروح نہ ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ
غزل کے لئے لطف و انبساط جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مگر
اُن کا اعتراض میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر فنیؔ لحاظ سے اس میں کوئی
خامی نظر آئی ہو تو میں ماننے سے انکار کرتا ہوں، یہ غزل جناب ساحرؔ
سیالکوٹی سے اصلاح شدہ ہے اور ایسے استاد شاعر کی سند کے بعد
میرے پاس کوئی اور دلیل نہیں رہ جاتی۔ اور اگر حجازؔی صاحب اسے
خودستائی سمجھتے ہیں تو میں گذارش کروں گا کہ وہ مقطع پھر پڑھیں اس
میں خود پرستی نہیں بلکہ تجسس ہے جو ایک غزل گو شاعر میں لازم ہے
میں دو غزلیں برائے اشاعت بھیج رہا ہوں، غزلیں مجھے بہت پسند
ہیں۔ جناب ساحرؔ مرحوم انہیں قابلِ ستائش قرار دے چکے ہیں۔
جہاں تک میرا ذاتی تعلق ہے مجھے اس سے بڑی سند یا سفارش
کی ضرورت نہیں۔ ہاں ان کی اشاعت کے واحد مالک آپ ہیں
مگر مجھے یقین ہے میرے کلام سے انصاف ہو گا۔
کافی عرصہ سے جے پور جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جب
بھی آیا حاضر ہو کر سلام عرض کروں گا۔

مخلص
فضا جو کالوی

# فہرست مضامین پندرہ روزہ آجکل دہلی

مرتبہ ——— سید حسن عباس گوپال پوری ایم اے

پندرہ روزہ آجکل دہلی ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۳ء

۱۔ مولانا نذیر احمد کے ناولوں پر طائرانہ نظر۔ نصیر الدین ہاشمی
۲۔ راجہ رام موہن رائے ۔ محترمہ مس ایل آر کرک۔
۳۔ عالم کی ہندی شاعری ۔ انگد سنگھ بی، اے

۱۵ نومبر ۱۹۴۳ء

۱۔ غالب کے ہندو شاگرد ۔ عبد السلام خورشید
۲۔ واجد علی شاہ کی شاعری۔ حرماں حیدر آبادی

یکم جنوری ۱۹۴۴ء

۱۔ مشرق وسطیٰ کی زبانیں اور لاطینی رسم خط۔
از لفٹیننٹ کرنل جی، ای وہلیر
۲۔ امام حسین علیہ السلام ۔ صالحہ عابد حسین
۳۔ افغانستان کا ایک ہندو شاعر ۔ ادارۂ تحریر
۴۔ منشی دیانرائن نگم ۔ منشی شیام موہن جگر
۵۔ قدیم ہندوؤں کے چند علمی شاہکار۔ بیگم پروین نیاز رسول

۱۵ جنوری ۱۹۴۴ء

۱۔ حفیظ اور اختر شیرانی کی شاعری اقبال کے مطالعہ کی روشنی میں ۔ از جناب محمود ہاشمی (علیگ)
۲۔ عہد مغلیہ کی نقاشی ۔ محترمہ وحیدہ عزیز بی اے
۳۔ افسانہ نگاری کا اسکول ۔ عزیز احمد
۴۔ گرامی کا ایک شعر ۔ عرش ملسیانی

یکم فروری ۱۹۴۴ء

۱۔ علامہ راشد الخیری ۔ صادق الخیری
۲۔ چینی شاعری ۔ موہن سنگھ دیوانہ
۳۔ تنقید کا مقصد ۔ ن۔م۔ راشد
۴۔ حفیظ اور اختر شیرانی کی شاعری اقبال کے مطالعہ کی روشنی میں ۔ محمود ہاشمی علیگ

یکم مارچ ۱۹۴۴ء

۱۔ ترقی پسند ادب (۲) رشید احمد صدیقی
۲۔ روسی ادب انقلاب سے پہلے ۔ حسن امام علیگ
۳۔ املا کی خاص غلطیاں ۔ جوش ملسیانی
۴۔ جوش ملیح آبادی ۔ روزگار نو، لندن سے ماخوذ

۱۵ مارچ ۱۹۴۴ء

۱۔ ہندوستانی رقص و موسیقی ۔ جناب آئی، بی
۲۔ سحر البیان پر ایک نظر ۔ سید احتشام حسین
۳۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ اور اردو ۔ عطاء الرحمٰن اطہر
۴۔ جزیرہ کابلی میں ہندوؤں کا تمدن ۔ شنکر دیال

یکم اپریل ۱۹۴۴ء

۱۔ ہندوستان کی چند ہمسایہ قومیں، مولانا ابوالقاسم بخاری
۲۔ روس کی ابتدائی تاریخ ۔ کامریڈ نکولائی رسکی
(۳) موہن سنگھ دیوانہ ۔ منور لکھنوی
۴۔ جدید اردو شاعری میں قنوطیت ۔ تمکین احسن کلیم



تحلہ ۱۱

۱۵ر اپریل سنہ ۱۹۴۴ء

۱۔ کچھ ترقی پسند ادب کے بارے میں ۔ علی جواد زیدی

۲۔ سندھ کا ایک ہندو فارسی گو (دسیوک رام عطارد) } لطف اللہ بدوی

۳۔ مغلوں کے اخبار ۔ حامد اللہ افسر میرٹھی

یکم رمئی سنہ ۴۴ء

۱۔ ہندی کے ترقی پسند شعراء ۔ کیلاش بہاری موج

۱۵ رمئی سنہ ۴۴ء

۱۔ روس کا شیکسپیئر ۔ علی احمد

۲۔ ادبی اشارے ۔ خورشید الاسلام

۳۔ سرور جہاں آبادی ۔ نازاں لطیف

یکم جون سنہ ۴۴ء سالنامہ

۱۔ دختر حوا کا کورس (نظم) ۔ جوش ملیح آبادی

۲۔ گرونانک کی جنم ساکھی کا ایک نایاب نسخہ } موہن سنگھ دیوانہ

۳۔ بغیر حروف تہجی کی زبان ۔ ریونڈرڈ بلیوجیمیر

۴۔ تین افسانہ نگار (کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری) } وقار عظیم

۵۔ جگر مرادآبادی ۔ راجندر ناتھ شیدا

۶۔ تخت طاؤس (تحقیقی مطالعہ) پروفیسر اظہر علی

۱۵ رجون سنہ ۴۴ء

۱۔ سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب نیاز فتحپوری
نیاز اور اثر کی نظر میں } اور اثر لکھنوی

۲۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری ۔ حرماں خیرآبادی

---

یکم رجولائی سنہ ۴۴ء

۱۔ فراق کی شاعری ۔ عزیز احمد

۱۵ رجولائی سنہ ۴۴ء

۱۔ اقبال کی دو پرانی غزلیں ۔ محمد بشیر الحق دسنوی

۲۔ ولی دکنی اور نجم ناگوری ۔ مولانا البشیر احمد مخفی القادری

۳۔ تنہائی ۔ ایک نفسیاتی مطالعہ ۔ ریوتی سرن شرما

یکم راگست سنہ ۴۴ء

۱۔ ابوریحان البیرونی ۔ ظفر قریشی دہلوی

۲۔ ترقی پسند ادب ۔ بے تاب دہلوی

۳۔ قدیم اردو شاعری میں محتاج اور مفلس } شیام جی سری واستو

۴۔ طب قدیم عہد مغلیہ میں ۔ کوثر چاندپوری

۱۵ راگست سنہ ۴۴ء

۱۔ ترقی پسند ادب کے متعلق کچھ اور ۔ سید احتشام حسین

۲۔ قدیم اردو میں اسلامی قانون کی کتابیں } نصیر الدین ہاشمی

۳۔ اردو شاعری میں ساقی کا کردار } سید مسعود الحسن تابش

یکم رستمبر سنہ ۴۴ء

۱۔ نقد الانتقاد (سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب)
از ۔ اثر لکھنوی

۲۔ خان بہادر میر علی ناصر دہلوی } موہن سنگھ دیوانہ

۱۵ رستمبر ۴۴ء

۱۔ موسیقی اور مذہب ۔ پروفیسر پی یشنکریا

۲- دختران حوا کا کورس نیاز اور اثر کی نظر میں (تنقید) } نیاز فتحپوری اور اثر لکھنوی

۳- مسٹر چرچل کی وضاحت } ڈسمنڈ میکارتھی

یکم اکتوبر ۴۴ء

۱- آپ بیتی (غیر مطبوعہ) - منشی پریم چند

۲- شاہ نصیر دہلوی کے ہندو شاگرد - عبدالسلام خورشید

۳- فلموں کی ادبی اہمیت - سید اقبال عظیم

۱۵ر اکتوبر ۴۴ء

۱- ذوق سے ناانصافی - جوش ملسیانی

۲- انتقاد النقد - آغا اشہر لکھنوی

۳- جدید اُردو اور افسانہ نگار - مختار صدیقی

یکم نومبر ۴۴ء

۱- جدید ہندی شاعری - اکرام حسین

۲- دختران حوا کا کورس (تنقید) اثر لکھنوی

۱۵ر نومبر ۴۴ء

۱- نقد الانتقاد - اثر لکھنوی

۲- ادب کے سو کے نام } خورشید الاسلام

یکم دسمبر ۴۴ء

۱- ملایائی ادب پر فارسی کے اثرات } رچرڈ ونسٹیڈ

۲- سیماب اکبرآبادی } محمد اسحاق آلم مظفر نگری

۳- جدید تامل ادب کے رجحانات } ڈی، ایس، ڈارڈن

۱۵ر دسمبر ۴۴ء

۱- زمانہ جنگ کا سویٹ ادب - } لطیف الدین احمد

۲- حضرت عباس ابن علی - صالحہ عابد حسین

۳- عہد اموی میں عرب کے ایرانی شعراء } ابوالقاسم بخاری

۴- بولیوں کا سنگم (۱) - اختر اورینوی

(باقی آئندہ)

راجستھان اردو اکیڈمی کا جریدہ

سہ ماہی

# نخلستان

جنوری ــــــ تا ــــــ مارچ سنہ ۱۹۸۵ء

جلد ۵ — شمارہ ۱


نگراں

ڈی، این، اپادھیائے
آئی، اے، ایس
اسپیشل سکریٹری ایجوکیشن، حکومت راجستھان
ایڈمنسٹریٹر، راجستھان اردو اکیڈمی

مدیر

ڈاکٹر سید محمد علی زیدی
صدر شعبۂ اردو و فارسی راجستھان یونیورسٹی
سابق چیرمین
راجستھان اردو اکیڈمی



ناشر

راجستھان اردو اکیڈمی

جے، ۳ سبھاش مارگ ــ سی اسکیم، جے پور ۳۰۲۰۰۱

سکریٹری راجستھان اردو اکیڈمی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر راجستھان اردو اکیڈمی جے پور ۳۰۲۰۰۱ سے شائع کیا۔

سہ ماہی

# نخلستان

قیمت فی پرچہ ۳ روپے

زرسالانہ ۱۰/دس روپے

ترسیل زر و مراسلت کا پتہ

دفتر راجستھان اردو اکیڈمی

جے - ۳ سبھاش مارگ - سی اسکیم

جے پور ۳۰۲۰۰۱

# ترتیب

# ترتیب

# سخنہائے گفتنی

ڈاکٹر سید محمد علی زیدی

نخلستان کے قارئین کو اور اُن کے توسط سے پرستاران و خادمان اردو کو گزشتہ عیدالفطر اور آنے والی عیدالضحٰی کی پُرخلوص مبارک باد پیش کرتا ہوں ۔

میری اور راجستھان اردو اکیڈمی کے دیگر اراکین کی مدتِ کار ۶ مئی ۱۹۸۴ء کو ختم ہوگئی تھی لیکن مجھ سے اکیڈمی کی تشکیلِ نو تک کام کرتے رہنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس خیال سے کہ اکیڈمی کا کام یک بیک رک نہ جائے اور حکومت کو غور و فکر کرکے مناسب اشخاص کے انتخاب کرنے کا موقع مل جائے میں ۲۲ر فروری ۱۹۸۵ء تک کام کرتا رہا۔ یہ فیصلہ کرنا میرے لئے اس لئے بھی ناگزیر ہوگیا تھا کہ میرے سبکدوش ہونے کے بعد سیکریٹری کے عرصے سے تقرر نہ ہونے کی وجہ سے کوئی ایسا ذمہ دار شخص جو اکیڈمی کا روز کا کام بھی چلا سکے نہیں تھا، چنانچہ تقریباً ڈیڑھ سال تک میری یہ کیفیت رہی کہ ع ہم کوزہ و ہم کوزہ گر و ہم گِلِ کوزہ ، اس دوران میں زبانی و تحریری طور پر یہ کوشش کرتا رہا کہ اکیڈمی کی جلد سے جلد تشکیلِ نو ہو جائے یا کوئی متبادل انتظام کرکے مجھے مشقتِ خود اختیاری سے نجات دیجائے ۔ ماہ فروری کے تیسرے ہفتہ میں راجستھان کے سیاسی حالات کچھ ایسے دگرگوں ہوئے کہ یہاں کے محبوب وزیر اعلا جناب شیو چرن ماتھر نے اپنے اعلا عہدہ سے استعفےٰ دیدیا۔ اُسی روز انھوں نے میری بھی ازراہِ کرم گلو خلاصی کی اور جناب ڈی این اُپادھیائے آئی۔ اے۔ ایس کو جو محکمۂ تعلیم کے معتمد خصوصی ہیں راجستھان اردو اکیڈمی کا ناظم مقرر کیا۔ اپادھیائے صاحب نیک، شریف اور وسیع النظر انسان ہیں۔ انھیں ادب سے بھی دلی لگاؤ ہے۔ میں نے اُن سے اس دلی خواہش کا اظہار کیا کہ نخلستان کی اشاعت بند نہ ہو۔ انھوں نے اس کی ذمہ داری میرے ہی سپرد کی جسے میں نے بخوشی قبول کرلیا۔ اور یہ کوشش کی کہ مارچ میں نہیں تو اپریل میں نخلستان منظرِ عام پر آجائے، مارچ کے تیسرے ہفتے سے کتابت کا کام شروع کرادیا۔ لیکن کاتب صاحب کی علالت، دیگر مصروفیات اور لیت و لعل

وغیرہ کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ اگست کا مہینہ آگیا انھوں نے پختہ وعدہ کیا ہے کہ اگست میں ضرور مکمل کر دیں گے۔ یہ بھی غنیمت ہے اگر وہ اب بھی نہ کرتے تو میں اور آپ کیا کر لیتے۔

میں نے حتی الامکان اکیڈمی کو فعال بنانے کی کوشش کی، کئی نئے منصوبے زیر عمل لائے گئے اور کچھ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں کر لی گئی تھیں مثلاً اردو ٹائپنگ سکھانے کا مرکز قائم کرنے کے لئے اردو کے ٹائپ رائٹرس خرید لئے گئے تھے، اشاعتی مرکز کے قیام کا بھی منصوبہ بنا لیا گیا تھا۔ اردو کی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے کتب کی فراہمی، طلبہ و طالبات کو اردو پڑھنے کی رغبت دلانا وغیرہ۔ اکیڈمی کے محدود وسائل میں وہ سب کچھ کرنا جو دوسری ریاستوں کی اکیڈمیز اپنے وسیع وسائل کو کام میں لا کے کر رہی ہیں بہت مشکل کام تھا۔ بعض اکیڈمیز کا بجٹ تو یہاں سے چودہ پندرہ گنا زیادہ ہے ظاہر ہے کہ کام کی نوعیت میں بھی وہی تناسب ہوگا۔ مگر مجھے یہ اطمینان ہے کہ حسین نازک و نوخیز پودے کو میں نے سنبھالا تھا وہ آج چھوٹا درخت بن چکا ہے اور مناسب آبیاری اور خبرگیری ہوتی رہی تو بارآور بھی ضرور ہوگا۔ اکیڈمی کا بنیادی اور اہم مقصد اردو زبان و ادب کی ترویج و فروغ ہے۔ اکیڈمی اپنے اس فرض منصبی کو انجام دیتی رہے گی۔

ہماری کوششوں سے بی، اے اور ایم، اے کی سطح پر اردو کے طلبہ و طالبات کو جو ماہانہ وظیفہ حکومت دے رہی ہیں اُس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں، طلبہ و طالبات کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہوا ہے۔ اگر تحتانی اور ثانوی درجات کی سطح پر اسی طرح کے محرکات کا انتظام کیا جائے تو اس سطح پر بھی تعداد میں کافی اضافہ ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

میں نے اپنی تقریباً چار سالہ مدتِ کار میں یہ کوشش کی کہ غیر جانبدار اور بے خوف ہو کے کام کروں۔ گروہ بندی سے بالاتر رہوں اور جہاں تک ممکن ہو مستحقین کو ان کا حق پہنچاؤں۔ اس طریقۂ کار نے کچھ حضرات کو ناراض بھی کیا۔ وہ خانہ آرائی پر بھی آمادہ ہوئے اور میرے خلاف مہم بھی چلائی لیکن میں نے ان سب کو نظر انداز کیا۔ رفیقوں کا بھی ممنون ہوں جن کے تعاون سے میں اپنی خدمات بحسن و خوبی انجام دیتا رہا اور اُن دوستوں کا بھی جن کی مخالفانہ سرگرمیوں نے مجھ میں عزم و حوصلہ کیساتھ کام کرنیکی قوت پیدا کی۔ میں نے حریف و حلیف دونوں کو ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اور دونوں سے استفادہ کیا ؎

من بہوس ہمی خورم ناوکِ سینہ دوز را　　تا نہ کنی ملامتی غمزۂ کینہ توز را
(امیر خسرو ؒ)

بقیہ صد ۲ کے بعد

# محمد عثمان عارف شخصیت اور شاعری


**ڈاکٹر محمد علی زیدی** • صدر شعبۂ اردو، فارسی، راجستھان یونیورسٹی جے پور


گورا رنگ، کسی قدر کشیدہ قامت، اٹھا شانہ کئے ہوئے، کھچڑی بال، موٹے فریم کی عینک کے پیچھے سے غور و فکر میں مصروف دو گول آنکھیں جو چار ہوتے ہی بجلیاں گرانی لگتی ہیں پروقار متبسم چہرہ دوہری تھوڑی بھاری بدن، دیکھتے ہی مرد معقول نظر آئیں، انھیں کا یہ شعر ان کا نقیب ہے ؎

اخلاص و محبت کے حسیں پھول کھلے ہیں
ہم جس سے ملے دل سے ملے، جی سے ملے ہیں

یہ ہیں جناب محمد عثمان عارف نقشبندی، علامہ محمد عبداللہ بیدل مرحوم کے خلف الرشید مرکزی وزیر، کامیاب وکیل، بلند پایہ سیاست داں اور مشہور و معروف شاعر، جس کی ہمہ جہتی شخصیت پر راجستھان کو بجا طور پر ناز ہے۔ راجستھان کا خطۂ ارض بڑا زرخیز ہے، شمشیر و سنان کے دور میں ایسے سورما پیدا کئے جنھوں نے تاریخ میں اپنی ہمت و شجاعت کے نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے اور شہنشاہی جلال کے سامنے بھی سر نہیں جھکایا۔ بزم آرائی کی تو ایسی کہ جریدۂ عالم پر اپنا دوام ثبت کر دیا ــــ صناعی، صورت گری، موسیقی، مصوری، شاعری غرض اس نگار خانہ میں ہر فن کے ایسے اہل کمال مل جائیں گے جنہوں نے نہ صرف راجستھان کا

نام بلند کیا بلکہ مادر وطن کی آبرو بھی سمجھے جاتے ہیں، یہاں اس اجمال کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں، بات عثمان عارف صاحب کی ہے جو اس نگار خانہ کی رونق میں اضافہ کر رہے ہیں، میری اُن سے ملاقات کب اور کہاں ہوئی یہ تو یاد نہیں، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ پندرہ بیس برس پیشتر پہلی مرتبہ ملنے پر جو اپنائیت اور خلوص محسوس کیا تھا، امتداد زمانہ سے اس میں کمی نہیں آئی بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہا، پھر وقف بورڈ راجستھان میں بہ حیثیت ممبر ہم دونوں کو ایک دوسرے سے زیادہ قریب آنے کا موقع ملا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس خلوص و محبت کا لامتناہی خزانہ ہے جسے وہ اپنوں اور بیگانوں پر بے دریغ لٹاتے رہتے ہیں اور اس میں کمی نہیں آتی۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں جودھپور میں ایک کل راجستھان سہ روزہ سمپوزیم ہوا تھا، دن میں مقالے پڑھے جاتے تھے اور شب میں کل ہند مشاعرہ میں شعراء اپنا کلام سناتے تھے، میں بھی مقالہ پڑھنے گیا تھا، اتفاق سے میں جس کمرہ میں قیام پذیر تھا اس کے مقابل والے کمرہ میں علامہ بیدل بیکانیری مرحوم فروکش تھے۔ عارف صاحب مجھے ان کی خدمت میں لے گئے اور میرا تعارف کرایا۔ مرحوم بزرگانہ شفقت سے ملے کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے موضوع سخن شاعری تھا کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد میں واپس آ گیا۔ رات کو ساڑھے تین بجے میری آنکھ کھل گئی۔ بیدل صاحب مرحوم کے کمرہ سے واہ واہ کی آوازیں آ رہی تھیں، معلوم ہوا کہ کچھ شعراء ان کے کمرے میں جمع ہیں اور بیدل صاحب اپنا کلام سنا رہے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی کی طرح عارف صاحب کی شخصیت بھی یک جہتی نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حسرت نے چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن جاری رکھی اور عارف صاحب نے مشقتِ سیاست کے ساتھ فکر سخن کی، عارف صاحب کی انکساری، حسن اخلاق، تہذیب اور ادائے دلبری میں عہد طفولیت کی صالح پرورش و پرداخت کے واضح نقوش نظر آتے ہیں۔ جس پر علم و دانش نے جلا کر دی ہے۔ وہ انتہائی معاندانہ ماحول میں بھی صبر و ضبط کا دامن نہیں چھوڑتے، اور مسکراتے رہتے ہیں۔ میں نے اکثر لوگوں سے یہ روایت سنی ہے کہ انہیں غصہ نہیں آتا وضعداری

تکلف

ان کی سرشت میں داخل ہے۔ جس سے کے ہو گئے، ہو گئے بقول میر ضمیر ؎

میلے نہ ہوں تیور یہ سپاہی کے ہنر ہیں
جس کے ہیں اسی کے ہیں جدھر ہیں بس ادھر ہیں

چند سال پیشتر ہندوستان میں ایک سیاسی انقلاب آیا تھا، بڑے بڑے سورماؤں کے قدم ڈگمگا گئے بہت سے دیرینہ رفیق ہوسِ جاہ میں رفاقت چھوڑ گئے، بہت سے مشہور رہنماؤں نے اپنی قیادت پر خطرہ کے بادل منڈلاتے دیکھ کے، سیاسی نظریات بدل دیئے چند نے حقیقی یا فرضی خطرہ محسوس کرکے جنس وفا نیلام کر دی لیکن عارف صاحب ان باوفا ہستیوں میں سے ایک ہیں جو وفاداری پر استواری سے قائم رہے نہ ساتھ چھوڑا، نہ عقیدت کم ہوئی، نہ عمل میں کوتاہی کی، نہ حوصلے پست ہوئے نہ کوششوں میں اضمحلال آیا۔ بلکہ اسی آن بان اور شان سے اپنے قائد کے احکامات کو بجالاتے رہے، آفریں ہے ان کے اس جذبہ وفاداری کو، اور مرحبا اس استواری کو۔

عثمان عارف صاحب نقشبندیہ سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں تعصب سے دور، تصوف سے قریب، فرقہ بندی سے گریزاں ہاں انسانیت کی سربلندیوں کے لئے کوشاں فروغ آدمیت کے خواہاں، ہمیشہ شاداں و فرحاں، یہ ہیں ان کی شخصیت کے مختلف پہلو، بلحاظ پیشہ وکیل و سیاستداں ہیں۔ ان کی شاعری اور شرافت سے پر شخصیت میں سیاستدانی اور قیادت کے جوہر کے ساتھ ساتھ چمکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو جاننے کے لئے ماننے اور ان پر عمل پیرا ہونے والے انسان کے لئے وکالت سیاست اور شاعری میں کوئی اساسی تضاد نہیں، وہ اپنے اپنے مقام پر سب کی حرمت و عظمت برقرار رکھ سکتا ہے۔

عارف صاحب کو علم و ادب سے خصوصاً اردو ادب سے ہمیشہ گہرا لگاؤ رہا۔ کیونکہ یہ ان کی جبلت اور خمیر میں داخل ہے۔ اردو زبان و ادب سے انہیں عشق کی حد تک محبت ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ راجستھان کے واحد سہ ماہی رسالہ نخلستان رہے گذشتہ چند سالوں سے

راجستھان اردو اکیڈمی شائع کر رہی ہے) کی مجلس ادارت کے رکن اور دیگر ادبی رسائل سے وابستہ رہے۔ انہوں نے راجستھان ساہتیہ اکیڈمی کے معزز رکن کی حیثیت سے، راجستھان کے اہل قلم حضرات کی نہ صرف خدمت کی بلکہ حوصلہ افزائی بھی کی، ادبی کارناموں کی انجام دہی کے لئے ان کی حوصلہ افزائی اکثر فہمائش سے گذر کر تہدید تک پہنچ جاتی ہے۔ غالباً ۱۹۶۳ء کا واقعہ ہے کہ ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم میرے یہاں قیام پذیر تھے۔ اتفاقاً عارف صاحب بھی تشریف لے آئے میں نے دونوں حضرات کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا، پھر ادبی گفتگو شروع ہو گئی، مجھے داغ پر تحقیقی کام شروع کئے ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا، لیکن مواد کی کمیابی اپنے رہنما پروفیسر احتشام حسین صاحب مرحوم سے دوری، اور کچھ خانگی پریشانیوں کی وجہ سے پست ہمت ہو رہا تھا گفتگو کے دوران اس کا ذکر بھی چھڑ گیا، مسیح الزماں مرحوم نے یہ سنا تو بھڑک اٹھے ان کے مزاج میں شعلہ بداماںی تھی، لیکن عارف صاحب نے دوستانہ فہمائش بلکہ تہدید پُرزور الفاظ میں کی تو میری وہی حالت ہوئی جو اس شخص کی ہوتی ہے جو کراس فائر CROSS FIRE کا شکار ہو میں نے عارف صاحب سے گذارش کی کہ جناب ایک طرف سے ہی گولہ باری ہونے دیجئے۔ اس حملہ پر عارف صاحب بے ساختہ ہنس پڑے لیکن مجھ سے انہوں نے پختہ وعدہ لیا کہ میں جلد ہی اس کام کو پایۂ تکمیل تک پوری ہمت اور لگن سے پہنچا دوں گا۔ ان کی دوستانہ فہمائش میرے حق میں کس قدر سود مند ثابت ہوئی اس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔ راہ تحقیق میں ایک ایسا موڑ آتا ہے جب ہمت ساتھ چھوڑ دیتی ہے، حوصلے پست نظر آتے ہیں۔ دل، دماغ سے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے، راستے مسدود نظر آتے ہیں اگر ایسے وقت میں کوئی خضر طریقت نہ ملے تو تحقیق کرنے والے اکثر راہ فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ عارف صاحب دوستوں اور حلیفوں کا کس قدر خیال رکھتے ہیں اور کس قدر بہی خواہ ہیں یہ اس کی معمولی مثال ہے۔ ان کا رویہ حریفوں اور مخالفوں کے ساتھ بھی ہمدردانہ ہوتا ہے۔ غالباً یہ ان کی سرشت کا عنصر ہے یا موروثی اثر ہے کہ وہ سب سے خواہ حریف ہو یا حلیف، دوست ہو یا دشمن، موافق ہو یا مخالف، مشفقانہ اور

ہمدردانہ رویا برتاؤ کرتے ہیں۔

عارف صاحب کے کلام کی اشاعت کا آغاز ان کی وطنی شاعری کے مجموعہ "نذرِ وطن" سے ہوا۔ اگرچہ ان کی شاعری کا آغاز ابتدائے شباب میں ہی ہو چکا تھا اور "نذرِ وطن" کی اشاعت تک ان کے پاس غزلوں، قطعوں، رباعیات اور حمد و نعت کا بھرپور سرمایہ تھا۔ "نذرِ وطن" کے بعد ان کا حمد و نعت کا مجموعہ "عقیدت کے پھول" شائع ہوا جو عشقِ خدا، عشقِ رسول، اہلِ بیت اور بزرگانِ دین سے عقیدت و محبت کا مظہر ہے۔ عارف صاحب نے عرصہ پہلے سے ہی ممتاز شعراء کی صف میں اپنی جگہ بنالی تھی، اور زبان پر عبور، بیان پر قدرت کا سکہ بٹھا دیا تھا "نذرِ وطن" پر تبصرہ کرتے ہوئے عالی جناب پی وی نرسمہا راؤ فرماتے ہیں کہ "عارف کا دل جذبہ حب الوطنی سے لبریز ہے، وہ سچے اور پکے ہندوستانی ہیں، ان کا نقطۂ نظر بہت وسیع ہے، ان کی نظمیں ان کے سکولر کردار، جمہوری ذہن، اور سماج وادی مزاج کی آئینہ دار ہیں جن میں اکثر جوش اور جذبہ بھرپور ہے" یہ خراج تحسین وزیر امور خارجہ حکومت ہند کا ہی نہیں بلکہ ایک عظیم ادیب اور افسانہ نگار کا ہے جو نا قدِ ادب بھی ہے۔

ان کا دوسرا مجموعہ "عقیدت کے پھول" اشاعت کے سفر میں دوسرے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اس کا رنگ و آہنگ جدا ہے، حمد و نعت اور منقبت میں، جذبات کی پاکیزگی، نفس کی طہارت، زبان کی لطافت اور بیان پر قدرت کی ضرورت ہوتی ہے، ان سب سے بڑھ کر اس والہانہ محبت و شیفتگی کے جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کا محرک ہوتا ہے، اس کے علاوہ نعت و منقبت گوئی بہت دشوار بھی ہے کیونکہ معمولی سی لغزش دور رس نتائج کی حامل ہو سکتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے ؎

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

اس راہ میں بڑے پیچ و خم اور حوصلہ شکن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہ امر لائق ستائش ہے کہ عارف صاحب نے نہ صرف ان مراحل کو کامیابی سے طے کیا ہے بلکہ زبان و بیان پر پوری قدرت

کا مظاہرہ بھی کیا ہے ۔ جذبہ کی صداقت اور خلوص نے ان کے نعتیہ کلام میں گہرائی اور گیرائی پیدا کر دی کا ہے ۔

پیش نظر تصانیف "قلم کی کاشت" اور "لوزر زندگی" پر کچھ تفصیلی نگاہ ڈالنا چاہتا ہوں ۔ اول الذکر ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا، اور ۷۲ اسی غزلوں پر مشتمل ہے جس میں ابتداء میں ستائیس رباعیاں اور باقی تمام قطعات ہیں ۔

اردو ادب میں غزل قلی قطب شاہ سے لیکر فیض و فراق تک گوناگوں تجربات سے گذری ہے اور ہر تجربہ کے بعد اس کی رعنائی و برنائی میں اضافہ ہی ہوا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اردو ادب کی مقبول ترین صنف غزل رہی ہے تو بے جا نہ ہوگا ۔ اردو کے ہر عظیم شاعر نے عروس غزل کی آرائش و زیبائش کی ہے بلکہ جو کسی وجہ سے گیسوئے غزل سنوارنے میں حصہ نہ لے سکے، انہوں نے کسی اور صنف میں شان تغزل پیدا کر کے اپنی حسرت کی تکمیل کی، غزل کی اشاریت و رمزیت، ایجاز و اختصار، حسن و دلکشی، سوز و گداز، نشاط و انبساط، بے ربطی و انتشار موضوعات کا تنوع، اور رنگ و آہنگ کی کثرت ہر فرد کا دامن دل کھینچتے ہیں، یہ بہ یک وقت سریع الفہم بھی ہے اور بعید الفہم بھی ہے، اس کا لہجہ سامعہ نواز بھی ہے اور مترنم بھی ہے، اس میں شہد کی شیرینی، دم تیغ کی تیزی، دریائے پرشور کی روانی، ٹھہرے ہوئے سمندر کا سکون و سکوت سربلند پہاڑوں کی بلندی، نسیم سحر کی نرم روی، خرام یار کی گل طرازی، شمیم جاں فزا کی عطر بیزی گل کی مہک، غنچہ کی چٹک، سبزہ کی مہک، سبزے کی چمک، برق کی دمک سب کچھ ہے ۔ اردو کے ہر عظیم شاعر نے اس کی جھولی بھری، کسی نے تصوف و تغلف سے روشناس کرایا تو کسی نے سوز و گداز سے، کسی نے اس آبگینہ میں صہبائے تند و تیز بھری تو کسی نے مرصع کاری کی ۔ داغ دہلوی نے غزل کو نشاطیہ لب و لہجہ دیا، اور زبان کے چٹخاروں سے اس کا دامن بھرا، عارف صاحب کو شاعری ورثہ میں ملی ہے، اس لئے داغ دہلوی کے اثرات ان کے کلام میں نمایاں ہیں، داغ زبان کے معاملہ میں سخت گیر تھے، اور ان کا دعویٰ تھا کہ

اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زباں نہیں

یا عر

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ

وغیرہ وغیرہ لیکن عارف بیکانیری کی صاف ستھری زبان پر اکثر جگہ داغ کی زبان کا دھوکا ہوتا ہے۔ مثلاً عر

ڈال دیں ہنس کے گلے میں جو بانہیں اس نے

ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، زبان کی سادگی، صفائی اور روزمرہ کا استعمال ان کے پورے کلام میں موجود ہے۔ کہیں ثقالت اور نامانوسیت نہیں پائی جاتی زبان پر اس قدر قدرت حاصل کر لینا ایک بڑی خوبی ہے، چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

محبوب سے جی کھول کے باتیں ہوں غزل کی
ہنگامۂ ہستی میں یہ فرصت بھی کہیں ہے؟

فرصت نہیں اپنی ہی مصیبت سے ہر اک کو
پوچھے کوئی کیا حال ہے، یہ کس کو پڑی ہے

O

کیسی وفا، کہاں کی محبت، خلوص کیسا
چھوڑو گذر گیا وہ زمانہ گذر گیا

عارف صاحب کی شخصیت اور شاعری میں بہت ہم آہنگی ہے، انہوں نے ان دونوں میں باہمی ربط قائم رکھا اور دورنگی پیدا نہیں ہونے دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری یا ان کا فن، ان کی شخصیت کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ اور ان میں بے ربطی نہیں ہونے پاتی۔ ان کی طبیعت کی سادگی، خلوص، کردار کی عظمت، دردمندی اور انسانی ہمدردی عصری حسیت، زود اثر پذیری جو ان کی شخصیت کی ساخت کے اہم عناصر ہیں انکی

شاعری میں بھی پوری طرح جلوہ گر ہیں، وہ اپنے تجربات و مشاہدات و تاثرات کو بہا خوگر سادہ الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں، جن میں احساس جمال کی چاشنی بھی ہوتی ہے اور جذبہ کی صداقت بھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار، سادگی اور پرکاری کا نمونہ ہیں۔

دل تھا آباد تو جنگل میں مناتے منگل
آج تو شہر بھی سونا نظر آتا ہے مجھے

o

اپنے چہرے کے کیسے داغ نظر آتے ہیں
وقت ہر شخص کو آئینہ دکھا دیتا ہے

o

جذبۂ جنس کی آوارہ مزاجی توبہ
کتنے جسموں کے لئے ذہن کو للچاتا ہے

ان کے کلام میں عصری آگہی بھرپور ملتی ہے، اس دور میں انسان کس قدر اخلاقی پستی کی طرف مائل ہے، ہوس نے، شیرازۂ ہستی کو کس طرح پارہ پارہ کر دیا ہے خود غرضی نے دردمندی کی جگہ لے لی ہے، کس طرح آدمی بندۂ زر بنتا جا رہا ہے، وفا محبت خلوص و ہمدردی، قصۂ پارینہ بن گئے ہیں ؎

کیسی وفا، کہاں کی محبت، خلوص کیا
چھوڑو، گذر گیا وہ زمانہ گذر گیا

o

چاہیں تو آج زہر بھی خالص نہ مل سکے
انساں کا کھیل دیکھئے انساں کی جان سے

یہی نہیں بلکہ انسان کتنا خونخوار ہو گیا ہے۔ اس کی سرشت میں درندگی اور خوں آشامی،

سرایت کر گئی ہے۔ اخباروں کے صفحات اس کی خوں چکاں اور خونریز داستانوں سے سیاہ رہتے ہیں ؎

انساں ہیں کہ شہروں میں خونخوار درندے
معلوم نہیں ہوتا جنگل ہے کہ بستی ہے

O

اس شہر میں روئیں بھی تو ہم روئیں کہاں تک
لاشوں کے جہاں ڈھیر ہیں انبار لگے ہیں

عارف صاحب نے تقریباً ہر جگہ بربریت و سفاکی، خونریزی و درندگی کی آماجگاہ، شہروں کو بتایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دیہات میں اس دور میں بھی، سادہ لوحی، دردمندی، انسانی ہمدردی، اور اخلاص ملتا ہے، لیکن شہروں میں جو انسانوں کا جنگل بن گئے ہیں، آدمی آدمی کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے، ہر چہرہ نقاب پوش نظر آتا ہے، آدمی کئی چہرے رکھتا ہے اور موقع و محل کے تقاضے سے مصنوعی چہرہ لگا لیتا ہے، یہاں تک کہ اس کے سامنے شیطان بے ضرر و بے خطر نظر آتا ہے ؎

اس سے بڑھ کر دشمنِ انسانیت دیکھا نہیں
آدمی سے اب ڈرو شیطاں کا خطرہ نہیں

●

شائستہ زمانہ کا کیا دورِ نفاست ہے
باطن میں عداوت ہے ظاہر میں محبت ہے

اور حالات اس زوال و پستی کی حد تک پہنچ گئے ہیں ؎

کتنی پستی پہ زمانہ اسے لے آیا ہے
آدمی آدمی ہونے سے بھی شرمایا ہے

O

انسانیت کا اس سے بڑا حادثہ نہیں
انساں ہے آپ اپنی نظر سے گرا ہوا

عارف صاحب نے نہ صرف بے باک انداز میں، آدمی کی پستی اور درندگی، خباثت اور بہیمیت کا ہی ذکر کیا ہے بلکہ ان کے وجوہ بھی بتائے ہیں۔ عام محسوسات تو ہر حساس شخص بیان کر سکتا ہے، لیکن ان اسباب و علل کا بیان کرنا جو اس کا باعث ہوتے ہیں، صاحبانِ فکر کا ہی کام ہے۔ انسان عروج کے بجائے زوال کی جانب کیوں مائل ہے۔ اس میں مذموم جذبات کیوں پیدا ہو رہے ہیں ؟ ان سوالوں کے جواب غور و فکر، تجزیہ و تحلیل کے متقاضی ہیں، عارف صاحب نے ان اسباب و علل کی واضح طور پر نشاندہی کی ہے ؎

بہت اداس، بہت مضمحل، بہت غمگیں
یہ زندگی ہے اسے نذر کس کے نام کریں

O

فرصت نہیں اپنی ہی مصیبت سے ہر اک کو
پوچھے کوئی کیا حال ہے ؟ یہ کس کو پڑی ہے

O

گھبرا دیا ہے کتنا غمِ روزگار نے
ہر آدمی کو اپنا ہی سایا بلا سا ہے

O

انساں ہے غم کے بوجھ سے کتنا دبا ہوا
یہ زندگی ہے یا کوئی سینے پہ سنگ ہے

دولت کی غیر مساوی تقسیم، مستقبل کی تاریکی، ارباب اقتدار کی عہدے کے نشہ میں عوام سے بے تعلقی اور بے توجہی برتنا، فلک بوس عمارتوں کا، پڑوس کی زمین دوز جھونپڑیوں کا مذاق اڑانا، آدمی آدمی میں اس قدر فرق ہونا کہ ایک کا خون پانی سے ارزاں اور دوسرے کا خون لعل و جواہر سے بھی گراں، ان امتیازات نے انسان کی طبیعت میں چڑچڑاپن، جھلاہٹ اور بیزاری پیدا کر دی ہے، یہ چڑچڑاپن اور بیزاری تخریب کاری کا جذبہ پیدا کرتی ہے، بے روزگاری اور بیکاری اس جذبہ کو ہوا دیتی ہے، اس مرض کا علاج نہ قانون ہے، نہ سخت گیری ہے، زخم پر مرہم کا کام تو کر سکتے ہیں لیکن جب تک فاسد مادہ کا علاج نہ کیا جائے گا، مرض دفع نہیں ہو سکتا، پھوڑے کا منہ اگر ایک جگہ سے بند کر دیا گیا تو وہ دوسری جگہ فاسد مواد کے اخراج کا راستہ بنانے کی کوشش کرے گا، یہ مرض تب ہی دفع ہو سکتا ہے جب اس کا صحیح علاج کیا جائے۔ عارف صاحب نے بہت غور و فکر کرکے اس کا علاج بھی پیش کیا ہے اور حقیقتاً وہی واحد علاج ہے وہ کہتے ہیں ؎

غنچہ و گل کی مہک، چاند ستاروں کی چمک
کوٹھیوں، بنگلوں سے، محلوں سے نکالی جائے

جب تک گل کی مہک، غنچہ کی چٹک، شمع کا نور اور حسن کا سرور، کوٹھیوں اور بنگلوں میں محصور ہیں تب تک بھوکوں اور فاقہ زدہ عوام کا احساسِ محرومی دور نہیں ہو سکتا، جب تک یہ احساس رہے گا کہ ؎

جگمگاتی کوٹھیاں، بنگلے، فلک منزل مکاں
کتنے سینوں پر کھڑے ہیں یہ مگر دیکھے گا کون؟

اس وقت تک انسانیت کا درد و کرب ختم نہ ہوگا، اس لئے وہ اہل دل کو خبردار کر رہے ہیں کہ وہ خطرناک کھیل، کھیل رہے ہیں ؎

اہلِ دولت ڈس نہ جائے دیکھنا
سانپ دولت کا شناانڈھا بھی ہے

ایک دن وہ بھی آئے گا کہ ان کی دولت ہی ان کے لئے زہر بن جائے گی اور یہ زہر کا پیالہ انہیں پینا پڑے گا، اب بھی وقت ہے کہ وہ سنبھل جائیں اور دیوار کی تحریر کو پڑھیں، عارف صاحب جب ایک طرف بھوک کے مارے ہوئے اور زندگی کی ضروریات سے محروم انسان کی چیخ و پکار کی طرف غور کرتے ہیں اور دوسری طرف شیش محلوں میں رنگ رلیاں منانے والوں کی بے حسی اور غریبوں کی طرف سے بے نیازی کی طرف دھیان دیتے ہیں تو یک لخت شعر کی زبان میں سوال کرتے ہیں ؎

پتھراؤ کے بغیر نہ مانیں گے کیا کبھی!
چیخوں کی جن کے شیش محل میں صدا نہ جائے

یہی نہیں بلکہ وہ احساسِ محرومی کے شکار عوام کو عزم و حوصلے سے کوشش اور جد و جہد کرنے کی تلقین بھی کرتے ہیں ؎

جانے دو ڈوبتے سورج کی جو لالی جائے
زندگی ایک نئی صبح میں ڈھالی جائے

زندگی کتنی تڑپتی ہے اُجالوں کے لئے
یہ قدامت کے اندھیروں سے نکالی جائے

عارف صاحب نہ فانی کی طرح زندگی سے مایوسی کا شکار ہیں، نہ میر کی طرح غم و الم میں گرفتار ہیں بلکہ ان کا نقطۂ نظر رجائی ہے وہ گرد و پیش کے دردناک حالات سے مایوس نہیں ہیں بلکہ ایک نئی صبح کے طلوع ہونے کی خوش خبری دیتے ہیں، وہ انسان کی پستی و زوال سے بھی ناامید نہیں ہیں بلکہ عزم و یقین کے ساتھ کہتے ہیں ؎

زخموں کو پھول، اشکوں کو گوہر بنائینگے
ہم خود بدل کے رکھ دیں گے نقشہ حیات کا

تاریکی روشنی کا پیش خیمہ ہوتی ہے، ناسازگار حالات ہی سازگار فضا پیدا کرتے ہیں، خرابی سے خوبی اور بدحالی سے خوشحالی جنم لیتی ہے ؎

روشنی میں بھی نظر کچھ نہیں آتا اکثر
یا اندھیرا بھی نئی راہ دکھاتا ہے مجھے

لیکن وہ اس نئی صبح اور حیات نو کو پیار کے ذریعہ لانا چاہتے ہیں، اور اسی کی تلقین کرتے ہیں محبت عارف صاحب کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے، خدا سے محبت، رسولؐ سے محبت، وطن سے محبت اور انسانوں سے محبت ان کی شخصیت کے ایوان کے یہ چار اہم ستون ہیں، وہ جن اصولوں پر خود بھی عمل پیرا ہیں دوسروں کو بھی اس پر چلنے کی ہدایت کرتے ہیں، یہ جذبہ غیر کو اپنا، دشمن کو دوست اور اجنبی کو محبوب بنا دیتا ہے ؎

پیار کا جذبہ بھی کیا خواب دکھا دیتا ہے
اجنبی چہرہ کو محبوب بنا دیتا ہے

جس میں احساسِ جمال ہوتا ہے اس میں پیار کا جذبہ خود بخود کروٹیں لینے لگتا ہے۔ عارف صاحب نے حسن پرستی کی یا نہیں، نقد دل کا سودا کیا یا نہیں کیا، یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ دعوائے پارسائی کے باوجود، زاہد خشک نہیں ہیں، ان میں احساسِ جمال ہے اور حسن پرستی ان کی جبلت میں داخل ہے وہ حسن کے جلوؤں سے مسحور بھی ہوئے ہیں اور انہیں اپنے نہاں خانۂ دل میں محفوظ بھی کیا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو اس قسم کے اشعار جو خالص تجرباتی اور محسوساتی ہیں ان کی قلم سے تراوش نہ کرتے، اس شعر کی محاکاتی کیفیت درحقیقت کو دیکھئے ؎

حسینوں کے یہی اقرار کے انداز ہوتے ہیں
نظر جھکنا، لجانا، مسکرا دینا، مکر جانا

داغ جب کسی شوخ و شریر پری رُو کو دیکھ لیتے تھے تو ان کی طبیعت بلا کی گدگداتی تھی کیونکہ وہ رند شاہد باز تھے، لیکن عارف صاحب کسی حسین چہرہ کے دیدار کو عبادت سے کم نہیں سمجھتے ہیں ؎

حسین چہرہ کسی کا دیکھ لینا
عبادت یہ بھی عارف کم نہیں ہے

یہ عبادت ہی نہیں تسکینِ روح و جاں بھی ہے ؎

ناز و ادائے حسن کا پیکر کہیں ملے
تسکینِ روح و جاں ہو وہ منظر کہیں ملے

یہی نہیں بلکہ ان غزلوں میں حسن و عشق سے بھرپور اشعار ملتے ہیں ؎

وحشت کا حال یہ کہ بدن اپنا نوچ لیں
دامن نہیں ہے چاک گریباں کریں تو کیا

○

نہیں احساس ہو جائے گا خود ہی ایک دن اس کا
بہت مل جائیں گے ہم سے مگر وہ ہم نہیں ہوں گے

○

پھول، خوشبو، شعر و نغمہ، ناز و انداز و حیا
دیکھ کر حسنِ جواں کو کتنے مر جاتے ہیں لوگ

○

ڈال دیں ہنس کے گلے میں مرے بانہیں ہنس کی
حسن کیا عشق کو سمجھائے کہ کیا مانگے ہے

○

میں خوب جانتا ہوں تقاضے شباب کے
مجھ کو ہے اعتبار تری بات بات کا

ان کی جانِ حیات کا رنگ و روپ بھی دیکھ لیجئے ؎

سرخی گلوں کی چاند ستاروں کی روشنی
یہ رنگ و روپ ہے مری جانِ حیات کا

○

وہ حسن وہ شباب اس کا یہ درجۂ وہ قیامت کی
چلتی ہوئی دنیا بھی دیکھے تو ٹھہر جائے

○

پہنا ہے اس نے جیسے بہاروں کا پیرہن
کیسا نفیس ذوق ہے کیا خوش لباس ہے

○

فضا مہکتی گئی ہے خرام ناز کے ساتھ
چلے وہ جیسے مہکتی ہوئی بہار چلے

ہندوستان میں آزادی کے پینتیس برس بعد بھی فرقہ پرستی کی لعنت ختم نہیں ہوئی کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی بات پر فسادات ہو جاتے ہیں، خون خرابہ ہوتا ہے اور اکثر بے گناہ مذہبی جنون کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب خوں ریزی کی اجازت نہیں دیتا لیکن مذہب کے ٹھیکیدار آپس میں ایسی نفرت پیدا کر دیتے ہیں کہ انسان انسان کے خون

کا پیا سا ہو جاتا ہے۔ جب تک یہ مذہبی جنون کم نہ ہوگا مختلف مذاہب کے تنگ نظر بزعم خود محافظ مذہب اپنا رویہ تبدیل نہیں کریں گے اس وقت تک مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا باہمی اختلاط ممکن نہیں، اس نظریہ کو عارف صاحب نے عام اور مستعمل علامتوں کے ذریعہ بیان کیا ہے مولانا حسرت موہانی بھی اسی خیال کے حامی تھے، جب تک شیخ و برہمن کے امتیازات باقی ہیں تب تک یہ ہنگامہ آرائی ہوتی رہے گی چنانچہ عارف صاحب فرماتے ہیں ؎

جب تک رہیں گے شیخ و برہمن جہاں میں
ممکن نہیں کہ سرحدِ دیر و حرم ملے

عارف صاحب سیاست میں عملی حصہ لیتے ہیں اور ایک عظیم سیاسی جماعت کے سرگرم رکن ہیں، بقول ان کے یہ ان کا پیشہ بن چکی ہے، لیکن عارف صاحب نے سیاست کو اپنی شاعری پر اثر انداز نہیں ہونے دیا، ان کے کلام میں سیاست کی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی، یہ ان کی بڑی خوبی ہے، اگر وہ سیاست کو اپنی شاعری میں داخل کرتے تو ان کی شاعری پروپیگنڈا بن کے رہ جاتی اور پروپیگنڈا نہ ادب کا جز ہے نہ اس میں استقامت و پائیداری ہے، یہ جگنو کی چمک ہوتی ہے، سیاسی نظریات انقلاب پذیر ہیں لیکن ادبی روایات و خیالات فنا نہیں ہوتے اس لئے ڈاکٹر عنوان چشتی کا یہ خیال کہ عثمان عارف صداقتوں کے شاعر ہیں بالکل درست ہے، میں اس سے سو فی صد متفق ہوں اور جب عثمان عارف صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ؎

یہ ناز، یہ غمزے، یہ کرشمے، یہ ادائیں
اشعار حسیں ہیں مری رنگیں غزل کے

تو ان کا دعویٰ بالکل درست اور حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے، وہ وادیٔ عشق کے ہر نشیب و فراز سے واقف ہیں، اور کیفیات و واردات عشق کے رمز شناس ہیں۔

عارف صاحب کی چوتھی تصنیف "نورزندگی" رباعیات و قطعات کا مجموعہ ہے، ان کے مجموعی کلام کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کے نگار خانے

میں تقریباً تمام اصنافِ سخن اپنی پوری تابانیوں جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہیں ان کا یہ مختصر مگر وقیع مجموعہ بھی دامن دل کھینچنے کو کافی ہے عارف صاحب نے اس مجموعہ کی ابتدا نہایت شائستگی و اخلاق کے ساتھ جو ان کی سیرت کا خاصہ ہے اردو پر ایک رباعی سے کی ہے ؎

شائستہ آداب محبت اُردو
ہے اصل میں دریائے لطافت اُردو
گنجینۂ اخلاق و مروت کہئے
گہوارۂ تہذیب و شرافت اُردو

اردو کی ان تمام مذکورہ خوبیوں کا عکس عارف صاحب کی سیرت میں بھی نظر آتا ہے اور یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اُردو ایک تہذیب ہے ایک کلچر ہے۔

رباعی اور دوبیتی قطعات کہنے کا فن دشوار ہے کیونکہ ان دونوں میں چار مصرعوں میں شاعر کو اپنا ما فی الضمیر بیان کرنا پڑتا ہے۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کرنا پڑتا ہے اس لئے برجستہ اور موزوں الفاظ کا انتخاب، خیال کی ندرت، تسلسل و ربط وغیرہ ان کے لوازم ہیں، اردو ادب میں رباعیات اور دوبیتی قطعات کا ذخیرہ زیادہ نہیں ہے۔ اکثر مشاہیر شعراء نے ہی ان اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اس لئے عارف صاحب کا یہ مجموعہ اردو ادب میں اہم و وقیع اضافہ ہے۔ یہ مجموعہ نہ صرف ان کی پختہ مشقی اور قادرالکلامی کا بین ثبوت ہے بلکہ دعوت فکر و نظر بھی دیتا ہے۔ موضوعات کا تنوع، طرزِ ادا کی دلکشی، لب و لہجہ کی جاذبیت، صفائی، سادگی اور سلاست ان کے کلام میں ایک فنی رچاؤ پیدا کر دیتے ہیں انہوں نے اپنے قطعات و رباعیات کا موضوع اخلاق، پیچیدہ مسائلِ حیات، اور انسانیت کو بنایا ہے اور تہذیب نو کی ظاہرا چمک دمک، اخلاقی پستی اور عصر حاضر کی بے یقینی اور اضطراب پر بھرپور وار کیا ہے، خوش آئند زندگی کی بشارت دی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

سیلاب حوادث کی فراوانی ہے
انسان کو کس درجہ پریشانی ہے
اللہ سے پھر بھی ہے بغاوت قائم
جو کام ہے انساں کا شیطانی ہے

ہے اصل حقیقت سے تو مہجور ابھی
تاریک ہے دل آنکھ ہے بے نور ابھی
اے چاند کی دنیا میں پہنچنے والے
انسان کی منزل ہے بہت دور ابھی

## قطعہ

رنج راحت کا پیش خیمہ ہے
غم کو کیوں آپ غم سمجھتے ہیں
اشک شبنم سے پھول کھلتے ہیں
آپ کیا جانیں! ہم سمجھتے ہیں

غرض عثمان عارف صاحب نے کشتِ شعر میں وہ رنگا رنگ گل بوٹے کھلائے ہیں جو اپنی دائمی بہار دکھاتے رہیں گے، اور اپنی خوشبو سے مشام جاں کو معطر کرتے رہیں گے، اُن کی شاعری میں جدید و قدیم کا خوشنما سنگم ہے انہوں نے نہ صالح قدیم روایات سے منہ موڑا ہے نہ جدید تقاضوں سے دامن کشی کی ہے، انہوں نے انسان کی فلاح و درستی کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے تاکہ زندگی خوشگوار بن سکے اس لئے ان کی شاعری افادی اور با مقصد ہے۔ وہ عظیم شعری روایات کے امین بھی ہیں اور نئے تجربوں کے حامل بھی ہیں، انہوں نے زندگی کو بہت قریب اور برت کے دیکھا ہے اس لئے ان کے جذبے میں صداقت ہے ●●

**نوٹ** یہ مقالہ ماہنامہ شاعر کی جلد ۵۵ شمارہ ۹-۱۰ میں گوشہ عثمان عارف نقشبندی کے تحت شائع ہو چکا ہے۔ ادبی حلقوں میں اسے سراہا گیا اور تعریفی و توصیفی خطوط میں مجھ سے اس مقالہ کی نقل بھیجنے کی بھی فرمائش کی گئی۔ ان سب فرمائشوں کی تعمیل کا یہی طریقہ نظر آیا کہ اسکو نخلستان میں دوبارہ شائع کر دیا جائے۔ اس سے اس فروگذاشت کی بھی کسی حد تک تلافی ہو جائے گی کہ جو کام نخلستان کو کرنا چاہئے تھا اس کو ماہنامہ شاعر نے انجام دیا۔ راجستھان کے شاعروں اور ادیبوں کو عزت مآب عارف صاحب پر ناز ہے۔ یہ مقالہ جب مکمل ہوا تب عارف صاحب مرکزی وزارت میں نائب وزیر تھے اب خدا کے فضل سے اتر پردیش کے گورنر ہیں۔ وہ اس اعلیٰ ترین عہدہ کے لائق و مستحق ہیں میں حکومت ہند کے حسن انتخاب کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا، میری دعا ہے کہ اُن کے مرتبہ میں مزید اضافہ ہو۔

زیدی

---

فروری ۱۹۸۳ء میں راجستھان اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام اردو کتابت اسکول کا قائم کیا گیا تھا۔ یہ تعلیمی مرکز اب بارآور ہو گیا ہے، پندرہ طلبہ و طالبات اس سال مارچ میں فارغ التحصیل ہو چکے ہیں، دوسری خوشی کی بات یہ ہے کہ اسکے ہیڈ کاتب قائد علی صاحب نے اپنی کتابت کے دو نمونے سرینگر میں ہونے والی کل ہند نمائشی مقابلہ میں شامل کئے تھے۔ ان دونوں نمونوں کو قابل تعریف قرار دیتے ہوئے ان پر قائد علی صاحب کو پانچ سو روپیہ کا نقد انعام دیا گیا۔ اس کے لئے وہ قابل مبارکباد ہیں، مجھے امید ہے کہ میرے عزیز شاگرد قائد علی صاحب کی قیادت میں یہ مرکز خوب ترقی کریگا۔

(مدیر)

# مولانا محمد منظور کوثر سندیلوی

خواجہ محمد صلاح الدین عشقی فاروقی یوسفی تاجی
حکیم ہاؤس اجمیری گیٹ جے پور

**ایک ضروری تصحیح** | عزیزی اسلام اشرف ریسرچ سکالر راجستھان نے حضرت کوثرؔ کے متعلق جو مقالہ رسالہ نخلستان جنوری تا جون ۱۹۸۶ء میں تحریر فرمایا ہے اُس کے عنوان میں "سلسلۂ غالب کے ایک باکمال شاعر مولانا کوثر سندیلوی" درج کیا ہے حضرت کوثر کو سلسلۂ غالب لکھنے میں کسی غلط اطلاع کی بنا پر غلطی ہوئی ہے حضرت کوثرؔ مرزا محمد تقی بیگ مائلؔ دہلوی کے شاگرد تھے اور حضرت مرزا مائلؔ سلطان الشعراء سیدامراء مرزا انورؔ دہلوی کے شاگرد تھے اور حضرت انورؔ حضرت محمد ابراہیم ذوقؔ کے شاگرد رشید تھے، یہ بات صباؔ صاحب آنجہانی جانشین مرزا مائلؔ سے میں نے بارہا سنی ہے اور صباؔ صاحب آنجہانی نے جو مقالہ جریدۂ نخلستان کو مرزا مائلؔ صاحب کے متعلق لکھ کر بھیجا تھا اُس میں بھی درج ہے۔

(۲) ایک بات اور بھی صاف کرنا ضروری ہوگیا ہے صباؔ صاحب نے حضرت انورؔ کو سید امراؤ مرزا انورؔ اپنے مقالہ میں لکھا ہے، سید و مرزا کی یکجائی محل نظر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ان کا خاندانی شاہی خطاب ہوگا جیسا کہ والی جے پور مرزا راجہ جے سنگھ والی منوہر پور مرزا منوہر، شاہی زمانے میں مرزا کا خطاب سب سے اعلیٰ ہوتا تھا اور یہ شاہی خاندان سے یگانگت کا خطاب ہوتا تھا۔

(۳) ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی سے غالبی میکدے کے میگسار حضرت آگاہ و راقمؔ اور خانقاہ ذوق

کے فیض یافتہ حضرت انور و ظہیر تشریف لائے تھے حضرت ظہیر کے متعلق میں نے جیسا سُنا ہے لکھا ہے میرے پاس اس کا تحریری ثبوت نہیں ہے کہ کس کے شاگرد تھے۔

(۲) عزیزی اسلام اشرف کا مقالہ حضرت مولانا کوثر سندیلوی پر ایک مختصر مگر جامع مقالہ بہت اچھے سلیقہ سے عزیزم اسلام اشرف نے پیش کر کے جے پور والوں پر احسان عظیم ہی نہیں فرمایا ہے بلکہ قارئین نخلستان کو بھی اس باکمال درویش شاعر سے روشناس کرایا ہے جس کو جے پور کے لوگ بھول سے گئے تھے حضرت کے دیکھنے والوں کی بھولی بسری یاد کو تازہ فرمایا ہے مگر اس مقالہ میں حضرت قبلہ کی زندگی کے حالات اور شاعری کے متعلق واقعات تفصیل سے نہیں آئے اسی لئے میں نے عریضہ جو حسن نظر کے لئے بھیجا ہے وعدہ کیا تھا کہ میں حضرت کے متعلق آپکو شاگردوں سے حالات معلوم کر کے اور دیگر طور پر معلومات بہم کر کے جلد ہی مقالہ پیش کروں گا۔ اس سلسلے میں عزیزی عبدالرحمٰن صاحب پارسا کوثری نے مجھے تعاون دیا ہے ایک کتاب "موج کوثر" جو آپ کے حقیقی بھتیجے نفیس سندیلوی سلمہٗ نے مرتب کی ہے دیکر احسان کیا ہے وہاں اپنی ۲۳ ۲۴ سالہ حضرت کی خدمت ورفاقت میں رہتے ہوئے کچھ زبانی حالات بھی بتلائے ہیں اور لوگوں سے بھی کچھ حالات معلوم ہوئے ہیں اُن کی روشنی میں میں اپنی عقیدت و محبت کا یہ گلدستہ پیش کر رہا ہوں۔

(۳) اسم گرامی:۔ آپ کا تاریخی نام محمد منظور تھا ویسے جے پور کے لوگ آپکو منظور احمد منظور علی کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔

(۴) تخلص:۔ جے پور میں آنے سے پہلے جب آپ فیروز پور میں اپنے نانا کی سرپرستی میں تربیت پا رہے تھے۔ نالاں تخلص سے اپنا کلام پیش کرتے تھے جے پور آتے پر جب مولانا تسنیم سے آپ کے دوستانہ تعلقات ہوئے تو اُس سے متاثر ہو کر آپ نے اپنا تخلص کوثر تجویز کیا۔ اور اسی نام سے آپ جانے پہچانے جاتے ہیں۔

(۵) سلسلہ نسب :- حضرت مولانا کوثر کا نسبی سلسلہ ۳۴ واسطوں سے امیر المومنین سیدنا ابوبکر صدیق رضہ سے ملتا ہے۔

(۶) حالات :- حضرت مولانا کوثر مرحوم و مغفور اُن باقیات الصالحات اور مغتنمات زمانہ سے تھے جن پر علم و فن شعر و ادب کو بجا طور پر ناز تھا اور اُن کی وفاتِ حسرت آیات سے دنیائے شعر و ادب کو جو نقصان عظیم پہنچا ہے اُس کی تلافی محال ہے۔

(۷) خاندانی حالات و مقام پیدائش :- حضرت کوثر حجۃ المحققین مولانا احمد اللہ رح شارح مسلم المخاطب بہ ملک العلماء فضل اللہ قادری شاہی طبیب خاص محمد شاہ بادشاہ دہلی کی چھٹی پشت میں تھے، آپ ۱۲۸۸ھ میں بمقام اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے آپکے آباؤ اجداد باکمال عالم، خدا رسیدہ بزرگ درویش و فن سپہ گری، شاعری میں کامل گذرے ہیں، آپ کے بزرگوں کے متعلق تذکرہ علمائے ہند میں حالات درج ہیں، آپکے جد امجد شاہ اکبر علی علم ظاہری و باطنی میں باکمال بزرگ تھے اور اُس زمانہ کے مشائخین کبار میں شمار ہوتے تھے، حزب البحر کی ایک بسیط شرح آپ کی یادگار ہے۔ (تذکرہ علمائے ہند ص۵۲)

(۸) سندیلہ سے اکبر آباد کی سکونت :- آپ کے دادا حضرت کاظم علی مرحوم سندیلے سے ترک سکونت کر کے اکبر آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، جنکو ۱۲ سال کی عمر میں ہی دستار فضیلت سے سرفراز کر دیا گیا تھا آپ کے زمانے میں ایک بیباک پادری نے اسلام پر ناپاک حملے کئے تھے جس کا آپنے اور مولانا حسرت موہانی کے دادا سید آل حسن صاحب نے مدلل جواب دیکر اُس کا منہ بند کیا تھا۔

(۸) آپ کے والد مولانا وارث علی :- مولانا کوثر کے والد ماجد مولانا وارث علی عالم عدیم المثل اور فاضل بے عدیل تھے، علوم عربی و فارسی کے منتہی، سنسکرت، علم جوتش، و ہیئت کے ماہر، فنِ شاعری و خوشنویسی میں یکتائے زمانہ تھے، آپ اپنے کمالات ظاہری



[redacted]

و باطن کی پردہ پوشی کرتے تھے، طبعی آزادی، وارستہ مزاجی کی وجہ سے شہرت سے گریز فرماتے تھے، ملازمت کی پابندی بھی آپ کو پسند نہیں تھی۔ آپکو انشا، پردازی سے فطری لگاؤ تھا، مشکل سے مشکل اور ادق سے ادق مضمون قلم برداشتہ لکھتے، عربی، انگریزی، سنسکرت کے ترجمہ کرنے میں آپکو ید طولیٰ حاصل تھا، آپکے قلم سے جو لفظ لکھا گیا وہ پتھر کی لکیر ہوتا تھا آپ نظر ثانی نہیں فرماتے تھے، آپ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ کوئی شخص آپ کو لکھا پڑھا سمجھ ہی نہیں سکتا تھا، آپ اکثر و بیشتر بازار میں مجذوبانہ استغراق کی حالت میں بیٹھتے، چلتے پھرتے نظر آتے تھے اس حالت میں آپ کسی عزیز و دوست کی طرف بھی توجہ نہیں فرماتے تھے، آپ میں مجذوب سالک کے جملہ اوصاف موجود تھے، آپ کی شب کی حالت کا حال کسی پر ظاہر نہیں ہوا۔ آپکے پاس B.A - M.A کے کافی طالب علم، عربی، فارسی انگریزی، سنسکرت پڑھنے آتے تھے آپ کوئی معاوضہ نہ لیکر مفت پڑھاتے تھے، آپ کثیر التصانیف تھے جو آپ کی وارستہ مزاجی سے محفوظ رہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) شمس التواریخ ۳ حصے (۲) سانحہ کربلا (۳) واقعہ کربلا (۴) رسالہ عروض،
(۵) ہدایت النحو (۶) حیرت (۷) ہدایت الادب فی لسان الادب (۸) مصباح الادب
(۹) رسالہ صرف و نحو۔

آپ نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھنا شروع کی تھی اس کے لیے بہت سی کتابیں اور مواد اکٹھا کیا تھا، دو پاروں کی تفسیر مکمل ہو گئی تھی یہ دو پاروں کی تفسیر کتب خانہ محمدیہ اکبرآباد میں محفوظ ہیں، باقی پاروں کی تفسیر کے لئے اجل نے مہلت نہیں دی، یہ دو پاروں کی تفسیر اپنا مقام و مرتبہ رکھتی ہے، اس کے علاوہ ہفت سورہ مطبع عثمانی ۱۳۱۸ھ و پنجسورہ مطبوعہ عثمانی پریس ۱۹۰۲ء میں تفسیر کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ آپ نے اخبار الموسم اسلام بھی نکالا اور جنتری تقویم حسینی کے نام سے مرتب فرماتے رہے، آخری مضمون متعلق سل و دق شائع ہوا تھا۔ آپ کی بہت سی تصانیف لوگوں نے حاصل کر کے اپنے نام سے شائع کرائیں ـــ

انسائکلوپیڈیا بھی لکھنے کا ارادہ تھا اس کے لئے مواد بھی جمع کر لیا تھا مگر اچانک موت نے یہ آرزو پوری نہیں ہونے دی، ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں ۶۲ سال کی عمر میں اِس عالم سے عالمِ قدسی کی طرف کوچ فرما گئے۔
میں نے آپ کے والد کے حالات تفصیل سے اس لئے لکھے ہیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ آپ کسی قابل بزرگ عالم فاضل باپ کے خلف تھے۔

(۹) **حالات مولانا کوثرؔ** :۔ حضرت قبلہ مولانا کوثرؔ نے یہ جملہ صفات اپنے والد سے ورثہ میں پائی ہیں صرف انگریزی، سنسکرت کی تعلیم نہیں تھی، باقی تمام اوصاف آپ میں موجود تھے، خاص طور پر مجذوبانہ اوصاف، میرا ایمان ہے کہ آپ مجذوب سالک تھے میں نے بازار میں ان کو چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے اس حالت میں دیکھا ہے۔ آپ کو علم ادب اور جذب وسلوک، وارفتگی، وارستگی کی دولت کماحقہٗ ورثہ میں ملی تھی، ہر وقت محویت استغراق کی حالت میں رہتے تھے، حضرت قبلہ بابا ذہین شاہ صاحب تاجیؒ نے احمرؔ مرحوم کے فوٹو کے پیچھے ایک شعر لکھا تھا

؎ یاد ماضی کہ حال میں گم ہے
احمرؔ اپنے خیال میں گم ہے

اگر بجائے احمرؔ کے کوثرؔ لکھدیا جائے تو یہ شعر آپ کی حالت پر پورا اترتا ہے، اُس زمانے میں صرف جے پور میں تانگے اِکّے چلتے تھے، چلانے والا زور زور سے آواز لگاتا چلتا تھا، کاریں، بسیں اسکوٹر وغیرہ نہیں تھے۔ آپ چاندپول اسکول سے رام گنج بازار تک عالمِ محویت میں ہی سفر کرتے جو ٹریفک کا زور آجکل ہے اگر ویسا اُس زمانے میں ہوتا تو آپ کے لئے خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ آپ کے والد کی وارستہ مزاجی کے باعث آپ کے نانا شیخ امید علی اور ماموں شیخ جاوید علی آپکو بچپن میں ہی ازراہِ محبت فیروز پور جھرکہ لے گئے وہاں ہی آپ کی تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ مگر میرا ایمان ہے کہ اگر آپ اپنے والد کی نگرانی میں تربیت

پاتے تو اس گوہرِ نایاب کی آب و تاب کچھ اور زیادہ تابناک ہوتی مگر آپ کو الولد سرٌ لابیہ کے مطابق فطرت نے وہ اوصاف مرحمت فرما دیئے تھے۔

(۱۰) **آپ کی جے پور میں آمد** :- آپ ۱۸۹۶ء کے قریب جے پور تشریف لائے آپکے بھائی حاجی شیخ علی صاحب علوی نے آپکا فارسی عربی کی، یہی پر تقرر کرا دیا تھا جو آپنے بادلِ ناخواستہ منظور کیا تھا۔

(۱۱) **سخاوت و ایثار** :- آپ کو اُس زمانے میں ۴۰ یا ۵۰ روپیہ جھاڑ شاہی تنخواہ ملتی تھی یہ جھاڑ شاہی جے پور اسٹیٹ کا سکّہ اصلی چاندی کا ہوتا تھا جس کی قیمت کلدار روپیہ سے ایک دو آنہ زیادہ ہوتی تھی اس قلیل تنخواہ میں بھی آپ کی داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ جس روز تنخواہ ملتی اسکول کے دروازے پر ضرورتمندوں کا مجمع ہوتا تھا آپ اسکول سے باہر آتے ان فقیروں، یتیموں اور بیواؤں کو جس کا جو حصّہ مقرر کر رکھا ہوتا اُس کو اس طرح دیتے کہ ایک کو دوسرے کا حال معلوم نہیں ہوتا، ویسے راہ چلتے کسی نے سوال کیا فوراً اس کے ہاتھ میں کچھ رکھ کر مٹھی بند کر دیتے تھے اگر کسی نے کھانے کا سوال کیا تو اپنے ساتھ لیجا کر ہوٹل پر اپنے سامنے کھانا کھلواتے تھے حاجتمنداں کو خوب پہچانتے تھے، آپ کے کاغذات میں ایسے بہت سے خطوط ملے ہیں جن میں مالی امداد کی استدعا کی گئی ہے، ایسی قلیل تنخواہ میں یہ فیاضی اپنی جگہ ایک مقام رکھتی ہے حیرت ہوتی ہے کہ خود کے گھر کا خرچ کیسے چلتا ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ اُس زمانے میں ایک روپیہ کے ۱۷-۱۸ سیر گندم۔ عہ کا پونے دو سیر گھی، چار پانچ سیر شکر، چار سیر دودھ اور اشیاء بھی اسی نسبت سے ارزاں تھیں مگر اُس قلیل تنخواہ میں بھی برکت تھی نہ کہ آجکل کی بے برکتی، بقول جوش مرحوم ؎

حال کے سکّہ کو گر ماضی کا سکّہ دیکھ لے
سو روپیہ کے نوٹ کے منہ پر دوّنی تھوک دے

ملازمت کی پابندی آپکو بہت ناگوار تھی، جب آپکی پنشن ہو گئی تو آپنے سکون کا سانس لیا۔

(۱۲) **تعلیم** :- آپ نے فیروز پور جھرکہ میں دستورِ قدیم کے مطابق تعلیم پائی، عربی فارسی کی تحصیل کی، آپ نہایت ذہین و ذکی تھے حافظہ قوی تھا۔ مطالعہ عمیق تھا فارسی کا انتہائی ذوق تھا۔ فیروز پور جھرکہ میں آپ کے استاد مولوی عبد المجید پانی پتی تھے ان کو شاعری کا بڑا شوق تھا مشاعروں میں غزل پڑھتے تھے آپ نے غزل لکھنا شروع کی تو اپنے استاد کو دکھائی، وہ حیرت میں پڑ گئے اور پھر اُن کا یہ دستور ہوگیا تھا کہ اپنی غزل بھی آپ سے ہی لکھوا کر مشاعرے میں پڑھتے تھے۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

آپ وہاں نالاں تخلص فرماتے تھے جیسا کہ اوپر درج کیا جاچکا ہے۔

(۱۳) **شاعری کی ابتداء** :- آپ نے اپنی ایک غزل کے لئے فارسی میں نوٹ درج کیا ہے (اول بی غزل گفتہ ام جس پرچے پر یہ نوٹ ہے وہ پرچہ چاک ہے صرف دو شعر لکھے رہ گئے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) آیا مگر خیال عدو تم کو اے صنم
یادش بخیر تم نے کہا کچھ نہ کچھ تو ہے

(۲) شاید رقیب بھی میرا کنبہ ہے اے خدا
کہ سنگدل کے دل میں جو چاہ کچھ نہ کچھ تو ہے

مگر اس غزل کے بعد ہی دوسری غزل ہے جس پر یکم محرم ۱۳۰۲ھ درج ہے اُس غزل کا مطلع ہے

نہ بھولیں گے کبھی اے عید کے دن تیرے احسان کو
گلے ملوایا تو نے ہم سے آج اُس ماہ تاباں کو

آپ کی پیدائش ۱۲۵۸ء ہے اس لحاظ سے آپکی عمر اُسوقت ۱۴ - ۱۳ سال کی تھی آپ کے اس جوش اور زورِ طبع میں اُس عمر میں ہی سودا کی جھلک نظر آ رہی ہے ویسے بھی مولانا کوثر ہمیشہ سودا کے مداح رہے ہیں اسی قسم کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

سر ہے اچھا جو سلامت تو خطر کچھ بھی نہیں
(۱) کیا ہے زنداں میں اگر رخنہ در کچھ بھی نہیں

(۲) آہ سوزاں کا ارادہ ہے جلا دے ہم کو
کہتے ہیں دیدہ گریاں کہ بہا دیکھیں تو

فروز پور جھرکہ میں جہاں آپ کا قیام تھا وہاں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کا قیام بھی، اپنے ایک عزیز پنڈت جیون رام تحصیلدار کے سلسلہ تعلیم تھا۔ آپ کے اُن سے برادرانہ تعلقات ہو گئے تھے۔ جو تا زندگی قائم رہے ہر ایک ایک دوسرے کو بھائی کہتا تھا حضرت صبا آنجہانی جب دہلی جا رہے تھے آپ نے ایک قطعہ لکھ کر بھیجا۔

جا کے دلی میں بھائی کیفی سے
کہیو پیغام یہ صبا میرا
اور ساتھی تو چل بسے، کوئی
رونے والا نہیں رہا میرا
چھوڑ کر تم کہیں نہ چل دینا
تم کو کہنا ہے مرثیہ میرا

کیفی صاحب نے اس کے جواب میں یہ قطعہ لکھ کر صبا صاحب کے ساتھ بھیجا،

جا کے جے پور بھائی کوثر کو — کہنا پیغام یہ صبا میرا
تم سے پہلے ہے میرا عزم سفر — جوں توں لکھ لینا مرثیہ میرا
اس وصیت کو میری رکھنا یاد — کیجیے گا نہ غم ذرا میرا

ایسا ہی ہوا اور کیفی صاحب آپ سے پہلے چل بسے آپ نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہوگا مگر آپ کے پراگندہ کاغذات میں کچھ نہ ملا۔

**شاگردی وجے پور میں پہلی طرحی غزل** جب آپ جے پور تشریف لائے سب سے پہلے آپ نے شاہ خلیل الرحمٰن صاحبؒ جمالی کی قیام گاہ پر طرحی غزل پڑھی وہاں مولانا سلطان الدین مبین بھی تشریف فرما تھے دوسرے روز صبح جب مولوی ولایت احمد صاحب سندیلوی مولانا مبین کے دولت کدے پر آئے تو مولانا صاحب نے فرمایا آپ کے یہاں کے ایک نو وارد لڑکے نے ماشاءاللہ بہت اچھی اور ہموار غزل رات کو پڑھی آپکو مولوی اساس الدین صاحب نسیمؒ کے ذریعہ بلوایا گیا۔ اتفاق سے مرزا مائل بھی وہاں آ گئے تھے آپ سے وہ غزل دوبارہ سنی گئی، مولوی ولایت احمد صاحب نے آپ کو اسی وقت مرزا مائل اور مولوی سلطان الدین صاحب کا شاگرد کرادیا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں بیک وقت دو استادوں کا شاگرد رہا ہوں، مگر آپ نے زیادہ فائدہ مرزا مائل سے ہی اٹھایا جب آپ کسی مشاعرے میں غزل نہیں پڑھتے تو مولانا مبینؒ فرماتے تھے میاں کوثر یہ کفران نعمت ہے کہ تم شعر نہیں کہتے، جہاں آپ کے استاد مرزا مائل شاعروں میں سہ غزلے چو غزلے پڑھتے وہاں آپ آٹھ دس شعر سے زیادہ شعروں کی غزل ہی پڑھ کر خوب داد حاصل کرتے تھے، آخر عمر میں مرزا مائل صاحبؒ کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ جب تک کوثر صاحب کو غزل نہیں سنا لیتے مشاعروں میں نہیں پڑھتے، یہی حال مولانا اطہر ہاپوڑی کا تھا جو مسلم الثبوت استاد تھے جب تک آپکو غزل نہیں سنا لیتے مشاعروں میں نہیں پڑھتے۔

**سخن فہمی** مولانا اطہر، مولوی سلطان الدین مبینؔ، سائل دہلوی، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی دہلوی، مولانا حسرت موہانی، مرزا مائل دہلوی مشہور استادان سخن بھی آپ کی سخن فہمی اور فارسی دانی کے دل سے معترف تھے۔ مولانا اطہر ہاپوڑی نے ڈالمیا نگر راولپنڈی پاکستان سے ایک فارسی غزل بھیجی، آپ نے تعریف کی صبا صاحب نے اسکی اطلاع

مولانا اطہر کو لکھ کر بھیجی تو مولانا اطہر کا خط آیا کہ داد حاقی داد سخنداں ہے میں آپکی داد سے بہت خوش ہوں۔

**داد دینے کا طریقہ** جب مرزا مائل دہلوی آپ کے استاد آپکو غزل سناتے تو آپ آنکھ بند کرکے سر جھکا کر بیٹھ جاتے جب شعر پسند آتا تو ہوں کہہ کر سر ہلا دیتے، ناپسند شعر پر "اُوں ہوں" کہہ کر منہ بنا لیتے۔ مرزا مائل یا تو الفاظ تبدیل کر دیتے یا وہ شعر ہی حذف فرما دیتے۔

(۲) دہلی سے ایک مصرع آیا۔ اور دوسرا مصرع لگانے کی تاکید تھی وہ مصرع یہ تھا۔

مجھ کو زیر تیغ جھونکے نیند کے آنے لگے

حضرت مرزا مائل اور دوسرے شاعروں نے صدہا مصرع لگائے مگر آپکی اُوں ہوں جاری رہی تو سب نے جھلا کر کہا کہ پھر آپ مصرع لگائیے، آپنے آنکھ بند کر کے فکر شروع کی۔ تھوڑی دیر بعد آپ کے منہ سے ہوں نکلا، سب نے جان لیا کہ آپ نے مصرع لگا لیا ہے، سنانے کی تاکید شروع ہوئی تو آپنے فرمایا

کس قدر راحت فزا ہے کوئے جاناں کی ہوا
مجھ کو زیر تیغ جھونکے نیند کے آنے لگے

ہر طرف واہ واہ، سبحان اللہ مرحبا کی صدائیں گونج اٹھیں، یہ شعر جے پور کے بچے بچے کی زبان پر ہو گیا تھا، گلی کوچے میں گاتے پھرتے تھے، آپ کے ایک دوسرے شعر کا بھی یہی حال تھا، جو حسب ذیل ہے۔

خوشا قسمت کہ وہ تصویر بنکر آ گئے میں غم کی
خدا نے آبرو رکھ لی، ہماری بزم ماتم کی

**آپکے کلام پر رائے** آپ کے کلام میں کیف، اثر، سلاست، روانی بذور بیان

ایسا ہے کہ یہ سب باتیں دوسرے شعراء میں مشکل سے ہی پائی جاتی ہیں۔ عزیزم اسلام اشرف سلمہٗ نے آپ کے اشعار کی نشاندہی کی ہے اسکے بعد کچھ اور اشعار کی ضرورت نہیں رہتی مگر تبرکاً میں بھی چند اشعار پیش کر دیتا ہوں، حضرت مولانا صاحب ایک ایسی پاکیزہ طبیعت لیکر آئے تھے جو شعر سے مناسبت خاص رکھتی تھی۔ حافظہ نہایت قوی تھا، اردو فارسی شعراء کے ہزاروں اشعار ورد زبان تھے۔ شعر پر غایر نظر تھی، حقیقت یہ ہے کہ آپ کا کامل الفن استاد اور فطری شاعر تھے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ہم کس سے جنوں میں اشک پونچھیں
دامن نہیں ہے آستیں نہیں ہے

سر کے بل ہم نے کیا وادیٔ پُرخار کو طے
زور کچھ بھی نہ چلا آبلہ پائی تیرا

صد شکر ہمیشہ کے لئے مست بنایا
ساقی نے ہمیں اک نگہ ہوش ربا میں

میں اگر چاہوں تو قسمت میں ہی جو وہ بھی نہ ہو
تم اگر چاہو تو وہ ہو جو مقدر میں نہ ہو

حقیقت ہے جو تم چاہتے ہو وہی ہوتا ہے
نہ کچھ تدبیر ہوتی ہے نہ کچھ تقدیر ہوتی ہے

اگرچہ غزل میں بھی آپ کا زور بیان اپنی جگہ کیف و اثر دکھلا رہا ہے مگر ان کا اصلی جوش و خروش نعت میں اجاگر ہوا ہے جس میں محبت و عقیدت و انتہائی عشق کا اظہار ہوا ہے اور نعت رنگِ تغزل میں ڈوبی ہوئی ہے، میں ایک نعت کے چند شعر پیش کر رہا ہوں۔

رسول اکرم۔ نبی اعظم حبیب رب العلا محمدؐ
صلواۃ ربی علی محمد، صلواۃ ربی علیٰ محمدؐ

خدا نہ ہے تم سے جدا محمدؐ نہ تم خدا سے جدا محمدؐ
جو ہے تمہاری رضا محمدؐ، وہی خدا کی رضا محمدؐ

دوئی کا وحدت میں دخل کیا ہے مگر ہر اک کی نظر جدا ہے
خدا محمدؐ، خدا محمدؐ، خدا محمدؐ خدا محمدؐ

یہ بیخودی کا ہے میری عالم زباں پہ قابو نہ دل پہ قابو
کہا ہے دل نے تجو یا الٰہی زباں سے نکلا ہے یا محمدؐ

حدوث کیسا قدم کہاں کا، یہ جھوٹی باتیں ہیں فلسفی کی
وہی ہے اک ذات حیّ و قایم خدا کہو اس کو یا محمدؐ

غرض نہیں کوئی کچھ بھی سمجھے، مجھے یہ ہی دھن لگی ہوئی ہے
خدا محمدؐ، خدا محمدؐ، خدا محمدؐ، خدا محمدؐ

بظاہر جہاں کچھ ظاہر ہیں لوگوں کو ان شعروں پر اعتراض ہو سکتا ہے وہیں اہل نظر اور اہل دل لوگوں کے لئے یہ اشعار باعث فرحت اور زندگی کا سرمایہ ہیں۔ ان اشعار کی تشریح اور توضیح میرے لئے مندرجہ ذیل اشعار سے آسانی سے قارئین کی سمجھ میں آجائے گی جب سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت اپنے عروج پر ہوتی ہے تو ایسے اشعار زبان پر آتے ہیں میرا عقیدہ ہے کہ فنا فی الرسول کی منزل میں سوائے ذات رسول صلعم کچھ نظر نہیں آتا میرے شعر ملاحظہ فرمائیے۔

اے صلِّ علیٰ مطلعِ انوارِ دوعالم
اے نورِ ازل مظہرِ اظہارِ دوعالم
سب محو ہوئے جاتے ہیں آثارِ دوعالم
ہر سمت نظر آتے ہیں سرکارِ دوعالم

مجھ نور محمد نظر آتا نہیں کچھ مجھ سے

اب فرض ہے دیوانے پہ انکارِ دو عالم

عشق اسی آہنگ میں پڑھتا ہی چلا جا

اے صلِّ علیٰ مطلعِ انوارِ دو عالم

درود بر خواجۂ عالم صلے اللہ علیہ وسلم

سلام بر مختار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم

## اہلیہ محترمہ سے محبت و دائمی جدائی

آپ کی اہلیہ محترمہ رح بھی صاحب ایثار سراپا محبت، اور صبر و رضا و وفا کی پیکر تھیں، فطرتاً ہر عورت کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ گھر میں فارغ البالی ہو اپنا گھر کا مکان ہو، زیور ہو، اچھا لباس ہو اور سب سے زیادہ گھر میں نونہالوں کی چہل پہل ہو۔ مگر آپ کو ان میں سے کوئی چیز بھی نصیب نہیں تھی، آپ کے مقدر میں صرف مولانا کی بے پناہ محبت تھی اور اس محبت نے آپ کی تمام خواہشات و آرزوؤں کو ختم کر دیا تھا۔ اور شوہر کی محبت ہی آپکو سکون کا باعث تھی۔ قلیل تنخواہ جس میں سے بھی نصف زیادہ محتاجوں کی نذر ہو جاتی تھی مگر اس خدا کی نیک بندی نے نہ کوئی مزاحمت کی نہ ہی شکوہ، یہ مولانا کی خدمت و محبت میں سرمست تھیں ادھر مولانا بھی آپ کی خدمت و محبت سے تسکین پا رہے تھے کہ قدرت نے آپکو ایک شدید آزمائش و امتحان میں ڈال دیا اور بیگم صاحبہ کی دائمی مفارقت کے غم میں ڈبو دیا۔ بیگم صاحبہ کے جنازے کے ساتھ جانے والے کہتے ہیں کہ آپ کے جنازے کے پیچھے پیچھے آپ یہ اشعار انتہائی سوز و درد کے ساتھ پڑھتے جا رہے تھے۔

اندھیری رات، طوفاں خیز دریا، دور ہے ساحل

مخالف ہے ہوا، کشتی بھنور میں، ناخدا غافل

اڑاتا خاک پیچھے پیچھے آتا ہے ترا مجنوں
ذرا پردہ اُٹھا کر دیکھ تو اے صاحبِ محمل

آپ نے ایک دردناک مرثیہ بھی لکھا ہے اُس کے بھی تین اشعار سُن لیجئے۔

اے میری مونس میری دمساز میری غمگسار
راحت قلبِ حزیں آرامِ جان بے قرار
زندگی کیسی، کہاں اب زندگانی کے مزے
تم نے مرکر کھو دیئے سب زندگانی کے مزے
میری دلجوئی میں تم مصروفِ صبح و شام تھیں
تم مرے بے چین دل کا چین تھیں آرام تھیں

**فارسی کلام** میں آپ کے فارسی کلام کی جھلک دینا بھول گیا تھا۔ وہ بھی ملاحظہ فرماکر سر دُھنیئے
یہ قطعہ بیوی کے انتقال کے بعد ہی کہا ہے

بے تو ابرِ بہار را چہ کنم
بادۂ خوشگوار را چہ کنم
سینہ را داغ داغ می خواہم
گلشن و لالہ زار را چہ کنم
گفتہ از من جدا مشو گفتا
گردشِ روزگار را چہ کنم

مولانا اطہر ہاپوڑی سنہ ۱۹۵۶ء میں راجستھان اردو کانفرنس میں شرکت کی غرض سے جے پور تشریف لائے اور تین ماہ قیام فرمانے کے بعد جب واپس تشریف لے جانے لگے تو مولانا کوثر مرحوم سے رخصت ہوتے وقت یہ شعر پڑھا

دیکھئے حضرت کوثر سے کہاں ملتے ہیں
اب یہاں ملتے ہیں اطہر کہ وہاں ملتے ہیں

حضرت کوثر نے برجستہ شعر پڑھا ؎

کہہ سکوں کیونکر نہ جائیں آپ اطہر جائیے
شرط یہ ہے مرثیہ کوثر کا لکھ کر جائیے

حضرت مولانا اطہر کا آپ سے ۱۰ ماہ پہلے ۲۵ فروری ۱۹۵۷ء کو انتقال ہو گیا۔

## پنڈت راجا امرناتھ اٹل و مولانا کوثر

آنجہانی پنڈت راجا امرناتھ اٹل فائینس منسٹر جے پور اسٹیٹ جو سر سپرو کے داماد تھے شعر و ادب کے دلدادہ تھے آپ کی کوشش و آرزو کے باعث ہمیشہ جے پور میں دو آل انڈیا مشاعرے ہوئے جن میں ہندوستان کے چوٹی کے صدہا شاعر شریک ہوئے اور مشاعروں کی نشست کئی کئی روز چلیں، راجا صاحب ہی صدر مشاعرہ ہوتے تھے اور وہ صحیح طور پر اس کے مستحق بھی تھے، آپ مسند صدارت پر جس نشست سے آکر بیٹھتے تھے آخر تک اُسی نشست سے بیٹھے رہتے تھے اُنکی دلی خواہش تھی کہ مولانا کوثر اُن کے یہاں تشریف لاکر سرفراز فرمائیں آپ کو اُمراء کے یہاں آنے جانے سے ہمیشہ اعتراض رہا آپ ہر حیلے سے ٹال جاتے تھے آخر راجا صاحب نے طوطیِ راجستھان حضرت صبا جانشین مرزا مائل کو جو آپکے انتہائی دوست و اُستاد بھائی تھے آپکے پیچھے لگا دیا۔ بمشکل تمام آپ صبا صاحب کی دلدہی کی وجہ سے راضی ہوئے اور آپ نے ایک قطعہ بھی لکھا ؎

تیرے دیدار کو اے راجا امرناتھ اٹل
کوثرِ خستہ، و ناچیز و حقیر آیا ہے
کبھی بھولے سے بھی جو خانہ ہوں کے در پہ نہ گیا
آج دروازے پہ تیرے وہ فقیر آیا ہے

مگر دونوں بیمار ہو کر چل بسے اور ملاقات نہ ہو سکی۔

آپ عرس کی محفلوں میں ضرور شریک ہوتے۔ حضرت برکت اللہ شاہ بنگال
مرید حضرت مبارک شاہ صاحب ابو العلائی رح کے عرس میں آپ نے طرحی غزل سے
پہلے جو قطعہ پڑھا اُس سے بھی آپ کی بے نیازی و استغنا کا اظہار ہوتا ہے

یہ کوثر آپ کا یا شاہ برکت اللہ شاہ
وزیر کے لئے لکھتا نہ بادشاہ کے لئے
مگر ہے اے پاس اسے خاطر مبارک کا
کہ چند شعر لکھے بزم ابوالعلا کے لئے

آپ نے ۳۵۔ ۳۰ سال سے مشاعروں کی شرکت ترک فرمادی تھی جب سے آپکی شریک
زندگی کا انتقال ہوا اُسوقت سے آپ خاموش و دل گرفتہ رہنے لگے تھے۔ آپ
حسرت و یاس کا مرقع محرومی و ناکامی کی تصویر تھے۔ ہر وقت کسی خیال میں محو و مستغرق
رہتے تھے مگر شاگردوں کو اصلاح ضرور دیتے۔

## شکل و شباہت و لباس

سانولا رنگ نکلتا ہوا درمیانہ قد۔ چوڑا ہاڑ، کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، متناسب
اعضا، نیچا کرتہ، شرعی پاجامہ، پہلے شیروانی پہنتے تھے پھر ترک کردی تھی شانے پر یا
ہاتھ پر بڑا رومال، پہلے چو گوشہ ٹوپی پہنتے تھے پھر ترک کردی تھی اس کا سبب یہ ہوا کہ
ایک دفعہ عالم بیخودی میں نہیں گم ہوگئی دوسری مرتبہ تیز ہوا میں اُڑ گئی آپ نے ٹوپی ترک کردی
کہ قدرت کو یہ ہی منظور ہے، جاڑے میں گرم کمبل یا ہلکی رضائی، گرمی میں سُوتی چادر
اوڑھتے، خشخشی داڑھی، سر پر پٹے گفتگو بہت آہستہ نرم لہجے میں کرتے، گفتگو
میں محبت اور خلوص ہوتا تھا، سال میں معمولی کپڑے کے صرف دو جوڑے بنواتے، دھوبی کو
کلف استری کی ممانعت تھی۔ شعر ہو تر انداز میں تحت اللفظ میں پڑھتے۔

## غذا

مدتوں سے ایک صرف ایک ہی وقت دن کے ایک دو بجے گھر جاکر

کھاتے جو بہت کم اور معمولی ہوتا مثلاً ترکاریاں، ماش کی دال، میٹھا دہی، اچار، گوشت بہت کم کبھی کبھی نوش فرماتے، مچھلی بہت مرغوب تھی اُس کے پکانے میں بڑا اہتمام فرماتے، چائے کثرت سے پیتے سبز چائے اہتمام سے بناتے تھے، حقّے کے بھی بہت شوقین تھے، بازار میں بھی کوئی دوکاندار آواز لگا کر حقہ پیش کرتا تو وہیں ٹھہر کر حقہ پینے لگتے تھے جو آپ کے شاگردوں کو جو ساتھ ہوتے تھے ناگوار بھی گذرتا۔ یہ حقیقت ہے کہ آپکی ہیئت کذائی کو دیکھ کوئی یہ یقین نہیں کرسکتا تھا کہ آپ عربی فارسی کے معلم اعلیٰ درجہ کے شاعر اور باکمال سخن فہم ہیں۔

**ایفائے وعدہ** | منشی سرفرازالدین مرحوم آپ کے مخلص دوست تھے اور آپ کے مکان کے قریب ہی رہتے تھے، سرفرازالدین صاحب کے مکان کے باہر ایک دفعہ دونوں رات کو ۱۰ بجے باتیں کر رہے تھے منشی صاحب یہ کہہ کر مکان کے اندر گئے کہ میں ابھی آتا ہوں وہ مکان میں جا کر بھول گئے جب صبح مکان سے باہر آئے تو آپ وہاں ہی ٹہل رہے تھے آپ نے فرمایا میاں میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ منشی صاحب نے شرمندہ ہو کر معذرت چاہی۔

**آپ کے شاگرد** | آپ کے شاگردوں کی تفصیل عزیزی اسلام اشرف نے لکھدی ہے آپ کو سب سے دلی محبت تھی، مگر یہ حقیقت ہے کہ عزیزی عبدالرحمٰن پار تھا سلمہٗ نے ۲۳-۲۴ سال صدق دل سے جیسی آپکی خدمت کی ہے اُسی نسبت سے فیض بھی پایا ہے اب تو اس مرد قلندر نے وضع قطع اُن جیسی ہی اختیار کرلی ہے وہ ہی ننگے سر کرتا پائجامہ، موسم کے مطابق سر یا شانوں پر سرد، گرم چادر وہ ہی انداز رفتار وہ ہی فقیرانہ انداز انکسار، عاجزی نیازمندی، خدا اُن کو سلامت رکھے اور میری دعا ہے کہ


تحقیق

خاتمہ بالخیر پارسائی پر کرے۔

(۲) آپ کے ایک شاگرد مہندر سنگھ نازش تھے، موضع ماتوڈہ تحصیل نیم کے تھانہ ضلع سیکر کے تنور راجپوت تھے۔ سب انسپکٹر پولس کے عہدہ پر فائز تھے۔ کافی جائداد، بیوی وغیرہ سب ہی کچھ تھا مگر مولانا کی درویشانہ اور پاکیزہ زندگی سے متاثر ہو کے مشرف باسلام ہو گئے اور سب کچھ چھوڑ دیا۔

استاد الشعرا حضرت صولت ٹونکی کی لڑکی سے شادی ہو گئی تھی۔ جوانی میں ہی چل بسے ورنہ یہ مولانا کا نام روشن کرتے۔ اب میں سب سے اہم اور قابل اندراج ابواب کو نظر انداز کر کے آخری پیراگراف پیش کر رہا ہوں۔

## انتقال پُر ملال

آپ مولانا حمید الدین کے مکان میں رہتے تھے انہوں نے وہ مکان تو فروخت کر دیا آپ کو اس مکان سے دلی لگاؤ ہو گیا تھا مجبوراً چھوڑنا پڑا آپ اُس مکان سے اپنا سامان عزیزی پارسا کے شانوں پر رکھ کر رضائی اوڑھے مستجاب علی و امتیاز علی اپنے بھائیوں کے مکان پر جا رہے تھے سردی کا موسم رضائی لپیٹ رکھی تھی نگے میاں کی مسجد کے پاس رضائی ڈھلک گئی آپ سنبھالنے لگے کہ منہ کے بل گرے پتھر وہ ڈھیر پر چوٹ آئی لوگوں نے اٹھایا، مستجاب علی اپنے مکان پر لے گئے، آپ نے پارسا کو تاکید کر کے آگے بھیج دیا تھا۔ پارسا جیسا نحیف شخص آپ کا ساز و سامان کندھے پر لئے چل رہا تھا اس سے اس درویش کے ساز و سامان کا اندازہ ہوتا تھا، اسی تکلیف میں چار روز زندہ رہ کر ۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو راجستھانی علم و فن کی یہ آخری شمع گل ہو گئی،

انا للہ وانا الیہ راجعون

حیرت کی بات یہ ہے کہ بعد انتقال آپ کی جیکٹ کی اوپر کی جیب سے ستّر روپیہ کے نئے نئے نوٹ کپڑے میں سلے ہوئے ملے جو غالباً آپ نے تجہیز و تکفین کے لئے ہی

رکھے تھے اور وہ اسی کام میں آئے۔ اللہ اُن کے مرقد پر رحمت و نور کی بارش فرماتا رہے۔ میری آرزو ہے کہ اس درویش کا سالانہ عرس اُن کے عزیزوں و شاگردوں کو منانا چاہیئے۔ ویسے میرا ایمان ہے کہ آپ کو ربِّ ذوالجلال رحمتِ کاملہ سے نوازتا رہے اور بقول حضرت نیازؔ بے نیاز رح ؎

طمع فاتحہ از خلق ندارم نیاز
عشق اندر پس من فاتحہ خوانم باقیست

---

بقیہ صہ ۶ سے آگے : میں نے جب سے ہوش سنبھالا تب سے ہی اردو کی خدمت گزاری میں مشغول ہو گیا۔ اور آئندہ بھی یہی میری زندگی کا نصب العین ہو گا۔ خدمت کرنے کے لئے صرف جذبے کی ضرورت ہے عہدہ اور بلند مقام کی ضرورت نہیں۔ میں طاعت میں بے وا نگہیں رہی لاگ کا قائل نہیں،

میں اُن سب اہل قلم حضرات کا بھی متشکر ہوں جن کے رشحات قلم نخلستان کی زینت بنتے رہے اور جن کی اعلا ادبی صلاحیتوں کی وجہ سے نخلستان کا ادبی معیار قایم ہوا اور ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ میں جناب ڈی این اپادھیائے کا بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے نخلستان جاری رکھا۔ آخر میں میں نخلستان کی بزم ادب سے احساس ممنونیت کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں ؎

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

۱۶ر اگست ۱۹۸۵ء

# اردو ناول کا فکری و فنّی مزاج

حبیب الرحمٰن نیازی
لیکچرار شعبۂ اردو، سوائی مادھوپور

ناول کے پیکر کی تخلیق و تعمیر کا سلسلہ نذیر احمد نے شروع کیا۔ انکے ناول مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، رویائے صادقہ اور فسانۂ مبتلا نے فکر و فن کے اعتبار سے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ان کے ناولوں میں علی گڑھ تحریک کی اصلاحی اور تبلیغی روح جاری و ساری ہے۔ ان ناولوں میں قاری اور مصنف کے درمیان جذباتی ہم آہنگی پیدا نہیں ہوتی۔ نذیر احمد کی مذہبی شدت پسندی نے ان کے فنی حسن کو مجروح کر دیا۔ فن اور مقصدیت میں مکمل ہم آہنگی کے بجائے نذیر احمد کے ناولوں میں مقصد فن پر حاوی ہے۔ فسانۂ مبتلا میں نذیر احمد نے فنکار اور واعظ کی شخصیت کو ہم آہنگ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی دوران سرشار کا ناول فسانۂ آزاد اور شرر کا ناول ملک العزیز ورجنا منظر عام پر آئے۔ سرشار نے اپنے ناول میں لکھنؤ کی رنگین معاشرت کے دلکش اور دلچسپ مرقعے پیش کئے۔ گو فنّی اعتبار سے اس ناول کا پلاٹ ربط و تسلسل اور ارتقاء کی خصوصیات کا حامل نہ ہونے کی وجہ سے اس کے مرتبہ اور اہمیت کو کم کرنے کا باعث بنا ہے لیکن طنز و مزاح

شوخی و رنگینی اور ادبی چاشنی نے اس ناول کو ایک دلچسپ تصویر خانہ بنا دیا ہے جسے دیکھ کر قاری اس کی رعنائی میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کے کرداروں میں چمک دمک تو ہے لیکن زندگی کے خون کی روانی نہیں ہے۔ سرشار نے زندگی کے ایک محدود اور مخصوص پہلو کا انتخاب کر کے اس کی تمام پیچیدگیوں، گہرائیوں اور رعنائیوں کو اپنے ناول میں سمیٹ لیا ہے، خوجی فسانۂ آزاد کا سدا بہار کردار ہے وہ اودھ کی زوال آمادہ تہذیب اور وہاں کی پُر تکلف اور پُر تصنع زندگی کا نمائندہ کردار ہے۔ سرشار کے بعد شرر نے اردو ناول کو فکری و فنی اعتبار سے نیا اسلوب اور نئے فن سے متعارف کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کے پُر عظمت کارناموں پر ناول لکھے۔ شرر کے ابتدائی ناولوں ملک العزیز ورجنا، حسن انجلینا اور منصور و موہنا میں شدید تاثر اور لطف و انبساط کے عناصر تو موجود ہیں لیکن مثالیت اور مقصدیت نے ان ناولوں کی فنی حیثیت کو کم کر دیا ہے البتہ ان میں واقعات کی ایک ترقی پذیر ارتقائی شکل ضرور موجود ہے جو مختلف مراحل سے گزر کر ایک منطقی انجام تک پہنچتی ہے۔ شرر کے ناولوں میں مرقع کشی منظر نگاری، جذبات نگاری، زبان کا لطف، ادبی چاشنی، اور انشائے لطیف کا دلکش امتزاج قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ وہ شرر کے ناولوں کو دلچسپی سے پڑھتا ہے بغیر یہ غور کئے ہوئے کہ ان ناولوں میں فنی نزاکتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے یا نہیں۔ شرر کا ناول فردوس بریں فنی معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس کا پلاٹ منظم اور مربوط ہے، یہ ناول مثالیت اور مقصدیت سے بھی پاک ہے۔ شرر نے ناول کو تبلیغی، قومی اور اصلاحی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا وہ اردو ناول کا ایک غیر ضروری حصہ بن گیا یہاں تک کہ پریم چند جیسا بالغ نظر ناول نگار بھی اپنے ناولوں کے لئے ذریعہ اصلاحی اور قومی مقاصد کے حصول کا متلاشی نظر آتا ہے۔ نذیر احمد، سرشار اور شرر نے جہاں مغربی فنی اصول کی کسی حد تک پیروی کی وہاں زیادہ تر مشرقی مذاق اور مزاج کا خیال رکھا۔ ان کے بعد آنے والے ناول نگاروں نے مغرب اور مشرق کے فنی و ادبی مذاق میں ایک مخصوص امتزاج پیدا کیا۔

راشد الخیری کا منشی سجاد حسین اور محمد علی طبیب نے اپنے پیشرو ناول نگاروں نذیر احمد، سرشار اور شرر کی پیروی بھی کی اور ان کے فن پر مزید جلا بھی کی۔ راشد الخیری نے عورت کی معاشرتی اصلاح پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ انہوں نے نذیر احمد کی پیروی میں عورت کے مسائل پر ہمدردانہ تبصرہ کیا۔ سجاد حسین کے ناولوں میں سرشار کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ حاجی بغلول اور طرحدار لونڈی سجاد حسین کے ایسے ناول ہیں جن میں لکھنؤ کے مذاق اور مزاج اور وہاں کی زبان کی عکاسی کی گئی ہے۔ سجاد حسین کو اپنے ناول نشتر میں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اس ناول میں عملی زندگی کو کینوس پر اتارنے کی کوشش کی گئی ہے ساتھ ہی ایک حد تک طوائف کی زندگی کی اصلاح کی بھی کوشش نظر آتی ہے محمد علی طبیب نے شرر کی پیروی کی لیکن کوئی نئی بات پیدا نہ کر سکے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں اردو ناول نے فنی حیثیت سے جو ترقی کی وہ قابل ستائش ہے۔ ہادی رسوا کے ناول "امراؤ جان" اور مرزا محمد سعید کے ناول خواب ہستی نے خارجی مظاہرہ کو سادہ اور سپاٹ انداز میں بیان نہیں کیا بلکہ نفسیاتی اور تجزیاتی طریقۂ کار کو اپنا کر دل و دماغ کی گہرائی کو ناول میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کرداروں کے جذبات کو ان ناولوں میں جس فنی نزاکت سے پیش کیا گیا اس نے اردو ناول کو فنی بلندیوں پر تک پہنچا دیا۔ امراؤ جان ادا بظاہر ایک طوائف کی خود نوشت، داستان ہے لیکن دراصل یہ اودھ کے زوال آمادہ معاشرہ پر ایک لطیف طنز کی شکل اختیار کر لیتا ہے، نوابوں کی عیاشی، ڈاکوؤں کی دیدہ دلیری، مولویوں کی مکاری اور سماجی و اخلاقی پستی کی عبرت انگیز داستان امراؤ جان ادا میں فنی نزاکت اور لطافت کے ساتھ مؤثر انداز میں پیش کی گئی ہے، خواب ہستی میں انیسویں صدی کے تہذیبی، سماجی اور اخلاقی انتشار کو نئے انداز میں پیش کیا گیا۔ ان دونوں ناولوں میں مشاہدہ کی باریک بینی، زندگی کا تنوع، حسن ترتیب اور ادبی و شاعرانہ ذوق

میں وہ اعتدال اور توازن موجود ہے جو شاہکار ناولوں میں ہی دیکھنے کو ملتا ہے ان ناولوں میں ناول نگاروں نے واقعات پر اپنے تخیل اور احساس اور فکر کا جو رنگ چڑھایا ہے اس نے ان کی فنی سطح کو بلند کیا ہے۔

نذیر احمد، سرشار، شرر اور ہادی رسوا کی فنی روایات کو پروان چڑھانے کا سہرا پریم چند کے سر ہے۔ پریم چند نے ابتدا میں حب الوطنی اور سماجی اصلاح پر ناول لکھے جو فکر، تخیل اور احساس کی آنچ میں تپے ہوئے نہیں تھے اور اسی لئے فنی معیار پر پورے نہیں اترتے۔ بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، میدانِ عمل اور گئودان پریم چند کے ایسے ناول ہیں جو فنی عظمت اور بلندی کے ضامن ہیں، پریم چند کے ان ناولوں میں اصلاحی مقصد اور فنی حسن دونوں کا دلکش امتزاج نظر آتا ہے۔ یہ پریم چند کی فنی بصیرت ہی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے ناول کو زندگی کا سچا نقیب بنانے کے ساتھ ساتھ انسان کے جذباتی رشتوں کی پر پیچ وادیوں کی سیرگاہ بنا دیا۔ پریم چند نے حسنِ بیان کا بھی خاص خیال رکھا اور سماجی و اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ جمالیاتی تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ پریم چند کی انسان دوستی اور خلوص نے بھی انہیں ایک عظیم ناول نگار بنانے میں مدد دی ہے۔ انہوں نے کسانوں اور مزدوروں کے دکھ درد کو اپنا ہی دکھ سمجھا اور اس دکھ کو بڑی کامیابی کے ساتھ ناولوں میں پیش کیا ہے۔

پریم چند نے ناول کو جس بلند مرتبہ پر پہنچا دیا آج تک اردو ناول اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر بھی چند بہتر ناول لکھے گئے ہیں لیکن ان میں وہ فنی بلندی اور انسانی جذبات کی تیز آگ نہیں ہے جو پریم چند کے ناولوں کا امتیازی وصف ہے۔ ترقی پسند تحریک کے دوران لکھے گئے ناولوں میں سجاد ظہیر کا ناولٹ "لندن کی ایک رات"، کرشن چندر کا شکست، عزیز احمد

کا گریز، عصمت کا ٹیڑھی لکیر، بیدی کا ناولٹ ایک چادر میلی سی، قابلِ ذکر ہیں۔

لندن کی ایک رات تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے پہلا جدید ناول ہے، اس میں ''شعور کی رو'' کی تکنیک کو سب سے پہلے اردو میں استعمال کیا گیا۔ مصنف نے آزاد تلازمِ خیال کے ذریعہ کرداروں کے ذہنی سفر کو خود کلامی کے ذریعہ پیش کیا ہے اس میں بظاہر بے ربط واقعات میں ایک داخلی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لندن کی ایک رات میں سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام کے داخلی و خارجی تضادات کو خوش اسلوبی کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ نوجوان طبقہ جو پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریاں دیکھ چکا تھا اب دوسری جنگ عظیم کے تباہ کن نتائج بھگتنے کے لئے مجبور تھا۔ اس میں فرد کے ذہنی انتشار اور تشکیک پسند ذہن کی بخوبی عکاسی کی گئی ہے۔ موجودہ دور کے تہذیبی بحران کا حقیقت پسندانہ بیان اس ناول کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو قاری کو فوراً متوجہ کرتی ہے۔

عزیز احمد نے ابتدا میں "ہوس" اور "مرمر اور خون" ناول لکھے جو فنی اعتبار سے کمزور ناول ہیں "گریز" ان کا شاہکار ناول ہے، اس میں نفسیاتی تجزیے اور جنسی میلان کے بیباکانہ اظہار کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس ناول پر جدید فلسفہ اور خصوصاً وجودیت کے فلسفے کا گہرا اثر ہے۔ فرد کی ناآسودگی اور بیچارگی کی عکاسی بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔ عزیز احمد نے اس ناول میں کہیں شعور کی رو سے کام لیا ہے تو کہیں تحلیل نفس کے ذریعہ کرداروں کے جذباتی ہیجان کی عکاسی کی ہے، نعیم کی زندگی ایک گریز اور فرار بن کر رہ جاتی ہے لیکن یہ فرار زندگی کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ عزیز احمد کے ناول آگ کا تعلق کشمیر سے ہے۔ کشمیر جو مفلسی، ناداری اور استحصال کی آگ میں جل رہا ہے۔ اس میں اس دور کے تمام عصری مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ عزیز احمد کے ناولوں میں وقت کے بہاؤ کا بھی احساس ہوتا ہے۔ عزیز احمد اپنے ایک ناول

"ایسی بلندی ایسی پستی" میں ایک کردار سریندر کے ذریعہ سلطان حسین کی موت پر کہلواتے ہیں :-

"بہتا ہوا پانی، دریا، سمندر، وقت ـــ لیکن تحمیل زندگی کا وہ نام اور زندگی وقت کے ۔۔ ایک ہی حربے اور وقت جو ساری دنیا کا احتساب کرتا ہے وہ بھی رکتا رہے گا ..... پیدائش، افزائش، نسل، اور موت سب کے سب بے معنی ہیں کیونکہ متوسط طبقہ کا دہریہ بہتے ہوئے پانی بپتسمہ کے چھینٹے، زنار کے دھاگے، تسبیح کے دانے پر یقین نہیں رکھتا"۔ [۱]

جدید حسیت میں تشکیک، ناآسودگی اور اقدار کا بحران سب سے زیادہ اہم بنتا جارہا ہے ۔ عزیز احمد نے اسی جدید حسیت کو اپنے ناولوں میں قید کرلیا ہے ۔

عصمت چغتائی کا ناول "ٹیڑھی لکیر" جدید ناول نگاری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ عصمت چغتائی نے عورتوں کے محاورے اور لب و لہجے کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے ۔ تیز قوت مشاہدہ، جنسی بیباکی، لطیف طنز، اور دریا کی سی روانی عصمت کے ناولوں کی ایسی خوبیاں ہیں جو انھیں ایک منفرد ناول نگار کا درجہ عطا کرتی ہے ۔ شمن کے کردار عصمت نے ٹیڑھی لکیر میں نہایت فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے ۔ انہوں نے نفسیاتی اور معاشی عوامل اور ماحول کا تجزیہ بھی نہایت ہنرمندی سے کیا ہے ۔ فرائڈ اور مارکس کے نظریات سے کام لیکر عصمت نے دونوں نظریوں میں ایک انوکھا امتزاج پیدا کیا ہے ، ٹیڑھی لکیر میں صنعتی اور سرمایہ دارانہ عشق کی تمام خود غرضیاں، ریاکاری اور جھوٹے اخلاق کو نمایاں کیا گیا ہے ۔

---

[۱] ایسی بلندی ایسی پستی (عزیز احمد) ص ۲۶۰

قرۃ العین حیدر نے اودھ کی جاگیردارانہ تہذیب کے مٹتے ہوئے نقوش کو اپنے ناول "میرے بھی صنم خانے" میں پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند نے اس تہذیب کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ اس میں بھی شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال خوبی سے کیا گیا ہے۔ اس ناول پر بھی وجودیت کے فلسفے کا گہرا اثر ہے۔

کرشن چندر نے اپنے ناول شکست میں رومانیت کے المیہ پہلو کی عکاسی کی ہے اور سماجی جبر کی گھٹن معصوم جذبات کو کس طرح کچل دیتی ہے اسے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ ناول ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد جدیدیت کا رجحان ترقی پانے لگا اور ناول میں بھی سپاٹ بیانیہ نگاری، منطقی دلائل، منظم پلاٹ، اور سطحی واقعہ نگاری کے بجائے جذباتی وجدانی اور نفسیاتی منطق سے کام لیا جانے لگا۔ عمل کے بجائے ردِ عمل، تجزیہ کی جگہ تاثر، روانی بجائے تموج اور بیان واقعہ کے بجائے رمزی اظہار کو اہمیت حاصل ہو گئی۔ داخلی اور شخصی تاثرات کو ناول میں زیادہ جگہ ملنے لگی۔ اس کے علاوہ عصری اور تاریخی ناولوں کا رجحان بھی بڑھنے لگا۔ "خدا کی بستی" (شوکت صدیقی) آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر) لہو کے پھول (حیات اللہ انصاری) انقلاب (خواجہ احمد عباس) اسی قسم کے ناول ہیں۔ یہ ناول زندگی کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔ ان ناولوں کے علاوہ کریم فضلی کا "خونِ جگر ہونے تک"، علیم مسرور کا "بہت دیر کر دی" کرشن چندر کا "مشینوں کا شہر"، ممتاز مفتی کا "علی پور کا ایلی"، عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" جدیدیت، عصری حقیقتوں اور نفسیاتی تجزیے کی عمدہ مثالیں ہیں۔

قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" ہندوستان کے مختلف فکری دبستانوں کی تاریخ پیش کرتا ہے۔ سماجی اور سیاسی عوامل اور تحریکات اور تاریخی

وعصری معاقات، قومیت، جمہوریت، انسان کی تنہائی اور اس کا کرب ان سب کو علامتی اور رمزی طریقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ فرائڈ کی نفسیات، لارنس، فلابیر اور جیمس جوائس وغیرہ کے اثرات اس ناول میں آسانی سے تلاش کئے جا سکتے ہیں، ہری شنکر وجودیت کے اس تصور کو پیش کرتا ہے جو بدھ فلسفے سے اخذ کیا گیا ہے، وہ کہتا ہے۔

"علیت کا قانون بجائے خود مکمل ہے کوئی چیز کسی دوسری چیز کی مانند نہیں ہے۔ صرف اپنے لمحاتی وجود کے علاوہ کسی شئے کا کسی شئے سے تعلق نہیں سمجھے ــــ سب وقتی ہے ــــ اور مصیبت ہے ــــ سروم دکھم دکھم.... جسم اور آتما دونوں فانی ہیں۔ دونوں کے اکٹھا ہونے سے بھی کوئی مستقل وجود پیدا نہیں ہوتا ــــ آتما ابدی نہیں ہے۔ انسان چراغ کی طرح بجھ جاتا ہے ــــ محض واقعات اور احساسات کا دور تسلسل قائم رہتا ہے"

شوکت صدیقی کا ناول "خدا کی بستی" تصوریت اور رومانیت سے پاک اور بڑی حد تک عصری حقیقتوں کی ترجمانی کا حق ادا کرتا ہے۔ پریم چند کی سماجی حقیقت نگاری اور انسان دوستی کی اعلا روایت کو اس میں برقرار رکھا گیا ہے، فرد اور معاشرہ کے درمیان تصادم کا فطری اظہار، نیاز اور علی احمد کے کرداروں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں تقسیم کے بعد پاکستان کے اس معاشرہ کی عکاسی کی گئی ہے جس میں مذہب اور سرمایہ دارانہ نظام نے گٹھ جوڑ کر کے انسانوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح ناچنے پر مجبور کر دیا ہے۔

"اداس نسلیں" عبداللہ حسین کا ایک ایسا ناول ہے جس میں برطانوی دور حکومت سے لیکر آزادی حاصل ہونے تک کے عہد کی عکاسی کی گئی ہے اور طبقاتی جدوجہد

اور تحریک آزادی میں نچلے طبقے کی قربانیوں اور تکلیفوں کا حقیقت شناسانہ اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس میں عصری تاریخ کو ایک کسان کے نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں عصری تاریخ کو ایک نئی تخلیقی بصیرت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

خدیجہ مستور نے اپنے ناول "آنگن" میں آزادی سے قبل کے مشترکہ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی بساط کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں یو۔ پی کے متوسط طبقہ کے ایک مسلمان کنبہ کی گھریلو زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں مشترکہ ہندوستان میں مسلمانوں نے اقتصادی نظام، تہذیبی اور معاشرتی ارتقا اور سیاسی جدوجہد میں جو نمایاں حصہ لیا ہے اسے مصنفہ نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس کے کردار تہمینہ، کسم دیدی، صفدر بھائی اور اسرار میاں کی آرزوئیں اور تمنائیں سماج کی کھوکھلی روایات پر قربان ہو جاتی ہیں۔ لیکن نئی نسل کے کردار عالیہ جمیل اور ان روایات سے سرکشی کرتے ہیں اور اپنے حسین خوابوں کی قیمت کو سمجھتے ہیں۔ اس ناول میں انفرادی اور جذباتی رشتوں اور فرد کے داخلی تصادم پر بھی خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے۔ ناول کے کرداروں کو تجربات کی بھٹی میں تپا کر تخلیقی پیکروں میں ڈھال دیا گیا ہے۔

آزادی کے بعد لکھے گئے ناولوں میں جدید حسیت کی نمائندگی جبنی، معاشرتی، نفسیاتی اور عصری ناولوں نے کی ہے۔ تاریخی، اصلاحی، سماجی اور رومانی ناولوں کی مقبولیت نسبتاً کم رہی ہے۔ جدید ناول میں کسی آفاقی یا عمومی قدر اور معیار کے بجائے شخصی اور ذاتی صداقت کی عکاسی کی گئی ہے جس کا انحصار اور جس کی معنویت کا دارومدار وجود کے تجربہ پر ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا ناولٹ "ایک چادر میلی سی" اسی وجودی تجربہ کا اظہار ہے۔ رانو نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کا مقابلہ کس طرح کیا اور اس کے تجربات کی نوعیت کیا تھی اسے اس ناول میں بڑی دلکشی اور ہنرمندی سے

پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے زبان وبیان اور لب ولہجہ کو ماحول اور فضا کے عین مطابق ڈھالا ہے۔ اس ناول میں ماں کی مامتا اور اس کی عظیم قربانیوں کو، عورت کے رشتوں کے پیچ وخم کو نفسیاتی بصیرت سے پیش کر کے راجندر سنگھ بیدی نے رانو کو بھی شمیؔ (گرم کوٹ) لاجو (لاجونتی) ہولی (گرہن) اور اندو (اپنے دکھ مجھے دیدو) کی طرح اردو ناول کے ناقابل فراموش کردار بنا دیئے ہیں۔ رانو زندگی کی بیدردیوں اور تلخیوں کے زہر کو شیو جی کی طرح پی جاتی ہے اور اسے امرت بنا دیتی ہے۔ وہ ایسے اذیت ناک حالات میں بھی جب کہ اس کے شوہر تلوکا کے مرجانے کے بعد اسے مجبوراً اپنے دیور منگل سے شادی کرنی پڑتی ہے جسے وہ ایک بیٹے کی نظر سے دیکھتی تھی صبر واستقلال سے کام لیتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے قاتل کو اپنا داماد بنانے پر مجبور ہو جاتی ہے تاکہ اس کی لڑکی کنواری نہ رہ جائے۔ ان ستم ظریفیوں کے باوجود نہ تو وہ خودکشی کرتی ہے نہ راہِ فرار اختیار کرتی ہے، اس نے اپنی زندگی سے یہ ثابت کر دیا کہ زندگی مفاہمتوں کا نام ہے۔ بیدی کے یہاں تجربے، فن، موضوع اور اسلوب میں گہری مطابقت نظر آتی ہے۔ ان کے فن میں فطری اظہار، معنویت، جمالیاتی کیف اور رمزیت کا ایک ایسا دلکش امتزاج پایا جاتا ہے کہ قاری مبہوت ہو جاتا ہے جذباتی شدت اور جذباتی وفور کے وقت ان کی تحریریں ایک تیکھاپن آجاتا ہے جو قاری کے ذہن کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔

قاضی عبدالستار کے دو ناول "شکست کی آواز" اور "شب گزیدہ" میں سماجی زندگی کے طبقاتی کردار، اس عہد کی بدلتی ہوئی اقدار اور پیچیدہ نفسیاتی حقیقتوں کو ایک نئے تخلیقی شعور کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ "شب گزیدہ" عام تجربے کے حالات پر مبنی ہے۔ اس میں واقعات کی مناسب ترتیب، قصہ کے زیروبم اور کردار نگاری کے بہتر سلیقہ کی وجہ سے یہ جدید عہد کا ایک منفرد ناول

بن گیا ہے۔ اس کا ہیرو جمی مثالی خوبیوں اور متحرک قوتوں کی وجہ سے ناول کے بجائے ڈراما کا کردار نظر آتا ہے۔ بوڑھے اود جابر تعلقدار کے ہاتھوں اس کی موت ہی ناول کو ایک تمثیلی المیہ بنا دیتی ہے، جمی شرافت، انسانیت اور تہذیب کی علامت ہے جسے ایک جابرانہ نظام مار ڈالتا ہے۔ اس ناول میں جدید ذہن اور فکر کی دلکش عکاسی پائی جاتی ہے۔

۱۹۶۹ء میں حیات اللہ انصاری کا ناول "لہو کے پھول" شائع ہوا۔ یہ پانچ جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم ناول ہے۔ اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۵۰ء تک کے ہندوستان کی عصری تاریخ اس کی معاشرت، تہذیب، سیاسی و سماجی تحریکات کا مفصل جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس میں ہر طبقہ کے رہن سہن، مسائل اور جذبات کی تصویریں ہیں۔ نوابین کی مٹتی ہوئی تہذیب، زمینداروں کے ظلم اور عیاشیاں، کسانوں کی محنت اور ان کا استحصال، سامراجی اور جاگیردارانہ دور کے اقتصادی، سماجی و سیاسی حالات کا جائزہ سمٹ کر ناول میں سما گیا ہے۔ خارجی واقعات اور حالات کے ساتھ ساتھ اس میں داخلی اور جذباتی تصادم، جمالیاتی کیف اور علامتی انداز بیان پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ امرا اور چلتیا ہندوستان کے کسان مردوں اور عورتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ زندگی سے بھرپور اور متحرک کردار ہیں۔ اس میں راجا صاحب اور دلربا کی شائستہ گفتگو بھی ہے تو نواب اعن کا کردار بھی بڑا دلچسپ ہے۔

جدید عہد کی نئی بصیرت اور آگہی کے لئے ناول ایک مؤثر ذریعۂ اظہار ہے۔ جدید ناولوں نے اعلا انسانی اقدار کی پیش کش اور انسان کی مایوسیوں اور محرومیوں کا تذکرہ نیز فرد اور سماج کی آویزش اور تصادم کو اجاگر کرنے میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ جدید دور میں خارجی دنیا کی بے تحاشہ رفتاری اور اقدار کے اضافی تصور نے معروضیت کو بھی ایک بدلتی ہوئی کیفیت کا حامل بنا دیا ہے، جس پر اب کوئی بھی ادیب زیادہ بھروسہ کر کے نہیں چلتا۔ یہی وجہ ہے کہ ناولوں میں اب شعور کی رو، نفسیاتی تجزیئے، تحلیل نفسی

اور رمزی و علامتی اظہار کے رجحان کو تقویت پہنچی ہے۔ زندگی کی پیچیدگیوں اور متضاد رجحانات کی بیک وقت موجودگی نے بھی جدید ناول کے ادبی مزاج کی تشکیل میں حصہ لیا ہے اور اسی اعتبار سے وہ زیادہ پیچیدہ ہوگیا ہے۔

افسانہ

# ماہرِ نفسیات

مظفر انصاری
محلہ لکرہ کلاں، شاہجہاں پور

ثروت جہاں بڑی خوبیوں کی مالک ہیں۔ ایک گرلز انٹرمیڈیٹ کالج میں لیکچرار ہیں، جب کالج سے فرصت پاتی ہیں میرے گھر ضرور آتی ہیں۔ میری چھوٹی بہن نجمہ کی سہیلی ہیں۔ نجمہ سے خاصی بے تکلف ہیں، کیونکہ اُس سے بہت قریب رہتی ہیں۔ میرے والدین ثروت جہاں کے اخلاق و کردار سے ہمیشہ متاثر رہے ہیں، اُن کو اولاد کی طرح پیار کرتے رہے ہیں۔ ثروت جہاں بھی میرے والدین کا ہمیشہ ادب و احترام کرتی رہی ہیں۔

ثروت جہاں میں اخلاق و کردار کی آب و تاب تو خیر موجود ہی ہے، حسنِ صورت سے بھی وہ مرصع و مزین ہیں۔ چھٹی کے دن ثروت جہاں سویرے ہی سویرے میرے گھر آجاتی ہیں اور ریڈیو سے اس طرح شوق فرماتی ہیں کہ میرا ذوقِ لطیف نوحہ خواں ہو جاتا ہے دن بھر مکان میں وہ شور ہوتا ہے کہ عقلِ سلیم پانی میں گرے بتاشے کی طرح غائب ہو جاتی ہے۔ نازک مزاج پڑوسی ہریاں فلمی گیتوں کے شور سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ زبان اس

خیال سے نہیں کھولتے کہ والد صاحب فوجی رہے ہیں۔ جان لینے اور دینے کو عین شہادت سمجھتے ہیں۔ پتہ نہیں انھیں فلمی گیتوں سے کیسے دلچسپی پیدا ہوئی۔ والدہ بھی فلمی گیتوں کو اچھے شخصیت کا طرۂ امتیاز سمجھتی ہیں۔ گھر بھر میں ہی ایک ایسا بدقسمت ہوں جسے جدید فلمی گیتوں سے کبھی لگاؤ نہ رہا۔ کلاسیکل موسیقی ہمیشہ پسند رہی ہے۔ نجمہ کلاسیکل موسیقی پسند نہیں کرتی۔ جدید فلمی نغمات پر ہمیشہ سر دھنتی رہی۔ اور اب بھی اُسے جدید فلمی گیتوں سے پیار ہے۔ وہ اس طرح کے معیاری گیت سنتی ہے۔

ے انگریزی میں کہتے ہیں کہ ILOVE YOU
ے ربّا رّبا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ پرمانینٹ ہوگیا۔
ے دونوں جوانی کی مستی میں چور، نہ تیرا قصور، نہ میرا قصور

میں جب اس قسم کے معیاری فلمی گیت سنتا ہوں تو جی چاہتا کہ خود اپنے ہاتھ سے اپنی گردن مڑوڑ دوں یا ریڈیو اٹھا کر باہر سڑک پر پھینک دوں، ایسا سوچنا آسان تھا کرنا مشکل، کیونکہ والد صاحب کی بندوق آنکھوں کے سامنے ابھر آتی۔ مجبوراً نجمہ سے کچھ کہہ نہ پاتا۔ چپکے سے اٹھتا اور باہر چلا جاتا۔

میں نجمہ کو کئی بار سمجھا چکا تھا کہ وہ ہر وقت ریڈیو نہ بجایا کرے، پڑھنے لکھنے میں دلچسپی لیا کرے۔ اس نے ہر بار مسکرا کر وعدہ کر لیا کہ میری ہدایت پر عمل کرے گی۔ لیکن عمل کبھی نہ کیا، میں کسی اچھے ماہر نفسیات کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا تاکہ اُس سے مشورہ کر دل اور ثروت جہاں کا پتّا ہمیشہ کے لئے کاٹ دوں۔ جلد ہی میرے ذہن اور عقل نے عرشی صاحب کا انتخاب کر لیا۔ عرشی صاحب انسانی نفسیات کے ماہر سمجھے جاتے تھے، اس مضمون میں ایم اے کر چکے تھے۔ میرے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔

میں ایک دن عرشی صاحب کے دولت خانہ پر حاضر ہوا اور انھیں اپنا دکھڑا سنا یا۔ ثروت جہاں کو اپنے گھر سے دفع کرنے کی ترکیب پوچھی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ثروت جہاں کو

دفع کرنے کی بس ایک ہی بہترین ترکیب ہے۔ اُن سے عشق کرنا شروع کردیجئے لیکن ایسا عشق نہ کیجئے گا جیسا مجنوں نے لیلیٰ سے کیا یا فرہاد نے شیریں سے، عشق اس انداز سے شروع کیجئے گا کہ ثروت جہاں کو اپنی عزت خطرے میں نظر آنے لگے، یقیناً وہ آپ کے گھر آنا بند کردیں گی۔ اور نتیجے میں آپ کو عریاں فلمی گیتوں سے نجات مل جائے گی۔

مجھے عرشی صاحب کا یہ مشورہ بڑا معقول لگا۔ اس پر عمل کرنے کا تہیہ کرلیا۔ عشق شروع کیسے کیا جائے، کئی دن اس سلسلے میں غور کرتا رہا۔ پھر فیصلہ کرلیا کہ حرکات وسکنات کے ذریعہ عشق کا اظہار کیا جائے۔ اس فیصلے کے مطابق عشق کی نیچرل ایکٹنگ شروع کردی جیسے ہی ثروت جہاں آتیں، میں اُن کے قریب جا بیٹھتا اور جذباتی اداکاری شروع کردیتا، ایک ہفتہ یہ سلسلہ چل سکا، ایک دن مجھے احساس ہوا کہ میں جذباتی اداکاری کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا ہوں، یعنی اداکاری کرتے وقت بھنگڑہ رقص کا نمونہ بن جاتا ہوں، مجبوراً اداکاری چھوڑ دی اور کسی دوسرے طریق سے عشق کا اظہار کرنے پر غور کرنے لگا۔ اسی درمیان عرشی صاحب سے ملاقات ہوئی، اُن سے پھر مشورہ چاہا، انھوں نے مشورہ دیا کہ عشق کا اظہار رومانی اشعار کے ذریعہ کیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس طریق سے محبوبہ فوراً عشق مجازی کی گرفت میں آجاتی ہے۔ موصوف نے اپنے ذاتی تجربات بھی اس سلسلے میں بیان فرمائے۔ مثلاً یہ کہ اُن کی شادی رومانی اشعار کے بدولت ہوئی، آدھ درجن بچے بھی رومانی اشعار کی دین ہیں، اب بھی جب وہ کسی بلا پر عاشق ہوتے ہیں تو محبت کا اظہار اشعار کے ذریعہ کرتے ہیں۔

دوسرے ہی دن میں نے بہت سے رومانی اشعار رسائل سے نقل کئے اور انھیں حفظ کرنے لگا، دو ہفتے میں مجھے بہت سے رومانی اشعار حفظ ہوگئے۔

اُس دن ثروت جہاں میرے ڈرائنگ روم میں اکیلی بیٹھی تھیں، نجمہ والدہ صاحبہ کے ساتھ

ڈاکٹر کے یہاں گئی ہوئی تھی، میں تیر کی طرح اُڑتا ہوا ڈرائنگ روم پہنچا اور اُن کے قریب بیٹھ گیا۔ ثروت جہاں مجھے گھورنے لگیں، جھٹ میں نے انہیں سلام کیا۔ وہ کچھ سوچ کر مسکرائیں اور بولیں "آپ بخیریت ہیں نا"

میں نے کہا "بخیریت ہوں، آپ کو چند رومانی اشعار سُنانا چاہتا ہوں، زحمت نہ ہو تو سُن لیں"

انہوں نے مجھے حیران کن نظروں سے گھورا اور فوراً ہی کہا "کیا آپ نے شاعری شروع کر دی ہے"؟

"نہیں — خدا کا شکر ہے کہ میں اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہوں، اور محروم ہی رہنا چاہتا ہوں، دوسرے شعراء حضرات کے رومانی اشعار سنانا چاہتا ہوں"

"ضرور سُنائیے" کہہ کر ثروت جہاں مسکرا دیں۔

میں سوچنے لگا۔ شعر خوانی کے وقت والدہ یا والد صاحب ڈرائنگ روم میں آ گئے تو یقیناً ڈانٹ پڑے گی، میں اگلے لمحہ حافظہ کی دنیا میں شعر تلاش کرنے لگا۔ والد صاحب بندوق تھامے ڈرائنگ روم کے سامنے سے گذرے، وہ شاید کسی ملازم کو پھٹکار رہے تھے مجھ پر بدحواسی کا دورہ پڑ گیا۔ یہ دورہ بڑھتا ہی گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جو رومانی شعر ثروت جہاں کو سنانا چاہتا تھا ذہن سے نکل گیا۔ بدحواسی میں یہ شعر پڑھ دیا۔

تھکا تھکا سا، بجھا بجھا سا آج وہ گھر یوں لوٹا ہے
منڈی میں کٹ جائے جیسے جیب کسی بیوپاری کی

"اچھا شعر ہے" ثروت جہاں مسکرا دیں۔ طنز کے انداز میں۔

مجھے اپنے حافظہ پر غصہ آ گیا۔ کیونکہ رومانی شعر پڑھنے میں ناکام رہا تھا۔ فوراً ہی دوسرا شعر حافظے کے اندھیرے میں تلاش کرنے لگا۔ لیکن کامیاب نہ ہوا۔ کیونکہ والد صاحب کی بندوق نظروں کے سامنے ناچ گئی تھی، بدحواسی میں یہ شعر پڑھ دیا۔

تخلستان

؎ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

ثروت جہاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں، میں انھیں گھورنے لگا، اُن کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح سُرخ ہو گیا۔ چند لمحے بعد ثروت جہاں بولیں " اور سُنائیے کچھ "

میں نے ایک بار پھر حافظے کی اتھاہ گہرائی میں غوطہ لگایا۔ ٹھیک اُسی وقت والد صاحب کا چہرہ لاشعور میں ابھر آیا۔ بڑی بڑی خونخوار آنکھیں، لانبے لانبے بال، صحت مند جسم میرے حواس پھر خراب ہو گئے، بدحواسی میں یہ شعر پڑھ دیا۔

؎ زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

اس بار ثروت جہاں کافی زور سے ہنسیں، مجھے غصہ آ گیا، اُن پر نہیں، اپنی قابلیت اور حافظے پر، شرمندگی سے بچنے کے لئے میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور ذہن کے اندھیرے میں رومانی شعر ٹٹولنے لگا، باہر والد صاحب غالبًا بید سے کتے کو مار رہے تھے، کتا چلّا رہا تھا۔ اور والد صاحب اُسے مغلظات سُنا رہے تھے، چیخ چیخ کر، ایسے میں حافظہ کیا ساتھ دیتا، مجبورًا یہ شعر پڑھ دیا۔

؎ اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

" یہ رومانی شعر ہے " کہہ کر ثروت جہاں ہنس پڑیں، اور صوفے پر گر گئیں، میں سوچنے لگا، عشق کی ایکٹنگ کرنا جس قدر مشکل ہے، موقع کا شعر پڑھنا اس سے بھی کہیں زیادہ دشوار ہے۔

ثروت جہاں بولیں " آپ کے شعر پڑھنے کا انداز اتنا دلکش ہے کہ فورًا حالی تک یاد آ جاتا ہے، لیکن آپ کا حافظہ سوڈا واٹر کی بوتل کی طرح ہے، مطلب یہ کہ آپ اپنے

[illegible] نہیں کیا رہے تھے۔ جیسے کہ آپ کے حافظہ کا ذکر ہو سکتا

ہے [illegible]۔

میں خاموش رہا جواب کیا دیتا؟ سچائی کے چہرے پر پتھر کیسے مارتا۔؟

ثروت جہاں نے کہا، کچھ اور سنائیے تاکہ وقت کٹ جائے،

میں نے ایکبار پھر حافظے کی گہرائی میں غوطہ لگایا۔ رومانی شعر کی تلاش میں، لیکن کامیاب نہ ہوا۔ کیونکہ والد صاحب کے چیخنے چلانے کی آواز ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ میرے حواس پر پھر بجلی گری۔ عجلت میں یہ شعر پڑھ دیا۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ثروت جہاں ہنستے ہنستے پھر صوفے پر گر پڑیں، میں اپنے کمرے میں بھاگ گیا۔ اور پلنگ پر کٹے ہوئے درخت کی طرح گر پڑا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ کلائیوں پر پسینے کے قطرے دکھائی دینے لگے تھے، حواس دھواں دھواں ہو رہے تھے، جیسے چوری کرکے آیا تھا۔

اس رومانی حادثہ کے بعد، میں نے کبھی ثروت جہاں کے سامنے شعر پڑھنے کی ہمت نہیں کی۔ حالانکہ ثروت جہاں نے کئی بار شعر سننے کی درخواست کی، لیکن میں نے ان کی درخواست پر غور نہیں کیا۔ اسی درمیان عرشی صاحب سے ملاقات ہوگئی، میں نے انھیں ناکامی کا افسانہ سنایا۔ بدحواسی کا تذکرہ بھی کیا۔ عرشی صاحب ہنس دیئے اور بولے، آپ احمق ہیں، ثروت جہاں کو عشق و محبت کے جذبات سے بھرا خط کیوں نہیں لکھ دیتے، منٹوں میں قصہ پاک ہو جائے گا۔ خط میں نہ صرف جذبات کا اظہار کیجئے گا بلکہ یہ بھی تحریر کر دیجئے گا کہ عشق تنہائی کی ملاقاتوں کے بغیر جوان

نہیں ہو سکتا۔ یہ جملہ آپ کی بدنیتی ظاہر کر دے گا اور ثروت جہاں ہمیشہ کے لئے آپ کے یہاں آنے سے توبہ کریں گی۔"

میں جواب کیا دیتا۔ عرشی صاحب کا شکریہ ادا کر کے اپنے اسٹوڈیو جیسے گھر میں واپس چلا آیا اور اپنے "کیس" پر غور کرنے لگا۔ عرشی صاحب کی تجویز معقول معلوم ہو رہی تھی۔ اس پر عمل کرنے سے ایک خطرہ پیدا ہونے کا امکان کافی روشن تھا، "میرا لکھا ہوا محبت نامہ ثروت جہاں والد صاحب کو دکھا سکتی تھی"، مجھ پر ڈانٹ پڑ سکتی تھی، بات ڈانٹ پھٹکار سے بھی آگے بڑھ سکتی تھی۔

میں نے ہر پہلو سے پیش آنے والے خطرات پر غور کیا اور عہد کر لیا کہ ثروت جہاں کو خط ضرور لکھوں گا، اُن کو گھر سے دفع کرنے کے لئے ہر خطرہ کا مقابلہ کروں گا۔

دوسرے دن میں نے ایک رومانی خط ثروت جہاں کو کالج کے پتہ پر روانہ کیا اور نتیجہ کا انتظار کرنے لگا۔ نتیجہ میری مرضی کے مطابق ہوا۔ ثروت جہاں نے گھر آنا بند کر دیا تھا، لیکن ریڈیو کے شور سے نجات نہ ملی، نجمہ ریڈیو بجانے میں ڈوبی رہتی تھی، ثروت جہاں کو مراسلہ لکھے ہوئے اب پندرہ دن گزر چکے تھے۔

~

اُس دن میں ایک کتاب کی تلاش میں ڈرائنگ روم میں جا پہنچا، نجمہ ریڈیو بجا رہی تھی مجھے دیکھ کر مسکرا دی، میں نے اس سے کہا "بلند آواز میں ریڈیو نہ بجایا کرو۔ اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو ریڈیو توڑ ڈالوں گا۔ بڑی مشکل سے ایک 'بلا' کو ٹالا ہے، اب تم شور مچاتی رہتی ہو۔"

نجمہ نے شرارت سے منہ بسورا، آنکھوں کی پتلیاں نچائیں، اور بولی "جس بلا کو آپ نے ٹالا ہے، وہ بڑی شان سے اس گھر میں آنے والی ہے۔ کیسے؟ یہ آپ کو وقت بتلائے گا بھائی جان۔"

ثروت جہاں نے ریڈیو بند کر دیا اور مجھے کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

---

اسی دن شام کا ذکر ہے، والد صاحب میرے کمرے میں آئے، ہاتھ میں ایک لفافہ تھامے ہوئے، لفافہ انہوں نے میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اور بولے "یہ آپ کا محبت نامہ یعنی لو لیٹر ہے۔"

شرم سے میری گردن جھک گئی، دل دھڑکنے لگا، ہاتھ پیر کپکپانے لگے۔

والد صاحب نے کہنا شروع کیا "میں آج صبح ثروت جہاں کے گھر گیا تھا، تمہاری امی بھی ساتھ تھیں، ثروت جہاں کے والدین سے ملاقات ہوئی، انھوں نے آپ کا یہ محبت نامہ مجھے دکھایا۔ یہ آپ نے پندرہ دن پہلے ثروت جہاں کو بھیجا تھا، اس میں آپ نے عشق و محبت کے دریا بہائے ہیں۔ ثروت جہاں سے تنہائی میں ملنے کی درخواست کی ہے، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فوراً آپ کی شادی ثروت جہاں سے کر دی جائے، آپ کے مراسلہ کی تحریر کے مطابق، میں نے ثروت جہاں سے آپ کا رشتہ طے کر دیا ہے، ثروت جہاں کے والدین شاید اس رشتے کے لئے پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے، انھیں غالباً ایک بے وقوف داماد کی ضرورت تھی، آپ میں یہ صفت موجود ہے۔ بہرحال، آپ کی شادی پندرہ دن کے اندر ہی ہو جائے گی۔ اب ثروت جہاں کو محبت بھرا خط لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ خدا کے فضل سے آپ کا کام تمام ہو گیا ہے۔"

والد صاحب خاموش ہو گئے، کچھ دیر نہ جانے کیا سوچتے رہے، پھر بولے "آپ پرانا ریڈیو کسی کباڑی کو دیدیجئے، نیا خرید لیجئے، نیا ریڈیو بھاری آواز کا ہونا چاہئے، ثروت جہاں بھاری آواز کا ریڈیو پسند کرتی ہیں نا، ان کی پسند کو اہمیت دینا ہم سب کے لئے ضروری ہو گیا ہے۔"

والد صاحب جملوں کے تیر برسا کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے، میرا سر چکرا رہا تھا،

# سید منجو قمر سے ایک انٹرویو

محمد خالد عابدی آل انڈیا ریڈیو اندور

سوال :- آپ نے سب سے پہلا ڈرامہ کب لکھا تھا ؟

جواب :- ۱۹۳۰ء میں ۔

سوال :- کیا آپ نے ڈرامے میں کچھ تجربات بھی کئے ہیں

جواب :- ہاں ، ہر منظر کے ختم پر ساکت منظر (ٹیبلو) کے تاثر اور جنگ کی صورت میں ٹیپ ریکارڈر سے کام لیکر ۔

سوال :- ایک اچھے ڈرامے میں کن چیزوں کا ہونا ضروری ہے ؟

جواب :- اچھوتی کہانی ، شستہ و برجستہ مکالمے اور منجھی ہوئی اداکاری ۔

سوال :- اسٹیج کے مقابلے میں ریڈیائی ڈرامہ زیادہ مقبول ہے ۔ کیا یہ دعویٰ درست ہے ؟

جواب :- غریب ہندوستانی سستی بلکہ مفت کی تفریح کا عادی ہے ۔ لفظ "ڈراما" صرف اسٹیج سے متعلق ہے کہ اس کے معنی کچھ کر دکھانے کے ہیں ۔ مرکب لفظ "ریڈیائی ڈرامہ" جنگ عظیم کے بعد کی پیداوار ہے ۔ ریڈیو صرف سننے کی خاطر ہے لیکن اسٹیج دیکھنے اور سننے دونوں کی خاطر ، تو ریڈیائی ڈرامے کا اسٹیج سے مقابلہ کرنا ٹھیک نہیں ۔

سوال :- کیا اسٹیج ڈراما زیادہ کرداروں اور طویل مکالموں کا متحمل ہوسکتا ہے ۔

جواب :۔ جی ہاں ! اگر ڈراما تاریخی ہو اور خاص کر "منفی پلاٹ" میں کردار زیادہ ہوتے ہیں۔ یہی بات طویل مکالموں کی "تقریر" یا خود کلامی" میں دو چار منٹ کی طوالت گوارہ کرلی جاسکتی ہے لیکن اسٹیج ڈرامے میں طویل مکالمہ سامع کو بور کر دیتا ہے۔

سوال :۔ ڈراما خود ایک شاعری ہے کیا یہ کہنا درست ہے ؟

جواب :۔ غلط بیانی ہے۔ جمیع اصناف ادب اور جمیع فنون لطیفہ کے مجموعے کا نام ڈراما ہے۔

سوال :۔ ابھی تک ڈرامے پر جو تحقیقی کام ہوا ہے کیا آپ اُس سے مطمئن ہیں ؟

جواب :۔ پچاس سے زیادہ اُدبا، تنقید نگار اور محققین نے اس قدر کام کیا ہے کہ اب مزید تحقیق کی ضرورت نہیں رہی، البتہ ان میں سے بیشتر محققین نے روایات اور شنی شنائی باتوں اور قیاس آرائی سے کام لیا ہے، یوں بھی ہمارا ادیب دس روپے کا ٹکٹ لیکر ڈراما دیکھنے کی سکت نہیں رکھتا۔ تاہم قلم کا دھنی ضرور ہے پھر بھی کسی نے بھی کسی ایک ڈرامے کو سامنے رکھ کر اُس پر تحقیق کا کام نہیں کیا۔ یہ اُردو کی بدبختی ہے ورنہ کام کرنے والے کے لئے حشر صاحب کا "رستم وسہراب" کیا کم تھا۔

سوال :۔ کسی ڈرامے کا ترجمہ کرتے وقت کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے ؟

جواب :۔ اگر ڈراما ہندوستان کی کسی بھی زبان میں ہے تو اس کا من وعن ترجمہ کسی زبان میں کرنا چاہئے۔ ایسے میں کسی بات کا خیال رکھنا غیر ضروری ہے، البتہ ہندوستان سے باہر کی یعنی مغربی ہے تو فرسودہ تہذیب۔ پر نظر کر کے شرم وحیا اور ہندوستانیت کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔

سوال :۔ کیا یہ خیال درست ہے کہ اسٹیج ڈرامے کی ترقی یافتہ شکل فلم ہے ؟

جواب :۔ بالکل درست ہے۔

سوال :۔ فلم سے اسٹیج ڈرامے کی تقریباً موت ہوگئی۔ آپ کی کیا رائے ہے ؟

جواب :۔ اسٹیج ڈرامے کی موت کیا واقع ہوتی، البتہ اُردو اسٹیج ڈراما پیش نہ کیا جا سکا۔ ڈراما لکھنے والے بھی لکھتے ہیں اور پیش کرتے ہیں لیکن پچھلا سا طمطراق باقی نہیں رہا۔

سوال :۔ ریڈیائی ڈراما، فلم اور ٹیلی ویژن کیا اسٹیج ڈرامے کے لئے مہلک ثابت ہوئے ہیں؟

جواب :۔ ان میں جان کہاں جو ہلاک کرتے؟ ریڈیائی ڈراما فلم اور ٹیلی ویژن نے اسٹیج کو مات دیدی۔ ایک دور ایسا آئے گا کہ "طلسفن" یعنی ٹیلی ویژن، ریڈیو، فلم اور اسٹیج تینوں کا نام ونشان مٹا دے گا۔ "اچھا ڈراما" صرف پڑھنے کی چیز بن کر رہ جائیگا اور کبھی کبھار شاید اسٹیج بھی کیا جا سکے۔

سوال :۔ شیکسپیئر اور آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کو فلمی شکل دی گئی ہے۔ کیا ان فلموں میں ڈرامائیت قائم رہی؟

جواب :۔ انہی کے خیالات کو تو محور بنایا جاتا ہے۔ خیال اُپج اور مکالمے کی چاشنی قائم رہی تو ڈرامائیت بھی قائم رہے گی سو وہ قائم رہی۔

سوال :۔ ڈراما انارکلی میں اکبر اعظم کا المیہ ہے یا سلیم وانارکلی کا۔ آپنے کیا تجزیہ کیا؟

جواب :۔ انارکلی ڈراما نہیں صرف مطالعہ کرنے کی ادبی چیز ہے۔ اسٹیج نہیں کیا جا سکتا۔ خود مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ یہ خیالی چیز۔ انارکلی کے مزار کے کتبے کو پڑھ کر انہوں نے لکھا تھا جس کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں تاہم انہوں نے شاہانِ مغلیہ کے تاریخی نام دیکر اس کردار کو تاریخی قرار دینے کی بے جا جرأت کی۔ رہا سوال اکبر کے المیہ یا سلیم وانارکلی کے المیہ کا تو میں کہوں گا یہ مدرسہ کی چہار دیواریوں میں بند تخیل کی قلابازیوں سے کام لینے والوں کی قیاس آرائی ہے۔ جنہوں نے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود "انارکلی" کو ڈراما کی تعریف دیدی۔ تاریخی اعتبار سے اکبر اور جہانگیر کے کردار پر

یہ ایک بدنما داغ ہے جس کی پنجاب کے ناظر تعلیمات نے ہوا دی۔ اور اس زبان کی گھلاوٹ کے مدنظر صرف ایکبارگی مطالعہ کی چیز ہے۔ واضح ہو کہ جب پارسی تھیٹر نے اسے "ڈراما" میں تبدیل کرنے کی تاج مرحوم سے خواہش کی تو انہوں نے معذرت اس لئے چاہی کہ بیسیوں مناظر کو دو یا تین "ایکٹ" کے ڈرامے میں تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔ غرض "انارکلی" کو ڈرامہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

سوال :۔ ریڈیائی ڈرامہ میں بہ حیثیت "روح رواں" کونسا حصہ ہے ؟

جواب :۔ ریڈیائی ڈراما ہو کہ اسٹیج ڈراما۔ ابتداء ارتقاء اور انتہا پر مشتمل ہوتا ہے اس کا ارتقائی پہلو بہ آسانی سمجھ لیا جاسکتا ہے لیکن "روح رواں" جیسی کوئی چیز اس بے جان شے کینئے یا فن میں نہیں ہوتی۔ جب تک کسی خاص ریڈیائی ڈرامہ کی نشاندہی ہی نہیں کی جاتی اس کے عروج کی بھی نشان دہی نہیں جاسکتی۔

سوال :۔ ریڈیائی ڈرامے کا سب سے نازک پہلو کونسا ہے اور اس پر کس طرح تسخیر پائی جاسکتی ہے ؟

جواب :۔ ریڈیائی ڈرامہ میں سمجھتا ہوں از ابتدا تا انتہا متعدد نازک پہلوؤں پہ مشتمل ہوتا ہے ان میں سے کسی ایک پہلو کی تسخیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔

سوال :۔ اگر ریڈیائی ڈرامہ کو اسٹیج کیا جائے تو کن تقاضوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور کیا یہ تجربہ کامیابی کا متحمل ہو سکتا ہے ؟

جواب :۔ صرف خاکہ ہی تو اپنایا جائے گا ایسے میں تمام قباحتوں کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔ خاکے کو اپنانا تجربہ نہیں ہوتا۔

سوال :۔ کیا اسٹیج ڈراما نویس بہ آسانی ریڈیائی ڈراما لکھ سکتا ہے ؟ اگر نہیں تو کیوں ؟

جواب :۔ اسٹیج ڈراما نویس "کل" کی حیثیت رکھتا ہے اس کے لئے ریڈیائی ڈرامانگاری مشکل نہیں ہوتی۔

سوال :۔ اسٹیج ڈراما اور ریڈیائی ڈراما کے مکالموں میں کیا فرق اور خصوصیات ہیں ؟

جواب :۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے ریڈیو سننے کی چیز ہے اور اسٹیج "کر دکھانے" کی تو ظاہر ہے ریڈیو میں زبان ہی زبان اور آواز ہی آواز ہے لیکن اسٹیج ڈرامے کے مکالمے میں حرکی الفاظ کا استعمال بے حد ضروری ہے تاکہ ڈرامائی تاثر پیدا ہو سکے۔

سوال :۔ کیا ریڈیائی ڈرامے سننے میں غیر فطری محسوس ہوتے ہیں ؟

جواب :۔ کوئی بھی غیر فطری بات غیر فطری ہی محسوس ہو گی۔

سوال :۔ اسٹیج ڈراما اور ریڈیائی ڈراما میں کس کا تاثر دلدوز اور دیرپا ہوتا ہے ؟

جواب :۔ چشم بینا شہادت دے گی کہ اسٹیج ڈرامہ کا تاثر دلدوز بھی ہوتا ہے اور دیرپا بھی۔

سوال :۔ کیا ریڈیائی ڈراما محض تفریحی وسیلہ ہے ؟

جواب :۔ بالکل اور اثر آور بھی۔

سوال :۔ ریڈیائی ڈرامے کی کہانی کو کس چیز سے پُرکشش بنایا جا سکتا ہے ؟

جواب :۔ پُرکشش کہانی اور اچھوتی زبان سے، بشرطیکہ صوتی انداز موزوں ہو۔ اور مکالمہ اثر انگیز تو ظاہر ہے ان کی اہمیت ہے ہی تاہم بہتر اندازِ پیشکش سے پُرکشش بنایا جا سکتا ہے۔

سوال :۔ ریڈیائی ڈرامہ کا وہ کونسا حصہ ہوتا ہے جو سامعین کے لئے بار خاطر اور نشاط خاطر کا باعث ہوتا ہے ؟

جواب :۔ ہر بور کرنے والا حصہ بور اور ہر نشاط انگیز حصہ نشاط خاطر ہوتا ہے۔ ان دونوں باتوں کا انحصار اختتامی حصہ پر ہوتا ہے۔

سوال :۔ کیا ریڈیائی ڈرامہ نگار کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ فنی اور میکانکی مسائل سے بخوبی واقف ہو۔ یا صوتی اثرات کی ذمہ داری ریڈیائی ڈرامہ ڈائرکٹر

کے لئے وقف ہے ؟

جواب :۔ میکانکی وسائل سے واقفیت "تحریر" میں سکت پیدا کرتی ہے، صوتی اثر پیدا کرنا صوتی انداز کا فریضہ ہے۔

سوال :۔ کیا اردو ریڈیائی ڈراما کو ادب میں شمولیت حاصل ہے ؟

جواب :۔ ہر ادبی چیز ادب میں شمار کی جاتی ہے۔ اسی طرح ریڈیائی ادبی ڈرامہ کو ادب میں شمولیت حاصل ہے۔

سوال :۔ اردو ریڈیائی ڈرامے کا مستقبل ؟

جواب :۔ تاریک، کیونکہ ٹیلی ویژن کا مستقبل روشن ہوگا۔

سوال :۔ کہتے ہیں ایکشن کا نام ڈراما ہے تو کیا ریڈیائی ڈراما، ڈراما نہیں ؟

جواب :۔ ناواقف کار نے ایسی تعریف کی ہو تو ممکن ہے صرف ایکشن کو ڈراما نہیں کہتے "ریڈیائی ڈرامہ، غلط العوام فصیح ہے۔ لیکن میں اسے "صوتی کہانی" کہتا ہوں کہ "ریڈیائی ڈراما، ڈراما نہیں ہوتا۔ کیونکہ ڈرامے کا لفظ صرف کردکتے کے لئے ہی مختص ہے بعض مفکرین کا خیال ہے کہ ڈراما نہ صرف اسٹیج پر پیش کرنے کی چیز ہوتی ہے بلکہ وہ پیش کش کے بعد "کامیاب" بھی ہو تو اسے "ڈراما" کہتے ہیں۔

●●

# خان خاناں
# اور
# ہندی شاعری

محمد شمس الدین
۹-۱۱-۵۱ قلعہ گولکنڈہ حیدرآباد

مرزا عبدالرحیم خان خاناں اکبر اعظم کی فوج کا ایک بڑا جرنیل تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کو ادب سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ اس کو عربی اور فارسی میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ اسکے علاوہ بھاشا میں بھی اس کا جواب نہیں۔ اور ہندی کلام میں خان خاناں کو دوامی شہرت حاصل ہوئی۔ ذہن رسا اور جودت خداداد تھی، شستہ الفاظ بھی مرغوب تھے۔ تخیل میں بلند پروازی، کلام میں چستی اور بندش غضب کی تھی۔ اچھے مضامین کی تلاش، الفاظ کا مناسب اور برمحل استعمال اس کے کلام کا خاص جوہر رہے، بعض دوہوں کا مضمون اس قدر عمیق ہے کہ ایسی حیرت انگیز قدرت کا نمونہ بہت کم کسی اور کے کلام میں پایا جاتا ہے، خیالات کی تازگی اس قابل ہے اس کی تعریف بے حد کی جائے۔

خان خاناں نے خود اپنے ادبی ذوق کی بنا پر ہندی ادب کی بہت خدمت کی سورداس جو ہندی کا مشہور شاعر تھا۔ کی وفات کے بعد اس کی یادگار میں خان خاناں نے فن نظم ایک اشرفی دیکر اس کی تخلیقات کو جمع کر کے "سور ساگر" مرتب کیا، اسکے علاوہ گیتا

کا سنسکرت سے ہندی اور فارسی میں ترجمہ کیا۔

ہندی میں بعض جگہ اس کا تخلص "رحمٰن" اور بعض جگہ "رحیم" آیا ہے۔ چنانچہ اس کی ہندی شاعری کے چند نمونے پیشِ خدمت ہیں ملاحظہ ہوں۔

1. रहेमान धाग प्रेम का जन तोड़ो छुटकाऐ ।
टूटे से फिर न जुड़े गांठ पड़ जाऐ ।

ترجمہ:۔ شاعر خود کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ اے رحمٰن محبت کے رشتے کو کبھی نہ توڑ۔ کیونکہ ٹوٹنے کے بعد ان کا جوڑنا محال ہے۔ اگر بہ فرض محال جڑ بھی جائے تو درمیان میں گرہ پڑجاتی ہے۔

2. रहेमान रहो वहाँ भलो जब तक सैलसमीज
सैल मिल जब दखे तरत किजिए कूच

ترجمہ:۔ عزت نفس ملاحظہ ہو۔ کہتا ہے، اے رحمٰن کسی مقام پر اس وقت تک رہنا اچھا ہے جب تک میزبان کے برتاؤ میں کمی محسوس نہ ہو، جیسے ہی تم کو معلوم ہو کہ برتاؤ میں کمی پیدا ہوگئی تو فوراً اس مقام سے کوچ کر جاؤ۔

3. रहेमान देखी बड़े को लीखो न दिजिय डार
जहाँ काम आवे सुई कहा करे तलवार

ترجمہ:۔ شاعر ناصحانہ انداز میں کہتا ہے کہ بڑی چیز کو حاصل کرکے چھوٹی چیز کو کھو نہیں دینا چاہیے جہاں سوئی کام آجاتی ہے وہاں تلوار کچھ کام نہیں کرسکتی۔

4. रहेमान मोर समाघ अब मित्र बित में होए ।
पग वा को परतवे रहे रहुँ प्रसग से होए ।

ترجمہ:۔ ندرت خیال ملاحظہ ہو، کہتے ہیں اے رحمٰن میری قبر سیر معشوق کے راستے میں میں بنائی جائے تاکہ اس کا پاؤں پڑتا رہے اور مجھے آرام اور چین کی نیند ملے۔

5\. रहेमान नीच संगबसे लगत कलंगन काहो।

दोध कलारन हाथ मोरवी मद सम सत साहो।

ترجمہ :۔ کس قدرت شستہ کلام ہے۔ کہتے ہیں اے رحمٰن نیچ اور ذلیل آدمیوں کی صحبت میں نہ رہو کیونکہ ساقی کے ہاتھ میں اگر دودھ بھی ہو تو وہ شراب ہی سمجھا جائیگا۔

غرض خان خاناں کی ہندی شاعری ایک انمول خزانہ ہے جو اس وقت تک یادگار رہے گا جب تک ہندی زبان زندہ ہے۔

---

## دنیا میں ساٹھ کروڑ افراد

## اردو زبان بولتے ہیں

اس کا اظہار اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم نے ایک جائزہ میں کیا ہے۔

## اس سے اُردو زبان

کی اہمیت اور اسکے علمی کارناموں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے

# اُردو زبان کتنی سخت جان

ڈاکٹر ایس جلال توقیر، ایم، بی، بی، ایس، ڈی، سی، ایچ، سوائی مادھوپور راجستھان

یہ اردو زبان بھی ہے بڑی سخت جان، کہتے ہیں کہ یہ کھڑی بولی سے نکلی ہے، دہلی اور لکھنؤ میں پروان چڑھی، نازک مزاجی کے اعتبار سے اس کا انجام تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ اسکے قریب سے کوئی نفرت کی میلی کچیلی خاکروب گذرتی تاکہ تعصب کے تعفن سے اس کی روح بغیر کسی تاخیر کے پرواز کر جاتی لیکن ہوا دراصل اس کے برعکس. دہلی سے لکھنؤ پہنچنے سے پہلے یہ دکن پہنچ گئی اور اس نے اپنے ہاتھ پیر ایسے پھیلائے کہ ملک کا کوئی گوشہ شاید ہی ایسا بچا ہو جہاں اس کا وجود نظر نہ آتا ہو جہاں نہیں پہنچ سکی وہاں اس کی زلف کے لمبے اور گھنے سائے پہنچ گئے، اپنے تو اپنے پرائے بھی اس کی زلف کی گرہ گیر کے اسیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

لیکن اسیر ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ دشمنی تو آخر دشمنی ہے لہٰذا اب مشورے ہونے لگے کہ اسکو کیونکر غارت کیا جائے۔ سب سے پہلے یہ سازش تیار ہوئی کہ اس پر غیر ملکی ہونے کا الزام لگایا جائے کیونکہ جب یہ غیر ملکی قرار دیدی جائے گی تو فوراً اسپر غداری اور وطن دشمنی ثابت ہو جائیگی اور ظاہر ہے کہ جب کوئی وطن دشمن اور غدار ہو تو اُس سے زیادہ ذلیل کون ہو سکتا ہے پھر چاہے یہ عدالت کے دروازے بھی کھٹ کھٹائے گی لیکن کون سُنے گا۔ لہٰذا اس کا شجرۂ نسب معلوم کیا گیا

تو معلوم ہوا کہ یہ عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کے آمیزش سے اس کا خمیر تیار ہوا ہے۔ اب سوال بڑا پیچیدہ تھا کہ اس میں اردو کا کیا قصور ہے یہ تو بالکل ایسی مثال ہے جیسے کوئی جرمن عورت کسی ہندوستانی رکشہ والے سے شادی کرے، یا پاکستان کا کوئی کرکٹ کھلاڑی ہندوستانی فلم ایکٹرس سے بیاہ رچالے اور جب اس قسم کی شادیوں سے کوئی اولاد پیدا ہو تو اس پر غیر ملکی ہونے کا الزام لگا دیا جائے۔

جب یوں بات نہ بن پڑی تو مخالفین کے ذہن میں ایک اور تدبیر آئی کہ کیوں نہ اس پر فرقہ پرستی کا الزام عائد کیا جائے۔ اس تدبیر کے ذہن میں آتے ہی اُردو دشمنوں کی ایک بار تو باچھیں کھل گئیں۔ محسوس یوں ہوا کہ گویا کہ درپردہ اُردو دشمنی کم اور اُس فرقہ سے دشمنی زیادہ کرنا تھی جس کا مذہبی لٹریچر اُردو میں محفوظ تھا یا آج ہے، لہذا منصوبہ یہ بنایا گیا کہ کیوں نہ اس جنم جلی اردو کو فرقہ پرستی کا الزام لگا کر ملک بدر کر دیا جائے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری، لیکن یہاں مخالفین کو ایسی منہ کی کھانی پڑی کہ بیچاروں کو چہرہ چھپانا مشکل ہو گیا۔ ایسے ایسے اردو کے حامی سامنے آئے کہ تمیز کرنا نا ممکن ہو گیا کس فرقہ پر اردو نوازی ہونے کا سہرا باندھا جائے اور کس کو اردو دشمنی کے الزام سے سرفراز کیا جائے۔

جب ان کرم فرماؤں کے ہتھکنڈے کسی بھی طرح کامیاب نہ ہو سکے تو کچھ دنوں کے لئے خاموشی اختیار کر لی گئی۔ گو چھٹ پٹ وارداتیں ہوتی رہیں مثلاً اسکول میں اردو ٹیچر نہیں، کبھی اردو کی کتابیں دستیاب نہیں ہیں کبھی یہ کہ طلباء کی تعداد کم ہے وغیرہ وغیرہ مگر اردو کے لئے یہ زخم بہت معمولی تھے جو بغیر مرہم پٹی کے مندمل ہوتے رہے، کبھی زخم ذرا بڑا ہوا تو اس بدنصیب نے اپنے ہی آنچل سے ذرا سا ٹکڑا پھاڑ کے پٹی باندھ لی، لیکن اپنی رفتار میں کمی نہ آنے دی۔

لیکن مخالفین اردو کی یہ خاموشی کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھی، دیکھتے ہی دیکھتے ایسے لوگ اردو کے "ہمنوا" بنکر سامنے آگئے جنہیں اس سے قبل نہ کبھی دیکھا تھا نہ سُنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کا سامنے آنے کا انداز بھی خوب سے خوب تر تھا۔ مثلاً ان میں سے ایک صاحب نے اردو کے طرفدار

چنانچہ وہ تقریریں کیں کہ زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے اور جب قلابے مل گئے تو پھر فرمایا ، دیکھو بھائی اردو کی ترقی میں ایک چیز حائل ہے ، اور وہ ہے اس کا رسم الخط جو اس قدر مشکل ہے کہ نہ تو اردو کا ٹائپ رائٹر تیار ہو سکتا ہے اور نہ اس کا لکھنا ہی اتنا آسان کہ ہر کوئی سیکھ سکے ۔ لہٰذا اس کا رسم الخط دیو ناگری میں کر دیا جائے ۔

اردو کے ایک دوسرے ہمدرد نے فرمایا کہ رسم الخط تو دیو ناگری کر ہی دیا جائے لیکن اس کی جائے پیدائش کے نقطۂ نظر سے اس کا نام اردو سے بدل کر ہندوستانی کر دیا جائے ، لیجئے ہو گیا کتنا آسان طریقہ سے اردو کا نام کرن سنسکار اور ہو گئی اس کی ترقی کی راہ ہموار ، اسے کہتے ہیں ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آجائے ۔

اس قسم کی تقاریر کا سلسلہ ابھی پوری طرح بند بھی نہ ہوا تھا کہ "ہمدردان" اردو کا ایک گروہ تجدید اردو کا علمبردار بن کر سامنے آیا اور اس کرّو فر سے آیا کہ اب تک تمام ہمدردان اردو کو کئی برس پیچھے چھوڑ گیا اس گروہ کو یہ فکر سوار تھی (اور آج بھی ہے) کہ اردو کے پرانے جامہ کو یک لخت اتار پھینکا جائے اور اردو کی ہر صنف کو ردیف اور قافیہ سے آزاد کر کے جدیدیت کے لباس سے آراستہ کیا جائے ۔ اور اس کی قطعاً پرواہ نہ کی جائے کہ جدید لباس میں اردو کتنی عریاں اور برہنہ نظر آتی ہے ۔ وہ اردو جس کو عموماً شلوار قمیض پہنے دیکھا گیا ، جس کے سر سے کبھی دوپٹہ سرک کر شانوں تک نہ آیا اس کا دوپٹہ اتار کر کہیں پھینک دیا جائے ۔ اس کی لمبی اور گھنی زلفوں کو تراش کر بوب کٹ یا بوائے کٹ کر دیا جائے ۔ شلوار قمیض کی جگہ اسکرٹ اور بغیر آستینوں کا بلاؤز لے لے ، سلیپر کی جگہ اس کو اونچی ایڑی کے ایسے سینڈل پہنائے جائیں کہ اس کے ہر ہر قدم پر لغزش کا گمان ہو اور توازن بگڑنے لگے ۔ غرض یہ کہ جدیدیت کا لباس پہن کر اردو نہ اردو لگے نہ ہندوستانی بلکہ سراپا انگلش نظر آنے لگے پھر خواہ اردو پر اس کی بڑی بوڑھیاں یعنی سنسکرت ، فارسی اور عربی وغیرہ کتنی ہی انگلیاں اٹھائیں اس کی قطعاً پرواہ نہ کی جائے ۔ اسی صورت میں اردو کی ترقی اندرجا ممکن ہے ۔

کاش اردو کے بہی خواہ جو صحیح معنوں میں اردو کے خیر خواہ ہیں یہ سمجھ لیں کہ جدید شاعری کی بے راہ روی اردو کے لئے وہ زہر قاتل ہے جو اس کی رگ و پے میں آہستہ آہستہ سرایت کر رہا ہے اگر اس کا علاج بروقت نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اردو کا مرثیہ کہنے والا بھی کوئی نہ رہے اور پھر کسی "دقیانوس" شاعر کا مصرعہ ہی کچھ ردّو بدل کے بعد یوں پڑھنا پڑے ۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھی

(اردو کے جدید شعراء سے معذرت کے ساتھ)

(ادارہ ۔ خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی)

---

ص۱۱ کا بقیہ : ہر شخص پڑھتا ہے "بیسویں صدی"، اور "شمع" کی مقبولیت کا سبب مضامین نہیں افسانے ہیں ۔ بہرکیف، مجموعی حیثیت سے نخلستان معیاری جریدہ ہے آپ تمام حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ آپ حضرات کو اس سلسلے میں کتنی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہوگا ۔ یہ تو آپ ہی حضرات جان سکتے ہیں ۔

میرے ذہن میں نخلستان کے اسٹاف یا مضامین نگار حضرات کے خلاف کوئی انتقامی جذبہ کارفرما نہیں ہے ۔ نخلستان پر جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ بربنائے خلوص کیا ہے ۔ میں یہاں نخلستان کو فروغ دینے کی کوشش کروں گا ۔ لیکن افسانوی ادب کا حصہ بڑھائیے ۔ مجلس ادارت کی خدمت میں محبت بھرا اسلام ۔ امید کہ آپ سبھی حضرات بعافیت ہوں گے ۔ کارلائقہ سے یاد فرمائیے ۔

والسلام

مظفر انصاری

تسنیم کاظمی

# کیپسول

میں تو اس شخص کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکی جس نے یہ لفظ ایجاد کیا۔ کیپسول ہماری زبان میں نہ ہوتا تو پھر ہم ادب میں بھی نہ استعمال کر سکتے۔ ویسے یہ نام ڈاکٹر، کیمسٹ، اور مریضوں کی مطلب کی چیز ہے لیکن اردو ادب نے بھی دامن پھیلا کر اس کو اپنا لیا اور نادر تشبیہ کے طور پر استعمال کر دیا۔

اس لافانی نام کو کسی چیز رنگ و نسل قوم و مذہب کسی سے بھی تعصب نہیں۔ کتنے بے شمار کیپسول ہاتھ ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں۔ ہمیں اپنا لو، گلے لگا لو۔ اپنی کہانی اپنے افسانے کا عنوان بنا لو تسنیم! ادبی قدروں میں ڈھلکر زندہ جاوید ہونے کے لئے مچل رہے ہیں، کیسے ان کا دل رکھوں! اور، کس طرح مثال دوں، "بچپنا ہے تو ضدیں بھی ہیں نرالی ان کی" پھول پر لرزتے ہوئے قطرۂ شبنم، محبت کے تاج محل ستاروں کی چشمک، نسیم صبح گاہی۔ خرام آہو۔ چاند کی خنک چاندنی، آبشار کے ترنم، نیم نگاہی، ایک شعر، ایک نغمے کے طلسم حروف میں سمودو نا ہم کو !!

کائنات کی ہر شئے کیپسول میں بند ہے جب تک بند ہے محفوظ ہے۔

اف! بھوپال گیس پائپ پھٹتے ہی میدان حشر بن گیا وہ گھٹن وہ دھواں۔

جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء

کسی شے نے حد سے تجاوز کیا تو ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۶ء کی طرح ناگاساکی، ہیروشیما پر ایٹم بم بن کر گرتے ہی تباہی و بربادی، ویرانی طوفان اٹھا دیتی ہے۔ اف بیچارہ جاپان ۔ آہ بیچارہ مسیحے گاندھی ہیلی کوپٹر کا کیپسول پھٹتے ہی حرف غلط کی طرح دنیا سے مٹ گیا۔ اس عالم کی ہر شے کا مقدر کیپسول میں بند ہے ۔

نومبر کی ایک سرد و خاموش رات میں وہ اسٹڈی کر رہی تھی کہ دریچے کا کواڑ کھلتا ہوا سا محسوس ہوا نگاہ اٹھا کر دیکھا تو ایک شخص اندر آتا ہوا دکھائی دیا، نوید ہیبت سے کانپنے لگی۔ جگہ جگہ سے کپڑے پھٹے ہوئے خاک دھول میں اٹ کر خاصا ہیولا لگ رہا تھا۔ آتے ہی اپنا سامان زمین پر رکھ دیا۔

خاموش رہو، ورنہ گولی کا نشانہ بنا دی جاؤ گی، ٹھیک سے رہیں تو کوئی نقصان نہ ہوگا ان سب بچوں کو سوتا رہنے دو، شور مچانے کی کوشش نہ کرنا، پستول داغ دوں گا، روشنی مدھم رکھو، لیمپ کی بتی کم کر دو بالکل نہ ڈرو ۔

"مگر تم ہو کون ؟ اور اس طرح کیوں آئے ہو ۔

یہ تو میری افغان رجمنٹ کی وردی سے پتہ چل جائے گا پہچان لو

اگر پکڑا گیا تو مار ڈالا جاؤں گا، میں ابھی اور جینا چاہتا ہوں جیوں گا ....

تم جو میری زندگی میرے سامنے ہو ۔

اس مختصر لباس پر یہ اوور کوٹ پہن لو یا شال اوڑھ لو، میں غیرت مند قوم افغان سے ہوں

کیا نام ہے آپ کا ؟

نوید زیدی، اس کے منہ سے بمشکل نکلا ۔

"کیا افسانوی سا نام ہے نوید زیدی ۔ نوید زیدی اس نے شیرینی محسوس کرتے ہوئے جان غزل کے اضافے کے ساتھ دہرایا۔ سلام نہ لیں گی۔ بیٹھنے کو نہیں کہیں گی، میرا نام بھی نہیں پوچھیں گی، چور ڈاکو لٹیرا نہ کہیں گی، نوید زندگی! میرا نام خان شہباز خاں ہے، سینٹ جونس کالج آگرہ سے بی. ایس. سی ۔ ..........

ہوں، ماسکو ہی میں اردو زبان سیکھی، مینی تال فوجی ٹریننگ اسکول سے سپاہی بنا، سات سال سے افغان فوج کا ملازم ہوں، چھ میڈل حاصل کرچکا ہوں ... فوج کے ہاتھوں پریشان ہوں، جان بچانے کے لئے آپکی پناہ میں آیا ہوں یا قسمت لے آئی ہے اوراب" نجانے کونسا عالم گذر گیا دل پر"،

مدھم روشنی میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے دیکھتے رہے اور ایک دوسرے کے ہوگئے، نکلتا ہوا قد، مرجھایا ہوا سرخ وسپید رنگ، بھرا بادام کی شیپ کا چہرہ، کیوپڈ کی کمانوں میں رقص کرتے ہوئے تیر، باریک لبیں ان پر خفتہ مسکراہٹ، سر پہ دھول میں اٹے ہوئے الجھے ہوئے بالوں کا جنگل، کشیدہ ہاتھ پاؤں۔ مگر ایک چیز یہ کہ چہرے پر ناک غیر شاعرانہ۔ جیسے ہانپتے ہوئے ہرن کے نتھنے پھیلتے سکڑتے ہیں۔

پہلے میرے ہاتھ دھلا دیجئے۔

وہ سامنے واش بیسن ہے دھو لیجئے سر اور منہ بھی،

ان سب بچوں کو یوں ہی سوتا رہنے دیں، شور مچانے کی کوشش کی تو پستول داغ دوں گا خاموش رہیں تو کوئی نقصان نہ ہوگا، میں بے رحم انسان نہیں ہوں۔

اس نے پستول صوفے پر پھینک دیا، کٹی لٹی رسیوں میں بندھا ہوا پیراشوٹ زمین پر رکھ دیا، بارود کی تھیلی میز پر احتیاط سے رکھدی۔

" کچھ کھانے کو مل سکتا ہے لوید مسرت! گھر میں اور کون کون ہیں؟

یہ آپ میرے کیسے کیسے نام رکھ رہے ہیں واہ۔ گھر میں اماں ہیں ابا میاں ہیں اور یہ بچے،

" یہ تھوڑا سا چاکو لیٹ کریم کیک ہے، میری سہیلی نے بھیجا تھا، آدھا تو میں کھا چکی ہوں۔

" لائیے لائیے نعمت ہے بڑے شوق سے کھاؤں گا، پورے پانچ وقت سے

کچھ نہیں کھایا ہے، یہ تیل میں ملی ہوئی مٹی میرے کپڑوں پر لگی ہوئی ہے، میں دہرہ دون میں ایک بنگلے کے گیراج میں پورے پچاس گھنٹے گاڑی کے نیچے چھپا رہا ہوں موبل آئل اور پٹرول ٹپکتا رہا موقع پا کر بس سے یہاں پہنچا، بازار میں دیکھا کہ جاسوس مجھ سے پہلے موجود ہیں، ایک بھڑبوجے کی دوکان میں بھری ہوئی بوریوں کے پیچھے لیٹا رہا، اندھیرا ہوا تو چھپتا چھپاتا یہاں آیا ہوں، پیراشوٹ سے روسی ہوائی جہاز نے فضا میں گرا دیا تھا۔ زمین پر آنے سے پہلے ہی بیہوش ہو چکا تھا نجانے کتنک ایک اونچے درخت میں لٹکا رہا، پیراشوٹ بری طرح الجھ گیا تھا، حواس درست ہوئے تو لائٹر سے اسی کو آگ لگا دی، رسی جل گئی تو زمین پر آ رہا وہاں سے بھاگا تلاش کرتے کرتے گیراج میں پناہ ملی، اور اب روح میں ستارے سے ٹمٹما رہے ہیں، ہمیں جب کوئی صورت بچاؤ کی نظر نہیں آتی تو تھیلی سے بارود کپڑوں پر چھڑک کر زندہ جل مرتے ہیں اگر آپ کے گھر میں چند گھنٹوں کی پناہ نہ ملی تو صحن میں کھڑے ہو کر بارود کو آگ لگا کر جل جاؤں گا،

"نہیں نہیں میں آپ کو مرنے نہیں دوں گی ہرگز نہیں،

"ہوں ہوں میری طرف نہ بڑھئے، مجھے چھونے کی کوشش نہ کیجئے میرا لباس بیحد کثیف ہے۔ میں محبت میں تطہیر کا قائل ہوں اگر ایسا ہی ہے تو جائیے اپنی والدہ کو بلا لائیے،

محبت محبت کیسی محبت، ایک ملکوتی نغمہ جو روح کو روح سے ترسیل ہوتا ہے اندر سے آواز آئی

" ہاں خدا ترسی ہی سہی۔ زبان جھوٹ بول سکتی ہے۔ آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔

سو نہ جائیے گا کھڑے ہی رہئے گا شہباز! شہباز کے دل میں ستارے جگمگانے لگے،

وہ بولا " کیک بہت لذیذ تھا اور اشتہا بھڑک اٹھی نیند بھی آرہی ہے مگر سوؤں گا نہیں"

وہ پلنگ کے گرد چکر کاٹتا رہا، میٹھی نیند۔ ذرا بیٹھ جاؤں، نرم بستر آوازیں دینے لگا۔

منع کر گئی ہے سوؤں گا نہیں، سر میں طوفان سا اٹھ رہا ہے بس لیٹ جاؤں۔

رکن من کی آواز، کیا بات ہے۔ بچی "رشاش" ہاں کیا نام ہے تبسم تھپک کر سلا دیا اس کو بھی۔ دو انگلیاں منہ میں فیگر چوستے ہوئے نیند نے آ دبایا جوتے پہنے ہوئے بے خبر

سو گیا۔

کہاں ہے وہ سپاہی تجھے جو بھی سوجھتی ہے انوکھی، خواب دیکھ لیا ہو گا۔

سچ سچ بیٹی اِدھر امتحان ہے پھر شادی۔

وہ ہے بستر پر سو گیا غریب۔ موت سے ڈرتا ہوا آیا باز کے پنجے سے چھٹی ہوئی فاختہ کی طرح ہر انسان،

ہائے ہے یہ ہے منہ میں انگلیاں چسر چسر چوس رہا ہے۔ خدا کی مار،

دکون ہیں آپ جاگ جائیے۔

بستر کو تھپکتے ہوئے سو جاؤ تبسم سو جاؤ سب بہنیں سو رہی ہیں۔

کیا تبسم تبسم لگائی ہے اٹھئے، کیا ٹکر ٹکر میرے منہ کو تک رہے ہیں۔

جی، جی میں جاگ گیا، نیند میں غٹ لال انگارہ آنکھیں کھول دیں۔

میں تھوڑی دیر اور پناہ چاہتا ہوں اگر آپ کی اجازت ہو تو، دشمنوں سے بچتا ہوا یہاں آگیا ہوں۔

نوید اپنے ابا سے کہو وہ سو رہے ہیں،

اماں ایسا کریں کہ میں اور آپ دونوں یہیں ایک پلنگ پر لیٹ جائیں، صبح کو ابا میاں سے بات ہو جائے گی یہ ہوش میں کب ہے۔ خراٹے اور تیز ہو گئے۔

اسے دن نکلنے سے پہلے ہی چائے ناشتہ کرا کے چلتا کرو، ہماری عزت و زندگی بھی خطرے میں ہیں وہ دیر تک سپاہی کے متعلق سوچتی رہی، نوید کی ساری ہمدردیاں اس غیر معلوم شخص کے ساتھ ہیں۔ غریب، بیچارہ، پناہ کا طالب، نجانے کیا گل کھلانے والی ہے۔ سمدھیانے سے خط آیا ہے احمد بھی بارہ کو آنے والا ہے شادی کا تقاضہ کیا ہے یہاں یہ ڈراما ہو رہا ہے، اسی اُدھیڑ بُن میں غافل سو گئیں۔

نوید کی آنکھ کھلی تو چار بج چکے تھے۔ اماں اماں جلد اُٹھئے ناشتہ چاء تیار کر دیں، گھیں کے

چولہے پر پراٹھے بنانے لگیں۔ دونوں سرگرمی سے مشغول ہوگئیں چائے کی کیتلی میں پانی رکھدیا، تم اپنے ابا میاں کو جگاؤ میں اُس کو جگاتی ہوں تم نہ جگانا خبردار بچوں کو آہٹ نہ ہو۔

اے سپاہی۔ میاں اٹھئے اور ناشتہ کرکے روانہ ہوجائیے وہ صابن تولیا ہے منجن بھی ڈبیہ میں ہے۔ چائے ناشتہ قرینے سے میز پر سجا ہوا تھا، سپاہی ہاتھ منہ دھوکر آداب عرض کرتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

نوید سب ماجرا سناکر باپ کو ساتھ لائی سخت طیش میں تھے

شہباز! ابا میاں آئے ہیں۔

شہباز لپک کر جھکا اور سیدھا کھڑا ہو کر السلام علیکم کہا اور فوجی طریقے سے سیلوٹ کیا فوراً پیر پکڑ لئے، حضور میں بہت بیجا طریقے سے آیا تھا۔ اب واپس جارہا ہوں میری معذرت قبول کر لیجئے، تشکر کے ساتھ رخصت چاہوں گا،

ہاں مناسب یہی ہے سب ہی کے لئے خطرہ ہے، چائے ناشتہ کرلو،

تیز تیز پراٹھے کھاتے ہوئے سامنے پستول اور گھڑی ڈالدی اور یہ میڈل بھی ہے میڈل اٹھاکر پڑھا تو ابا میاں دنگ رہ گئے۔ اسٹار افغانستان، کیپٹن شہباز خاں، آفیسر رجمنٹ نمبر ۵ ہوائی افواج "ہُما"

ابا میاں کبھی خان کو دیکھتے کبھی اپنی بیوی کو کبھی نوید کو، آپ اس کے مہمان ہیں، میں کیا کہوں غصہ تو بہت آرہا ہے بیشک آنے کا طریقہ بہت غلط تھا دوبارہ معذرت خواہ ہوں میرے پاس پیسے بالکل نہیں ہیں۔ میڈل گھڑی اور پستول آپ کے پاس امانت ہیں آپ مجھے تیس چالیس روپئے عنایت فرمادیں جلد واپس کردوں گا۔

لیکن اس وقت گھر میں دس بیس روپئے سے زیادہ نہ ہوگا۔ نوید جھپٹ کر گئی اور دس دس کے آٹھ نوٹ لیکر باپ کو دیتے ہوئے کہا ابا میاں میرے پاس یہ تھے یہ دیدیجئے۔ متشکرم، متشکرم، کوئی چیز ایسی دیدیجئے کہ میری وردی چھپ جائے۔

نوید جاؤ نانا ابا کا اوور کوٹ لادو، ابامیاں نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

کوٹ فوراً پہنتے ہوئے یہ خطرناک چیز یں کہیں چھپا دینا نوید من، خدا حافظ کہتا ہوا اٹھ کر دھندلکے میں غائب ہو گیا۔

کتنے اچھے ہیں یہ لوگ نوید کا سراپا نگاہوں میں پھر گیا، نوید مری زندگی تمہاری مرہونِ منت ہے تمہیں زندگی کی پوری شادمانیاں نصیب ہوں۔

•

گھر میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں گی نوید سب بات سنبھال لے گی۔ یہ تو بہت خوب ہوا کہ کالج کا فون نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ پاسپورٹ محفوظ ہے۔ ہلو ہلو سیکنڈ ایر کی طالبہ نوید زیدی کو بلا دیجئے ٹرنک کال ہے۔

نوید بدحواس دوڑی ہوئی آئی۔ یہ آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔ آداب۔ اس نے گھبرائی ہوئی سانسوں میں کہا۔

جاپان ٹرین سے شہباز بول رہا ہوں پہچان لو ایک منٹ کو بھی تمہیں نہیں بھلا پایا، "غلام نرگسِ مستِ تو تفہر یار آمد۔ خراب بادہ لعل تو ہوشیار آمد"

"میں کچھ نہیں جانتی، گھر میں تو قیامت آئی ہوئی ہے لیکن ابامیاں ہموار ہیں، اماں بہت برہم ہیں وہ شخص بھی اسی ہفتہ آرہا ہے بڈھا!

بڈھے سے میں نمٹ لوں گا کوئی فکر کی بات نہیں۔ تم میری وکالت کرتی رہو گی سب تمہیں تو ٹھیک ہیں تمہاری ہی طرح سوئیٹ ہیں، نوید، جاپان کی گاڑیاں بڑی صاف ستھری ہیں، ہر ڈبے کے سامنے مسافروں کی لائن لگی ہوتی ہے، ہر ٹکٹ پر سیٹ نمبر اور درجے کا نمبر درج ہوتا ہے؛ جتنے لوگ اترتے ہیں اسی حساب سے اتنے ہی ٹکٹ دیئے جاتے ہیں، نظم اور سہولت ہے۔ جب ہم بیٹھے گئے تو ایک لڑکا ناشتہ لایا۔ دیوار پر بجلی سے جگمگاتا ہوا نقشہ بنا ہوا تھا جس سے یہ پتہ

چلتا ہے کہ ٹرین اب کس مقام پر ہے۔ ریڈیو ایر فون، ٹیلی فون بوتھ بھی موجود ہے جس سے
میں ٹرنک کال کر رہا ہوں اب میرا وقت ختم ہو رہا ہے نقشے پر میرا اسٹیشن روشن ہو گیا ما توار
کو پہنچ رہا ہوں آپکے گھر میں شہباز، ہ
جاپانیوں کو زندگی کی شاہراہ تعمیر کرنے کا بہترین راز معلوم ہے اور تجارت کا بھی۔
"من از شوق حضوری طول دادم داستانے را" جانِ شہباز خدا حافظ
نوید کو لڑکیوں نے گھیر لیا۔ کس کا فون تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا ہوں بتائیں گی نہیں۔
کس سلسلے میں میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھیں۔
کلاس میں وقت کاٹنا مشکل ہو گیا۔ کانوں میں تو آوازیں گونج رہی ہیں۔ میں آ رہا
ہوں۔ بہترین راز جانتے ہیں۔ جانِ شہباز، اس نے سر کو جھٹک دیا، یہ
یہ شخص مجھے زندہ نہیں رہنے دیگا۔ میں بھی پہاڑ کے برابر غلطی کر بیٹھی، تصویر پر دستخط بھی
کر دیئے، یہ کوئی ہوشمندی کی بات تھی۔ ہوش میں ہے کون؟
میں مر جاؤں گی، حالات پاگل تو ضرور ہی کر دیں گے۔ احمد علی شیطان بنکر جان کو لگا ہے
اماں کو اپنے پیسے کے رعب میں لے رکھا ہے بڈھے نے۔
شہباز خدارا تم میری زندگی سے مت کھیلو مجھے خود کو بھول جانے دو، میرے گھر نہ آؤ،
مجھے زمانہ کھا جائے گا رسوا کر دے گا میں یہ سب نہیں برداشت کر سکتی چلے جاؤ میرے خیال
سے میں تم سے نفرت کرتی ہوں، جادوگر ہو تم مجھے زندگی سجانی سنوارنی ہے دشمن ہو میرے
حواس پر قزاق بنکر چھاپا مار دیا چوروں کی طرح آئے بزدل بھگوڑے سپاہی، لٹیرے چور ہو
تم میرے دل کے جیت چور، کیپٹن شہباز .... ہائیں یہ میں نے کیا کیا سوچ لیا میرے
دل! کیا کیا سبق سکھاتا ہے۔ میں اس میں عیب تلاش کر رہی ہوں نفرت کے لئے بھول جانے
کے لئے تو جیت چور اور دلنواز کی حاشیہ آرائی کر رہا ہے لعنت ہے تجھ پر دیکھنا کیسی ایک
ایک چیز اٹھا کر پھینکتی ہوں اُس بلا نے آسانی کی۔

گھر میں آکر خیالات کے طوفان کو دبانے کے لئے رضائی اوڑھ کر لیٹ گئی دیکھتی ہوں اب کیسے یاد آؤ گے ہر طرح سے رضائی کے قلعہ میں خود کو محصور کر لیا۔ دل اور دماغ میں برابر جنگ ہوتی رہی۔ یقین جانو نوید جیت ہمیشہ سچی بے لوث محبت ہی کی ہوتی ہے یہ سب کون کہہ رہا ہے میرے اندر سے یہ کس کی آواز ہے کیسی جیت ہے تو دل دماغ ذہنی آسودگی اپنا سب کچھ ہار گئی آنِ واحد میں جب فرد کی محبت پر یا محبت کی فرد پر فتح پُر وقار اور بلند ہو گئی تب محبت عظیم اور مکمل ہو گئی یقین مانو نوید کہ محبت کائنات کی سب سے حسین شے کا نام ہے وسعتِ نظر میں حسن پیدا ہوتا ہے یہ نظر خونِ دل کی تپش سے ایثار و قربانی سے مرکب ہے اپنی دلی تمنائیں اور آرزوئیں سب کچھ ہار دینے میں بھی بڑی راحت ہے۔ اف آوازیں مرے دل سے روم روم سے یہی آوازیں کیوں آتی ہیں،

میں نفرت کرنا چاہتی ہوں، محبت کا صحیح توڑ کیپٹن شہباز سے نفرت ہے مجھے "مگر وہ میرے تصور کا شاہکار بھی ہے"

مرکزی خیال بڑا نازک ہے

——— (*) ———

# منظومات

# حمد

نسیم شاہ جہاں پوری

کبھی کسی کو نہ ہو پائی جرأتِ انکار
کیا ہر اک نے ترے وجود کا اقرار

ترے وجود کا اقرار عقل کی معراج
ترے وجود سے انکار خود سے انکار

ہر ایک نقش خود اپنی جگہ ہے تیری دلیل
یہ کائنات ترا فن ہے اور تو فنکار

عمل ہی صرف ضروری نہیں بشر کیلئے
رہِ حیات میں تیرا یقیں بھی ہے درکار

ترے یقیں سے روشن جہانِ قلب و نظر
ترے یقیں پہ ایمان کا ہے دار و مدار

متاعِ اہلِ یقیں تیری یاد، تیرا خیال
بہشتِ اہلِ نظر تیری صنعتوں کی بہار

ترے کرم کے ہیں محتاج بادشاہ و گدا
جبینِ کون و مکاں تیرے در پہ سجدہ گزار

جہاں ہے قافلہ اور تو ہے منزلِ مقصود
ترا حبیب ہے عالم کا قافلہ سالار

دلِ نسیم کی ہر بات تجھ پہ روشن ہے
یہ تجھ سے کیا کرے اپنے یقین کا اظہار

# غزل

احتشام اختر
پرانا خزانہ ہاؤس سول لائنز کوٹہ (راجستھان)

عشق اب اپنا مقدر ہو گیا
آنکھ کا صحرا سمندر ہو گیا

دشمنوں سے کچھ گلہ مجھ کو نہیں
منحرف میرا ہی لشکر ہو گیا

کس قدر تاریک تھا دل کا مکاں
رات آئی تو منور ہو گیا

اب کسی بھی بات پر روتا نہیں
دل مرا گویا قلندر ہو گیا

زندگی کے جنگلوں کا یہ سفر
نعرۂ اللہ اکبر ہو گیا

پاس تھا جب تو چمک کچھ بھی نہ تھی
دور جا کر وہ تو اختر ہو گیا

# غزل

کیا دیکھتا ہے حال کے منظر اِدھر بھی دیکھ
ماضی کے نقش یاد کی دیوار پر بھی دیکھ

دیکھے ہیں میرے عیب تو میرا ہُنر بھی دیکھ
سودا ہے جس میں اپنی اَنا کا وہ سر بھی دیکھ

لے کام مجھ سے سخت اُڑانوں کا تو مگر
پہلے میری نگاہ مرے بال و پر بھی دیکھ

چہرے کے رنگ و نور کو میرا ہُنر سمجھ
مجھ کو مری نظر سے کبھی جھانک کر بھی دیکھ

اک بار بچ کے اور زمانے کی آنکھ سے
ہوں دیکھنے کی چیز تو بارِ دگر بھی دیکھ

سیدہ شان معراج

# اُردو

مصرعِ طرح :- ہر خطۂ زمیں پر پہونچی صدائے اُردو
آل انڈیا مشاعرہ منعقدہ منجانب رائٹرز گلڈ مظفر نگر یوپی [illegible]ء


ابوالاسرار رمزی اٹاوی
(ایم اے) جودھپوری


تاریخ کہ رہی ہے خود ماجرائے اُردو
سینتیس ۳۷ سال سے ہے مظلوم ہائے اُردو

دن رات بولتے ہیں اپنے پرائے اُردو
سارے جہان والے ہیں آشنائے اُردو

وہ "علمِ مجلسی" میں ممتاز ہو گیا ہے
بھولے سے لگ گئی ہے جسکو ہوائے اُردو

نعرے لگا لگا کر یہ انقلاب لائی
پھرتی تھی ہر گلی میں جھنڈا اُٹھائے اُردو

ہندی کی ساری فلمیں محتاج ہیں اسی کی
ان میں بھی جلوہ گر ہے رنگِ فضائے اُردو

زندہ ہے یہ ابھی تک زندہ یونہی رہے گی
سوچیں گے جلنے والے رازِ بقائے اُردو

ؤ

# غزل

میکش اجمیری

ٹھوکریں کھا کے مسافر کو سنبھلنا ہوگا
ورنہ اوروں کا سہارا لئے چلنا ہوگا

نرم پاؤں کا لہو مانگ رہے ہیں کانٹے
پھر کسی رام کو محلوں سے نکلنا ہوگا

منتظر رہتا نہیں وقت زمانے کا کبھی
وقت کے ساتھ زمانے کو بدلنا ہوگا

آج ٹھہرائے ٹھہرتے ہی نہیں آنکھوں میں
ان کو شاید کسی دامن پہ مچلنا ہوگا

کامرانی کے شبستاں میں پہنچنے کے لئے
آرزوؤں کے کھلونوں سے بہلنا ہوگا

جام ہر رند کو دینے کے لئے اے ساقی
تجھ کو تقسیم کا انداز بدلنا ہوگا

آسماں قید ہوا جام میں آ کر میکش
سر سے اب گردشِ ایام کو ٹلنا ہوگا

جناب پنڈت اوتار نارائن بہادر گلکڑ کشمیر نژاد تھے۔ بہادر گوت بھی تھا۔ اور تخلص بھی۔ بسلسلۂ ملازمت متفرق مقامات پر میرا اُن کا ۲۲ سال تک ساتھ رہا میں نے ان سے زیادہ شعر و ادب، اخلاص و محبت کا پیکر، غیر متعصب شخص نہیں دیکھا، شعر و ادب سے ان کے لگاؤ کا یہ ہی ثبوت ہے کہ عرصہ دراز تک نائب صدر انجمن ترقی اردو رہے اور جناب الطاف احمد خیری صاحب کے پاکستان جانے پر یہ آخر عمر تک صدر انجمن ترقی اردو راجستھان رہے۔ انکے حلقۂ احباب میں زیادہ تر مسلمان تھے مثلاً خانصاحب وحید اللہ صاحب کلکٹر جودھپور، سید احمد علی ثنا صاحب جعفری کلکٹر۔ خانصاحب بشیر خاں صاحب چیف انجینئر الیکٹرک ڈپارٹمنٹ راجستھان، شام کو آپکے دولت کدہ پر احباب کا مجمع ہوتا اور شعر و ادب و لطائف سے محفل قہقہہ زار رہتی، خانصاحب بشیر خاں صاحب کے انتقال پر آپنے اُن کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ جہاں درد و غم سوز و ساز کا حامل ہے وہیں تغزل اور ترنم کا بھی شاہکار ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ —— عشق فاروقی

# تاثراتِ غم

بر وفات

## جناب بشیر خاں صاحب ریٹائرڈ الیکٹرک چیف انجینئر راجستھان

از:۔ (پنڈت) اوتار نراین بہادر

---

جب شاخ پہ غنچے کھلتے ہیں آنکھیں پُر نم کرتا ہوں
جب پیار کی باتیں ہوتی ہیں میں دل کا ماتم کرتا ہوں

جب عشق کی باتیں ہوتی ہیں جب حسن کے چرچے ہوتے ہیں
میں ٹھنڈی سانسیں لیتا ہوں اور بزم کو برہم کرتا ہوں

جب ہر سو پھول مہکتے ہیں جب فصلِ بہاراں آتی ہے
پلکوں پہ لرزتے اشکوں کو ہم رتبۂ شبنم کرتا ہوں

ہے راگ نرالا دھن ہے نئی ہر بات نئی ہر رنگ نیا
جب بہار خوشی کے بجتے ہیں میں نالے پیہم کرتا ہوں

اک مردِ قلندر ساتھی نے یہ کہہ کر رشتہ توڑ دیا
"میں روح مقید کو اپنی آزادِ دو عالم کرتا ہوں"

وہ جذب کا عالم آنکھوں میں وہ انوٹ باتیں کرنے کی
اب لاؤں کہاں سے وہ منظر اس بات کا ماتم کرتا ہوں

جب ہوک سی دل میں اٹھتی ہے جب درد سا دل میں ہوتا ہے
فرقت کے بھڑکتے شعلوں کو اشکوں ہی سے کچھ کم کرتا ہوں

اب سوزِ غمِ فرقت نے مرا سب ضبط کا یارا چھین لیا
آہیں تو نکل ہی جاتی ہیں جب نالوں کو مدھم کرتا ہوں

یہ لب پہ تبسم دھوکہ ہے دل اندر اندر روتا ہے
ہنس ہنس کے علاجِ تلخی دل میں آپ ہی ہمدم کرتا ہوں

وہ مہر و وفا کا منظر اب آنکھوں کو نظر آتا ہی نہیں
میں ان کی محبت کی باتیں ہر لمحہ ہر دم کرتا ہوں

ہر لحظہ دعائیں دیتا ہوں دل توڑ کے جانے والے کو
ہر آن وفاؤں کا اپنی میں اونچا پرچم کرتا ہوں

جو آنے والے راہی ہیں وہ راہ نہ بھولیں منزل کی
الفت کا نشانِ منزل میں ہر گام پہ محکم کرتا ہوں

میں ان کی خیر مناتا ہوں دو چار نفس جو باقی ہیں
دل سہما سہما رہتا ہے جب باتیں باہم کرتا ہوں

[illegible] نہیں ہے دل کی لگی یہ حال بنا کر رہے اپنا
جب یادِ دلگیر آجاتی ہے اخلاص کا ماتم کرتا ہوں

جبّار غنی رانجھی

# غزل

موجِ صبا کا پھولوں کو ہے انتظار آج
شبنم کسی کی یاد میں ہے اشکبار آج

اب اُن سے ربط رکھیں بھی تو کس طرح رکھیں
اپنی وفا بھی اُن کو ہوئی ناگوار آج

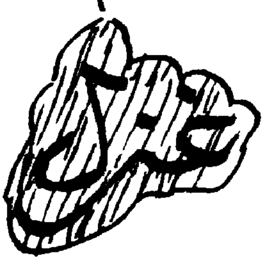
نیرنگئ جہاں کا کریں ذکر کیا ندیم
ہر فرد ہے شکارِ غمِ روزگار آج

ساقی اِدھر بھی جامِ مئے ارغواں بڑھا
بے چین دل کو میکدے سے ملے کچھ قرار آج

کہنے لگے ہیں مجھ سے بھی باتیں وہ راز کی
کرنے لگے ہیں مجھ پہ بھی وہ اعتبار آج

چشمِ فسوں طراز کی کیا بات ہے غنی
شیخِ حرم بھی کرنے لگا اُن سے پیار آج

# امینؔ جودھپوری



جس گلاب کو مالی نے بڑے چاؤ سے پالا
زندگی بھر جسے سینے سے لگائے رکھا
وہ ہی نذرِ خزاں ہو گیا
چمن کے سارے پھول
ڈھونڈتے پھریں گے برسوں اُسے
کانٹے
جو محافظ تھے اُس کے
وہ ہی چبھ گئے
اور گلاب چھلنی ہو گیا۔
زینتِ انجمن چھن گئی
اور رہ گئی اک خلا،
بس اُسے ڈھونڈتے رہو
اور روتے رہو
اب چمن کے ہر اک پھول کا
یہی ہے مقدر۔

# غزل

کچھ دیر کناروں پہ ٹھہر، شام شفق رنگ
دریا میں ابھی سے نہ اُتر، شام شفق رنگ

اشجار کی حیرت رہے کچھ دیر تو قائم!
اس دشت سے آہستہ گذر، شام شفق رنگ

پتے تیری آمد سے پُر اسرار ہوئے ہیں
گلشن میں ذرا دیر ٹھہر، شام شفق رنگ

دریاؤں کی آغوش میں سونے کے لئے روز
آتی ہے پہاڑوں سے اُتر، شام شفق رنگ

خیمہ تو لگانے کا ہنر ہے پہ کریں کیا؟
لکھا ہے مقدر میں سفر، شام شفق رنگ

ایم، آر قاسمی
دہلی

# قطعات

جاوید اشرف فیض

آپ سے بہتر نہیں کوئی جہاں میں حق شناس
آپ کی پاکیزہ ہستی آپ کا نوری لباس
حشر تک کہتے رہیں گے آپ کے ادنیٰ غلام
آپ سے دنیا ہے قائم آپ دنیا کی اساس

رہے خیال بڑی چیز انکساری ہے
جھکا کے سر کو چلو تم نہ سر اٹھا کے چلو
جو سر اٹھاتا ہے گرتا ہے سب کی نظروں سے
یہ خود بھی یاد رکھو سب کو بھی بتا کے چلو

یہی دیکھا کہ بات وہ جو بھی
اہلِ الفت کے لب پہ آتی ہے
سب کے کانوں میں گھولتی ہے رس
روح و دل کو بھی چھو کے جاتی ہے

عزیب بدایونی

## غزل

خلق کی ہر نگاہ سے گو کہ ہے آج بھی نہاں
بکھرے ہوئے مہ و نجوم دیتے ہیں سب ترا نشاں

تیری عطا روش روش، تیرا کرم چمن چمن
تیرے ہی لطف سے ہری آج ہے شاخِ گلستاں

لطفِ بیاں کے ساتھ ساتھ طرزِ ادا ہو پُر کشش
ایسی ہو داستانِ دل حسن بھی کہہ اُٹھے کہ ہاں

دیکھ فلک پہ ہے گھٹا، دیر نہ کر پلا پلا!
ساقی! خوبرو ملے مجھ کو بھی جامِ ارغواں

پردہ اُٹھے نظر تو آئے دید کی تشنگی بجھے
بدلے یقین میں کبھی وہم مرا، میرا گماں

وہ مرا حاصلِ نظر سامنے ہے نہیں بھی ہے
دیکھے تو ہے عیاں عیاں، پوچھے تو ہے نہاں نہاں

عشق میں تیرے آج کل میرا یہ حالِ زار ہے
آہ لبوں پہ آئے جب دل سے مرے اُٹھے دھواں

کوئی نہ جانے اے عزیب، حالِ عجیب ان کا ہے
آنکھ میں کچھ، زباں پہ کچھ، دل کی ہیں کچھ کہانیاں

مخمور جمالی
مرکز ادب، عیدگاہ بنٹور، بجنور، یوپی

# غزل

رنگینیوں میں غرق مری زندگی رہی — جب تک کوئی قریب رہا بیخودی رہی
ہونٹوں کے ریگزار میں بوسے بھی کھو گئے — سیرابیوں کے نام پہ اک تشنگی رہی
کافر ہوں، بھول کر بھی جو دیکھا ہو اور کچھ — نظروں کی بس جمال سے وابستگی رہی
پھر اُس کے بعد حسن سے شکوہ نہیں رہا — پلکوں پہ کچھ دنوں کے لئے تو نمی رہی
اُس نے زمین اوڑھ کے چہرہ چھپا لیا — میری نظر خلا میں اُسے ڈھونڈتی رہی
اک انتظار تھا کہ نہ مر کر بھی کم ہوا — اک آنکھ تھی کہ یوں ہی ہمیشہ کھلی رہی
ہونے کو اور بھی تھے ہدف ظلم و جور کے — ظالم! تیری نگاہ مجھی پر جمی رہی
عالم کا سارا کرب تو حصے میں آگیا — کیا غم ہے، ہم سے دور جو اک خوشی رہی
اک اک کرن کو اب بھی ترستے ہیں جھونپڑے — محلوں ہی کے حدود میں ہر روشنی رہی؟
اشکوں سے اپنے جس نے بجھائی گھروں کی آگ — مخلوق اس کو جلتا ہوا دیکھتی رہی
پڑھنا تھا جس کو اُس نے ہی مجھ کو نہیں پڑھا — دنیا ورق ورق پہ مجھے دیکھتی رہی
ویرانئ نگاہ سے منظر جھلس گئے — شاداب تھی نظر تو بڑی تازگی رہی

گُل ہو کے پھر سے جل گئے مخمور سب چراغ
لیکن یہ دل کی شمع بجھی کی بجھی رہی

# غزل

اختر عظیم آبادی
پٹنہ

یہ بھی ہنگامۂ حالات میں اکثر دیکھا
میں نے انگشتِ مسیحا میں جو نشتر دیکھا

یوں شبِ غم تری یادوں کے اُجالے آئے
خواب میں جیسے حسیں صبح کا منظر دیکھا

تم نے شعلوں کو لپکتے ہوئے دیکھا ہی نہیں
آگ لگتی ہوئی ان آنکھوں نے گھر گھر دیکھا

اپنے ہی شہر پہ مقتل کا گماں ہوتا ہے
میں نے ہر موڑ پہ ہر ہاتھ میں خنجر دیکھا

دستِ ظلمت نے تراشا ہے اجالوں کا بدن
شب کی آغوش میں یوں صبح کا پیکر دیکھا

میں نے ٹوکا بھی نہیں اُس نے پکارا بھی نہیں
جانے کیا بات تھی جو میں نے پلٹ کر دیکھا

اب کے موسم میں نہ پھل آئے نہ کونپل پھوٹی
پھر بھی آنگن میں برستے ہوئے پتھر دیکھا

تشنگی اپنی بھی بجھ جائے گی اختر اک دن
اُن کی آنکھوں میں اگر جھیل کا منظر دیکھا

# زندہ باد اے نگارِ آزادی

سید احمد سحر شاہ جہاں پوری

وائے بر قتلِ اندرا گاندھی — ہائے کردارِ قوم کی پستی
اُف یہ جور و جفا یہ ظلم و ستم — اُف یہ دیوانہ پن یہ بدمستی
سینچ کر اپنے خون سے جس نے — جسم کو جان دل کو طاقت دی
تم نے اُس ماں کو بھی نہیں بخشا — کیسی آنکھوں پہ چھا گئی چربی
تختۂ مشقِ جور اک زنِ پیر — گولیوں کا نشانہ اک دیوی
جارحیت کا ایسا ننگا ناچ — کیسی کھیلی ہے خون سے ہولی

خون بھی کس کا اپنی میڈم کا
اندرا سی وزیرِ اعظم کا

اندرا کون ۔ جسم و جانِ وطن — وارثِ عزمِ رہبرانِ وطن
اندرا نازو فخرِ شانِ وطن — اندرا مہرِ آسمانِ وطن
نیک دل نیک رو و نیک نہاد — فخرِ ناموسِ دخترانِ وطن
آب و تابِ جواہر و موتی — رنگ و آہنگِ داستانِ وطن

اس صدی کی وہ آہنی عورت — وہ کمر بستہ پاسبانِ وطن
ملک اور قوم اس کا گھر آنگن — اندرا مثلِ سائبانِ وطن
پختہ کار سیاستِ اقوام — نازشِ بزمِ نکتہ دانِ وطن
مشعلِ راہِ امن و آزادی — یعنی سالارِ کاروانِ وطن
مادرِ مشفقِ سری راجیو — حوصلہ بخش باغبانِ وطن
خونِ ناحق یہ رنگ لائے گا
آئینہ تم کو منہ چڑھائے گا

زندہ باد اے وقارِ آزادی — آفریں جاں نثارِ آزادی
کہیں صدیوں میں چند ہوتے ہیں — تجھ سے طاعت گذارِ آزادی
زندہ باد اے متاعِ عظمتِ ہند
زندہ باد اے نگارِ آزادی

# حُسنِ نظر

## نوٹ

اس عنوان کے تحت قارئین نخلستان کے خطوط یا اُن کے اقتباسات ہر شمارہ میں ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں لیکن قارئین کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

(ادارہ)

محترمی و کرمفرمائے من !

محمد علی زیدی صاحب !                تسلیمات

خدا کرے آپ بخیر ہوں ۔

مودبانہ عرض رسا ہوں نخلستان" جیسا شاداب، معیاری ادب کو پیش کرنے والا اردو کا انمول صحیفہ کی اشاعت میں اتنی تاخیر ——— ! آخر بات کیا ہے؟ حالات کی ناسازگاری کی کیا وجہ ہے ؟ ۔ مدبّر اور علم و عمل کا دانشور آخر خاموش کیوں ہے ؟ برق تپاں میں اتنا سکوت و جمود کیوں طاری ہو گیا ہے ۔؟ بحر بیکراں میں طلاطم کیوں نہیں ہے ؟ عہد آفریں کی پکار میں لغزش و انحراف کیوں ہے ۔ کیا تخلیقات کی موصولی میں کوتاہی لاحق ہوئی ہے ؟ یا پھر ——— کتابت کی کمی میں نظر اندازی کی کفالت نہیں ہے ۔ وجہ چاہے جو بھی ہو ——— لیکن رسالہ تو وقت پر نکلنا ہی چاہئے ——— ذمہ دارانِ بزم تو بڑے ہی ذی فہم و ادراک ہوشمند ٹھہرے ۔ پھر رسالہ وقت معین پر کیوں نہیں منظر عام پر آتا ۔ آپ کیوں کسی کو شکوہ کا موقع دیں ۔ سچ جانئے نخلستان جیسا معیاری جریدہ سے خاص شغف ہے ۔ اور آپ لوگوں کی مدّاحی کا ہمیشہ دم بھرتا ہوں ۔ آپ کی زرّیں خدمات کسی سے روپوش نہیں ہیں ! حق بات تو یوں ہے کہ مجھے رسالہ ماہ ستمبر ۸۴ء کے بعد سے ہاتھ نہیں آیا ہے، میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے آخری سال کا آخری ایڈیشن نئے سال کی خوشیاں لیکر مارچ میں ضرور حاضر ہو گا، مارچ ختم ہو گیا اپریل آگیا ۔ اور اچھا ہمیں " اپریل فول " بنا گیا ۔ نذر سالانہ کی فرمائش کنتی میں نے فوراً منی آرڈر کر دیا ۔ دیکھتا ہوں ۔ آج اپریل کی ۲۰ تاریخ ہو گئی ۔ پیڑوں میں نئے برگ و بار اور نئے نخل بھی نکل آئے لیکن نخلستان کی شادابی میں ذرا بھی رونق نہیں آئی ۔ آنکھیں رونق بزم کی جانب لگی ہوئی ہیں، نخل

معطر فضا میں سیر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دیکھئے دلجوئی کیجئے اور نخلستان کی صحراؤں میں بھٹکنے سے ہمیشہ بچائیے۔ باقی سلام لیجئے۔

کارکنانِ بزم کو بھی ہدیۂ سلام دیں۔ مخلص

جبّار غنیؔ راوڑ کیلا (اڑیسہ)

(تاخیر کے اسباب سخنہائے گفتنی میں تحریر کر دیئے گئے ہیں۔ (زیدی)

عظمت مآب زیدی صاحب ——————— سلام مسنون

نخلستان کا تازہ شمارہ "دیر آید درست آید" کے مصداق وارد ہوا۔ گوشۂ نگراں حقیقت کا غماز ہے بہ الفاظ دیگر ایک زندہ ضمیر کی آواز ہے۔" رہبر اعظم خلق مجسم" سرور کائنات کے کردار، مشن، مطمح نظر کا نقیب ہے۔ طرز استدلال دل نشیں، اسلوب نگارش منفرد ہے "ظرافت ظریف اور دیوانجی" میں ظرافت کی سرسری تاریخ، ظریفؔ کی شاعرانہ حیثیت کی تعین کی کاوش ملتی ہے۔ روانی بیباختگی سونے پر سہاگہ کا کام کر رہی ہے۔ شمیمؔ جے پوری کا انٹرویو بڑا ہی بھرپور اور جامع ہے جو خالد عابدی کی فنّی چابکدستی کا بین ثبوت ہے" اقبال اور تعلیم جدید" میں نئے طریق تعلیم، اس کے محرکات، مضر نتائج کا جائزہ اقبال کے اشعار کی روشنی میں لیا گیا ہے مضمون مدلل، معلومات افزا، حقائق پر مبنی ہے۔ ایچ ایس سوڈھی نے زندگی کے واقعات کو حسن سحر کارانہ پیرایہ میں پیش کیا ہے اس سے ان کے معجز نگار قلم اور فن کا قائل ہونا پڑتا ہے، موصوف کا ایک ایک حرف حرفِ معتبر کا درجہ رکھتا ہے، "حیرت بحیثیت غزل گو" کی تمہید پر طائرانہ نظر کرتے ہی بیباختہ منہ سے نکل گیا "آغاز تو اچھا ہے انجام خدا جانے" جابجا بکھرے نکات رستوگی کی شعری آگہی پر دلالت کرتے ہیں۔ انداز بیان کا شکوہ لائق داد ہے۔ "رشید احمد صدیقی کا اسلوب بیان" رشید صاحب کے آرٹ پر تنقیدی نوٹ کا مرتبہ رکھتا ہے جو غالباً اردو کے طلباء کی ضروریات کو مدّنظر رکھ کر سپرد قلم کیا گیا ہے

طنز و ظرافت کے نمونوں کا انتخاب میں تنقیدی شعور کا عکس صاف جھلکتا ہے، حصۂ منظومات میں نسیم شاہجہاں پوری کی نعت کے بعض شعر دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ سوز کے نذرانۂ عقیدت کے چند بند سوز جاں کا پتہ دیتے ہیں۔

اختر شاہجہان پوری کی نظم کا دوسرا بند بہت خوب ہے۔ لیکن ان کے یہاں ے
دور درشتی اور پھر پکا ارادہ چاہئے۔

مصرع دیکھ کر ذوقِ جمال کو ٹھیس پہنچی۔ انصار محشر نے "ماتم اندرا" میں جذبات کی دنیا سمو دی ہے کوئی کوئی بند پوری پوری نظموں پر بھاری ہے۔ ستار بے پوری کے اشعار میں خلوص دل کی شمعیں سی جھلملاتی ہیں۔ فضا جوکالوی کی غزل بوریت کی فضا تخلیق کرنے میں اپنی مثال آپ ہے۔ گناہگار نے ان کے شعروں میں لطف و انبساط کا پہلو پایا تھا لیکن مقطع کو غزل کی فضا سے ہم آہنگ نہ پاکر بکھر دیا تھا۔ "مقطع نہ ہوتا تو غزل کا حسن مجروح نہ ہوتا" جس کی انھیں مجھ سے شکایت ہے۔ وہ غزل ساحر سیالکوٹی کی اصلاح شدہ بتاتے ہیں خدا کرے ایسا ہی ہو اور اپنی شاعری کو فنی خامیوں سے مبرا خیال فرماتے ہیں۔ میں ان کی تازہ غزل کے دو مصرعے پیش کر رہا ہوں اور جاننا چاہتا ہوں کہ ان میں فن کا کیا رکھ رکھاؤ ہے اور کس علامۂ وقت نے ان میں اصلاح دی ہے۔

(۱) آج ان کے فریب اور مکر دیکھ رہا ہوں
(۲) گھر اپنے میں اب آگ کا ڈر دیکھ رہا ہوں

عظیم امروہوی کی تخلیق بھی غنیمت ہے البتہ اس بار چونکانے والی بات کوئی نہیں۔ "بت نہرو" کے بعض بند معیاری اور بعض سطحی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ کوئی بند کسی وزن میں ہے تو کوئی کسی میں یہ نظم کی کوئی نئی قسم ہے یا مختلف نظموں کا مجموعہ۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔ گوہر امروہوی کے یہاں بھی آبدار موتیوں کی کمی نہیں۔ ضرورت صرف تہ تک پہنچنے والی نظر کی ہے۔ بحیثیت مجموعی نخلستان کا زیر نظر شمارہ جملہ ظاہری و باطنی محاسن سے مملو ہے۔ اخلاص کو

نظر بد سے محفوظ رکھے۔

محمور جہانی سنبھلی

نہٹور، بجنور

مکرمی ! آداب و نیاز !

کل اچانک ایک صاحب کے پاس نخلستان کا اکتوبر تا دسمبر ۸۴ء کا شمارہ دیکھا۔ مضمون (ظرافت، ظریف اور دیا بجی) شائع فرمانے کا شکریہ۔ لیکن افسوس، ادارے کی طرف سے مجھے اب تک اس کی کاپی ارسال نہیں کی گئی۔ امید ہے توجہ فرمائیں گے۔ مضمون میں مندرجہ ذیل خاص غلطی کاتب صاحب سے ہوئی ہے۔ براہ مہربانی اگلے شمارے میں تصحیح فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

صفحہ ۴۲ پر قطعات کے بارے میں جو کچھ میں نے تحریر کیا تھا وہ شائع نہیں کیا ہے، بلکہ رباعیات کے بجائے قطعات کا عنوان دیکر رباعیات کا مضمون شائع کیا ہے۔ قطعات کا مضمون مندرجہ ذیل ہے جو شائع ہونے سے رہ گیا ہے۔

قطعات :۔ ظریف نے شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے، مہاراج کمار صاحب محمود آبادی کے صاحبزادے کی پیدائش کے موقع پر ظریف نے مبارکبادی کا قطعہ کہا

تقویت دے گا مہاراجہ کے تخت و تاج کو
چاند سا بیٹا مبارک ہو کنور مہراج کو

پالنا نادار لایا ہے سپئے نذر امیر
زر تصدق کے لئے ممکن نہ تھا محتاج کو

اسکے علاوہ مضمون پر میرا نام شائع ہونے سے رہ گیا ہے۔

اسی شمارہ میں شامل خطوط میں صفحہ ۱۱۰ پر خواجہ صلاح الدین عشقی صاحب نے اپنے خط میں میرے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ میں نے اپنے خط میں جناب ستار آرجے پوری کی غزل کے لئے تحریر کیا ہے کہ "کوئی خیال نیا پن نہیں ہے " نہ ہی بیان میں ندرت ہے"۔

میرا ایک خط جولائی تا ستمبر ۸۳ء کے شمارے میں صفحہ ۱۱۲ پر شائع ہوا ہے، جس میں میں نے کسی بھی تخلیق کار کی تخلیق پر کوئی رائے نہیں دی ہے۔ ہاں میرے خط کے بعد جناب عباس فرحت وزینید محرریوا، ایم، پی) کا ایک طویل خط شائع ہوا ہے، جس میں فرحت صاحب نے رسالے پر تبصرہ کیا ہے۔ انہوں نے صفحہ ۱۱۵ پر جناب ستار آرجے پوری کی غزل پر مذکورہ خیال جسے عشقی صاحب نے مجھ سے منسوب کیا ہے ظاہر فرمایا ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ عشقی صاحب یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ یہ رائے کس نے تحریر کی ہے اور میں کس پر زور قلم آزما رہا ہوں یہاں اس بات کی بھی گنجائش نہیں کہ اس غلطی کو کاتب سے منسوب کیا جا سکے کیونکہ میرا نام دو مرتبہ آیا ہے۔ اس غلطی کے لئے عشقی صاحب کے ذمہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ ادارہ نخلستان بھی قابلِ افسوس ہے کہ وہ خطوط بغیر پڑھے شائع کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ادارہ اگلے شمارہ میں عشقی صاحب سے رابطہ قائم کر کے اس کی تصحیح ان کی طرف سے فرمائے گا۔ ساتھ ہی مجھے عشقی صاحب کے پتے سے مطلع فرمانے کی زحمت فرمائیے گا۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے

مخلص

شاداب ذکی بدایونی

جناب مکرم و محترم !

ڈاکٹر زیدی صاحب !

سلام مسنون ! مزاجِ گرامی نیک مطلوب ۔

مجھے یہ لکھتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ میں نے "نخلستان" کا تازہ شمارہ (اکتوبر تا دسمبر ۸۹) کو نہایت دلچسپ پایا ۔ مذکورہ شمارہ میں میری تخلیق " قطرۂ خونِ اندرآ ، نذرِ ہندوستان " کی اشاعت کے لئے میں آپ کا بیحد ممنون و مشکور ہوں ۔ یہ آپ کا کرم ہے کہ آپ نے میرے تأثرات کے خاکہ کو پسند کی نگاہ سے دیکھا ۔ مذکورہ شمارہ میں خاکہ خوب چھپا ہے البتہ کتابت کی دو چار غلطیاں نکل آئی ہیں ۔ ذیل کے جدول میں ان کی نشان دہی کی گئی ہے ۔

| نمبر | حوالہ ۔ صفحہ نمبر ، سطر وغیرہ | غلط کتابت | صحیح مواد یا عبارت |
|---|---|---|---|
| ۱ | صفحہ ۸ ، سطر نمبر ۲ ۔ جگر کا شعر پہلا مصرع | جو جنگی خاطر | جو حق کی خاطر |
| ۲ | صہ ۸ ، سطر ۳ ، جگر کا شعر دوسرا مصرع | رقصاں ہوتی ہیں | رقصاں ہوتے ہیں |
| ۳ | صہ ۷۹ ۔ سطر نمبر ۹ ، | موصوفہ کو اپنے مرگ | موصوفہ کو اپنی مرگ |
| ۴ | صہ ۷۹ ، سطر ۲۱ | آنسو روئینگی | آنسو روئینگیں |
| | صہ ۷۹ ، سطر ۲۱ | فخر کرینگی | فخر کرینگیں |

اطلاعاً تحریر ہے ۔ اعتراض مقصود نہیں ۔ آپ سے گزارش ہے کہ مراسلۂ ہذا کو "حسنِ نظر" کے صفحات میں شائع فرمائیں تاکہ عام قارئین ان امور سے واقف ہوجائیں اور رسالہ خریدار اپنی کاپیوں میں ان کی تصحیح کرلیں ۔ ناظرین کو مجھ سے یا آپ سے شکایت نہ ہوگی ۔

امید کہ میری یہ جسارت آپ کو ناگوار نہ گزرے گی ۔

دیگر یہ کہ آپ کا مقالہ " رہبر اعظم خلق مجسم صلعم " نہایت دلچسپ اور شاندار ہے۔ آپ نے رسول کریم ؐ کی سیرت پاک اور حیات طیبہ پر نہایت استدلال کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ مجھے آپ کی طرز تحریر اور اسلوب بیان نے نہایت متاثر کیا ہے۔ میں اپنی جانب سے تہہ دل سے آپ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

زیر نظر شمارہ معیاری مضامین اور شاندار منظومات کی شمولیت سے لاجواب ہوگیا ہے۔ بعد از مطالعہ اپنی ناچیز رائے کا اظہار کروں گا۔ فی الحال آپ کے انتخاب کی داد دینا اور اس کا اظہار کرنا اپنا اوّلین ادبی فریضہ تصور کرتے ہوئے یہ دو چار لفظ رقم کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی اور آپ کو بھی مسرت ہوگی کہ میری سفارش پر

نخلستان کے سالانہ خریدار بن چکے ہیں اور میرے توسط سے نخلستان کا زر سالانہ

بذریعہ منی آرڈر ارسال کر چکے ہیں۔ اِدھر میں نے اپنے چند ادب نواز دوستوں سے نخلستان کی سالانہ خریداری کے لئے پرزور سفارش کی ہے۔ آپ کے ادارہ کا انھیں پتہ بھی دیا ہے دو ایک شمارے انھیں دکھائے ہیں۔ یہ ادبی جریدہ انھیں پسند آیا ہے خدا کرے وہ نخلستان کی خریداری قبول فرمائیں۔

امید کہ جناب جواب سے جلد از جلد سرفراز کر کے اور اعزازی کاپیاں روانہ کر کے ناچیز کو ہدیۂ تشکر کا موقع دیں گے۔

ادارہ کے تمام اراکین کو میری جانب سے سلام علیک۔ باقی احوال لائق تشکر،

فقط والسلام، مخلص

مصباح اللہ۔ بلادر مدراس

محترمی! تسلیمات!

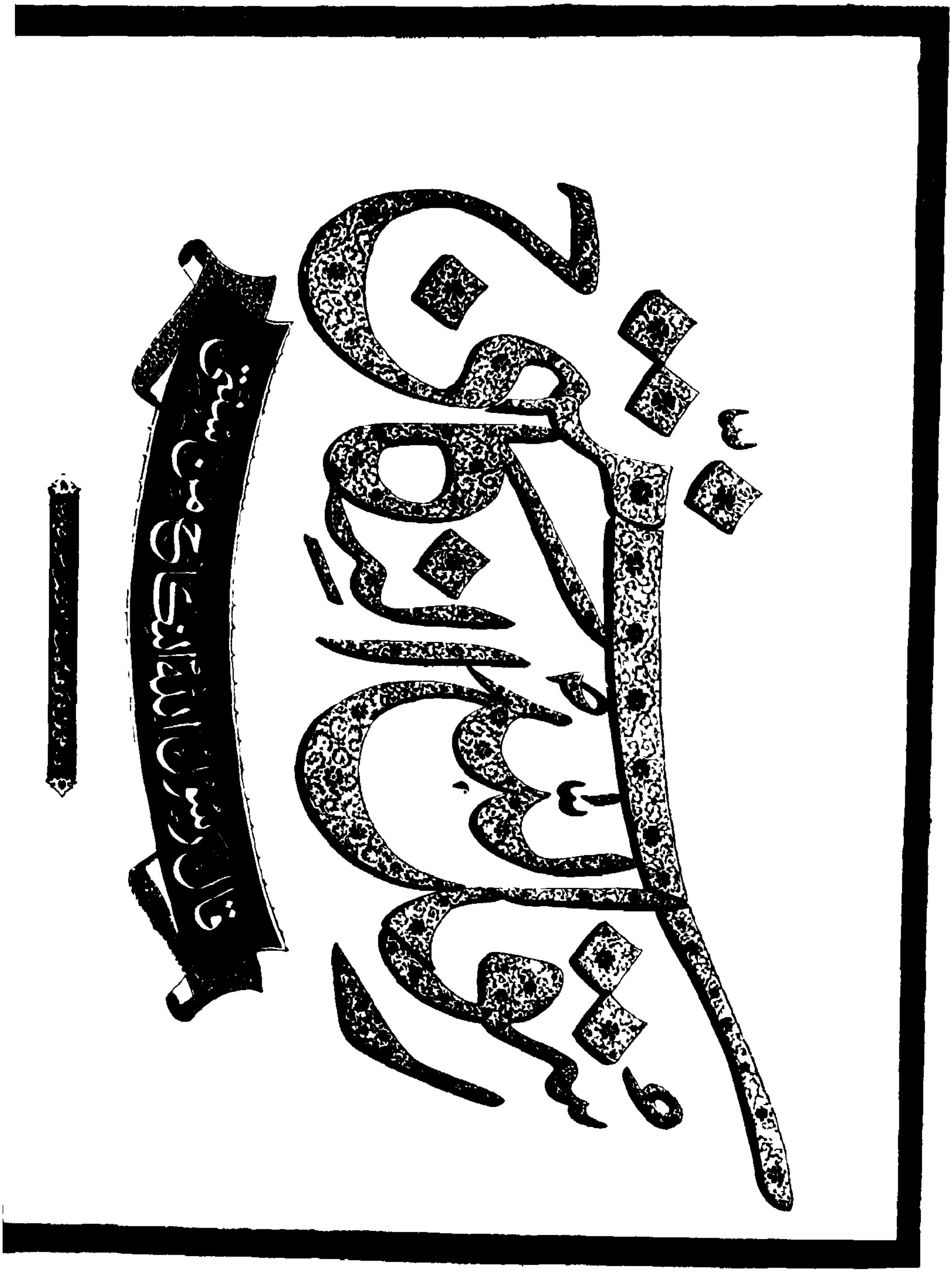
نخلستان" کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ کرم فرمائی کے لئے ممنون ومشکور ہوں، مضامین بغور پڑھے اس میں کوئی شک نہیں کہ "نخلستان" معیاری ادب کا ترجمان ہے۔ عامیانہ نظریات اور خیالات سے بلند تر ہے۔ نثار اعظمی صاحب کا مضمون قومی یک جہتی اور نظیر اکبرآبادی بھی بغور پڑھا، یہ مضمون "نیا دور" لکھنؤ کے ستمبر ۸۴ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ مضمون دو رسائل میں کیسے شائع ہوا؟ یہ جستجو کرنے کی ضرورت ہے۔ مس شہناز قریشی کا افسانہ "قربت اور فاصلے" میں کئی اغلاط موجود ہیں مثال کے طور پر یہ جملہ ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتی ہیں

"میں نے سوچا، شائد صنف نازک سمجھ کر اخلاقاً طور پر وہ مجھے اپنی سیٹ پیش کریں"۔ (یہ جملہ صـ۸ کے شروع میں) اس سطر میں اخلاقاً لکھ دینے کے بعد "طور پر" کی کیا ضرورت تھی۔ جملہ اخلاقاً لکھ دینے سے پورا ہو جاتا ہے مطلب بھی ادا کر دیتا۔ شہناز قریشی نے بار بار میں اپنی نثر میں لکھا ہے "میں نے اپنے دل میں سوچا"، اس جملہ میں، دل میں سوچا، مناسب نہیں۔ میں نے سوچا، لکھ دینا کافی تھا۔ سوچنے کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے دل سے نہیں۔

آپ ادبیات پر کافی مضمون چھاپتے ہیں۔ لیکن افسانوی ادب کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ یہ بات مناسب نہیں۔ ط مضامین اور شعری ادب کا حصہ قدرے کم کر دیجئے اور افسانوی ادب کا حصہ بڑھا دیجئے۔ کم سے کم ہر اشاعت میں تین افسانے شائع کیجئے۔ افسانے دلچسپ اور معیاری ہوں۔ افسانے چھپنے سے نخلستان ہر شخص کی توجہ کا مرکز بن جائے گا۔ ٹھوس ادبی مضامین ہر شخص نہیں پڑھتا، افسانے

(بقیہ صـ۷ پر دیکھیں)

جناب قائد علی خاں ٹونکی ہیڈ کاتب مرکز کتابت راجستھان اردو اکیڈمی جے پور کے
ان نمونوں پر جموں و کشمیر میں منعقدہ کل ہند چوتھی کیلی گرافی نمائش میں اعزازی انعام دیا گیا۔



(دوسرا نمونہ)

